

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تفسیر طہری

جلد ہفتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجتہد پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین، بھیر شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی - پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تفسیر مظہری (جلد ہفتم)	نام کتاب
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ	تالیف
ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ	ترجمہ متن
الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ	مترجمین
مولانا محمد انور منگھالوی	
فضلاء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف	
ایک ہزار	تعداد
دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)	اشاعت
1Z348	کپی ہارڈ کوڈ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

واٹا در پار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ انکریم ہارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:- 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:- 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

- سورہ فرقان 32 تمام مومن تھے۔ 134
- کافر کے منہ کے بل اٹھائے جانے کا بیان۔ 136
- پانی کے مسائل، کون سی چیزوں سے پانی ناپاک ہوتا 138
- شعر اور شعراء کی خدمت کا بیان 139
- شعر کی اباحت اور اس کی مدح کا بیان 141
- شعر کلام ہے، اچھا ہو تو حسین ہے اور برا ہو تو قبیح ہے۔ 141
- قیام لیل کی فضیلت کا بیان۔ 61
- حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصیت نامہ کا بیان۔ 62
- خوف ورجا کا بیان 62
- حدیث طیبہ: کون سا گناہ سب سے بڑا ہے۔ 63
- غنی اور آٹام کا بیان 64
- گناہوں کو نیکیوں سے تبدیل کرنے کا بیان 65
- جھوٹی شہادتوں کا بیان 69
- جھوٹی شہادت پر تکریر کا تذکرہ 70
- غزوہ اور اہل غزوہ کی عظمت شان کا بیان 72
- سورہ شعراء 77
- کسی عبادت کے عوض اجرت لینا جائز نہیں۔ 111
- ضرورت سے زائد عمارت پر مال خرچ کرنا جائز نہیں۔ 111
- مسئلہ: منویل آرزو (طول الاول) مکروہ ہے اور مختصر مستحب ہے۔ 113
- مسئلہ: جنبی آدمی کے لئے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھنا اور ترجمہ کو مس کرنا جائز ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف نماز کے دوران غازی میں قرآن کریم کی قرات جائز ہے۔ لیکن فتویٰ عدم جواز پر ہے۔ 126
- حضور نبی کریم ﷺ کے آباء اور امہات تمام کے
- 137 خفیہ طور پر ملائکہ سے شیاطین کے کلام سننے کا بیان
- 138 شعر اور شعراء کی خدمت کا بیان
- 139 شعر کی اباحت اور اس کی مدح کا بیان
- 141 شعر کلام ہے، اچھا ہو تو حسین ہے اور برا ہو تو قبیح ہے۔
- 141 حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصیت نامہ کا
- 143 بیان۔
- 145 سورہ نمل
- حدیث بالمعنی جائز ہے۔ نیز لفظ نکاح اور تزویج کے
- بضمیر ان الفاظ سے نکاح جائز ہے جو ان کے ہم معنی
- ہوں۔ 147
- علماء کی فضیلت کا بیان 153
- رد افضل کیلئے باعث افسوس ہے کہ انہیں چوبنی کے شعور
- کی شکل بھی احساس نہ ہوا۔ 158
- اللہ تعالیٰ کا ذکر چھوڑ کر کسی اور میں مشغول ہونا باعث
- ہلاکت ہے۔ 158
- رسول اللہ ﷺ کے تبسم فرمانے کا بیان 159
- پیغام نکاح کے ارادہ سے اجنبی عورت کی طرف دیکھنا
- جائز ہے۔ 179
- حدیث طیبہ: میں خلق میں تمام لوگوں سے اول ہوں
- اور بعثت میں سب سے آخر ہوں۔ 187
- دابۃ الارض کا بیان 197
- فصل قیامت کی علامات کے بیان میں 200
- تخت فرع، صق اور بعث کا بیان 203

- اس کا بیان کہ قیامت شریر لوگوں پر قائم ہوگی۔ 206 حدیث طیبہ: کہ جب تم کسی آدمی کی خلقت تبدیل
- سورہ قصص 213 ہونے کے بارے سنو تو اس کی تصدیق نہ کرو۔ 343
- مسئلہ: عمل عبادت پر اجرت لینا کیسا ہے؟ 233 حدیث طیبہ کہ میری امت جہتر فرقوں میں بٹ جائے
- مسئلہ: ریوڑ چرانے کے عوض نکاح کرنا کیسا ہے؟ 237 گی۔ 344
- مسئلہ: اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق میں روٹا کیسا 238 حدیث طیبہ:۔ اصبح من عبادی مومن و کافر
- ہے؟ 238 من قال مطرونا بفضل اللہ الحمد۔ 345
- حدیث طیبہ: الکبریاء ودانی کا بیان 246 اس کا بیان کہ جنت میں داخل محض اللہ تعالیٰ کے فضل
- حدیث طیبہ تین قسم کے افراد کیلئے دواجر ہوں گے۔ 255 کے ساتھ ہوگا نہ کہ الہام کے ساتھ۔ 352
- حضرت ابوطالب کی وفات کا بیان 257 حدیث طیبہ: فاما من مسلم یزید عن عو ض اخیہ
- اس کا بیان جو کبر کے باعث اپنا کپڑا زمین پر پھیلت 257 اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ اَنْ يُؤَدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ۔ 355
- کر چلے۔ 267 حدیث طیبہ:۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا کیا تم
- درج دوم سے فرحت محسوس کرنے کا بیان 269 راضی ہو؟ 360
- حدیث طیبہ:۔ پانچ چیزوں کو پانچ سے قبل قیمت 269 سورہ لقمان 363
- سمجھو۔ 269 مسئلہ:۔ مزامیر اور دیگر آلات موسیقی بنانا حرام ہے۔ 365
- جس کسی نے اپنے نفس کی طرف نہیں دیکھا وہ کامیاب 366 مسئلہ:۔ فقہاء کے نزدیک گانا بجانا حرام ہے۔ 366
- ہو گیا۔ 271 صوفیاء کا قول کہ غنا باعث حرج نہیں۔ 366
- سورہ عنکبوت 281 غنا کی حرمت و اباحت کا بیان 367
- فضیلت ذکر بیان 376 مسئلہ: کافر فقیر والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہوتا ہے۔ 376
- ان الصلوۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر کا بیان 305 مسئلہ:۔ غیر شرعی امور میں والدین کی اطاعت واجب
- توکل کا بیان 317 نہیں۔ دیگر مباح امور میں والدین کی اطاعت
- سورہ روم 323 واجب ہے۔ اگر والدین کثرت ذکر، زہد و ریاضت
- جنت میں سماع کا بیان 332 اور صالحین کی مصاحبت ترک کرنے کا حکم دیں تو کیا
- شیعہ و تحمید کے ثواب کا بیان 335 ان کی اطاعت واجب ہے؟ 376
- حدیث طیبہ کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ 342 درمیان اور تیز چال چلنے کا بیان 379
- حدیث طیبہ کہ تم میں سے ہر ایک تخلیق کے وقت 335 حدیث طیبہ:۔ ایمان کے دو نصف ہیں ایک نصف شکر
- چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں اپنی ماں کے پیٹ 335 ہے اور ایک نصف صبر ہے۔ 386
- میں رہتا ہے۔ 343 حدیث طیبہ:۔ پانچ چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

- 389 نہیں رکھتا۔ نمازوں کا تذکرہ
- 391 سورہ سجدہ مسئلہ: اگر متعدد نمازیں قضا ہو جائیں تو انہیں پڑھتے وقت اذان صرف پہلی نماز کیلئے کہی جائے گی اور اقامت ہر نماز کیلئے لیکن ہر نماز کیلئے اذان و اقامت
- 396 حدیث طیبہ: ملک الموت کسی کی مہرت کے معین وقت سے آگاہ نہیں ہوتا جب تک اسے حکم نہ دیا جائے۔
- 397 ملک الموت بندہ سوگن کے سامنے حسین صورت میں اور کافر کے سامنے قبیح صورت میں آتا ہے
- 397 انسانوں کے سوا دوسروں کی موت کیسے ہوتی ہے؟
- 399 قضا و قدر کا بیان اس کا بیان کہ تنجافی حنیوہم عن المضامع
- 402 سے مراد کون لوگ؟ ہیں، تہہ گزار یا دوسرے لوگ؟
- 405 حدیث طیبہ: میں نے اپنے صالحین بندوں کیلئے وہ کچھ تیار کیا ہے جسے کسی آئندہ نے دیکھا تک نہیں،
- 407 الحدیث۔
- 407 موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات کا بیان
- 411 سورہ المیزیل اور سورہ ملک کی فضیلت کا بیان
- 413 سورہ احزاب
- 417 غیر باپ کی طرف نسبت کرنے سے نہی کا بیان
- 418 متنبی اور اپنے غلام کو ہذا ابنی کہنے کا بیان
- 419 محبت رسول ﷺ کے وجوب اور آپ کے اوٹلی
- 419 بالبوئین ہونے کا بیان
- 422 حدیث طیبہ: میں خلقت میں سب لوگوں سے اول ہوں اور بخت میں سب سے آخر۔
- 423 غزوہ خندق کا تفصیلی ذکر
- 423 غزوہ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ کی قضا
- 435 نمازوں کا تذکرہ
- 436 مسئلہ: اگر متعدد نمازیں قضا ہو جائیں تو انہیں پڑھتے وقت اذان صرف پہلی نماز کیلئے کہی جائے گی اور اقامت ہر نماز کیلئے لیکن ہر نماز کیلئے اذان و اقامت
- 436 کہنا اولیٰ ہے۔
- 442 حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کو شرب پکارنے سے منع فرمایا۔
- 442 حضرت انس بن نضر، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے فضائل و مناقب کا بیان
- 448 غزوہ بنی قریظہ کا تفصیلی ذکر
- 451 مسئلہ: اجتہاد میں خطا ہونے کے سبب مجتہد پر گناہ نہیں
- 453 یہود کی جانب سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نبی ہونے کا اعتراف
- 455 مسئلہ: مال غنیمت کا مستحق وہ ہے جو جنگ میں ماضر ہوا اگرچہ مال محفوظ کرنے سے قبل فوت ہو گیا۔
- 464 مسئلہ: جو تورش جنگ میں شریک ہوں انہیں مال عطا کیا جائے گا لیکن باقاعدہ حصہ ان کے لئے مقرر نہیں ہوگا۔
- 464 مسئلہ: دو صغیر یا ایک صغیر اور کثیر غلام کے مابین تفریق جائز نہیں جبکہ ان کے درمیان قرابت قریبہ موجود ہو۔
- 466 مسئلہ: جس نے بیچ کے دوران مال اور بیٹے کو جدا جدا کر دیا وہ گنہگار ہوگا۔ کیا ایسی بیچ باطل ہوگی یا فاسد یا پھر نافذ ہو جائے گی؟
- 467 مسئلہ: اگر دونوں غلام بائع ہوں تو ان کے درمیان تفریق جائز ہے۔

- مسئلہ:- اگر ایک صغیر کے ساتھ رشتہ داروں کی جماعت ہو تو حکم؟
تفویض طلاق کے مسائل اور بیوی کیلئے مرد کے قول اختیار کا بیان
ازواج مطہرات، حضرت فاطمہ الزہراء، حضرت مریم اور حضرت آسیہ کے فضائل کا بیان
مسئلہ:- اجنبی مرد و عورت کیلئے باہم نرم لہجہ میں گفتگو کرنا جائز نہیں جس کے سبب وہ ایک دوسرے کی طرف مائل ہو جائیں۔ ان کے لئے کلام میں سنجیدہ لہجہ اپنانا مستحب ہے۔
حدیث طیبہ:- رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو اپنے خاوندوں کی اجازت کے بغیر کلام کرنے سے منع فرمایا ہے۔
اہل بیت کا بیان
مسئلہ:- مطلق امر و وجوب کیلئے ہوتا ہے۔
مسئلہ:- عالم اور دین میں فضیلت رکھنے والا علوی کا ہم کفو ہے۔
حیاء کا بیان
رسول اللہ ﷺ کے اسماء حسنیٰ اور آپ کے خاتم الانبیاء ہونے کا بیان
حدیث طیبہ: جب ملک الموت بندۂ مومن کی روح قبض کرنے کیلئے آتے ہیں تو کہتے ہیں تیرا رب تجھے سلام فرماتا ہے۔
مسئلہ:- اجنبیہ عورت کی طلاق کو نکاح پر معلق کرنے کا بیان اور اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف اور دلائل
مسئلہ:- مس کرنے سے قبل طلاق ہونے کی صورت میں عدت نہیں ہوتی۔
- مسئلہ:- جب ذی مرد و میرہ عورت کو طلاق دے اور وہ عدت کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں تو اس مطلقہ پر عدت نہیں ہوگی۔
جب مسلمان عورت دار الحرب سے دارالاسلام آجائے تو اس پر عدت نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ حاملہ نہ ہو۔
مسئلہ:- کیا لفظ ہبہ، بیع یا ان جیسے دیگر الفاظ کے ساتھ نکاح جائز ہوتا ہے؟
مسئلہ:- جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو اس کی طرف دیکھنا جائز ہے۔
حدیث طیبہ:- جو کوئی میری قبر کے پاس مجھ پر درود پاک پڑھتا ہے میں وہ خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔
مسئلہ:- حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنا فرض ہے۔ بعض نے کہا عمر میں ایک بار، بعض نے کہا ہر نماز کے آخری قعدہ میں اور بعض نے کہا جب بھی آپ ﷺ کا ذکر ہو۔
درود پاک کی فضیلت اور اس کی کیفیت کا بیان
حدیث طیبہ:- اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ابن آدم نے میری تکذیب کی اور مجھے سب و شتم کی۔
حدیث طیبہ:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم زمانے کو برا کہہ کر مجھے اذیت دیتا ہے۔
تصاویر کا بیان
حدیث طیبہ:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی اس نے مجھے جنگ کا پہنچ دیا۔
اس کا بیان کہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانا اللہ تعالیٰ کو ایذا دینا ہے اور اولیاء اللہ کو ایذا دینے کا حکم بھی اسی طرح ہے۔

مسئلہ:- جس نے رسول اللہ ﷺ کیلئے غلیظ زبان استعمال کی اس کا حکم

534

مسئلہ:- صحابہ کرام کی گستاخی حضور نبی کریم ﷺ کیلئے باعث اذیت ہے۔

535

حدیث طیبہ:- مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کی جان اور مال محفوظ رہیں۔

535

عورتوں کیلئے کام کی غرض سے باہر نکلنے کی اجازت کا بیان

536

ان چیزوں کا بیان جن کے ساتھ مومن علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کو اذیت دی گئی۔

540

زمین و آسمان اور پہاڑوں پر امانت پیش کرتے ہوئے ان کے اس کا انکار کرنے اور انسان کے اس امانت کو اٹھانے کا بیان، اس کے بارے علماء و صوفیاء کے اقوال

542

حدیث طیبہ: بنی آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جب وہ فاسد ہو جائے تو سارا بدن ہی فاسد ہو جاتا ہے۔

548

www.muhammadiyah.com

سورة الفرقان

﴿اٰیٰہا ۷۷﴾ ﴿سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ ۲۵﴾ ﴿مَرْکُوْعَاتُهَا ۶﴾

(سورة الفرقان مکی ہے اور اس کی ستر آیتیں اور چھ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عِبْدِہٖ لِیُبَيِّنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱

”بڑی (خیر و) برکت والا ہے۔ وہ جس نے امارا ہے الفرقان ۱۔ اپنے (محبوب) بندہ پر تاکہ وہ بت جائے سارے جہان والوں کو (غضب الہی سے) ڈرانے والا ہے۔“

۱۔ تَبٰرَکَ یہ ہر جگہ سے باب فاعل ہے۔ اور برکت کا معنی کثرت خیر ہے۔ یعنی تَکَاثُرٌ خَیْرٌ ۱۔ (ا) کا خیر بہت زیادہ ہے) اس حینہ سے اور مشتقات نہیں بن سکتے اور نہ ہی یہ حینہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے، ہر قسم کی برکت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس طرح حسن نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اپنی صفات اور افعال میں ہر چیز سے زائد اور بلند ہے۔ کیونکہ برکت زیادتی کے معنی کو مختصص ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک نے اس کا معنی تعظیم کیا ہے (۱)۔

۷۔ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ فرقان مصدر ہے۔ جب کوئی دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کر دے تو کہتے ہیں فَرَّقَ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ۔ قرآن کریم کا نام فرقان اس لیے ہے کہ یہ اپنی وضاحت سے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ اور اپنے اعجاز سے حق اور باطل کو جدا جدا کرنے والا ہے یا پھر فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ نزول کے اعتبار سے اس کے بعض اجزاء بعض سے جدا جدا ہیں۔ (یعنی قرآن

(۱) امام مالک اور شیخین نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی شام بن حکیم کو سورہ فرقان پڑھتے سنا۔ تو میں نے اسے ایسے کثیر الفاظ پر اس کی قرأت کرتے سنا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھا تھے۔ پس قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دیوچ لیتا لیکن میں نے مہر کیے رکھا لیکن جو نبی اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور پوچھا تجھے یہ سورت کس نے پڑھائی ہے جو ابھی میں نے تجھ سے سنی ہے۔ اس نے جواب دیا مجھے رسول اللہ ﷺ نے سورت پڑھائی ہے۔ تو میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ مجھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں پڑھائی تھی تو نے پڑھی ہے۔ چنانچہ میں اسے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گیا۔ وہاں جا کر عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اسے ایسے حروف پر سورہ فرقان پڑھتے سنا ہے جن پر آپ نے مجھے نہیں پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے شام! پڑھو۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی پڑھ کر سنائی جیسے میں نے اس سے سنی تھی۔ تو سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح ہے۔ اسی طرح یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا تم پڑھو چنانچہ میں نے ایسے ہی قرأت کی جیسے آپ نے مجھے پڑھائی تھی تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا یہ قرآن کریم سات قرأتوں (کیوں) پر نازل ہوا ہے۔ ان میں سے جو آسان لکھی گئی اس کے مطابق اسے پڑھو۔

کرم متفرق طور پر نازل ہوا اس لیے اسے فرقان کہا گیا) اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے قول بَیِّنًا لِّكَوْزَالِ القرآن پر مرتب کیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں خیر کثیر ہے اور اس لیے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت پر دلالت کرتا ہے۔
 دوسری علی نقیبہ ہے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ تاکہ وہ بندہ یا فرقان عام جن و انس کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔ اور رسالت کا کام ہونا آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور مذکورہ بمعنی منذر یا انداز ہے جیسے تکبیر بمعنی انکار ہے۔ یہ جملہ اگر اہل مکہ کے انکار کے محل میں ہے جو اس کا مخاطب ہیں حالانکہ صلہ کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ جملہ قوت دلیل کی وجہ سے صلہ معلوم کے قائل تھم رہے۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ
 فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَأَاهُ تَقْدِيرًا ۝

”وہ جس کے لئے حکومت ہے آسمانوں اور زمین کی۔ اور نہیں بنایا ہے اس نے کسی کو بیٹا اور نہیں اس کا کوئی شریک سلطنت میں۔ اور اس نے پیدا فرمایا ہے ہر چیز کو۔ جس اس نے مقرر کیا ہے ہر چیز کا ایک انداز ہے۔“

۱۔ یعنی اس کی سلطنت زمین و آسمان میں ہے۔ اس آیت میں اللہ ہی اسم موصول پہلے موصول سے بدل ہے۔ اور لِيَكُونَ کے قول سے بدل اور مبدل منہ کے درمیان فاصلہ جائز ہے۔ کیونکہ مبدل بمعنی موصول صلہ کے ساتھ اور صلہ کے معلقات میں سے اس کا قول لِيَكُونَ مبدل منہ کے لیے علت ہے۔ گویا مبدل منہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ موصول کو مرفوع بنا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے ہو مبتدا مقدر ہوگا۔ یا پھر موصول منصوب ہوگا۔ اس صورت میں اس سے پہلے اُغْنِيْ بِأَمْرِهِ فاعل مقدر ہوگا۔

۲۔ اور اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا جیسا کہ بیسیائیوں کا گمان ہے۔ اور نہ ہی اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے۔ جیسا کہ مجوسی اور بت پرست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے لیے مطلق سلطنت اور بادشاہی کو ثابت کیا ہے اور جو بھی اس میں قائم مقام (مقابل) ہو سکتا ہے اس کی نفی کر دی ہے۔ پھر اس کے بعد ان امور کا ذکر فرمایا جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

۳۔ یعنی اس نے ہر چیز کو اس میں ایک خاص اندازہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پیدا فرمایا مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کا مخصوص مواد سے معینہ اشکال و صورت پر پیدا کرنا وغیرہ۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ان خصائص اور افعال کے لیے مکمل طور پر بنایا اور تیار کیا جس کا اس نے اس لیے ارادہ فرمایا مثلاً انسان کو فہم و ادراک، نظر و فکر، متنوع منافع کے استنباط اور مختلف اعمال کی کوشش اور جدوجہد کے لیے تیار کرنا وغیرہ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک باقی رکھنے کے لیے اسے مقرر فرمایا۔ اور کبھی خلق کا اطلاق سبب اشتقاق کا لحاظ رکھے بغیر صرف ایجاد پر بھی ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ایجاد کیا اور اس کی ایجاد میں ایک اندازہ مقرر کیا تا کہ وہ مشابہت نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کے لیے عمر، عمل اور رزق کے اعتبار سے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اور یہ مقادیر (اندازے) اسی طرح جاری ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے بنائے۔ جب کلام تو حید اور نبوت کے اثبات کو شامل ہے تو اللہ تعالیٰ نے متعین کار کیا اور ان کے معبودان باطلہ کا نقص اور عیب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَ هُمْ يُخْلَقُونَ وَ لَا يَسْتَكُونُ

جیسے تو حید کا انکار کفر ہے۔ اس لیے کہ حقیقت تو حید صرف عقل سے سمجھی نہیں جاسکتی بلکہ اس کا ادراک شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا آپ فلاسفہ اور ان کی مثل لوگوں کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ الہیات میں بغیر غور و فکر کے کیسے کیسے کام کرتے رہے یہاں تک کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ صحیحین میں وفد عبدالقیس کے قصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا ”کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ وحدہ کے ساتھ ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟“ تو انہوں نے عرض کی اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔“ اللہ بیٹ (1)

یہ وہ قرآن جو محمد ﷺ نے کرائے۔ (وہ نہیں ہے) مگر جھوٹ جس سے کسی وجہ سے منہ پھیر لیا گیا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے جیسا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ نے اسے گھڑا ہے۔ اور محمد ﷺ کی قرآن گھڑنے پر ایک (دوسری قوم نے) مدد کی ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد عبید بن الحضر اشجشی الکاحن ہے۔ (2) یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبر، یسار اور عداس ہیں جو مکہ مکرمہ میں اہل کتاب کے غلام تھے۔ مشرکین کا گمان یہ تھا کہ محمد ﷺ ان سے قرآن اخذ کرتے ہیں۔

یعنی یہ بات کہنے والوں نے ظلم کیا ہے اس طرح کہ انہوں نے کلام مجر کے بارے میں کذب، من گھڑت اور یہود سے اخذ شدہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ (اور یہ سفید جھوٹ ہے) اس اعتبار سے کہ جنہا نے افتراء کی نسبت اس کی ذات کی طرف کی ہے جو اس سے بری ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اتھی اور بجاء دونوں مطلق فعل کے معنی میں بر۔ تو ہیں اور اس کے متعدی ہونے کے سبب یہ متعدی ہوتے ہیں (3) (لہذا ظلمنا اور زوراً مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں) اور یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہیں۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”فَقَدْ جَاءُوا عَلَيْنَا اَوْ ذُرًّا“

وَقَالُوا اَسَا طِيرُ الْاَوَّلِينَ اَكْتَتَبَ اَفْهَىٰ سُبُلَ عَلَيْهِ بَكَرًا وَّ اَوْحِيلًا ۝

”اور کفار نے کہا یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اس شخص نے لکھوا لیا ہے انہیں۔ پھر یہ پڑھ کر ٹائے جاتے ہیں اسے ہرج و مرج و شام (تا کہ ازبر ہو جائیں) لے“

۱۔ اس کا عطف ”قَالَ الْاَوَّلِينَ سَخَّرُوْا“ پر ہے۔ یعنی ان میں سے بعض نے کہا۔ اس سے مراد نضر بن حارث ہے کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان شخص میں سے ہے جو پہلے لوگوں نے لکھے ہیں مثلاً قصہ رسم اور اسفند پار وغیرہ۔ اور اسے محمد ﷺ نے جبر، یسار، عداس اور ان جیسے لوگوں سے لکھوا لیا ہے۔ پس یہ افسانے پڑھ کر ٹائے جاتے ہیں تا کہ وہ انہیں یاد کر لیں کیونکہ آپ تو امی ہیں، نہ لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی کتاب سے پڑھ سکتے ہیں۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اِنَّهٗ كَانَ عَفُوًّا رَّحِيْمًا ۝

”آپ فرمائیے اتارا ہے اس کو اس (خدا) نے جو جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے رازوں کو واقعی وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ یہ جملہ مستافہ ہے کیونکہ یہ مَاذَا أَقُولُ لَهُمْ کے جواب میں ہے۔ یعنی آپ انہیں ان کی بات رد کرتے ہوئے فرمائیے سو اہل اس طرح نہیں جیسے تم نے کہا ہے بلکہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو زمین و آسمان کے رازوں کو جانتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ان کے بلغاء کو اپنا معارض لانے سے عاجز کر دینا اور اس کا ایسے علوم پر مشتمل ہونا جنہیں کوئی نہیں جانتا مگر وہی اللہ تعالیٰ جو رازوں اور خفیہ چیزوں کو جاننے والا ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تم یہ کیسے فصلہ کرتے ہو۔ یہ حقد مین یا متاخرین میں سے کسی بشر کا کلام ہے۔ اس لیے وہ تمہیں ان باتوں پر جلدی سزا نہیں دیتا جو تم کہتے ہو حالانکہ وہ اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور تم اس سزا کے مستحق بھی ہو۔

وَقَالُوا هَذَا الرَّسُولُ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَشْفِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرٌ ۝

”اور کفار بولے کیا ہوا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں ۱، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا ۲۔“

۱۔ اس کا عطف ”قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ“ پر ہے۔ یعنی انہوں نے نبوت کا انکار کرتے ہوئے اپنے استدلال میں یہ کہا ”ہاں! ہذا الرَّسُولُ“ کیا ہے یہ جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس میں حقارت اور تسخر پایا جا رہا ہے۔ یہ ایسے ہی کھانا کھاتا ہے جیسے ہم۔ یہ جملہ مشار الیہ سے حال ہے اور اس میں حال معنی اشارہ ہے۔ اور وہ ہماری طرح بازاروں میں چلتا ہے۔ یعنی اگر یہ نبی ہوتا تو یقیناً دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتا۔ لیکن اس طرح نہیں ہے۔ لہذا یہ نبی بھی نہیں ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے تم فرشتے تو نہیں ہو کیونکہ تم کھاتے ہو اور فرشتے تو نہیں کھاتا۔ اور تم بادشاہ بھی نہیں ہو کہ وہ بازار میں نہیں چلتا، حالانکہ تم چلتے ہو اور کاروبار بھی کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ کلام فاسد ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرشتہ ہونے یا بادشاہ (سلطان) ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ کہا تھا اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَيَّ (کہ میں بشری ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔) اور آپ کا دعویٰ نبوت کھانا کھانے اور بازار میں چلنے کے معنائی نہیں ہے کیونکہ یہ اس بشریت کے تقاضے ہیں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ بشری ہیں کیونکہ افاضہ اور استفادہ کے لیے ہم جنس ہونا شرط ہے۔ رب کو ہم الارشاد فرماتے ہیں لَوْ كُنَّا فِي الْأَنْهَارِ مُلْكُكُمُ يَسْتَفْتُونَ مَعْشَرُ مَعْشَرٍ لِّتَقُولَ أَلَا تَعْلَمُونَ (اگر زمین پر ملائکہ ہوتے اور زمین پر اطمینان کے ساتھ چلتے پھرتے تو پھر ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی رسول اتارتے) چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی پیغمبر ہونا چاہیے۔

۲۔ کیوں نہ اس کی طرف کوئی فرشتہ اتارا جاتا، کہ ہم اسے دیکھ سکتے ”فَيَكُونُ“ یہ لَوْلَا معنی خللا کا جواب ہے۔ اور یہ فاء کے بعد اُن مقدمہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ تو ہم فرشتے کی تصدیق کے سبب اس کی سچائی کو جان لیتے۔ لولا اپنے جواب کے ساتھ مل کر سابقہ جملے سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی کیا ہوا ہے اس رسول کو جو بشر ہے کہ یہ ذاتی طور پر بھی قوی بادشاہ نہیں اور نہ ہی مذکورہ تین امور میں سے کسی سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس کی طرف فرشتہ اتارا جائے۔

أَدِينُنَّ لِي ۚ كُنَّا أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِنَّا تَسْتَعْتُونَ

إِلَّا سَجَلًا مَسْحُورًا ①

”یا ایہا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف خزانہ یا (کم از کم) اس کا ایک باغ ہی ہوتا، کھایا کرتا اس (کی آمدنی) سے لے اور ان ظالموں نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر ایک ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔“

اس کی طرف آسمان سے اتارا جاتا کوئی خزانہ جسے یہ خرچ کرتا اور اسے طلب معاش کے لیے بازار میں چلنے پھرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ جملہ جنت کی صفت ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ناٹکلی کی بجائے صیغہ جمع مشکلم ناٹکلی نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ انھوں نے تینوں چیزوں کا ذکر علی سبیل الشتر ل کیا ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اگر یہ رسول ہوتا تو پھر یہ فرشتہ ہوتا، اور اگر یہ خود فرشتہ نہیں، تو پھر اس کے ساتھ فرشتہ ہوتا جو اس کی تصدیق کرتا اور اگر اس طرح بھی نہیں تو پھر اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا، اور اگر اس طرح بھی نہیں تو پھر کم از کم اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جیسا کہ سرداروں اور خوشحال لوگوں کے ہوتے ہیں تو یہ اس کے منافع کے سبب خوشحال زندگی گزارتا۔

اسے یہاں ضمیر کی جگہ پر ظالمون ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان کے خلاف ان باتوں میں ظلم ثابت ہو جائے جو انہوں نے نہیں۔ اے مسلمانو! تم محمد ﷺ کی پیروی کرنے کی صورت میں اتباع نہیں کر رہے ہو۔ مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔ یعنی جادو اس کی عقل پر غالب آ گیا ہے۔ فسْخُوْرٌ کا ایک معنی مَخْذُوْع (جس کے ساتھ دھوکہ کھایا جائے) کیا گیا ہے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے فسْخُوْرٌ وہ آدمی ہے جسے حق سے پھیر دیا جائے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے۔ ایسا آدمی جس پر جادو کیا گیا ہو۔ اور یہ بشر بیکھا کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول بمعنی قائل ہے۔ یعنی جادو کرنے والا۔

اَنْظُرْ كَيْفَ صَرَبُوا لَكَ اَلَمْثَالَ فَصَبُّوا اَفَلَا يَسْتَظِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ①

”ملاحظہ تو کیجئے کہ بیان کرتے ہیں آپ کے متعلق طرح طرح کی مثالیں سو وہ (اس بے ادبی کے باعث) گمراہ ہو گئے۔“

اے محمد ﷺ! ملاحظہ تو کیجئے اور کَيْفَ صَرَبُوا لَكَ اَلَمْثَالَ میں کَيْفَ طرف ہے اور صَرَبُوا کے متعلق ہے۔ اور یہ مقدم اس لیے ہے کہ صدر کا کام کو متضمن ہے۔ اور مکمل جملہ بتاویں مفرد ہو کر اَنْظُرْ فعل کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے مثالیں بیان کرنے کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ یعنی انہوں نے آپ کو بہتان تراشنے والوں اور قصے بیان کرنے والوں کی مثل بنادیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کے بارے افراء اور قصص لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آپ کو ان لوگوں کی مثل قرار دیا جن پر جادو کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مثل جو فرشتہ ہونے یا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے بارے کھانے اور بازار میں چلنے پھرنے کے محال ہونے کے بارے فیصلہ کیا۔ اور ایسی چیزوں کو آپ کے لیے لازم قرار دیا جو انبیاء اور سلاطین کے لوازمات میں سے ہیں مثلاً خزانہ اور اندر باغ وغیرہ۔ فَصَبُّوا کا عطف صَرَبُوا پر ہے، یعنی انہوں نے کیسے مثالیں بیان کیں اور وہ کیسے اس راستے سے ہٹ گئے جو حق تک پہنچانے والا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص پہنچانے کے سبب آپ کی نبوت کا عرفان ملتا ہے۔ اس طرح کہ نبی بشر اور معصوم ہوتا ہے اور اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ اور وہ اس راستے سے گمراہ ہو گئے جو ان معجزات کے سبب نبی اور متنبی کے درمیان فرق کی معرفت عطا کرتا ہے، جو اس نبی کی نبوت پر دال ہوتے ہیں۔

آپ کے پاس وہ رشددہدایت کی طرف راہ نہیں پاسکتے۔ اس کا عطف فُضِّلُوا پر ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے لیے ایک مثال میں بیان کی ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ لہذا وہ آپ کی نبوت میں عیب نکالنے کی راہ نہیں پاتے۔ کیونکہ متناقض کلام ساقیہ ۱۱۱ متبر ۱۱۱ ہے۔ واللہ اعلم۔

تَبَارَكَ الَّذِي إِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذَلِكَ جَنَّتْ نَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ وَيَجْعَلُ لَكَ قُصُورًا ۝

”بڑی (خیر و) برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو بنادے آپ کے لیے بہتر اس سے (یعنی ایسے) باغات رواں ہوں جن کے نیچے نہریں اور بنادے آپ کے لیے بڑے بڑے محلات۔“

۱۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت شیخہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ کہا میں کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو زمین کی چابیاں اور اس کے خزانے عطا فرما دیں اور اس طرح کہتا ہمارے پاس آخرت میں کسی چیز کو ہم نہیں کر سگے گا۔ اور اگر آپ چاہیں تو ہم انہیں آخرت میں آپ کے لیے جمع کر دوں (۱)۔ تو اس پر آپ ﷺ نے عرض کی نہیں بلکہ دونوں کو آخرت میں میرے لیے جمع فرمادے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ بڑی خیر و برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو دنیا میں آپ کے لیے بنادے اس سے بہتر، جس خزانے اور باغ کے بارے انہوں نے کہا ہے۔ لیکن اس نے اسے آخرت کے لیے مؤخر کر دیا ہے کیونکہ یہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اس میں حیرا جعلی کا مفعول اول ہے اور لک مفعول ثانی ہے۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بازاروں میں چلنے اور کسب معاش تلاش کرنے سے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس خیر کی وضاحت اپنے اس قول سے فرمائی ”جَنَّتْ“ عجباً سے بدل ہے۔

۲۔ یہ جنت کی صفت ہے۔ اس کا عطف جَعَلَ پر ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر، اور عامر نے ابو بکر کی روایت کے مطابق اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور ابقیہ نے جزم کے ساتھ۔ کیونکہ شرط اُرْفَعُ ماضی ہو تو اس کی جزاء میں جزم اور رفع دونوں پڑھنا جائز ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں رفع استیناف کے لیے ہو کیونکہ یہ ان نعمتوں کا وعدہ ہے جو آخرت میں آپ ﷺ کے لیے ہوں گی۔ یعنی مضبوط اور پختہ محلات۔ عرب میں ہر پختہ اور مضبوط گھر کو قصر (محل) کہا جاتا ہے۔ امام احمدؓ اور ترمذیؓ نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”غَوْضُ عَلِيٍّ رَبِّيْ اَنْ يُّجْعَلَ لِيْ نَظْحَاءٌ مَّكَهَ دَهْنًا فَقُلْتُ لَا يَدْرِي وَلَكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَخْلُوْهُ يَوْمًا“ (۲) اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔ (کہ میرے رب نے مجھے فرمایا کہ وہ میرے لیے لٹھا، مد کو سوتا بنادے تو میں نے عرض کی اسے میرے پروردگار نہیں، بلکہ میں تو ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا) اور امام بغوی نے ایک روایت میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے تین دن کا ذکر فرمایا کہ جب میں بھوکا ہوں گا تو میں تیری بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو میں تیری حمد اور شکر ادا کروں گا۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو سونے سے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلیں۔ میرے پاس ایک فرشتہ آیا جس کی عفت و پاکدامنی کعبہ کے مساوی ہے۔ تو اس نے آکر کہا کہ آپ کا رب

آپ کو سلام فرماتا ہے۔ اور ساتھ ہی فرما رہا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو نبی عبد بنیں اور اگر چاہیں تو نبی ملک (بادشاہ) بنیں۔ تو میں نے جبرئیل امین کی طرف دیکھا تو اس نے اشارہ کیا کہ اپنے ٹیس کو جھکا دو۔ لہذا میں نے کہا میں نبی عبد بننا پسند کرتا ہوں۔ تو ام المومنین اور ادرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بھی یہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے میں ایسے کھاؤں گا جیسے غلام کھاتے ہیں اور میں ایسے بیٹھوں گا جیسے غلام بیٹھتے ہیں۔ (1)

بَلْ كَذَّبُوا بِالْسَّاعَةِ ۖ وَاعْتَدُوا الْمُنْكَدَّ بِالْسَّاعَةِ سَعِيرًا ۝

”بلکہ یہ تو جھٹلاتے ہیں قیامت کو۔ اور ہم نے تیار کر رکھی ہے ان کے لیے جو جھٹلاتے ہیں قیامت کو بھڑکنے والی آگ۔“

۱۔ اس کا عطف فالو اپ ہے۔ یعنی انہوں نے یہ کہا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز قول کیا۔ یا یہ اس کام سے متصل ہے جو قالوا کے بعد آ رہی ہے۔ یعنی بلکہ ان کی نظریں دنیوی ساز و سامان پر محصور ہو گئیں اور وہ یہ گمان کرنے لگے کہ بیشک عزت و کرامت، مال و متاع کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور انہوں نے آپ کو قنفر و افلاک کا طعن دیا اور ایسی چیزوں کے ساتھ ملعون کرنے کا حلیہ کیا جو بالکل فاسد اور لاعینی ہیں۔ یا پھر معنی اس طرح ہے۔ بلکہ انہوں نے تو قیامت کو جھٹلا دیا تو وہ اس جواب کی طرف کیسے متوجہ ہوں گے۔ اور وہ آپ کے بارے ان چیزوں کے متعلق کیسے تھدیق کریں گے جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آخرت میں کیا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کا آپ کو جھٹلانا تعجب کا باعث نہیں کیونکہ یہ (قیامت کو جھٹلانا) اس کی نسبت زیادہ تعجب انگیز ہے۔

۲۔ اس کا عطف کذبوا پر ہے۔ یعنی ایسی آگ جو سخت بھڑکنے والی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبعہ جہنم کا نام ہے۔ اور یہ طرف مکان ہونے کے اعتبار سے منصرف ہے۔

إِذَا رَأَوْهُمْ مِنْ مَكَانٍ يَبْعِدُ سَمِعُوا أَلْهَاتٍ عِظًا وَرَفِيقًا ۝

”جب یہ آگ دیکھے گی انہیں ۱۔ دور سے تو وہ نہیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا ۲۔“

۱۔ جب آگ کفار کو دیکھے گی۔ بعض محققین نے آگ کی طرف رویت کی نسبت کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ امام بغوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”مَنْ كَذَّبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدًا بَيْنَ عَذَابِي ۖ وَهَلْ لَهَا مِنْ عَذَابِيْنَ قَالِ أَلَمْ نَسْمَعْ قَوْلَ اللَّهِ تَعَالَى إِذَا رَأَوْهُمْ مِنْ مَكَانٍ يَبْعِدُ“ (جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ کی آنکھوں کے درمیان بنالے۔ صحابہ نے عرض کی کیا آگ کی آنکھیں ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا ”جب یہ آگ انہیں دور سے دیکھے گی“۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ نسبت مجازی ہے حقیقت یہاں مضاف محذوف ہے یعنی (جب آگ کے دروغے نہیں دیکھیں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ جب آگ ایسی جگہ ہوگی جہاں سے وہ دیکھ سکے گی۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ان میں سے دو کی آگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے گی (2) یعنی وہ ایسی جگہ پر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوں گے کہ وہاں سے ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔

۲۔ کلمی نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایک سو سال کی مسافت اور ایک قول یہ ہے۔ کہ پانچ سو سال کی مسافت سے وہ آگ انہیں دیکھ

لے گی (1)۔ کفار آگ کے جوش مارنے کی آواز سن لیں گے۔ تغیط سے مراد آگ کے کھولے اور جوش مارنے کی آواز ہے جو کہ غیظ و غضب والے آدمی کی بڑبڑاہٹ کے مشابہ ہوگی۔ اور ذُفیر اسے مراد وہ آواز ہے جو پیٹ سے سنا کی دیتی ہے۔ یہ جملہ شرطیہ معیروں کی صفت ہے۔ اور زَنْهَمُکُمْ خیر اس لیے ہے کہ اس سے مراد آگ (النار) یا جہنم ہے۔

وَإِذَا أَلْفَوْا مَكَانًا صَبِيحًا مَّقْرَنِ زَيْنٍ دَعَوْا هَٰؤُلَاءِ ثُبُورًا ﴿٥﴾

”اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے۔ زنجیروں میں جکڑ کر توپکاریں گے وہاں موت کو بل۔“

1۔ اس کا عطف پہلے جملہ شرطیہ پر ہے۔ مِنْہَا یعنی جہنم سے یہ اپنے مابعد سے حال ہے۔ ”مکان“ یہ اَلْفَوْا کی طرف ہے۔ ”صَبِيحًا“ عذاب میں زیادتی کے لیے تنگ جگہ سے۔ کیونکہ مشقت اور تکلیف تنگی کے ساتھ ہوتی ہے اور راحت و اطمینان وسعت اور کشادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے اسے ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یا مشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم نے یحییٰ بن اسید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے دیوار میں کیل گاڑ دیا جاتا ہے (2)۔ آیت کے بارے میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے نیزے کے پتھیلے حصے کا لوہا اس میں گھسا ہوتا ہے (3)۔

ابن مبارکؒ نے قتادہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کہا کرتے تھے جہنم کافروں پر اس طرح تنگ ہو جائے گی جیسا کہ نیزے کا لوہا اس پر تنگ ہوتا ہے (4)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور سیبانی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب انہیں آگ میں پھینکا جائے گا جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے تو انہیں لوہے کے صندوقوں میں ڈالا جائے گا جن میں لوہے کی سختیں ہوں گی۔ پھر ان صندوقوں کو لوہے کے اور صندوقوں میں رکھا جائے گا۔ پھر انہیں جہنم کے نچلے حصے میں پھینک دیا جائے گا۔ پس ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو بھی عذاب دیا جا رہا ہے (5)۔ ابو نعیمؒ اور سیبانی نے سوید بن غفلہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

2۔ مَقْرَنِ اَلْفَوْا کی تفسیر مرفوع سے حال ہے، یعنی ان کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ زنجیروں کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں شیاطین کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور دَعَوْا هَٰؤُلَاءِ ثُبُورًا لک فیضیٰ کی جڑا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ثُبُور سے مراد اوہل (ہلاکت) ہے۔ اور ضخاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہلاکت ہے (6)۔ امام احمد، بزار، ابن ابی حاتم اور سیبانی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے انہیں کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ پس وہ اسے اپنے ابرؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھمٹے گا اور اس کے بعد اس کی ذریت (اولاد) کو وہ لباس پہنایا جائے گا اور اس وقت وہ پکارے گا ہائے کی ہلاکت اور پھر وہ کہیں گے ہائے وہ برباد اور ہلاک ہو گئے یہاں تک کہ وہ آگ پر کھڑے رہیں گے۔ (7)

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَلَا جَدًّا وَلَا دَعْوًا ثُبُورًا لِّلْثُبُورِ ﴿٦﴾

- 1۔ تفسیر بغوی زیر آیت 4۔ 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 117 (العلینیہ) 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت 4۔ 5۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 4 صفحہ 176 (الحادیۃ) 6۔ تفسیر بغوی زیر آیت 4۔ 7۔ مسند امام احمد، جلد 3 صفحہ 152 (مسار)

”کہا جائے گا بد بختو! نہ مانگو آج ایک موت بلکہ مانگو بہت سی موتیں!“

یہ جملہ مستانہ ہے۔ گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ انہیں کیا کہا جائے گا جب وہ بلا تک کو پکاریں گے؟ یعنی تمہاری بلا تک اس سے زیادہ ہے کہ تم اسے ایک مرتبہ پکارو۔ لہذا تم کثیر بلا تکوں کو بار بار پکارو اور اس لیے بھی کہ تمہارے عذاب کی کثیر انواع ہیں اور ان میں سے ہر قسم اپنی شدت کے باعث بلا تک ہے۔ یا پھر اس اعتبار سے کثیر بلا تکیں ہیں کہ وہ بلا تک متجدد ہوتی رہے گی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **كُلَّمَا نَفِثَتْ جُنُودُهُمْ بِئَاتِنَهُمْ جُنُودًا غَيْرُهَا لِيَهْلِكَ ذُو الْقُرْآنِ** (جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کی (جلی ہوئی) کھالیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔) یا پھر اس لیے کہ وہ قسم نہیں ہوگی، لہذا بلا تک ہر وقت بدتر اور بے گنی۔

قُلْ أَذِلَّكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَاصِيَةً ۝۱۰

”ان سے پوچھئے (ذرا تازہ) یہ بھڑکتی ہوئی آگ بہتر ہے یا دائمی جنت۔ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے۔“

گی یہ جنت ان کے اعمال کا صلہ اور (ان کی زندگی کا) انجام ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”قل“ اے محمد! ﷺ ان سے پوچھئے۔ یہ جملہ مستانہ ہے۔ کیا وہ جو میں نے تمہارے لیے جہنم اور اس کے باسیوں کی صفت ذکر کی ہے۔ یا کیا وہ جزاء اور باغ جو دیا میں ہے ہمیشہ کی جنت سے بہتر ہے یا ہمیشہ کی جنت اس سے بہتر ہے۔ یہ استفہام کفار کو زبردستی کے لیے ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کو پختہ کرنے کے لیے ہے اور خلد کی طرف جنت کی اضافت مدح کے لیے ہے۔ یا اس کے دائمی ہونے پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر اسے دنیا کے فاقوں سے ممتاز کرنے کے لیے ہے۔

۲۔ اس میں اسم موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ اور متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور تکذیب سے بچتے ہیں اور اس معنی پر دلالت اس طرح ہوتی ہے کہ ان کا ذکر کفار کے مقابلہ میں ہے ورنہ ہر مومن کی جزاء جنت ہوگی۔

۳۔ یہ جنت ان کے لیے علم الہی میں ہے یا لوح محفوظ میں لکھا ہے یا اب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کے تحقق کا وعدہ کیا ہے وہ ایسے ہی ہے گویا واقع ہو چکا ہے۔ اور یہ ان کے اعمال کا صلہ اور انجام ہے جس کی طرف وہ لوٹ رہے ہیں۔ اس میں توہین تکبر تعظیم کے لیے ہے۔ اور جزاء و مصیبت دونوں کائنات کی ضمیر مرفوع سے حال ہیں۔ یا اس کے لیے دوسری خبر ہے اور کائنات لہم کا جملہ وعدے کے مفعول مقدر سے حال ہے۔ لہذا تقدیر عبارت ہوگی **جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ** ایٹھا وقد کائنات لہم جزاء و مصیبت آیا یہ جملہ الْمُتَّقُونَ سے حال ہے اور اس میں رابطہ لہم ضمیر ہے۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خُلْدٍ يَبِينُ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدٌ مَّسْئُولًا ۝۱۱

”ان کے لیے اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے وہاں ہمیشہ رہیں گے ۱۔ آپ کے رب کے وعدہ وعدہ ہے، جس کا ایفاء لازم ہے۔“

۱۔ ان کے لیے جنت میں وہی (نعمت) ہوگی۔ اس میں ضمیر مائد محذوف ہے، یعنی ”فما يشاءون“ **وَلَهُ مِنَ الْعِجَمِ** جس نعمت کی وہ خواہش کریں گے۔ یعنی جو نعمت ان کے رتبہ اور درجہ کے مناسب ہوگی۔ کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ناقص صرف خواہش کرنے سے اس نعمت کو نہیں پاسکتا جسے کامل پاسکتا ہے۔ اور اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ تمام مردوں صرف جنت میں ہی حاصل ہوں گی۔ خلدین یہ ان

کی ضرورتوں میں سے کسی ایک سے حال ہے اور سخا کی ضمیر صائیغاً ذوق کی طرف لوٹ رہی ہے۔

یعنی جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں علی کا کلمہ وجوب کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی اس کی وضاحت کے لیے کہ وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس پر پورا کرنا لازم ہے۔ کیونکہ موعود کے ساتھ ارادے کا تعلق اس وعدہ سے پہلے ہے جو پورا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اور یہ اختیار کا ثبوت ہے جو پورا ہوگا اس طرح کہ وہ پوچھے گا اور طلب کرے گا۔ یا ایسا وعدہ ہے جس کے بارے سوال کیا جائے گا یعنی لوگ اپنی دعاؤں میں اس کے بارے سوال کریں گے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا قَرَارًا وَجْهًا لِّكَ يَا اِلهَا عَلٰی مَرْسَلِکَ“ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں وہ نعمت عطا فرما جس کا تو نے ہمارے لیے اپنے رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ کی طرف سے اس قول کے ساتھ سوال کیا گیا ہے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا قَرَارًا وَجْهًا لِّكَ يَا اِلهَا عَلٰی مَرْسَلِکَ“ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں اس جنت عدن میں داخل فرما دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ (1)

وَيَوْمَ يَضْرِبُہُمْ وَمَا یَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فِیْ قَوْلٍ ؕ اَنْتُمْ اَصْلَلْتُمْ عِبَادِیْ
ہَؤُلَاءِ اَمْ هُمْ صَلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۱﴾

”اور جس روز (محشر میں) اللہ انہیں اکٹھا کرے گا اور ان (باطل خداؤں) کو جنہیں یہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا تو اللہ پوچھے گا (کہ معبودوں سے) کیا تم نے گمراہ کیا میرے ان بندوں کو یا وہ خود ہی سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے۔“

یہ قائلو السبحانک کے متعلق ہے اور قائلو اسبحا لک کا جملہ اپنے تعلقات کے ساتھ مل کر وَاجْعَلْنَا قَرَارًا وَجْهًا لِّكَ يَا اِلهَا عَلٰی مَرْسَلِکَ پر معطوف ہے۔ ابن کثیر، ابو جعفر، یعقوب اور رفص نے صیغہ غائب ہونے کی بناء پر اسے یاد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تعظیم اور تکلم کی بناء پر اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر وہ معبود جس کی عبادت باطل طریقہ سے کی جائے، چاہے وہ عاقل ہو یا غیر عاقل۔ کیونکہ اصح قول کے مطابق ما کا لفظ ان دونوں قسموں کو شامل ہوتا ہے۔ اور محابہ نے کہا ہے یعنی ملائکہ، جن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیز علیہ السلام (2)۔ (جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں) یہاں انہیں سوال وجواب کے قرینے سے خاص کیا گیا ہے۔ اور عمرہ، ضحاک اور کلبی نے کہا ہے یعنی وہ بت، جن کی وہ عبادت کرتے ہیں (3)۔ کیونکہ اس میں ما کا کلمہ غیر ذوی العقول کے لیے ہے۔ اور اس قول کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں حیات عطا فرمائے گا اور ان سے کلام کرے گا تو وہ بھی کلام کریں گے جیسا کہ جوارح (اعضاء) اور امکنہ (جنگلیں) وغیرہ گفتگو کریں گی۔ تو اللہ تعالیٰ معبودان باطلہ سے کہے گا۔ فبقول کا عطف یخشرو پر ہے۔ ابن عامر نے اسے تکلم اور تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صیغہ غیب کی بناء پر یا سے پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو کہے گا۔

یعنی کیا تم نے انہیں اپنی عبادت کی طرف دعوت دے کر انہیں گمراہ کیا۔ یا وہ خود اپنی صحیح نظر و فکر میں غفل ڈالنے اور فصیح و بلیغ نصیحت کرنے والے راہنما سے اعراض کرنے کے سبب حق کی پہچان سے گمراہ ہو گئے۔ یہ سوال ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اور عبادت کرنے والوں کو رولانے اور سوا کرنے کے لیے ہے۔ اور اصل عبارت ؕ اَصْلَلْتُمْ اَمْ صَلُّوا (کیا تم نے گمراہ کیا یا وہ گمراہ ہو گئے)؟ ترتیب

تکلم کو بدلا گیا تاکہ فعل حرف استفہام کے قریب ہو کیونکہ فعل ہی مقصود ہے نہ کہ نفس سوال جو کہ فعل کے قرب کے سبب سوال سے ظاہر ہے تو یہ اس لیے ہے کہ یہ حکم قطعی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ورنہ عتاب متوجہ نہ ہوتا۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يُخَيَّلُ لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ اَوْلِيَاءَ وَلٰكِنْ
مَتَّعْتَهُمْ وَاٰبَاءَهُمْ حَتّٰى نَسُوَ الَّذِيْ كَرَّمْتَ وَكَانُوا قَوْمًا مُّوْمِنًا ۝۱۱

”وہ کہیں گے تو پاک ہے ہر عیب سے بل ہمیں یہ بات زیادہ تھی کہ ہم بناتے تیرے سوا کسی غیر کو دوست بل لیکن تو نے آرام و آسائش عطا کی انہیں اور ان کے آباء کو یہاں تک کہ انہوں نے بھلا دیا تیری یاد کو اور (یوں) وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے“

بل یہاں مستقبل کے لیے مینہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا واقع ہوتا یقینی ہے۔ وہ یہ قول تعجب کرتے ہوئے کہیں گے کیونکہ بات ان کی عصمت کے بارے میں تھی اگر وہ ملائکہ یا انبیاء ہوئے، یا وہ یہ قول تعجب گمراہ کرنے کی قدرت نہ رکھنے کے سبب کہیں گے اگر وہ جنادات یا ان کے علاوہ دوسرے ہوئے تو بل یا پھر اس بات کا احساس دلانے کے لیے وہ یہ کہیں گے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کے ساتھ پہلے ہی موسوم کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هُمْ يَدْعُوْنَ لَا يُعْبَدُ سِوَايَ (ہر شئی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے) تو اس کے بندوں کو گمراہ کرنا کیسے ان کے لائق ہو سکتا ہے۔ یا پھر وہ یہ قول تعجب اللہ تعالیٰ کی کسی بھی شریک سے تنزیہ اور پاکی بیان کرنے کے لیے کریں گے۔

بل مَا كَانَ يُخَيَّلُ لَنَا میں یخیی کا جملہ مکان کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ اَوْلِيَاءَ میں زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی ہمارے لیے یہ صحیح تھیں ہے کہ ہم تیرے بغیر کسی کو عصمت اور عدم قدرت کے سبب والی بنائیں تو پھر یہ ہمارے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم دوسروں کو یہ دعوت دیں کہ تیرے سوا کسی اور کو ولی بنائیں۔ یہ جواب انبیاء، ملائکہ اور جنادات کی طرف سے تو صحیح ہے۔ لیکن جن و انس میں سے جن شیاطین نے الوہیت باطلہ کا دھوکا کیا ہے۔ یہ جواب ان کی طرف سے بھی ہوگا جیسا کہ ان کا قول وَاللّٰهُ يَرْسِطُ مَا لَكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ (قسم بخدا اے ہمارے پروردگار! ہم شرک نہیں تھے) اور شیطان کا قول لَمَّا فَصَّيْتُ اٰمُرًا اِنَّ اللّٰهَ وَرَعَدَهُ الْبَاقِیُّ وَوَعَدَهُمْ فَلَا ظِلْمَ لَّاهُمْ وَمَا كَانَ لِيْ عَلَيْهِمْ مِنْ مُّطْلِقٍ اِلَّا اَنَّهُۥ جَبَّ وُقَعَلَ وَوَقَعَا مَا جَبَّ اَوْ يَسْتَفْهِمُ اَوْ يَكْتُمُ اَوْ يَخْتَلِفُ اَوْ يَحْجُبُ اَوْ يَكْنُزُ a

و قدرت حاصل نہ تھی“

بل لیکن تو نے انہیں اور ان کے آباء کو لمبی عمر، رحمت اور مختلف قسم کی نعمتوں کے ساتھ آرام و آسائش عطا کیا تو وہ شہوات میں غرق ہو گئے۔ اس کا عطف مفعولہم پر ہے۔ یعنی حتیٰ کہ وہ تیرے ذکر سے غافل ہو گئے۔ اور تیری نعمتوں کو یاد کرنے اور تیری ان آیات میں تدبر کرنے سے غافل ہو گئے۔ جنہیں اس پر دلالت کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے اور تیرا محتاج ہونے سے غافل ہو گئے۔ یا پھر انہوں نے نصیحت اور قرآن پر ایمان لانے کو ترک کر دیا۔ پس اس میں ضلال اور گمراہی کی نسبت اس حیثیت سے ان کی طرف ہے کہ یہ ان کا کسب ہے۔ اور جو نسبت اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کی طرف گمراہی کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس تخلیق نے انہیں اس پر براہینیت کیا ہے۔ لہذا یہ آیت معتزلہ کے خلاف ہماری دلیل ہے نہ کہ ہمارے خلاف ان کی۔ اور وہ تیرے

فیصلے کے مطابق تباہ و برباد قوم ہو گئے۔ کانوا کا عطف نسوآ پر ہے۔ اس میں بوز مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں واحد اور جمع مساوی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بناؤں کی جمع ہے جیسا کہ غالباً جمع غوفہ ہے۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ بِمَا تَقُولُونَ ۚ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَظْلِمِ
وَسْنَكُمْ نُنْزِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ۝۱۹

”(اے کفار!) تمہارے معبودوں نے تمہیں جھٹلادیا۔ جو تم کہتے ہو۔ پس اب تم اپنے سے عذاب کو پھیر سکتے ہو اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی۔ اور جس نے ظلم کیا تم میں سے تو ہم پکھا دیں گے اسے عذاب بڑا ہے۔“

یہ دنیا میں شرک کرنے والوں کو خطاب ہے، یعنی مغربی آخرت میں تمہیں تمہارا وہ الہ جھٹلادیں گے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اس کے باطن میں واقع ہونے کی وجہ سے معینہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے ”إِذَا الشَّمَاءُ انشَقَّتْ“ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہاں قول مقدر ہو، یعنی ہم اس وقت مشرکین کو کہیں گے تحقیق معبودوں نے تمہیں جھٹلادیا ہے۔

یہاں تَقُولُونَ میں بلوغنی فہی ہے۔ یعنی تم اس قول میں جھوٹے ہوئے کہ بے شک وہ معبود ہیں یا انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہاں تَقُولُونَ کذب پر مضمون ہے بل اشتغال ہو یعنی ”تَكْذِبُوا قَوْلُكُمْ“ (انہوں نے تمہارے قول کو جھٹلادیا ہے)

سے فَمَا تَسْتَطِيعُونَ اس کا عطف ”فَقَدْ كَذَّبْتُمْ“ پر ہے۔ محض نے اسے عبادت کرنے والوں کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ اس بناء پر تاء کے اس کی ضمیر معبودین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ معبود تم سے عذاب پھیرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے اور نہ تمہاری مدد کر سکیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے عذاب پھیر سکتے ہو اور نہ اپنی مدد کی طاقت رکھتے ہو۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صرف کا معنی حیلہ کرنا ہے۔ اسی سے عربوں کا یہ قول ہے انہ یبصرف ای یحسنا۔ (یعنی وہ حیلہ کرتا ہے)

یہ اے لوگو! جس نے بھی تم میں سے ظلم کیا۔ اگر ظلم سے مراد شرک ہے تو پھر جزاء بالا جماع لازم ہے۔ اور اگر یہ کفر اور فحش دونوں کو شامل ہو تو پھر جزاء کا مقتضی بالاتفاق عدم مزام کے ساتھ مقید ہوگا۔ اور ہمارے نزدیک مزام سے مراد اولیٰ الطاعت اختیار کر کے فحش کو مکمل طور پر ختم کرنا اور غلو ہے۔ (یعنی اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ پائی گئی تو پھر اسے عذاب ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی صورت پائی گئی تو پھر عذاب نہیں ہوگا)

واحدی نے جو ہر کی سند سے، بغوی نے ضحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے اور اسی طرح ابن جریر نے آپؐ سے سعید یا عمرؓ کے واسطے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو قاتلہ کی عار دلائی اور یہ کہاؤ قاتلوا مال طہا الرسولی یا لعل الطغاة ویبشینی فی الاسواق تو رسول اللہ ﷺ فرود ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَشْفُونَ فِي
الْأَسْوَاقِ ۖ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۚ أَتَصْبِرُونَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝۲۰

”اور نہیں جیسے ہم نے آپ سے پہلے رسول مکر وہ سب کھانا کھایا کرتے اور چلا پھرا کرتے بازاروں میں لے اور ہم نے بنادیا جنہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش ہے کیا تم (اس آزمائش میں) صبر کرو گے؟ اور آپ کا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے۔“

لے ہم نے آپ سے پہلے نہیں جیسے مگر ایسے رسول جو کھانا کھاتے تھے۔ اس میں موصوف کو محذوف کیا گیا ہے اس لیے کہ اس پر المرسلین ولالت کرتا ہے۔ اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے (لَا زُئْلًا كِلَيْهِ الطَّعَامُ وَالْمَنَاسِينُ لِحَى الْأَسْوَاقِ) (ترجمہ: ہم نے نہیں جیسے مگر کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلتے پھرنے والے رسول) جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَمَا هُمْ بِإِذْنًا مَقَاتِلُهُمْ فَعَلُوا (ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے مگر اس کے لیے مقام معلوم ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو اور اس میں انکشاف پری ہو۔ یعنی ”مَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ أَخَذًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي خَالٍ مِنَ الْأَخْوَالِ إِلَّا وَالْحَالِ أَنَّهُمْ لَيَّا كُفُلُونَ“ (ہم نے کسی بھی حال میں آپ سے قبل رسولوں میں سے کوئی نہیں بھیجا مگر وہ اس حال میں کھانا کھاتے تھے) لَمَّا أَرْسَلْنَا جَمْلَةً مِّنْهُمْ ہے اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لیے ہے۔

لے اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنادیا ہے۔ پس فنی فقیر کے لیے فتنہ ہے کہ فقیر کہتا ہے کیا ہے مجھے میں اس کی مشل نہیں ہوں۔ اور صحت مند مریض کے لیے آزمائش ہے اور شریف خسیس آدمی کے لیے فتنہ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا گیا ہے تاکہ تم اس پر صبر کرو جو تم ان کے بارے میں سنتے ہو اور ان کے خلاف دیکھتے ہو۔ اور ہدایت تلاش کرو (۱) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خسیس کے سبب شریف کی ابتلاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ شریف آدمی (صاحب مرتبہ) جب اسلام لانے کا ارادہ کرتا ہے پھر وہ ادنیٰ آدمی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس سے قبل اسلام لا چکا ہے تو وہ اس کے بعد اسلام لانا پسند کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ادنیٰ کو صاحب مرتبہ (شریف) پر سبقت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی نتیجہ وہ کفر پر ہی ڈنار پتا ہے اور اسلام سے انکار کر دیتا ہے۔ پس اس طرح بعض بعض کے لیے آزمائش ہوتے ہیں۔ یہ کلیہ کا قول ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو جہل، ولید بن عتبہ، عاص بن وائل اور نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ جب انہوں نے حضرت ابوذرؓ، ابوذرؓ، ابن مسعودؓ، عمارؓ، بلالؓ، صہیبؓ اور عامر بن عبیدہؓ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تو کہا اگر ہم اسلام لے سکیں تو پھر ہم بھی ان کی مشل ہو جائیں گے۔ (2)

حضرت قتادہؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان مومنین کی ابتلاء کے بارے میں نازل ہوئی جن کے ساتھ قریش استہزاء کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے دیکھو ان کی طرف جنہوں نے ہمارے غلاموں اور زرعی افراد میں سے محمد ﷺ کی اتباع کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو فرمایا: لے کیا تم فقر، شدت اور ذلت کی اس حالت میں صبر کرو گے (3) تو تمہیں اجر دیا جائے گا یا تم صبر نہیں کرو گے تو اس طرح تم اپنے غم میں اضافہ کر لو گے۔ لہذا حاصل معنی یہ ہے کہ تم صبر کرو اور آپ کا رب صبر کرنے والوں اور غم و اندوہ کا اظہار کرنے والوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو مال اور جسم میں اس پر فضیلت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو اس سے کم تر ہو (4) اسے شخصین نے صحیحین میں

اور امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ الْمُبِينُ ۚ أَوَلَمْ نَرَأِ مَا يُنْفُسُ أَكْبَرًا ۝

”اور کہاں لوگوں نے جو امید نہیں رکھتے تھے ہم سے ملنے کی کہ کیوں نہ اتارے مجھے ہم پر فرشتے۔ یا ہم دیکھ لیتے

اپنے رب کو نہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اپنے دلوں میں۔ اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی تھی۔“

اس کا عطف فال الذین کفروا یہ ہے۔ وہ امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی خیر کے ساتھ اور نہ ہماری ملاقات کی شر کے ساتھ ایسے لیے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ معنی مجاز ہے یا بنی تہام کی لغت کے مطابق ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ تہام کی لغت کے مطابق رجا کا معنی خوف ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (1)، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و درفعت ہوتے ہوئے اس کا خوف نہیں رکھتے۔ لقا کا اصل معنی کسی شے تک پہنچنا ہے۔ اور اسی سے رویت بھی ہے کیونکہ اس میں بھی دکھاؤ۔ یعنی والی چیز تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اپنی جزا اور انجام تک پہنچنا ہے۔

یہاں لولا بمعنی خلا ہے۔ کیوں نہیں ہم پر فرشتے اتارے گئے کہ وہ ہمیں محمد (ﷺ) کے سچا ہونے کی خبر دیتے یا وہی ہماری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔ پس وہ خود ہمیں اپنی اتباع کرنے کا قلم دیتا ہے۔

تہ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ وہ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اس طرح کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے لیے ایسی چیز کا مطالبہ کیا جس کا اتفاق کبھی بھی ان افراد دنیا کو ہوتا ہے جو تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سے اکمل ہوتے ہیں۔ اور وہ چیز اس سے بھی اعظم ہے۔ اور انہوں نے قلم میں حد سے تجاوز کیا۔ مجاہد نے کہا انہوں نے سرکشی کی (2)۔ مقاتل نے کہا قول میں انہوں نے تکبر کیا (3) اور بخوبی نے کہا کہ عتو کا معنی شدید ترین کفر اور فحش ترین قلم ہے۔ ظلم اور سرکشی کی انتہائی حدوں تک پہنچتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رویت کا مطالبہ کر دیا اور اس سے اوپر تو کوئی شئی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا ظلم اور سرکشی یہ ہے کہ انہوں نے واضح معجزات کو دیکھا اور پھر ان سے اعراض کیا اور انہوں نے اپنے لیے ایسا غلام مطالبہ رکھا جس کے قریب بھی کامل طالبین کی گردنیں نہیں جاتی تھیں۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ۝

”جس روز وہ دیکھیں گے فرشتوں کو تو کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی کہ اس روز جس مجرموں کے لیے اور فرشتے کہیں گے

تمہارے لیے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے۔“

اس دن کفار دیکھیں گے فرشتوں کو یعنی موت کے وقت یا قیامت کے دن۔ یہ جملہ مترضہ ہے اور طرف یا تو اذخو کے متعلق ہے۔ اور وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا کا عطف یوزون پر ہے۔ اور دوسرا جملہ مترضہ ہے۔ یا پھر طرف قول باری تعالیٰ ”لَا بُشْرَىٰ“ کے متعلق ہے۔ اس طرح کہ اس سے پہلے قول مقدر ہے، یعنی يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ يَقُولُونَ (جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو ملائکہ کہیں گے) ”لَا بُشْرَىٰ“ مجرموں کے لیے کوئی بشارت نہیں، عطیہ نے کہا ہے کہ ملائکہ قیامت کے دن مومنوں کو خوشخبری دیں گے

اور کافروں کو کہیں گے تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو وہ انہیں بشارت نہیں دیں گے جس طرح وہ مؤمنین کو جنت کی بشارت دیں گے۔

یہ یا تو تکبر کے لیے ہے۔ یا بھڑلائی کا خبر ہے۔ یا یہ اس فعل یا شیعہ فعل کی طرف ہے جس کے متعلق لَمْ يَخْبُرُوهُمْ بَیِّنٌ ہو رہا ہے۔ اور ”لَمْ يَخْبُرُوهُمْ“ یا تو ظریف مستقر کے متعلق ہے یعنی ہونا منع کے۔ یا یہ لاکھی خبر ہے۔ یا یہ بُسری کے متعلق ہے۔ اگر اسے منون تصور کر لیا جائے اور لا کے ساتھ اس کا مصدر ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عمل نہیں کر سکتا۔ اور للمعجور مین یا تو عام ہے اور اس کا حکم ان کے حکم کو شامل ہے۔ یا یہ خاص ہے اور ان کے جرموں پر مہر ثبت کرنے کے لیے ان کی ضریر کی جگہ اسے رکھا گیا ہے۔ اور اس چیز کا احساس دلانے کے لیے ہے جو بشارت کے مانع ہے اور اس کے مقابل (غم زدہ کرنے والی خبر) کا موجب ہے۔

سے اور ملائکہ کہیں گے۔ اس کا عطف یقولون لا بُسْرٰی پر ہے۔ جیسا کہ امام بغویؒ نے عطا کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ فرشتے کہیں گے جنت میں داخل ہونا قطعاً حرام ہے مگر ان ہی کے لیے جنہوں نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کہا۔ اور مقابل سے روایت ہے کہ جب کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے تو فرشتے انہیں کہیں گے کہ تمہارے لیے جنت کا ہونا قطعاً حرام ہے (1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ مجرم جبراً مَخْجُورٌ کہیں گے جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے اور ملائکہ کو دیکھیں گے۔ امام بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریرؒ نے کہا ہے جب اہل عرب پر کوئی تکلیف آتی اور وہ کسی ناپسندیدہ چیز کا مشاہدہ کرتے تو کہتے جبراً مَحْجُورٌ۔ لہذا وہ یہی کلمات کہیں گے جب ملائکہ کو دیکھیں گے اور اس کا معنی ہے قطعی پناہ مانگنا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ ملائکہ سے پناہ طلب کریں گے (2)۔ یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے اور ملائکہ انہیں کہیں گے تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں۔ اور مجرم کہیں گے جبراً مَخْجُورٌ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان کی ملاقات روک دے۔

وَقَدْ مَنَّاْ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا ۝۳

”اور ہم تم پر جو کاموں کی طرف لے اور انہیں گرد و غبار بنا کر اڑا دیں گے۔“

۱۔ اور ہم اس دن قصد کریں گے۔ اس کا عطف وَيَقُولُوْنَ پر ہے۔ ان اعمال کی طرف جو اچھے اعمال میں سے کفار نے کیے۔ شرا مہمان کی تکریم کرنا، صلہ رحمی اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ۔

۲۔ یہ ضمیر مَا عَمِلُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تو ہم ان اعمال کو باطل کر دیں گے۔ ان کے لیے کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ان پر ثواب ملنے کی شرط نہیں پائی جاری اور وہ شرط اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اعمال کو اخلاصاً اسی کے لیے کرنا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا ہے کہ ہبائے سے مراد غبار کی طرح کے وہ ذرات ہیں جو روشن دان میں دکھائی دیتے ہیں جب اس میں دھوپ لگ رہی ہو۔ انہیں نہ ہاتھوں سے مس کیا جاسکتا ہے اور نہ سائے میں دیکھا جاسکتا ہے (3)۔ یہی قول حسن بکرمہ اور مجاہد کا ہے۔ اور منشور سے مراد بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ ہبائے کی صفت ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ و قتادہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ ہبائے سے مراد وہ غبار ہے جو تیز ہوا میں اور خشک درختوں میں سے اڑاتی ہے (4)۔ اور مقابل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گرد ہے جو چو پاؤں کے چلتے وقت ان کے پاؤں سے لگ کر اڑتی ہے (5)۔ یہ بھی کہا گیا ہے الہباء المنشور وہ غبار ہے جو روشن دان میں دکھائی دیتا ہے۔ اور الہباء المنبت وہ

ہے جسے گھوڑوں وغیرہ کے پاؤں سے لگنے کے سبب ہوا اڑاتی ہے۔ تو یہاں ان کے وہ اعمال جنہیں نفع نہ دینے اور حقیقہ ہونے کے سبب ضائع کر دیا جائے گا انہیں اولاً غبار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور پھر ان کے بکھرے ہونے کے سبب انہیں منشور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس حیثیت سے کہ انہیں بھی ہباء منشور کی طرح اکٹھا کرنا اور منظم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یا یہ متفرق ہونے میں ان امراض کی مثل ہوں گے جس کی طرف وہ متوجہ رہتے تھے۔ یا یہ خبر کی طرح ہونے کی وجہ سے تیسرا مفعول ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے: ﴿لَوْ كُنَّا قَرْدًا لَخِصِفْنَا﴾

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا أَوْ أَخْسَنُ مَقِيلًا ۝

”اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانہ ہوگا اور وہ پہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی۔“

۱۔ یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے ”مُسْتَقَرًّا“ مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں اکثر اوقات ٹھکانہ کیا جاتا ہو۔ اور مَقِيل سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بیویوں سے راحت حاصل کرنے کے لیے پناہ لی جاتی ہے اور اس سے مراد ان سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد وہ پہر کے قیلولہ کی جگہ ہو۔ اس تشبیہ کی بناء پر کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی۔ از ہری نے کہا ہے کہ قیلولہ اور مقبل سے مراد وہ پہر کے وقت آرام کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَ أَخْسَنُ مَقِيلًا“ (اور وہ پہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی) اور جنت میں نیند نہیں ہوگی (1)۔ اور أَخْسَنُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا قیلولہ حسین و جمیل صورتوں اور دیگر محاسن سے مزین ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مستقر اور مقبل سے مراد مصدر یا ظرف زمان ہو اور اشارہ اس طرف ہو کہ ان کی جگہ اور زمانہ اس سے انتہائی اچھا اور اعلیٰ ہوگا جو کچھ عام جگہوں اور زمانوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ فضیلت یا تو مطلقاً زیادتی کے اعتبار سے ہے یا یہ فضیلت ان چیزوں کی نسبت ہے جو دنیا میں خوشحال لوگوں کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ابن مبارک نے الزہد میں، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نصف النہار نہیں ہوگا کہ یہ (اہل جنت) اور وہ (اہل جہنم) قیلولہ کر لیں گے (2)۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یوم قیامت کو دن نصف تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں قیلولہ کریں گے۔ اور پھر یہ پڑھا ”ثُمَّ إِنَّ مَقِيلَهُمْ لَأَوَّلَى الْمُحْجَبِينَ“ اسی طرح وہ پڑھا کرتے تھے۔

ابن مبارک، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن منذر اور ابونعیم نے حیلہ میں حضرت ابراہیم خیمؒ سے قول نقل کیا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے حساب سے نصف النہار کے وقت فارغ ہوگا۔ پس اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں (3)۔ اور علامہ بخاریؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اس دن حساب اس کے اول حصہ میں ہوگا اور قوم اس وقت یہ قول کرے گی جبکہ وہ جنت میں اپنے مراحب پر ہوں گے اور علامہ بخاریؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ قیامت کا دن مومنین کے لیے انتہائی چھوٹا ہوگا حتیٰ کہ یہ عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کی مثل ہو جائے گا۔

وَيَوْمَ تَشْقَى السَّاءُ بِالْعَمَاءِ وَنَزَلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا ۝

”اور یاد کرو جس روز پھٹ جائے گا آسمان اور بادل نمودار ہوگا۔ اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ۔“

اس کا عطف یَوْمَ یُزْفَنُ پر ہے۔ اہل کوفہ اور ابو عمرو نے یہاں شین کو مخفف پڑھا ہے اور سورۃ قیامت میں سے ایک کے حذف کے ساتھ۔ اور بقیہ قراء نے تا کو شین میں مدغم کر کے مشدد پڑھا ہے۔ یاد کرو جس روز بادل کے نمودار ہونے کے سبب آسمان پھٹ جائے گا۔ اس سے مراد وہی بادل ہے جس کا ذکر اس ارشاد گرامی میں ہے هَلْ يَمْشُكُونَ اِلَّا اَنْ يَّاتِيَهُمُ اللّٰهُ فَيُطْلِقَ قِيَمَ الْقَنَابِرَةِ وَالْمَكِيكَةِ اس کا ذکر سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہ کہہ کر مثل سفید رنگ کا باریک بادل ہوگا۔ اور یہ صرف بنی اسرائیل کے میدانوں میں ظاہر ہوا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ اس میں باء عن کے معنی میں ہے، یعنی یہ دونوں محل ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے جیسا کہ کہا جاتا ہے ”رَمِثُ الشَّهْمِ بِالْفَوْسِ“ یعنی یہ ہے کہ آسمان پر بادل نمودار ہونے کے ساتھ ہی پھٹ جائے گا۔

عام قاریوں نے نزول کو ایک نون، زاء مشدد اور لام کے تحت کے ساتھ صیغہ ماضی مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ملائکہ کو مسند الیہ ہونے کی بناء پر رفع دیا ہے۔ اور ابن کثیر نے تعظیم کی بناء پر اسے دونوں، زاء مخفف اور لام کے ضمہ کے ساتھ صیغہ جمع متکلم فعل مضارع معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اسے انزال سے بنایا ہے اور ملائکہ کو مفعول ہونے کی بناء پر نصب دی ہے۔ حاکم، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاسماء میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ پڑھا ”يَوْمَ تَشَقُّقُ السَّمَاوَاتِ بِالْغُصَامِ“ اور کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ہی میدان میں مخلوق کو جمع فرمائے گا جن میں جنات، انسان، چوپائے، درندے، پرندے اور تمام مخلوق ہوگی۔ پس اسے میں آسمان دینا پھٹ جائے گا۔ اور اس کے باقی بھی اتر آئیں گے۔ اور ان کی تعداد زمین میں موجود جن وانس اور تمام مخلوق سے زیادہ ہوگی حتیٰ کہ وہ جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ تو اہل زمین انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر دوسرے آسمان میں رہنے والے اتریں گے اور وہ تعداد میں آسمان دینا اور زمین کے باسیوں سے زیادہ ہوں گے۔ پس وہ انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ تھینے والے اپنے سے پہلے اترنے والے ملائکہ، جنات، انسان اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر تیسرے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی تعداد دوسرے اور پہلے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ پس یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں پھر چوتھے آسمان کے مکین اتریں گے۔ ان کی تعداد پہلے، دوسرے اور تیسرے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر پانچویں آسمان کے باقی اتریں گے اور ان کی تعداد سابقہ مکمل تعداد سے زیادہ ہوگی۔ پھر چھٹے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔ پھر ساتویں آسمان کے رہنے والے اتریں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور اہل زمین کی تعداد سے زیادہ ہوگی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر ہمارا رب (اپنی شان کے مطابق) بادل کے سائے میں نزول فرمائے گا اور اس کے ارد گرد رکھوین ہوں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور ساتویں زمینوں کے باسیوں سے زیادہ ہوگی ان کے قدموں کے درمیان حاملین عرش ان کے ساتھ نیزے کی گانٹھوں کی طرح اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔ ان کے قدم کے نچلے حصے سے لے کر اس کے فٹے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی۔ فٹے سے گھٹنے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، گھٹنے سے کمر تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، کمر سے فٹے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی اور فٹے سے لے کر کان تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی (1)۔ یہ حدیث اور اللہ تعالیٰ کے نزول کی تاویل کے بارے میں علماء کے اقوال سورہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکے ہیں

يَخْتَرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُمٍ لَّيْلٍ فَقَالُوا هَذَا عَذَابٌ يُعَذِّبُكَ بِمَا كُنْتَ تَعْمَلُ (آخرت کے معاملات کو دنیاوی امور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا)۔ ابن جریر اور ابن المبارک نے فصاح کے نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان کو کھم فرمائے گا وہ پھٹ جائے گا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں کھم فرمائے گا تو وہ نیچے اتر جائیں گے اور زمین پر رہنے والوں کا احاطہ کر لیں گے بعد ازاں دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور پھر ساتویں آسمان کے فرشتے اتریں گے۔ پس وہ ایک دوسرے کے پیچھے صف در صف کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر ملک (شہنشاہِ مرادِ ربِ کریم) نزول فرمائے گا مگر اس کی بائیں جانب جہنم ہوگا جب اہل زمین اسے دیکھیں گے تو وہ بھاگ کھڑے ہوں گے لیکن زمین کی اطراف میں سے جس طرف بھی جائیں گے ادھر ہی ملائکہ کی سات صفیں پائیں گے۔ لہذا واپس اسی جگہ کی طرف لوٹ آئیں گے جہاں وہ پہلے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّكْوِيْنِ اَيَوْمَ نَخْلُقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَنُفِثُ السَّحَابَ وَنُفِثُ السَّحَابَ وَنُفِثُ السَّحَابَ وَنُفِثُ السَّحَابَ اور لوگ ایک آواز سنیں گے اور حساب کے لیے آ جائیں گے۔

الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ الْخَبِيرُ ۝ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا ﴿٦٦﴾

”اس دن چنگی بادشاہی (خداوند) رحمن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بڑا مشکل ہوگا۔“

لَا تَلْسَنُ مِمَّا هُوَ يَوْمَهُذِ الْمُتْلِكِ كَيْفَ تَعْلَمُ اس کے متعلق ہے اور الحق المتلک کی صفت ہے اور لَمْ یَلْسَنْ مِمَّا کی خبر ہے یعنی وہ ملکیت جو ثابت اور تحقق ہے اور اسے کبھی بھی زوال نہیں۔ اس دن وہ صرف رخصت کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یَوْمَهُذِ مِمَّا کی خبر ہو اور لَمْ یَلْسَنْ اس کے متعلق ہو۔ اور یَوْمًا مکان کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر مستتر ہے۔ اور میں عَصِيْرًا یَوْمًا کی صفت ہے اور علی الکافِرین اس کے متعلق ہے، یعنی اصل عبارت اس طرح ہے "كَانَ ذَلِكَ الْيَوْمُ يَوْمًا شَدِيدًا عَلَى الْكَافِرِينَ" حضرت ابو سعیدؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے کیا وہ دن اتنا طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ مون پر وہ دن انتہائی ضعیف (آسان) ہوگا حتیٰ کہ اس پر وہ دن اس فرض نماز کی نسبت زیادہ آسان ہوگا جو وہ دنیا میں ادا کرتا تھا (۱)۔ (یعنی جتنا وقت فرض نماز کی ادائیگی میں خرچ ہوتا تھا اس سے بھی کم وقت میں یہ طویل دن گزر جائے گا) واللہ اعلم

امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط جب سفر سے واپس آتا تو پیچھے قوم کے اشراف کو اپنے پاس کھانے پر بلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر حضور نبی کریم ﷺ کی مجالست بھی کیا کرتا تھا۔ وہ ایک دن سفر سے واپس آیا۔ تو اس نے کھانے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور ساتھ ہی حضور نبی کریم ﷺ کو بھی کھانے کے لیے بلایا جب کھانے کا وقت قریب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تیرا کھانا نہیں کھاؤں گا یہاں تک کہ تو یہ شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی محبوب نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ تو یہ سن کر عقبہ نے کہہ دیا "اشھدان لا الہ الا اللہ وان محمدًا رسول اللہ" تو بعد ازاں آپ ﷺ نے اس کا کھانا تناول فرمایا۔

لیا۔ عقبہ ابی بن خلف کا دوست تھا۔ جب اس نے ابی بن خلف کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ تو اس نے کہا اے عقبہ تو صابی ہو گیا ہے۔ (یعنی تو نے اپنے آپ کو اجداد کا دین چھوڑ دیا ہے)۔ اس نے جواباً کہا تم بخدا میں صابی نہیں ہوا۔ میں نے تو صرف اس لیے ایسا کیا ہے کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے اس وقت تک میرا کھانا کھانے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں اس کی شہادت دوں۔ اس لیے مجھے جیسا محسوس ہوئی کہ وہ میرے گھر سے چلا جائے اور میرا کھانا نہ کھائے۔ لہذا میں نے اس کی شہادت دے دی۔ تو اس نے میرا کھانا کھا لیا۔ یہ سن کر ابی بن خلف نے کہا میں کبھی بھی تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اس صورت میں کہ تو اس کے پاس جائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ عقبہ نے ایسا ہی کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مکہ سے باہر تیرے ساتھ ملاقات ہوگی تو میں تیرا سر تلواریں سے اڑا دوں گا چنانچہ عقبہ غزوہ بدر میں قید ہو کر مارا گیا۔ اور ابی بن خلف کو حضور نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد میں اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ اسی طرح اسے ابن جریر نے مرسل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ ابی بن عقبہ کو کہا میں تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اسی صورت میں جبکہ تو اس کی گردن کو جھکائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ اس نے آپ ﷺ کو دارالندوہ میں سجدہ کرتے ہوئے پایا تو اس نے ایسا کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا جب تو مکہ سے باہر نکلے گا تو میں تیرا سر تلواریں سے اڑا دوں گا۔ چنانچہ غزوہ بدر کے دن اسے قید کر لیا گیا اور آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابی کو آپ ﷺ نے غزوہ احد کے دوران نیزہ مارا اور وہ مکہ کی طرف واپس لوٹے ہوئے راستے میں مر گیا (۱)۔ عقبہ اور ابی دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يَعِضُ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ لِيَكُنْتَنِي أَخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَينِيلَا ۝

”اور اس روز ظالم (فرط اندامت سے) کانٹے گا اپنے ہاتھوں کو (اور) کہے گا کاش! میں نے اختیار کیا ہوتا رسول

(کرم) کی معیت میں (نجات کا) راستہ۔“

۱۔ اس کا عطف یَوْمَ شَقِيقٌ پڑھئے۔ ”الظالم“ سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے۔ علی یَذِیہ یعنی حد درجہ حسرت اور ندامت کے سبب ظالم اپنے ہاتھ کانٹے گا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابی بن خلف حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا تو عقبہ بن ابی معیط نے اسے ڈانٹا۔ اس وقت یہ آیت خذُوا نَکَالًا نَازِلًا ہوئی۔ اسی طرح انہوں نے شععی اور مقسم سے بھی نقل کیا ہے۔

قاضی بیضاوی نے فرمایا بعض البدین (ہاتھ کاٹا)، اکل البنان (پورے کھانا) اور حرق الامنان (دانت پینا) وغیرہ الفاظ غصے اور حسرت سے کنایہ ہوتے ہیں۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے کہ جب عقبہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر تھوکا تو اس کی تھوک اس کے اپنے رخسار پر آگئی جس کے سب اس کے رخسار چل گئے اور اس کا نشان اس کے مرنے تک باقی رہا۔ (2)

شععی نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط امیہ بن خلف کا دوست تھا۔ عقبہ اسلام لے آیا تو امیہ نے کہا اگر تو نے محمد ﷺ کی بیعت کی ہے تو پھر میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے۔ چنانچہ اس نے کفر اختیار کیا اور مرتد ہو گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی ”و“

يَوْمَ يَقْبِضُ الْمَلَكُ، یعنی عقبہ بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اللہ تعالیٰ کے بارے اختیار کردہ رویہ پر ہدایت اور انفس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹنے لگا۔ اور اس نے اپنے آپ کو ایسے دوست کی اتباع کی خاطر معصیت اور کفر پر باقی رکھا جس نے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روک دیا (1)۔ عطاء نے کہا ہے وہ اپنے ہاتھ کھائے گا۔ یہاں تک کہ کہنیوں تک پہنچ جائے گا پھر وہ اگ آئیں گے پھر وہ انہیں اسی طرح کھائے گا حتیٰ کہ ہاتھ اگتے رہیں گے اور وہ انہیں اپنے کیے پر حسرت اور ندامت کرتے ہوئے کھاتا رہے گا۔ (2)

۱۔ اس میں تقدیر عبارت یہ ہے یا قوم لَبِثْتُمْ اسے ابو عمرؓ نے باء فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دوسروں نے سکون کے ساتھ اس صورت میں یہ بعض کے فاعل سے حال ہے۔ اے کاش دنیا میں میں نے محمد ﷺ کی اتباع کی ہوتی۔ یا میں نے ان کی معیت میں ہدایت اور نجات کا کوئی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ اور وہی حق کا راستہ ہے اور میں مگر اسی اختیار نہ کرتا۔

يُؤَيِّلُكَ يَبْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا حَلِيلًا ۝۱

”ہائے افسوس! کاش نہ بتایا ہوتا میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ“

۱۔ اس سے مراد ابی بن خلف ہے اور فلاں یہ اعلام سے کفار ہے۔ (ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بتایا ہوتا)

لَقَدْ أَصَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا ۝۲

”واقعی اس نے بہکا دیا مجھے اس قرآن سے اس کے پھر سے پاس آ جانے کے بعد ۱۔ اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو

(مشکل کے وقت) بے یار و مددگار چھوڑنے والا ہے ۲۔“

۱۔ واقعی فلاں نے مجھے بہکا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے یا اس کی کتاب سے یا رسول اللہ ﷺ کی نصیحت سے یا کلمہ شہادت سے یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سبب اس ذکر کے میرے پاس آ جانے کے بعد۔

۲۔ یعنی گمراہ کرنے والا دوست۔ پس جن و انسان میں سے جو بھی سرکش ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے والا ہے وہی شیطان ہے۔ خدا لان سے فعل کے وزن پر ہے۔ اور اس کا معنی ہے اعانت اور مدد کو ترک کر دینا۔ یعنی یہ انسان کے ساتھ دوستی اختیار نہیں کرتا حتیٰ کہ اسے ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے پھر اسے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہ آیات اگرچہ نزول کے اعتبار سے خاص ہیں لیکن عبارت کے لحاظ سے عام ہیں۔ لہذا ان کا حکم ایسے تمام لوگوں کو شامل ہے جو معصیت اور گناہ کے سبب ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا دوست کستوری والے (عطر فروش) کی طرح ہے۔ اور برادر دوست بھٹی میں پھونک مارنے والے (لوہار) کی مثل ہے۔ کیونکہ عطر فروش یا تو آپ کو کچھ خوشبو عطا کر دے گا، یا آپ اس سے دھریا لیں گے ورنہ آپ اس کے پاس بیٹھنے کی دیر اچھی خوشبو پاتے رہیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس بھٹی میں پھونک مارنے والا یا تو آپ کے کپڑوں کو جلا دے گا یا پھر وہاں بیٹھنے کی دیر آپ ناپسندیدہ بو پاتے رہیں گے۔“ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ (3) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ”تم مومن سے مصاحبت اختیار کرو۔ وہ آپ کا وہی کھانا کھائے گا جو فلاں اور بچا ہوا ہوگا“ (4)۔ اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی،

ابن جہان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہذا اسے خوب غور و فکر کرنا چاہئے کہ وہ کسے دوست بنارہا ہے؟ (1) اسے بغوی نے روایت کیا ہے۔

شیخین نے تصحیح میں، امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور شیخین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔ (2)

وَقَالَ الرَّسُولُ يُرَبِّ إِنِّي قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۝

”اور رسول عرض کرے گا میرے رب! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔“

۱۔ یعنی محمد ﷺ اس دن کہیں گے۔ اس کا عطف بغض الظالم پر ہے۔ ”یُرَبِّ إِنِّي قَوْمِي“ نافع، ابو عمرو اور یزید نے اِنِّی قَوْمِ کو یاء کے فتح کے ساتھ پڑھنا ہے اور بغیر قرآن کے یاء کے سکون کے ساتھ اور قوم سے مراد قریش ہیں۔ جبکہ آیت طیبہ میں مجبور بمعنی سزوک ہے (یعنی جسے چھوڑ دیا جائے)۔ یعنی میری قوم نے اس قرآن سے اعراض کر لیا اور اس کے ساتھ ایمان نہیں لائی۔ اور نبی اس کے احکام کے مطابق عمل کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو جبر، ہذیان اور ناپسندیدہ قول کے قائم مقام قرار دیا اور یہ گمان کیا کہ قرآن کریم شعر ہے، یا جادو ہے یا پھر کہانیاں ہیں۔ یہ نفعی اور مجاہد کا قول ہے (3)۔ ایک معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں فرمایا کہ وہ اپنے رب کی بادشاہ میں اپنی قوم کی شکایت کریں گے۔ کہ بیشک میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ”اس معنی کی بناء پر قَالَ الرَّسُولُ کا عطف ”قَالَ الَّذِينَ لَا يُزْجِلُونَ“ پر ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ آپ کو نئی دی۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا وَمِنَ الْمُجْرِمِينَ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًّا وَنَصِيرًا ۝

”اور (اے حبیب) اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن جرائم پیشہ لوگوں سے ۱ اور کافی ہے آپ کا رب

(آپ کے لئے) منزل مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا ۲۔“

۱۔ جس طرح ہم نے تیرے لیے مشرکین قریش میں سے دشمن بنائے ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مشرکین میں سے دشمن بنائے ہیں۔ آیت کا عطف قَالَ الرَّسُولُ پر ہے۔ اور اس میں لفظ عدو واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لہذا آپ اس طرح صبر کیجئے جیسے انہوں نے صبر کیا۔ بے شک میں تمہارا مددگار اور ہادی ہوں۔

۲۔ اور ان پر غلبہ پانے کے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا اور ان کے خلاف مدد کرنے والا تمہارا رب کافی ہے۔ ترکیب کلام میں هَادِيًّا وَنَصِيرًا نطفی کے قائل سے حال ہے۔ یا یہ نسبت سے تمیز ہیں جیسا کہ نطفی بِاللَّهِ خَلِّفًا کا قول ہے۔ اسی طرح اس قول میں بھی ہے: ”لِلَّهِ دَرَهَ فَارَسًا“ اور كَفَىٰ بِرَبِّكَ کا عطف كَذَلِكَ جَعَلْنَا پر ہے۔

ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور ضیاء نے اختصار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اور اسے حاکم نے صحیح

قرآن یا ہے کہ شریکین نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں (جیسا کہ وہ گمان کرتے ہیں) تو ان کا رب انہیں دیکھ تکلیف کیوں دیتا ہے یا پھر ان پر قرآن کریم یکبارگی نازل کیوں نہیں کیا (1)۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝

”اور کہنے لگے انکار (ازراہ اعتراض) کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن یکبارگی؟ ۱۔ اس طرح اس لیے کیا کہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپ کے دل کو یہ اور اسی لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر کر اسے پڑھا ہے۔“

۱۔ اس کا عطف ”قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا يُزْجِلُونَ“ پر ہے۔ ”لَوْلَا“ یہاں لَوْلَا خَلَا (کیوں نہیں) کے معنی میں ہے۔ اور ”نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ“ میں نُزِّلَ کے معنی میں ہے (یعنی کیوں نہیں ان پر قرآن یکبارگی اتارا گیا) جیسا کہ خیر جمعہ بخیر ہے۔ تاکہ وہ اس قول کے مناسق نہ ہو جائے۔ ”جُمْلَةً وَّاحِدَةً“ یعنی ترکیب کلام میں یہ القرآن سے حال ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تو رات، عیسیٰ علیہ السلام پر پانچ گھنٹوں اور داؤد علیہ السلام پر زبور یکبارگی نازل کی گئی۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان کے اس اعتراض کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ (قرآن کریم کا) انجاز اس کے یکبارگی نازل ہونے یا اس کے متفرق طور پر نازل ہونے سے متعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ متفرق نزول میں کئی فوائد ہیں۔ جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے۔

۱۔ یہ فعل متخلف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”انْزَلْنَاهُ كَذَلِكَ مُفْرَقًا“ (یعنی ہم نے اسے متفرق طور پر اس لیے نازل کیا ہے) تاکہ اس متفرق نزول کے سبب ہم آپ کے دل کو اسے یاد کرنے اور سمجھنے کے لیے مضبوط کر دیں، اس لیے بھی کہ واقعات کے مطابق اس کا نازل ہونا معنی کی بصیرت عطا کرتا ہے، اور اس لیے بھی کہ جب یہ بتدریج نازل ہوگا اس حال میں کہ اس کا ہر جزء چلتی ہوگا اور وہ اس کا معارض لانے سے عاجز ہوں گے تو یہ آپ کے دل کی قوت میں اضافہ کا سبب ہوگا۔ اور اس کے متفرق نزول کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب مختلف حالات میں جبرئیل نازل ہوں گے تو اس سے آپ کا دل پختہ ہو جائے گا۔ ان فوائد میں سے ایک نافع و منسوخ کی پہچان ہے اور قرآن کا حال کو الالات لفظیہ کے ساتھ ملانا ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بلاغت میں زیادہ پر زور ہوتا ہے۔

۲۔ اس کا عطف اس فعل مقدم ”انْزَلْنَاهُ“ پر ہے جس کے متعلق لُتْبِت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ ”بَيِّنَةً بَيِّنَاتٍ“ (اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی واضح اور بین نازل فرمایا)۔ ترتیل کا معنی ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ سدی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے ”فَصْلَانَا تَفْصِيلًا“ (کہ ہم نے اسے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کے بعد نازل فرمایا۔ اور غرضی اور حسن کا قول ہے ”وَقُرْآنًا مَّفْرُقًا“ (2) (کہ ہم نے اسے جدا جدا کر کے نازل کیا ہے) ترتیل فی القرآن کا اصل معنی داخوں کا کشادہ ہونا ہے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۝

”اور نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب ۱۔ اور عمدہ تفسیر (جو

اعتراف کو رد کر دی گئی (۱)۔

۱۔ اور وہ آپ پر کوئی عجیب سوال پیش نہیں کریں گے۔ گویا کہ اس سوال سے وہ آپ کی نبوت پر اعتراض کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر ہم ان کے سوال کا ایسا جواب لائیں گے جو ان کے اعتراض کو بالکل رد کر دے گا۔

۲۔ اس کا عطف جار اور مجرور پر ہے یعنی وہ جواب جو بیان کے اعتبار سے اتنا حسین اور اعلیٰ ہوگا کہ ان کے اشکال کو زائل کر دے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ آپ کے پاس کسی عجیب حال کے ساتھ نہیں آئیں گے کہ وہ یہ کہیں اس کا حال یہ تھا، مگر ہم آپ کو ایسا حال عطا کریں گے جو ہماری حکمت کے مطابق آپ کے شایان شان ہوگا اور وہ آپ کے مقصد بحث کو بہتر انداز میں واضح کرنے والا ہوگا۔ اَلْفَسْرُ کا معنی ہے ظاہر کرنا اور پردے کو ہٹانا۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُخْسِرُوْنَ عَلَىٰ وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ اُولٰٓئِكَ سَرُّهُمْ كَلَّا وَاصْلُ سَبِيْلًا ۝۱۰

”جو لوگ ہانگے جائیں گے اور نہ منہ جنہم کی طرف ان کا بہت برا ٹھکانا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے۔“

۱۔ یہ مذمت ہے ان لوگوں کی جنہیں منہ کے بل جنہم کی طرف ہانکا جائے گا۔ اس اعتبار سے اسم موصول یا محل نصب میں ہے یا محل رفع میں۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ الخ ہے۔ (اس میں اَصْلُ صیغہ اسم تفخیل ہے) اس میں مُضِلُّ عَلٰی الرُّسُوْلُ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے طریقہ پر نقل ھَلْ اَنْتُمْ كَلِمٌ مِّنْ ذٰلِكَ مَكْنُوْنَةٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ گویا یہ کہا گیا کہ انہیں ان سوالوں پر ابھارنے والی شئی آپ کے راستہ کو بھٹکا ہوا ہے جس کے سبب آپ کے مکان کو ظہیر جانا ہے۔ اور وہ اپنی حالت کو نہیں جانتے کہ انہیں معلوم ہو جائے ان کا اپنا ٹھکانا زیادہ برا اور وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول اس قول باری تعالیٰ سے متصل ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَعِيْلًا اس آیت میں بھی مُضِلُّ عَلَیْہِ عام ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ برکتیں کی نسبت زیادہ برا اور گم کردہ راہ کی نسبت وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں کلمے مکاناً اور سبیلانہ نسبت سے تمیز ہیں اور تکمیل کی صفت طلال سے بیان کرتا مبالغہ کے لئے اسناد مجازی کی بناء پر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قیامت کے دن لوگوں کو تین حالتوں پر چلایا جائے گا سوار، پیدل اور منہ کے بل۔“ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ اپنے منہوں کے بل چل سکیں گے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ذات جس نے انہیں قدموں پر چلایا وہ انہیں منہ کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کافر کو منہ کے بل کیسے چلایا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ ذات جس نے اسے دنیا میں پاؤں کے بل چلایا وہ اسے قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہو گی۔ متفق علیہ۔ (۲)

حضرت معاویہ بن حیدرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے بیشک تمہیں پیدل اور سوار یوں پر چلایا جائے گا اور تمہیں اپنے منہوں کے بل کھینچا جائے گا۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ (۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے صادق مصدوق نبی ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن تین گروہوں کی صورت میں نکالا جائے گا ان میں سے ایک گروہ خوش خوراک، خوش پوش اور سوار ہوگا، دوسرا گروہ چل رہا ہوگا اور دوسرا ہا ہوگا اور تیسرا گروہ وہ ہے جسے ملائکہ موتیوں کے بل گھسیٹ رہے ہوں گے۔ اسے نسائی، حاکم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (1)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مِصْعَاةَ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا ۝

”اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور مقرر کیا ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر۔“

۱۔ اس میں کتاب سے مراد توریت ہے۔ (جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی) اور ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے لیے اعلا وکلتہ اللہ اور دعوت حق دینے کے لیے وزیر اور معاون بنایا۔ اور یہ نبوت میں ان کی مشارکت کے متنافی نہیں کیونکہ کسی امر میں دو شریک اس میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔

فَقُلْنَا أَذْهَبَ إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَدَمَرْنَاهُمْ ثُمَّ دَمَرْنَا ۝

”پھر ہم نے حکم دیا دونوں کا قوس کی طرف جنہوں نے جھٹلایا ہے ہماری آیتوں کو (وہ گئے قوم نے ان کو ٹھکرادیا) تو ہم نے ان کو بالکل برباد کر دیا۔“

۲۔ پھر ہم نے دونوں کو کہا کہ تم دونوں اس قوم کو اللہ تعالیٰ اور اس کی ان آیات پر ایمان لانے کی دعوت دو جو اس کے وجود و وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ صالح کے وجود کا انکار کرتے تھے یا پھر غیر کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اور بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ اور یہاں آیات سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات لینا بھی جائز ہے۔ اس بناء پر ”الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا“ کی نسبت زمانہ حکایت کی طرف کرنا صحیح ہے۔ زمانہ حکایت سے مراد قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ہے۔ لیکن آیات سے مراد تو رات کی آیات لینا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد نازل ہوئیں۔

۳۔ یہاں اختصار کے لیے کچھ کلام مخدوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ ”فَذَهَبَ إِلَيْهِمْ فَدَعَاَهُمْ إِلَى الْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَ آيَاتِهِ فَكَذَّبُوهُمَا فَدَمَرْنَاهُمْ ثُمَّ دَمَرْنَا“ (یعنی وہ قوم کی طرف گئے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لانے کی دعوت دی تو قوم نے انہیں جھٹلادیا تو ہم نے انہیں (قوم کو) بالکل برباد کر دیا) کلام میں صرف اتنے الفاظ پر اکتفا کیا گیا جو سارے واقعہ سے مقصود ہیں۔ اور وہ رسولوں کی بعثت پر جہت قائم کرنا اور انہیں جھٹلانے کے سبب بربادی اور ہلاکت کا استحقاق ثابت کرنا ہے۔

وَقَوْمٌ نُّوحٌ لَّكَ كَذَّبُوا الرَّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِنَارٍ آيَةً ۝ وَاعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

”اور قوم نوح کو یاد کرو۔ جب انہوں نے جھٹلایا رسولوں کو جسے تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور بنادیا انہیں دوسرے لوگوں

کے لیے عبرت اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب جس۔“

۱۔ یہ یا تو ”أَذْهَبَ“ فعل کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر اس مضر فعل کے سبب جس کی تفسیر ”أَغْرَقْنَاهُمْ“ کرتا ہے یعنی ”أَغْرَقْنَا قَوْمَ نُوحٍ“ لیکن اسے ”دَمَرْنَاهُمْ“ میں ”ہم“ ضمیر پر معطوف کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح کیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ موسیٰ

علیہ السلام کے آنے کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم برباد ہوئی۔ حالانکہ وہ قوم ان سے پہلے تھی۔

۷۔ یہ ”قَوْمٌ ثَمُودٌ“ کو نصب دینے والے مضر فعل کی طرف ہے۔ یا اپنے مابعد فعل کی طرف ہے۔ اور کھذیب الرسل سے مراد نوح علیہ السلام اور ان رسولوں کو کھجلا نا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ یا اس سے مراد صرف نوح علیہ السلام کو کھجلا نا ہے۔ تو اس صورت میں صیغہ جمع لانے کا سبب یہ ہے کہ رسولوں میں سے کسی ایک کو کھجلا نا تمام رسولوں کو کھجلا نے کی مثل ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کا انکار کر دیا۔

۸۔ ہم نے انہیں طوفان کے سبب غرق کر دیا۔ اور ہم نے ان کے غرق یا ان کے قہے کو لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا اور ہم نے کفر کے سبب اپنے نفوس پر عظیم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

وَعَادًا وَثَمُودًا أَصْحَابُ الرَّسِّ وَغُرُوثًا بَيْنَ ذَلِكَ ۝۱۱

”اور یاد کرو تم عادی، ثمود اور اصحاب الرس کو جو ان کثیر التعداد قوموں کو جو ان کے درمیان گزریں سے“

۱۔ اس کا عطف جملہ میں ضمیر پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہو جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ یعنی ”أَهْلَكْنَا عَادًا وَثَمُودًا“ یا اس سے پہلے ”أَذْكُرُ فَعِلَ محذوف ہے۔ ان دونوں کا قصہ سورہ اعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے۔

۲۔ قاموس میں ہے کہ الرس کا معنی کسی شے کی ابتداء ہے۔ اسی سے ”زَمْسُ الْحَشَى وَزَيْبُهَا“ ہے۔ (بخاری ابتدا ہونا اور پھر اس کا پختہ ہو جانا) علاوہ ازیں اس کے یہ معانی بھی ہیں۔ وہ کنواں جسے پتھروں کے ساتھ بنایا جائے (۱)۔ صلح کرانا، فساد ڈالنا یعنی یہ اسمائے اشداد میں سے ہے۔ آذر یا نجان کی ایک وادی ہے جس پر ایک شہر تعمیر کیا گیا، کھودنا اور میت کو دفن کرنا ہے۔ اور اصحاب الرس کا اطلاق مخصوص قوم پر ہے۔ (اس نام کی متعدد وجوہات ہیں) یا تو اس لیے کہ وہ کفر اور شر ظاہر کرتے تھے اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے، یا اس لیے کہ وہ کنویں کے مالک تھے، یا اس لیے کہ وہ اس وادی کے رہنے والے تھے، یا پھر اس لیے کہ انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا اور اسے دفن کر دیا۔ یہاں ان سے مراد وہ قوم ہے جو کنویں کے مالک تھے اور اپنے مال موشی کے کران پر رہتے تھے اور عبادت بتوں کی کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف بلانے کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ لیکن انہوں نے اپنی سرکشی کے سبب حضرت شعیب علیہ السلام کو اذیت پہنچانے میں انتہائی زیادتی کی۔ پس اس اثناء میں کہ وہ کنویں کے ارد گرد اپنے گھروں میں تھے کنواں بننے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھروں اور ساز و سامان سمیت دھنسا دیا۔ اس طرح وہ تمام کے تمام ہلاک ہو گئے۔ وہ بن معین نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اسے ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ قتادہ اور بکری نے کہا ہے کہ الرس یمامہ ان کے کسانوں کا ایک کنواں تھا جنہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے۔ کہ اصحاب الرس حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے باقی رہ جانے والے لوگ تھے۔ اور وہی اس کنویں کے مالک تھے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: ثَمُودُ مَعْطَلَةٌ وَهَمَّ عِشْيَتُهُ۔ اسی طرح عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ سعید بن جبیر نے فرمایا ان کا ایک نبی تھا جسے حظلہ بن صفوان کہا جاتا تھا۔ انہوں

نے انہیں قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بہت بڑے پرندے کے ساتھ آزمایا جس میں تمام قسم کے رنگ موجود تھے۔ انہوں نے اس کا نام اس کی گردن لمبی ہونے کی وجہ سے عقی رکھا۔ وہ ان کے فتح اور فتح پہاڑ پر رہتا تھا۔ وہ ان کے بچوں پر چھینٹا اور انہوں نے اچک کر لے جاتا تھا۔ تو حظلہ نے اس کے لیے بددعا کی۔ پس اس پر آسمانی بجلی آ پڑی پھر انہوں نے حظلہ کو قتل کر دیا پھر انہیں بھی ہلاک کر دیا گیا۔

بنوئی نے کہا ہے کہ کعب، مقاتل اور سدی نے کہا ہے کہ الرس سے مراد اٹلا کیہ کا کنواں ہے جس میں انہوں نے حبیب التجار کو قتل کیا تھا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ یس میں کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ اصحاب اخذود ہیں جنہوں نے کھائی کھودی تھی۔ مگر ہم نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کو کنوئیں میں دفن کر دیا تھا (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرس کا معنی معدن ہے۔ اور اس کی جمع رساس ہے۔

۱۔ کا عطف اصحاب الرس پر ہے۔ یعنی ”وَأَهْلَكْنَا قُرُونًا“ قُرُون قُرُون کی جمع کثرت ہے۔ اور اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک زمانے سے متصل ہوتی ہے۔ قرن کی اضافت جب معین شخص یا معلوم جماعت کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جو اس شخص یا اس جماعت سے متصل اور ملنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں سے اکثر یا ان ہی میں سے کوئی ایک۔ اسی میں سے وہ قول بھی ہے جس میں تین قرون کے لیے خیر کی شہادت دی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے ”خَيْرُ الْقُرُونِ قُرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ“ (2) (سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں)۔ پس حضور نبی کریم ﷺ کا زمانہ ان صحابہ کرام کا زمانہ ہے جنہوں نے آپ ﷺ کا دیا اور کیا قرن ثانی سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا اور قرن ثالث سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا۔ اور اگر یہ مضاف نہ ہو تو اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک ہی زمانے سے متصل ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ایک جماعت ایک زمانے سے متقرن ہو تو ان کے بڑے ان کے چھوٹوں سے ملے ہوتے ہیں (یعنی وہ ان کے معاصر ہوتے ہیں)۔ پھر یہ چھوٹے بچے جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ان کے زمانے کے بچے ان کے معاصر ہو جاتے ہیں۔ علماء نے قرن کا اطلاق ایک خاص مدت پر بھی کیا ہے۔ اور وہ مدت چالیس، دس، بیس، تیس، پچاس، ساٹھ، ستر، نوے، سو یا ایک سو یا بیس سال ہے۔ صحیح کا قول یہ ہے کہ قرن سے مراد سو سال ہیں۔ اس لیے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو فرمایا ”عش قرنًا“ کہ تو ایک قرن زندہ رہے ”فعاش مائة سنة“ تو وہ سو سال تک زندہ رہا۔ تو اس بنا پر حق یہ ہوگا کہ ہم نے کثیر زمانوں میں رہنے والے کا فرق کو ہلاک کیا۔ اور ان کو جو عابد، شہود، اصحاب الرس اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے درمیان تھے اور کثیر اقرون کی صفت ہے۔

وَكَلَّا صَرَ بَالَهُ الْآمَنَالُ وَلَا تَبْرَأَنَا شَيْئًا ۝۳۱

”حق سمجھانے کے لیے ہم نے بیان کیس ہر ایک کے لیے مثالیں لے اور ہم نے سب کو نیست و نابود کر دیا۔“

۱۔ یہ اس مضر فعل کے سبب منصوب ہے جس پر ضروبنا دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی توحین مضاف الیہ کے عوض ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَأَنْتُمْ زُنَا كُلُّ وَاحِدٍ مِنْ تِلْكَ الْقُرُونِ صَرَ بَالَهُ الْآمَنَالُ (اور ہم نے ان قرون میں سے ہر ایک کو زور دیا اور ان کیلئے مثالیں

بیان کیں) یعنی ہم نے اس کے لیے پہلے قصوں میں عجیب و غریب قصے بیان کیے تاکہ وہ ان سے عبرت حاصل کریں۔
 ۱۔ ان میں سے تمام کو ہم نے مکمل طور پر ہلاک کر دیا جب انہوں نے مثالوں سے عبرت حاصل نہ کی اور ڈرانے والوں کو چٹلایا۔
 انہیں نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کی قوت کو مکمل طور پر توڑ دیا۔ زجاج نے کہا ہے: عُلِّ ضِعْبٌ خَسِرْتَهُ وَفَسَتْهُ فَقَدْ تَبَرَّتْهُ (۱) یعنی ہر وہ شئی جسے تو توڑ دے اور ریزہ ریزہ کر دے تو تو نے اس کی تعمیر کر دی۔ اسی وجہ سے سونے اور چاندی کے چورے (ریزوں) کو تیر کہتے ہیں۔

وَلَقَدْ آتَوْنَا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أَمِطَتْ مَظِلَّ السَّوْءِ ۖ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنها بَلًا
 كَانُوا لَا يَتَزَجُّونَ لِنُسُورِهَا ۝۱

”اور کئی بار گزرے ہیں یہ شرک اس قصبہ کے پاس سے جس پر پتھر اڑا گیا تھا بری طرح ۱۔ کیا (وہاں سے گزرتے ہوئے) وہ اسے نہیں دیکھا کرتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں دوبارہ جینے کی امید ہی نہیں ہے۔“

۱۔ یہ محض قسم کا جواب ہے۔ اور وَلَقَدْ آتَوْنَا مُوسَى الْكِتَابَ پر معطوف ہے۔ اور ضمیر اہل مکہ کی طرف راجع ہے۔ اس میں بعض کا فعل تمام کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے: لَقَدْ لَبِثُوا لَكُمْ زُفُوءًا، یعنی ”وَاللّٰهُ لَقَدْ مَرَّ اَهِلْ مَكَّةَ“ یعنی ان میں سے اکثر شام کی طرف اپنے سفروں کے دوران ان مقامات سے گزرے ہیں۔ یعنی سدوم عظمیٰ کی قوم لوط کی بستیاں ہیں جن پر پتھر برسائے گئے اس لیے کہ وہ اعمال بد کیا کرتے تھے یعنی وہ مردوں کے ساتھ دہروں میں لواطت کا عمل کرتے تھے۔ بغویٰ نے کہا ہے کہ قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں جن میں سے چار کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا۔ اور ان میں سے ایک چھوٹی سی بستی اس سے بچ گئی۔ اس لیے کہ اس کے باشندے اس فعل بد کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بستیاں اہل مکہ کے شام کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھیں۔

۲۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انہیں ضرور دیکھا ہے تو پھر انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی۔ اور نہ ہی نصیحت حاصل کی۔ اور ان کا نصیحت حاصل نہ کرنا ان کے نہ دیکھنے کے سبب نہیں بلکہ اس کا سبب ان کے دلوں کا اندھا ہونا ہے۔ اور دوبارہ زندہ کیے جانے اور آخرت کی توقع کی نہیں رکھتے یا دوبارہ جینے کی وہ اس طرح امید نہیں رکھتے جس طرح مومنین اس میں ثواب حاصل ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ یا بخلت تھا کہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کا خوف نہیں رکھتے۔

وَإِذَا مَرَّ أَوَّلُكَ إِن يَتَّخِذْ وَنَكَ إِلَّا هُزُوءًا ۖ أَهَذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۝۲

”اور جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتا شروع کر دیتے ہیں۔ (کہتے ہیں) کیا یہ وہ صاحب ہیں جن کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔“

۱۔ اس کا عطف لَا يَتَزَجُّونَ پر ہے۔ یہ (ان تافہ ہے) یعنی مَا يَتَّخِذُونَكَ اسْتِثْنَاءً مَفْرُغٌ ہے اور يَتَّخِذُونَكَ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ هُزُوءٌ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی مَهْزُؤًا به (جس کا مذاق اڑایا جائے) بغویٰ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرتے تو استہزاء کرتے ہوئے کہتے

”اٰهَذَا“ اور اس سے وہ اشارہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر یہ ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اٰهَذَا کا مکمل جملہ صریح مَحْذُوف کا معمول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”يَقُولُونَ اٰهَذَا الَّذِي يُبْعَثُ اللّٰهُ رُسُلًا“ (وہ کہتے ہیں کیا یہ ہے وہ جسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے) اس میں استہمام تعجب اور انکار کے لیے ہے۔ اور هَذَا کا کلمہ فقیر کے لیے ہے۔ اور يقولون کا مکمل جملہ سابقہ کلام بہت خدو نک مہزوا بہکا بیان ہے۔

اِنْ كَاذِبِيْنٰ عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوَلَا اَنْ صَدَرْنَا عَلَيْهَا ۖ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حٰجِيْنَ
يَرُوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَصْلٰ سَيِّئًا ۝

”قریب تھا کہ یہ شخص ہمیں بہکا دیتا اپنے خداؤں سے لے اگر ہم ثابت نہ رہے ہوتے ان کی (پوجا) پر۔ (اے صیب) یہ جان لیں گے جب (ہمارے) عذاب کو دیکھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا ہے (راست) سے لے۔“

یعنی قریب تھا کہ وہ وحید کی طرف دعوت دینے میں اپنی حدود پر کوشش، اسے جلدی ذہن نشین کرانے والے کثیر دلائل اور معجزات لانے کے سبب ہمیں اپنے خداؤں کی عبادت سے پھیر دیتا۔ یہ اِنْ مخففۃ عن المقتضی ہے۔ اور لام اِنْ نافیہ اور اِنْ مخففہ میں فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں دعوت تو حید دینے میں بہت زیادہ کوشش کی اور ان کے لیے وافر اور کثیر مقدار میں معجزات پیش کیے حتیٰ کہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس کیفیت تک پہنچ گئے کہ وہ اپنے غلط اور بیزہدے دین کو آپ ﷺ کے صحیح اور سیدھے دین کے لیے چھوڑ دیتے اگر وہ اپنے خداؤں کی عبادت کرنے میں حدود پر مضبوط اور پختہ نہ ہوتے۔ اور جس کی حالت یہ ہو کہ وہ اتنے کثیر مقدار میں واضح معجزات دیکھنے کے باوجود فصاحت حاصل نہ کرے تو وہ خالی بستیوں کے پتھروں کو دیکھ کر کیسے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

لے اگر ہم ثابت نہ رہتے اور ان کی عبادت میں پختہ نہ ہوتے۔ لَوْ لَکَا جَوَاب مَحْذُوف ہے اور اس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”لَوْ لَا صَبَرْنَا قَابِتْ اَوْ لَوْ لَا فَتَتْ صَبَرْنَا لَا صَلٰتْنَا“ (اگر ہمارا صبر ثابت نہ رہتا تو وہ ہمیں ضرور بہکا دیتا) ایسے مقامات پر لَوْ لَا معنی کے اعتبار سے محکم مطلق کا قاعدہ دیتا ہے نہ کہ لفظ کے اعتبار سے جب ان کا یہ کلام احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے ضلال کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرف کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا ”وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حٰجِيْنَ“ یہ روئے العذاب من اٰلہہ سبیلہ“ یہ جان لیں گے کہ کیا وہ راستے سے بھٹکنے والے ہیں یا مومنین۔ تو اس میں وعید بھی ہے اور اس پر دلالت بھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑے گا نہیں۔

اَمْ رَءِیْتُمْ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هُوْلًا ۖ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَاٰیٰتًا ۝

”کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا اس (اجن) کو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو۔ کیا آپ اس کے ممدوار ہیں؟“

لے اس طرح کہ اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھی اس نے نہ کوئی حجت سنی اور نہ کسی دلیل کی طرف دیکھا۔ اسی اہتمام کے لیے مفعول عانی کو مقدم کیا۔ امام ابو نعیم نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا ہے اور پتھر کی طرف مائل ہو کر اس کی عبادت کرنے لگے؟ یہ من بشرطہ ہے۔ اور اس کی جزاء یہ ہے ”اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَاٰیٰتًا“ و کجیل سے مراد وہ حفاظت کرنے والا ہے جو اسے اس (نظریہ) سے روک دے

یعنی مائع جملہ شرط یہ راہت کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ پہلا استفہام تقریر اور تعجب کے لیے ہے اور دوسرا انکار کے لیے۔ یعنی آپ ان کے محافظ نہیں ہیں۔ بلکہ نے کہا ہے کہ آیۃ القتال اس کی ناخ ہے۔ (1)

أَمْ تَحْصِبُ أَنْ أَكْثَرَهُمْ يَسْعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنَّهُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝۳۰

”کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا (کچھ) سمجھتے ہیں نہ نہیں ہیں یہ گمراہوں کی مانند،

بلکہ یہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔“

لے یہ ام قطعہ ہے، یعنی بل احتساب (بلکہ آپ کیا خیال کرتے ہیں) کہ ان میں سے اکثر آپ سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے ہیں یا وہ سمجھتے ہیں جو (منہوم) اس نے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی بے شک نہ وہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر ہمہ لگا رکھی ہے۔ یہاں سے مراد ان کے دلوں کا منہا ہے کہ وہ مواخذہ اور دلائل سے نفع نہیں اٹھا سکتے۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ برہان کا معلوم نتیجہ کا فائدہ دینا امر عادی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ ان میں سے بعض ایمان لائے تھے اور بعض نے حق کو سمجھا تھا لیکن تکبر یا ریاست کے خوف سے مخالفت کرتے رہے۔

لے ”إِنَّهُمْ“ وہ نہیں ہیں۔ یہ ضمیر (اکثرہم) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وہ اپنے کانوں سے چو پاؤں کی طرح سنتے ہیں لیکن اپنے دلوں سے نہیں سنتے اسی لیے وہ اس سے نفع حاصل نہیں کر سکتے اور جن دلائل اور معجزات کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں ان میں وہ غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ چو پاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ کیونکہ چو پاؤں کو تو حق اور باطل کا ادراک ہی نہیں ہوتا اور نہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق گمان کرتے ہیں۔ پس چو پائے جہل بسیط ہیں اور کفار جہل مرکب ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو جہل مرکب کے سبب جاہل ہو وہ اس کی نسبت زیادہ گمراہ اور حق سے دور ہوتا ہے جو جہل بسیط کے سبب جاہل ہو۔ چو پائے تو حق اور باطل کے درمیان تمیز ہی نہیں کر سکتے اور کفار شرک کی حقیقت جانتے ہیں اور بلا دلیل بلکہ بظان کے ظاہر ہونے کے باوجود پتھروں کی عبادت کرتے ہیں اور دلائل اور معجزات کا مشاہدہ کرنے اور برہان واضح ہونے کے باوجود رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ یہ وہ بھی بیان کی گئی ہے کہ چو پائے اس کی بیرونی کرتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اپنے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے کو اس سے ممتاز کرتے ہیں جو اس سے برا سلوک کرتا ہے۔ اور وہ اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے اور اس سے دور رہنا ہوا کرتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کفار نہ تو اپنے رب کی بیرونی کرتے ہیں اور نہ وہ اپنے رب کا احسان شیطان کی برائیوں کے مقابلہ میں پہچانتے ہیں۔

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ چو پائے اپنے خالق کو پہچانتے ہیں، اسے عبادہ کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و تحمید بیان کرتے ہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں اگرچہ عوام ان کی عقل کا ادراک نہیں کر سکتے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس اثناء میں کہ ایک آدمی گائے بانک کر لا رہا تھا جب وہ تھک گیا تو اس پر سوار ہو گیا۔ تو گائے نے کہا میں

ہے۔ یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

سے پھر ہم نے آفتاب کو سائے پر دلیل بنادیا۔ یعنی اگر سورج (دھوپ) نہ ہوتا تو سایہ سائے کی صورت میں نہ پہچانا جاتا اور اگر نور نہ ہوتا تو کوئی تاریکی کو نہ پہچانتا۔ کیونکہ چیزوں کی پہچان انہی تضادات سے ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ سایہ کا وجود اور اس میں تفاوت سورج کی حرکات کے سبب ہوتا ہے۔ اور اس آیت میں غیب سے منظم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

لَمْ يَخْشَ الْيَمِينُ الْقَبْضَ ۖ إِنَّهُ يُدْرِكُ

”پھر ہم پہنچتے جاتے ہیں سایہ کو اپنی طرف لے آہستہ آہستہ لے“

لے پھر ہم نے اسے سورج کے طلوع ہونے، اس کے بلند ہونے اور سایہ کی جگہ پر اس کی شعاعیں پڑنے کے سبب زائل کر دیا۔ کیونکہ سائے کے پھیلانے کو خدا اور اس کے زائل کرنے کو قبض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ”إِنَّمَا“ یعنی اس جگہ کی طرف جس کا ہم اس سے ارادہ کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القبض الی نفسہ روکنے سے کنایہ ہے۔

لَمْ يَخْشَ الْيَمِينُ الْقَبْضَ ۖ اسے مراد یہ ہے کہ آسانی سے بغیر کسی مشکل کے یا تھوڑا تھوڑا کر کے جیسے سورج بلند ہوتا ہے سایہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اور اگر غل سے مراد رات کی تاریکی ہو تو قبضۃ الیمر کا معنی ہوگا طلوع فجر کے وقت آہستہ آہستہ تاریکی کو زائل کرنا۔ آہستہ آہستہ تاریکی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ روشنی بہت زیادہ ہو جاتی ہے پھر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان تمام مقامات سے تاریکی دور ہو جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں۔ اور ان مقامات سے تاریکی کم ہو جاتی ہے جہاں اس کی روشنی پردوں میں سے واقع ہوتی ہے اور یہ نور پردوں کے مختلف ہونے کے اعتبار سے کم و بیش ہوتا ہے۔ دونوں مقامات پر لفظ ”لَمْ“ سورج کے ظاہر ہونے کے اوقات کے تضاد کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ گویا یہاں ان دونوں کے درمیان تضاد کے اعتبار سے جو بعد پایا جاتا ہے اسے حوادث کے مابین وقت کے اعتبار سے پائے جانے والے بعد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور میرے نزدیک یہاں اس کی دوسری تاویل بھی ہے وہ یہ کہ قیل سے مراد عالم امکان لیا جائے کیونکہ مرتبہ الوجود کا قیل خارج قلیل میں وجوب قلیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسماء کے مراتب لیے جائیں۔ اور معنی یہ ہوگا کہ آپ نے اپنے رب کی صفات کی طرف نہیں دیکھا اس نے عالم امکان کیسے بنایا اور ان مہابت کی صورتوں پر پھیلنے والے وجود کو پھیلا یا جو حق کے وجود کا قیل ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو وہ اسے ایک ہی حالت میں ٹھہراتے ہوئے ساکن بنا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، بلکہ اسے تغیرات اور فنا کے لیے تیار کرتے ہوئے حوادث کا قیل بنایا تاکہ اس کا ممکن ہو تا اور اس مہابت کا محتاج ہونا واضح ہو جائے جو اہل الوجود ہے اور اس کی ذات واجب اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ اور جس وقت صوفی نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بصیرت قلبی سے حق کے وجود کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس وقت اس کے لیے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ عالم امکان اس کے ظلال میں سے ایک قیل ہے۔ حالانکہ ان تجلیات اور مشاہدات سے قیل وہ یہ گمان رکھتا تھا کہ عالم امکان فی الحقیقت موجود ہے۔ پھر ان تجلیات اور مشاہدات کے بعد ہم نے اسے اپنی طرف سمیٹا یعنی ہم نے اسے چن لیا اور ہم نے اسے ایسا قریب عطا کیا جو کسی کیفیت سے متکلیف نہیں، اپنی صفات اور ذات کے مراتب کی طرف آہستہ آہستہ قریب کرتے ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رب کریم نے فرمایا ”لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أَحْبَبْتُهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ

الْحَدِيثُ (1) "میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی قوتِ سماعت ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔" اور صوفیہ نے کہا ہے "مَنْ اسْتَوَى يَوْمَهُ فَهُوَ مَغْبُورٌ" (جس کے دو دن برابر ہوں گے یعنی ترقی و درجات نہ کرے تو وہ ضعیف المرأے ہوگا یعنی وہ خسارے میں ہوگا)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لِیَاسَاؤَ النَّوْمِ سُبَاتًا وَجَعَلَ لَكُمُ النَّشُورَ ﴿۱۰﴾

"اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے رات کو لباس اور نیند کو باعثِ راحت اور بنایا ہے دن کو (طلبِ معاش کے لیے) دوڑ دھوپ کا وقت ل۔"

ل۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لِیَاسَاؤَ اس میں رات کی تاریکی کو ڈھانپ دینے کے وصف میں لباس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (یعنی تیرا رب وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا) اور نیند کو ابدان کے لیے راحت بنایا اس طرح کہ اس سے مشاغل و مصروفیات منقطع ہو جاتی ہیں۔ سبت کا اصل معنی کاٹنا ہے۔ یا سبات کا معنی موت ہے۔ (یعنی نیند کو موت بنایا) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ اسی وجہ سے میت کو مُسَبُّوت کہا جاتا ہے۔ اور دن کو دوڑ دھوپ کرنے اور منتشر ہونے کا وقت بنایا اس میں لوگ دینی اور دنیوی منافع کے حصول کے لیے بھٹک جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي اَرْسَلَ الرِّيحَ بِشْرَ الْبَيْتِ يَدُكَ رَحْمَةً ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴿۱۱﴾

"اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری دینے کے لیے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے ل۔ اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی۔ ج۔"

ل۔ ابنِ کثیر نے الرِّيحَ کو صحرانے کر صیغہ واحد کی صورت میں الرِّيحَ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے افراد کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ جمع کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور "نُشْرًا" کو جمہور نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح یہ نُشُور سے ماخوذ ہے۔ ابنِ عامر نے اسے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ تخفیف کی صورت پڑھا ہے۔ حالانکہ اصل میں شین پر ضمہ ہے۔ اس صورت میں یہ ناشرۃ کی جمع ہے۔ یعنی بادلوں کو گھیرنے والی ہوا۔ جزہ اور کسائی نے اسے نون کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ مفت بیان کی گئی ہے اور عامر نے اسے باء کے ضمہ اور شین مخفہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نُشُور یہ بشیر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے خوشخبری دینے والی۔ "بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَةٍ" سے مراد بارش سے پہلے ہے۔

ج۔ وَاَنْزَلْنَا میں غیب سے نغم کی طرف التفات کے طریقے پر اس کا عطف ارسل پر ہے۔ اور الطُّهُورُ سے مراد وہ شے ہے جس سے پاکیزگی و طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ حور سے مراد وہ شے ہوتی ہے جس سے بحری کی جائے اور فطور سے مراد وہ جس سے افطاری کی جائے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں ہے کہ بے شک پاک مٹی مسلمان کے لئے طہارت کے حصول کا سبب ہے۔ جبکہ وہ پانی نہ پائے اگرچہ ایسا دس سال تک ہو (2)۔ اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "ہمارے لیے تمام زمین مسجد بنادی گئی ہے اور اس کی مٹی کو پاک کرنے والا بنایا گیا ہے (3)۔ یا پھر طہور مصدر ہے جیسا کہ قول۔ چنانچہ آقائے دو جہاں رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا

منذال لے تو اس کی پاکیزگی اس میں ہے کہ وہ اسے سات مرتبہ دھوئے اور ان میں سے پہلی مرتبہ منی کے ساتھ صاف کرے (۱)۔ اسے امام مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ پانی (ماء) کی اس کے ساتھ صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے۔ اور کوئی صفت مبالغہ کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مبہور، مشہور، قطوع اور ضحک۔ یہ پاکیزگی میں کامل ہونے کے معنی میں ہے۔ امام بنوئی نے لکھا ہے کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ طہور سے مراد وہ شے ہے جس سے بار بار طہارت حاصل ہو۔ جیسا کہ مبہور اس شے کا نام ہے جس سے بار بار صبر کیا جائے اور شکر اس شے کا نام ہے۔ جس سے بار بار شکر ادا کیا جائے۔ یہ حضرت امام مالک کا قول ہے اسی لیے انہوں نے اس پانی سے وضو جائز قرار دیا ہے جسے ایک بار وضو کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کوئی شے نہیں۔ کیونکہ فَعُولی کے وزن پر صیغہ نہ تو کسی شے میں عمل کرنے (تفعیل) پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی تکرار پر، بلکہ مبالغہ پر بھی دلالت نہیں کرتا ہے۔ مگر یہ جو کہا جاتا ہے۔ ”الْكَمَالُ فِي الطَّاهِرِيَّةِ“ تو اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ طاهر فی نفسہ اور مطہر لغیرہ ہے۔ (یعنی یہ خود پاک ہے اور دوسرے کو پاک کرنے والا ہے) اور پانی کا اس صفت سے متصف ہونا تو نصوص، اجماع اور نقل و متواتر سے ثابت ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شے نجس نہیں بنا سکتی۔ یہ قول حضرت امام مالک نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا پانی کو کوئی چیز نجس نہیں بنائے گی (۲)۔ اسے امام احمد، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اصحاب سنن اربعہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ”ان الماء لا ينجس“ (کہ بے شک پانی نجس نہیں ہوگا)۔ دارقطنی نے اسے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے، طبرانی نے الاوسط میں، ابویعلیٰ، بزار اور ابویعلیٰ بن الحسن نے اپنی صحاح میں حدیث شریک سے نقل کیا ہے اور احمد، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی کیا ہم بئر بضاع سے وضو کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں حیض کے پیزے کے تھوک کا گوشت اور بدبودار چیزیں جھنگی جاتی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”بے شک پانی اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شے پلید نہیں کر سکتی“ (۳)

ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حوضوں پر درختے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں ان کے لئے وہ پانی ہے جو وہ اپنے پیچوں میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کے علاوہ وہ پانی ہے جو پاک ہے (۴)۔ اگر کہا جائے کہ یہ احادیث بالا جماع متروک ہیں حتیٰ کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک جب تبدیل ہو جائے تو وہ نجاست گرنے سے پلید ہو جاتا ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ جب پانی کے اوصاف میں سے کوئی تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ماء مطلق نہیں ہوتا اور ہمارا کلام تو الماء المطلق کے بارے میں ہے۔ اور اس استدلال کا جواب کہ یہاں ماء سے مراد ماء ممہود ہے۔ یعنی وہ کثیر پانی جو حوضوں اور بئر بضاع میں موجود ہے یا اسی کی مثل کہیں موجود ہو۔ تاکہ ان احادیث اور دوسری ان احادیث کے درمیان تعارض ختم ہو جائے جو نجاست واقع ہونے کے سبب پانی کے پلید ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اگرچہ اس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیل نہ ہو۔

ان میں سے آپ ﷺ کا ایک قول یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منذال دے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ

ہے کہ اسے سات مرتبہ دھویا جائے اور ان میں سے پہلی مرتبہ منی سے (پاک کیا جائے) اسے مسلم اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی یہ ہے کہ تم میں سے کسی کو نہیں چاہئے کہ وہ ایسے کھڑے پانی میں پیشاب کرے جو جاری نہ ہو اور پھر اسی سے وضو کرنا ہو (1) متفق علیہ۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ ایک حدیث طیبہ اس طرح ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی نیند سے بیدار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ کسی برتن میں داخل نہ کرے یہاں تک کہ انہیں تین مرتبہ دھو لے کیونکہ تم میں سے کوئی انہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا (2)۔ اسے امام مالک، شافعی، احمد، بخاری، مسلم اور اصحاب سنن رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی قسم کی حدیث حضرات ابن عمر، جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے۔

ہم نے ان احادیث کو مابقیہ (تھوڑے پانی) پر محمول کیا ہے جو پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور جو اس کے نجس نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انہیں پانی کی کثیر مقدار پر محمول کیا ہے۔ اب کثیر پانی کی مقدار کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلعے ہو جائے تو وہ کثیر ہوگا اور وہ اس وقت تک نجس نہیں ہوگا جب تک نہاست کے ساتھ اس کا ذائقہ، رنگ یا بو تبدیل نہ ہو جائے۔ اور اگر پانی کی مقدار اتنی نہ ہو تو وہ قلیل ہوگا اور وہ پلید ہو جائے گا۔ (قلۃ) سے مراد وزن کے اعتبار سے پانچ سو رطل بغدادی اور پیناکش (مساحت) کے اعتبار سے طوآن، عرضاً اور عمقاً ایک ذراع اور ایک ذراع کا چوتھائی حصہ ہے)

امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر پیمان کرنے والوں کی ایک بڑی رائے کے مطابق نہاست پانی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نہ پہنچے تو وہ پانی کثیر ہوگا ورنہ قلیل ہوگا۔ متاخرین میں سے بعض نے کثیر پانی کی مقدار دوس دروس مقرر کی ہے۔ علاوہ ازیں پندرہ در پندرہ، بارہ و بارہ، آٹھ در آٹھ اور سات در سات ذراع الکر باس کپڑے کا گز کے ساتھ بھی مقدار مقرر کی گئی ہے۔ ذراع الکر باس سے مراد یہ ہے کہ ایسا ہاتھ جس میں سات قبضے ہوں اور ہر قبضہ میں چار انگلیاں ہوں۔ کثیر پانی کی یہ مقدار امام اعظم ابو حنیفہ اور صاحبین میں سے کسی سے بھی منقول نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ شارع کی جانب سے کوئی خاص مقدار مروی نہیں ہے۔ اور فقہین کی حدیث ضعیف ہے۔ لہذا اسے پہچاننے والے کی رائے کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ جبکہ امام شافعی اور امام احمد نے حدیث الفقہین سے استدلال کیا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام شافعی، احمد، اصحاب سنن اربعہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دارقطنی اور بیہقی نے عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب عن ابیہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جس پر درندے اور چوپائے آتے ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب پانی دو قلعے ہو تو وہ پلید نہیں ہوگا (3)۔ اور حاکم کے الفاظ یہ ہیں کہ جب پانی دو قلعے ہو تو کوئی شے اسے نجس نہیں کرتی۔ (4) ابن ماجہ اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ وہ پانی نجس نہیں ہوگا (5)۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور ان دونوں نے اس کے صحیح رواۃ سے استدلال کیا ہے۔ ابن مندہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام طحاوی نے بھی اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

2- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 28 (وزارت تعلیم)

4- مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 225 (احمدیہ)

1- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 37 (وزارت تعلیم)

3- سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

5- سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا دارودمدار ولید بن کثیر پر ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن جعفر بن زبیر سے روایت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن عباد بن جعفر سے اور کبھی وہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر اور کبھی عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتا ہے۔؟ تو ہم یہ کہیں گے۔ کہ حافظ نے کہا ہے کہ یہ اضطراب جرح کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ یہ تمام کے تمام محفوظ ہیں اور ان میں ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ کی طرف عی انتقال ہے۔ اور ان میں تحقیق کے مطابق صحیح سند اس طرح ہے: عن الولید بن کثیر عن محمد بن عباد بن جعفر عن عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر النکمر رضی اللہ عنہم اور عن محمد بن جعفر بن زبیر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر البصری رضی اللہ عنہم۔ اور جس کسی نے اس کے علاوہ دوسری سند سے اسے نقل کیا ہے تو اسے وہم ہوا ہے۔ اور مذکورہ دونوں سندوں کے مطابق ولید بن کثیر سے حدیثین کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے۔

دارقطنی نے کہا ہے کہ دونوں قول بن الاسام عن الولید صحیح ہیں۔ اور اس کی ایک تیسری سند بھی ہے کہ اسے حاکم وغیرہ نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی سند سے اسے روایت کیا ہے۔ ابن مثنیٰ سے اس سند کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اس کی سند جید ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کسی روایت میں یہ الفاظ ہیں "لم یحمل حبشاً" کسی میں یہ ہیں "لم یُحْمَلْ شَيْءٌ" اور کسی میں یہ مروی ہیں "لَا يَنْتَحِشُ" (تو پھر یہ کیسے قابل جہت ہو سکتی ہے)؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا دارودمدار روایت بالعمی پر ہے۔ اور روایت بالعمی صحیح ہوتی ہے۔ اور متن میں تعارض کا قول اس وقت تک نہیں کہا جاسکتا جب تک (معنی میں) تعارض موجود نہ ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت حرف شک کے ساتھ مروی ہے یعنی قلین اور ثلاثاً (دو قلعے یا تین) جیسا کہ امام احمدؒ نے کتب سے اور دارقطنی نے یزید بن ہارون سے اور پھر انہوں نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر عن ربیعہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جب پانی دو یا تین قلعے ہو جائے تو پھر اسے کوئی چیز ٹاپاک نہیں کرتی؟ (1)

تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے کہ حماد سے روایت میں اختلاف ہے کیوں کہ ان سے ابراہیم بن حجاج نے روایت کی اور اس کی تہذیب و تنقیح کی اور پھر کامل بن طلحہ نے اسے روایت کیا۔ تو ان تمام نے کہا دو قلعے یا تین۔ اور حماد سے ہی عقال، یعقوب بن اسحاق حضرمی، بشر بن سری، علاء بن عبد الجبار، رمی بن اسامیل اور عبید اللہ بن رمیٰ العسلی نے روایت کیا کہ جب پانی دو قلعے ہو جائے۔ اور انہوں نے تین کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور یزید بن ہارون سے بھی اختلاف ہے کہ ان سے ابن السہاح نے شک کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بغیر شک کے۔ لہذا ان کے قول پر عمل کرنا واجب ہے جنہوں نے بغیر شک کے یقین کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ او کا کلمہ شک کے لیے نہیں بلکہ تردید اور تحقیر کے لیے ہو۔ اور معنی یہ ہو کہ دو مقدمہ داروں میں سے جس تک بھی پانی پہنچ جائے وہ پلید نہیں ہوگا۔ لہذا جب پانی کی مقدار دو قلوں تک پہنچ جائے تو وہ اسی طرح نجس نہیں ہوگا جیسا کہ اس کی مقدار تین قلعے ہونے کی صورت میں وہ نجس نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ چالیس قلوں کی روایت بھی موجود ہے جیسا کہ دارقطنی، ابن عدی اور عقیلی نے قاسم بن عبد اللہ العمری عن محمد بن منکدر عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی چالیس قلوں تک پہنچ جائے تو پھر وہ ٹاپاک نہیں ہوگا" (2)۔ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ امام احمدؒ

نے قاسم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن معین، ابو حاتم الرازی اور ابو زرعہ نے کہا ہے۔ لہذا اس کی روایت کے سبب حدیث صحیح مضطرب نہیں ہوگی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دارقطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ روح بن قاسم عن محمد بن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طریق سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ ”کہ جب پانی چالیس قلعے ہو جائے تو وہ نجس نہیں ہوتا“ (1) اسی طرح کعب بن عصفیٰ ثوری عن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ عبدالرزاق عن معمر بن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی اسی طرح مذکور ہے۔ اور پھر راوی کا قول اس روایت کے خلاف ہے جس کے بارے میں اس نے حدیث پر طعن ذکر کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ شرط کا مفہوم مطلقاً امام ابو حنیفہ کے نزدیک جنت نہیں۔ اور اسی طرح وہ امام شافعی وغیرہ کے نزدیک بھی جنت نہیں جب وہ سوال کی مطابقت سے خارج ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ قُلَّة کا لفظ مشترک ہے۔ اس کا اطلاق کوزے پر بھی ہوتا ہے اور گھڑے پر بھی۔ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ لہذا چالیس کی حدیث کو ایسے چھوٹے قلوں پر محمول کیا جائے گا جن میں سے میں ایک بڑے قلعے کے مساوی ہوں گے تاکہ تنازع ختم ہو جائے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب قُلَّة کا لفظ گھڑے، مشکیزے، ڈول اور پہاڑ کی چوٹی وغیرہ معانی میں مشترک ہے جیسا کہ قاسم میں ہے کہ الْقُلَّة بالضم سے مراد سر، کوہان اور پہاڑ کی بلند جگہ ہے۔ یا ہر شی کی بلند جگہ کو قُلَّة کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بڑا کنواں، بڑا گھرا چھوٹا گھرا یا مٹی سے بنا ہوا پیالہ اور چھوٹے کوزے کو قلعہ کہا جاتا ہے (2)۔ اور حدیث صحیح مرفوعہ میں قتال جہری قید ثابت نہیں۔ اور وہ حدیث جو ابن عدی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے ”کہ جب پانی قتال ہجر میں سے دو قلوں تک پہنچ جائے تو کوئی شئی اسے نجس نہیں کرتی“ (3)۔ اس کی سند میں مغیرہ بن یحسان راوی منکر الحدیث ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اس حدیث پر عمل چھوڑ دیا جائے جس کا معنی مراد متنازع اور ظاہر نہ ہو۔ جیسا کہ مجلس روایت کا حکم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے امام طحاوی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے لیکن قلعین کا یقینی علم نہ ہونے کے سبب ہم نے اس پر عمل ترک کر دیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کے معانی میں سے ایک معنی بوجہ ارنج ہے اور وہ ہے قتال ہجر۔ لہذا اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اس کا معنی پہاڑ کی چوٹی اور سر اور کوہان کی بلند جگہ مراد لینا بالا جماع درست نہیں۔ کیونکہ پانی کا پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنا بحر محیط یا طوفان کے وقت ہی تصور ہو سکتا ہے۔ اور اعلیٰ الواسع والسنام مراد لینا بھی بالا جماع درست نہیں کیونکہ پانی اکثر اس مقدار سے کم ہوتا ہے۔ لہذا برتنوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اور برتنوں کی طرف متوجہ ہونے کے بعد قتال ہجر مراد لینا بوجہ ارنج ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اہل عرب لفظ قُلَّة اکثر اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ابو سعید نے کتاب الطہور میں کہا ہے۔ یعنی نے کہا ہے کہ قتال ہجر ان کے نزدیک مشہور تھے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شب معراج ان کے ساتھ تشبیہ دی۔ جب آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا تو فرمایا اس کے پتے باقی کے کانوں کی مثل ہیں اور اس کا پھل قتال ہجر کی مثل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قتال ہجر ان تمام میں سے بڑے تھے۔ اسی طرح ازہری نے کہا ہے۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کا عدد کے اعتبار سے حد مقرر فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد بڑے ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بڑے پر قدرت ہونے کے باوجود دو چھوٹے قلوں کو مقرر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان سے مراد بڑے قلعے ہیں کیونکہ اگر ان سے چھوٹے قلعے مراد ہوں تو پھر جب

پانی دو بڑے تلوں کی مقدار تک پہنچ جائے تو بدرجہ اولیٰ نجس نہیں ہوگا کیونکہ چھوٹا قلدہ بالیقین بڑے قلدہ میں پایا جاتا ہے۔ لہذا ہم نے احتیاطاً اسے دو بڑے تلوں پر محمول کیا ہے۔ اسی سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اگر کہا جائے کہ حدیث القلعتین کو حافظ ابن عبد البر، العاصمی، اسماعیل بن اسحاق اور ابوبکر بن الولی المالکیوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے جو مذہب امام شافعی نے اختیار کیا ہے وہ نظر و فکر سے اعتبار سے ضعیف ہے اور اثر کے اعتبار سے ثابت نہیں کیونکہ یہ وہ حدیث ہے جس کے بارے میں اہل علم کی جماعت نے کلام کی ہے۔ کیونکہ کسی اثر میں قلعیت کی مقررہ مقدار ثابت نہیں۔ اور نہ اجماع سے ثابت ہے۔ ہم کہتے ہیں مذکورہ بالا سوالوں کے بارے میں ان کے محمل اقوال ہیں اور اس کے روات میں سے کسی کے ضعف کے بارے میں کسی نے کوئی قول نہیں کیا۔ کیونکہ وہ صحیحین کے رواقہ ہیں جب مذکورہ سوالات کے جوابات ظاہر ہو گئے تو ان کے اعتراضات ختم ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ :- بالا جماع پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ وضو اور غسل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ رب کریم نے ارشاد فرمایا قَدْ تَجَدَّدُوا مَاءَكُمْ فَتَجَدَّدُوا أَصْلَابَكُمْ (سوال یہ ہے) کیا پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ نجاست حقیقیہ سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں جمہور نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے جائز ہے۔ امام بغویؒ نے جمہور کا استدلال اسی آیت سے کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت میں بطور بعضی مطہر ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَتَوَلَّوْا عَنكُمْ مَنَاقِبَ الشَّعْبِ مَلَاكٍ يَنْظُرُونَ (سوال یہ ہے) ثابت ہوا کہ تطہیر پانی کے ساتھ مختص ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ نجاست کو زائل کرنا جائز ہے تو اس کے ساتھ حدت کو زائل کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ پانی کا مطہر ہونا پانی میں تطہیر کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ پانی کا ظاہر ہونا طہارت کے اس کے ساتھ محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احداث اور انجاست کے درمیان فرق یہ ہے کہ حدت نجاست حکمیہ غیر مرئیہ ہے اس کے وجود اور زوال کا ادراک شریعت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور پانی کے استہمال سے اس کا زائل ہونا نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ لیکن پانی کے بغیر کسی اور کے استہمال سے اس کا زوال نص اور اجماع سے ثابت نہیں۔ اور قیاس سے اس کا اثبات بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں اصل ہی قیاس کے طریقوں سے معدول ہے۔ اور نجاست حقیقیہ دیکھائی دینے والی نجاست ہے اور اسے پانی کے ساتھ زائل کرنا معقول ہے۔ کیونکہ پانی ظاہر ہے اور نجاست کو زائل کر سکتا ہے۔ لہذا اسی معنی مشترک کی وجہ سے دیگر تمام مائعات کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب پانی نجس چیز پر اغلا جائے تو وہ پانی پہلی ملاقات کے ساتھ ہی نجس ہو جاتا ہے۔ لہذا میں ایسا مت مرتبہ دھونے کے ساتھ طہارت کا حاصل ہونا مرتبہ ہی ہے۔ اور نیچوڑنے کے ساتھ پانی کے جمیع اجزاء اس ہی سے خارج نہیں ہوتے۔ لہذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کپڑا اور اس کی مثل کوئی شے دھونے کے ساتھ پاک نہ ہو۔ اسی وجہ سے سابقہ شریعتوں میں کپڑے کو نجاست کی جگہ سے کاٹ دیا جاتا تھا۔ تو جب دھونے کے سبب طہارت کا حاصل ہونا ہی شریعت سے خلاف قیاس ثابت ہے تو پھر پانی پر دیگر مائعات کو قیاس کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ :- ہمارے نزدیک جب طرح پانی میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اسی طرح اگر نجاست پر پانی گرے تب بھی پانی نجس ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں نجس ہونے کا سبب پانی کے ساتھ نجاست کا ملنا ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ علامہ ابن جوزی نے حضرت امام احمدؒ کا یہ مذہب ذکر کیا ہے کہ نجاست کا دھون (غسل) کھجھل کے پاک ہونے کے بعد

جدا ہوا اور وہ غیر متحیر ہو۔ تو وہ پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین پر جب پیشاب یا اسی کی مثل کی کوئی نجاست ہو تو جب اسے کثیر پانی کے ساتھ بہا دیا جائے اور پانی میں تغیر رونما نہ ہو تو پھر پانی اور جگہ دونوں کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہی قول امام مالک اور شافعی کا ہے۔ اور اس پر استدلال حضرت انس بن مالک ؓ کی حدیث سے کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اچانک ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام میں سے ایک کو فرمایا اٹھو، پانی کا ڈول لاؤ اور اس پر بہاد (1)۔ اسے امام احمد اور بخاری اور مسلم نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس صحیح کے مخالف ہے۔ لہذا اسے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ سے مٹی منتقل کرنے کے بعد اس پر پانی اٹھ لینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس حدیث کی روایت صحابہ تابعین وغیرہم میں مشہور ہے اور مٹی و جوحہ سے اسے روایت کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے عبد الجبار بن ابن عیینہ عن یحییٰ بن سعید عن انس کی سند سے ذکر کی ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ کو کھود ڈالو پھر اس پر پانی کے ڈول اٹھ لیو (2)۔ حافظ نے کہا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے کہا کہ عبد الجبار کو ابن عیینہ کے بارے وہم ہوا ہے۔ کیونکہ ابن عیینہ کے اصحاب حفاظ ہیں جنہوں نے اس روایت کو آپ کے واسطے سے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے اور انہوں نے زمین کھودنے کا ذکر نہیں کیا۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ عبد الجبار ثقہ راوی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ اس کی مثل ایک روایت دارقطنی نے حضرت ابن مسعود ؓ سے نقل کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے لیکن اس کے روایت میں سے کوئی بھی جھوٹ سے متہم نہیں ہے۔ ایک روایت کو دارقطنی اور ابو داؤد نے عبد اللہ بن مغفل بن مقرن المزنی سے نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا کہ عبد اللہ بن مغفل تابعی ہیں۔ اور ان کے روایت ثقہ ہیں۔ سوائے جریر بن حازم کے۔ اس کے بارے امام ذہبی نے کہا ہے کہ یہ ثقہ اور امام تھا، موت سے پہلے اس میں تغیر رونما ہوا تو اس کے بیٹے وہب نے اسے چھپا لیا۔ پھر اس نے کوئی حدیث بیان نہیں کی یہاں تک کہ مر گیا۔ ابن عیینہ نے کہا ہے کہ وہ قتادہ کے درجہ میں ضعیف ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث قتادہ سے مروی ہی نہیں بلکہ یہ عبد الملک بن عبید سے مروی ہے۔ اور عبد الملک ثقہ ہے اور اس کی روایات صحیحین میں ہیں۔ اور اگر یہ اعتراض ہو کہ امام احمد نے کہا یہ حدیث منکر ہے۔ تو میں کہوں گا یہ مجمل جرح ہے جو مقبول نہیں۔ اور امام احمد نے مشہور روایت میں کھدائی کے واقع ہونے کے بارے جو کہا ہے وہ جرح نہیں ہے کیونکہ ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ ان روایات میں سے ایک وہ ہے جسے امام طحاوی نے ابن عیینہ عن عمرو بن دینار عن طاؤس کی سند سے ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح سعید بن منصور نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اس کی جگہ کو کھود ڈالو“ یہ روایت بھی مرسل ہے اور مرسل روایت امام ابو حنیفہ کے نزدیک مسند سے اقویٰ ہوتی ہے۔ اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک اس سے کم ہوتی ہے۔ لیکن مرسل روایت مطلقاً حجت ہوتی ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک پانچ امور میں سے کسی ایک کے پائے جانے کے ساتھ مقبول ہوتی ہے۔ (1) اس راوی کے علاوہ کوئی اور اسے مسند ذکر کرے۔ (2) یا مرسل ذکر کرے اور یہ معلوم ہو کہ ان دونوں کے شیوخ مختلف ہیں۔ (3) صحابی کا قول اس کے لیے باعث تقویت ہو۔ (4) اکثر اہل علم کا قول اس کی قوت میں اضافہ کر رہا ہو۔ (5) اس کی حالت سے یہ معلوم ہو کہ وہ ہمیشہ عادل راوی سے ہی اپنی حدیث کو مرسل مناتا ہے۔ تو یہاں

طاؤس کی مرسل روایت صحیح ہے۔ عبد اللہ بن مغفل کی مرسل حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ اور وہ حسن ہے۔ اور حضرت انس کی مسند روایت صحیح ہے یا حسن ہے۔ اور حضرت ابن مسعود کی مسند روایت ضعیف ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت انس ہی وہ حدیث جو صحیحین میں ہے وہ ان تمام روایات سے زیادہ قوی اور راسخ ہے۔ تو اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ صحیحین کی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور معنی کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ کیونکہ اس کا تعارض ان احادیث کے ساتھ ہے جو اس معنی پر دلالت کرنے میں متواتر کے درجہ کے قریب ہیں کہ پانی نجاست کے ساتھ ملنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ترجیح کا اعتبار تعارض کے وقت ہوتا ہے اور یہاں تعارض موجود ہی نہیں بلکہ جو احادیث ہم نے ذکر کی ہیں وہ مٹی کھودنے پر ناظر ہیں اور حدیث انس اس سے ساکت ہے۔ لہذا ان میں سے کسی شے پر عمل ترک نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ وہ پانی جو حدث کو زائل کرنے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے وہ جمہور کے نزدیک طاہر (پاک) ہوتا ہے۔ امام حسن نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت کی ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے اور اس میں نجاست غلیظ پانی جاتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ کی آپ سے روایت یہ ہے کہ کھل اختلاف ہونے کے سبب وہ نجاست خفیفہ کے ساتھ نجس ہوتا ہے۔ اور امام محمدؒ نے آپ سے جمہور کے قول کی مثل قول نقل کیا ہے۔ اور یہی قول امام محمدؒ نے بھی کیا ہے۔ احناف نے پانی کے نجس ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے۔ نص تو حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث ہے جو مسلم نے روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو جنبی حالت میں کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہیے" (1)۔ اور ابو داؤد نے ان الفاظ کے ساتھ حدیث روایت کی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نہ تو کھڑے پانی میں پیشاب کرے اور نہ ہی حالت جنابت میں اس میں غسل کرے (2)۔ اور حکم تحریم کے لیے یہ بھی پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ یہاں بھی تحریم کے لیے ممکن ممکنہ چیز کے لیے ہے۔ کیونکہ اس میں احتمال غالب ہوتا ہے کہ جنبی کا بدن منی سے ملوث ہو۔ جیسا کہ نیند سے بیدار ہونے والے کو برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ اس میں ہاتھ کے نجاست حقیقہ کے ساتھ ملوث ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول دلالت کرتا ہے "کیونکہ وہ نہیں جانتا اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا"۔ اور قیاس یہ ہے کہ انہوں نے اسے ان چیزوں پر قیاس کیا ہے جو نجاست کی حالت میں اپنے جامع استعمال کے ساتھ نجاست حقیقہ کو زائل کر دیتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ نجاست حقیقہ کو زائل کرنے کی صورت میں پانی کا استعمال اجزاء نجاست کے ساتھ پانی کے اختلاط کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہی اختلاط پانی کے نجس ہونے کا سبب ہے۔ جبکہ نجاست حکمیہ کو زائل کرنے میں یہ اختلاط نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث ایک امر حکمی ہے اور اس کا زوال اجزاء میں منقسم نہیں ہوتا۔ لہذا ہر وہ پانی جو اعضاء میں سے کسی عضو میں استعمال کیا جائے اس سے حدیث در نہیں ہوگا بلکہ حدیث کو زائل کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ جنبی اپنے تمام بدن میں اور محدث مکمل چار اعضاء میں پانی استعمال کرے۔ اس کے بعد حدیث زائل ہوگا۔ پس وضو کے پانی کے اجزاء میں سے ہر جزء پاک ہے۔ اسی طرح وہ تمام اجزاء بھی پاک ہیں کیونکہ وہ شے جو نجس نہ ہو اس کا ایسی شے سے ملنا جو نجس نہیں، بالاجماع نجس ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔

انہوں نے قربت کے لیے استعمال ہونے کے سبب پانی کے نجس ہونے پر استدلال حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے کیا

ہے۔ ”کہ وہ آدمی جو خوب اچھی طرح وضو کرتا ہے تو اس کی خطائیں اس کے جسم سے خارج ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے انھوں کے نیچے سے بھی نفل نکل جاتی ہے“ (1) متفق علیہ۔ امام مسلم نے اسے حضرت عثمان اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ پانی کے ساتھ اس کے بدن سے خطائیں نکل جاتی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خطائیں نفل چیزیں ہی تو ہوتی ہیں۔ لہذا پانی ان کے ساتھ ملنے کے سبب اسی طرح نفل ہو جاتا ہے جیسے دیگر تمام نجاستوں کے ساتھ ملنے کے سبب نفل ہو جاتا ہے۔

یہ استدلال کوئی شے نہیں کیونکہ خطائیں نہ تو اجسام ہیں اور نہ ہی امراض ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ قائم ہوتی ہوں۔ اور وہ کسی بھی اعتبار سے نجاست حقیقیہ کی مثل نہیں اور نہ ہی ان کا بدن سے نکلنا نجاست حقیقیہ کے نکلنے کی مثل ہے۔ تاکہ اس سے پانی کا نجس ہونا لازم آئے۔ بلکہ اس خروج کا مفہوم تو طہور اور مغفرت ہے کیونکہ اگر خطائیں نجاست ہوں تو پھر گنہگار مومنین کی نماز جائز ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بالا جماع جائز ہے۔ بلکہ یہ خطاؤں کو مٹانے والی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ الْعَسَلَتِ مِنْ جَنَّاتٍ شَاتِئَاتٍ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے درمیان سے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں بشرطیکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے“ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے (2)۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَهَّرِ الشَّعْأَ لَا يَدُ (اور دن کی دونوں طرفوں میں نماز قائم کر)۔ اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ (3)

ہمارے پاس مستعمل پانی کے پاک ہونے پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ہیں۔

(1) حضرت جابرؓ ماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں بیمار تھا اور بیہوش پڑا تھا۔ پس آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر اڑا دیا تو میں ہوش میں آ گیا۔ اور میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ”کلالہ“ میرا وارث ہوگا۔ تو اس وقت آیت میراث نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔ (4)

(2) حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ میری خالہ مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ میرا بھانجا بیمار ہے تو آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی پھر وضو کیا، تو میں نے آپ کے وضو کا پانی چھو پانی پی لیا۔ اور آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو چمکے گی گھنٹی کی مثل دیکھا۔ متفق علیہ۔ (5)

(3) حضرت مسور بن مخرمہ کی حدیث ہے انہوں نے صلح حدیبیہ کے بیان میں ذکر کی ہے، کہتے ہیں قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ نے نخمہ (فصلہ ناک) بھی نہیں پیچھا مگر وہ بھی صحابہ کرام میں سے کسی کی تھیلی پر جا گرتا اور پھر وہ اسے اپنے چہرے اور سینے پر مل لیتے تھے۔ اور جب آپ وضو کرتے، تو وہ آپ کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لیے (ایک دوسرے سے) لڑنے کے قریب ہو جاتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ (6)

1- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 125 (قدیمی)

2- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 122 (قدیمی)

3- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 678 (وزارت تعلیم)

4- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

5- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

6- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 678 (وزارت تعلیم)

7- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

8- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

مسئلہ :- حدث کو زائل کرنے یا قربت کو حاصل کرنے کی صورت میں ماء مستعمل کے ساتھ نجاست ھقیقہ کو زائل کرنا بالاقفاق جائز ہے مگر ان کے نزدیک جائز نہیں جو اس کے نجس ہونے کے قائل ہیں۔ کیا اس کے ساتھ غسل یا وضو کرنا بھی جائز ہوتا ہے؟ تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ قربت کے حصول کے لیے مستعمل پانی کے ساتھ وضو کرنا اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ظاہر (پاک) تو ہے مگر مطہر (پاک کرنے والا) نہیں۔ امام زفر اور امام شافعی کا قول ہے کہ حدث کو زائل کرنے کی صورت میں مستعمل پانی ظاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ہر وہ پانی جو حدث کو دور کرنے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اس سے وضو اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ وہ پانی ظاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس کے غیر مطہر ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے۔ نص تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا یہ نبی ہے اور دو امروں میں سے ایک کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک استعمال کے سبب پانی کا نجس ہو جانا دوم اس سے مطہریت (پاکیزگی) کا سلب ہو جانا۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلی صورت کا تصور تمہیں کیا جا سکتا۔ لہذا دوسری متعین ہوگئی۔

اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ ماء مستعمل کے ساتھ کوئی ایسا معنی قائم ہوتا ہے جو وضو کرنے کے جواز کے مانع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی قول بالاصرا مطلوب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ماء مطلق وہ ہوتا ہے جس پر لغوی طور پر بغیر کسی قید اور شک کے لفظ ماء کا اطلاق کیا جاتا ہو۔ بیشک لغوی طور پر لفظ ماء کے اطلاق میں پاک پانی، جو نہجس پانی جس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیلی نہ ہوا ہو، وہ پانی جو قربت کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور وہ پانی جو ٹھنڈک کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی وجہ سے زہری نے کہا ہے کہ جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں منہ داخل کر لے اور اس کے پاس وضو کے لیے اس کے بغیر کوئی دوسرا برتن نہ ہو تو وہ اسی میں پانی ڈال کر وضو کرے۔ اور سفیان نے کہا ہے کہ بعینہ یہی مفہوم رب کریم بیان فرماتا ہے: **لَكُمْ شَيْئٌ وَاحِدٌ اَوْ اَمَّا وَتَقِيْتُمْهُ** اور **هَذَا مَاءٌ** کے بارے امام بخاری نے تعلیقا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب شارع نے نجاستوں کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ اور ہمیں ان سے اس طرح اجتناب کرنے کا حکم فرمایا ہے **وَشَيْءٌ يَكُنْ لَكَ طَهْرًا** وَالْوَجْهُ فَافْجُرْ اور آیت وضو فرمایا **لَكِنْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ الْحَرَمَ مَاءً طَهُرًا** اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ داخل کر لے تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر نمی پٹے اور پھر سات مرتبہ اسے پانی کے ساتھ دھو ڈالے" (۱)۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کو ان کا پسندیدہ چیزوں میں سے کسی شے کے ساتھ آزمایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے (قائم کردہ) پردے کے ساتھ ڈھانپ لے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **يُحْيِيْ لَكُمْ اَلْغُلُوْظَ وَيُحْيِيْكُمْ عَلَيْهِمُ الْغُلُوْظَ** (وہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور تمہارا پاک چیزوں کو تم پر حرام کرتا ہے)۔ پس جو جس پانی پر قار ہو تو وہ حکماً پانی کو پانے والا نہیں کیونکہ شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہے۔ لہذا وہ اس آدمی کی مثل بنے جو کنویری کی مندر پر پرہشما ہو اور اس کے پاس ڈول نہ ہو۔ کیونکہ اس کے لیے طبعاً پانی کا استعمال ممنوع ہے۔ کیونکہ طبیعت کنوئیں میں گرنے سے اسے روکتی ہے۔ اسی طرح وہ مریض جو پانی تو پاتا ہو لیکن طبعاً اور شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہو کیونکہ وہ پانی جس کا استعمال شرعاً ممنوع ہے وہ اسی کی مثل ہے۔ جو طبعاً ممنوع ہے۔ لیکن مستعمل پانی سے اجتناب شرعاً واجب نہیں اس لیے کہ وہ ظاہر (پاک) ہے۔ لہذا اسے پانے والا **هَٰذَا** اور حکماً پانی کو پانے والا ہوگا۔ پس اس کے لیے تیمم جائز نہیں ہوگا اور اس پر وضو کرنا واجب ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ پانی کا مطہر ہونا اس کے ظاہر ہونے کو لازم ہے۔

مسئلہ:- جب پانی میں کوئی پاک شے گر جائے پس اگر اس کے سبب اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہو اور پانی پر اجزاء کا اضافہ بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ وضو کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اور اگر پانی کے اوصاف میں سے ایک یا زیادہ تبدیل ہو جائیں۔ تو اگر اس سے بچتا معذور ہو مثلاً عمری اور موسم خزاں میں درختوں کے پتے وغیرہ۔ تو اس سے بھی بالاجماع وضو کرنا جائز ہے جب تک کہ وہ اسے اپنی رقت سے نہ نکال دے جیسا کہ زیادہ دیر ٹھہرے رہنے کے سبب پانی متغیر ہو جائے۔ اور اگر اس سے بچنا معذور نہ ہو مثلاً سرکہ، زعفران اور اشنان وغیرہ۔ تو اگر اس کے سبب پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک تبدیل ہو جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ پانی مقید ہو جاتا ہے اور مطلق پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کرنا واجب ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ مگر جب پانی میں کوئی جلد چیز مل جائے وہ اس کی نرمی کو زائل کر دے یا اس کے اکثر اوصاف کو تبدیل کر دے۔

اوصاف سے مراد اذائقہ، رنگ اور بو ہے۔ مثلاً نمیزین وغیرہ مل جائیں۔ یا پھر کوئی مانع چیز پانی میں مل جائے اور وہ اس پر اجزاء کے سبب غالب آ جائے یا اس کے اوصاف میں سے اکثر کو تبدیل کر دے یا پانی میں کوئی اور چیز کا پانی کو اس نے اسے تبدیل کر دیا جیسے شورہ اور لوبیہ کا پانی وغیرہ مگر وہ چیزیں جن سے پانی کی صفائی کا ارادہ کیا جائے مثلاً راس، ہیری کے پتے اور اشنان وغیرہ، اگرچہ پانی پاک چیز کے ملنے سے تھوڑا سا تبدیل ہی ہو جائے۔ کیونکہ ابن خزیمہ اور نسائی نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ام المومنین سمیرہ رضی اللہ عنہا نے ایک ٹب میں غسل کیا اور اس میں گوند تھوڑے ہوئے آئے کے اثرات تھے۔ (۱)

امام بخاری نے حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ کی صاحبزادی کا وصال ہوا اور فرمایا اسے تین بار یا پانچ بار یا اس سے بھی زیادہ بار۔ اگر تمہاری رائے ہو تو ہیری کے پتے پانی کے ساتھ غسل دینا اور آخریں کا فوراً فوراً غسل کوئی شیئی لگا (۲)۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ثمامہ بن اثال اسلام لایا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے ہیری کے پتے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا (۳)۔ اور قیس بن عاصم کی حدیث ہے کہ جب اس نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ہیری کے پتے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم فرمایا۔ (۴)

لَمْ يَجِدْ فِيهِ بَلَدًا مَّيِّتًا وَنَسْفِيَّةً مَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنْ آسَى كَثِيرًا ۝

”تاکہ ہم زندہ کر دیں اس پانی سے کسی غیر آباد شہر کو اور ہم پلا لیں یہ پانی اے اپنی مخلوق سے کثیر التعداد موشیوں اور انسانوں کو۔“

۱۔ تاکہ ہم اس پانی کے ساتھ غیر آباد جگہ کو زندہ کر دیں۔ یہاں مینا مذکور ہے اس لیے کہ بلدۃ بمعنی بلد ہے۔ یا پھر اس لیے کہ یہ مکان کی تاویل میں ہے (یعنی مکنا مینا) یا اس لیے کہ یہ مونث غیر حقیقی ہے، یا پھر اسی لیے کہ یہ مبالغہ کے تمام اوزان کی طرح فعل پر جاری نہیں۔ لہذا یہ جامد کے قائم مقام ہے۔ اور نَسْفِيَّةٌ میں سقی اور اسقی دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔

۲۔ یعنی ان جنگلوں میں رہنے والوں کو جو بارش کے ساتھ ہی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی لیے انعام اور اناسی کو نکرہ ذکر کیا۔ اور ان کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے نہروں، کنوؤں اور چشموں کے قریب رہتے ہیں لہذا وہ اپنی ذاتوں اور موشیوں کے لیے بارش کے پانی سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اور کیونکہ آیت کا سیاق انسان پر نعمتیں متعدد ہونے کے بارے ہے اور ان کے عام منافع اور ان کے غالب طرز حیات کا انحصار موشیوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موشیوں کو سیراب کرنے کا ذکر انسانوں کے ذکر پر مقدم کیا ہے۔ اسی طرح جانوروں پر زمین کو زندہ کرنے کا ذکر مقدم کیا کیونکہ ان کی حیات اور تعیش کا سبب ہے۔ اناسی یہ انسی کی جمع ہے یا انسان کی جمع ہے۔ جیسا کہ ظو اسی طربان کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اناسیین ہے جیسا کہ ہاتین بستان کی جمع ہے۔ اس میں نون کو یا ء سے بدلا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيهِمْ لَبِيدًا لَّهُمْ كِرْوًا قَبْلَ أَنْ تَنْفَخَ النَّفْسُ فِي الْأَنْفُسِ ۝

۱۔ سنن نسائی، جلد ۱ صفحہ ۴۷ (وزارت تعلیم) ۲۔ صحیح بخاری، جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ (وزارت تعلیم)

۳۔ مجمع الزوائد، جلد ۱ صفحہ ۶۲۹ (الطکر) ۴۔ طبقات کبریٰ از ابن سعد، جلد ۷ صفحہ ۳۶ (صادر)

”اور ہم بانٹتے رہتے ہیں بارش کو لوگوں کے درمیان تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے مگر یہ کہ وہ ناشکر گزار بنیں گے۔“

۱۔ اور ہم بارش لوگوں کے درمیان بانٹتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک شہر اور کبھی دوسرے شہر۔ علامہ بغوثی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ”کوئی سال بھی کسی سال سے زیادہ بارش برسانے والا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اسے زمین میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ آیت پڑھی۔ اور مرفوع روایت ہے کہ شب و روز میں سے کوئی بھی ساعت نہیں مگر آسمان اس میں بارش برساتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے (۱)۔ ابن اسحاق، ابن جریر اور مقاتل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کوئی سال دوسرے سال کی نسبت زیادہ بارش برسانے والا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس رزق کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ رزق آسمان و زمین اس بارش میں رکھ دیا ہے۔ لہذا وہ ہر سال اس سے معین اور معلوم کیل اور وزن کے ساتھ اتارتا ہے۔ اور جب کوئی قوم گناہ کا عمل کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوسروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور جب سارے لوگ گناہ کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے جنگوں اور سمندروں کی طرف پھیر دے گا۔ (۲)

اور یہ بھی کہا گیا ہے تشریف المطر (بارش کو تقسیم کرنے) سے مراد اسے موسلا دھار، ملکی بارش، پھو بار اور ان ہی جیسی کیفیتوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد وہمہ یا چشموں میں بانٹنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تشریف قول کی طرف راجع ہے۔ یعنی ہم نے اس قول کو لوگوں کے درمیان قرآن اور دیگر تمام کتابوں کے ذریعہ تقسیم کر دیا ہے۔ تاکہ وہ غور و فکر کریں اور کمال قدرت اور اس میں نعمت کے حق کو پہچانیں اور پھر اس کا شکر بجالائیں۔ یا معنی یہ ہے تاکہ وہ (بارش کے کبھی) اپنے سے (دوسروں کی طرف) اور کبھی اپنی جانب پھرنے سے عبرت حاصل کریں۔

۲۔ پس اکثر لوگوں نے انکار کر دیا مگر یہ کہ وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ جب ان پر بارش برسائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش برسائی گئی۔

حضرت زید بن خالد الجعفی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر ہمیں بارش کے ان نشانات میں صبح کی نماز پڑھائی جو رات کے وقت ہوئی تھی۔ تو جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ تمہارے رب نے کہا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں سے بعض نے میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے صبح کی ہے اور بعض نے میرے ساتھ کفر کرتے ہوئے۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش عطا کی گئی تو وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں (یعنی ستاروں کی قدرت کا انکار کرنے والے ہیں)۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش دی گئی تو وہ میرے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ متفق علیہ۔ (۳)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ مِّنْهُ

”اور اگر ہم چاہتے تو بھیجتے ہر گاؤں میں ایک ڈرانے والا۔“

لے اور اگر ہم ہر گاہوں میں ایک رسول بھیجتا چاہتے تو ہم ہر گاہوں میں ایک نبی بھیجتے دیتے جو ہاں کے رہنے والوں کو ڈراتا تو آپ پر تبلیغ کا بوجھ بکا ہو جاتا۔ لیکن ہم نے آپ کی بزرگی، عظمت شان اور تمام رسولوں پر آپ کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے آپ کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا۔

فَلَا تُطِيعُ الْكُفْرَيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝۶۱

”پس کافروں کی پیروی نہ کرو اور خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو ان کا قرآن (کی دلیلوں سے) لے۔“

لے پس آپ کافروں کی پیروی نہ کریں ان امور میں جن میں وہ اپنی فریب کاری کے ساتھ آپ کو اپنی موافقت کی دعوت دیتے ہیں۔ بلکہ ہم نے آپ پر رسالت عامہ کا جو انعام فرمایا اس پر شکر اُجالا لے اور آپ اپنی دعوت اور اظہار حق میں ثابت قدم رہے۔ اور ان کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیجئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی توفیق سے یا قرآن کی دلیلوں سے یا پھر ان کی اس اطاعت کو چھوڑ کر جس پر ”فلا تطیع“ دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بے شک وہ حق کو باطل قرار دینے کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں۔ پس آپ حق کو ثابت کرنے اور ان کی مخالفت میں خوب جدوجہد کر کے ان کا مقابلہ کیجئے۔ ”جہاد کبیرا“ سے مراد بہت سخت کوشش ہے جو دل، زبان، تلوار اور تیروں سے ہو۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذَبٌ فُرَاتٌ وَ هَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا ۝۶۲

”اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ملایا ہے دو دریاؤں کو، یہ (ایک) بہت شیریں ہے اور یہ (دوسرا) سخت کھاری لے اور بنا دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان آڑ اور مضبوط رکاوٹ بنائی۔“

لے یعنی اللہ تعالیٰ نے دو دریاؤں کو اس طرح چلا دیا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے جوار میں ہونے کے سبب آپس میں ملنے والے ہیں۔ کہا جاتا ہے ”مَرَجْتُ الدَّائِمَةَ وَأَمْرُ جَنْهًا“ یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ جب تو کسی چوپائے کو چھ اگاہ میں لے آئے اور اسے چھوڑ دے کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے۔ (مقلنا یہ مقصود ہے کہ آیت طیبہ میں مرج بمعنی خلا (چھوڑ دینا) ہے۔ مترجم) اس آیت کریمہ کا عطف ”وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ“ پر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تمام جملے معترض ہیں (یہ) (ایک) بہت شیریں ہے (اپنی حد درجہ شیرینی اور میٹھاں کے سبب پیاس کو قہر کرنے والا ہے۔ اور یہ) (دوسرا) کڑوا اور سخت کھاری ہے۔ یہ ”تَابِخُ النَّارِ“ سے ہے یعنی جب آگ خوب بھڑک جائے اور شعلے مارنے لگے اور یہ پیاس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ دونوں جملے قول مقدر کے ساتھ الْبَحْرَيْنِ سے حال ہیں۔ یا پھر اس کی صفت ہیں اس طریقہ پر ”وَلَقَدْ أَمَرْتُ عَلِيَّ النَّبِیُّنَ یُسَبِّحُنِ“ یا پھر ان سے قبل موصول صلہ سمیت حذف ہو کر اس کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ”مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ اللَّذَيْنِ یُقَالُ فِی شَأْنِهِمَا هَذَا عَذَبٌ فُرَاتٌ وَ هَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ“۔

لے اس کا عطف مَرَجَ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان اپنی قدرت سے بنادی۔ ایک آڑ، رکاوٹ جو ان کے آپس میں ملنے کے مانع ہے۔ یعنی مکمل پردہ نہ تو وہ حد سے تجاوز کر سکتے ہیں اور نہ ہی کھاری پن محسوس اور شیرینی کو خراب کر سکتا ہے۔ علامہ

بیضاؤں نے فرمایا ہے کہ یہ ذیل کی طرح ہے جو سمندر میں داخل ہو رہی ہے اور وہ سمندر کو چیر دیتی ہے اور یہ کئی فرخ تک اس کے اندر چلی جاتی ہے اور اس کا ذائقہ تغیر نہیں ہوتا۔ اور کہا گیا ہے البحر العذب سے مراد نہر عظیم (بڑا دریا) ہے جیسا کہ دریائے نیل وغیرہ اور البحر الحار سے مراد بحر کبیر (بڑا سمندر) ہے۔ اور برزخ سے مراد ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی زمین ہے۔ اور یہ انہیں جدا جدا اور مختلف صفات پر رکھنے کی قدرت رکھتی ہے۔ باوجودیکہ تمام عناصر کے اجزاء کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ وہ باہم ملے ہوئے ہوں، ایک دوسرے سے ملاطقت ہوں اور کیفیت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۚ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥١﴾

”اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا انسان کو پانی (کی بوند) سے اور بنادیا اسے خاندان والا اور سرال والا اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نطفہ سے پیدا کیا ہے انسان کو اور اسے دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک ذی نسب یعنی مذکر بنایا۔ جن کی طرف انسان کی نسبت کی جاتی ہے۔ اور دوسرا ذات مہر بنایا یعنی مونث کہ ان کے سب سرال بنائے جاتے ہیں۔ لہذا یہ ارشاد اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہی ہے: فَجَعَلَ مِنْهُ الْبَشَرَ ذَكَرًا وَالْأُنثَىٰ اٰیہ بھی کہا گیا ہے کہ ”جَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا“ کا معنی ہے ذائب۔ یعنی یہ آباء کی طرف منسوب ہے، چاہے وہ مذکر ہوں یا مونث اور ذابھیر اس اعتبار سے ہے کہ وہ شادی کرتا ہے، چاہے وہ مذکر ہو یا مونث ہو۔

۲۔ یعنی وہ جس پر چاہتا ہے قدرت رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ اس نے ایک مادہ سے انسان کو پیدا کیا۔ جبکہ اس کے اعضاء مختلف ہیں اور طبائع اور مزاج بھی باہم متفرق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی دو قسموں میں بنایا جو باہم ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اور بسا اوقات وہ ایک ہی نطفہ سے دو بچے نکلتے ہیں (ایک کو مذکر اور ایک کو مونث) پیدا کر دیتا ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۚ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٢﴾

”اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو انہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت کرتے رہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملے پر ہے۔ یا یہ مبتدا مقدر کے ساتھ حال ہے۔ یعنی ”وَهُمْ يَعْبُدُونَ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ“ اور وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت چھوڑ دیں۔“

۱۔ اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو انہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت کرتے رہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملے پر ہے۔ یا یہ مبتدا مقدر کے ساتھ حال ہے۔ یعنی ”وَهُمْ يَعْبُدُونَ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ“ اور وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت چھوڑ دیں۔

۲۔ اور کافر گناہ کرنے کے سبب اپنے رب کے خلاف شیطان کا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ کافر اپنے رب کے مقابلہ میں رسوا اور ذلیل ہے۔ کہا جاتا ہے ”جعلنی ظہیرا ای ذلیلا“ (اس نے مجھے ذلیل کر دیا) یہ ظہرت المشیء سے ہے۔ اس کا معنی ہے کہ جب تو کسی شے کو اپنی پشت کے پیچھے رکھ دے اور اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

وَمَا أَمْرُنَا بِشَيْءٍ إِلَّا مُبَشِّرًا ۚ وَتَنْزِيلًا ﴿٥٣﴾

”اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔“

۱۔ اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مومن کو جنت کی بشارت دینے والا اور کافروں کو جہنم کی آگ سے ڈرانے والا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝

”فرما دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیر خواہی) پر کچھ اجرت۔ مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے

رب کا راستہ اختیار کرے۔“

۱۔ میں تم سے رسالت کی تبلیغ پر کچھ نہیں مانگتا جس پر اللہ تعالیٰ کا قول فَتُبَيِّرُوا وَتَذُكِّرُوا دلالت کرتا ہے۔ یعنی کوئی اجرت نہ۔ کہ اس تاوان کا خوف تم پر میری اتباع مشکل بنادے۔ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

۲۔ مگر یہ عمل کہ جس کا جی چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرے اور اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرے گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اس کی پیروی اور اپنی نواہی سے اعتقاد کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کو رسالت کا اجر قرار دیا اس اعتبار سے کہ یہی رسالت کا مقصود ہے۔ اور مرض اور لالچ کے شر کو بڑے اکھڑنے اور حد درجہ شفقت کے اظہار کے لیے تبلیغ رسالت کو اس اجر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کے سوال کی نفی کی گئی ہے۔ اور اس کی چیز کو اجرت بنایا جو فی نفسہ ان کے لیے بھی نفع بخش تھی اور یہ آپ کی رضا اور مقصود کو پورا کرنے والی بھی تھی اور یہ انداز بیان احساس دلاتا ہے کہ ان کی اطاعت کے سبب آپ ﷺ کو بھی ثواب ملے گا۔ جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد دلالت کرتا ہے الذَّالِي عَلَى النَّحْيِ كَفَّاهُ (۱) کہ بھلائی کی راہنمائی کرنے والا اسے کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے بزار نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے ہبل بن سعد اور ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، اصحاب کتب سے اور الضیاء نے اس زیادتی کے ساتھ اسے بریدہ سے روایت کیا ہے ”وَاللَّهُ يُحِبُّ إِعَاثَةَ اللَّفْهَانِ“ (اور اللہ تعالیٰ مظلوموں کی مدد کرنا پسند کرتا ہے) اور ابن ابی الدنیا نے قضاء، الحواجج میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجُورُهَا وَاجْرُؤُهَا مِنْ عَمَلٍ يَهْدِي بِهَا مَنْ غَيْرُهُ يَنْقُصُ مِنْ أَجُورِهِمْ شَيْءٌ“ (جس کسی نے اسلام میں اچھ طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے مطابق عمل کیا۔ مگر اس طرح ان کے اجر میں سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی) اسے مسلم نے ایک موثر حدیث میں جریر سے نقل کیا ہے۔ (۲)

یہ قول بھی ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ ”وَلَكِنْ مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا بِالْإِنْفَاقِ مِنْ مَالِهِ فِي سَبِيلِهِ فَلَيْسَ يُحْذَرُ“ لیکن جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرے کوئی اجر بنانا چاہے تو وہ بنالے۔ یعنی میں اپنی ذات کے لیے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے، اس کی رضا طلب کرنے اور اس کی جنت کی طرف راستہ بنانے سے منع نہیں کرتا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کی ادائیگی کے امر میں اجرت کے سوال کی تہمت کو دور کرنے کے لیے اسے اپنی نبی ﷺ اور آپ کی اہل بیت پر صدقات کو حرام قرار دیا ہے۔

مسئلہ :- اس آیت سے یہ مستحب ہوتا ہے کہ اطاعت کی اجرت لینا جائز نہیں مثلاً قرآن کریم کی تعلیم، اذان اور امامت وغیرہ کی

اجرت۔ قول باری تعالیٰ ”الَّذِي رَزَقَهُ“ یعنی الی ثواب رزقہ یہ سببِ بلا سے حال ہے اور سببِ بلا یہ تخذ کا مفعول ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَى بِهِ نُسُوبَ عِبَادِهِ خَيْرًا ۝۱۱

”اور (اے مصطفیٰ ﷺ) آپ بھروسہ کیجئے ہمیشہ زندہ رہنے والے پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اس کی حمد کے

ساتھ پاکی بیان کیجئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہے۔“

۱۔ ان کے شر کا مداخل کرنے میں اور ان کی اجرت سے استغناء کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔ کیونکہ فی الحقیقت اسی کی شان ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے نہ کہ ان زندوں پر جو مر جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ان پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ضائع اور ہلاک ہو جاتے ہیں جب وہ مر جاتے ہیں۔ اس کا عطف قلی لا اسئلکم پر ہے۔

۲۔ صفات نقصان سے اس کی پاکی بیان کیجئے اور مزید انعام طلب کرتے ہوئے صفات کمال کے ساتھ اس کی تعریف بیان کیجئے۔ اور کہئے سبحان اللہ وحمده۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تعریف کیجئے۔ اور اللہ تعالیٰ (اپنے بندوں کے گناہوں کو) جاننے والا ہے۔ اور وہی ان کے بدلے جزاء دے گا۔ اور حمد کفٰی بہ الحی سے حال ہے۔

الَّذِي خَلَقَ السَّلَوتِ وَالْأَمْراضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ فَسَلِّ بِحَمْدِهِ خَيْرًا ۝۱۲

”جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ پھر وہ متکبر ہوا عرش پر (چسے

اس کی شان ہے) وہ جو جس ہے۔ سو پوچھ اس کے بارے میں کسی واقعہ حالی سے۔“

۱۔ شاید اس کا ذکر (استحکام) تقریر کی زیادتی کے لیے ہے۔ کیونکہ ہیئتہ اس کی شان ہے کہ اس پر توکل کیا جائے اس حیثیت سے کہ وہ ہر شے کا خالق ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ اس میں تمام امور میں ثبات اور استحکام اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت اور ہر امر میں اپنا حکم فوراً نافذ کرنے کا اختیار ہونے کے باوجود تمام اشیا کو بالندرج اور آہستہ آہستہ پیدا کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اسم موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر ”الْوَحْضُنُ“ ہے یا موصول الحیث کی صفت ہے یا منصوب علی المصدح ہے یعنی اس سے پہلے اغنی یا اُفدح فعل مخدوف ہے۔ اور الوَحْضُنُ مبتداء و فسل کی خبر ہے۔ یعنی هو الوَحْضُنُ یا پھر یہ استوی کے فاعل سے بدل ہے۔

۲۔ جو کچھ خلق اور استوئی میں سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی جاننے والے سے پوچھ جو تمہیں اس کی حقیقت کے بارے خبر دے (۱)۔ اسی طرح کلی نے کہا ہے۔ خبر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس، جبرئیل امین علیہ السلام یا پھر سابقہ کتب کا عالم ہے تاکہ وہ آپ کی اس بارے میں تصدیق کرے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ضمیر الوَحْضُن کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اس کے اطلاق کا انکار کریں تو پھر اہل کتاب کے علماء سے اس کے بارے پوچھئے تاکہ یہ ان کی کتابوں میں اس کا ہم معنی لفظ آنے کو پہچان لیں۔ اور اس بناء پر جائز ہے کہ وہ مبتداء ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور سوال جس طرح صلہ عن سے متعدی ہوتا ہے۔ اسی

طرح صلہ باء سے بھی متعدي ہوتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے سو پوچھا اے انسان! رخص کے بارے میں کسی واقف حال سے جو تجھے اس کی صفات کے بارے میں خبر دے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ⑩

”اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ رخص (کے حضور) سجدہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں رخص کون ہے؟ کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور وہ زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔“

۱۔ اس کا عطف اس قول پر ہے اَلَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فَيَسْجُدُوْا لَهَا وَهُمْ اَشْتَوْا عَلٰی الْعَرْشِ اَلَّذِي خَلَقَ جملہ پر ہے۔

۲۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ پر رخص کا اطلاق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے ہم تو ہمارے رخص کے سوا کوئی رخص نہیں پہنچاتے۔ اس سے ان کی مراد میلہ کذاب تھا وہ اسے رخص الہیامہ کے نام سے پکارتے تھے۔

۳۔ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے متعلق اے محمد (ﷺ) تم ہمیں حکم دیتے ہو۔ جمہور نے اسے صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور معزہ اور کسائی نے صیغہ غائب کے ساتھ لہنا یا مرونہ پڑھا ہے۔ اور وہ لہنا یا مرونہ سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی لیتے تھے۔

۴۔ اس کا عطف قَالُوا پر ہے۔ یعنی رخص کو سجدہ کرنے کے حکم نے ان کی ایمان سے نفرت میں اضافہ کر دیا۔

تَبٰرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا ⑪

”بڑی (خبر) برکت والا ہے جس نے بنائے ہیں آسمان میں برج، اور بنایا ہے اس میں چراغ (آفتاب) اور چاند چمکتا ہوا۔“

۱۔ حسن، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بروج سے مراد بڑے ستارے ہیں، ان کے ظاہر اور واضح ہونے کی وجہ سے ان کا نام بروج رکھا گیا ہے۔

عطیہ عوفی نے کہا ہے کہ بروج سے مراد وہ محلات ہیں جن میں پہرے دار رہتے ہیں (۱)۔ اور سراج سے مراد سورج ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا“ معزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت سُورَجاً پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد سورج اور تمام ستارے لیے ہیں سوائے چاند کے۔ کیونکہ چاند سراج نہیں ہے اس لیے کہ سراج وہ ہوتا ہے جو بذات خود روشن ہوتا ہے جبکہ چاند کا نور سورج سے مستفاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورج کے مقابل آنے کی مقدار کے مطابق اس کا گھٹنا اور بڑھنا اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور قَمَرٌ مُّنِيرٌ اس کے قول کے ساتھ اس پر عطف بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۢ أَرَادَ أَنْ يَدَّ كُنَّ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ⑫

”اور وہ وہی ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا اس کے لیے جو یہ چاہتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے؟ یا چاہتا ہے کہ شکر گزار رہے؟“

یعنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے پیچھے ہوتا ہے۔ اس طرح کہ ان میں سے ایک دوسرے کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس جس کا کوئی عمل ان میں سے ایک میں فوت ہو جائے تو وہ اسے دوسرے میں قضا کر لے (۱) (یعنی دن کا عمل رات کے وقت اور رات کا عمل دن کے وقت قضا کر لے۔ مترجم)۔

امام بغوی نے کہا ہے کہ ایک آدمی امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی میری رات کی نماز فوت ہو گئی ہے۔ تو آپ نے فرمایا "أَذْبُكَ مَا فَاتَكَ مِنْ لَيْلِكَ فِي نَهَارِكَ" (یعنی جو کچھ تیرا رات کے عمل میں سے فوت ہوا ہے اسے اپنے دن میں ادا کر لے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَا كَانَ آدَمُ الْفَاطِنُ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے مخالف ہے اس طرح کہ ایک ان میں سے سیاہ (تاریک) ہے اور دوسرا سفید (روشن) ہے۔ (۱)

یہ یہ جعل کے متعلق ہے اور "أَنْ يَذْكُرَ" کو محضہ اور کسائی نے ذال اور کاف کی تخفیف اور کاف کے ضمہ اور ذال کے سکون کے ساتھ بحر پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ذکر کرے۔ اور باقی قراء نے اسے ذال اور کاف کی تشدید اور دونوں کے فتح کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے کہ اس میں تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے لیے جو یہ ارادہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اس کی صنعت و کارگیری میں غور و فکر کرے۔ تو وہ یہ جان لے گا کہ اس کے لیے حکیم و دانسا نفع کا ہونا ضروری ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود ہو اور بندوں پر انتہائی رحم کرنے والا ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جو اعمال خیر میں سے اس عمل کو یاد کرنے کا ارادہ کرے ان دونوں میں سے کسی ایک میں فوت ہو جائے تو پھر وہ اسے دوسرے وقت میں قضا کر لے۔

یہ یاد اس پر اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کو پیدا فرمایا اور ان میں سے رات کو تاریک بنا دیا اور دن کو روشن اور ان میں اسے منافع رکھے ہیں تاکہ نصیحت حاصل کرنے والے ان میں نصیحت حاصل کریں اور اس کی نعمتوں پر شکر بجا لانے والے اس کا شکر ادا کریں۔ لہذا جس نے ذکر، شکر، نصیحت اور غور و فکر کے بغیر اپنا وقت گزار دیا تحقیق اس نے اپنا وقت ضائع کر دیا اور اس کا راس المال ہلاک ہو گیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَتَسَوَّنُ عَلَى الْأَمْرِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝۳۱

"اور جن کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر آہستہ آہستہ اور جب گفتگو کرتے ہیں ان سے جاہل تو وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو۔"

یہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولَئِكَ يَجْزُونَ النُّعْمَةَ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے شرف اور ان کی فضیلت کے اعتبار کے لیے

۱۔ تفسیر بغوی زیر آیت ۲۸

(۱) حسن سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاشت کی نماز طویل کر دی۔ تو آپ سے کہا گیا کہ آج آپ نے دو کام کیا ہے جو آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا میرے رات کے دعا کاف میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اسے مکمل کر لوں یا فرمایا میں اسے پورا کرتا ہوں پھر یہ آیت کہ عِبَادُ الرَّحْمَنِ يَجْزُونَ النُّعْمَةَ فرمائی وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً ۝۳۱

ان کی نسبت (اضافت) اپنی طرف کی ہے۔ یا اس لیے کہ وہ اس کی عبادت میں راسخ ہیں۔ اس صورت میں عباد عابد کی جمع ہے جیسے تبار تاجر کی جمع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے رُحْمٰن کا اسم یہ احساس دلانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ بے شک وہ لوگ مخلوق پر کمال رحمت کا سلوک کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت کا وعدہ فرما رکھا ہے۔

یہ اس میں ہونا یا توہینین کے معنی میں ہے (یعنی ضمیر مرفوع سے یہ حال ہے۔ مترجم) یا یہ مشبہا ہیناً ہے۔ یعنی مصدر کی صفت اس کے ساتھ لگائی گئی ہے۔ اور معنی یہ ہے بے شک وہ زمین پر سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں تو واضع کرتے ہوئے نہ کہ اکڑتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے۔ (۱) لغت میں حون کا معنی نرمی اور لین ہے اور قاموس میں ہے کہ حون کا معنی وقار ہے۔ (۱)۔ اسی سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "الْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لِّسِنٍ خَفِي تَخَالُهُ مِنَ اللَّبَنِ أَحْمَقُ" (۲) (کہ مومن پر وقار اور نرم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تم اسے نرمی کی وجہ سے حق خیال کرنے لگتے ہو۔ اسے تہنی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۳۔ اس کا عطف بمشون پر ہے۔ یعنی جب احمق لوگ ان سے ایسی چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا یعنی وہ ایسی درست بات کرتے ہیں کہ وہ ایداء اور گناہ دونوں سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح مقاتل اور ابن حبان نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اگر کوئی جاہل ان سے جہالت کا سلوک کرے تو وہ اسے برداشت کرتے ہیں اور وہ جاہلانہ رویہ نہیں اچالتے۔ اور حسن سے یہ معنی بھی مروی ہے کہ وہ انہیں سلام کہہ دیتے ہیں (یعنی تم سلامت رہو) اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَإِذَا سَمِعُوا النَّغَا أَذْعُوْا وَقَالُوا لَوْلَا غَبَابُكُمْ لَخَرَابُكُمْ (۳)

کبھی اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ یہ اندازِ قتال کے حکم سے پہلے کا ہے۔ پھر آیتِ قتال نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ (۴)۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ آیت مجامع ہے اور منسوخ نہیں۔ کیونکہ قتال کا حکم تو اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور وہ لا الہ الا اللہ کہنے یا جزیہ دینے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ کہیں لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ۔ الحدیث متفق علیہ (۵)۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ قَوْلَ هَٰذَا یُعْطَوْنَ لِیَعْنِیَنَّ یٰۤیُّ وَهْمٌ ضَرْبُ بَعْدٍ۔ اور یہ سلمیاء کے مقابلہ میں مؤمنین کی حالت کا بیان ہے اور اس میں اپنی ذاتوں کے لیے ان سے انتقام لینے سے اعراض کرنے اور ان سے مؤاخذہ نہ کرنے کی تعلیم ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میرے قربت دار ہیں، میں ان کے ساتھ صلہ رُحی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ قطع تعلقی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برادر یہ اختیار کرتے ہیں اور میں ان سے برادری کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جاہلانہ

۱۔ التاموس المخطوط، جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۹ (اتراٹ العربی) ۲۔ شعب الایمان، جلد ۶ صفحہ ۲۷۲ (احمدیہ) ۳۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۴۔ ایضاً ۵۔ صحیح بخاری، جلد ۸ صفحہ ۸۰ (وزارت تعلیم)

(۱) حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ اکڑ کر چل رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تڑک چلتا ناپسندیدہ چال ہے۔ مگر دورانِ جہاد (پسندیدہ ہے) اور اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ اور ارشاد فرمایا ہے: وَمَنْ جَاهِلًا فَخْصًا لِّیْهِ یُشْکَوْنَ عَلٰی اِلٰہِ نَزَّهٌ هُوَ کَانَ۔ لہذا تو اپنی چال میں مبالغہ نہ کر۔

برتاؤ کرتے ہیں۔ تو یس کن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تو ایسے ہی ہے جیسے تو نے کہا ہے تو پھر تو انہیں خاک چنوتا ہے اور جب تک تو اس پر قائم رہے گا اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے ساتھ رہے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب انہوں نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا یہ تو ان کے دن کی حالت ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِينَ يَمِينُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ۝

”اور جو رات بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور کھڑے ہوئے۔“

لے تو فرمایا یہ ان کی رات کا وصف ہے (2)۔ اس میں رات کی عبادت کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رات کی عبادت مشقت آمیز اور یاد سے بھرت دور ہوتی ہے۔ اور قلب (دل) کو زبان کے موافق کرنے والی ہوتی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ دن کو عبادت کی دوسری قسم کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ اور وہ تعلیم و تعلم اور ارشاد و استرشاد کے لیے نیک لوگوں کی ننگت اختیار کرتے ہیں۔ اس میں لڑنے کا قول مسجد کے متعلق ہے۔ اور یہ عبادت کی جمع ہے اور قیام قائم کی جمع ہے۔ یا قیام مصدر ہے جو فاعل کے قائم مقام ذکر کیا گیا ہے۔ اور قیام کو مؤخر کرنے کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الْفُضُوفُ أَمْشَى خُمْلَةَ الْفُزَّانِ وَأَصْحَابُ اللَّيْلِ“ (میری امت کے اشراف قرآن اٹھانے والے (یعنی قرآن پر عمل کرنے والے) اور رات کو عبادت کرنے والے ہیں)۔ اسے ترمذی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ (3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز وہ ہے جو رات کے وقت ادا کی جائے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ (4)۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر رات کا قیام لازم ہے بے شک یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ ہے۔ یہ تمہیں اپنے رب کے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ برائیوں کو مٹانے والا ہے اور گناہ سے روکنے والا ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (5)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ (اپنی شان کے مطابق) مسکراتا ہے ایک وہ آدمی جو رات کو اٹھ کر عبادت کرتا ہے۔ دوم وہ قوم جب نماز کے لیے اٹھیں بتائی ہیں اور سوم وہ قوم جو دشمن کے ساتھ قتال کرنے کے لیے صف آرا ہوتی ہے۔ اسے ابو نعیم نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔ (6)

علامہ ابو نعیم نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس نے عشاء کے بعد آخر میں دو یا دو سے زیادہ رکعتیں پڑھیں تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات بسر کی۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو (اس کا اجر) نصف رات قیام کرنے کی مثل ہے۔ اور جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی وہ مکمل رات قیام کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے احمد اور مسلم نے صحیح میں نقل کیا ہے۔ (7)

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 315 (قدیمی)	2۔ تفسیر ابو نعیم ذریعہ 1	3۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 556 (العمدہ)
4۔ سند احمد، جلد 2 صفحہ 303 (سار)	5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 194 (وزارت تعلیم)	
6۔ مصابح السنہ، جلد 1 صفحہ 153 (العمدہ)	7۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی)	

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝

”اور جو (بارگاہ الہی میں) عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! اور فرما دے ہم سے عذاب جہنم! بے شک اس کا عذاب بڑا مہلک ہے۔“

یعنی وہ مخلوق کے ساتھ حسن معاشرت اور عبادت حق میں اپنی جدوجہد کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور وہ اپنے سے عذاب کو پھیرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں وہ اپنے اعمال کو حجت نہیں بناتے اور نہ اپنے حال پر اکتفا کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ وہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے اعمال پر توکل نہ کریں بے شک میں قیامت کے دن حساب کے وقت جس بندے کو کھڑا کروں گا اگر میں اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دے دوں گا اور اپنی امت میں سے میری نافرمانی کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (یعنی یائوس نہ ہو جائیں) بے شک میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا (1)۔ اسے ابو نعیم نے روایت کیا۔

بے شک اس کا عذاب لازم ہے۔ اسی سے غریم ملا زمّت کے معنی میں ہے۔ اور علامہ ابن عثیم نے کہا ہے کہ غرام کا معنی اشد لازم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہلاک کرنے والا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ غرام سے مراد وہ تکلیف اور مصیبت ہے جو انسان کو پہنچتی ہے۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے شکر ادا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تکلیف میں مبتلا کر دیا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ حسن نے کہا ہے ہر غریم اپنے غریم سے جدا ہو جائے گا مگر جہنم کا غریم اس سے جدا نہیں ہوگا۔ (2)

إِنهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝

”بے شک وہ بہت برا ٹھکانہ اور بہت بری جگہ ہے۔“

اس میں سآئٹ فصل ذم ہے اور بنسبت کے معنی میں ہے۔ اور اس میں ایک ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر (ماضی) ضمیر کر رہی ہے۔ اور مخصوص بالذم (ہی) ضمیر مخذوف ہے۔ اسی کے سبب اس کا ربط ان کے اسم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا تمیز۔ اور جملہ پہلے جملہ کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر یہ جملہ دوسری تعلیل ہے۔ اور دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت اور ابتداء کا احتمال رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ سآئٹ افعال متصرفہ میں سے ہو یعنی ساء یسوء سوء او مساء فہی حسنت کی ضد ہے۔ اس معنی کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے جو اہل جنت کے وصف میں ہے۔ ”حَسَنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا“ اس معنی کی بناء پر ساء ث میں ضمیر مستتر ان کے اسم کی طرف راجع ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا نسبت سے تمیز اور معنی یہ ہے کہ جہنم کو ٹھکانا بنانا اور اس میں اقامت اختیار کرنا برا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَتَقَفُوا إِلَيْكُمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ۝

”اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کجی (بلکہ) ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے بینین اعتدال سے ہوتا ہے۔“

اس کو ابن کثیر اور اہل بصرہ نے یاء کے فتح اور تاء کے کسرہ کے ساتھ ”یَقْتُرُوا“ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور ابن عامر نے یاء کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسروں نے یاء کے فتح اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ تمام کی تمام لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے اِفْتَرَّ يَفْتَرُ اور قَتَرَّ يَزِنُ مَشَدَّ وَهِنٌ۔ اور قَتَرُ يَفْتَرُ اور يَفْتَرُ يَبْصُرُ اور يَبْصُرُ يَبْصُرُ کے وزن پر ہیں۔

اسراف کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرنا اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔ اور اِقْتَارُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے حق کو رد کرنا۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج کا ہے۔ اور حسن نے بھی اس آیت میں یہی کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مال خرچ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض سے روکتے نہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ اسراف کا معنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا ہے یہاں تک کہ وہ فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے۔ اور اِقْتَارُ کا معنی ہے وہاں خرچ کرنے سے کجی کرنا جو شے اس کے لیے ضروری ہو۔ ابراہیم کے قول کا یہی معنی ہے نہ تو وہ انہیں بھوکا رکھتا ہے، نہ ننگا رکھتا ہے اور نہ وہ اتنا خرچ کرتا ہے کہ لوگ کہنے لگیں اس نے اسراف کیا ہے (۱)۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے بلکہ اس سے بھی انھیں ہے۔ کیونکہ مباح اخراجات میں حد شرعی سے اتنا تجاوز کرنا کہ فضول خرچی میں داخل ہو جائے یہ حرام اور معصیت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ الْمُبْتَغِيَّ يَنْتَعِلُ الْاَخْوَاعَ الشَّيْطَانِيَّةَ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِيَوْمٍ كَثُورًا (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے) اور ان پر اتنا مال خرچ کرنا جن کا خرچہ اس کے ذمہ واجب ہے کہ نہ انہیں بھوکا رکھے اور نہ ننگا ہے فرض ہے۔ اور ان پر مال خرچ کرنے سے روک لیتا ہے اللہ تعالیٰ کے فریضہ سے رکنا ہے۔

۱۔ فضول خرچی اور کجی کے بینین میں خرچ کرنا یہ میانہ روی ہے اور دو برائیوں کے درمیان نیکی ہے (۱)۔ دونوں طرفوں کے سیدھا (مستقیم) ہونے کی وجہ سے وسط (درمیان صورت) کو قوام کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ان دونوں کے مساوی ہونے کی وجہ سے وسط کو سوا کا نام دیا جاتا ہے۔ ترکیب میں یہ دوسری خبر ہے یا حال مؤکدہ ہے۔ اور کان کی خبر بنانا بھی جائز ہے۔ اور ان کے درمیان طرف انھوے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ مکان کا اسم ہے اور غیر متضمن کی طرف اضافت کے سبب مثنیٰ ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ قوام کے معنی میں ہے۔ تو یہ کسی شے کے اپنی ہی ذات کے بارے میں خبر دینے کی طرح ہو جاتا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کونسا گناہ سب سے بڑا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو شریک بنانا حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کی پھر کونسا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے بیٹے کو اس

۱۔ تغیر بخوبی زیر آیت ہذا

(۱) ابن زید بن حبیب نے کہا ہے کہ اس آیت کا مصداق حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ وہ فقط راحت اور لذت کے حصول کے لیے نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی زینب و راکش کے لیے لباس پہنتے تھے بلکہ کھانے سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ بھوک دور ہو جائے اور عبادت الہی کے لیے انہیں تقویت حاصل ہو جائے اور لباس اس لیے پہنتے تھے کہ وہ ان کی شرمگاہ کو بھوکھانے میں کام لے اور انہیں سردی اور گرمی سے محفوظ رکھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسراف کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی جس چیز کی خواہش کرے اسے ہی خرید لے اور اسے کھا لے۔

خوف سے قتل کر دینا کہ وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی پھر کون سا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے بڑی کی بیوی سے زنا کرنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۖ

”اور جو نہیں پوجے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو اور نہیں قتل کرتے اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے

مگر حق کے ساتھ اور نہ بدکاری کرتے ہیں، اور جو یہ کام کرے گا تو وہ پائے گا (اس کی) سزا“

۱۔ نفس محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی لا یقتلون قتلاً الا قتلاً بالحق۔ یا یہ لا یقتلون کے متعلق ہے یعنی لا یقتلون بسبب الا بالحق۔ (وہ نہیں قتل نہیں کرتے کسی سب سے مگر حق کے ساتھ۔ جیسے قصاص رحم یا اسی جیسا کوئی اور سبب)۔ (عباد الرحمن) کے لیے اصول الطاعات ثابت کرنے کے بعد اس سے امہات المعاصی کی نفی کی گئی ہے۔ ان کے کمال ایمان کو ظاہر کرنے کے لیے اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ اگر اسے ہی عطا ہوتا ہے جو ان تمام کا جامع ہو۔ اور اس میں کفار کے لیے تعزیریں ہے کہ وہ ان کی اشد اسے متصف ہیں۔ گویا کہ یہ فرمایا ”وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں اور برائیوں سے پاک فرمایا جن پر تم ہو۔“ (وَالَّذِينَ طَهَّرَهُمُ اللَّهُ عَمَّا أَنْتُمْ عَلَيْهِ مِنَ الشُّوْزِ وَالسِّنَابِتِ)۔ اسی لیے اس کے بعد انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے وعید ذکر کی اور فرمایا ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا“ اور جو ان امور میں سے کوئی فعل کرے گا۔ تو وہ اس گناہ کی سزا پائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے اٹام کا معنی سزا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ اٹام جہنم میں ایک وادی کا نام ہے (2)۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے یہی مروی ہے۔ اور حدیث میں مروی ہے کہ اٹام وادی نام ہے۔ ان میں اہل ناری کی پیپ بہتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت میں یہ نقل کیا ہے کہ یہ (اٹام) جہنم میں ایک وادی ہے (3)۔ بناد نے سفیان سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور ابن جریر بطبرانی اور بیہقی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دس اوقیر وزن کا پتھر جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک نفی اور اٹام کی انتہا تک پہنچے گا (4)۔ میں نے کہا نفی اور اٹام کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جہنم کے پچھلے حصے میں دو نہریں ہیں جن میں اہل ناری کی پیپ بہتی ہے۔ اور انہی دو کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ”فَنُفُوسٌ يَلْقَوْنَ غَيًّا“۔ وَعَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا۔

يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهْلًا ۖ

”دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب روز قیامت ۱۔ اور ہمیشہ رہے گا اس میں ۲۔ ذلیل و خوار ہو کر رہے“

۱۔ یضاعف کو ابن کثیر اور ابن عاصم نے یضَعَّفُ باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقی قرء نے باب مفاعلہ سے۔ کفر کے ساتھ معصیت ملنے کے سبب قیامت کے دن ان کے لیے عذاب دوگنا کر دیا جائے گا۔

۲۔ ابن عاصم اور ابو بکر نے یضَاعَفُ اور یُخْلَدُ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ جملہ مستأنفہ ہے یا حال ہے اور بقیہ نے ان

دونوں کو نطف سے بدل ہونے کے سبب جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے اسے اپنے اصل پر ہی رکھا ہے۔ اور حفص نے یہاں وغیرہ میں مبالغہ کے لیے ضمیر مجرور کے صلہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور باقی قراء نے ضمیر مجرور کے اس اصول کی بناء پر پڑھا کہ جب اس کا ماقبل ساکن ہو تو اس کے سرہ کو (اختلاس) پر کیے بغیر پڑھتے ہیں۔

سہ مہانا ترکیب کلام میں حال ہے۔ شیخین نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین میں سے لوگ کثرت سے قتال کرتے تھے اور کثرت سے زنا کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے بشرطیکہ آپ ہمیں ہمارے عمل کا کفارہ بتائیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَ اَلَّذِيْنَ لَا يَزِنُوْنَ عَمَلُهُمُ الْاِحْسَانُ وَلَا يَفْقَهُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَزَمَهُ اللّٰهُ اِلَّا بِالْعَقْلِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ اَوْ مَنْ يَفْعَلُ لِيْلِكَ نَارُ اَشْأَمًا لِّىْ يُلَاقِيَ لَهٗ الْعَذَابَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدُ فِيْهَا مُهْمًا (1)۔

اَلَا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَلِيْكَ يُّبْدِلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۚ وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

”مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے۔ تو یہ وہ لوگ ہیں بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“

۱۔ مگر جس نے شرک سے توبہ کی (اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے) یہ آیت عَفُوْرًا رَّحِيْمًا تک نازل ہوئی۔ اور یہ آیت بھی نازل ہوئی: قُلْ لِيُبَيِّنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ الْاٰيَةَ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مگر جس نے اپنے گناہ سے توبہ کی، اپنے رب پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو یہ معاملہ اس بندے کے اور اس کے رب کے درمیان ہے (ج) امام بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا جب قرآن کریم میں یہ آیت نازل کی گئی۔ وَ اَلَّذِيْنَ لَا يَزِنُوْنَ عَمَلُهُمُ الْاِحْسَانُ وَلَا يَفْقَهُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَزَمَهُ اللّٰهُ تو مشرکین کہ نہ کہا ہم نے بغیر حق کے لوگوں کو قتل کیا، ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے الٰہ کو بھی پکارا اور فواحش (زنا) کا ارتکاب بھی کیا۔ (ہمارا انجام کیا ہوگا؟) تو پھر یہ آیت نازل ہوئی اَلَا مَنْ تَابَ۔ (3)

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ ہمیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو سال تک یہ آیت پڑھتے رہے: وَ اَلَّذِيْنَ لَا يَزِنُوْنَ عَمَلُهُمُ الْاِحْسَانُ الْاٰيَةَ پھر یہ نازل ہوئی: اَلَا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ تَوْبَتِمْ لَیْ جَزَاءُ لَکُمْ مِنْ حَاضِرِکُمْ اَلْحَسَنُ لَکُمْ فَتَحْتَ اَلَّذِيْنَ لَا یُحْشَرُوْنَ لَکُمْ فِیْہِمْ حَافِظٌ مِّنْ دُوْنِکُمْ وَ مَا تَاَخَّرُوْا۔

اگر یہ کہا جائے کہ استثناء جاز نہیں ہوتا تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت دو سال بعد نازل ہوئی؟ تو ہم کہیں گے کہ پہلی مرتبہ یہ آیت بغیر استثناء کے نازل ہوئی۔ اور پھر یہ آیات استثناء کے ساتھ نازل ہوئیں۔ پس یہ آیت مستثنیٰ کی مقدار میں پہلی کے لیے ناخج ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ اصول میں یہ بات ثابت ہے۔ کہ کل احکام میں اخبار نہیں۔ لیکن یہ آیت تو اخبار میں سے ہے تو پھر اس کا فتح کیسے ممکن ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اخبار میں فتح جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ ان میں خبر کے خلاف کا احتمال نہیں ہوتا تاکہ کذب لازم نہ

آئے۔ اور آیت وعید میں فتح جازز ہے کیونکہ یہ وعید کے لیے انشاء ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تفضل اور مغفرت کی صورت میں وعید کے خلاف کا احتمال رکھتی ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اثبات سے استثناء نفی ہوتی ہے اور اس کا برعکس (یعنی نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے) جیسا کہ اس پر استثناء مفرغ دلالت کرتا ہے۔ اور ایسا نہیں جیسے انہوں نے کہا ہے کہ مستغنی مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے اور استثناء استثناء کے بعد ماضی سے کلام کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر منطوق کا فتح مسکوت سے لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔ اور عملاً صالحاً کا قول مفعول یا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۱۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہے کہ سبب ان کی سابقہ معصیوں کو منادے گا اور ان کی جگہ ان سے بعد میں ہونے والی نیکیوں کو نامہ اعمال میں ثبت کر دے گا۔ یا دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کے ملکہ کو اطاعت اور نیکی کے ملکہ کے ساتھ تبدیل کر دیتا ہے اور ان سے جو گناہ اس سے قبل سرزد ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں ان کے برعکس نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اور اس قول کا بھی یہی معنی ہے جو حضرت ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، مجاہد، ضحاک اور سدئی نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حالات شرک میں کیے جانے والے اعمال کی برائیوں کو اسلام کے اعمال کے حسن کے ساتھ بدل دیتا ہے۔ اور ان کے شرک کو توحید کے ساتھ، مونہین کے قتل کو جنگ کرنے والے شرکین کے قتل کے ساتھ اور زنا کو عفت و پاکدامنی کے ساتھ بدل دیتا ہے۔ (1)

ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان گناہوں کو جو انہوں نے حالت اسلام میں کیے قیامت کے دن انہیں فضل کے نیکیوں سے تبدیل کر دے گا۔ یقول سعید بن مسیب، یحیٰ، عائشہ، ابو ہریرہ اور سلمان کہ ہے (2)۔ اور حضرت ابو ذر کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا اس کے صغیرہ گناہوں کو پیش کرو چنانچہ اس پر صغیرہ گناہ پیش کیے جائیں گے اور اس کے کبیرہ گناہ پھیلے جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا۔ کیا تو نے یہ یہ اعمال کیے ہیں؟ وہ ان کا اقرار کرے گا اور قطعاً انکار نہیں کرے گا اور آٹھ لاکھ گناہ کا کبار سے ڈر رہا ہوگا۔ تو پھر کہا جائے گا اسے ہر گناہ کے بدلے نیکی عطا کر دو۔ تو اس وقت وہ کہے گا کہ بیشک میرے تو اور بھی گناہ ہیں جنہیں میں یہاں نہیں دیکھ رہا۔ تحقیق میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ میں پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3) ابن ابی حاتم نے حضرت سلمان سے روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو صحیفہ دیا جائے گا تو وہ اس کے اوپر کی جانب پڑھے گا تو اس میں اس کے گناہوں کا ذکر ہوگا پھر وہ اس کے نیچے کی جانب دیکھے گا تو اس میں اس کی نیکیاں ہوں گی پھر وہ اوپر کی جانب نظر اٹھائے گا تو اسے میں اس کی بدیاں نیکیوں میں بدل چکی ہوں گی۔ (4)

حضرت ابو ہریرہ سے یہ بھی روایت ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو لائے گا اور وہ یہ پسند کریں گے کہ کاش ان کے گناہ زیادہ ہوتے۔ پوچھا گیا یہ کون لوگ ہیں؟ تو فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔ (5) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس معنی کی بناء پر برائی کو نیکی سے بدلنے کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے اور برائی پر ثواب کیسے دیا جاسکتا ہے جبکہ برائی ایک ناپسندیدہ اور مکرہ عمل ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے کفر اور گناہوں کے سبب راضی نہیں ہوتا۔ تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی میرے نزدیک دو وجہیں ہیں

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے وہ غلطی صادر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے تو وہ اس پر حدود جزا نام ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو انتہائی حقیر خیال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کمال بخیر و انکساری کے ساتھ التجا کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اس کے ساتھ ہی مغفرت کی امید کے ساتھ اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت کا صحیظ بن جاتے ہیں اس طرح کہ اگر وہ یہ گناہ نہ کرتے تو وہ اس اجر و ثواب کو حاصل نہ کر سکتے۔ پس اس طرح ان کا وہ گناہ جو عتاب و سزا کا سبب تھا وہ ثواب کا سبب بن جاتا ہے، اگرچہ یہ ندامت اور توبہ کے توسط سے ہوا ہے۔ اسی مقام پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں قسم کر دیتا اور تمہاری جگہ ایسے لوگ لے آتا جو گناہ کرتے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتا“ اسے مسلم نے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ (1)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ما عز بن مالک کی طرح استغفار کرو، تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو وہ تمام کے لیے کافی ہو“ (2)۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو فرمایا جبکہ انہوں نے غامہ نے نامی عورت کو برا بھلا کہا، پھر جا خالد! قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر محصول، چنگی وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرے تو اسے بخش دیا جائے (3)۔ مسلم نے اسے ما عزر اور غامہ یہ کہ قصہ میں حضرت بربیعہؓ سے نقل کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی معصیت جس کی ابتدا غفلت ہو اور اس کے آخر میں ندامت ہو تو وہ اس نیکی سے بہتر ہے جس کی ابتدا میں تکبر ہو اور آخر میں ریا کاری ہو۔ اور دوسری توجہ یہ ہے کہ محبت میں غواسی کرنے والوں سے کبھی ایسے امور صادر ہوتے ہیں جن کا وزن میزان شرع کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ (یعنی وہ معیار شریعت پر اپرا نہیں اترتے) جیسا کہ کلمات شط (غیر شرعی کلمات)، سماع، وجد اور رہبانیت جسے انہوں نے ایجاد کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے صادر ہونے والے ان تمام امور کو نیکیاں بنادے گا کیونکہ ان سے ان کا صدور خالص محبت کے تحت ہوا ہے۔ اسی وجہ سے عارف روی نے مثنوی میں کہا ہے۔

ہرچہ گھبر عسلی علت شود کفر گھبر کاملے ملت شود
کار ہا کاں راقیاس از خود مگیر گجرچہ مانند در نوشتن شیر شیر
نیک بندوں کے معاملات کو اپنے پر قیاس نہ کر کیونکہ شیر لکھنے میں شیر (دودھ) جیسا ہے
اوبدل گشت و بدل شد کار او لطف گشت و نور شد ہرنا راو
بندے کا معاملہ ونیت بدلی تو اس کا سارا معاملہ ہی بدل گیا مہربانی ہوگی اور اس کے لیے اس کی آگ ہی نور بن گئی
اور حضرت ابو ذرؓ کی حدیث میں جو وارد ہے کہ کہا جائے گا کہ اس کے صغیرہ گناہ پیش کرو۔ پس اس پر صغیرہ پیش کیے جائیں گے اور
کہا نہ کہ اس سے چھپایا جائے گا تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ امور ہیں جو کا ملطن سے غلبہ محبت کے سبب صادر ہوتے ہیں اور یہ میزان شرع کے مطابق صغیرہ گناہ ہیں نہ کہ کبیرہ۔ لہذا اللہ تعالیٰ انہیں نیکیاں بنادے گا کیونکہ محبت کے چشموں سے پھونسنے والے ہیں۔ اور وہ کبیرہ گناہ جن کا صدور ان سے شاذ و نادر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ان سے صادر ہونا لکھا ہی نہیں۔ لہذا وہ ان سے چھپالے گا، مغفرت فرما دے گا اور ان پر پردہ ڈال کر ان کا بالکل ذکر ہی نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ تو بہ کے ساتھ اور بغیر تو بہ کے بخش دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَاَلَمْ يَكُنْ لَكَ تَزْوُجُ عَنْ اَبْنَاءِ الْاَخْتِ "میں فناء القلب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بندہ اپنے دل کے فناء کے بعد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی شے کا قصد نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے کسی بھی شے کی امید نہیں رکھتا، اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈرتا ہے۔ اور ہر وہ جو تیرا مقصود ہے پس وہی تیرا معبود ہے۔

بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو وجود اصلی کے ساتھ موجود ہی نہیں دیکھتا اور صرف اللہ ہی وجود اصلی کے ساتھ موجود ہے کیونکہ اس کی ذات اس کے وجود کا تقاضا کرتی ہے کہ عام مومنین فناء سے قبل یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اس وجود کے ساتھ موجود ہے جس کا تقاضا اس کی ذات کرتی ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس طرح نہیں۔ میں کہتا ہوں کیوں نہیں، وہ اس کا اعتقاد رکھتے ہیں لیکن استدلال کے ساتھ۔ نہ کہ روایت اور شہود کے ساتھ۔ اور اس پر وجدان بدینی اور مخلوق سے ان کا خوف اور موعظ شاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد "وَلَا يَشْكُرُونَ الشُّكْرَ الَّذِي مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَا يَذْكُرُونَ فَنَاءَ الْفَسِّ" طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ برائی کی طرف ابھارنے والا نفس مارہ جب فنا ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ گناہوں کی دعوت دینے سے دور ہٹ جاتا ہے اور اس اشارہ پر دلیل یہ ہے کہ پہلے "وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَتْلُونَ الْآيَةَ" کے قول سے ان کی صفات کمال بیان کیں اور پھر ان صفات مذکورہ سے ان کا وصف بیان کیا اور اگر اس سے مراد وہ جو عباد کی غارتگوئی ہو تو پھر اسے مذکورہ صفات پر مقدم کیا جاتا۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝

"اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے۔"۔

۱۔ اور جس نے توبہ کی شرک اور گناہوں سے انہیں چھوڑتے ہوئے اور ان پر نہ امت کا اظہار کیا اور استغفار کیا اور نیک عمل کیے اپنی کمزوری اور غفلت کی تلافی کرتے ہوئے یا شرک اور گناہوں نے سے نکل کر اطاعت و فرمانبرداری میں داخل ہو گیا تو بیشک اس نے رجوع کیا (اللہ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے) نہ کہ کسی غیر کی طرف۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کم پر ہے کہ وہ اسے ثواب عطا کرے اور اس کی برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دے۔ یہ جملہ مقررہ ہے اور سابقہ جملہ مقررہ پر معطوف ہے۔ اور وہ جملہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَنْتَظِرْ أَثْمَارَ يَوْمٍ يَدْعُونَ فِيهِ دُعَاؤَ يَوْمِ الْاٰثِمَاتِ اور یہ دونوں جملے ان موصولات کے درمیان واقع ہیں جو عباد الرحمن کی صفات مام ہیں۔ ان دونوں میں سے پہلا ان گنہگاروں کی سزا کے بیان میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مفہوم ہوتے ہیں وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ إِلَى الْاِغْوَاءِ اور ان میں سے دوسرا توبہ کرنے والوں کے انجام کے بیان میں ہے جو استثناء میں مذکور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ متاباً پر جوین تنگیز تعظیم اور توبہ کی ترغیب کے لیے ہے۔ تاکہ شرط متعذر نہ ہو۔ یعنی "اِنَّهُ يَتُوبُ اِلَلّٰهِ مَتَابًا مَرَضِيًّا عِنْدَ اللّٰهِ مَاجِبًا لِلْعِقَابِ مُخَصَّلًا لِلتُّوْبِ" (اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسا رجوع کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، سزا کو ختم کرنے والا ہے اور ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بیشک اس نے اللہ تعالیٰ کے ثواب کی طرف انتہائی اچھا رجوع کیا۔ اور یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایسی توبہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں مذکور قتل اور زنا کی توبہ کے سوا ہے۔ یعنی جس نے توبہ کی، شرک سے رجوع کیا اور فرائض کو ادا کیا اور نہ اس سے نقل کیا اور نہ زنا۔ تو اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں تو یہ کی۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف موت کے بعد انتہائی اچھی طرح لوٹے گا اور اسے اس پر فضیلت دی جائے گی جس نے نقل کیا اور زنا کیا اور پھر تو یہ کی۔ تو یہیں پہلی تو یہ شرط ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قول وَهَرَبْنَا بَنِي كَامَعِي ہے جس نے شرک سے رجوع کیا۔ اور دوسری تو یہ جزاء ہے یعنی یہ قول فَإِنَّهُ يَسْتَوِي إِيَّاهُ اللَّهُ مَتَابَا اس کا معنی ہے۔ اس نے جزاء اور بدلے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ پس اس طرح دونوں جدا جدا ہو گئے۔

بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت تمام مٹا ہوں سے تو یہ کرنے کے بیان میں ہے اور اس کا معنی ہے جو تو یہ کا ارادہ کرے اور اس پر عزم مصمم کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی تو یہ کرے۔ پس قول باری تعالیٰ "يَسْتَوِي إِيَّاهُ اللَّهُ مَتَابَا" خبر معنی امر ہے۔ یعنی يَسْتَوِي إِيَّاهُ اللَّهُ (چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں اسے جانتا چاہیے کہ اس کی تو یہ اور اس کے رجوع کا عمل (انجام) اللہ تعالیٰ ہی سے۔ میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر اللہ تعالیٰ کے قول "يَسْتَوِي إِيَّاهُ اللَّهُ سَيَجْهَمُ" سے مراد وہ تو یہ کرنے والے ہیں جن سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو ان پر غلبہ سکر اور محبت کے سبب میزان شرع پر پورے نہیں اترتے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت کے سبب ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت میں تو یہ کرنے والوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے ہوں جن سے غیر شرعی امور میں سے کوئی شے بھی صادر نہیں ہوئی۔ یعنی جس نے رجوع کر لیا ہر اس شے سے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور ان میں سے کسی بھی شے پر عمل نہ کیا اگرچہ وہ محبت اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے ہی ہو۔ تو اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہلوں (اصحاب سکر) سے احسن مذاہم رجوع کرنے والے ہوں گے۔ اور ان سے مراد اولیاء اللہ سے اصحاب الصحو ہیں جیسا کہ اولیاء نقشبندیہ ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اتباع سنت میں اصحاب رسول ﷺ کا نمونہ پیش کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرًا وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كَمَا مَأْمُورٌ

”اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب گزر رہے ہیں کسی لغوی چیز کے پاس سے تو بڑے باوقار ہو کر گزر جاتے ہیں۔“

۱۔ علامہ بنوئی نے لکھا ہے کہ شحاک اور اکثر مفسرین نے کہا ہے زور سے مراد شرک ہے کیونکہ وہ بھی جوگی گواہی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے تو تکرار لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر پہلے وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ مَعَ اللَّهِ الْهَائِجَةِ کے قول میں گزر چکا ہے۔ اور علی بن طلحہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے (وہ لوگوں کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دیتے) (۱X)

مسئلہ: ۱۔ امام بنوئی نے کہا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے فرمایا جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے جائیں گے۔ اس کے چہرے کو سیاہ کیا جائے گا اور اسے بازار میں پھرایا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ نے ابو خالد عن حبان عن محمول عن الولید بن عمرؓ کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام میں اپنے عمال کی طرف جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے لکھا کہ اسے چالیس کوڑے لگائیں جائیں، اس کا منہ سیاہ کیا جائے، اس کا سر موٹ دیا جائے اور اسے طویل وقت تک قید میں رکھا جائے (۲)۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں محمول سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے (۳)۔ اور کہا کہ یحییٰ بن علانے ہمیں خبر دی اور احوص بن حکیم نے اپنے باپ سے مجھے خبر دی کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے

1- تفسیر بنوئی زیر آیت نمبر 2- مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5 صفحہ 532 (انرا مان)

3- مصنف عبدالرزاق، جلد 8 صفحہ 327 (المکتب الاسلامی)

حکم دیا کہ اس کا منہ سیاہ کیا جائے۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں ڈالی جائے اور اسے قبائل میں پھرایا جائے (1)۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والے کو تعزیر امارا جائے گا اور اسے اپنی قوم میں ٹھہرایا جائے گا یہاں تک کہ وہ پہچان کر لیں کہ یہ جھوٹا شاہد ہے۔ اور امام مالکؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اسے جامع مسجد اور بازاروں میں لایا جائے۔ ان تمام نے یہ کہا ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیث انسؓ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ کی روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ کے بارے خبر نہ دوں۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی کہ میں نہیں یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا (پیلے آپ ﷺ کیلئے گناہ گار ہوئے تھے پھر آپ ﷺ سیدھے جہنم گئے اور فرمایا) خبردار اور جھوٹا قول اور جھوٹی شہادت۔ آپ ﷺ اس کا مسلسل تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش کہ اب آپ ﷺ کا مشوہ ہو جائیں (2)۔ اور اللہ تعالیٰ نے جھوٹی شہادت کو شریک کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا **فَاجْتَنِبُوا الزُّحْمَ وَمِنْ آلَاتِهِمْ اُولُو اَلْأَرْسَابِ حَثَا حَثًا** (3)۔ جب یہ ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس کے بارے شرعاً کوئی حد مقرر نہیں تو پھر اس میں تعزیر ہی ہوگی۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اس کی تعزیر میں صرف تشہیر پر ہی اکتفا کیا جائے گا، نہ اسے مارا جائے گا اور نہ اسے قید کیا جائے گا۔ کیونکہ مقصود ڈانٹ پلانا اور جھڑکنا ہے۔ اور یہ تشہیر سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور مارنا اور دیگر ای نوع کے امور اس ڈانٹ میں مبالغہ ہے۔ کیونکہ یہ (شہادت) سے رجوع کے مانع ہوتا ہے۔ اور شہادت کا جھوٹا ہونا اقرار اور رجوع سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ لہذا اس سبب کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے تخفیف ضروری ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے اثر کو سیاست پر مشمول کیا جائے گا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی طرح ہی قول قاضی شریع سے بھی مروی ہے۔ محمد بن حسن نے کتاب الآثار میں امام ابو حنیفہؒ کی سند سے ابو ایسیثم سے اور انہوں نے اس سے جس نے اسے شریع سے نقل کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ جب وہ کسی جھوٹے شاہد کو پکڑتے اور وہ بازاری ہوتا تو وہ اپنے قاصد کو کہتے کہ تم اہل سوق کو کہہ دو کہ شریع تمہیں مسلمان کہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اس جھوٹے گواہ کو پایا ہے لہذا تم اس سے بچو۔ اور اگر وہ عرب میں سے ہوتا تو اسے اس کی قوم کی مسجد میں بھیج دیتے اور وہاں تمام لوگوں کو جمع کرتے اور وہاں بھی قاصد کو وہی کچھ کہنے کو کہتے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہؒ نے شریع سے نقل کیا ہے۔

ابن جریجؒ نے کہا ہے کہ شہادت زور سے مراد مطلق جھوٹ ہے (3)۔ اور کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ جھوٹ کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ کیونکہ باطل کا مشاہدہ اس میں شریک ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور ایسے قسے سننا جس میں اغویات اور جھوٹ ہوں یا ایسی مجلس میں شہر کے بارے ہوں وہاں جانا جائز نہیں۔ اسی طرح مجاہدؒ نے بھی کہا ہے کہ وہ شریکین کی عیدوں (میلوں) میں حاضر نہیں ہوتے (4)۔ اور یہ بھی ہے کہ اس سے مراد توحہ کی مجلس ہے۔ اور قنادہ نے کہا ہے کہ وہ اہل باطل کی ان کے باطل نظریات پر مدد نہیں کرتے۔ اور محمد بن حنفیہؒ نے کہا ہے کہ وہ اغواء اور گانے بجانے کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ غناء (گانا) دل میں فحاش پیدا کرتا ہے جیسا کہ پانی بھیجتا گا تا ہے (5)۔ یعنی نے کہا ہے کہ زور کا اصل معنی ہے کسی شے کو خوبصورت بنانا اور

اسے اپنے وصف خاص کے خلاف پرکھنا۔ گویا اس کا معنی ہے باطل کو اس طرح طمع سازی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ سمجھ جائے کہ وہیم دلانے لگے میں کہتا ہوں کہ لغت میں زور کا معنی رات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَنْ يُؤْمِنَ قَوْمٌ حَتَّىٰ يَكُونُوا يَكْفُرُوا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ اور کذب میں حق سے باطل کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور اسی طرح بر لغو بات میں ہوتا ہے۔ قافوں میں ہے کہ اگر زور کا معنی کذب، شرک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ، پھر دو نصاریٰ کی عیدیں، رئیس، گانے، بھانے کی مجلس، ہر وہ شے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے اور قوت ہے (1)۔ اور یہ آیت رئیس اور قوت کے علاوہ دیگر تمام معانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ع۔ اس کا عطف "لَا يَشْكُرُونَ الْكَوْثَرَ" پر ہے۔ اور یہ دونوں ایک موصول کے دو حصے ہیں۔ اور ان دونوں میں وجہ اشتراک ظاہر ہے کہ زور سے مراد تمام گناہ ہیں۔ شہود سے مراد حضور (حاضر ہونا) ہے اور لغو سے مراد بھی تمام قسم کے گناہ ہیں۔ جیسا کہ حسن اور بکری نے کہا ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں کی مجالس میں اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ حاضر نہیں ہوتے اور جب وہاں سے اتفاقاً گزر رہے ہیں تو بڑے وقار کے ساتھ، تیزی رفتاری کے ساتھ، اعراض کرتے ہوئے اور مجلس کی طرف توجہ کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ (2) کہا جاتا ہے "كُرْمٌ فَلَانٌ عَمَّا يُبْشِرُهُ إِذَا تَوَفَّاهُ وَانْكَرَمَ نَفْسُهُ غَنَةً" (فلاں ان چیزوں سے مہرہ ہے جو اس کے لیے عیب کا سبب ہیں جب کہ وہ ان سے مزہ ہو اور وہ اپنے آپ کو عیب سے محفوظ کر لے)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب وہ انکار سے سب و شتم اور اذیت ناک باتیں سنتے ہیں تو وہ ان سے اعراض کرتے اور درگزر کرتے ہیں (3)۔ اسی کی مثل ایک روایت جرجی نے مجاہد سے نقل کی ہے۔ اور "إِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ" سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ (4)

میں کہتا ہوں کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ قتال جزیدہ سے شتم ہو جاتا ہے اور سب و شتم اور اذیت پہنچانے کے سبب قتال جائز نہیں ہوتا۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخَفُوا عَلَيْهِمْ حَسَبًا وَعُمِيًّا ۝

"اور وہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات سے تو نہیں ڈرتے ان پر ہرے اور اندھے ہو کر لے"

۱۔ اور جب انہیں وعظ و نصیحت اور آیات قرآن کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے یا ایسی آیات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور تہذیب پر دلالت کرتی ہیں۔ تو وہ اس طرح نہیں رہتے کہ انہیں سننے والے نہ ہوں اور نہ انہیں دیکھنے والے ہوں، یعنی ان کی آنکھیں ان آیات طہیات سے غافل ہوں۔ گویا کہ وہ بہرے ہیں۔ انہوں نے انہیں سنائی نہیں اور وہ اندھے ہیں انہوں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو سنتے ہیں ان آیات طہیات کو جن کے ساتھ انہیں نصیحت کی جاتی ہے وہ اسے توجہ سے سنتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ حق کو دیکھتے بھی ہیں اور اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ تو اس میں مراد حال کی نفی ہے فعل کی نہیں۔ جیسا کہ یہ قول ہے "لَا يُلْقَايْنِ ذُنُوبًا ذَا كِبًا" (زید سوار ہونے کی حالت میں مجھے نہیں ملا) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت طہیہ میں حاضیر معاصی کے لیے ہے جن پر لفظ "اللغو" دلالت کر رہا ہے۔

وَالَّذِينَ يَعْلَمُونَ رَبَّهُمْ لَأَبْرَأُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَذُرِّيَّتَهُمْ أَفْكَارًا عَيْنِينَ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۝

"اور وہ جو علم کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب امرِ محبت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی

خُشْدَک لے اور بنا ہمیں پرہیزگاروں کے لیے پیشواں۔“

لے وَ ذُرِّيَّتًا كَوَامِرًا، عزوہ، کسانِ اور ابوبکر نے بغیر الف کے وَ ذُرِّيَّتًا پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے ساتھ جمع کی صورت پر پڑھا ہے۔ اور ”قُرَّةُ اَعْيُنٍ“ میں اَعْيُنٍ کو کمرہ ذکر کرنا قُرَّة کے کمرہ ہونے کی وجہ سے تعظیم کے لیے ہے۔ اور امین کو جمع قلت کے صیغہ کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد متقین کی آنکھیں ہیں اور یہ دوسروں کی آنکھوں کی نسبت قلیل ہی ہیں۔ اس میں ”عین“ ابتداء سے ہے یعنی ”هَبْ لَنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ كَانَتْ مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَّتِنَا“ (ہمیں آنکھوں کی خُشْدَک عطا فرما مارِ آنکھانیکہ وہ ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے ہو) یعنی تو انہیں صالح بنادے تو ان کے سبب ہماری آنکھیں خُشْدی ہوں گی۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ بندہ مومن کی آنکھوں کو اس سے بڑھ کر خُشْدَک پہنچانے والی کوئی شے نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار دیکھے (1)۔ حسن نے کہا ہے کہ قُرَّةً واحد ہے اس لیے کہ یہ مصدر ہے اور اس کا اصل معنی خُشْدَک ہے۔ کیونکہ عرب گرمی سے ازیت محسوس کرتے تھے اور خُشْدَک سے راحت، خوشی اور سروے کے وقت قُرَّة العین اور غم و حزن کے وقت سَخْنَةُ العین ذکر کیا جاتا ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنکھ کا آنسو سرد کے وقت خُشْدَک اور غم کے وقت گرم ہوتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے کہ قُرَّة العین کا معنی یہ ہے کہ اس کا دل اپنے محبوب کو حاصل کر لے، پالے اور آنکھ اس کے سوا کسی اور کو دیکھ کر خُشْدی نہ ہو بلکہ اسے ہی دیکھ کر خُشْد ملے۔ (3)

ج۔ یہ سابقہ جملے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جب ان کی ازواج اور ان کی اولاد قح ہوگی اور وہ اپنی ازواج اور اولاد کے اندر ہیں تو اس طرح وہ متقین کے امام ہو گئے۔ اور امامت کا جو شخص پر دلالت کرنے اور عدم التماس کی وجہ سے واحد ذکر فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد خُشْمٌ يُخْرِجُكُمْ مِطْلًا فَاَنْتُمْ عَدُوٌّ لِّلْاَرَبِّ الْعَالَمِينَ میں طفل اور عَدُوٌّ مفرد الفاظ جماعت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام مصدر ہے جیسا کہ قیام اور صیام۔ لہذا کہا جاتا ہے ام امام بھی کہا جاتا ہے قَامَ قِيَامًا اور صَامَ صِيَامًا۔ یا پھر اس لیے ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو متقین کا امام بنادے ”اِنْجَعَلَ كُلٌّ وَاَحَدٌ مِّنَّا لِلْمُتَّقِينَ اِمَامًا“ جیسا کہ یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ اِنْ تَاْمُرُوْا سُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ یا پھر اس لیے کہ وہ تمام کے تمام اپنے طریقہ کے متحد ہونے اور اپنے کلام کے متفق ہونے کی وجہ سے ایک نفس کی مش ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ام کی جمع ہے۔ جیسا کہ ضامن کی جمع صیام ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تو ہمیں متقین کا قصد کرنے والا اور ان کے راستے پر چلنے والا بنادے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْعُرْفَةَ بِاصْبَرٍ اَوْ يَكْفُونَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ۝

”یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کو بدلہ ملے گا (جنت کا) بالا خانہ لے ان کے ممبر کرنے کے باعث ج۔ اور ان کا استقبال کیا

جائے گا۔ وہاں دعا اور سلام سے ج۔“

ل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جو ان صفات سے متصف ہیں انہیں جنت کے اعلیٰ مقامات (بطور جزاء) دیے جائیں گے۔ شیخین نے صحیحین میں، امام احمد نے ابوسعید خدریؓ سے اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں رہنے والے اپنے سے اوپر بالا خانہ میں رہنے والوں کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسا کہ تم افق مشرق یا مغرب میں سے دور آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو (اور یہ تفاوت) ان کے درمیان باہم تفاضل کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ وہ تو

انبیاء کے مراتب ہیں، کوئی ان کے سوا تو وہاں نہیں پہنچ سکے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تقدیر کی (1)۔ اسی کی مثل سبل بن سعد سے بھی مروی ہے۔ امام احمد، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ سے، اور اسے حاکم نے صحیح کہا ہے، ترمذی اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے اور امام احمد نے ابو مالک اشعری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہوں گے جس کے ظاہر کو ان کے باطن سے شفاف ظاہر کی طرح دیکھا جاسکے گا۔ صحابہ نے عرض کی وہ کن کے لیے ہوں گے یا رسول اللہ! ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جنہوں نے کلام اچھا کیا (خوش گفتار)، کھانا کھلایا (بھوکوں کو)، اور رات عبادت کرتے ہوئے گزار دی درآئیکہ لوگ سوئے رہے (2)۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے ”جنہوں نے کلام اچھا کیا، سلام پھیلایا، کھانا کھلایا، رات کو عبادت کرتے رہے درآئیکہ لوگ سوئے رہے“ (3)۔ اور ابو مالک کی حدیث میں ہے ”جنہوں نے کھانا کھلایا، کلام نرم کیا، مسلسل روزے رکھے اور راتوں کو عبادت کی درآئیکہ لوگ سوئے رہے“ (4)۔ ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں جنت کے بالا خانوں کے بارے میں مطلع نہ کروں؟ ہم نے کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں جو ابرار کے بنے ہوئے بالا خانے ہیں جن کا ظاہر ان کے باطن (اندروں) سے ظاہر کی مثل ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان میں (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) ایسی ایسی نعمتیں، لذت اور شرف ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ وہ بالا خانے کن کے لیے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جو سلام کو عام کرتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، ہمیشہ روزے رکھتے ہیں اور رات کو عبادت کرتے ہیں جب کہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس کی طاقت کون رکھتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے۔ میں تمہیں اس کی خبر دوں گا فرمایا وہ آدمی جو اپنے بھائی سے ملنا، اس پر سلام کیا اور اسے سلام کا جواب دیا گیا۔ گویا تو اس نے سلام کو عام کیا، جس نے اپنے اہل و عیال کو اتنا کھانا کھلایا یہاں تک کہ اس نے انہیں خوب سیر ہو کر دیا، تو تحقیق اس نے انہیں کھانا کھلایا، جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر ہر مہینے تین روزے رکھے تو گویا اس نے ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو تحقیق اس نے ساری رات عبادت کی اور لوگ سوئے رہے (5) یعنی بیہود، نصاریٰ اور مجوسی، اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

ابن عدی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک جنت میں بالا خانے ہیں کہ ان میں رہنے والوں پر وہ چیزیں مٹتی نہیں ہوں گی جو ان سے باہر ہیں اور جب تک وہ ان سے باہر ہوں گے تو ان پر وہ چیزیں مٹتی نہیں ہوں گی جو ان کے اندر ہیں۔ تو عرض کی گئی وہ کن کے لیے ہیں یا رسول اللہ ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جنہوں نے کلام اچھا کیا، مسلسل روزے رکھے، کھانا کھلایا، سلام عام کیا اور رات کو عبادت کی درآئیکہ لوگ سوئے رہتے تھے۔ عرض کی گئی خوبصورت اور اچھا کلام کون سا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ کیونکہ جب وہ قیامت کے دن آئے گا تو یہ کلام آگے آگے ہوگا، نجات دلائے والا ہوگا اور پیچھے پیچھے آئے گا۔ پھر عرض کی گئی

1- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 461 (دزارت تعلیم) 2- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (دزارت تعلیم)

3- شعب الایمان، جلد 3 صفحہ 216 (اعلیٰ) 4- منند امام احمد، جلد 5 صفحہ 243 (صادر) 5- الترمذی، جلد 4 صفحہ 251 (القر)

وصال الصوم کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے رمضان المبارک کے نفل مینے کے روزے رکھے تو گویا اس نے مسلسل روزے رکھے۔ پھر عرض کی گئی کھانا کھلانے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اپنے اہل و عیال کو خوراک مہیا کرنا۔ پھر عرض کی گئی سلام عام کرنے کا معنی کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کی مصاحبت اختیار کرنا اور سلام کہنا۔ پھر کہا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے کہ رات کو نماز پڑھی اور لوگ سوئے رہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عشاء کی نماز ادا کرنا۔

حکیم ترمذی نے حصل بن سعد سے اس آیت کے تحت مرفوعاً نقل کیا ہے کہ یہ بالا خانے سرخ یا قوت، ہبز زبرد اور سفید موتیوں کے بنے ہوئے ہوں گے نہ تو ان میں سے کوئی ٹوٹا ہوگا اور نہ کسی میں کوئی عیب ہوگا۔ (1)

جہاں کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے اطاعت و پیروی اختیار کرنے، شہوات چھوڑنے، محابرات کرنے اور مشرکین کی طرف سے افیتیں پہنچائے جانے کی تکلیف اور مشقت کے دوران کیا۔ ابو نعیم نے ابو جعفر سے نقل کیا ہے کہ یہ ان کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے دار دنیا میں فقر و افلاس پر کیا۔ (2)

یعنی ”وَيُلْقُونَ“ اس کو حوزہ، کسان کی اور اپنی کھیتی باڑی کے فتنے، لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ”يُلْقُونَ“ اور باقی تمام قراء نے یا، کے ضمہ، لام کے فتنے، اور قاف کو مخدود پڑھا ہے۔

یعنی ملائکہ ان کے لیے دعا کریں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے۔ یعنی وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں گے اور انہیں باقی رہنے اور ہر آفت سے محفوظ رہنے کی بشارت دیں گے۔ یہی نے کہا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سلام کریں گے اور رب کریم ان پر سلام فرمائے گا۔ (3)

امام احمد، بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ وہ مہاجرین و انصار ہیں جن کے ساتھ سرحدیں آباد ہیں، ان کے سبب تکلیفیں اور مشقتیں آسان ہو گئیں اور ان میں سے کوئی فوت نہیں ہوا مگر اس کی اپنی حاجت (و خواہش) اس کے سینے میں ہی رہی اور اس نے اسے پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا فرمائے گا تم ان کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کہو۔ تو ملائکہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم تیرے آسمان کے باسی ہیں اور تیری بہترین مخلوق میں سے ہیں تو تو ہمیں حکم فرما رہا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور ان پر سلام پیش کریں۔ تو رب کریم فرمائے گا بے شک وہ میری عبادت کرتے تھے وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں سمجھتا تھے، ان کے سبب سرحدیں آباد ہیں (یعنی جہاد جاری رہا) ان کے سبب مشقتوں سے حفاظت رہی، ان میں ہر ایک مرتا رہا اور اس کی حاجت اس کے سینے میں رہی اور اسے پورا کرنے کی اس نے طاقت نہ رکھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت ملائکہ ان کے پاس آئیں گے۔ پس وہ ان پر دروازے سے داخل ہوں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو ان کے بدلے جن پر تم نے صبر کیا۔ پس یہ آخرت کا گھر کتنا اچھا ہے (4)۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لیے دعا کریں گے ہمیشہ باقی رہنے اور آفات سے سلامت رہنے کی۔

خَلِيلَيْن فِيهَا حَسَنَتٌ مُسْتَقَرٌّ أَوْ مَقَامًا ۝

”وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس میں بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے۔“

یعنی ان کے قرار اور اقامت کی جگہ بہت عمدہ ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا دینے والا نہادے گا کہ بے شک اب تمہارے لیے صحت ہے تم کبھی بیمار نہیں ہو گے، تمہارے لیے اب ایسی حیات ہے کہ تم کبھی نہیں مرو گے، تمہارے لیے اب ایسی جوانی ہے کہ تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہارے لیے اب ایسی نعمتیں ہیں کہ تم کبھی محروم نہیں ہو گے۔ (1)

قُلْ مَا يَعْبُوْهُكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دَعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِرَبِّكُمْ ۝

”آپ فرمائیے کیا پروردگار سے تمہاری میر سے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔ اور تم نے (تو انہا) جیسا، شروع کرنا چاہا۔ تو یہ جیسا تا تمہارے گلے کا بار بٹا رہے گا۔“

آپ فرمادیجئے اے محمد ﷺ میر سے رب کو تمہاری کیا پروردگار ہے۔ یہ جملہ مستأنف ہے اور یغیوٰہ غیبات الحبش عواہ سے ہے یعنی میں نے لشکر کو ترتیب دیا اور اسے تیار کیا۔ ای طرح نہایہ میں ہے (2) یعنی کوئی چیز تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گی۔ اگر تم اس سے استغفار نہ کرو۔ یہ معنی بھی کیے گئے ہیں اگر تم اس کی عبادت نہ کرو یا اگر تم ایمان نہ لاؤ، یا اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دے۔ پس جب تم ایمان لاؤ گے تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما یغیوٰہ غیبا یعنی نقل سے بنا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں کوئی وزن اور قدر نہیں دیتا اور نہ اسے تمہاری کوئی پرواہ ہے اگر تم اس کی عبادت اور اطاعت نہ کرو۔ کیونکہ انسان کا شرف اور کرامت معرفت اور اطاعت کے باعث ہے۔ ورنہ وہ چوپاؤں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ کم کردہ راہ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دیتا۔ پس اب جب تم ایمان لے آئے تو تمہاری قدر و منزلت ظاہر ہوگی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اسے تمہاری کیا پروردگار ہوتی کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا اگر تم اس کی عبادت و اطاعت نہ کرو۔ یعنی اس نے تو تمہیں پیدا ہی اپنی عبادت کے لیے کیا ہے۔ جیسا کہ رب کریم نے فرمایا وَ مَا يَوْفَا حَالُكُمُ الْيَوْمَ اِنْ اَنْتُمْ اَنْفُسًا اِلَّا لِيَعْبُدُوْهُ (3) علامہ بخوی نے کہا ہے کہ یہ قول ابن عباس اور مجاہد کا ہے۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اسے تمہاری کیا پروردگار ہے۔ یہ معنی نقل اور قدر سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ نقل شے جوڑی قدر اور ذی وزن ہو اس کی پرواہ کی جاتی ہے۔ لہذا اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ میر سے رب کو تمہاری مغفرت کی کیا پرواہ ہے اگر تم اس کے ساتھ اور خداؤں کو نہ پکارو اور کیا ہے اسے کہ وہ تمہیں عذاب دے اگر تم کسی کو شریک نہ بناؤ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعِبَادِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ“ (اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دے گا اگر تم شکر بجا لائے اور ایمان لائے اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اسے تمہیں عذاب دینے سے کیا پرواہ ہے اگر تم اسے سختیوں اور مصیبتوں میں نہ پکارو۔ جیسا کہ اس معنی پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: فَاِذَا دَاوَرَكُمُوْا اِنِّيْ الْخَالِقُ دَعَا اللّٰهُ مُخْشِعِيْنَ لِّلْاٰتِيْنَ۔

اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں پیدا نہیں کیا دراصل تمہیں اسے تم سے کوئی حاجت ہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں تمہاری کوئی قدر رہے مگر یہ کہ تم اس سے مانگو گے تو وہ تمہیں عطا کرے گا۔ اور اگر تم اس سے استغفار کرو گے تو وہ تمہیں بخش دے گا۔ اس معنی کی بناء پر ”منا“ نافیہ ہے۔ اور اگر تم اسے استغماہیہ بناؤ تو مصدر یہ ہونے کی بناء پر کل نصب میں ہے۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے خدا

یہ خطاب کفار مکہ کو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے رسول (ﷺ) کے ذریعے اپنی توحید اور عبادت کی طرف بلایا ہے۔ لیکن تم نے تو رسول معظم ﷺ کو جھٹلادیا اور تم نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کیسے کرے گا؟ تمہارا اس کی بارگاہ میں وزن اور قدر کیسے بنے گی یا پھر اے تمہارے عذاب کی پرواہ کیسے ہوگی یا پھر وہ کیسے تمہاری مغفرت کی پرواہ نہیں کرے گا۔

سچ پس تمہارا جھٹلانا تمہارے لیے لازم ہو جائے گا۔ پس تمہیں تو یہ کی توفیق نہیں دی جائے گی یہاں تک کہ تمہارے اعمال پر جزا مرتب ہو جائے گی۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہارے جھٹلانے کی سزا تمہارے لیے لازم ہے بائقین وہ جہنم محیط ہو گی۔ یا اس کا اثر تمہارے لیے لازم ہے یہاں تک کہ وہ جہنم میں گرا دے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لو اہل کا معنی موت ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا اس کا معنی ہلاک ہونا ہے ابن زید نے کہا اس کا معنی قتال ہے اور ابن جریر نے کہا ہے اس کا معنی ہے ایسا عذاب جو داغی اور لازمی ہو، ہلاک کرنے والا اور فنا کرنے والا ہو اور اس میں تم میں سے بعض بعض سے ملے ہوں گے (1)۔ امام بیہقی نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ بد میں قتل ہونے والے ستر افراد ہیں۔ یہ قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم کا ہے (2)۔ یعنی وہ بد رکے دن مقتول ہوئے اور آخرت کا عذاب ان کے ساتھ لازماً متصل ہو گیا۔

حضرت امام بخاریؒ نے اپنی تصحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں ہیں جو پوری ہو چکی ہیں (دعائے دعوائے)، چاند کا شش ہونا، روم کا فتح ہونا، عیسیٰ (مخت گرفت) اور یزید (3)۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ واللہ اعلم۔

الحمد لله رب العالمين و صلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله و اصحابه اجمعين.

سورة الشعراء

﴿الْباقِ ۲۲﴾ ﴿سُورَةُ الشُّعَرَاءِ مَكِّيَّةٌ ۲۲﴾ ﴿مَكِّيَّةٌ ۱۱﴾

سورة اشعراء کی ہے، اس میں گیارہ رکوع اور دو سو ستائیس آیات ہیں۔

سورة اشعراء آخری چار آیتوں کے سوا سبکی ہے، یعنی ذِ الشُّعَرَاءِ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ سے لے کر تا آخر۔ اس کی 227 آیتیں اور 11 رکوع ہیں۔ "حاکم نے مستدرک میں معتقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رُط، طواسین اور جوامیم مجھے الواح موسیٰ میں سے عطا کی گئی ہیں۔" (1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طسم ①

"ط-سین-میم لہ"

لہ "طسم" حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یہاں، سورة قصص اور سورة نمل میں طاء کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے بین بین اور باقی قراء نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر اور حمزہ نے یہاں اور سورة قصص میں نون کو میم سے ظاہر کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ بغوی نے کہا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا طلاء طسم کی تفسیر سے عاجز ہیں۔ اور علی بن طلحہ الواسلی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ قسم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ یہ اسمائے قرآن میں سے ہے، مجاہد نے کہا یہ اس صورت کا نام ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی قدرت اور عظمت و بزرگی کی قسم کھائی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین راز ہے۔ (2)

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ①

"یہ لہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی لہ"

لہ اس کا اشارہ اس سورت یا قرآن کریم کی طرف ہے۔

یعنی اس کا اعجاز اور اس کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ احکام اور ہدایت کے راستوں کو ظاہر کرنے والی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ②

"(اے جان عالم) لہ شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لارہے۔"

لہ کہا جاتا ہے "بخیع نفسہ" یہ باب منع سے ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، البخیع کا

اصل یہ ہے کہ ذبح کے وقت نضاع تک پہنچنا اور نضاع صلب (پشت) میں ایک رگ ہے جو نرون سے جوڑا کرتی ہے۔ اور یہی ذبح کی حد ہے۔ اور یہ نضاع کے علاوہ ہے۔ جیسا کہ زمخشری نے خیال کیا ہے۔ پھر اظہار مبالغہ کے لیے اسے ہر ایک کے لیے استعمال کیا ہے۔

یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جبکہ اہل مکہ نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور یہ آپ ﷺ پر بہت شاق گزارا کیونکہ آپ ان کے ایمان کے بہت حریف تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا ان کے ایمان نہ لانے پر شدید تمکین ہونے کا سبب اللہ تعالیٰ کا یہ خوف ہو کہ وہ آپ کو اپنی قوم کا انکار کی وجہ سے سزا دے گا۔ پس یہ آیت آپ ﷺ کے لیے تسلی کا باعث ہے۔ لعل لفظ ترحی کے لیے آتا ہے اور یہاں شفاق کے لیے ہے۔ یعنی اپنے آپ پر شفقت کیجئے اور غم نہ کیجئے۔ کیونکہ اگر غم کرتے رہے تو اپنے نفس کو غم کے سبب ملامت کر دو گے۔ دیکھ ہم نے ان کے ایمان کو چاہا ہی نہیں۔

إِنْ تَشَاءُ نُزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ ۝

”اگر ہم چاہیں، تو اتاریں ان پر آسمان سے کوئی نشانی پس ہو جائیں یہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی۔“

اے کیونکہ اگر ہم ان کا ایمان چاہیں تو ہم ان پر آسمان سے نشانی اتاریں، جو ایمان کی پناہ لینے پر دلالت کرتی ہو یا وہ ایسی آزمائش ہو جو ایمان کی طرف لوٹانے والی ہو۔

۲۔ قَضَتْ کا عطف نازل پر ہے۔ اور اس کا معنی فُضِّل ہے۔

پس ان کی گردنیں اس کے لیے جھٹکنے والی ہو جائیں۔ عقادہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان پر کوئی نشانی نازل فرما دیتا جس کے سبب وہ رام ہو جاتے اور اس کے بعد کوئی بھی معصیت کی طرف نہ مڑتا۔ لیکن ایسی کوئی نشانی ان پر نازل نہیں ہوئی۔ ابن جریر نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے لیے اپنے امور میں سے کوئی ایسا امر نازل فرما دیتا کہ اس کے بعد ان میں سے کوئی بھی معصیت کا عمل نہ کرتا (1)۔ یہاں خاصۃً کی جگہ خاصۃً ذکر کیا گیا ہے (یعنی مونث کی جگہ نہ ذکر کیا گیا ہے اس لیے تاکہ آیات کے آخری الفاظ ایک جیسے رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل کلام اس طرح ہے: ”فَطَلَّوْا لَهَا خَاصِصِينَ“ پس اس میں محل خضوع کے بیان کے لیے اغناقی بطور تہجیم زیادہ کر دیا گیا اور خبر کو اپنے اصل پر باقی رہنے دیا گیا ہے۔ (تہجیم سے مراد یہ ہے کہ کسی کلمہ کو مضاف اور مضاف الیہ جیسے دو متلازم کے درمیان داخل کر دینا مترجم)۔ یہ قول بھی ہے کہ اصل عبارت یہ ہے: ”طَلَّتْ اصْحَابُ الاغْنَاقِ لَهَا خَاصِصِينَ“ پھر اس سے ”اصحاب“ کو حذف کر دیا گیا اور ”اغناق“ کو ان کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔ کیونکہ گردنیں جب جھٹکتی ہیں تو ان کے ارباب (گردنوں والے) بذات خود جھک جاتے ہیں۔ پس پہلے فعل اغناق کے لیے (مونث) لایا گیا ہے۔ پھر خاصصین (مذکر) مردوں کے لیے ذکر کیا ہے۔

انفخ نے کہا ہے کہ خضوع کا تعلق اسی مضمر کے ساتھ ہے جس کی طرف اعناق کی اضافت ہے (2)۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ اعناق کو خضوع کی صفت سے متصف کیا گیا ہے حالانکہ یہ عقلا و صفات میں سے ہے اس لیے کہ انہیں (اعناق کو) ان کے (عقلا و) کا نام مقام رکھا گیا ہے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ صفت کو مذکر ذکر کرنا مذکر کی محاورت کے سبب ہے۔ کیونکہ یہ عربوں

کی عام عادت ہے کہ وہ صفت مومن کو مذکور کرتے ہیں جبکہ وہ مومن کو مذکور کی طرف مضاف کریں اور مذکور کو مومن ذکر کرتے ہیں جبکہ وہ اسے مومن کی طرف مضاف کریں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "عنق" سے مراد مکمل بدن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے **وَابْتَغِ الْفَقْدَ مَثَلًا لِّأَنَّهُ ظَنَّىٰ كَافِرًا عَنِ الْغَيْفِ** اور معنی ہے **فَطَلُّوا خَاصِصِينَ** (پس وہ جھنگے والے ہو جائیں) (1) مجاہد نے کہا ہے کہ اعتناق سے مراد درو سلام اور کبراء (سرور) ہیں اور معنی ہے **فَطَلُّتُمْ كَثِيرًا وَهُمْ لَهَا خَاصِصِينَ** (بڑے بڑے سردار اس کے لیے جھنگے والے ہو جائیں) اور یہ قول بھی ہے کہ اعتناق سے مراد جماعتیں ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے **"جَاءَ الْقَوْمُ غَنَفًا غَنَفًا"** ای جماعتاً و طوائف (قوم آئی جماعتوں اور گروہوں کی صورت میں)۔

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرِ مِنَ الرَّحْمَنِ مُحَدَّثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ①

"اور انہیں آیا کرتی ان کے پاس لے کوئی تازہ نصیحت الرحمن کی جانب سے ہے مگر یہ کہ وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔" اس کا عطف سابقہ جملے کے مضمون پر ہے۔ یا یہ حال ہے۔ جن ذنوب سے مراد کوئی نصیحت یا قرآن کریم کا کوئی ٹکڑہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہے اس میں "من" "تراندہ ہے اور" "ذکر" مکمل رفع میں ہے۔
 من الرحمن میں من ابتدا یہ ہے اور یہ ذکر کی صفت ہے۔ یعنی وہ نصیحت جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے نبی کریم ﷺ پر تازہ نازل کی گئی۔ اگرچہ وہ وہود کے اعتبار سے تو قدیم ہے۔
 اس استثناء مفرع ہے اور یا تاتبعہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یا مرفوع ضمیر سے حال ہے۔ یعنی کسی حال میں بھی ان کے پاس نصیحت نہیں آتی عمر اس حال میں کہ وہ اس پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَتُوبًا كَانُوا بِسِتْرَتِكَ عَوْنًا ①

"تو بے شک انہوں نے تکذیب کی کہ وہ اس کی توبہ مانگ لیں اور انہوں نے اس حد تک تکذیب کی کہ وہ اس سے استہزاء کرنے لگے۔ استہزاء کا ضد ناذر اس ارشاد میں کیا گیا ہے۔ **فَسَيَأْتِيهِمْ** جب یوم بدر کو ان پر عذاب نازل ہوگا یا قیامت کے دن جب عذاب نازل ہوگا۔
 من (سومل جائے گی انہیں اطلاع) اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے کہ آیا وہ حق تھا یا باطل۔ کیا حقیقت ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور اس کی قدر و عظمت کو پہچانا جائے۔ یا اسے جھٹلایا جائے اور اس کے امر کو تحقیر سمجھ کر اس سے استہزاء کیا جائے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي كُنَّا فِيهَا مِنْ قَبْلُ دَوْحًا كَرِيمًا ①

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا زمین کی طرف لے کہ کتنی کثرت سے ہم نے اگائے ہیں اس میں ہر طرح کے مفید پودے۔"

لے یہ استفہام انکار کے لیے ہے اور اوامدوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے **"أَيُّظُنُّونَ أَنَّهُ غَلِيٌّ مَا يَذَّعْبُهُ مُحَمَّدٌ ﷺ مِنَ التَّوْحِيدِ وَالبُعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى الْأَرْضِ"** یعنی انہیں ایسی نشانی کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ زمین کی طرف دیکھیں، یہی نشانی ہے۔ کیونکہ نئی کا انکار ثابت ہوتا ہے۔

یہ ”الْأَرْضُ“ سے بدل اِستہلال ہے اور کلمہ خبریہ ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے زمین میں نباتات کی مختلف اقسام کثرت سے لگائی ہیں۔

سچ جو حسین بھی ہیں اور قابل تعریف بھی اور لوگوں یا چوپائوں کی غذا اور دوا کے لیے انتہائی نفع بخش اور مفید بھی ہیں۔ ان سے یہ فائدہ انفرادی طور پر حاصل ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کے ساتھ مل کر۔ اور یہ بھی ہے کہ زمین کی نباتات میں سے مختلف قسموں کو اگانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ خالق ان کی ایجاد پر بھی قادر ہے اور انہیں ختم کرنے کے بعد انہیں دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی توحید اور صفات کمال پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس میں لفظ ”نخل“ افراد کے احاطہ کے لیے ہے اور حکم ان کی کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے۔

إِنِّي فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝

”بے شک اس میں (ان کے لیے قدرت الہی کی) نشانی ہے۔ اور ان سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔“
یعنی ان تمام اقسام کو اگانے میں یا ان میں سے کسی ایک میں ”لَآيَةٌ“ (نشانی ہے) حوالہ ہے اس فاعل کا جو واجب لذات ہے اور تمام القدوة والحکمة ہے۔ اور نعت و رحمت کے اعتبار سے انتہائی وسیع ہے۔

یعنی اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قضا میں ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی لیے ان عظیم الشان نشانیوں نے انہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ سیوہو نے کہا ہے کہ یہاں نشان زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ان نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لانے والے نہیں۔

وَإِن مَّ رَأَيْتَ أَنَّ مَرْبِّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

”اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

یعنی عزیز کا معنی غالب ہے جو کہ کافروں سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہو اور ”الرَّحِيمُ“ سے مراد ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے اس اعتبار سے کہ اس نے انہیں مہلت دی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ انتقام کی قدرت رکھتا ہے اس سے جو کفر کرے اور اس پر رحم کرنے والا ہے جو توبہ کرے اور ایمان لائے۔

وَإِذْ نَادَىٰ مَرْبُّكَ مَوْسَىٰ أَنْ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

”اور یاد کرو جب خدا ہی آپ کے رب نے موسیٰ علیہ السلام کو (اور فرمایا) کہ جاؤ۔ ظالم لوگوں کے پاس۔“

یعنی اور یاد کرو جس وقت انہوں نے درخت اور آگ کو دیکھا۔ اس کا عطف اس قول کے مضمون پر ہے ”فَلَعَلَّكَ بَاجِعٌ مُّقَنَّكَ“ کیونکہ تقدیر عبارت یہ ہے ”لَا تَعْبُذُونَ عَلَىٰ كُفْرِهِمْ قَوْمُكُمْ وَلَا تَبْعُغُ نَفْسُكُمْ وَأَذْخُرُ وَقْتُ بَدْءِ رَبِّكَ مُؤَسِّسٌ“ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام مستأخّر ہو اور ظرف قول باری تعالیٰ ”فَالْزَبْتُ“ کے متعلق ہو۔

یعنی اس میں ”اَنِّي“ فاعلی کی تفسیر کے لیے ہے۔ یا اَنِّي مصدر یہ ہے۔ یعنی اِنْتُ اِنْتُ۔

اس ان لوگوں کے پاس جو کفر کے سبب ظلم کرنے والے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ظالم ہونے کا سبب ان کا بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا اور ان سے ناروا مشقت لینا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تکلیف دہ امر یہ کہ ان کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم جاری کیا۔

قَوْمٌ فَرَعُونَ ۝۱۱ اَلَا يَتَذَكَّرُونَ ۝۱۲

”یعنی قوم فرعون کے پاس کیا وہ (قہر الہی سے) نہیں ڈرتے ہیں۔“

۱۱۔ ”الْفُرْعَانُ“ سے بدل ہے یا اس کے لیے عطف بیان ہے۔ اور صرف قوم پر اقتدار اس کے معروف و معلوم کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فرعون تو ان تمام سے بڑھ کر آگے آگے تھا۔

۱۲۔ یہ استفہام انکار اور توجہ کے لیے ہے۔ اور اس کا معنی امر کی صورت میں ہے۔ یعنی ”لِيَتَذَكَّرُوا اَنْفُسَهُمْ عَنْ عَذَابِ اللّٰهِ بِطَاغِيَّتِهِ“ (چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سبب اس کے عذاب سے بچائیں) اور یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: ”اَلَا يَأْتِي قَوْمٌ اَتَقْنُونَ“ تو اس صورت میں یہ قول کی تقدیر کے ساتھ ایت کے قائل سے حال ہوگا یعنی ”اَيْتٌ قَابِلَةٌ لَّهُمْ مِنَ اللّٰهِ اَلَا يَأْتِي قَوْمٌ اَتَقْنُونَ“ اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے اَلَا يَسْجُدُوْا لِمَنْ اَلَا يَأْتِي قَوْمٌ اَسْجُدُوْا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُكَلِّمُنِيْ ۝۱۳

”آپ نے عرض کی کہ میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔“

۱۳۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

۱۴۔ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اپنی کوتاہی، ان کی کثرت اور ابو عمرو نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ۔

۱۵۔ وَ يَصْبِقُ صَدْرِيْ کو جمہور نے اَخَافُ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے یکذبون پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور یہی اختلاف اس قول میں بھی ہے۔

وَيَصْبِقُ صَدْرِيْ وَلَا يَمْلِكُ لِسَانِيْ قَاۤسِرٌ ۝۱۴ اِلَىٰ هٰرُونَ ۝۱۵

”اور گھٹتا ہے میرا سینہ اور روانی سے نہیں چلتی میری زبان۔ سو (اگر وہ نرم) کوئی بھیجے، ہارون کی طرف سے۔“

۱۴۔ اور میری زبان روانی سے نہیں چلتی اس لیے کہ اس میں نکلت ہے۔ اور سینہ گھٹتا ہے اس لیے کہ ان کی تکذیب کا دفاع کرتے ہوئے حجت قائم کرنے میں مدد اور مقصد کو بیان کرنے کے لیے زبان معاون و مددگار نہیں ہوتی۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے جھٹلانے سے میرا سینہ گھٹتا ہے۔

۱۵۔ سو وہ بھیجے یا جبرائیل امین کو وہی کے ساتھ بھیجے۔

۱۶۔ ہارون کی طرف فَارَ دَیْسِل میں فہاء سببہ ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملائے اور انہیں اپنے معاملات میں شریک کرنے کی استدعا کو تین امور پر مرتب کیا ہے، یعنی تکذیب کا خوف، تکذیب کا اثر قبول کرتے ہوئے دل کا تنگ ہونا اور زبان میں نکلت کا بڑھ جانا اس طرح کہ جب دل گھٹنے کے وقت روح باطن قلب کی طرف منقبض ہوتی ہے تو

زبان چلتی ہی نہیں۔ کیونکہ جب یہ امور جمع ہو جائیں تو ایسے مددگار اور معاون کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دل کو تقویت پہنچائے اور اس کی نیابت کے فرائض سرانجام دے۔ جب اس کی زبان بولنے میں ساتھ نہ دے حتیٰ کہ اسے دعا پر محمول نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ دعوت کی نال مثل تھی اور نہ ہی حکم کی پیروی میں حیلہ بہانہ تھا۔ بلکہ یہ حکم کی پیروی میں ان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

وَلَهُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكَ خَافَ أَنْ يَقْتُلُوْنَ ۖ

”اور (تو جانتا ہے) کہ ان کا میرے ذمے ایک جرم بھی ہے۔ اے اسی لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔“

اے یہاں مضاف محذوف ہے۔ یعنی تبعۃ ذنب یا دعویٰ ذنب۔ اور اس سے مراد قبلی کا قتل ہے۔ اسے ذنب اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے گمان کے مطابق یہ گناہ تھا حالانکہ قبلی اپنے کفر کے سبب مباح الذم اور غیر معصوم تھا۔ (یعنی اسے قتل کرنا مباح تھا) یہ اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جسے دوسرے مقام پر شرح و سہلہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس لیے مجھے اس کا خوف ہے کہ وہ مجھے رسالت کے فرائض ادا کرنے سے قتل ہی قتل کر دیں گے۔ تو یہی قتل کے خوف کے سبب حکم تبلیغ کی عدم پیروی اور اس کی علت کا بیان نہیں بلکہ اس متوقع آزمائش سے بھاؤ کی استدعا ہے جو تبلیغ سے مانع ہے۔

قَالَ كَلَّا ۖ فَاذْهَبْ بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَعِينُونَ ۖ

”اللہ نے فرمایا اے ایما نہیں ہو سکتا پس تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور (ہر بات)

سننے والے ہیں۔“

اے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اس لیے تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ اس وعدہ کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کہ ان سے خوف کو دور کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اور ساتھ ہی ان کے بھائی کو فرائض رسالت میں ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ ”فاذہب“ میں صیغہ خطاب حاضر کی تغلیب کے لیے ہے۔ اور یہ اس فعل پر معطوف ہے جس پر تکرار دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ”قَالَ اذْهَبْ يَا مُوسَىٰ عَنْ قَوْمِكَ فَأَذْهَبَ اَنْتَ وَمَنْ طَلَبْتَ حُضْمَةً اِلَيْكَ“ (فرمایا اپنے قتل کے وہم سے باز رہ سو تو جائے اور وہ جس کا تو نے مطالبہ کیا، اسے اپنے ساتھ ملا لے)

اسے یعنی ہماری مدد موسیٰ، ہارون علیہما السلام اور ان کے تبعین کے ساتھ ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم تم دونوں اور جو تمہارے ساتھ عداوت رکھتے ہیں انہیں جانتے ہیں۔

اسے اور جو حکام تمہارے درمیان ہوگی اسے سننے والے ہیں۔ پس تم دونوں کو ان پر غلبہ دیں گے یہ دوسری خبر ہے۔ یا پھر یہ اس لیے خبر ہے اور معکم طرف لغو ہے۔

فَاتَّبِعُوا فِرْعَوْنَ فَقُوْلًا اِنَّا رُسُلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۖ

”سو دونوں جاؤ فرعون کے پاس اور اسے کہو ہم فرستادے ہیں رب العالمین کے۔“

اے اس میں رسول مفرود ہے اس لیے کہ یہ رسالت کے معنی میں ہے اور یہ مرسل اور رسالت کے مابین مشترک ہے۔ قاموس میں ہے کہ اسم رسالت بالکسر بھی ہے۔ اور بالفتح بھی۔ اور اسی طرح صبور، امیر اور رسول اس کا اطلاق مرسل پر بھی ہے (1)۔ علامہ بیضاوی نے

کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کبھی متثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی مفرد یعنی جب اس سے مراد مرسل ہو تو اسے متثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جب اس سے مراد رسالہ ہو تو مفرد اور جب اس سے مراد رب العالمین کا پیغام لانے والے ہیں۔ یا پھر مفرد ذکر کرنے کی علت یہ ہے کہ فعل کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے قاموس میں ہے۔ کہ اَبَانُ مُسَلِّ رَّبِّ الْعَالَمِينَ نہیں کہا کیونکہ مفعول اور فعل میں مذکر مؤنث، واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں (1)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ الرسول کا متثنیہ اور جمع کے معنی میں ہونا جائز ہے۔ کیونکہ عرب کہتے ہیں "هَذَا رَسُولِي وَذَلِكَ هَذَا رَسُولِي وَوَكِيلِي" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مفرد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دونوں اخوت میں متحد تھے یا پھر اس لیے کہ مرسل بہ (پیغام) ایک تھا۔ یا مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا رسول ہے۔ "اَنِّیْ مَفْرُہٌ ہُوَ کَیْنِکَ رَسُوْلُ رَسَالِیْ کَیْنِ مَعْنٰی مَضْمُنِ ہُوَ۔ اور ارسال قول کے معنی مضمین ہے۔

اَنْ اَسْرِسَلْ مَعَا بِنِیْ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱﴾

”(ہم تمہیں کہتے ہیں) کہ بھیج دے ہمارے ساتھ (ہماری قوم) بنی اسرائیل کو۔“

۱۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیجئے۔ کہ وہ تمام کی طرف چلے جائیں اور تو انہیں غلامی سے آزاد کر دے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ فرعون نے نہیں چار سو سال تک غلام بنائے رکھا اور اس وقت ان کی تعداد چھ سو سی ہزار تھی (چھ لاکھ اسی ہزار)۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام مصر کی طرف چلے گئے اور ہارون علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر انہیں خبر دی۔ اور ایک واقعہ اس طرح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر واپس تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ ان کا جبہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں عصا مبارک تھا اور اس کے ایک سرے پر کھجور سے بنا ہوا ایک ٹوکرا معلق تھا جس میں آپ کا زور اور اہ تھا۔ وہاں داخل ہو کر اپنے آپ کو چھپایا اور ہارون علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم فرعون کو دعوت حق دیں۔ چنانچہ ان کی والدہ جنتی چلائی باہر نکلی اور کہنے لگی فرعون تجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کر رہا ہے۔ آخر تم دونوں اس کی طرف گئے تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔ لیکن آپ والدہ کے کہنے پر نہر کے اور دونوں رات کے وقت فرعون کے دروازے پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو دربان گھبرا گئے۔ اور کہا دروازے پر کون ہے؟ ایک روایت اس طرح ہے کہ دربان ان دونوں سے آگاہ ہو گیا تو اس نے پوچھا تم کون ہو؟ تو جواباً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" (بے شک ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا فرستادہ ہے)۔ چنانچہ دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا۔ ایک مجنوں دروازے پر ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ پس اس نے کوئی تو جہنہ دی حتیٰ کہ صبح ہو گئی پھر اس نے دونوں کو بلایا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ دونوں مل کر فرعون کی طرف گئے۔ لیکن اس نے نہیں ایک سال تک تو اندر آئے کی اجازت ہی نہ دی۔ پھر ایک دن دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا کہ ایک آدمی ہے جو اپنے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ تو یہ سن کر فرعون نے اسے کہا کہ اسے اندر آئے کی اجازت دے دو تاکہ ہم اس سے محظوظ ہو سکیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس کے پاس تشریف لے گئے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا کیونکہ آپ اسی کے گھر پر وان چڑھے تھے۔

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ﴿٥﴾

” (فرعون نے) کہا میں نے (تو) کوئی بچہ ہی نہیں پالا تھا اپنے یہاں۔ جبکہ تو بچہ تھا۔ اور بسر کیے تو نے ہمارے پاس اپنی عمر کے کئی سال۔“

۱۔ اور کہا کیا ہم نے تجھے اپنے گھروں میں پالا نہیں تھا۔

۲۔ جبکہ تو بچہ تھا۔ ولادت کے قرب کے باعث آپ کو ولید کہا گیا۔

۳۔ کہا گیا ہے کہ آپ ان کے پاس تیس سال تک ٹھہرے پھر آپ مدین کی طرف چلے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ پھر ان کی طرف واپس آئے اور انہیں تیس سال تک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی پھر ان کے غرق ہونے کے بعد پچاس سال تک آپ زندہ رہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَكَ الْبَیُّ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٦﴾

”اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا۔ اور تو بڑا احسان فرماؤں ہے۔“

۱۔ یعنی تو نے قبیلہ کو قتل کیا۔

۲۔ تو میرے احسان اور حق تربیت کا انکار کرنے والوں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ تو نے میرے خواص تک کو قتل کرنے کا قصد کر لیا۔
۳۔ یہی طرح عوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے (۱)۔ اور اکبر مفسرین کا یہی قول ہے اور کہا کہ بے شک فرعون یہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا ہے؟ حسن اور سدی نے کہا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بے شک تو تو اپنے اس الکا انکار کرنے والا تھا جس کی طرف اب تو دعوت دے رہا ہے۔ اور جس کی تو عبادت کرتا ہے حالانکہ تو ہمارے ساتھ ہمارے دین پر تھا (۲)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ دو تاؤں میں سے ایک سے حال ہے۔ اور اس کا حکم مبتدا علیہ ہوتا بھی جائز ہے کہ وہ (فرعون) اپنی الوہیت کے دعویٰ اور احسان جتنا کرنے کے سبب کافروں میں سے ہے جب سے آپ اس کی طرف مخالفت کرتے ہوئے مراجعت فرما ہوئے یا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے دین میں کفر کرتے تھے۔

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذْ أَوَّلَاكُمْ مِنَ الضَّالِّينَ ﴿٧﴾

”آپ نے جواب دیا میں نے ارتکاب کیا تھا اس کا اس وقت جبکہ میں نادان تھا۔“

۱۔ یہ جملہ فعلتک تاء سے حال ہے۔ یعنی ”فعلتک ما فعلتک وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ“ جب میں نے وہ عمل کیا تو اس وقت میں نادان تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی شے میری پاس نہیں آئی تھی۔ یا معنی یہ ہے کہ میں اس انجام سے نادان تھا کہ میرے اس عمل سے وہ مقتول ہو جائے گا کیونکہ میں نے تو اس سے تادیب کا ارادہ کیا تھا نہ کہ قتل کرنے کا۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ میں خطا کرنے والوں میں سے تھا یعنی بغیر ارادے کے سیدھے راستے سے ہٹنے والا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ میں ان لوگوں کی مثل فعل کرنے والا تھا جو جاہل اور احمق ہوتے ہیں۔ اور ضالین کا معنی بھولنے والا بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ معنی اس ارشاد سے لیا گیا ہے اَنْ تَقْضِلَ اِخْلُدْهُمَا فَتُكَلِّمَ اِخْلُدْهُمَا اَلَا حُرٰی۔

فَقَرَأَتْ مِنْكُمْ لَمَّا خَفَعْتُمْ قَوْهَبَ لِي رَأَيْتُ حُلُمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

”تو میں بھاگ گیا تھا تمہارے ہاں سے ۱۔ جبکہ میں تم سے ڈرا پس بخش دیا مجھے میرے رب نے حکم علی اور بنادیا مجھے رسولوں سے ۲۔“

۱۔ تو میں تمہارے ہاں سے مدین کی طرف بھاگ گیا تھا۔

۲۔ جب میں تم سے ڈرا تو میرے رب نے مجھے حکمت اور علم عطا فرمادیا۔

۳۔ اور اس نے مجھے رسولوں میں سے بنادیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۝

”اور یہ ۱۔ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے ۲۔ حالانکہ تو نے غلام بنا رکھا ہے بنی اسرائیل کو ۳۔“

۱۔ مبتدا ہے اور اس کا اشارہ بچپن کی تربیت کی طرف ہے۔

۲۔ اور یہ اسم اشارہ سے بدل ہے یا اس سے خبر ہے۔

۳۔ ”تَمُنُّهَا عَلَيَّ“ جمع غنی صفت ہے۔

۴۔ ”اَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ“ یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ جہی ہے۔ یا اس لیے کہ یہ نعمت سے بدل ہے۔ یا پھر باء مضمرہ کے سبب مجرور ہے۔ اور وہ مبتدا کی خبر ہے، یعنی بِمُقَابَلَةِ جَفَانِكَ اَوْ بِسَبَبِ جَفَانِكَ۔ اور وہ ہے ”ہی اَنْ عَبَّدْتُ“ یا باء کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ یا ظرف کی بناء پر اس صورت میں الوقت مقدر ہے۔ یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ انتہائی عالمانہ خلصت کی طرف اشارہ ہے اور اَنْ عَبَّدْتُ اس کا عطف بیان ہے۔ اور عَبَّدْتُ کا معنی ہے کہ تو نے انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عَبَّدْتُ فُلَانًا وَاعْبَدْتُهُ وَاسْتَعْبَدْتُهُ وَفَعِدْتُهُ۔ ان تمام کا معنی ہے میں نے اسے غلام بنایا ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس شے کا اقرار ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے اوپر اس کی طرف سے نعمت شمار کیا ہے کہ اس نے آپ کی تربیت کی اور آپ کو قتل نہیں کیا جیسے اس نے بنی اسرائیل کے دیگر تمام بچوں کو قتل کرایا گویا کہ یہ کہا ”بنی و تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَتَرَكْتَنِي وَلَمْ تَسْتَعْبِدْنِي“ (کیونکہ میں نے نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا اور مجھے چھوڑ دیا اور مجھے غلام نہ بنایا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ظاہر اقرار ہے اور معنی انکار ہے کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام نے اس کا رد کیا جس کے سبب اس نے آپ کی نبوت پر اعتراض کیا تھا اور پھر اسے دہرایا جسے اس نے نعمت شمار کیا تھا۔ اور صراحۃً اس کا انکار نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا تھا۔ بلکہ اس پر متنبہ کیا کہ وہ حقیقت میں نعمت تھی کیونکہ وہ جفا کے مقابلے میں تھی یا اس کا مسبب تھی۔ پس کہا ”وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ“ وہ نعمت تھی جفا کے مقابلہ میں یا جفا کے سبب۔ کیونکہ یہ میرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے اور ان کے بچوں کو قتل کرنے کے سبب ہوا کہ مجھے تیری طرف اٹھا کر لایا گیا یہاں تک کہ تو نے میری تربیت کی اور میری کفالت کی اور اگر تو انہیں غلام نہ بناتا تو پھر میری تربیت میرے گھر والے کرتے اور وہ مجھے دیر یا میں نہ بچھکتے۔ پس یہ اقرار انکار کو محضمن ہے۔

یہ قول بھی ہے۔ کہ یہ انکار ہے اور اس میں استفہام انکاری کا مزہ مقدر ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ”اَتِلْكَ التَّوْبَةُ نِعْمَةٌ

لُكَّ عَلَيَّ اَنْ عُبِّدْتُ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ“ یعنی کیا تیرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے کے وقت میری تربیت کرنا نعت ہے؟ یا ”اَلْحَالُ اَشْكُ عُبْدْتُ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ“ (کیا تیرا میری تربیت کرنا نعت ہے اس حال میں کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟) پس تیرے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنانے نے اس احسان کو ختم کر دیا جو تو نے مجھ پر کیا۔ ”نَعْمُهَا“ میں خطاب واحد ہے اور اس سے ماقبل میں جمع ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ یہ احسان اکیلے اس کی طرف سے تھا جبکہ خوف اور فرار آپ کی طرف سے اور آپ کی قوم کی طرف سے تھا جب فرعون نے اس طعن کا جواب سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام پر کیا اور دیکھا کہ وہ تو پھر دعوت دینے لگے ہیں تو اس نے آپ کے دعویٰ پر اعتراضات شروع کر دیے اور مرسل کی حقیقت کے بارے استفسار کرنے لگا اور کہا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٠﴾

”فرعون نے پوچھا کیا حقیقت ہے رب العالمین کی لے“

لے چونکہ اللہ تعالیٰ جو واجب الوجود ہے اس کی حقیقت کا بیان کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہے اور اجزاء کی تعریف و پہچان مستبعد ہے۔ ہاں اس کی پہچان عوامن اور افعال کے ذکر سے ہوتی ہے۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام نے اس کے اظہر ترین خواص و آثار کا ذکر کیا۔

قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ اِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ﴿٥١﴾

”آپ نے فرمایا رب العالمین وہ ہے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے لے اگر ہو تم یقین کرنے والے لے“

لے یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی ”رَبُّ الْعَالَمِينَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنَ الْكَوْنَاتِ“ (رب العالمین آسمان، زمین اور ان کے درمیان کائنات میں سے ہر شے کا مالک ہے)

لے اگر تم حقائق اشیاء کے ثبوت پر یقین کرنے والے ہو تو پھر ان سے ان کے خالق پر استدلال کرو۔ کیونکہ یہ وہ اجسام محسوسہ ہیں جنہیں مرکب کرنا، شمار کرنا اور ان کے احوال میں تغیر و تبدل کا ہونا ناممکن ہے۔ پس ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیاد اور اصل واجب لذات ہو اور اس اصل کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام ممکنات کی اصل ہو۔ ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ناممکن ہے اور ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ناممکن نہیں۔ اگر اس طرح نہ ہو تو پھر یا تو واجب کا متعدد ہونا لازم آئے گا یا پھر بعض ممکنات کا اس سے استغناء لازم آئے گا۔ اور یہ دونوں محال ہیں۔ تعدد اس لیے کہ وہ ایسی دو چیزوں کی ترکیب کو مستلزم ہے جن میں اشتراک پایا جاتا ہے اور ایسی چیزوں کو جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اور مرکب حدوث کی دلیل ہے جو کہ وجوب کے منافی ہے۔ اور استغناء اس لیے محال ہے کہ یہ امکان کے منافی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کی تعریف ممکن نہیں مگر خارجی لوازم کے ساتھ، کیونکہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہونے کی وجہ سے جو کچھ اس میں داخل ہیں ان سے اور بنفسہ اس کی ذات کی پہچان مستبعد ہے۔ اور یہ ایسی شرط ہے جو گذشتہ کلام کے سبب جہاں سے مستغنی ہے۔ چونکہ فرعون غبی (کنہ ذہن) تھا وہ اس جواب کے حسن کو نہ پہچان سکا۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ اَلَا تَسْمَعُونَ ﴿٥٢﴾

”فرعون نے اپنے ارد گرد بیٹھے والوں سے کہا: کیا تم سن نہیں رہے ہو۔“

۱۔ تو اس نے تعجب کرتے ہوئے اپنے ارد گرد بیٹھے والوں سے کہا

۲۔ کیا تم اس کا جواب سن نہیں رہے۔ یعنی میں نے اس سے رب کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا ہے اور یہ اس کے افعال کا ذکر کر رہا ہے۔ یا وہ یہ گمان کرتا تھا کہ آسمانوں کا رب ہے۔ اور یہ قدیم ہیں اور اپنی ذاتوں کے اعتبار سے واجب ہیں۔ جیسا کہ دہریوں کا مذہب ہے۔ یا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بھی کسی مؤثر کے محتاج ہیں۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَمَرْبُ آبَائِكُمْ الْوَالِدِينَ ①

”آپ نے فرمایا وہ جو تمہارا بھی مالک ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی ۱۔“

۱۔ یہ ان چیزوں کی طرف موصول ہے جنہیں قدیم اور واجب گمان کرنا ممکن نہیں اور ان کے کسی مصور و حکیم کا محتاج ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور یہ انداز نظر و فکر کرنے والے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور غور و فکر کرتے وقت زیادہ واضح ہوتا ہے۔

قَالَ إِنَّ مَسْئَلَكُمْ الَّذِي أَرْسَلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ②

”فرعون بولا ۱۔ بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو مجھ تک آیا ہے تمہاری طرف یہ تو دیوانہ ہے ۲۔“

۱۔ فرعون نے کہا

۲۔ کہ میں اس سے کسی شئی کی حقیقت کے بارے پوچھتا ہوں اور یہ مجھے جواب اور طرح دیتا ہے۔ تو اس نے آپ کو از روئے طعنے استخفاف رسول کہا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ③ إِنَّ لَكُمْ تَعْلُونَ ④

”آپ نے (معا) فرمایا جو مشرق و مغرب کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۱۔ اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو ۲۔“

۱۔ آپ نے فرمایا کہ تم ہر روز مشاہدہ کرتے ہو (کہ میرا رب) سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور اسے پہلے دن کے مدار کے سوا دوسرے مدار میں چلاتا ہے حتیٰ کہ اسے مغرب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے منافع و اہمیت ہیں اور وہ امور کائنات کا انتظام کرتا ہے۔

۲۔ اگر تمہارے پاس ایسی عقل ہے جس سے تم ادراک کر سکو تو اس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی جواب نہیں۔ پہلے آپ نے ان سے نرم انداز اپنایا پھر جب آپ نے ان کی شدت اور سختی کو ملاحظہ کیا تو آپ نے بھی درشت رویہ اپنایا اور ان کے کلام کے شعل سے آپ نے بھی ان سے کلام کیا۔

قَالَ لَئِنْ اتَّخَذْتُ الْهَآغِیْرَی لَا جَعَلَكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ⑤

”اس نے ۱۔ (رعب بھاتے) ہوئے کہا (یا درکھو!) اگر تم نے میرے سوا کسی کو خدا بنایا ۲۔ تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں

داخل کروں گا ۳۔“

۱۔ حجت میں لا جواب ہونے کے بعد فرعون نے جاہلانہ انداز اپناتے ہوئے ذانت ڈپٹ کر کہا۔

۱۔ یہ مخذوف قسم کا جواب ہے۔

۲۔ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الہ بنایا تو میں ضرور تجھے قید میں ڈال دوں گا۔ الْمُسْجُونُونَ میں ام عہدی ہے۔ یعنی تو پہنچاتا ہے ان لوگوں کے حال کو جو میری قید میں ہیں۔ کبھی نے کہا ہے کہ اس کی قید قتل سے زیادہ سخت تھی کیونکہ وہ آدمی کو پکڑ کر تنہا اکیلے مکان میں پھینک دیتا تھا اس میں نہ وہ کوئی آواز سن سکتا اور نہ کسی چیز کو دیکھ سکتا تھا بس اس طرح وہ زمین پر پڑا رہتا تھا (۱)۔ تو فرعون نے اس طرح اپنے عذاب دینے کے اختیارات سے اپنی الوہیت کے اثبات اور صالح (حقیقی) کے انکار پر استدلال کیا۔ اور اس کا قول اَلَا تَسْتَعْمِلُونَ اپنے سوا کسی اور کی طرف ربوبیت کی نسبت کرنے پر تعجب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ شاید وہ دھرمی تھا اور یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اس کا ملک زمین کا حصہ ہے اور وہ اپنی قوت سے اس کے امور کا والی ہے۔ لہذا وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے پاس اس کی عبادت کریں۔

قَالَ اَوْ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ۝

”فرمایا! اگرچہ میں لے آؤں تیرے پاس ایک روشن چیز ہے۔“

۱۔ اس کی جھڑک کا جواب دیتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

۲۔ اس میں ہمزہ استفہام زجر و توبیخ اور انکار کے لیے ہے۔ اور حذف فعل کے بعد واؤ حال کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”اَتَجْعَلُنِي مِنَ الْمُسْجُونِينَ وَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ“ یہ اس حال میں برائی کرنے پر زجر و توبیخ ہے۔ جو وہ آپ کی صداقت پر واضح دلیل آجائے کی صورت میں کر رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ مخذوف شرط پر عطف کے لیے ہے۔ اور پھر دونوں شرطیں فعل مخذوف کے فاعل سے حال ہیں۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ”اَتَجْعَلُنِي مِنَ الْمُسْجُونِينَ لَوْلَمْ اُجِبْكَ عَلٰی دَعْوَانِي بِحُجَّةٍ وَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ حُجَّةً“ (کیا تو مجھے قید میں ڈال دے گا اگرچہ میں تجھے اپنے ایسے دعویٰ کی بنا پر قبول نہیں کرتا جو حجت سے ثابت ہے اور اگرچہ میں تیرے پاس بطور حجت ایک واضح اور روشن چیز لے آؤں) تو اس میں دونوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

قَالَ قَاتِلْهُ اِنَّكَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

”اس نے کہا! پھر پیش کرو! اسے اگر تم سے ہو۔“

۱۔ تو فرعون نے کہا

۲۔ وہ روشن چیز لے آؤ۔

۳۔ اگر واقعی وہ دلیل واضح ہے یا اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ کیونکہ دعویٰ نبوت کے لیے حجت کا ہونا ضروری ہے۔

فَاتْلُوْا اَصْحٰۤاۤہٗ قٰۤاۤاۤہٗ نَعْبٰۤاۤہٗ مُبِيْنٌ ۝

”پس آپ نے لے ڈالا اپنا عصا تو اسی وقت وہ صاف اثر دکھائے گیا۔“

۱۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے

۲۔ اپنا عصا ڈالا تو اس میں اثر دکھائے گیا اور اوصاف ظاہر ہو گئے۔ یا تمہیں کا معنی ہے کہ وہ ان کے دعویٰ کی صداقت کو ظاہر کرنے لگا۔ اس کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عطف قال پر ہے۔

وَنَزَّيْنِدَكَ فَادَّاهِيَ بَيْضَاءَ اللَّيْلِ ۝

”اور آپ نے باہر نکالا لے اپنا ہاتھ لے تو لیکھت وہ سفید ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے س۔“

لے اور موسیٰ علیہ السلام نے

لے اپنا ہاتھ نکالا جبکہ فرعون نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی شے ہے؟

سے تو آپ کا ہاتھ اتنا سفید تھا کہ اس سے روشنی کی شعائیں نکل رہی تھیں اور وہ آنکھوں کو خیرہ اور افاقہ کو ڈھانپنے لگیں۔ فرعون یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔

قَالَ لِلْمَلَاحِزَةِ إِنَّ هَذَا السَّحَرُ عَلِيمٌ ۝

”(یہ دیکھ کر) فرعون نے اپنے آس پاس بیٹھے والے درباریوں سے کہا لے واقعی یہ لے ماہر جادوگر ہے س۔“

لے فرعون نے ان درباریوں سے کہا جو اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے حوالہ طرف ہے جو حال کی جلد واقع ہے۔

لے کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام)

سے جادو کے علم میں مہارت رکھتا ہے۔

يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝

”یہ چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں اپنے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے (اب بتاؤ) تمہاری کیا رائے ہے؟ لے“

لے یعنی جب اس پر معجزہ کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تو آپ نے اسے دعویٰ پر بیعت بھلا کر قوم سے مشاورت کی طرف جھکا دیا۔ اور وہ ان سے اپنے بارے میں اور موسیٰ علیہ السلام سے نفرت کرنے کے بارے میں رائے طلب کرنے لگا۔ اور ساتھ ہی وہ آپ کے غالب آنے اور اپنے ملک پر ان کے قبضہ کرنے کے خوف کا اظہار کرنے لگا۔

قَالُوا أَمْ رَجُلٌ أَهْلًا وَآخِلًا وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝

”بولے مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو لے اور بھیج دو شہروں میں ہرکارے لے“

لے تو انہوں نے کہا ان دونوں کے معاملہ کو موخر کر دو۔

لے اور شہروں کی طرف ایسے لوگ بھیج دے جو وہاں سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔

يَأْتُونَكَ بِكُلِّ سَحَابٍ عَلِيمٍ ۝

”تا کہ وہ لے آئیں تیرے پاس لے (ملک کے کوئی نہ سے) تمام ماہر جادوگر س۔“

لے جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔

لے جو آپ پر بحر میں فوجیت رکھتے ہوں۔ ابن عامر، ابو عمر و اور کسائی نے سحابة میں امالہ کیا ہے۔

فَجَاءَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۝

”الغرض جمع کر لیے گئے سارے جادوگر مقررہ وقت پر ایک خاص دن لے“

لے اس کا عطف جملہ محذوف پر ہے۔ تقریر عبارت یہ ہے ”فَبَعَثَ خَاطِبُونِ فَقَضَوْا السَّحْرَةَ لَمَّا وَقَّتْ بِهِ مِنْ مَسَاعِدِ يَوْمٍ مُعَيَّنٍ“ (یعنی اس نے ہر کاروں کو بھیجا پس وہ گئے اور انہوں نے جادوگروں کو معین دن کی معین ساعتوں کے لیے جمع کیا) اور اس معین ساعت سے مراد یوم الزمر کا وقت چاشت ہے۔ علامہ بغوثی نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سال کے دنوں میں سے پہلے پختے کا دن تھا یعنی یوم نیروز۔

وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَبِعُونَ ﴿٥﴾

”اور کہہ دیا گیا لوگوں سے کیا تم (مقابلہ دیکھنے کے لیے) اکٹھے ہو گئے؟ لے“

لے ”هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَبِعُونَ“ میں استفہام بمعنی امر ہے۔ اور اس میں ان کی اجتماعی سستی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے ذریعے انہیں سستی نہ کرنے اور (معین جگہ کی طرف) جلدی آنے پر برا بھختہ کرنا ہے۔

لَعَلَّانَا نَكُونُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمْ الْغَالِبِينَ ﴿٦﴾

”شاید ہم بیرونی کرنے والے جادوگروں کی لے اگر وہ (مقابلہ میں) غالب آجائیں لے“

لے ”لَعَلَّانَا نَكُونُ السَّحَرَةَ“ سے ان کی مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم تھی۔ یعنی شاید ہم ان کے دین کی پیروی کرتے رہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں وہ جادوگر مراد لینا بھی جائز ہے۔ جہتیں اس نے طلب کیا تھا، یعنی شاید ہم موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل کرنے کے لیے ان جادوگروں کی پیروی کرتے رہیں۔

لے تہی دوسری تاویل سے زیادہ مناسب رکھتی ہے۔ البتہ پہلی تاویل کے مطابق تہی اس غلبے کی بناء پر ہے جو اتباع کا تھا خدا کرتا ہے۔ اور ان کا مقصود اصلی یہ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کی اتباع نہیں کریں گے۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا الْفِرْعَوْنُ أَهْبَنَ لَنَا لَا جَرَّاءَ إِنْ كُنَّا خَرُّنَا الْغَالِبِينَ ﴿٧﴾

”جب حاضر ہوئے جادوگر تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا لے اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر)

غالب آجائیں لے“

لے آپہن لَنَا لَا جَرَّاءَ اس میں استفہام تقریر کے لیے ہے۔

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذَا لَئِنِ اتَّقَرْتُمْ بَيْنَ ﴿٨﴾

”اس نے کہا ہاں ضرور ملے گا اور تم اس وقت لے میرے مقربوں میں شامل کر لیے جاؤ گے لے“

لے ”وَقَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ“ یہ عطف نعم کے معنوں پر ہے۔ یعنی اِنْ لَكُمْ اجزاء و اِنْكُمْ ”اِذَا“ اس کا تعلق ما بعد سے ہے جب تمہیں غلبہ حاصل ہوگا۔

لے تو پھر بالضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ اور یہ فرعون کی جانب سے اس اجر سے زیادہ عطا ہے جس کا انہوں نے غلبہ حاصل ہونے کی صورت میں مطالبہ کیا تھا۔ پھر جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا ”إِنَّمَا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِنَّا أَنْ نَكُونُ نَحْنُ“

الْمُتَّقِينَ“ (تم ڈالو جادو یا پھر ہم ڈالتے ہیں) جیسا کہ اس کا ذکر اعراف میں گزر چکا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ۝

”موسیٰ نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔“

۱۔ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔ تو آپ نے اس امر سے حرکت کرادہ نہیں فرمایا بلکہ اس سے مراد اس عمل میں پہل کرنے کی اجازت ہے جو وہ کرنے والے تھے بالیقین یہ اس کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ قطعاً آپ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ آپ نے معصیت کا حکم دے کر حرام کے ارتکاب کا حکم دیا۔ (کیونکہ جادو تو حرام تھا) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ امر تحقیر کے لیے ہے، یعنی مجزوہ کے مقابلہ میں ان کے حرکتی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے لہذا یہ کسی شے کے طلب کے باب سے ہے نہ کسی نکل۔

فَالْقَوَاهِ لَهم وَعَصِيهم وَقَالُوا بَعَثَ فِيهِمُ الذُّنُوبَ ۝

”تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لالچیاں (میدان میں) اور (بڑے وثوق سے) کہا تا موسیٰ فرعون کی قسم! ہم ہی یقیناً غالب آئیں گے۔“

۱۔ پس جادو گروں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لالچیاں۔

۲۔ انہوں نے اپنے فرط اعتقاد کے سبب عزت فرعون سے برکت حاصل کی کہ بے شک وہ سعادت مندوں میں سے ہیں۔ یا پھر انہوں نے عزت فرعون کی قسم کھائی کہ وہ اپنے جادو کا آخری حربہ بھی استعمال کریں گے جسے لانا ان کے لیے ممکن ہوا۔

فَالْقَوَاهِ لَهم وَعَصَا ذَاهِی تَلْقَفُ مَا یَأْفُکُونَ ۝

”پھر پھینکا موسیٰ نے اپنا سونٹا تو وہ لگا یک نکلنے لگا گیا۔ جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا۔“

۱۔ تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ انہیں نکلنے لگا۔ حفص نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ۔

۲۔ مَا یَأْفُکُونَ یہ ماموصولہ ہے۔ یعنی جن کے ظاہر کو انہوں نے اپنے جھوٹ اور فریب کے سبب تبدیل کر رکھا تھا اور یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ ان کی رسیاں اور دُرندے سانپ ہیں اور دُرندے ہیں۔ یا پھر یہ مامصدر یہ ہے۔ یعنی یہ ان کے فریب کو نکلنے لگا تو اس میں وہ چیز جس سے فریب دیا گیا اسے مبالغہ کے لیے فریب کا نام دے دیا گیا ہے۔

فَالْقَوَاهِ لَهم وَعَصَا ذَاهِی تَلْقَفُ مَا یَأْفُکُونَ ۝

”پس (یہ مجزوہ دیکھ کر) گر پڑے جادوگر عہدہ کرتے ہوئے۔“

۱۔ تو جب انہوں نے ایسا ہوتے تو دیکھا تو وہ اپنے آپ کو اس یقین سے نہ روک سکے کہ بے شک جادو کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اپنے چہروں کے بل گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں گرا کر تو بکی توفیق عطا کر دی۔ لہذا اس میں اس امر پر دلیل موجود ہے کہ حرکتی انتہاء یہ ہے کہ جھوٹ اور فریب کو آراستہ کیا جاتا ہے اور چیز کو ایسا خیال کیا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقتاً ایسی نہیں ہوتی۔

قَالُوا امَّا يَرْبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾

”انہوں نے (بر ملا) کہہ دیا ہم ایمان لائے رب العالمین پر لے۔“
 اے قَالُوا امَّا يَرْبِّ الْعَالَمِينَ یہ لفظی سے بدل استعمال ہے یا پھر حال ہے اور اس سے پہلے ”فقد“ مضمر ہے۔

رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ ﴿١١﴾

”جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا لے۔“

اے رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ یہ بھی بدل ہے جو اس امر کی وضاحت، کسی قسم کے وہم کا ازالہ اور اس بات کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ بے شک ان کے ایمان کا سبب وہ عجز و تنہا جوان دونوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوا تھا۔

قَالَ امْسِكْ لَهُ قَبْلَ اَنْ اَدْنٰ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَيِّدٌ مِّنْ اِلٰهِيۤنَّ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۚ لَا تَقْطَعْنَ اٰيٰتِيْكُمْ وَاَمْرًا جُنَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَلَا وَصِيْبًا لَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢﴾

”فرعون نے لے (خفت مٹانے کے لیے) کہا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر لے اس سے پہلے کہ میں تمہیں مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا (گروہ) ہے جس نے تمہیں حیر کا فن سکھایا ہے اسے ابھی (سازش کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا میں ضرور کات دوں گا تمہارا بے ہاتھ اور تمہارا بے پاؤں مخالف طرفوں سے اور میں تم سب کو سولی چڑھا دوں گا لے۔“

اے فرعون نے اپنی قوم پر حقیقت چھپاتے ہوئے بطور تکبر کہا تا کہ وہ یہ اعتقاد نہ رکھ لیں کہ وہ بصیرت اور حق کے ظاہر ہونے کے سبب ایمان لائے

اے امْسِكْ لَهُ قَبْلَ اَنْ اَدْنٰ لَكُمْ تم تو اس پر ایمان لا چکے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں اس کے مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا گروہ ہے۔ حمزہ، کسائی، ابو بکر اور روح نے اے امْسِكْ لَهُ قَبْلَ اَنْ اَدْنٰ لَكُمْ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ایک حمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور استفہام انکاری کے حمزہ کو حذف کر دیا ہے۔

اسے پس اسی نے تمہیں کچھ چیزیں سکھائیں۔ اسی لیے وہ تم پر غالب آ گیا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اس نے تمہارے ساتھ اس بارے میں مصالحت کر لی اور تم نے اس پر اتفاق کر لیا ابھی اس سازش کا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا۔
 لے یہ اجمالاً ذانت اور جھڑک ہے۔ پھر اس قول سے اس کی تفصیل بیان کی۔

قَالُوا الْاَصْحٰبُ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٣﴾

”انہوں نے جواب دیا ہمیں اس کی ذرا پروا نہیں لے ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں لے۔“

اے اس میں ہمارے لیے کوئی نقصان نہیں کیونکہ یہ شہادت اور اس عظیم اجر کو مستلزم ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی مصائب لاشیاء (معدوم ہونا) ہوتے ہیں۔

لے بے شک ہم تو اس وعید کے سبب جس سے تو ہمیں ڈرا رہا ہے یا موت کے اسباب میں سے کسی دوسرے سبب کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور تیرا قتل کرنا تو زیادہ نفع بخش ہے۔ اور ضمیر (نقصان) کی نفی کی علت بیان کرتے ہوئے امید

ظاہر کیا۔

إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطِيئَاتِنَا أَنْ كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٠﴾

”ہمیں یہ امید ہے کہ بخش دے گا ہمارے لیے ہمارا رب ہماری خطائیں لے کیونکہ ہم (تیری قوم میں سے) پہلے ایمان لانے والے ہیں۔“

لے کہ ہمیں یہ امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے لیے ہماری خطائیں بخش دے گا۔
ج۔ کیونکہ ہم ہی فرعون کے قہقین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ یا حاضرین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ بے شک ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں اور اول المؤمنین وہ ہوتے ہیں جن کی دوسرے اقتدا کرتے ہیں۔ یہ جملہ خبری کی نفی کی دوسری علت ہے یا پہلی علت کی تعلیل ہے یا اس سے بدل اشتغال ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِلَيْكُمْ فَهَارُونَ ﴿٥١﴾

”اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی طرف لے کہ راتوں رات (یہاں سے) میرے بندوں کو لے جاؤ۔ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔“

لے اس کے بعد کہ آپ کی سال ان کے درمیان مقیم رہے۔ انہیں حق کی طرف بلاتے رہے اور واضح نشانیاں دکھاتے رہے لیکن ان میں ہٹ دھرمی اور فساد کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا تو ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات یہاں سے میرے بندوں کو لے جاؤ۔
ج۔ ”بھگائی“ کو نافع نے یا مفتوحہ سے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یا سناکن کے ساتھ۔

ج۔ یقیناً فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کریں گے تاکہ وہ تمہارے اور مصر کے نکلنے کے درمیان حائل ہو جائیں۔ یہ اسراء (رات کو نکالنے) کی علت ہے۔ علامہ بخوی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل میں سے ہر چار گھروں میں رہنے والوں کو ایک گھر میں جمع کریں۔ پھر وہ بھیڑوں کے بچے ذبح کریں اور ان کا خون اپنے دروازوں پر لگا دیں۔ پس میں ملائکہ کو حکم دوں گا کہ وہ اس گھر میں داخل نہ ہوں گے جس کے دروازے پر خون ہوگا۔ اور پھر میں انہیں یہ حکم دوں گا کہ اگر فرعون میں سے ہر ایک کے بچوں کو جان سے مار دیا جائے اور انہیں مالی نقصان بھی دیا جائے۔ پھر تم تازہ روٹی پکالو، بے شک وہ تمہارے لیے تازی رہے گی۔ پھر میرے بندوں کو راتوں رات لے جاؤ یہاں تک کہ سمندر تک پہنچ جاؤ۔ پھر میرا حکم آجائے گا۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ پس جب جمع ہوئی تو انہوں نے فرعون کو کہا: موسیٰ اور ان کے قہقین کا عمل ہے کہ انہوں نے ہمارے بچوں کو جان سے مار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے آپ کے تعاقب میں کی ہزار کا لشکر بھیجا۔ ان میں پانچ لاکھ سالار اور ہزار سالار کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے۔ اور فرعون بذات خود ایک بہت بڑے تخت پر نکلا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کے لشکر کی اتنی تعداد ویداز عقل ہے اور کوئی ایسی روایت بھی منقول نہیں جس سے اس کا علم ہوتا ہو۔

فَأَسْرَسَكَ فِي الْهَدْيِ خَشِيرَتِ ﴿٥٢﴾

”پس جیسے فرعون نے لے سارے شہر میں ہر کارے ج۔“

۱۔ اس کا عطف مذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ ”فَأَسْرَى مُوسَى قَوْمَهُ فَبَلَغَ الْخَبْرُ فِرْعَوْنَ وَآرَأَا أَنَّى يُسَبِّحُهُمْ فَازْدَلَّ“ (کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو راتوں رات نکال لے گئے۔ پس جب یہ خبر فرعون کے پاس پہنچی تو اس نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا اور اس نے سارے شہروں میں آدمی بھیجے۔)

۲۔ کہ وہ لشکر جمع کریں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شاید اس نے لوگوں کو اس لیے بھیجا تا کہ وہ مصر سے متصل شہروں میں رہنے والوں کو جمع کریں کیونکہ اس رات میں صبح تک ان کا اجتماع ممکن تھا۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ﴿٥٦﴾

” (تا کہ لوگوں کو تائیس) ۱۔ یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں ۲۔“

۱۔ اور لوگوں کو تائیس کہ بے شک یہ بنی اسرائیل

۲۔ لوگوں کی چھوٹی سی جماعت ہے۔ شِرْذِمَةٌ کا تفسیر کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ قاموس میں ہے (۱)۔ پھر اسے اپنے اس قول سے مؤکد کیا۔ یہ انتہائی قلیل مقدار سے آگاہ کرنے کے لیے ہے۔ پس یہ آیت اس روایت کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے جس میں ان کی تعداد چھ سو ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔ اور بے شک ان کی یہ قلت فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں تھی کیونکہ اس کے لشکر کے مقدمہ میں سات سو ہزار (سات لاکھ) سپاہی تھے اور اس کے ساتھ، مین، میسرہ اور قلب میں بھی اسی کے مطابق تعداد تھی۔ لیکن اگر ملک الارض، بالخصوص شام مصر کی حیثیت میں غور و فکر کی جائے تو محض اتنی تعداد کو جائز قرار نہیں دیتی۔ میرا خیال ہے کہ شاید لَشِرْذِمَةٌ کا ذکر فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں ان کی قلت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور قَلِيلُونَ کا ذکر اس وضاحت کے لیے ہے کہ درحقیقت ان کی تعداد قلیل تھی۔

وَأَنَّهُمْ لَتَالغَاءٌ يُّظُنُّونَ ﴿٥٧﴾

”اور انہوں نے ہمیں سخت برا فرودختہ کر دیا ہے ۱۔“

۱۔ لئنا، غافظون کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے لیے غیظ و عداوت رکھنے والے لوگ ہیں۔ یعنی وہ ہم سے دشمنی رکھنے والے ہیں۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے ساتھ ایسا عمل کرنے والے ہیں جو ہمیں برا فرودختہ کرتا ہے۔

وَأَنَّا لَجَبِيحٌ خَذِرُونَ ﴿٥٨﴾

” (تا ہم فکر نہ کرو) ہم سب (ان کے متعلق بہت) محتاط ہیں ۱۔“

۱۔ وَأَنَّا لَجَبِيحٌ خَذِرُونَ میں اہل حجاز اور اہل مصر نے خَذِرُونَ اور فَارِهِينَ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ہشام نے خَذِرُونَ میں ان سے موافقت کی ہے اور باقی قراء نے خَذِرُونَ اور فَارِهِينَ دونوں کو الف کے ساتھ پڑھا ہے، ان میں سے پہلا ثابت اور دوسرا متحدہ کے لیے ہے۔ اور یہی معنی ہے اس کا جو فرما نے کہا ہے کہ حافظہ وہ ہے جو اب (زمانہ حال میں) تجھے ڈر رہا ہو اور خذِرٌ مطلق ڈرانے والے کو کہتے ہیں۔ اور یہی بھی کہا گیا ہے کہ حاذرون سے مراد صاحب رائے اور قوت ہیں، یعنی جو مکمل اسلحہ سمیت مستعد ہوں۔ زجاج نے یہی کہا ہے (۲)۔ اور خذِرُونَ کا معنی ہے ڈرنے والے بیدار نہ بننے والے یعنی جو غفلت ہوں، غافل نہ ہوں۔

فَاَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝۱۰

”سو ہم نے نکالا انہیں (سرسبز) باغوں میں اور (بہتے ہوئے) چشموں سے۔“

۱۰۔ فَاَخْرَجْنَاهُمْ میں تقدیر عبارت یہ ہے ”فَاَجْتَمَعُوا عَلَى الْاِجْتِنَاعِ فَاَخْرَجْنَاهُمْ“ پس وہ جمع ہوئے اور انہوں نے چھپا کرنے پر اتفاق کیا تو ہم نے انہیں نکالا، یعنی وہ ہماری تقدیر اور مشیت کے ساتھ نکلے۔

۱۱۔ (سرسبز) باغات سے،

۱۲۔ اور (بہتے ہوئے) چشموں (اور نہروں) سے،

وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝۱۱

”اور (بھرپور) خزانوں میں اور شاندار محلات سے۔“

۱۳۔ اور سونے اور چاندی کے مالوں (خزانوں) سے،

۱۴۔ اور خوبصورت گھروں اور پر رونق مجالس سے، یعنی امراء اور رؤساء کی مجالس سے جنہیں خدام اور تبعین گھیرے ہوتے تھے۔

كَذٰلِكَ ۙ وَاَوْسَّاهُمَا بَنِي اِسْرَآءِیْلَ ۝۱۲

”ہم نے ایسا ہی کیا۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان تمام چیزوں کا وارث بنادیا۔“

۱۵۔ معاملہ اسی طرح ہوا۔

۱۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان باغات، چشموں، خزانوں اور محلات کا وارث بنا دیا اس طرح کہ: یہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو مصر کی طرف واپس لوٹایا اور وہ سب کچھ انہیں عطا کر دیا جن اموال اور محلات کے فرعون اور اس کی قوم مالک تھے۔

فَاتَّبَعُوهُمْ مُّسْرِقِيْنَ ۝۱۳

”پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت۔“

۱۷۔ پس انہوں نے ان کا اشراق کے وقت تعاقب کیا۔

فَلَمَّا تَرَأَوْهُمُ الْغَبِيْنَ قَالَ اَصْحٰبُ مُؤْتَسٰی اِنَّا لَمُرْكُوْنَ ۝۱۴

”پس جب ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ دونوں گروہوں نے ۱۷۔ تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے (ہائے) ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے۔“

۱۸۔ فَلَمَّا تَرَأَوْهُمُ میں سے حمزہ نے راء کے فتح کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سو جب وقت کیا تو اس کے پیچھے حمزہ کو ذکر کیا۔ پس اسے اپنے اصل کے مطابق بین بین بناتے ہوئے اس میں امالہ کیا۔ تو اس طرح یہ ان دو القوں کے درمیان ہو جائے گا جن میں امالہ کیا گیا ہو۔ ان میں سے پہلی الف وہ ہے جسے راء کے فتح کے امالہ کے سبب مائل کیا گیا ہے اور دوسری وہ ہے جس میں حمزہ کے فتح کے سبب امالہ کیا گیا ہے۔ اور یہ مشابہت کے حکم کے مطابق ہے مگر ان کے مذہب کے مطابق یہی اس کی حقیقت ہے۔ اور باقی قراء حالت وصل میں

خالص راہ کا فتنہ اور ہمزہ پڑھتے ہیں۔ لیکن وقف کی صورت میں کسائی ہمزہ کے فتنہ کو امالہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سو اس امالہ کے سبب اس کے بعد کالف یا سے بدل جاتا ہے اور وراث سے ذوات الیاء میں اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تین تین کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور باقی قراء فتنہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔

یعنی وہ دونوں فریق اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوئے کہ قوم موسیٰ اور قوم فرعون میں سے ہر فریق دوسرے کو دیکھنے لگا۔ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے۔

یہ قوم فرعون ہمیں پالے گی اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

قَالَ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ ۝۱۱

”آپ نے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا

یہ وہ ہرگز ہمیں نہیں پاسکیں گے۔

یہ اِن مَعِيَ کَوْفَعُصَا نے یا مفتوح اور باقی قراء نے یا ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔

یہ میرے رب کی مدد اور حفاظت میرے ساتھ ہے۔

یہ وہ ضرور راہ نجات کی طرف میری راہنمائی فرمائے گا۔

فَاَوْحَيْنَا اِلٰی مُوسٰی اَنْ اَصْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ ۚ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ

الْعَظِيْمِ ۝۱۲

”سو ہم نے وحی کیجی موسیٰ کی طرف کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ

سے بڑے پہاڑ کی مانند۔“

لے چونکہ او حینا قول کا معنی ہے۔ لہذا ان اس کی تفسیر ہے۔

یہ فَاَوْحَيْنَا کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”فَصَرَّبَ مُوسٰی عَصَاهُ عَلٰی الْبَحْرِ ۚ فَانْفَلَقَ الْبَحْرُ اَي الْبَحْرِ“ پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا سمندر پر مارا تو سمندر نسل پھٹ گیا۔

سے اور پانی کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ثابت رہنے والے بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ پس جماعت کا ہر حصہ اس کے راستوں میں سے ایک ایک راستے میں داخل ہو گیا۔

وَاَرْسَلْنَاهُمُ الْاَحْزٰیْنَ ۝۱۳

”اور ہم نے قریب کردیا وہاں لے دوسرے فریق کو۔“

لے اور ہم نے اسی جگہ میں

سے دوسرے فریق کو یعنی قوم فرعون کو قریب کر دیا۔

وَأُنْجَيْنَا مُوسَى وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٥٦﴾

”اور ہم نے بچالیا (ان تادموجوں سے) موسیٰ اور اس کے سب ہمراہیوں کو۔“
 ۱۔ اور ہم نے سمندر کو چٹلے سے روک کر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے تمام ساتھیوں کو بچالیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے عبور کر لیا۔

ثُمَّ أَعْرَفْنَا الْأَخْرِئِينَ ﴿٥٧﴾

”پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے فریق کو۔“

۱۔ پھر ہم نے فرعون کی قوم کو فرق کر دیا۔

إِنِّي فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥٨﴾

”اس واقعہ میں (جو بڑی واضح) نشانی ہے ۱۔ اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے۔“

۱۔ بے شک موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچانے اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے میں
 ۱۔ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر واضح دلیل ہے۔ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ اور فرعون کے پیروکاروں میں اکثر۔
 ۱۔ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ال فرعون میں سے ایمان نہیں لائے مگر صرف فرعون کی بیوی آسیہ،
 حزقیل جو کہ اپنے ایمان کو چھپا تھا اور اس کی بیوی اور وہ مریم بخت ناموسیہ جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر پر مطلع کیا۔

وَأَنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٥٩﴾

”اور بے شک (اے حبیب!) آپ کا رب ہی سب پر غالب، ۱۔ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ اور بے شک آپ کا رب ہی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے میں سب پر غالب ہے۔

۱۔ اور اپنے اولیاء (دوستوں) پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْبُرْهَانَ ﴿٦٠﴾

”اور آپ بیان فرمائیے ان کے سامنے ابراہیم کا قصہ۔“

۱۔ اور آپ اہل مکہ کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کیجیے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے ”وَإِنَّا نَدْعُو لَكَ مُوسَى“ کیونکہ
 وہاں ”أَذْكُرُ“ مستفاد ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٦١﴾

”جب آپ نے ۱۔ اپنے باپ سے ۱۔ اور قوم سے کہا کہ تم کسی کی پرستش کرتے ہو؟“

۱۔ جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ یہ اذکر فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ”أَذْكُرُ إِذْ قَالَ“ اور یہ اُتِلْ عَلَيْهِمْ
 سے بدل ہے۔

۱۔ تو اللہ تعالیٰ نے آزر کو باپ کا نام اس لیے دیا کیونکہ وہ آپ علیہ السلام کا چچا اور آپ کا مربی تھا۔

۱۔ آپ نے اپنی قوم سے سوال کیا کہ تم کسی کی پرستش کرتے ہو؟ تاکہ آپ انہیں مطلع کریں کہ جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ عبادت

کے سخت نہیں۔

قَالُوا الْعَبْدُ أَصَمًا فَكَيْفَ لَهَا عَرِيفُونَ ﴿٥١﴾

”انہوں نے کہا تم تو بوجے ہیں بتوں کو اور ہم انہی کی پوجا میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں۔“
 لے تو انہوں نے اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اور غر کرتے ہوئے جواب طویل کر دیا۔ اور یہاں نَفْلٌ نَذْوَمُ کے معنی میں ہے۔
 علامہ بخاری نے کہا ہے کہ وہ دن کے وقت ان کی عبادت کرتے تھے رات کے وقت نہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ اِذْ تَدْعُونَ ﴿٥٢﴾

”آپ نے پوچھا (بھلا یہ بتاؤ) کیا وہ سنتے ہیں تمہاری آواز جب تم انہیں پکارتے ہو۔“

لے ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔

جے کیا وہ تمہاری پکار کر سنتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے کیا وہ تمہارے لیے سنتے ہیں۔ (1)
 جے جب تم انہیں پکارتے ہو۔ تو اس میں حالتِ باہر کی حکایت کے لیے مضارع کا صیغہ اذ کے ساتھ لایا گیا ہے۔

اَوْ يَسْمَعُونَكُمْ اَوْ يَصْرُوْنَ ﴿٥٣﴾

”یا وہ تمہیں (کچھ) نفع پہنچا سکتے ہیں۔ یا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔“

لے یا وہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اس بناء پر کہ تم ان کی عبادت کرو۔

2۔ یا اسے ضرر پہنچا سکتے ہیں جس نے اس سے اعراض کیا۔

قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَاذِبِينَ يَكْفُرُونَ ﴿٥٤﴾

”انہوں نے (لا جواب ہو کر) کہا بلکہ ہم نے تو پایا اپنے باپوں کو کہ وہ یونہی کیا کرتے تھے۔“

لے یعنی انہوں نے یہ کہا کہ بے شک یہ نہ تو کوئی آواز سنتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی ضرر کو دور کر سکتے ہیں بلکہ ہم تو صرف اپنے
 آباء اجداد کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس میں يَكْفُرُونَ وَجَدْنَا کا دوسرا مفعول ہے۔ اور كَاذِبِينَ يَكْفُرُونَ کے محذوف مصدر کی صفت
 ہے۔ یعنی ”بَلْ وَجَدْنَا اَبَاءَنَا يَكْفُرُونَ فَعَلًا كَاذِبِينَ الْفَعْلُ اَي كَفَرْنَا ذٰلِكَ“۔

قَالَ اَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٥٥﴾

”آپ نے فرمایا کیا تم نے دیکھا ان (کی بے بسی) کو جن کی تم پر تشر کرتے ہو۔“

اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ اَلَا قَدْ مَوَّنَ ﴿٥٦﴾

”اور تم اور تمہارے گذشتہ آباء اجداد۔“

لے یہ ہمزہ استفہام تقریری کے لیے ہے۔ یعنی مخاطب کو اقرار پر براہِ حقیت کرنے کے لیے۔ اور قَدْ محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ اور مَا
 بھی استفہامیہ ہے۔ اور جملہ استفہامیہ (ایسم کے مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یا پھر ما موصولہ ہے اور یہ اپنے صلہ سے مل کر ایسم کا

اس کی مدت کی انتہاء تک درج ہے وہ اس کے سبب نفع پہنچانے اور ضرر کو دور کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انسان کی طرف نسبت کے اعتبار سے اس کی ابتدا یہ ہے کہ وہ جینا کی ناف کے ذریعے خون حیض کو چوسنے کی راہنمائی کرتا ہے اور انتہاء جنت کا راستہ اور اس کی لذتیں ہیں۔ اس میں اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر رب العالمین کی معفت ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی اصل عبارت ہے ”هو الذی خلقنی“ یا یہ درج کی بناء پر منصوب ہے۔ (یعنی اس سے پہلے امدح فعل محذوف ہے) اور فاء عاطفہ ہے۔ اور عبارت کا اختلاف خلقت کے مقدم ہونے اور دیریت کے مسلسل جاری رہنے کی وجہ سے ہے۔ اور تین موصولات اس پر معطوف ہیں یا پھر موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور فہو یہدین اس کی خبر ہے۔ اس صورت میں فاء سیدہ ہے۔

وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي ﴿٤﴾

”اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور مجھے پلاتا بھی ہے۔“

۱۔ یہ اس بناء پر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد آنے والے دونوں اسم موصول بھی ہیں۔ اور ترکیب کی تمام وجوہ کی بناء پر موصول کو اس پر دلالت کرنے کے لیے مکرر لایا گیا ہے کہ اقتضائے حکم کے مطابق ہر صلہ مستقل ہے۔

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِي ﴿٥﴾

”اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت بخشتا ہے۔“

۱۔ اس کا عطف ”يَطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي“ پر ہے۔ کیونکہ بیان کے بعد ہی لاحق ہونے والی ہے۔ کیونکہ صحت اور بیماری اکثر کھانے پینے کے تابع ہوتی ہیں۔ اس میں مرض کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا اس کے باوجود کہ بیماری اور شفاء دونوں ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو ایسا حسن ادب کی رعایت کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خطر نے کہا قارئین! اَنْ اَعْيَبَا اور کہا ”فَلَا اَذْبُكْ اَنْ يَنْلَعَا اَشْفَاهُمَا“ تو نے اور دیکھنے کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ انسان کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ اور اس لیے کہ یہاں مقصود نعمتوں کو شمار کرتا ہے اور موت کی نسبت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف کی۔ کیونکہ موت اس اعتبار سے کہ اسے محسوس نہیں کیا جاتا اس میں کوئی ضرر نہیں ہے۔ بے شک ضرر اور تکلیف اس کے مقدمات میں سے ہے۔ اور وہ بیماری ہے کیونکہ موت اہل کمال کے لیے مختلف قسموں کے امتحانوں سے نجات ہوتی ہے۔ اور ان نعمتوں کے حصول تک پہنچتا ہے جن کے مقابلہ میں وہ دنیوی حیات کو تحریر جھمکتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ”الْمَوْتُ خَيْرٌ مِّنْهُ هَلْ الْغَيْبُ إِلَى الْغَيْبِ“ (کہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچا دیتا ہے) اور حدیث طبرہ میں ہے ”مَوْتُ الْفَجَاءَةِ رَاحَةٌ لِلْمُؤْمِنِ وَأَخَذُهُ الْأَسْفُ لِلْفَاجِرِ“ (۱) اسے احمد اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مرفوع روایت کیا ہے۔ (اچانک موت مومن کے لیے راحت ہوتی ہے اور فاجر کے لیے اس کی گرفت غم اور تکلیف ہوتی ہے۔) اور حدیث میں ہے ”الْمَوْتُ كَفَّارَةٌ لِلْغَلِي مُسْلِمٍ“ (کہ موت ہر مسلم کے لیے کفارہ ہے) اسے ابو یوسف نے علیہ میں احمد اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس لیے کہ اکثر مرض انسان کے کھانے پینے میں غفلت برتنے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز بھی اخلاط مزاجوں (سودا، صفرا، بلغم، خون) اور ارکان

(عناصر اربعہ) کے درمیان منافقا اور منافرت پائی جاتی ہے۔ اور صحت ان دونوں کی اجتماعی حفاظت اور اعتدال پر ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ اعتدال جبراً عزیز و محکم کی قدرت کے سبب ہی ہوتا ہے۔

وَالَّذِي يُبَيِّنُ لَكُمْ آيَاتِي وَيُخَبِّرُكُمْ بِالَّذِينَ كُنْتُمْ عَنِهَا مُرْتَابًا ۚ وَبَشِّرِ الصَّادِقِينَ ﴿٥٨﴾

”اور وہ جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا“

وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿٥٩﴾

”اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بخش دے گا میرے لیے میری خطا کو روزِ جزا کو۔“

۱۔ یہ بات اپنی ذات کے لیے بطور کسرِ نفسی ذکر کیا یا اپنی امت کی تعلیم کے لیے تاکہ وہ گناہوں سے اعتنا نہ کریں اور ان سے ڈرتے رہیں۔ اور جب ان سے گناہ صادر ہو جائے تو مغفرت طلب کریں یا یہ ترکِ عزیمت کے عمل سے استغفار ہے اور آپ نے اپنی امت پر شفقت کرتے ہوئے رخصت پر عمل کیا تاکہ اس پر بوجھ اٹھانا مشکل نہ ہو جائے۔ اور خطیبِ کمان تین کلمات پر محمول ہے۔ ایک ان کا قول اِنِّي سَوْفَ غَفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ اور تیسرا حضرت سارہ کے لیے آپ کا یہ قول ”هَذِهِ اخْبَتِي“ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حسن نے ان تین سے زائد یہ بھی کہا ہے کہ سارہ کے بارے آپ کا قول هَذِهِ امِّي بھی اس میں شامل ہے (۱)۔ لیکن یہ ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ تمام کلمات ہیں خطائیں نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ امام بغویؒ نے مسروق کی سند سے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ابنِ عبدِمان دورِ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا وہ اسے نفع دے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اسے نفع نہیں دے گا اگر اس نے کسی دن بھی یہ نہ کہا ہوگا ”رَبِّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ“ یہ تمام کے تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کے خلاف دلائل ہیں اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ جو ایسا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ اللہ بنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَارْحَمْنِي بِالصَّبْرِ ۚ وَارْحَمْنِي بِرَحْمَتِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الرَّحِيمُ الْكَرِيمُ ﴿٦٠﴾

”اے میرے رب اعطاف فرما مجھے علم و عمل (میں کمال) اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ۔“

۱۔ اے میرے رب! مجھے علم و عمل میں اس طرح کمال عطا فرما کہ وہ حق کی خلاف ورزی اور حقوق کی خدمت و بھلائی کے لیے کافی ہو۔
۲۔ اور مجھے عمل میں کمال عطا فرما یہاں تک کہ میں ان صالحین کے گروہ میں شامل ہو جاؤں جن کے ساتھ قساویٰ امیرش کا امکان نہیں اور وہ انبیاء ہیں جو کہ محصور ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴿٦١﴾

”اور بنا دے میرے لیے سچی زبان موری آئندہ آنے والوں میں۔“

۱۔ اور میرے لیے آئندہ آنے والوں میں ایسی حسین تعریف اور ذکرِ جمیل بنا دے جو واقع کے مطابق ہو اور ان امتوں میں قبول عام عطا فرما جو میرے بعد آئیں گی۔ اور معنی یہ ہے کہ بعد میں آنے والوں کی زبانیں میری تعریف میں بچ بولنے والی ہوں۔

اَلَا مَن اٰتَى اللّٰهَ وَقَلْبٌ سَلِيْمٌ ۝۱۱

”مگر وہ شخص جو لے کر آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلب سلیم۔“

۱۔ یعنی جو ایسا دل لے کر آیا جو شرک اور شک سے محفوظ ہو۔ کیونکہ گناہ سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ علامہ بغویؒ نے کہا یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے کہا قلب سلیم مومن کا دل ہوتا ہے اور کافر منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ ابو عثمانؒ ششاپوری نے کہا ہے کہ قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے خالی ہو اور سنت کے ساتھ مطمئن ہو (۱) یعنی اهل السنة والجماعة۔ معنی یہ ہوگا کہ مال اور بیٹے سوائے مؤمن کے کسی کو نفع نہیں دیں گے۔ لہذا اس صورت میں مستثنیٰ مفرغ محل نصب میں ہوگا۔ یا معنی یہ ہوگا کہ مال اور اولاد نفع نہیں دیں گے مگر مومن کا مال اور اولاد نفع دیں گے تو اس صورت میں مستثنیٰ بدل ہونے کی صورت میں محل رفع میں ہوگا۔ نتیجہ حکام یہ ہے کہ کافر اگرچہ صلہ رحمی اور مساکین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتا بھی رہے تب بھی وہ اس کے لیے اسلام قبول نہ کرنے کے سبب نفع بخش نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت بیٹوں اور اولاد کی بھی ہے۔ کہ اگرچہ وہ صلحا اور انبیاء ہی کیوں نہ ہو وہ شفاعت اور استغفار کے سبب اپنے آباء کو نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس لیے رب کریمؐ نے مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا اَعَاكَانَ لِلشِّرْكِ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوا لِلشِّرْكِ وَلَوْ كَانُوا اُولٰٓئِ فَنُذِیْ نَبِیْ عَلَیہِ السَّلَام اور مومنین کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ آزر کو ملیں گے اس حال میں کہ اس کا چہرہ گردوغبار سے اٹا ہوگا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے فرمائیں گے کیا میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ تو میری نافرمانی نہ کر۔ تو وہ آپ علیہ السلام سے کہے گا آج کے دن میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔ تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام رب کریمؐ کے حضور التجا کریں گے اے میرے رب! بے شک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے شرمسار نہیں کرے گا جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ تو میرے اس باپ کی رسوائی سے بڑھ کر اور کون سی بات میرے لیے باعث شرم ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ بے شک میں نے کافروں پر جنت کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! اس شے کی جانب دیکھیے جو آپ کے پاؤں کے نیچے ہے۔ پس آپ دیکھیں گے تو اچانک (بزرگ) گندگی میں تھرا ہوا ایک جانور (بجو یا گدھا) پائیں گے پس اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2) اور وہ اس دن اس سے بری ہو جائیں گے۔ ابھی۔ لیکن مومن کا وہ مال اسے نفع دے گا جو اس نے اطاعت (یعنی کے کاموں) میں خرچ کیا اور اس کی اولاد شفاعت و استغفار کے سبب اسے نفع پہنچائے گی اور یہ قول بھی ہے۔ کہ استثناء منقطع ہے۔ اور معنی یہ ہوگا لیکن اس کی سلامتی جو قلب سلیم لے کر آیا اسے نفع پہنچائے گی۔

وَاُزْلِفَتْ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝۱۲

”اور قریب کر دی جائے گی جنت پر ہیزگاروں کے لیے۔“

۱۔ اور جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی اس اعتبار سے کہ وہ اسے موقف سے ہی دیکھ لیں گے۔ پس وہ اپنے اٹھائے جانے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے۔

وَبَرَزَتِ الْجَنَّةُ لِلْبُغْوِيِّ ۝

”اور ظاہر کر دی جائے گی دوزخ نیکے والوں کے لیے۔“
 لے اور نیکے والوں کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی اور وہ اسے بالکل ظاہر دیکھ لیں گے۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ انہیں اس کی طرف ہانک کر لایا جائے گا۔ علامہ بیضاوی نے فرمایا کہ دونوں قولوں میں لفظ کا اختلاف جانب وعدہ کی ترجیح کے لیے ہے۔

وَقِيلَ لَهُمْ أَأَنتُمْ كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۝

”اور کہا جائے گا انہیں لے کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم پوجا کرتے تھے۔“

لے اور ان نیکے والوں کو کہا جائے گا۔

لے کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوال ان کی شفاعت کی امید کرتے تھے۔

مِنْ دُونِ اللَّهِ هَلْ يَشْعُرُونَ ۝

”اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر لے کیا وہ تمہاری (کچھ) مدد کر سکتے ہیں یا انتقام لے سکتے ہیں۔“

لے وہ دُونِ اللَّهِ معنی منصوب سے حال ہے۔

لے یہ استفہام انکار اور توجیح کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ تمہیں عذاب سے بچالیں گے۔

لے یا وہ عذاب کو اپنے نفسوں سے دور کر سکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اور جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

فَلْيَكْفُرُوا فِيهِمْ هَاهُمْ وَالْعَاُونَ ۝

”پس اوندھے پھینک دیے جائیں گے لے اس میں وہ لے اور دوسرے مگرا رہے۔“

لے علامہ بغوی نے فرمایا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے انہیں اس میں جمع کیا جائے گا۔ مجاہد نے کہا انہیں دوزخ کے گڑھ میں سے پھینکا جائے گا۔ مقاتل نے کہا انہیں ڈالا جائے گا، زجاج نے کہا ان میں سے بعض کو بعض پر پھینکا جائے گا۔ اور قتیبہ نے کہا ہے کہ انہیں سروں کے بل اس میں ڈالا جائے گا (1)۔ قاسموس میں ہے کہ کنبۃ کا معنی ہے قلبہ و حوضۃ صیۃ اکتبہ و کبکبہ فاکب اور یہ لازم ہے (2) یعنی کتب اور کبکبہ ایک ہی معنی میں ہیں۔ علامہ بیضاوی نے کہا کہ کبکبہ کا لفظ معنی کے تکرار کے لیے آتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ باری باری گرتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس کی اتھاہ گہرائی میں پہنچ جائیں گے۔

لے یعنی معبودان باطلہ۔

لے اور ان کی عبادت کرنے والے۔

وَجُودُ ابْلِيسَ أَجْمَعُونَ ۝

”اور ابلیس کی لہ ساری فوجیں لہ۔“

لہ اور جنس وانس میں سے جو تا فرمان شیطان کے متبعین ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شیطان کی ذریت (اولاد) ہے۔
لہ آجْمَعُونَ یہ جنود کی تاکید کے لیے ہے۔ اگر اسے مبتدا بنا کر اس کے مابعد کو خبر بنایا جائے۔ یا یہ کجگوئی ضمیر مرفوع کے لیے تاکید ہے جب کہ اسے اس پر معطوف کیا جائے۔

قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ﴿٥٦﴾

”وہ کہیں گے لہ اس حال میں کہ وہ دوزخ میں یا ہم جھگڑ رہے ہوں گے لہ۔“

لہ یعنی شیطان کی پوجا کرنے والے اور معبودان باطلہ کہیں گے
لہ قَالُوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور ضمیر مرفوع متصل پوجا کرنے والوں اور ان کے معبودوں تمام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائے گا پس وہ اپنی پوجا کرنے والوں سے جھگڑا کریں گے۔

تَاللّٰهُ اِنْ كُنَّا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٧﴾

”خدا کی قسم! ہم کبھی گمراہی میں گرفتار تھے لہ۔“

لہ اس میں ”اِنْ“ مخففہ عن المنقلب ہے اور لام اِنْ فافیہ اور اِنْ مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور جملہ قَالُوا کا مفعول ہے۔

اِذْ نَسُوْا بَرِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٨﴾

”جب ہم تمہیں لہ رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے لہ۔“

لہ اے معبود! جب ہم تمہیں استحقاق عبادت میں رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے۔

لہ اس میں اِذْ نَسُوْا بَرِّ الْعٰلَمِيْنَ کے متعلق ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر متصل اور جس کی طرف وہ لوٹ رہی ہے وہ پوجا کرنے والوں کی طرف راجع ہو۔ پس بتوں میں جھگڑنے کی صلاحیت نہ ہونے کی بناء پر یہ کہنا کافی ہے۔ اور بتوں کو خطاب کرنے کا مدعی اور فائدہ حسرت اور عناد میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ خلافت و مگرانی میں اپنے انہماک کے سبب ہی مبادا خلافت میں جھگڑ رہے ہیں پس وہ اس پر بہت زیادہ افسوس کریں گے۔

وَمَا اَصْلَكُمْ اِلَّا الْيَحْيٰوْنَ ﴿٥٩﴾

”اور انہیں گمراہ کیا ہمیں مگر (ان نامی) مجرموں نے لہ۔“

لہ مقال نے کہا ہے کہ مجرموں سے مراد شیاطین ہیں۔ اور کبھی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلے لوگ ہیں جن کی انہوں نے اقتدار کی۔ (۶)

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿٦٠﴾

”تو (آج) انہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی لہ۔“

۱۔ آج ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ مؤمنین کے لیے سفارش کرنے والے انبیاء، ملائکہ اور ان کے صالحین بھائی ہیں۔

وَلَا صَدِيقٌ حَمِيمٌ ۝

”اور نہ کوئی غم خوار مل دوست ہے۔“

۱۔ اور نہ کوئی دوست ہے۔ صدیق کا معنی ہے جو محبت و مودت میں سچا ہو۔ پھر اس میں شافعی کی جمع ذکر کی گئی ہے اور صدیق کو واحد۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عادیہ سفارش کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور دوستوں کی کم۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دوست اس سے کہیں زیادہ کوشش کرتا ہے جتنی بہت سے سفارش کرنے والے کرتے ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ صدیق جمع پر صادق آنے میں عدد کی مثل ہے۔ جیسا کہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ فعول اور فعیل کے وزن کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل میں مصدر ہے۔ جیسا کہ جنین اور صہیل وغیرہ۔

۲۔ صَدِيقٌ کا معنی ہے قریب (قرب رکھنے والا غم خوار) قاصوس میں ہے کہ حیم امیر کی طرح ہے۔ اور اس کا معنی ”الغریب“ ہے۔ اس کی جمع ”احماء“ آتی ہے۔ اور کبھی حیم ہی جمع اور مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے (۱)۔ ان کا اس سے مقصود یہ ہے کہ بے شک ہمارے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ قریبی جو ہماری سفارش کرے۔ کیونکہ اس دن متقین کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے اَلَا خَلَاءٌ يَوْمَئِذٍ يَبْغُضُهُمْ لِبَغْضَائِهِمْ وَعَدُوَّ الْاِنْسَانِ عَدُوٌّ عَلِيمٌ علامہ ابنوئی نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک جنت میں ایک آدمی کے گا میرے فلاں دوست سے کیا کیا گیا اور آٹھالیہ اس کا دوست جہنم میں ہو گا تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے لیے اس کے دوست کو جنت میں داخل کر دو۔ تو جو ہاں باقی رہ جائیں گے وہ کہیں گے ”فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ“ اصل عربی الفاظ اس طرح ہیں (عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ الرُّجُلَ لَيَقُولُ فِي الْجَنَّةِ مَا فَعَلَ صَدِيقِي فَلَمَّا رَأَى أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَخْرَجَهُ إِلَى الْجَنَّةِ يَقُولُ مَنْ بَقِيَ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ) (۲) حسن نے کہا ہے کہ مؤمنین میں سے کثرت سے دوست بناؤ کیونکہ ان کے لیے قیامت کے دن شفاعت کرنے کا اختیار ہوگا۔

فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَلَكَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

”پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا۔ (دنیا میں) کو ایسا جانا تو ہم اہل ایمان سے ہوتے۔“

۱۔ اس میں دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی تمنا اور آرزو کا تذکرہ ہے۔ اس میں تلوٹت کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں تقدیر معنی میں مشترک ہیں۔ یا پھر تلوٹ طریقہ ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور وہ ہے ”لَئِنْ خَيْرًا“

۲۔ فَنَتَلَكَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یہ تمنا کا جواب ہے یا پھر محوہ پر معطوف ہے۔

إِنِّي ذُلٌّ لَّأَيَّةٍ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

”بے شک اس واقعہ میں (عبرت کی) نشانی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ لوگ ایمان لانے والے“

لے بے شک جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

اس میں اس کے لیے واضح حجت موجود ہے جو اس سے بصیرت اور عبرت حاصل کرنا چاہے کیونکہ اسے انتہائی موزوں تربیت اور حسین انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں غور و فکر کرنے والا اپنے علم کی قوت کے ساتھ اسے سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس میں علوم دینیہ کے اصول کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے دلائل پر آگاہی بھی، قوم کو آپ کی دعوت دینے کے حسین انداز کا تذکرہ بھی ہے اور آپ کی ان کے ساتھ حسن مخالفت کا ذکر بھی، آپ کی ان پر کمال شفقت کا ذکر بھی ہے اور امرِ واقعہ کی تصویر بھی اور وعدے اور وعید کا اطلاق علیٰ سبیل الہکایہ اس طرف اشارہ کرنے اور اس پر آگاہ کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ ان کو سننے اور قبول کرنے کی طرف زیادہ دعوت دیے۔ اور اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے دعویٰ کی صداقت پر بھی واضح دلیل ہے۔

وَإِنْ رَبُّكَ لَهْوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٥٠﴾

”اور (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہے۔ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

لے تاکہ وہ اس کے ساتھ ایمان لائیں یا ان کی اولاد میں سے کوئی۔ اور مومنین پر انعام فرمانے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿٥١﴾

”جھٹلایا قوم نوح نے (اللہ کے) رسولوں کو۔“

لفظ القوم مؤنث ہے۔ اسی لیے اس کی تصغیر قَوْمِ نُوْحٍ آتی ہے۔ الْمُرْسَلِينَ صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جنس ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ يَرْحَبُ فَلْيَنْ الْغَيْبِ۔ اگر چہ اس کے پاس صرف ایک گھوڑا ہو۔ یا چھر اس لیے جمع لایا گیا ہے کیونکہ وہ رسولوں کی بعثت کا انکار کرتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ بے شک انہیں کہا گیا اے ابوسعید! اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے: ”كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ، كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِينَ، كَذَّبَتْ قَوْمُ الْمُرْسَلِينَ“ جبکہ ان کی طرف ایک رسول بھیجا گیا؟ تو انہوں نے کہا کہ بے شک دوسرا رسول وہی ہے کہ آیا جو پہلا رسول لایا تھا تو جب انہوں نے ایک کو جھٹلادیا تو یہ ایسا ہی ہو گیا کہ انہوں نے تمام رسل کو جھٹلادیا۔ (1)

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿٥٢﴾

”جب کہا انہیں ان کے بھائی نوح نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟“

لے جب ان کے بھائی نوح نے انہیں کہا۔ جو ان کے کسی بھائی تھے نہ کوئی ”نوح“ اخوہم سے عطف بیان ہے۔
لے کیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم اس کے سوا غیر کی عبادت چھوڑ دو۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿٥٣﴾

”بے شک میں تمہارے لیے رسول ہوں۔“

۱۔ بے شک میں اسی شے کی طرف تمہاری راہنمائی کرنے والا ہوں جو تمہارے لیے بہتر ہے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں۔

۳۔ اس کی وحی کا ائین ہوں اور تمہارے درمیان صدق و امانت کے اعتبار سے مشہور ہوں۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝

”پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری فرمانبرداری کرو۔“

۱۔ پس اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچو۔

۲۔ اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں، یعنی توحید اور اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی عبادت وغیرہ۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنَّا أَجْرِي إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

”اور میں تمہیں طلب کرتا ہوں ۱۔ اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت ملے میرا جزو تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔“

۱۔ اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے اور نصیحت کرنے کے عوض تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا۔

۲۔ کہ تم مجھے اس تبلیغ میں کسی طمع یا لالچ کے ساتھ ہم کر دو۔ ”إِنَّا أَجْرِي“ کو نافع، امین، عامر، ابو عمر اور حفص نے یا مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا ہمساکن کے ساتھ۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝

”پس تم ڈرو اللہ سے اور میری پیروی کرو۔“

۱۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا کو کر ذکر کر فرمایا تاکید کے لیے اور اس پر مطلع کرنے کے لیے ہے کہ ان کی امانت اور عدم طمع (لالچ نہ ہونا) میں سے ہر ایک ان امور میں ان کی اطاعت واجب ہونے پر مستقل دلالت کرتا ہے جن کی طرف وہ انہیں دعوت دیتے ہیں تو جب یہ دونوں وصف جمع ہو جائیں تو پھر مرتبہ کیسا ہوگا؟

قَالُوا أَتُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَلْمُذُنُونَ ۝

”انہوں نے کہا! کیا ہم (قوم کے رئیس) ایمان لائیں تجھ پر ۱۔ حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کر رہے ہیں۔“

۲۔ تو اس پر آپ کی قوم نے انکار کرتے ہوئے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ صرف گھٹیا لوگ تمہاری پیروی کر رہے ہیں۔

۳۔ وَاتَّبَعَكَ تَرْکِیب کلام میں حال ہے اور اس سے قبل قَدْ مَقْدَر ہے۔ یعقوب نے اتَّبَعْتُک پڑھا ہے جو کہ تابع کی جمع ہے۔ جیسے شاہد اور اَشْفَاقہ ہے۔ یا پھر یہ جمع کی جمع ہے جیسے بطل کی جمع ابطال ہے۔

۴۔ الْأَلْمُذُنُونَ کا جمع سالم ہے۔ اور ارذل امور کے وزن پر ہے۔ قاموس میں ہے کہ اس کا معنی ہے انتہائی گھٹیا اور خسیس۔ (۱)

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو جاہ و مرتبہ اور مال و وسائل میں انتہائی کمزور ہو۔ لغوی نے کہا انتہائی نچلے درجے کا آدمی حضرت امین عباسؑ سے مروی ہے۔ کہ اس کا معنی ہے زرگری کا پیشہ اپنانے والا۔ عکرمہ نے کہا ہے کپڑا بننے اور سوچی کا پیشہ اپنانے والا (۲) اور یہ دنیوی ساز و سامان کے بارے میں ان کی انتہائی کم عقلی اور کمزور رائے ہے کہ انہوں نے کم ساز و سامان رکھنے والوں کی اتباع

کواچی اتباع اور اس کے ساتھ اپنے ایمان کے باقی قرار دیا جس کی طرف وہ انہیں بلاتے تھے۔ اور اس کے بطلان پر دلیل بنایا۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ ان کے قسین اہل نظر و بصیرت نہیں۔ کیونکہ وہ مال و منال اور بلندی مرتبہ کی توقع رکھتے ہیں۔

قَالَ وَمَا عَلَيْنَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٣٧﴾

”آپ نے فرمایا! مجھے کیا خبر کہ وہ کس نیت سے ایمان لائے ہیں؟“

ل۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا

میں یہ نہیں جانتا کہ وہ یہ اتباع کیوں کرتے ہیں کیا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یا دنیا میں رفعت و بلندی حاصل کرنے کے لیے؟ میں تو صرف ظاہر کا اعتبار کرتا ہوں۔

إِنْ جَاءَهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَأْيٍ لَّنَا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ عَنَّا لَأَبْلُغَنَّ إِلَهُكُمُ الْمَوْتَ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَا يَفْقَهُونَ ﴿٣٨﴾

”ان کا حساب! تو میرے رب کے ذمہ ہے۔ اگر تمہیں (حقیقت کا) شعور ہے۔“

ل۔ ان کے باطن کا حساب۔

م۔ اس پر صرف میرا رب مطلع ہے۔

م۔ اگر تم اس کے ادراک کا شعور رکھتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حق کا ادراک کرنے سے تمہاری عقلوں کو باندھا اور تمہاری آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اگر تم جانتے ہوئے تو تم ان کے پیشوں کی وجہ سے انہیں ذلیل نہ سمجھتے۔ زجاج نے کہا ہے دین کے لیے پیشے ضرور ساں نہیں ہوتے۔ (1)

وَمَا آتَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٩﴾

”اور نہیں ہوں میں دور بھگانے والا (غریب و مسکین) مومنوں کو۔“

ل۔ اور میں مومنوں کو دور بھگانے والا نہیں ہوں۔ ”وَمَا آتَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ“ ان کے قول سے مومنین کو بھگانے کی استدعا کا جو وہم ہوتا ہے اس کا جواب ہے۔

إِنَّا أَنَا إِلَهُكَ يَا مُحَمَّدٌ ﴿٤٠﴾

”نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا۔“

ل۔ اِنَّا اِلٰہُکَ یَا مُحَمَّدٌ یہ نہ بھگانے کی علت ہے۔ یعنی میں تو صرف لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے، انہیں کفر و معصیت سے روکنے اور حقوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہوں چاہے وہ شرفاء ہوں یا گھنیا قسم کے لوگ ہوں۔ میرے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ میں انہما کی اتباع حاصل کرنے کے لیے فقراء کو بھگا دوں۔ کیونکہ میرے ذمہ تو صرف تمہیں ڈرانا ہے۔ خاک نے کہا ہے کہ ایسا ڈرانا جو خارج دلیل کے ساتھ ہو۔ لہذا میں تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں بھگا نہیں سکتا۔ (2)

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ عَنَّا يَا مُحَمَّدُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿٤١﴾

”ان (مغروروں) نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے (تو یا درکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔“

انہوں نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے اس سے جو ہم کہتے ہیں۔

یعنی تو تمہیں ضرور اسی طرح برا بھلا کہا جائے گا (یعنی گالی گلوچ دی جائیں گی)۔ شاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ مقاتل اور کلبی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ (۱)

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿۱﴾

”آپ نے عرض کی میرے مالک! میری قوم نے تو مجھے جھٹلایا ہے۔“

اِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ اس شے کا اظہار ہے جس کے سبب آپ نے ان کے خلاف بدعا کی۔ اور وہ ہے ان کا حق کو جھٹلانا نہ کہ ان کا آپ کو خوفزدہ کرنا اور آپ کو حقیر سمجھنا۔

فَاَقْبَحَ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ مِّثْقَالُ ذَرَّةٍ وَفَوَّضَ بَيْنِي وَبَيْنَهُم مِّثْقَالُ ذَرَّةٍ ﴿۲﴾

”بس تو فیصلہ فرما دے میرے اور ان کے درمیان۔ جو قطعی ہو اور (اپنے عذاب سے) نجات دے مجھے اور جو میرے

ساتھ ہیں۔ اہل ایمان سے۔“

اِنَّ قَابِضَهُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ مِّثْقَالُ ذَرَّةٍ سے ماخوذ ہے۔ (تو میرے اور ان کے درمیان قطعی فیصلہ فرما دے)

وَفَوَّضَ بَيْنِي وَبَيْنَهُم مِّثْقَالُ ذَرَّةٍ اور شخص نے یا مفتوح کے ساتھ پر حالے اور باتوں نے یا اس مکن کے ساتھ۔

یعنی اور تو مجھے نجات عطا فرما اور میرے ان ساتھیوں کو جو ایمان لانے والے ہیں اپنے ارادے سے یا اپنے پیشے کے ادنیٰ ہونے کے سبب۔

فَاَنْجِيْنَهُ وَمَنْ مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ السَّخُوْنِ ﴿۳﴾

”پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو آپ کے ہمراہ اس کشتی میں تھے جو کھپکھپ بھری ہوئی تھی۔“

ہم نے آپ کو اور آپ کے ہمراہ کشتی میں سوار لوگوں کو نجات دی جن سے کشتی بھری ہوئی تھی۔

ثُمَّ اَعْرَضْنَا بَعْدَ الْبَقِيَّتِ ﴿۴﴾

”پھر ہم نے غرق کر دیا اس کے بعد۔ پیچھے رہ جانے والوں کو۔“

پھر آپ کو اور مؤمنین کو نجات دینے کے بعد ہم نے۔

یعنی آپ کی قوم کے پیچھے رہ جانے والے افراد کو غرق کر دیا جو کافر تھے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵﴾

”یقیناً اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۔“

یہ ہے شک اس واقعہ میں بھی ایک نشانی ہے جو عام ہے اور متواتر ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهٗوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶﴾

”اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے“

كَذَّبَتْ عَادَۃُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱﴾

”جھٹلایا عادی نے (اپنے) رسولوں کو۔“

۱۔ یہاں عاقیلہ کے اعتبار سے فعل مؤنث ذکر کیا گیا ہے اور عادی اصل ان کے جد اعلیٰ کا نام ہے۔

اِذْ قَالَتْ لَهُمْ اَخُوهُمْ هُوَ الَّذِیْ تَقْتُلُوْنَ ﴿۲﴾

”جب فرمایا انہیں اُن کے بھائی ہود (علیہ السلام) ۱ نے کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ۲۔“

۱۔ جب انہیں ان کے بھائی نے کہا۔ جو ان کے نبی بھائی تھے نہ کر دیں۔

۲۔ هُوَ الَّذِیْ تَقْتُلُوْنَ (یعنی ہود علیہ السلام) نے انہیں فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے کیا تم اس سے بچنے کے لیے توحید قبول کر لو اور شرک چھوڑ دو۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اٰمِیْنٌ ﴿۳﴾

”بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔“

۱۔ بے شک میں رسالت کا امین ہوں۔ کبھی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ میں رسالت سے قبل تمہارے درمیان امین تھا (۱)۔ یعنی تم جب اس سے پہلے مجھے تمہیں نہیں کرتے تھے تو آج تم کیوں تمہیں کرتے ہو؟

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْا ﴿۴﴾

”پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“

وَمَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیْ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵﴾

”اور میں تمہیں طلب کرتا تم سے اس (خدمت) کا کوئی صلہ ۱ میرا اجر تو اس پر ہے جو سارے جہانوں کا پالنے

والا ہے ۲۔“

۱۔ نافع، ابن عمر، ابو عمر وادو حفص نے انجیری کو یاد کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاد کے سکون کے ساتھ۔

۲۔ کیونکہ فرامی رسالت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ لہذا اس کا اجر بھی اسی کے ذمہ ہے (میں تم سے اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کرتا)۔

مسئلہ: اطاعت و فرمانبرداری پر اجرت لینا جائز نہیں ورنہ وہ اطاعت اطاعت الہی نہیں ہوگی اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے اجر کا مستحق ہوگا۔

اَسْبِئُوْنَ بِحٰجِّیْ رَیْبٍ اَیَّۃٌ لِّتَعْبِتُوْنَ ﴿۶﴾

”کیا تم تمہیں کرتے ہو ہر اونچے مقام پر ۱ ایک یادگار ۲ بے فائدہ ۳۔“

۱۔ یہ استفہام توجہ یا تقریر کے لیے ہے۔ اور کل دبیع میں استغراق غیر حقیقی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ کثیر ہے جس میں کثرت حقیقی ہونہ کہ کثرت اضافی۔ والہی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ کل دبیع سے مراد ہر بلند جگہ ہے۔ اور دبیع الانراض سے مراد زمین کا بلند مقام ہے۔ فحاک اور مقابل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر راستہ ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی روایت کیا ہے۔ اور مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والا راستہ ہے۔ اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد منظر ہے (۱)۔ اور قاموس میں ہے۔ "الدبیع راء کے کسرہ اور فتح کے ساتھ اس کا معنی ہے زمین کی بلند جگہ، یا پہاڑ میں کھلا راستہ یا بلند پہاڑ یا ہر بلند مقام سے وادی کے بننے کی جگہ۔ اور اگر بالکسر ہو تو اس کا معنی گر جا اور کبوتروں کا برج ہے۔ (۲)

۲۔ "الہیۃ" سے مراد ایسی علامت اور نشانی ہے جو یادگار ہو

۳۔ اور "تغشون" اس کا مضموم ہے کہ تم ایسے کام کر رہے ہو جو آخرت میں تمہارے لیے فائدہ مند نہیں بلکہ دنیا میں بھی مفید نہیں۔ یا آیہ کا معنی ہے جو گزرنے والے مسافروں کے لیے علامت ہو۔ تو تمہارا انہیں تغیر کرتا ہے فائدہ ہے کیونکہ مسافر تو اپنے سفروں کے دوران ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ لہذا وہ ان کے محتاج نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بلند جگہوں پر عمارتیں بناتے تھے تاکہ وہ راستے سے گزرنے والے مسافروں اور جماعتوں پر اوپر سے لکھ سکیں۔ پھر وہ ان سے تسخیر کرتے تھے اور ان سے لایعنی حرکات کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد کبوتروں کے برج ہیں۔ تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں یہ بتانے سے منع کیا۔ اس معنی کی دلیل تغشون ہے۔ اس کا معنی "تغشون" کیونکہ وہ کبوتروں سے کھینچتے تھے (۳)۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ محلات، برج اور قلعے تعمیر کرتے تھے جو کہ مرد زمانہ کے ساتھ ساتھ سطح زمین پر باقی رہتے تھے۔ تو یہ بنانے والے کے لیے یادگار علامت ہوتی تھی۔ جیسا کہ اہل دنیا کا طریقہ ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کرتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلْتَ لَكَ بُعَاوُجَ اِسْمَاءَ ذَاتِ الْوُجُوْدِ اَلَيْسَ لَكَ بِهٰذَا الْبُعَاوُجِ مِثْلُهَا فَاِنِ الْيَاكُوْرُ اَوْ رِبٍ سَبَّحَ بِهٖ فَاَنَدَ تَهَا تَوْ حَضَرَ هُوْدُ عَلِيْهِ السَّلَامُ لَمْ يَنْهٰهُمْ اِسْ مِنْعَ كِيَا جِيْسَا كَهْ حَضُوْرُ نَبِيْ كَرِيْمٍ ﷺ نَے اِس طَرَحِ اِس سَے مَنع فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی ذلت و شرکا را ارادہ فرماتا ہے۔ تو وہ اسے اینٹوں اور گارے میں محصور کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ عمارتیں بناتا رہتا ہے (۴)۔ اسے طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور الاوسط میں ابو البشر انصاری کی حدیث سے اس طرح روایت کیا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے ذلت و رسوائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کا مال و عمارتوں میں خرچ کر دیتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبال ہے مگر وہ جو اس طرح ہو اور آپ نے پیٹھ کے ساتھ اس کا اشارہ کیا۔ اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ وائل بن اُسح سے روایت کیا ہے۔ (۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ بابر تعریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے تو آپ نے ایک بلند و بالا قیدہ لکھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کس کا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ فلاں انصاری کا ہے۔ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے اور اپنے ہی دل میں اسے برداشت کر لیا۔ حتیٰ کہ جب اس کا مالک رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور لوگوں کے درمیان آپ ﷺ پر سلام عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ جب بار بار آپ ﷺ نے ایسا کیا۔ تو وہ آدمی

1- تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2- القاموس المحیط، جلد 2972 (الترت العربی)

3- تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4- مجمع بحیر، جلد 86-2185 (ابن تیمیہ)

5- ایضاً جلد 22 صفحہ 55-56

آپ ﷺ کے غصہ اور اعراض کو جان گیا۔ تو اس نے اس کا اظہار آپ ﷺ کے صحابہ کرام سے کیا اور کہا تم بخدا رسول اللہ ﷺ ناراض ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ تو انہوں نے اسے بتایا کہ آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور تیری قبۂ نماز عمارت کو دیکھا۔ چنانچہ وہ آدمی اپنے تہی طرف واپس لوٹا اور اسے مکمل طور پر گر کر زمین کے ساتھ برابر کر دیا۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے تو آپ نے اسے تہہ دیکھا تو فرمایا قبہ کو کیا ہوا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اس کے مالک نے ہمیں بتایا کہ آپ نے اس سے اعراض برتا ہے۔ تو پھر ہم نے اسے اس کے بارے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ اس نے اسے گرا دیا۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا بے شک ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر جو ضروری ہو مگر جو ضروری ہو۔ اسے الوداؤ دے کر روایت کیا ہے۔ (1)

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک قیامت کے دن ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر وہ جو مسجد ہو یا رہائشی گھر ہو۔ اور جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے۔

وَتَشْكُوْنَ مَصَانِعُ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿٥٦﴾

”اور اپنی رہائش کے لیے بناتے ہو مضبوط محلات۔ اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے۔“

۱۔ وَتَشْكُوْنَ مَصَانِعُ اس میں مَصَانِع سے مراد پانی کے تالاب، پختہ محلات اور مضبوط قلعے ہیں۔ اس کا عطف تَنْبُوْنَ پر ہے۔
۲۔ گویا کہ تم امید رکھتے ہو کہ تم اس میں ہمیشہ باقی رہو گے۔ لہذا تم ان کی عمارتیں پختہ بناتے ہو۔

مسئلہ: لمبی آرزو کردہ ہوتی ہے اور چھوٹی آرزو مستحب ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے جسم کو پکڑا اور فرمایا تو دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو غریب الوطن ہے یا رہاڑے ملنے والا مسافر ہے اور اپنے آپ کو اصحاب قبور میں سے شمار کر۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے تو میں اور میری ماں کسی شے کو مٹی کا لپ کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ! یہ عبد اللہ! یہ کیا ہے۔ تو میں نے عرض کی اس شے کی اصلاح کر رہے ہیں (یعنی اس کی حرمت کر کے اسے سنوار رہے ہیں)۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حکم اس سے کہیں زیادہ تیز ہے (3) (یعنی موت اس سے بھی قریب ہے۔ مترجم)۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹا ہوا پانی بہا دیا کرتے تھے اور بعد ازاں نفر میں مٹی سے تھم کرتے تھے۔ میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ! بھگ پانی تو آپ کے قریب ہے تو آپ ﷺ فرماتے میں نہیں جانتا۔ شاید میں اس تک نہ پہنچوں (4)۔ اسے علامہ بخاری نے شرح السنہ میں اور علامہ ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے۔

وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿٥٧﴾

”اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑے ظالم و بیدردین کر گرفت کرتے ہو۔“

۱۔ جب تم پکڑتے ہو تو انتہائی سخت عذاب دینے کے لیے۔ یہ ظرف بطشتم کے متعلق ہے۔ اور ”بَطْشْتُمْ“ تَنْبُوْنِ پر معطوف ہے۔
 ”جَبَّارِيْنٌ“ کا معنی ہے بغیر کسی نری کے بغیر حق کے قتل کرنے والے۔ اور قافسوں میں ہے کہ جبار کا معنی ہے کبکھر کرنے والا، ایسا دل جس میں رحمت و نرمی نہ ہو، اور بغیر حق کے قتل کرنے والا۔ (1)

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا

”پس (اب تو) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“

۱۔ پس ان اشیاء کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

۲۔ اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کیونکہ وہ تمہارے لیے نفع بخش ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِينَ آمَنُوا كَمَا تَأْتِيكُمُ الْآيَاتُ

”اور ڈرو اس ذات سے جس نے مدد کی ہے تمہاری ان چیزوں سے جن کو تم جانتے ہو۔“

۱۔ تقویٰ کی امر مکرر ذکر کیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی چیزوں کے ساتھ ان کی امداد کرنے پر مرتب ہے۔ جنہیں وہ طرح طرح کی نعمتوں کے طور پر پہنچاتے تھے اور یہ تقویٰ ہی اس کی عطا کی علت اور یہ نتیجہ بھی کہ اگر تقویٰ قائم رکھو گے تو امداد مسلسل جاری رہے گی۔ اور ساتھ ہی اسے ترک کرنے کی صورت میں نعمتوں کے انقطاع کی وعید بھی ہے۔ اور یہ تَأْتِيكُمُ الْآيَاتُ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مجمل اظہار تھا جیسا کہ آتے تقفون میں کافروں کے جرم پر اجمالی دلالت تھی۔ اس کے بعد نصیحت اندوزی میں مبالغہ کرتے ہوئے اور تقویٰ پر ابھارتے ہوئے بعض نعمتوں کی تفصیل بیان کر دی۔

آمَدَكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَيْنَتٍ

”یعنی اس نے مدد فرمائی ہے تمہاری مویشیوں اور فرزندوں سے۔“

۱۔ ”آمَدَكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَيْنَتٍ“ یہ پہلے آمَدَكُمْ سے بدل ہے پھر انہیں دھمکایا اور فرمایا

وَجَنَّتِ وَعُيُونٌ

”اور باغات اور چشموں سے۔“

۱۔ انہی کو حرمیان (ابو جعفر اور ابو محمد) اور ابو عمر و نے یاہ مفتوح کے ساتھ اور ہاتھوں نے یاہ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ

”میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے۔“

۱۔ اگر تم میری اسی طرح نافرمانی کرتے رہے تو میں ڈرتا ہوں کہ۔

۲۔ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (2)۔ دنیا میں یا آخرت میں۔ کیونکہ جو نعمتیں عطا کرنے پر قادر ہے وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ جملہ مقام تخیل میں ہے۔ (یعنی علت بیان کرنے کے عمل میں ہے)

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَضَّتْ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ﴿٦٠﴾

”انہوں نے کہا! یکساں ہے ہمارے لیے ملے خواہ آپ نصیحت کریں یا نہ ہوں آپ نصیحت کرنے والوں سے ملے۔“

۱۔ قوم ہود نے اس کے جواب میں کہا۔

۲۔ سَوَاءٌ عَلَيْنَا یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ مگر اس قول کی وجہ سے مقدم ہے۔

۳۔ اَوْعَضَّتْ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ وہ مصدر کی تاویل کے ساتھ مبتدا ہے، یعنی آپ کا ہمیں وعظ کرنا اور نہ کرنا ہمارے نزدیک برابر ہے۔ آپ کے وعظ و نصیحت کے ساتھ ہم اپنے معمولات کو چھوڑیں گے نہیں۔ وعظ سے مراد وہ کلام ہے جو وعدہ و وعید کے ذکر سے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ نفی کی طرف کو اس سے تبدیل کر دیا ہے جس کا تقاضا اس کا مقابل کرتا ہے۔ اسی طرح کہ یہ نہیں فرمایا ”اَوْعَضَّتْ اَمْ لَمْ تَعْظُ“ تو اس سے اس میں مبالغہ مقصود ہے کہ وہ آپ کے وعظ و نصیحت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔

إِنْ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦١﴾

”نہیں ہے یہ (مخلات کا شوق) مگر ہمارے اسلاف کا دستور۔“

۱۔ اِنْ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ اس میں ابو جعفر، ابو عمرو، کسائی اور یعقوب نے خاؤ کو مفتوح اور لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی یہ جو نصیحت (ذرا دل) لے کر آپ ہمارے پاس آئے ہیں یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ اور ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے ”وَتَخْلُقُونَ الْفُلْكَ“ تم خود جھوٹ گھڑتے ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہمیں بھی پہلے لوگوں کی طرح ہی پیدا کیا گیا ہے۔ ہم زندگی گزاریں گے اور پھر انہی کی مثل مر جائیں گے نہ کوئی دوبارہ آئے گا اور نہ ہی حساب و کتاب ہے۔

نافع، ابن عامر، عاصم، حمزہ اور ابن کثیر نے خاؤ اور لام دونوں کو ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے یہ جو نصیحت آپ ہمارے پاس لائے ہیں یہ پہلے لوگوں کی عادت تھی۔ وہ بھی اس کی مثل جھوٹ بولتے رہتے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس دین اور عادات کو ہم اپناتے ہوئے ہیں وہ پہلے لوگوں کا وطیرہ اور ان کی عادت ہے اور ہم ان کی اقتدا کرنے والے ہیں۔ یا پھر موت و حیات کے بارے میں جس نظریہ پر ہم ہیں وہ ایک پرانی عادت ہے جس پر لوگ ہمیشہ رہے۔

وَمَا تَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ﴿٦٢﴾

”آپ گنہ گریں) ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔“

۱۔ جس طریقہ پر ہم ہیں اس کے سبب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٦٣﴾

”پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا اس لیے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور

نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۔“

۱۔ فَكَذَّبُوهُ پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا یہ قول باری تعالیٰ ”إِنْ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ“ کی بعض تاویلات کی بناء پر تاکید و تفریہ ہے۔

۱۔ تو ہم نے انہیں ان کے جھٹلانے کے سبب تند و تیز ہوا سے ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔
 ۲۔ وَصَاكَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر ان میں سے اکثر یا نصف ایمان لے آتے تو انہیں عذاب کے ساتھ نہ پکڑا جاتا۔ بے شک قریش بھی اس قسم کے عذاب سے ان لوگوں کی برکت سے محفوظ رہے جو ان میں سے ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَوْلَا رَحْمَةُ رَبِّكَ لَأَكْثَرُهُمْ فَسَاقٍ مُّذْمُومٌ اَلِیٰ قَوْلِهِ لَعَلَّآ يَتُوبُ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلَيْسَ اَکْرَمَ لِمَنْ مَّرَدُوْرٍ مَّوْسٰی عَوْرَتِيْنَ نَدَّ عَنْهُمْ تَوْبَتِيْ تُوْمَ اَنۡ كَا فَرُوْا كُوْرًا نَّكَ عَذَابٍ دٰیۡتٍ۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهٗوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰﴾

”اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ اور بلاشبہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

كَذٰبَتۡهُمُوْا اَلْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۱﴾

”جھٹلایا قوم ثمود نے رسولوں کو“

اِذۡ قَالۡ لَّهُمْ اٰخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲﴾

”جب کہا انہیں ان کے بھائی صالح نے کیا تم (قہر الہی سے) نہیں ڈرتے“

اِنِّیۡ نُّكَلِّمُ رَسُوْلًا اَمِيْنًا ﴿۱۳﴾

”میں تمہارے لیے رسول امین ہوں“

فَاَتَّقُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوْنَ ﴿۱۴﴾

”سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو“

وَمَا اَسْأَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنۡ اَجْرِیۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۵﴾

”اور میں نہیں طلب کرتا اس پر تم سے کوئی معاوضہ میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔“

۱۔ اِن اَجْرِی میں نافع، امان عامر، ابوعمر اور حفص سے براء کے فخر کے ساتھ اور باقیوں نے براء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَکْثَرُکُوْنَ فِیۡ مَا هُمْ اَمٰیۡنٌ ﴿۱۶﴾

”کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش و طرب) میں۔ جس میں تم یہاں ہو امن سے۔“

۱۔ اس میں ان نعمتوں پر انہیں باقی رکھنے کا انکار ہے جو انہیں دنیا میں عطا کی گئی ہیں یا ان نعمتوں کی یاد دلانا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسباب محکم میں سے انہیں عطا کیے تھے۔

۲۔ کہ تمہیں عذاب کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ پھر ماہنہا کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی۔

فِیۡ جَنَّتٍ وَ عٰیۡوُنَ ﴿۱۷﴾

”ان باغات میں اور چشموں میں۔“

۱۔ یہ اپنے معطوفات سمیت ماہِ ہِنَا کے قول سے بدل ہے۔

وَرُسُودٌ وَنَحْلٌ طَلَعَهَا هَضِيمٌ ۝

”اور (شاداب) کھیتوں میں اور کھجور کے درختوں میں جن کے شگوفے ۱۔ بڑے نرم و نازک ہیں ۲۔“

۱۔ طَلَعَهَا سے مراد ان کا پھل ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی لطیف اور نرم و نازک ہوتا ہے۔ اسی سے ہضم الکشح ہے (پہلو کا نرم ہونا) جب کہ وہ نرم ہو۔ عطیہ نے آپ سے یہ روایت کی ہے کہ اس کا معنی ہے نفع دینے والا پکا ہوا۔ مگر مرے نے کہا کہ اس سے مراد نرم و ملائم ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ”الرخو“ (خوشگوار ہونا) اور مجاہد نے کہا ہے کہ جب خوشیہ کھجور خشک ہو جائے اور وہ ٹوٹ سکتا ہو اور چبایا جاسکتا ہو۔ یعنی جب تک تر رہے تو وہ ہضم ہے۔ اور جب خشک ہو جائے وہ ہضم نہیں ہے۔ (1)

شناک اور متاعاں نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے بعض کا بعض سے ملا ہونا یعنی بہت زیادہ ہوگا۔ اہل لغت نے کہا ہے ایسا گچھا جو ظاہر ہونے سے پہلے اندر ہی اندر لایں کا بعض بعض سے ملا ہوا ہے۔ ازہری نے کہا ہے وہ جس کا بعض بعض میں داخل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہضم بمعنی حاشم ہے جو کھانے کو حاشم کرتا ہے۔ لطافت کا مفہوم ان تمام معانی میں پایا جاتا ہے۔ (2)

وَتَنَجُّونَ مِنَ الْجِبَالِ بِيُوتَا فَرِهَيْنِ ۝

”اور تراشتے رہو گے پہاڑوں میں گھرا (ماہر) سنگتراشی بنے ہوئے ۲۔“

۱۔ اس کا عطف (مبین) کے قول پر ہے۔ کیونکہ وہ فعل کے معنی کو مختصم ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے فالق الإصباح وَجَعَلَ الْبَيْتَ اور تقدیر کلام یہ ہے۔ ”تَمْنُنُونَ وَتَنَجُّونَ“ یا یہ (مبین کی ضمیر سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَانْتُمْ تَنَجُّونَ“

۲۔ تانف، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فَرِهَيْنِ پڑھا ہے۔ اور یہ زیادہ مبلغ ہے۔ کیونکہ یہ صفت مشبہ ہے جو دو ام پر دلالت کرتی ہے۔ اور باقیوں نے فَاْرِهَيْنِ پڑھا ہے۔ یعنی سنگتراشی میں مہارت کا اظہار کرتے ہوئے۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے فِرَّةُ الرَّجُلِ فِرَّةٌ فَهُوَ فَارِدٌ مگر مرے نے کہا اس کا معنی ہے ”فَاعَجِبِينَ“ عمدہ اور خوبصورت بنانے والے۔ قتادہ نے کہا تم اپنی کارگیری سے تعجب میں ڈال دینے والے ہو۔ سدی نے کہا ”مفحورین“ حیرت میں ڈال دینے والے۔ انفس نے کہا خوش کرنے والے اور عرب حاء اور ہاء کو ایک دوسرے کی جگہ لاتے رہتے ہیں مثلاً مدحستہ اور مدھستہ اور کہا اس کا معنی شہرِ ہین بہت زیادہ حرم رکھنے والے۔ الشرہ کا معنی ہے غلبۃ الحرص بہت زیادہ حرص ہونا۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے تکبر اور غرور کے ساتھ ناز سے چلنے والے کیونکہ وہ نعمتوں کے سبب سرکش ہو چکے تھے اور تکبر کے سبب حق کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (3)

فَاتَّبِعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝

”پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اتباع کرو“

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝

”اور نہ بیرونی کړوحد سے بڑھنے والوں کے حکم کی ل۔“

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مسرفین سے مراد شرکین ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد وہ نوافراد ہیں جنہوں نے ناتقہ (اوثقی) کی کوئی بھی کاٹ ڈالی تھیں۔ (1)

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَمْوَاسِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٥٠﴾

”جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں ل اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے ج۔“

۱۔ اور تم ان کی بیرونی نہ کرو جو معاصی کے سبب زمین میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ اور وہ اس امر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿٥١﴾

”جواب ملا۔ (اے صالح!) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے ج۔“

۱۔ قوم شعو نے کہا۔

۲۔ بے شک تم پر جادو کر دیا گیا ہے اور تم ہمیں ہمیں باتیں کر رہے ہو۔ اسی طرح مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے۔ کبھی نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ سحرین سے مراد وہ جھوٹے جادوگر ہیں جو بار بار کھلایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ”سُحْرُهُ أَيْ غَلَّه بِالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔“ اس نے اسے بار بار کھلایا جاتا ہے۔ یعنی بے شک تم کھاتے پیتے ہو اور فرشتے نہیں ہو۔ (2)

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا قَاتِ بِأَيِّ قَوْمٍ أَنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥٢﴾

”نہیں ہو تم مگر ایک انسان ہماری مانند ل ورنہ لاؤ کوئی مجھ ج۔ اگر تم راست باتوں میں سے ہو ج۔“

۱۔ آپ تو ہماری طرح ہی انسان ہیں۔ لہذا تم بھی نہیں ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ آپ تو ذوق ہیں، یعنی آپ کے پاس تو نعمتوں کی فراوانی ہے اور یہ انسان کا خاصہ ہے۔ لہذا اس معنی کے اعتبار سے مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اس کی تاکید کے لیے ہے۔

۲۔ اپنے قول کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل لاؤ۔

۳۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس وقت اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کی دعا سے چٹان سے اوثقی پیدا فرمادی۔ کیونکہ انہوں نے آپ کی صداقت پر مجھ سے کام لیا کیا تھا۔

قَالَ هَذِهِ نَاقَةُ لَهَا شَرْبٌ وَلَكُمْ شَرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ ﴿٥٣﴾

”فرمایا ل۔ یہ ایک اوثقی ہے ج۔ ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے ج اور ایک مقرر دن تمہاری باری ہے ج۔“

۱۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا یہ اوثقی

۲۔ میری سچائی کی دلیل ہے۔

سے پانی میں اس ناکہ کا حصہ ہے (یعنی ایک دن یہ پانی پیئے گی)۔ ترکیب میں لہذا شُرُوب، ناقص کی صفت ہے۔
 ج (اور ایک مقررہ دن تمہارے پینے کی باری ہے) پس تم اپنی باری پر اکتفاء کرو اور اس کی باری میں تم مزاحم نہ ہو۔ اور یہ جملہ لہذا
 شُرُوب کی ضمیر مشکل سے حال ہے۔ پس اونٹنی اپنی باری کے دن تمام پانی پی جاتی تھی۔ اور وہ اپنی باری کے دن نہیں پی سکتے تھے۔ اور
 یہ مہایہ کے جواز پر دلیل ہے۔ (مہایہ کا معنی ہوتا ہے اپنے اپنے حصے سے نفع اٹھانا)۔

وَلَا تَسْهَوْا سُبُوتَ قِيَامِ حَدِّكُمْ عَذَابِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٦﴾

”اور نہ چھٹانا اسے کوئی اذیت نہ دینا آگے گا تمہیں بڑے دن کا عذاب ملے۔“

لے اور تم اسے مارنے اور کوئی بھی کاٹنے کے سبب اذیت نہ پہنچانا۔ اس جملے کا عطف ”هَذِهِ نَاقَةٌ“ پر ہے۔
 لے ورنہ تمہیں بڑے دن کا عذاب آ لے گا۔ یعنی وہ دن جس کا عذاب بہت بڑا ہوگا۔ اور یہ عبارت تعظیم العذاب سے زیادہ بلند ہے۔
 کیونکہ وقت جب اس کے سبب سے عظیم ہے تو پھر واقعہ اس کی عظمت بہت شدید ہوگی۔

فَعَقِّرْ وَهَاقًا صَبْحُوا لِيَوْمِئِذٍ ﴿٥٧﴾

”ان (بد بختوں) نے اس کی کوئی بھی کاٹ ڈالیں لے پھر ہو گئے ندامت (و افسوس) کرنے والے لے۔“

لے فَعَقِّرْ وَهَاقًا کا عطف فَاذِیٰ پر ہے۔ کوئی بھی کاٹنے کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ عمل تو بعض نے کیا تھا تو اس کی وجہ یہ
 ہے کہ ان بعض نے یہ عمل ان تمام کے مشورے اور رضامندی سے کیا تھا۔ اسی لیے وہ تمام کے تمام عذاب میں گرفتار ہوئے۔
 لے تو پھر وہ ناکہ کی کوئی بھی کاٹنے پر افسوس کرنے لگے لیکن ان کا یہ افسوس عذاب نازل ہونے کے خوف سے تھا نہ کہ توبہ کے سبب سے یا
 وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے کئے پر نادم ہوئے تو اس وقت اس ندامت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔

فَاَحْذَرُهمُ الْعَذَابَ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

”پس آگیا انہیں عذاب نے بے شک اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان
 لانے والے لے۔“

لے تو وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس نے انہیں آگیا۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٩﴾

”اور بے شک آپ کا رب ہی عزیز رحیم ہے۔“

كَذٰبَتْ قَوْمٌ مَّرْهُوْطِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦٠﴾

”جھٹلایا تو م لوط نے اپنے رسولوں کو۔“

اِذْ قَالَ لَهُمْ اٰخُوْهُمْ لَوْ لَوْ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦١﴾ اِنِّیْۤ اَنْتُمْ رَّسُوْلُ اٰمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

وَاطِيعُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَمَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیْۤ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿٦٤﴾

جب کہا ان سے ان کے بھائی لوط نے کیا تم (قہر الہی سے) نہیں ڈرتے۔ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

پس ذر اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس (تخلیف) پر کوئی اجر میرا جو تم اس کے ذمے ہے جو رب العالمین ہے۔“

۱۔ اِنْ اَجَبِيْ كَوْنِيْ، اَبُو عَمْرٍو، ابْن عامر اور حفص نے یا مفتوح کے ساتھ اور بقیہ نے اسے یا، یا سکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الدُّكْرَانَ مِنَ الْعُلَمَاءِ ۝۱۵

”کیا تم بدفعی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے۔“

۱۔ اَتَاْتُوْنَ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَلَا تَنْظُرُوْنَ کا بیان یا اس سے بدل ہے۔ یعنی کیا تم مخلوق میں سے اپنے سوا دوسرے مردوں کے پاس جاتے ہو تا کہ تم ان سے بدفعی کرو۔ حالانکہ تمہارے سوا دوسری مخلوق اس عمل بد میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا تم ہی مخلوق میں سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جماع کے لیے جاتے ہو اس کے باوجود کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مردوں کی تعداد کثیر ہے اور عورتیں بھی ان میں کثرت سے ہیں۔ پہلی تفسیر کے مطابق عالمین سے مراد ہر وہی کرنے والی مخلوق ہے اور دوسری کے مطابق اس سے مراد لوگ ہیں۔

وَسَكْرٰوْنَ مَخْلُوْقٍ لَّكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ طَبْلٌ اَنْتُمْ قَوِّهٌ عُدُوْنَ ۝۱۶

”اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لیے تمہارے رب نے لے تمہاری بیویاں ۱۔ بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔“

۱۔ اور تم انہیں چھوڑ دیتے ہو جنہیں تمہارے رب نے تمہارے استطاع (اللف اندوز ہونے) کے لیے پیدا کیا ہے۔
۲۔ اگر قبیلہ اَزْوَاجُکُمْ سے مراد جنس عورت لی جائے تو پھر مین بیانہ ہے۔ اور اگر اس سے مراد عورتوں کا عضو مباح لیا جائے تو پھر مین بعضیت کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ اسی طرح کرتے تھے جیسے روافض کرتے ہیں۔ اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ بیویوں اور لونڈیوں کی دبدبوں میں وہی کرنا حرام ہے۔

۳۔ بلکہ تم تو شہوت کو پورا کرنے کے لیے حلال کی حد سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہو اور تم فحشاء شہوت میں تمام لوگوں سے بلکہ حیوانوں سے بھی بڑھ گئے ہو۔ یا معنی ہے۔ تم معاصی میں افراط کرنے والے ہو۔ (یعنی بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہو) اور یہ فعل مین جملہ انہی میں سے ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس کے مستحق ہو کہ تمہیں عدوان کی صفت سے متصف کیا جائے کیونکہ تم اس کہنے اور فعل بدکار نکاب کرتے ہو۔

قَالُوا لَیْسَ لَکُمْ تَنْتَعِلُوْا لَیْسَ لَکُمْ تَنْتَعِلُوْنَ ۝۱۷

”وہ (غصے سے) کہنے لگے (خاموش!) اے لوٹ اے لوٹ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا۔“

۱۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔

۲۔ اے لوٹ! اگر تم اس سے باز نہ آئے جس کی تم دعوت دیتے ہو یا اس سے کہ ہمارے فعل کے قبیح ہونے کے سبب ہمیں روکتے ہو۔
۳۔ تو تمہیں ضرور ہمارے گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔

قَالَ اِنِّي لَعَلَّكُمْ مِنَ الْفَالِئِينَ ۝

”آپ نے فرمایا (سن لو) میں تمہارے اس (گندے) فضل سے بیزار ہوں۔“

آپ نے فرمایا بے شک میں تمہارے فضل بد سے بیزار ہونے والوں میں سے ہوں۔ پس مجھے اتنی نفرت ہے کہ نکال دیئے جانے کی کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ قول اس قول کی نسبت زیادہ تلخ ہے ”اِنِّي لَعَلَّكُمْ فَالِئٌ“ کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بے شک آپ کا شمار ان کے گروہ میں ہے اور یہ مشہور ہے کہ آپ من جملہ ان میں سے ہیں۔ اسی طرح ”هَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ تَعْلُوْنَ“ کی نسبت زیادہ تلخ ہے۔

پھر جب لوط علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ ان کی دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں تو آپ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ آپ کو ان کی مصاحبت سے نجات دے اور انہیں اس عذاب سے عافیت عطا فرمائے جو انہیں لاحق ہوگا۔ تو آپ نے عرض کی۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَاهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

”میرے مالک! نجات دے مجھے اور میرے اہل و عیال کو اس (کی شامت) سے جو وہ کرتے ہیں۔“

ان کے عمل کی شامت اور اس کے عذاب سے۔

فَجِيْنِيْهُ وَاَهْلَكَ اَجْمَعِيْنَ ۝

”سو ہم نے نجات دے دی اسے اور اس کے سب اہل کو۔“

اس کا عطف قال پر ہے جو ”رَبِّ نَجِّنِيْ“ کے قول سے پہلے مقدر ہے۔

یعنی آپ کے اہل بیت کو اور دین میں آپ کی اتباع کرنے والوں کو اس طرح نجات دی کہ انہیں ان کے درمیان سے نکال دیا اور آپ کے بعد ان پر عذاب مسلط کر دیا۔

اِلَّا عَجُوْا فِي الْغَدِيْرِ ۝

”سو اسے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی۔“

لیکن عذاب اور ہلاکت کے دوران باقی رہنے والوں میں ایک بڑھیا تھی اسے راستے میں ایک پتھر لگا تو اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنی قوم کی طرف مائل تھی اور ان کے فضل پر راضی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بڑھیا ان میں سے تھی جو شہر میں باقی رہ گئے اور وہ لوط علیہ السلام کے ساتھ نہ نکلے۔

هُمْ دَمَرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝

”پھر ہم نے تمام نشان مٹا دیے دوسروں کا۔“

لیکن پھر ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۝ فَاَسَاءَ مَطَرُ النَّاسِ ۝

”اور ہم نے برساتی ان پر (پتھروں کی) بارش۔ پس بڑی تباہ کن تھی وہ بارش جو برسی ان پر جنہیں ڈرایا گیا۔“

۱۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ ان پر گندھک اور آگ برسی۔ (1)

۲۔ اس میں لام محض کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ مضاف الیہ کائنات کا قائل بننا صحیح ہے۔ اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اور وہ مطر ہم ہے۔

إِنِّي فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥٠﴾

”(اور وہ باز نہ آئے) بے شک اس میں (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے“

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٥١﴾

”اور بلاشبہ (اے محبوب) آپ کا پروردگار ہی عزیز رحیم ہے“

كَذَّبَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ النَّبِيُّ سَلِيمٌ ﴿٥٢﴾

”جھٹلایا اہل ایکہ نے بھی (اپنے) رسولوں کو“

۱۔ ابو عمرو، عاصم، ہمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورہ ص میں الانبیاء کو ہمزہ، لام ساکن اور تاہ مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔ حرمان (ابو جعفر اور ابو جعفر) اور ابن عامر نے لیکھتہ لام اور تاہ کے فتح کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور یہ شہر کا نام ہے غیر منصرف ہے۔ سورہ حمزہ اور ق میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں گروہوں نے لام ساکن اور تاہ مکسور کے ساتھ ہمزہ پڑھا ہے۔ مگردش وہاں ہمزہ کی حرکت قانون کے مطابق لام کو دیتے ہیں۔ اور الایکہ سے مراد مجھے درختوں کا جنگل ہے۔ مدین کے قریب یہ جنگل تھا جہاں لوگوں کا ایک گروہ رہائش پذیر تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جیسا کہ انہیں مدین کی طرف بھیجا تھا۔ چونکہ شعیب علیہ السلام اہل مدین میں سے تھے، اصحاب الایکہ میں سے نہیں تھے۔ اسی لیے رب کریم نے یہاں یہ ارشاد فرمایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿٥٣﴾

”جب فرمایا انہیں شعیب (علیہ السلام) نے کیا لے تم (تہرا لہی) سے نہیں ڈرتے“

۱۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَخُوهُمْ شُعَيْبٌ نہیں فرمایا۔ جبکہ مدین کے ذکر میں أَخُوهُمْ شُعَيْبٌ فرمایا کیونکہ یہ سب ان ہی میں سے تھے۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا أَمْرًا ۖ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ

أَجْرٍ ۚ إِنَّا عَلَىٰ رَأْيِ الْعَالَمِينَ ﴿٥٥﴾

”بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔ پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو۔ اور میں نہیں طلب کرتا تم

سے اس پر کوئی اجر میرا جزو اس کے ذمہ ہے جو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے۔“

۱۔ نافع، ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے یاہ کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ إِلَّا عَلَىٰ رَأْيِ الْعَالَمِينَ یہ ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ وہ تمام کے تمام تقویٰ اور اطاعت کا حکم دینے، عبادت میں اخلاص اختیار کرنے اور رسالت کی دعوت و تبلیغ پر اجرت کا مطالبہ نہ کرنے پر مشفق تھے۔ اسی وجہ سے رب کریم نے ارشاد فرمایا إِنْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كُنُوزًا أَوْ حِينًا إِلَىٰ لُؤْلُؤٍ وَالدُّرِّهِمْ وَمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ إِلَّا مَا كُنْتَ تَدْعُ ۚ أُولَٰئِكَ يَكْفُرُونَ ﴿٥٦﴾ اور مزید فرمایا ”أَفَتَدْعُونَ إِلَيْنَا إِنْ كُنَّا إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ“

تَعَزَّزُوا فِيهِ

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْبُخْسِينَ ﴿٧٦﴾

”اور پورا کیا کرو تاپ ۱ اور نہ ہو جائے کم پانے والوں سے ۲۔“

۱ یعنی تم اپنا تاپ مکمل کرو۔ یہ جملہ اپنے معظوفات سمیت تقویٰ کا بیان ہے۔

۲ اور تاپ میں کمی کرنے کے سبب لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچانے والے نہ ہو جاؤ۔

وَزِنُوا بِالْقِسْطِ أَيْسَرَ الْمِيزَانِ ﴿٧٧﴾

”اور وزن کیا کرو ۱ صحیح ترازو سے ۲۔“

۱ وَزِنُوا بِالْقِسْطِ ترازو اور کسائی نے قاف کے کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور قِسْطُاس سے مراد میزان ہے۔ اگر یہ عربی ہو تو پیش نقطہ سے ہستی عدل ہوگا تو فعلارع کے وزن پر ہوگا، یعنی اس میں عین کلمہ مکرر ہوگا۔ بصورت دیگر یہ فعلان کے وزن پر ابواب رباعی سے ہوگا۔

۲ القِسْطِ اس سے مراد ایسا صحیح ترازو ہے جس میں کمی نہ ہو۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْمُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٨﴾

”اور نہ کم دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں ۱، اور نہ پھرا کرو زمین میں ۲ فساد پر کرتے ہوئے ۳۔“

۱ اور تم لوگوں کے حقوق میں سے کوئی شے بھی کم نہ کرو۔

۲ اور فساد پر پا نہ کرو زمین میں۔ قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور مال چھینے وغیرہ کے ذریعے۔

۳ پس جس سے فساد کی کوئی نوع اصلاح کی نیت سے صادر ہوئی مثلاً کسی نے کافر کو نشانہ بنایا (جبکہ وہ مسلمان قیدی کو بطور ڈھال سامنے کھڑا کیے ہوئے ہو) تو جب اس نے کافر کی نیت سے تیر پھینکا اور وہ مسلمان قیدی کو جا کر لگا۔ تو گویا اس نے تو اس کا ارادہ نہیں کیا (اس لیے وہ مفسد نہیں ہوگا)۔ اور وہ آدمی جس سے خطا بغیر قصد کے فساد پر پا ہو گیا، تو وہ بھی مفسد نہیں ہوگا۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِوْثَةَ الْأُولَىٰ ﴿٧٩﴾

”اور ڈرو اس سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور (تم سے) پہلی مخلوق کو ۱۔“

۱ یعنی وہ لوگ جو مخلوق میں سے ان سے پہلے پیدا ہوئے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿٨٠﴾

”انہوں نے (جھلا کر کہا) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے“

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِنْ نَطَّقُكَ لَكُنَ الْكَذِبِيُّ ﴿٨١﴾

”اور نہیں ہو تم مگر ایک بشر ہماری مانند ۱ اور ہم تو تمہارے متعلق یہ خیال کر رہے ہیں ۲ کہ تم تو جھوٹوں میں سے ہو س ۳۔“

۱ میں وادعا ظنفہ کیونکہ یہ دو باہم متضاد وصفوں کو جمع کرنے کے لیے ہے اور آپ کی تکذیب میں مباہلے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بھی جائز

ہے کہ یہ با قبل کلام سے حال ہو۔

۲ اور ہم تو تمہارے بارے میں یہ خیال کر رہے ہیں

تہ کہ تم اپنے دعویٰ میں بھولے ہو۔

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٨٧﴾

”(ہم تمہاری بات نہیں مانتے) لو اب گرد و ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر تم راست بازوں میں سے ہو۔“

۱۔ حفص نے یہاں اور سورہ سباء میں کسفا میں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور اس کا معنی ہے قطعہ ٹکڑا۔

قَالَ رَبِّيَ اعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨٨﴾

”آپ نے فرمایا! میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۔“

۱۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا
۲۔ کیل اور وزن کو کم کرنے اور ان جیسے دیگر اعمال جو تم کر رہے ہو، میرا رب انہیں خوب جانتا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو ہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ عذاب الائمیرے اختیار میں نہیں بلکہ میرے ذمہ تو صرف دعوت حق دینا ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلُمَةِ ﴿٨٩﴾ إِنَّهُ كَانَ عَذَابٌ يُّورِثُهُمْ

”سو انہوں نے جھٹلایا شعیب کو تو پکڑ لیا انہیں پھتری والے دن کے عذاب نے۔ بے شک یہ بڑے دن کا عذاب تھا۔“

۱۔ اسے یوم الظلمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ بے شک شدید گرمی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ تین خانوں میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن جب وہ ان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان کو اور سخت گرم پایا تو پھر بادل نے ان پر سایہ کر دیا۔ اور یہی وہ سایہ تھا جہاں وہ جمع ہو گئے۔ تو ان پر آگ برساتی گئی جس کے سبب وہ جل کر راکھ ہو گئے۔ سورہ ہود میں یہ قصہ مذکور ہے۔

إِنِّي لَآتِيكَ لِبَآئِيَةٍ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٠﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٩١﴾

”بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نکتائی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۔ اور یقیناً آپ کا

رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ یہ ان سات واقعات میں سے آخری واقعہ تھا جنہیں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور آپ کے منکرین کو ڈرانے کے لیے انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَنزِيلُ رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٩٢﴾

”اور بلاشبہ یہ کتاب! رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے۔“

۱۔ اور بے شک قرآن کریم

۲۔ تنزیل مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی قرآن کریم رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے۔ تِلْكَ

ایث الکُتُبِ الْوُحُیِّ

نَزَلَ بِوَالرُّوْحِ الْاَمِیْنِ ﴿۱﴾

”اِتر اِچا سَے لے کر روح الامین (یعنی جبرائیل علیہ السلام) ۱۔“

۱۔ یہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدّر ہے۔ یا یہ سابقہ کلام کے لیے تاکید ہے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے جانے کی علت ہے۔ اہل جواز، ابو عمر اور حفص نے نَزَلَ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ یعنی روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) قرآن لے کر نازل ہوئے۔ اور وہی انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی لانے کے امین ہیں۔ ابن عامر، ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے زاء کو مشدّد پڑھا ہے اور الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین کو قرآن کے ساتھ اتارا۔

عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ السُّدْرِ بَیِّنٍ ﴿۲﴾

”آپ کے قلب (منبر) پر ۱ تاکہ میں جاؤں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے ۲۔“

۱۔ اے محمد ﷺ! آپ کے دل پر، یہاں تک کہ آپ نے اسے یاد کر لیا۔ قلب سے مراد صنوبر کے پھل کی مثل مخروطی شکل کا دل ہے۔ اس سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ امکانیہ نہیں جس کی اصل عرش سے اوپر ہے اور اس کا (پرتو) ظہور قلب صنوبری میں ہے۔ کیونکہ وہ عالم امر میں سے ہے اور وہ وحی اور نبوت کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اسے اٹھانے والا وہ قلب صنوبری ہے جو عصارہ اور نقش کا جامع ہے اور وہ عالم امر کا پرتو ہے۔ اسی وجہ سے وحی کا نزول بدن کے مکمل ہونے اور مضبوط و توانا ہونے پر ہوتا ہے۔ یہ عمل عموماً چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

۲۔ تاکہ آپ ایسے کاموں سے ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں جن کا کرنا یا چھوڑنا عذاب تک پہنچا دیتا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿۳﴾

”یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے ۱۔“

۱۔ یہ ایسی عربی زبان میں ہے جس کے معانی بالکل واضح ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا یعنی قریش کی زبان پر، تاکہ ان کے لیے یہ عذرباقی نہ رہے کہ جو کچھ ہماری طرف وحی کیا گیا ہے ہم تو اسے سمجھ ہی نہیں۔ یہ نَوَّلٰی یا منذرین کے متعلق ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عربی زبان میں قرآن لے کر آپ کے قلب پر نازل ہوئے۔ اگر وہ غیر عربی ہوتا تو پھر آپ کے کانوں پر نازل ہوتا نہ کہ دل پر، کیونکہ اس وقت آپ ایسی آواز سنتے تو آپ اس کے معنی کو نہ سمجھ سکتے۔ کبھی آدمی متعدد زبانوں کو جانتا ہوتا ہے جب کوئی اس سے اس زبان میں گفتگو کرے جو اس کی مادری زبان ہے تو فوراً سنتے ہی اس کا دل کلام کے معانی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسری زبان میں اس سے گفتگو کرے تو دل پہلے اس کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر اس کے معانی کی طرف۔ پس بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ، نَوَّلٰی غلٹی قَلْبِكَ کی تقریر ہے۔ (۱)

وَ اِنَّهُ لَغَفِيْرٌ ذُوْ الْاَلْوَانِ ﴿۴﴾

۱۔ غیر بنوی ذراعت ہذا

”اور اس کا (ذکر خیر) پہلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے۔“

۱۔ ائمہ کفر مفسرین نے کہا ہے کہ ضمیر سے مراد قرآن کریم کو نازل کرنے کا ذکر ہے۔ مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

۲۔ اس سے مراد پہلے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ دوسری تاویل کی بناء پر بعض حنفیہ نے کہا ہے کہ قرآن صرف معانی کا نام ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اپنے ان عربی الفاظ کے ساتھ سابقہ کتابوں میں قطعاً نہیں تھا۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے دوران غیر عربی زبان میں قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ قول مردود ہے۔ بلکہ قرآن الفاظ اور معانی کا مجموعہ کا نام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”قرآنا عربیاً“ تو اس میں عربی الفاظ کی صفت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید (جائز گردینے والا) ہے اور یہ اعجاز الفاظ کے خواص میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی آدمی کے لیے غیر عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھنا جائز ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے جائز ہونے کے لیے غیر عربی زبان میں قرأت کو اس لیے جائز قرار دیا ہے کہ آپ نے خضوع و خشوع کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں الفاظ کو ایسا کرنا قرار دیا ہے جو لازم نہیں۔ تحقیق امام اعظم ابوحنیفہؒ نے پھر اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اور غیر عربی زبان میں قرأت جائز نہ ہونے کا قول کیا۔ جیسا کہ صاحبین اور اکثر ائمہ نے کہا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ أَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ

”کیا نہیں تھی ان (مشرکین) کے لیے آپ کی چٹائی کی یہ دلیل کہ جانتے ہیں آپ کو بنی اسرائیل کے علماء سے۔“

۱۔ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور اواد محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ”أَلَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ عَلَى رُسُلِهِ“ ابن عامر نے اسے تاء کے ساتھ اَوَلَمْ يَكُنْ پڑھا ہے۔ اور آیت کو مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ کان کا اسم ہے اور لہم اس کی خبر ہے۔ اور اَنْ يَعْلَمَهُ آیت سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَمْ يَكُنْ تامة ہو، آیت اس کا قائل ہو اور لہم اس سے حال ہو۔ اور اَنْ يَعْلَمَهُ فاعل سے بدل ہو یا مبتدا محذوف کی خبر ہو یا پھر لَمْ يَكُنْ میں ضمیر قصہ ہو، اَنْ يَعْلَمَهُ مبتدا ہو، آیت اس کی خبر مقدم ہو اور لہم آیت سے حال ہو۔ اور عامل ثابت شہ فعل ہو جو اس محل سے مستفاد ہوتا ہے۔ اور پھر مکمل جملہ کان کی خبر ہو۔ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ لَمْ یکن پڑھا ہے۔ اور آیت کو خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور اس کا اسم اَنْ يَعْلَمَهُ ہے۔ اور لہم آیت سے حال ہے۔

۲۔ یعنی محمد ﷺ کو ان اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو توریت میں مذکور ہیں جیسا کہ وہ اپنے نبیوں کو پہچانتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کے بارے جانتے ہیں کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

۳۔ عطیہ نے کہا ہے کہ وہ پانچ علماء تھے عبد اللہ بن سلام، ابن یاسین، اعلیہ، اسد اور اسید۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل مکہ نے یہود و مدینہ کی طرف قاصد بھیجا اور ان سے حضور نبی رحمت ﷺ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا بے شک یہ آپ نبی کا زمانہ ہے اور تم تو رات میں آپ کی مدح و ستائش اور اوصاف کو پاتے ہیں۔ (۱)

وَلَوْ تَرَكْنَا عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْيَيْنِ ۖ ﴿٥٨﴾

”اور اگر ہم اتار دے قرآن کو لے کسی غیر عربی پر۔“

۱۔ اور اگر ہم اتار دے قرآن۔

۱۔ اَلْأَعْيُنُ ناگہم کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد وہ آدمی ہے جس کی زبان فصیح نہ ہو اور عربی زبان اچھی طرح نہ بول سکا ہو اگرچہ وہ نسبا عربی ہو۔ اور اگر وہ ہوتا ہے جو ناگہم کی طرف منسوب ہو اگرچہ وہ عربی زبان جاننے اور بولنے میں فصیح و بلیغ ہو۔ آیت کا معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم ایسے آدمی پر اتار دے جو عربی زبان میں فصیح و بلیغ نہ ہوتا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ اَعْيُنُ کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع سالم بنائی گئی ہے۔ یعنی اگر یہ ناگہم کی جمع ہوتی تو پھر اس کی جمع سالم جائز نہ ہوتی۔ کیونکہ اس کی مؤنث عجماء آتی ہے اور افضل فحشاء کی جمع سالم نہیں بنائی جاسکتی۔ اسی طرح اشعرون اشعری حقفہ کی جمع ہے اصل میں اشعریون ہے۔ اور معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم عربی زبان میں جیسا کہ وہ ہے کسی غیر عربی پر نازل کرتے اس کے اعجاز میں زیادتی کرتے ہوئے یا پھر غیر عربی زبان میں نازل کرتے۔

فَقَرَأْهُ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ۖ ﴿٥٩﴾

”پھر وہ ان کو پڑھ کر سنا تا کہ جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔“

۱۔ اور وہ غیر عربی اسے پڑھتا تھا اے مکہ پر

۱۔ تو یہ ان کے عناد اور تکبر میں اور اضافہ کر دیتا اور وہ اس غیر عربی کی بھڑکی کرنے سے انکار کر دیتے۔ یا وہ نہ سمجھنے کے سبب کہہ دیتے جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُضِّلَتْ إِلَيْنَا

كُنْ لَكَ سَلَكَنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۖ ﴿٦٠﴾

”یونہی لے ہم نے داخل کر دی ہے ۱۔ انکار کی عادت مجرموں کے دلوں میں ہے۔“

۱۔ یہ محل نصب میں ہے۔ اس فعل مضمر کے سبب جس کی تفسیر اس کا مابعد فعل کر رہا ہے۔

۱۔ اس کی ضمیر اس شرک اور کفر کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر اس قول سے دلالت ہوتی ہے۔ ”مَا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ“ حضرت ابن عباس، حسن اور حبابہؓ نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی ہم نے شرک اور کفر کو داخل کر دیا ہے۔ (۱)

۱۔ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ اس آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شرک بھی اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی ہم نے قرآن ان کے دلوں میں داخل کر دیا، پس انہوں نے اس کے معانی اور اعجاز کو پہچان لیا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عناد کے سبب اس کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۖ ﴿٦١﴾

”وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پر لے جب تک دیکھ نہ لیں دردناک عذاب کو۔“

۱۔ وہ قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ”تَكْذِبُكَ سَلَكْنَاهُ“ کا بیان ہے، یا حال ہے یا سابقہ کلام پر دلیل ہے۔ آیت میں

ان کے حال کی خبر دی گئی ہے۔ جن کی موت اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق شرک پر ہوگی۔

۳۔ (یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں) تو وہ ایمان کی طرف پناہ لیں گے اور یہ ایسا موت کے بعد قبور میں ہوگا۔

فَيَأْتِيهِمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٧٦﴾

”سو وہ آئے گا ان پر لے اچانک اور انہیں اس (کی آمد) کا احساس ہی نہ ہوگا۔“

۱۰۔ پس عذاب ان پر آئے گا

۲. اچانک اور نہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوگا۔

فَيَقُولُوا أَهْلُ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ﴿٢٣﴾

”تب (بہد حسرت) کہیں گے! کیا ہمیں مزید مہلت ملے گی؟“

۱۔ تو اس وقت وہ حسرت اور افسوس کے ساتھ کہیں گے۔

۷۔ یہ استفہام تمہنی کے لیے ہے۔ پس لوٹنے اور غور و فکر کرنے کی آرزو کریں گے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے

نبی ﷺ کی زبانی عذاب کی وعید سنائی تو انہوں نے کہا کب تک تم ہمیں اس عذاب سے ڈراتے رہو گے اور وہ عذاب کب

(1) $\mathbb{K} \subseteq \mathbb{T}$

”پھر (یہ عرصہ گزرنے کے بعد) آئے ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا۔ تو کیا نفع دین انہیں (اس وقت)

وہ (ساز و سامان) جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔“

۱۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ دردناک عذاب دیکھیں گے جبکہ وہ ان پر اچانک آجائے گا تو کہیں گے کیا ہمیں مہلت دی جائے گی؟ لیکن انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ اور اگر ہم انہیں مہلت دے دیں تو پھر بھی اگر آپ غور و فکر کریں تو آپ یقین کر لیں گے کہ اگر ہم انہیں کئی سال تک بھی لطف اندوز ہونے دیں۔ پھر ان کے پاس وہ عذاب آجائے جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا تو دنیوی ساز و سامان سے لطف اندوز ہونا اور ان کے لیے طویل مہلت کا ہونا ان سے عذاب کو روکنے اور اسے ہلکا کرنے میں قطعاً مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ ترجیح اس طرح لیا منسیا ہو جائے گا گویا کہ وہ کبھی بھی نعمت اور بخشش میں سے ہی نہیں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿٢٨﴾

”اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس کے لیے ڈرانے والے (بھیجے گئے تھے)۔“

اے اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر ایسی بستی کو

۷۔ جس میں ایسے رسول آئے جنہوں نے اس کے رہنے والوں کو ڈراپا، لیکن وہ باز نہ آئے۔

ذِكْرِي شَوْ مَا كُنَّا ظِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

”یاد دہانی کے لیے۔ اور ہم ظالم نہیں تھے۔“

۱۔ ڈکڑی کا معنی ہے نصیحت کے لیے اور یاد دہانی کے لیے۔ یہ علت یا مصدر ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ یہ انداز کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ مندرہوں کی صفت ہے اور اس سے پہلے دو ماضیہ ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے دو کمری کو مبالغہ بنایا اسے کیونکہ رسولوں نے نصیحت اور یاد دہانی میں خوب کوشش کی۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور محل جر ضمہ ہے۔

وَمَا تَنْزَلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ﴿٢١﴾

”اور نہیں اترے اس قرآن کو لے کر شاپین لے“

لَوْ مَا كُنَّا لَعَلِيَّوْنَۖ اَوْرَوْحًا مَّا كُنَّا بِهٖ الْغَافِقِيْنَۙ اَسْ كَا عَطْفِ نَزْلِ بِهٖ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُۙ پْرَهے۔ یعنی ایسا نہیں جیسا کہ مشرکین نے گمان کیا ہے کہ شاہین محمد ﷺ برقرآن القامہ کرتے ہیں۔

وَمَا يَتَّبِعِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَرْجِعُونَ ﴿٢١١﴾

”اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے۔ اور نہ ہی وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔“

۱۔ اور نہ شیاطین کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ محمد ﷺ پر قرآن اتاریں کیونکہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور شیاطین تو گمراہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

۳۔ اور وہ ایسی غیب کی خبریں القاء کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

اَللّٰهُمَّ عَنِ السَّمْعِ لَمَعَزُ وَلُؤْنٍ ۝

”انہیں (شیطانوں کو) تو اس کے سننے سے بچ بھی محروم کر دیا گیا ہے۔“

۱۔ اِنَّهُمْ بے شک شیاطین۔

۲۔ عین الشُّبْحِ آسمان سے ملائکہ کا کلام سننے سے۔

۳۔ لَعْنَةُ ذُوْنِ رُودِک دینے گئے ہیں انہیں انگارہ نما چھروں کے ذریعے بھگا دیا جاتا ہے۔

فَلَا تَنۡعَمۡ مَعَ اللّٰهِ اِلَّا مَآ اَخَّرَ فَتَكُوْنُ مِنَ الْمَعۡذُوۡبِيْنَ ﴿۱۱﴾

”پس نہ کارا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو اور نہ تو ہو جائے گا ان لوگوں میں سے جنہیں عذاب دیا گیا ہے۔“

۱۔ اس میں اخلاص کو یاد کرنے کے لیے براہِ حقیت کرتا ہے اور تمام مکلفین کے لیے ایک خاص لطف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ دوسرے کو ڈراتے ہوئے کہتا ہے تو میرے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ عزت والا ہے۔ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الہ بنایا تو میں تجھے عذاب میں ڈال دوں گا۔ (۱)

وَاَنْذِرۡ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۱۲﴾

”اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔“

۱۔ جو ان میں سے زیادہ قریبی ہیں پھر جو ان کے بعد قریبی ہیں کیونکہ وہ یا تو اپنے محترم بالشان ہونے کی وجہ سے اس کے زیادہ مستحق ہیں یا پھر اس لیے یہ حکم ہے کہ آپ پر کسی قسم کی تہمت عائد نہ ہو سکے۔ کیونکہ انسان اپنے قریب داروں سے نری برتا ہے۔ یا پھر اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو ان سے دور نہیں کر سکیں گے اور نجات کا انحصار اتباع اور پیروی میں ہی ہے۔ علامہ بخاریؒ نے کہا کہ محمد بن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کے واسطے سے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا، اور فرمایا۔ اے علی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤں۔ گو میں اس کی قدرت نہیں رکھتا اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں انہیں ڈراؤں گا اور اس کام کے لیے انہیں بلاؤں گا تو بائقین مجھے اس سے ناپسندیدہ حرکات و سکنات دیکھنا پڑیں گی۔ لہذا میں خاموش رہا حتیٰ کہ جبرائیل امینؑ بھر تشریف لائے اور کہا اے محمد! ﷺ اگر آپ نے وہ نہ کیا جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ تو آپ کا رب آپ کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اس لیے اب تم ہمارے لیے ایک صانعِ کدَم لو اور کھانا تیار کرو، اس کے ساتھ بکری کی ایک ٹانگ بطور سامان رکھ دو اور ہمارے لیے دودھ کا ایک (بڑا پیالہ)۔ بھر دو پھر بنی عبدالمطلب کو جمع کرو حتیٰ کہ میں انہیں وہ پیغام پہنچاؤں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ پس میں نے حکم کے مطابق کھانے کا انتظام کیا اور پھر انہیں دعوت دی۔ اس دن دعوت میں کم و بیش چالیس افراد تھے۔ ان افراد میں آپ ﷺ کے چچوں میں سے ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب شامل تھے۔ جب وہ تمام جمع ہو چکے تو آپ ﷺ نے وہ کھانا طلب کیا جو میں نے تیار کیا تھا۔ چنانچہ میں وہ لے آیا۔ جب میں وہ رکھ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے گوشت کا ایک ٹکڑا تناول فرمایا۔ اور اسے اپنے دانٹوں کے ساتھ کاٹا اور پھر دسترخوان کی ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا ”خُذُوْا مِنْہِمُ اللّٰہُ“ (اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہاتھ بڑھاؤ) پس تمام لوگوں نے خوب میرے ہر کھانا کھایا یہاں تک کہ انہیں کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ قسم بخدا! کھانے کی مقدار صرف اتنی

تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی وہ کھا سکتا تھا جتنا میں نے ان تمام کو پیش کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو میرا بکرہ دوسرا میں وہ پیالہ اٹھا لیا۔ انہوں نے اتنا دودھ پیا کہ وہ تمام کے تمام میرا بکرہ ہو گئے۔ تم بخدا (اس کی مقدار صرف اتنی تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی پانی پیتا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے پہلے ہی کہہ دیا تمہارے ساتھی نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ سن کر وہ لوگ بکھر گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ ان سے کوئی بات نہ کر سکے۔ تو آپ ﷺ نے دوسرے دن پھر فرمایا اے علی! ابے شک وہ آدمی مجھ سے سبقت لے گیا ہے کہ جب میں نے کلام کا ارادہ کیا تو میری گفتگو سے پہلے ہی لوگ منتشر ہو گئے۔ لہذا اسی قسم کی ایک اور دعوت کا اہتمام کرو۔ اور انہیں پھر جمع کرو۔ پس میں نے ویسے ہی کیا، پھر انہیں اکٹھا کیا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے کھانا لانا نے کو فرمایا، تو میں نے آپ کو پیش کیا پھر آپ ﷺ نے گذشتہ دن کے عمل کی طرح کیا۔ پھر ان تمام نے کھایا اور پیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی اے بنی عبدالمطلب ابے شک میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں، تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ پس تم میں سے کون میرے اس معاملے میں میری مدد کرے گا اور میرا بھائی، میری وصی اور میرا نائب ہوگا؟ پس تمام کے تمام لوگوں پر خاموشی چھا گئی اور کوئی بھی نہ بول سکا۔ تو میں نے کہا اے نبی اللہ! ابے شک میں ان تمام میں کم عمر ہوں لیکن اس معاملے میں میں آپ کا مددگار ہوں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے گردن سے پکڑا اور فرمایا اِنَّ هَذَا اَخِي وَوَصِيِّي وَخَلِيفَتِي فَاَسْمَعُوا لَهُ وَاَطِيعُوا (ابے شک تم میں یہ میرا بھائی، وصی اور نائب ہے اس کی بات سنو اور اطاعت کرو) لوگ استہزاء پیشے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ ہمیں علی کی بات سننے اور اس کی پیروی کا حکم دے رہے ہیں۔ (۱)

صحیحین میں سعید بن جبیر کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاتْلُوْا عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ تو حضور نبی کریم ﷺ صفا پر تشریف لے گئے۔ اور ندا ہوئے لے گئے اے بنی فہر، اے بنی عدی باری باری قریش کے تمام قبائل کو بلا دیا یہاں تک کہ وہ سارے جمع ہو گئے۔ اور جو آدمی خود نہ آ سکا اس نے اپنا نائب بھیج دیا تاکہ وہ بات کو سن کر اس تک پہنچائے۔ پس جب ابولہب اور قریش آچکے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس وادی میں دشمن کا ایک دستہ تم پر شب خون مارنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ تو ان تمام نے کہا جی ہاں، اس لیے کہ ہم نے آپ سے ہمیشہ سچ ہی سنا ہے۔ تو پھر آپ نے فرمایا "اَفَتُؤَيِّدُوْا لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ" (ابے شک میں تمہیں عذاب شدید سے پہلے متنبہ کر رہا ہوں کہ کفر و شرک سے باز آ جاؤ) تو یہ سن کر ابولہب بولا تمہیں سارا دن خرابی ہو تو نے ہمیں کیا اس لیے جمع کیا ہے؟ تو اس وقت یہ مکمل سورت نازل ہوئی تَحٰثُّ اٰتٰی لَہٗبٍ وَنٰسِۃٍ مَّا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗوَمَا كَسَبَ اِلٰی اٰخِرِ السُّوْرَةِ (2)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَاقْبَلُوْا عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبٰی" تو رسول اللہ ﷺ اٹھے اور فرمانے لگے اے گرد و قریش! ایسا ہی مثل اور کوئی کلمہ فرمایا اپنے انصوں کو سچ دو اے بنی عبد مناف! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو تم سے دور نہیں کر سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب میں تمہیں کسی شے کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد ﷺ میرے

مال کے بارے میں جو چاہو مجھ سے پوچھو، میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو دو نہیں کر سکوں گا۔ (1)۔ علامہ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس طرح ذکر کی ہے کہ جب وَأَلْتُمْ عَشِيرَتَكَ الْفَاقِرِينَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور صفا پر چڑھے اور آواز لگائی ”یا صباحا“ (اے صبح کرنے والو!) تو انہوں نے کہا یہ کون ہے چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک لشکر پہاڑ کے پیچھے سے آ رہا ہے۔ کیا تم میری بات مانو گے؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم نے تو کبھی بھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ”إِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيِ عَذَابِ خُذَيْدٍ“ ابوبہر بولا ”تَبَايَاكَ مَا جَعَلْنَا إِلَّا لِهَذَا“ تیری خرابی ہو تو نے ہمیں صرف اس لیے جمع کیا ہے؟ پھر آپ خاموش کھڑے رہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ تَبَايَا آتِي لَهَبٍ وَتَبَا۔ عَمَّش نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ علامہ بغویؒ عبد اللہ بن حمارؓ اپنا مشن ہے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں تمہیں تعلیم دوں اور اللہ تعالیٰ نے آج کے دن جو مجھ بتایا ہے اس سے تم ناواقف ہو۔ اس نے فرمایا وہ تمام مال جو میں نے اپنے بندوں کو دیا وہ ان کے لیے حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا ہے۔ پھر شیطان ان کے پاس آئے اور انہوں نے انہیں دین سے بھیر دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام قرار دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں۔ اور میں نے انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ میں نے کسی کو یہ قوت نہیں دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا۔ اور اہل کتاب میں سے (دین پر) باقی رہنے والوں کے سوا تمام عرب و عجم کو ناپسند کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں قریش کو ذراؤں۔ تو میں نے عرض کی اے میرے پروردگار! وہ تو میرا سر کل دیں گے اور اسے روٹی بنا چھوڑیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہیں مبعوث فرمایا تاکہ میں تجھے آزمائوں اور تیرے سبب دوسروں کو آزمائوں تحقیق میں نے تجھ پر کتاب نازل کی ہے جسے پانی دھوئیں سکتا، تم اسے سوتے جاگتے پڑھو، جو تجھ سے لڑے تم ان سے لڑو، تم فرج کر دو تم پر فرج کیا جائے گا۔ اپنے دشمنوں کے خلاف ایک لشکر بھیجو ہم پانچ گنا لشکر تمہاری مدد کے لیے بھیجیں گے۔ اور اپنے اطاعت شعاروں کے ساتھ مل کر نافرمانوں کے خلاف جنگ کرو۔ پھر فرمایا۔ اہل جنت تین ہیں۔ عادل حکمران، رشتہ داروں اور تمام مسلمانوں سے نرمی کرنے والا رحم کرنے والا آدمی، اور ایسا آدمی جو غمی ہو، پاک دامن بننے کی کوشش کرتا ہو اور صدقہ کرتا ہو۔ اور پانچ قسم کے آدمی اہل نار میں سے ہیں۔

(1) ایسا ضعیف اور کمزور آدمی جس کی عقل نہ ہو۔ اور وہ ایسے لوگوں کے تابع ہو جنہیں نہ اہل کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مال کی۔ (2) ایسا آدمی جو صبح کے وقت تیرے پاس آئے اور تیرے اہل اور مال کے ساتھ دھوکہ کرے۔ (3) حریص اور لالچی آدمی (4) بد اخلاق بخیل اور (5) جھوٹ بولنے والا۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر نے ابن جریر سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَأَلْتُمْ عَشِيرَتَكَ الْفَاقِرِينَ تو آپ ﷺ نے اپنے گھر سے آغاز کیا تو مسلمانوں پر یہ شاق گزرا (2) تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِئِنْ أَتَبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

”اور آپ اپنے بچے کیلئے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں۔ اہل ایمان سے سہ“

۱۔ اپنے پہلو کو نرم کیجئے۔

۲۔ یہ خفص الطائر جناحہ سے استعارہ ہے۔ کیونکہ جب پرندہ نیچے بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے پروں کو جھکا لیتا ہے۔
 ۳۔ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یعنی الشُّعْبَکَ کا بیان ہے کیونکہ مِنَ الشُّعْبِ کا لفظ انہیں بھی شامل ہے جنہوں نے دین میں آپ کی اتباع کی اور
 نہیں بھی جنہوں نے اس کے علاوہ میں اتباع کی۔ یا یہ مِنَ تَبَعِیْضِ کے لیے ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکمل طور پر آپ
 کی اتباع کی اور مؤمنین کی کا لفظ انہیں بھی شامل ہے اور ایسے مؤمنین کو بھی جو گنہگار ہیں جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِئٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۷۱﴾

”پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں ۱۔ تو آپ فرمادیں میں بری الذمہ ہوں ان کا مومن سے جو تم کرتے ہو ۲۔“

۱۔ اور اگر وہ بعض امور میں آپ کی نافرمانی کریں۔

۲۔ یعنی میں ان اعمال سے بری ہوں جو نافرمانی اور گناہ کے اعمال تم کرتے ہو۔ اس میں ان کی ذاتوں سے برأت مراد نہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۷۲﴾

”اور بھروسہ کیجئے ۱۔ سب سے غالب پر ۲۔ رحم کرنے والے پر ۳۔“

۱۔ ”وَتَوَكَّلْ“ اہل مدینہ اور شام نے اس فُتُو کُلِّ پڑھا ہے۔ اور ان کے مصاحف میں یہ اسی طرح ہے۔ اس بناء پر یہ ”فَقُلْ إِنِّي
 بُرِّئٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ“ سے بدل ہے۔ اور باقیوں نے اسے وَأَخْفِضْ جَنَاحَكَ پر عطف کرتے ہوئے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔
 اور فُتُو کُلِّ کا معنی اپنا کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ عقلاً اور شرعاً جائز نہیں ہوتا مگر اسی کے جو نفع دینے کی قدرت رکھتا ہو، اس
 سے ضرر کو دور کر سکتا ہو، اس کے اقوال کو سننے والا ہو، احوال کو دیکھنے والا ہو، اس کام کے انجام سے واقف ہو اور اس پر نگران بھی ہو۔
 اسی وجہ سے فرمایا

۲۔ وہ جو غالب ہے وہ اپنے دشمنوں کی تباہی پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اپنے دوستوں کی مدد کرنے پر بھی قادر ہے۔

۳۔ جو تجھ پر اور تیرے قہمیں پر رحم فرمانے والا ہے۔

الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۷۳﴾

”جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں ۱۔“

۱۔ جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد
 کرنے کے لیے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔

وَتَقَلِّبُكَ فِي السَّجْدِ ﴿۷۴﴾

”اور (اور) دیکھتا رہتا ہے جب آپ پھر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں کا) ۱۔“

۱۔ اس کا عطف یَوَ اک کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی وہ آپ کی نماز کی مختلف حالتوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ کبھی آپ حالت قیام میں ہیں،
 کبھی رکوع میں، کبھی سجود میں اور کبھی قعدے میں۔ یا اس کا عطف تَقُومُ کے محل پر ہے۔ یعنی وہ آپ کو دیکھتا ہے جس وقت آپ کھڑے

ہوتے ہیں اور جس وقت آپ رخ تبدیل کرتے ہیں۔ عطیہ اور کرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ فی الساجدین سے مراد فی المصلّین ہے (نماز پڑھنے والے) اور مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دیکھتا ہے نمازیوں میں آپ کے نگاہ پھرانے کو۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھتے تھے جیسے وہ اپنے سامنے سے دیکھتے تھے (1)۔ علامہ بغوی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وَهَلْ تَرَوْنَ قُلُوبِي ههنا فَوَ اللّٰهُ لَا يَغْطِيْ عَلَيَّ خُصْرُوْكُمْ اِنِّيْ لَا اَزَاكُم مِّنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ" (کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب میں قبلہ رو کھڑا ہوتا ہوں تو میں تمہاری حرکات و سکنات سے بے خبر ہوتا ہوں قسم بخدا تمہارے خشوع و خضوع مجھ پر غفلت نہیں ہیں بے شک میں تمہیں اپنی پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں) حسن نے کہا تَقْلِبُکَ فِی السَّاجِدِیْنَ کا اپنے مؤمنین اصحاب کے گھروں میں آتے جاتے ہوئے پکڑ لگاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے اس کا مطلب ہے آپ کا اپنے مختلف احوال میں تعارف کرنا جیسا کہ آپ سے نقل انبیاء کرتے تھے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی آپ کا تجہیز پڑھنے والوں کے احوال کو معلوم کرنے کے لیے گھومنا پھرنا۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی تو آپ نے اس رات اپنے اصحاب کے گھروں کا پکڑ لگایا کہ آپ دیکھیں جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس لیے کہ آپ ان کے بہت زیادہ اطاعت شعار ہونے کے حریص تھے۔ یوں تو آپ ﷺ نے انہیں مجڑوں کے گھروں کی مثل پایا۔ کیونکہ آپ نے ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت کی بوجھنا بیٹھ سنی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سجدہ کرنے والوں کے احوال معلوم کرنے کے لیے آپ کے پکڑ لگانے کا ذکر کیا۔ کیونکہ یہ اس رحمت کے اسباب میں سے ہے جو اس ذات پر توکل کا تقاضا کرتی ہے جو اس سے متصف ہو۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تغلبک سے آپ کے اپنے آباء کی صلیبوں میں منتقل ہونے کا ارادہ فرمایا ہے یعنی آپ کے نور کا ایک نبی سے دوسرے نبی کی پشت میں منتقل ہو کر آنا (3)۔ لیکن اس تاویل میں کمال مدح نہیں کیونکہ اس میں قریش بھی شریک ہیں بلکہ تمام لوگ اس میں شریک ہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والوں کی پاک اصلا ب سے پاک اور سجدہ کرنے والیوں کی رحموں کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اور پاک سجدہ کرنے والیوں کی رحموں سے پاک صلیبوں کی طرف آنا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کے نسب میں تمام مرد اور عورتیں وحید کے پرستار تھے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے تمام کے تمام مؤمن تھے۔ جیسا کہ امام سیوطی نے کہا ہے۔ اور حافظ شمس الدین بن ناصر الدین دمشقی نے کہا ہے۔

وَيُنْقَلُ اِخْتِ نُوْرًا عَظِيْمًا تَلَا لَا فِیْ وَجْهِ السَّاجِدِيْنَ

اور ہر ایک عظمت و شان والے نور کو منتقل کرتا رہا جو سجدہ کرنے والوں کی پیشانیوں میں چمکتا ہے۔

تَقْلَبُ فِيْهِمْ قُرْآنًا فَفَرَنَّا اِلٰی اَنْ جَاءَ خَيْرُ الْمَوْسِلِيْنَ

پس وہ نور ان میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ تمام رسولوں سے عظمت و شان والا رسول تشریف فرما ہوا۔

اس تاویل کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنٍ بَنِيْ اٰدَمَ قُرُوْنًا فَفَرَنَّا حَتّٰی بُعِثْتُ مِنَ الْقُرُوْنِ الَّذِيْ حُكِنَتْ فِيْهِ" (مجھے بنی آدم کے زمانوں میں سے قرآن بعد قرن بہتر زمانے سے

مبعوث کیا گیا حتیٰ کہ مجھے اس زمانے سے مبعوث کیا گیا جس میں میں ہوں۔ (مسلم شریف میں واصلہ بن اسحق سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو چنا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چنا، بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا قریش میں سے بنی ہاشم کا انتخاب کیا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا۔ (1)۔ امام بیہقی نے دلائل النبوة میں حضرت انسؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ دو فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے افضل و بہتر میں سے بنایا۔ پس مجھے اپنے والدین کے ذریعے پیدا کیا گیا اور زمانہ جاہلیت کی کسی شے نے مجھے مس نہیں کیا۔ میں آدم علیہ السلام کے زمانہ سے نکاح کے ذریعے پیدا ہوا نہ کہ زنا سے۔ یہاں تک کہ میرے باپ اور ماں پر میری انتہاء ہو گئی۔ میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی تم سے بہتر ہوں اور اپنے آباء کے اعتبار سے بھی تم سے افضل ہوں۔ (2)۔ امام بیہقی نے آپ ﷺ کے آباء کے ایمان کے اثبات میں اجمالاً اور تفصیلاً ایک کتاب تحریر کی ہے۔ اور اس میں اس کے بارے میں مفصل بحث اور اس پر ہونے والے اعتراضات و جوابات کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں نے اس سے ایک رسالہ تلخیص کیا ہے۔ لہذا اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٩﴾

”بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

لے بے شک وہ آپ کے اقوال کو سننے والا ہے اور آپ کے افعال، نيات اور آپ کے امور کے انجام کو جاننے والا ہے۔ پس فی الحقیقت اسی پر توکل کیا جاسکتا ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ﴿٧٠﴾

”کیا میں بتاؤں تمہیں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔“

لے یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے وَمَا تَنَزَّلُ بِهِ الشَّيَاطِينُ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے تَنَزَّلُ عَلَيْهِ شَيْطَانٌ۔

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿٧١﴾

”وہ اترتے ہیں لے ہر جھوٹ گھڑنے والے لے بدکار پرست۔“

لے تَنَزَّلُ دونوں مقامات پر بے باپ تفل سے فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ اور اس سے ایک تاء ماضی ہے۔

لے أَثِيمٌ کا معنی ہے بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

سے أَفَّاكٍ بہت زیادہ گناہ کرنے والا۔ جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار نہ ہو۔ تو اس میں اس کی وضاحت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آپ پر شیطان نازل ہوتا ہے اس کی دو وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شریر کذاب اور بہت زیادہ گناہ کرنے والے پر اترتا ہے۔ کیونکہ فیض دینے والے اور فیض پانے والے کے درمیان متابعت کا ہونا شرط ہے۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ علیہ الخیر والصلوات تو اس طرح نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ قول ہے۔

يُنْفِقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَذِبُونَ ﴿٧٢﴾

”یا اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر نے بھولے ہیں۔“

۱۔ وہ اپنے کان شیطانوں کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ پس ان سے کچھ اشیاء لیتے ہیں اور پھر اپنے خیالات کے مطابق بہت سی چیزیں ان کے ساتھ ملا لیتے ہیں جو ان میں سے اکثر واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا (اور ان میں سے اکثر نے بھولے ہیں) اور محمد ﷺ تو اس طرح نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو سب کثیر مغیبات کی خبریں دیتے ہیں جو شمار نہیں کیے جاسکتے اور وہ جب بھی کسی شے کی خبر دیتے ہیں وہ بالیقین واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔ ترکیب میں یہ جملہ یا تو اشیاء کی صفت ہے یا جملہ مستانہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کانہوں کے بارے پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا وہ کوئی شے نہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کبھی کبھی وہ ایسی شے کے بارے گفتگو کرتے ہیں جو بالکل حق ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنات حق کے کلمات ایک لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے کان بن دوست کے کان میں مرئی کی آواز کی مثل آواز سے ڈال دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنی طرف سے اس میں سو سے زائد جھوٹ ملا لیتے ہیں۔ متفق علیہ (۱)۔ آپ رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے شک ملائکہ بادل میں اترتے ہیں اور وہ آسمان میں ہونے والے فیصلے کا ذکر کرتے ہیں۔ پس شیاطین اسے چرانے کے لیے اس کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور اس میں سے کچھ سن لیتے ہیں۔ پھر وہ کانہوں کو آکر بتاتے ہیں اور پھر وہ اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹ اس کے ساتھ ملا کر آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ البخاری (۲)۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی حکم کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے عاجزی و اداسی کرتے ہوئے اپنے پر مار تے ہیں ایسی آواز میں جیسے کہ ایک زنجیر ہے جو چکنی چٹان پر لگے۔ اِذَا فُتِيَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا اَعَاذَ اَقَالِ رَبِّكُمْ قَالُوا الْحَقُّ كَمَا وَعَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ (کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو وہ آپس میں کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی۔ اس نے حق کہا ہے اور وہ بڑی شان والا عظمتوں والا ہے)۔ پس کلام کو چرانے والے اسے سنتے ہیں اور اسی طرح بعض جو ایک دوسرے سے مترتبہ نیچے ہیں وہ کلام چرا لیتے ہیں۔ (اور شیطان نے اس کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ اسے روک لیتا ہے پھر اس میں تبدیلی کرتا ہے اور اپنی انگلیوں کے درمیان جلدی سے لے لیتا ہے)۔ پس اوپر والا کلام مستانہ ہے اور وہ اسے اپنے سے نیچے والے کی طرف القاء کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والے کی طرف (حتیٰ کہ اسی طرح کرتے کرتے وہ اسے سارا اور کان بن کی زبان پر القاء کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات شہاب ثاقب القاء سے پہلے اسے آیتیں ہیں اور کبھی بھارا ان کے پیچھے سے پہلے وہ القاء کر دیتا ہے۔ پھر وہ سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا کر جھوٹ بولتا ہے۔ پھر کہہ دیا جاتا ہے کیا اسی طرح نہیں ہوا جو اس نے فلاں دن ہمیں اس اس طرح کہا اور فلاں دن اس اس طرح کہا۔ پس آسمان سے سنے گئے غلگہ کے سب اسے سچا مان لیا جاتا ہے۔ رواہ البخاری۔ (۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انصار میں سے ایک آدمی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک ستارہ ٹوٹا اور اس سے خوب روشنی ظاہر ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اس کی مثل ستارہ ٹوٹتا تو اس کے بارے تم زمانہ جاہلیت میں کیا کہتے تھے؟ انہوں نے کہا حقیقت تو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے ہم تو یہ کہتے تھے کہ آج

کی رات عظیم آدمی پیدا ہوا ہے تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ستارے کسی کی موت یا کسی کی پیدائش کے سبب نہیں ٹوٹتے۔ بلکہ جب ہمارا رب جب کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ پھر اس آسمان کے باہی اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو اس کے ساتھ متصل ہے حتیٰ کہ وہ تسبیح اس آسمان دنیا کے باسیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش کے ساتھ ملنے والے ان سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ تو وہ انہیں اس کے بارے خبر دیتے ہیں۔ پھر تمام آسمانوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو خبر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ خبر آسمان دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ پس جنات کا لگا کر اسے اچک لیتے ہیں اور اسے اپنے دوستوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ آگے بیان کر دیتے ہیں۔ پس جو کچھ وہ بعینہ لاتے ہیں وہ تو حق ہوتا ہے لیکن وہ اس میں بہت اضافہ کر کے اسے آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ مسلم واللہ اعلم۔ (1)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو آدمیوں نے ایک دوسرے کی جھوٹ بیان کی۔ ان میں سے ایک انصار میں سے تھا اور دوسرا دوسری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنی اپنی قوم کے بیوقوف لوگ تھے (2) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴿۱﴾

”اور جو شعراء ہیں تو ان کی پیروی حق سے ہٹکے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں۔“

۱۔ علامہ بونہی نے ضحاک سے اسی طرح ذکر کیا ہے اور انہوں نے کہا عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ شعراء سے مراد وہ کفار ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی جھوٹ کیا کرتے تھے۔ اور مقابل نے ان کے یہ اسامہ ذکر کیے ہیں عبد اللہ بن زبیر سہمی، مہیرہ بن ابی وہب خزومی، شافع بن عبد مناف، ابو عزمہ عبد اللہ بن عمر جمحی اور امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ یہ انتہائی جھوٹ اور باطل گفتگو کرتے تھے۔ اور کہتے تھے ہم محمد (ﷺ) کے قول کی شش ہی کلام کرتے ہیں۔ وہ اشعار کہتے اور ان کی قوم کے اجنبی اور بے وقوف لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور ان سے وہ اشعار سنتے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی جھوٹ ہوتی۔ اور وہ انہیں ان سے آگے بیان کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ان سے مراد وہ رواۃ ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی جھور روایت کرتے ہیں۔

۲۔ قنادہ اور مجاہد نے کہا ہے کہ غَاوُونَ سے مراد شیاطین ہیں (3)۔ یہ جملہ مستحکم ہے کیونکہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سے مزید پختہ کرتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ﴿۲﴾

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ شعراء ہر وادی میں ہر سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔“

۱۔ ”التم تو“ اے مخاطب! کیا تو نہیں دیکھتا ہے شک شعراء۔

۲۔ کلام کی وادیوں میں سے ہر وادی میں (گھومتے ہیں) مثلاً درج، ذم، انقیار اور محبت و بغض وغیرہ کا بیان کرتے ہیں۔ اور وادی سے

مرا دکلام کی انواع میں سے ایک نوع ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے افا فی واہ وانت فی واہ اخو۔ (میں ایک وادی (کلام کی نوع) میں ہوں اور تو دوسری وادی میں ہے)

اسی یہ سابقہ کلام کی علت بیان کرتا ہے۔ اَلْهَائِم سے مراد وہ سیدھا جانے والا ہے جو کسی حد پر نہ ٹھہرتا ہو۔ یعنی وہ کلام میں حدود درجہ مبالغہ کرتے تھے اور جھوٹ کی قطعاً پر غور نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے اکثر مقدمات اس طرح خیالی ہوتے کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ قنادہ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ کے ساتھ ہی مدح کرتے تھے اور جھوٹ کے ساتھ ہی بھوکہ کرتے تھے۔ اور فی کلّی واہ یھتمون کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حروف تہجی میں سے ہر حرف پر کافیے بتاتے تھے۔ (1)

وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿١﴾

”اور وہ کیا کرتے ہیں ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔“

یعنی وہ اپنے اشعار میں بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ چونکہ قرآن کریم کا آغاز الفاظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے ہے اس لیے وہ معنی پر اس طرح اعتراض کرتے تھے کہ یہ وہ ہے جو شایعین لے کر اترتے ہیں اور الفاظ میں عیب و نقص اس طرح بیان کرتے کہ یہ شعر کی جنس میں سے ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی کیفیت اور کارناموں اور شعراء کی حالت کے درمیان تضاد اور تباہی بیان کرتے ہوئے ان کے قول کا رد فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پیٹ کا پیپ سے بھر کر فاسد ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (2)۔ اسے بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عرج نامی پہاڑ کے پاس چل رہے تھے کہ اچانک ایک شاعر شعر کہتے ہوئے سامنے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شيطان کو پکڑ لو یا فرمایا شيطان کو روک لو کیونکہ کسی آدمی کے پیٹ کا پیپ سے بھر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (3)۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کلام میں غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے یہ ارشاد تین بار فرمایا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ ابوشلبہ نضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے مجھے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ ہوگا جو تم میں سے اچھے اخلاق والا ہوگا اور میرے نزدیک مبغوض اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہوگا جو برے اخلاق والا ہوگا اور وہ ثورثون، متشدقون اور متضیعون ہیں۔ اسے یحییٰ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (5)۔ نہایت میں ہے کہ ثورثون سے مراد وہ لوگ ہیں جو تکلف کے ساتھ کثرت سے کلام کرتے ہیں اور حق سے نکل جاتے ہیں اور متشدقون وہ ہیں جو بغیر احتیاط اور پرہیز کے وسیع کلام کرتے ہیں (6)۔ میں کہتا ہوں یہ دونوں شعراء کی صفات ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم ثورثون اور متشدقون کا مفہوم تو جانتے ہیں متضیعون سے مراد کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد تکبر کرنے والے لوگ ہیں۔ (7)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 909 (وزارت تعلیم)

1۔ تفسیر بخاری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (تذہبی) 4۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 339 5۔ شعب الایمان، جلد 4 صفحہ 51-250 (احمدیہ)

6۔ التہذیب فی غریب الحدیث، جلد 1 صفحہ 209 (احمدیہ) 7۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 22 (وزارت تعلیم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں شب معراج ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹوں کو آگ کی قیچیوں کے ساتھ کاٹا جا رہا تھا۔ تو میں نے کہا اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے عروہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ”وَالشُّعْرَاءُ يَبْغُهُمُ الْغَاوُونَ الٰہی قَوْلُهُ مَا لَا يَفْعَلُونَ“ تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا تحقیق یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ میں ان میں سے ہوں۔ تو بحر اللہ تعالیٰ نے آخر سورۃ تک یہ ارشاد نازل فرمایا ”إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا“ (2)۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور حاکم نے ابوالحسن البراء سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ”وَالشُّعْرَاءُ يَبْغُهُمُ الْغَاوُونَ“ تو حضرت عبداللہ بن رواحہ، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم آئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قسم بخدا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ تم شعراء ہیں ہم تو ہلاک ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ (3)

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴿٣٥﴾

”جو ان شعراء کے جو ایمان لے آئے۔ اور انہوں نے نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اور انتقام لینے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا۔ ایسا تو عقرب جان لیں گے جنہوں نے قلم و ستم کیے۔ کہ وہ کس (بھیا تک) جگہ سے لوٹ کر آ رہے ہیں۔“

۱۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا بھیجا اور ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی۔
۲۔ یعنی شعر کہنے نے انہیں کثرت سے ذکر سے غافل نہیں کیا۔ اور ان کے اکثر اشعار اللہ تعالیٰ کے ذکر، توحید، حمد و ثناء اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر براہین کرنے والے ہوں۔ ابو یزید نے کہا ہے کہ ذکر کثرت سے مراد کثرت باللہ و تکیہ بلکہ حضور قلب ہے۔ (4)
۳۔ اور اگر ان کے کلام میں کسی کی بھجوتی ہو تو وہ اس سے ان کے خلاف مدد کا ارادہ کرتے جو ان کی بھجوتے اور اسے مسلمانوں کی بھجوت کا دفاع مقصود ہوتا۔

علامہ بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے شعر کے بارے جو کچھ نازل کیا۔ سو نازل کیا حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے گویا کہ تم شعر کے ذریعے ان پر تیر اندازی کرتے ہو۔ اور ابن عبدالبر نے ”استیعاب“ میں کہا ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ شعر کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک بندہ مومن اپنی تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے۔ (5)۔ علامہ بغوی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ عمرہ قضاء کے وقت مکہ میں داخل ہوئے تو امین رواحہ رسول اللہ ﷺ کے آگے آئے چل

1۔ سند احمد، جلد 3 صفحہ 120 (صادر)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 185 (احمدیہ)
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر روح البیان، جلد 6 صفحہ 316 (مکتبہ اسلامیہ ریاض)
5۔ تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دار الکتب العربیہ بیروت)

رہے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حرم پاک میں شعر کہہ رہے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عمر! اسے چھوڑ دو۔ کمان کے تیر کی نسبت یہ زیادہ اثر کرنے والے ہیں۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوہ بنی قریظ کے دن حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا مشرکین کی جو بیان کرو، بے شک جبرائیل آپ کے ساتھ ہیں (1)۔ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا کرتے تھے میری طرف سے انہیں جواب دوائے اللہ اور اللہ کے ذریعے اس کی امداد فرما۔ (2)

مسلم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش کی جو کرو بے شک یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے (3)۔ اور آپؐ سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ روح القدس تیری تائید کرتا رہے گا۔ جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کا دفاع کرتا رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے بھی سنا ہے کہ حسان نے ان کی نبوکی۔ پس اس نے شفا دی اور شفا دینے والی چیز بیان کر دی۔ (4)

امام بخاریؒ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں منبر بچھایا کرتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کے مفاخر بیان کرتے۔ یا پھر آپ ﷺ کی مدافعت میں کلام پڑھا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے روح القدس حسان کی مدد کرتا رہا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کے مفاخر اور عظمت و شان کا ذکر کرتے رہے یا آپ ﷺ کا دفاع کرتے رہے (5)۔ علامہ بیہقی نے آپ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم قریش کی جو بیان کرو کیونکہ یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ پس آپؐ نے ابن رواحہ کی طرف پیغام بھیجا۔ اور فرمایا تو ان کی جو بیان کرو تو انہوں نے ان کی جو کہی لیکن آپ ﷺ اس سے مطمئن نہ ہوئے پھر کعب کی طرف اور بعد ازاں حضرت حسان کی طرف پیغام بھیجا پس جب حسان بن ثابت آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "فَإِنِّي لَكُمْ أَنِّي قَوْلُكُمْ إِلَى هَذَا الْأَمْسِ الْعُضَابِ بِذَنْبِهِ" (تھیں اب تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ تم اس شیر کو تیر بھیجو جو اپنی ذم زین پر رخ رہا ہے حملہ کے لیے)۔ پھر انہوں نے جوش سے اپنی زبان کو حرکت دیتے ہوئے کہا تم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنی اس زبان کے ساتھ انہیں انتہائی بری طرح پھاڑ ڈالوں گا۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جلدی نہ کیجئے، بے شک ابوبکر صدیق قریش کے نبیوں کے ماہر ہیں۔ میں بھی ان ہی ان کے نسب میں سے ہوں۔ پس وہ تمہیں ان میں میرے نسب کے متعلق بتائیں گے۔ پھر حسان حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، پھر وہاں سے لوٹے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ انہوں نے آپ کے نسب کے متعلق مجھے بتا دیا ہے پس تم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آپ کو ان سے باتچیں اس طرح نکال لوں گا جیسے آئے ہے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔ پھر حسان نے یہ کہا۔

وَعِنْدَ اللَّهِ فِي ذَٰلِكَ الْجَزَاءُ هَجَوْتُ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ غَنَةً

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 591 (دورالتعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 909 (دورالتعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 300 (قدیمی)

4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 300 (قدیمی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 107 (دورالتعلیم)

(اے ہوشیار!) تو نے میرے محبوب محمد ﷺ کے بارے میں کیا باتیں کی ہیں اور میں اس بھوکا جسمیں جواب دے رہا ہوں اور میں پر امید ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجھے 72 اجر ملے گی۔

هَجَوْتُ مُحَمَّدًا نَبِيًّا حَقِيْقًا رَسُوْلَ اللهِ سُبْحَانَهُ الْوَفَاءُ

تو نے میرے اس محبوب کی بھوک ہے جو تک سیرت اور پاکدامن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اس کی خصلت و قاضی ہے۔

فَاِنَّ اَبِيَّ وَوَالِدَتِيَّ وَعِزَّتِي لِعَرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وَقَاءُ

سنو! میں تم سے اپنے محبوب محمد ﷺ کی عزت کو بچانے کے لیے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بیوی تک کو قربان کر دوں گا۔

اَمَنْ يَهْجُو رَسُوْلَ اللهِ مِنْكُمْ وَ يَمْضَحُهُ وَ يَنْصُرُهُ سِوَاءُ

تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی بھوک نے والا اور آپ ﷺ کی مدح اور مدد کرنے والا برابر ہوں گے؟

وَ جِبْرِيلُ رَسُوْلُ اللهِ فِينَا وَ رُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهُ كُفَاءُ

اور اللہ تعالیٰ کے پیامبر جبریل امین علیہ السلام ہمارے ساتھ ہیں اور روح القدس؟ اللہ کا تو کوئی ہمسرہ ہی نہیں۔ (1)

ابن سیرین سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرمایا بھوکا جواب دیجیے تو انہوں نے اشعار کہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ان پر تحریر ملنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ (2)

فائدہ:- ان احادیث سے ثابت ہوا کہ شعر کہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس میں جھوٹ اور اس کے مشابہ محرمات سے اجتناب کیا جائے۔ دارقطنی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شعر کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک کلام ہے، اگر یہ حسین ہو تو اچھا ہے اور اگر قبیح ہو تو برا ہے (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے سچا کلام جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید کا کلام ہے "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ" (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے) متفق علیہ (4)۔ عمرو بن العریضہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کا ردیف تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیرے پاس امیہ بن صلت کے اشعار ہیں سے کوئی شے ہے؟ تو میں نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سناؤ چنانچہ میں نے اس کا ایک شعر پڑھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ۔ میں نے ایک شعر اور پڑھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ حتیٰ کہ میں نے آپ ﷺ کو سوا اشعار سنا دیے۔ رواہ مسلم (5)۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک جنگ میں تھے کہ آپ ﷺ کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

هَلْ اَنْتَ اِلَّا اَصْبَغَ دُمِيَّتْ وَ فِیْ سَبِيْلِ اللهِ مَا لَقِيْتُ

(تو صرف ایک انگلی ہے جو خون آلود ہوئی ہے جو تو نے دکھ پایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں پایا۔ متفق علیہ) (6)

1- تفسیر بغوی زیر آیت مذکورہ
2- تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دارالکتب العربی بیروت)

3- سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 155 (الحامی)

4- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (تذیبی)

5- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 393 (وزارت تعلیم)

6- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (تذیبی)

حضرت شعیبی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شعر کہتے تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شعر کہا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تینوں میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تھے۔ (1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں شعر کہتے بھی تھے اور سنتے بھی تھے۔ پس یہ روایت ہے کہ آپؐ نے عمرو بن ربیعہ کو بلایا اور اسے دو قصیدہ سنائے کہ کہا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

أَمِنَ الْإِلَٰهَ نَعْمَىٰ أَنْتَ غَادٍ وَ مَبْغُورٌ
عَذَّةٌ عَذَامٌ زَانِحٌ لِّمُهْجَرٍ

کیا تو آل نعمی کے پاس سے کل صبح ترکے ترکے جانے والا ہے یا شام کو جلدی سے جانے والا ہے۔

پس ابن ابی ربیعہ نے یہ قصیدہ آخر تک سنایا اور یہ تقریباً 70 ستر اشعار پر مشتمل تھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مکمل قصیدہ دوبارہ پڑھایا کیونکہ آپؐ ایک ہی بار سن کر قصیدہ یاد کر لیا کرتے تھے۔ (2)

فائدہ:- شعر اطاعت ہے اگر اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو یا یہ علوم دین میں سے ایک علم ہے یا یہ مسلمانوں کے لیے وعظ و نصیحت ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک شعر میں حکمت و دانائی ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ (3) صحیح بن عبد اللہ بن بریدہ نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک کبھی بیان میں جادو ہوتا ہے، کبھی علم میں جہالت ہوتی ہے، کبھی شعر میں حکمت ہوتی ہے اور کبھی قول میں اف کہنا محتاجی ہوتی ہے (4)۔ ابوداؤد نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک بیان میں سحر ہے اور شعر میں حکمت ہے (5)۔ اسے ابوداؤد اور احمد نے روایت کیا ہے اور حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔ ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مشرکین کے ساتھ اپنے بالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو (6)۔ اللہ تعالیٰ نے مشرک اور مسلمان شعراء کا ذکر کرنے کے بعد مشرکین شعراء کو ڈراتے ہوئے فرمایا۔

یعنی مختصر یہ وہ جان لیں گے جنہوں نے شرک کیا یا رسول اللہ ﷺ کی بھوک۔

۵۔ ”مُتَغَلَّبٌ“ یہ مصدر ہے یا اپنے باجد کے سبب غلبہ منسوب ہے۔ اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ استفہام مصدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ استفہامیہ مَسْبُغٌ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور یہ استفہام تہدید کے لیے ہے۔

۶۔ یعنی لوٹنا کوئی لوٹنے کی جگہ پر ہے جس کی طرف وہ موت کے بعد لوٹیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جہنم اور دوزخ کی طرف۔ (7)

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ سخت ترین ڈراوا ہے کیونکہ سَيِّئَةٌ میں وعید یلغ ہے۔ اَلَّذِينَ كَذَبُوا میں اطلاق اور تعمیم ہے۔ اور اَيُّ مُتَغَلَّبٍ میں ایہام اور تہویل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ظلم کرنے والے عذاب سے لوٹ آئے کا طمع رکھتے ہیں اور وہ عقریب جان

3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 908 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً

1۔ تفسیر بخاری زیر آیت 74

6۔ سنن الدارمی، جلد 2، صفحہ 132 (الحاجن)

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 328 (وزارت تعلیم)

5۔ ایضاً

7۔ تفسیر بخاری زیر آیت 74

لیں گے کہ ان کے لیے اس سے بچ نکلنے کا کوئی سبب نہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ میرے والد محترم نے وصیت میں دو سطریں لکھیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یہ وصیت ہے جو ابو بکر بن ابی قحافہ نے دنیا سے جاتے ہوئے اس وقت کی جب کافر مومن ہو جاتا ہے، فاجر متقی بن جاتا ہے اور کاذب صادق بن جاتا ہے۔ بے شک میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے، میری امید اور خیال کے مطابق وہ عدل کریں گے اور اگر وہ زیادتی کریں اور کوئی تہذیبی کردیں تو میں غیب نہیں جانتا وَ سَيَعْلَمُ الْاَوَّلٰیْنَ اَمْ اَنْیٰ مُنْقَلَبًا یَّتَّقِلُوْنَ (۱)

الحمد لله رب العالمین و صلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وآله و اصحابه اجمعین

www.muhammadiyah.com

سورة النمل

﴿اسماها ۹۳﴾ ﴿سُوْرَةُ النَّامِلِ مَكِّيَّةٌ ۲۷﴾ ﴿رُكُوْعَاهَا ۷﴾

سورة النمل کی ہے اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

طَسَّ ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿۱﴾

”طا۔ سین یہ آیتیں ہیں قرآن (حکیم) اور روشن کتاب کی ۱۔“

۱۔ تِلْكَ کا اشارہ سورت کی آیات کی طرف ہے۔ اور کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور اس کے مبین ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس میں وہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہے جو ہونے والا ہے۔ پس اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ یہاں کتاب کا ذکر مؤخر ہے جبکہ سورۃ حجر میں مقدم ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کے ساتھ ہمارے علم کے تعلق کی بناء پر اسے مؤخر ذکر کیا جبکہ وہاں قرآن پر کتابت کے مقدم ہونے کے اعتبار سے اسے مقدم کیا۔ یا اس سے مراد وہ قرآن جو طہل و حرام اور دیگر احکام کی وضاحت بیان کرتا ہے۔ اور اپنے مجر ہونے کے سبب اپنی صحت کو بیان کرتا ہے۔ اور قرآن پر اس کے عطف کی حیثیت یہ ہے جیسے دو صفوں میں سے ایک صفت دوسری پر معطوف ہو۔ اور اس کی تکمیل تنظیم کے لیے ہے۔ یہاں کتاب کو نگرہ ذکر کیا اور سورۃ حجر میں معرفہ اور قرآن کو دہاں نگرہ ذکر کیا اور یہاں معرفہ ذکر کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور کتاب دونوں علم ہیں اس (وحی) کا جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اور یہ دونوں اس کا وصف بھی ہیں کیونکہ اسے پڑھا بھی جاتا ہے اور لکھا بھی۔ لہذا جہاں معرفہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد علم ہے اور جہاں نگرہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد وصف لیا گیا ہے۔

هٰذِهِ بَشَرٰى لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

”یہ سراپا ہدایت ہے اور خوشخبری ہے اہل ایمان کے لیے ۲۔“

۲۔ هٰذِهِ بَشَرٰى دونوں منصوب ہیں اور قرآن سے حال ہیں اور ان دونوں میں عامل معنی الاشارة ہے۔ یا دونوں مجرور ہیں اور اس سے بدل ہیں یا دونوں مرفوع ہیں اور فیلک کی دوسری دو خبریں ہیں یا مبتداء مخدوف کی خبریں ہیں یعنی هٰذِهِ بَشَرٰى اور لِّلْمُؤْمِنِيْنَ تاذاع الفعلین کے طریقے پر ہدیٰ اور بشری کے متعلق ہے۔ یا صرف بشری کے متعلق ہے یعنی یہ تمام مخلوق کے لیے ہدایت ہے لیکن جس نے ہدایت حاصل نہ کی تو یہ اس کی اپنی بری سوچ اور پسند کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بشارت اور خوشخبری صرف مؤمنین کے لیے ہے۔

الَّذِيْنَ يُعْمَلُونَ الصّٰلٰتَ وَيُؤْتُونَ الزّٰكٰتَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ﴿۳﴾

”جو صحیح ادا کرتے ہیں نماز ادا اور دیا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں ا۔“

۱۔ جو نماز کے فرائض، سنن اور اس کے آداب کی حفاظت کرتے ہیں (یعنی نماز کو پورے آداب اور پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں)۔
 ۲۔ یہ صلہ کے تحت میں سے ہے اور یہ ادا حالہ ہے یا غافلہ۔ یہاں مسند الیہ کو فعل پر مقدم کر کے سیاق کلام میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ ان کی قوت یقین اور ان کے ثبات پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس سے صبر مقصود ہے۔ یعنی وہ آخرت پر اس طرح یقین نہیں رکھتے جیسے حق ہے مگر وہی لوگ جن میں ایمان اور اعمال صالحہ دونوں جمع ہوں۔ کیونکہ اعمال میں ان کا جدوجہد کرنا یہ ان کے ایمان پر دلیل ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ کلام صلہ سے خارج ہو اور یہ جملہ مستاتھ ہو جیسا کہ اس پر کلام کی تبدیلی دلالت کرتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اس طرح یقین رکھتے ہیں نہ کہ کوئی اور۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ذُرِّيَّتَهُمْ أََعْمَالُهُمْ يَعْهَدُونَ ۝

”بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے خوبصورت بنا دیے ان (کی نظروں) میں ان کے اعمال (بد)

پس وہ سرگرداں بھر رہے ہیں ا۔“

۱۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے قبیح اعمال ان کے لیے اس طرح خوبصورت بنا دیے ہیں کہ انہیں نفس پر مسلط کر دیا ہے اور نفس انہیں چاہنے لگا ہے۔ وہ ان کے انجام کو نہیں پہچانتے۔ ذُرِّيَّتًا کا جملہ ان کی خبر ہے۔ اور قَهُمْ يَعْهَدُونَ اس پر معطوف ہے۔ یا یہ ان کی خبر ہے اور فاعل موصول کو متضمن ہے جو شرط کسبی میں ہے۔ اور ذُرِّيَّتًا لَا يُؤْمِنُونَ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے فاعل مقدر ہے۔ اور إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ جملہ مقررہ ہے اور یہ ان کی حالت بیان کرنے کے لیے ہے جن سے مذکورین کو ڈرایا جا رہا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ إِلَّا خُسْرُونَ ۝

”یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے بدترین عذاب ہے اور یہی آخرت میں سب سے زیادہ کھانے میں ہوں گے ا۔“

۱۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے دنیا میں بدترین عذاب ہے۔ اس میں ان کی اس ذلت آمیز شکست کی خبر ہے جس سے وہ جنگ بدر کے دن قتل، قید اور ذلت و رسوائی میں سے دوچار ہوئے۔ اور وہ دوسروں کی نسبت آخرت میں زیادہ کھانے میں ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان انہیں یہ اعزاز بخشا کہ ان ہی میں سے ان میں رسول معوض فرمایا اور اس سے انہیں پاک کرنے، ان کا تزکیہ کرنے اور انہیں دنیا اور آخرت میں اعزاز و اکرام دینے کا ارادہ فرمایا۔ لیکن انہوں نے اس کے مقابلہ میں دنیا میں قتل اور قید اور آخرت میں بھڑکنے اور جلانے والی آگ کو پسند کیا۔ اولنک سے لے کر آخر تک مکمل جملہ اپنے معطوف سمیت مستاتھ ہے اور یہ ان کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ہے۔

وَإِنَّكَ لَن تَكُنَّ مِنَ الْقَرَّانِ مِنَ الَّذِينَ حَكِيمٌ عَلَيْهِمْ ۝

”اور بے شک آپ کو سکھایا جاتا ہے قرآن حکیم بڑے دانا، سب کچھ جاننے والے کی جانب سے ا۔“

۱۔ اس جملہ کا عطف ایات القرآن پر ہے۔ اس میں حکیم اور حکیم کی تعبیر تعلیم کے لیے ہے۔ یعنی اس حکیم اور حکیم کی طرف سے جس کی

کنہ، علم اور حکمت کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ یہاں دو وصفوں کو جمع کیا گیا ہے حالانکہ علم حکمت میں داخل ہے، ایک تو اس لیے کہ علم عام ہے اور حکمت فعل کی پہنچ پر دلالت کرتی ہے اور دوسرا یہ احساس دلانے کے لیے کہ علوم میں سے بعض علوم حکمت ہیں مثلاً عقائد اور احکام شریعت اور بعض وہ ہیں جو اس طرح نہیں مثلاً قصص اور مہجیات کی خبریں یہ قصص کو ذکر کرنے کی تمہید ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لَأَهْلِيهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَائِيَتْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ آدَاتِيكُمْ بَشَابًا
قَبِيْسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ①

”یا درمآؤ! جب کہا موسیٰ نے اپنی زوجہ سے کہ میں نے دیکھی ہے آگ۔ ابھی لے آتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر ہے۔ بالے آؤں گا تمہارے پاس (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلا کر دے تاکہ تم اسے تاپو گے۔“
۱۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر کی طرف سفر کرتے ہوئے اپنی زوجہ سے کہا۔ یہ طرف اذکو فصل کے متعلق ہے۔ اور علیم کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

۲۔ ”ایہی“ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یا مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم اپنی جگہ پر ٹھہرو میں ابھی وہاں سے راستے کی کوئی خبر لے آتا ہوں کیونکہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور سین بہت زیادہ مسافت سے لانے کے وعدہ پر دلالت کرنے کے لیے ہے، مگر چہ وری ہو جائے۔ یہاں سَائِيَتْكُمْ یقین پر دلالت کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے اور سورہ قصص میں لَعَلَّی (لَعَلَّكُمْ) حرف تہنہ کے ساتھ مذکور ہے۔ کیونکہ امید دلانے والا اپنی امید کے حصول کی تقدیر پر بالیقین اسے لانے کا وعدہ کرتا ہے اور یہ اس شے کے عزم و جزم کا احساس دلاتا ہے جس کا وہ وعدہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ روایت یا معنی جائز ہے اور نکاح لفظ نکاح اور ترویج کے بغیر ان الفاظ کے ساتھ جائز ہے جو اس کا معنی دوا کر سکتے ہیں۔

۳۔ کو قیوس نے بشہاب توین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ ”قبس“ اس سے بدل ہے یا اس کی صفت ہے۔ کیونکہ شہاب سے مراد بھڑکنے والی آگ کا شعلہ ہے۔ اور قبس سے مراد آگ کا وہ شعلہ ہے جو بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے (۱)۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور باقیوں نے بغیر توین کے شہاب کو قبس کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اور یہ اضافت بیان ہے کیونکہ شہاب پر قبس کا اطلاق کرنا جائز ہے۔

علامہ یعقوبی نے کہا ہے کہ شہاب اور قبس دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں کیونکہ قبس سے مراد وہ کھڑی ہے جس کی ایک طرف آگ لگی ہوئی ہو اور اس کی دوسری طرف میں آگ نہ ہو۔

۴۔ ”تَصْطَلُونَ“ اصل ہے بابت اعتعال ہے اور اس کا معنی ہے سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈک کے وقت حرارت و گرمائی حاصل کرنے کے لیے آگ جلانا۔

فَلَمَّا جَاءَهُنَّ أُنْزِلَ فِي الْأَثَرِ وَمِنْ حَوْلِهِنَّ اللَّهُ رَبُّ
الْعَالَمِينَ ②

”پھر جب اس کے پاس پہنچے تو نہ اندکی گئی کہ بابرکت ہو۔ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے اس پر (تثبیہ و تمثیل سے) پاک ہے اللہ جو رب العالمین ہے۔“

۱۔ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے قریب ہوئے جو انہوں نے دیکھی تھی۔ جب کوئی منزل کے قریب ہو جائے اگرچہ بعد میں وہ اس تک نہ پہنچے تو کہا جاتا ہے ”بَلَغَ فَلَانُ الْمَنْزِلَ“ (کہاں منزل تک پہنچ گیا)

۲۔ ”نُودَىٰ اَنْ يَّبُودَكَ“ میں اُن مفرہ ہے کیونکہ نداء میں قول کا معنی ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے بانی بُودک۔ تو اس صورت میں اُن مصدر یہ ہے یا مخففہ عن المطلقہ ہے۔ تخفیف اگرچہ لا قد، سین یا سوف کے ساتھ تعویض کا تقاضا کرتی ہے لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جو بہت سے احکام میں دوسروں کے مخالف ہوتا ہے۔

۳۔ حضرات ابن عباس، سعید بن جبیر اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ پاک ہے اور بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات گرامی ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نداء دی اور انہیں اپنا کلام سنایا (۱)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے آگ گمان کیا۔ اسی لیے آپ نے لفظ نار (آگ) ذکر کیا۔ امام مسلم نے ابو موسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور نہ ہی اسے سونا چاہیے۔ وہ میزان عدل بچھاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ رات کے عمل دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے عمل رات کے اعمال سے پہلے اپنی طرف اٹھا لیتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے اگر اسے رو کر دیا جائے تو اس کے چہرہ قدرت کی شعائیں حدنگاہ تک اپنی مخلوق کو جلا کر خاکستر بنادیں (۲)۔ اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ وہ بعینہ آگ تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کے جہانوں میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ اس کا حجاب آگ ہے اور اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرہ قدرت کی نورانی شعائیں حدنگاہ تک مخلوق کو جلا کر رکھ دیں (۳)۔ چنانچہ اس تاویل کی بنا پر یہ آیت آیات مشابہات میں سے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُونَ اِذَا اُنْزِلَتْ عَلَيْهِمُ السَّحَابُ ۚ اَللّٰهُ فِيْ كُلِّ نَفْسٍ عَلِيمٌ وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ غم کے سائبانوں میں ان کے پاس آئے گا۔ چونکہ اس کلام میں عمل اور تشبیہ کا ہم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے اور وہ ہر مہم اور برائی سے بھی منزہ ہے اس لیے فرمایا وَشَبَّحْنِ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

۴۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا آگ میں برکت رکھ دی گئی۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ میں نے انہی کو یہ کہتے سنا کہ آگ اور اس کے ارد گرد والوں میں برکت رکھ دی گئی (۴)۔ اس معنی کی بناء پر لفظ من زائد ہے اور بودک النار اور بودک فی النار دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ عرب ایک ہی معنی میں یہ کہتے رہتے ہیں بارک اللہ، بارک فیہ اور بارک علیہ۔ اور معنی یہ ہے کہ آگ میں برکت رکھ دی گئی اور ان میں جو اس کے ارد گرد ہیں۔ اور وہ ملائکہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ اور آگ کو مبارک اسی طرح کہا گیا ہے جیسے اس قول باری تعالیٰ میں بعد کو مبارک کہا گیا ہے ”فِیْ الْاُفْقِیْنِ الْمُبَارَکَتِیْنِ“ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بابرکت ہے وہ جو آگ کی تلاش میں ہے یا جو آگ کی جگہ میں ہے۔ اس صورت میں مضاف مضاف ہے۔ یعنی اصل عبارت یہ ہے ”بُودَكَ مَنْ فِیْ طَلَبِ النَّارِ اَوْ مَنْ فِیْ مَكَانِ النَّارِ“ اور وہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام ہیں۔ اور من حول لہا سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو آگ کے ارد گرد ہاں حاضر تھے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے برکت کا سلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملائکہ کے ذریعے سلام پہنچایا جبکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا ”رَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْمَيْمَنَةِ“

اور یہ قول بھی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد ملائکہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ نور جو موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس میں ملائکہ تھے۔ ان میں تسبیح و تحمید اور پاکیزگی بیان کرنے والا آدمی تھا اور من حول لہا سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ ان کے قریب تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَنْ حَوْلُ لَهَا م ہے اور ان تمام کوشاں ہے جو اس وادی میں تھے یا اس کے ارد گرد شام کی اس سرزمین پر تھے جسے برکات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ سرزمین انبیاء کے معیشت ہونے کا مقام ہے۔ اور اس کا خطاب صرف آپ کو کرنا یہ اس کی بشارت ہے کہ آپ کے لیے ایسے امر عظیم کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی برکت شام کی اطراف و کناف میں پھیل جائے گی۔ مذکورہ تمام بیانات کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَنُفِخُ فِي الصُّورِ نَفْثًا تَشِيءُ کے وہم کو ختم کرنے کے لیے ہے جو کلام سننے سے پیدا ہوتا ہے اور اس امر کی عظمت پر تعجب کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

يَوْمَئِذٍ اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١﴾

”اے موسیٰ! وہ میں اللہ ہی ہوں عزت والا، دانہ والا“

اس میں ضمیر شان اِنَّا کا اسم ہے اور اَنَا اللہ اس کی خبر ہے۔ یا ضمیر منادی کے لیے اس کا اسم ہے اَنَّا اس کی خبر ہے اور لفظ اللہ اس کے لیے عطف بیان ہے اور الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ دونوں اس کی صفات ہیں جنہیں بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ اظہار فرمایا کہ میں قوت والا ہوں اور میں وہ کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہوں جو وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ جیسے عصا کو سانپ سے تبدیل کر دینا اور میں ہر کام حکمت اور تدبیر کے ساتھ کرنے والا ہوں۔

وَاَتَقَّ عَصَاكَ فَلَكَاسَ اِهَاتَهْتُمْ كَا تَهَا جَانٌّ وَلِي مُدَبِّرٍ اَوْ لَكُمْ يَعْقِبُ ۚ يَوْمَئِذٍ لَا

تَخَفُ ۚ اِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ ﴿٢﴾

”اور راز زمین پر ڈال دوا اپنے سونے کو، اب جو اسے دیکھا تو وہ (اس طرح) لہر اہر اٹھا جیسے سانپ ہو، آپ پیٹھ پھیر کر وہاں سے چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (فرمایا) موسیٰ! ڈر نہیں سے میرے حضور ڈر نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے۔“

اس کا عطف ہوؤک پر ہے اور یہ ان مقررہ کے محل میں داخل ہے۔ اور اس پر ایک اور مقام میں یہ قول دلالت کرتا ہے کہ وہاں اَنَّا اَلْقَى عَصَاكَ اس قول کے بعد ہے ”اَنِّي يَا مُوسٰى اِنِّي اَنَا اللّٰهُ تَوَاسَّيْ اَنْ تَكْرَهُ مَذْكُورٌ ہے۔ لہذا مفہوم یہی ہوگا کہ اس قول کے ساتھ بھی آپ کو منادی لگتی اور اس قول کے ساتھ بھی۔ پس یہ مقرر کا عطف مقرر پر کرنے کے قییل سے ہے۔ نہ کہ انشاء کا عطف خبر پر ہے۔

اس لیے جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا دیکھا تو وہ حالت اضطراب میں لہر اہر اٹھا گیا کہ وہ اپنے تیز دوڑنے اور کثرت اضطراب کے سبب خفیف سانپ ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام خوف کے سبب پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور واپس نہ لوٹے۔ لَمْ يَغْضَبْ، غَضَبُ الْمُقَابِلِ

سے شق ہے۔ یہ جب کہا جاتا ہے جب وہ بھاگنے کے بعد واپس لوٹ آئے۔

یہ جملہ انداء اور اس کا بالکل نصب میں ہے کیونکہ اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ یعنی ہم نے کہا اے موسیٰ! اس سانپ سے خوف نہ کھائیے۔ یہ یعنی میرے ساتھ ان کے قرب کی وجہ سے اور میرے حضور ان کے استقرار کی وجہ سے ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔ یہ جملہ خوف نہ ہونے کی علت بیان کرنے کے مقام میں ہے۔ یعنی وہ لوگ جو میرے پیغامات پہنچاتے ہیں وہ صرف مجھ ہی سے ڈرا کرتے ہیں، وہ میرے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس آیت کریمہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کے درمیان کوئی منافقا اور تضاد نہیں۔ اَنَا أَخْشَاكُمْ بِاللَّهِ (میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں)۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ استغراق کی زیادتی کے سبب نزول وحی کے وقت مطلقاً نہیں ڈرتے۔ یا چھٹی یہ ہے کہ بے شک ان کا انجام بد نہیں ہوگا کہ وہ ڈرتے رہیں۔

﴿إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلْ حِسَابًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي عَقُورٌ مِّنْ حَيْثُمُ ۝﴾

”مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر) نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد۔ تو میں بے

شک غمور رحیم ہوں ۝“

۱۔ کہا گیا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے۔ اور اس کا اشارہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قبلی کو مار ڈالا تھا۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو اپنے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں کرتا مگر ایسے گناہ سے جو ان میں سے کسی سے سرزد ہو جائے۔ یہاں ظلم سے مراد گناہ صغیرہ یا ترک افضل ہے۔ اسی بناء پر آگے ارشاد یہ ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْ حِسَابًا بَعْدَ سُوءٍ یعنی گناہ کے بعد توبہ کر لی۔ اس کا عطف ظلم پر ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ اس کے لیے یہ قید اس لیے ذکر کی گئی ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا جائز نہیں ہوتا اگرچہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا نبوت سے پہلے ہو مگر اس کے بعد وہ توبہ کر لیتے ہیں۔

۲۔ اس کا عطف بدّل پر ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ”فَإِنِّي أَغْفِرُ لَهُ وَأَرْحَمُهُ“ کہ میں اسے بخش دیتا ہوں اور اس پر رحم فرما دیتا ہوں۔ یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ بَدَّلْ آخر تک نیا کلام ہے اور یہ محذوف پر معطوف ہے اور یہ تمام لوگوں میں سے ظلم کرنے والوں کا حال بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”فَمَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلْ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ“۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ رسولوں کے لیے ظلم جائز ہی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی لَٰكِن مِّنْ ظَلَمٍ مِّنَ النَّاسِ وَهُمْ غَيْرُ الْمُفْسِدِينَ فَإِنَّهُمْ يُخَافُونَ اللَّهَ غَيْرَ اللَّهِ تَعَالَى (لیکن لوگوں میں سے جنہوں نے ظلم کیا اور اعمالیکہ وہ رسول نہیں بے شک وہ غیر اللہ سے ڈرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس حد کے استداراک ہے جو تمام سے خوف کی نفی کے بارے سینے میں ٹھک جاتا ہے اس کے باوجود کہ ان میں ایسے بھی ہیں جن سے صغیرہ سرزد ہوئے۔ لہذا تقدیر عبارت یہ ہوگی لَٰكِن مِّنْ صَدْرٍ مِّنْهُ صَغِيرَةً وَهَمًّا (لیکن ان میں سے وہ جن سے صغیرہ صادر ہوئے) کیونکہ اگرچہ ان سے صغیرہ صادر ہوئے لیکن اس کے بعد انہوں نے ایسا عمل کیا، جس نے صغیرہ کو مٹا ڈالا اور اس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رحمت کے مستحق بن گئے۔ چنانچہ وہ بھی غیر اللہ سے نہیں ڈرتے۔

لیکن مذکورہ دونوں تاویلیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سانپ سے نہیں ڈرے اور یہ امر واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَلَمَّا رَاَهَا ”وَلَمَّا مَذْبُورًا وَلَمْ يَغْتَبِ“ اور یہ ارشاد بھی ہے فَلَا يَجْسُ فِي تَفْسِيهِ خَيْفَةً مُّؤْمِنٌ مَّغْرِبٌ کہ اس سے مراد

انبیاء سے مطلق خوف کی نفی ہو کیونکہ یہ فرما دیا گیا ہے کہ ان کا انجام برائیں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ لیکن سیاق کلام اس سے موافقت نہیں کرتا کیونکہ جو بھی عنہ موجود ہے وہ سانپ سے خوف کھاتا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں اِلَّا مَحْشًى وَلَا ہے۔ یعنی "لَا يَخَافُ لَذِي الْمُرْسَلُونَ وَلَا الْمَذْبُوحُونَ النَّبِيُّونَ" (میرے حضور و راسخین کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے اور نہ تو بہ کرنے والے نگہار و رتے ہیں)۔ اس سے مراد مؤمنین صلحاء ہیں کیونکہ وہ معصوم عن الخطا نہیں اور نہ ہی گناہ سے مبرا ہیں لیکن جس نے توبہ کے ساتھ اپنے گناہ کو زائل کر دیا وہ اسی کی مثل ہو گیا جس سے گناہ صادر نہیں ہوتا۔ یہ تاویل بھی سابقہ دونوں تاویلوں کے طرح مطلق خوف کی نفی سے مناسب رکھتی ہے نہ کہ صرف غیر اللہ کے خوف سے۔

وَاَدْخُلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخَرُّبَ بَيْضَاءٍ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۗ فِي تِسْعِ آيَاتٍ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَتُورِهِمْ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا مُّسِيْقِيْنَ ۝۱۱

"اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں۔ وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا۔ بغیر کسی تکلیف کے س (یہ دو معجزے) (ان نو

معجزات سے ہیں جن کے ساتھ آپ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے شک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں ہے۔"

اس کا عطف الفی غضاک پر ہے۔ یعنی اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں۔ اور اس سے مراد قمیص کی طرف ہے۔

قاموس میں اسی طرح ہے (۱)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ خوبصورتی سے مراد قمیص ہے کیونکہ اسے کاٹا جاتا ہے۔ علامہ بخوی نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے کہا ہے۔ کہ آپ اون کا بنا ہوا ایسا جہ پہنے ہوئے تھے جس کی نہ کوئی آستین تھی اور نہ اس کے بٹن تھے۔

ج۔ فخر ج جواب امر ہونے کی وجہ سے مجروح ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "اِنَّ فُلْجُلْ يَدْكَ تَخْرُجُ" (اگر تو اپنا ہاتھ ڈالے گا تو وہ) سفید چمکتا ہوا نکلے گا۔ جس کا نور سورج کے نور پر بھی غالب آجائے گا۔ ترکیب میں بیضاء فخر ج کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔

س۔ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ اس سے مراد ہے "كَأَنَّهَا مِنْ غَيْرِ بَرَصٍ" (کی بنا پر) اس کے اسی طرح ہوگا۔ ترکیب کلام میں یہ بیضاء کی صفت ہے۔ یا اس کے لیے حال مرادف ہے۔ یا پھر بیضاء کی ضمیر سے حال ہے۔

ج۔ یعنی آپ کے یہ دو معجزے من جملہ ان نو معجزات میں سے ہیں۔ یا ان کے ساتھ مزید نو ہیں۔ اور وہ ہیں سمندر میں شگاف ہونا، طوفان آنا، بکری کا آنا، جو وں کا زیادہ ہونا، میز کوں کی کثرت، خون کا ظاہر ہونا، ان کے جنگلوں کا خشک ہو جانا۔ جنہوں نے عصا اور ہاتھ کے مجروح کو ان میں شمار کیا ہے انہوں نے آخری دونوں کو ایک شمار کیا ہے۔ اور فلق بحر کو ان میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ اس معجزہ کے ساتھ آپ کو فرعون کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے "اِذْ هَبْ فَيُتِسَعِ اَيَاتُ" (نو معجزات لے کر جاؤ) یا اس بناء پر ہے کہ ارسال کے ساتھ جملہ معجزات ہے۔ اور یہ قول اِلٰى فِرْعَوْنَ وَتُورِهِمْ اس کے متعلق ہے۔ اور پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق یہاں سبعون یا مرسل مقدر ہے اور یہ اَلّٰی اور اَدْخُلْ کے قائل سے تنازع الغلین کے اصول کے مطابق حال ہے۔

یہ یہ جملہ ارسال کے لیے علت بن رہا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ اَنْتَهُمْ اِيْنَا مُبْصِرًا تَقَالُوْا هٰذَا اِسْحٰرُ مُبِيْنٍ ۝۱۲

"پس جب آئیں ان کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت افروز بن کر لے تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے کھلا ہوا۔"

یعنی جب موسیٰ علیہ السلام وہ لے کر ان کے پاس آئے۔ درآسمانیکہ وہ بین اور واضح تھیں۔ مَبْصُرَةٌ صِدْقِ اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے۔ اور یہ اس چیز کی علامت ہے کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے اتنی زیادہ واضح تھیں کہ قریب تھا کہ وہ خود دیکھنے لگیں۔ اگر وہ ان چیزوں میں سے ہوتیں جو کچھ کہتی ہیں۔ یا اگر وہ ایسی آنکھ والی ہوتیں جس سے دیکھا جاسکتا ہے۔

عَلَّ تَوْفَرَعُونَ اور اس کی قوم نے کہا اس کی جادوگری واضح ہے۔ اور لَمَّا جَاءَهُمْ کَا بِلْمَہِ ایک مخدوف جملہ پر معطوف ہے۔ اور وہ تَوْفَعُیٰ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ”نُودِیْ اَنْ اَلٰی عَصَاکَ وَ اَذْجَلْ یَذْکَ فِیْ جِبِیْکَ اَذْهَبْ فِیْ تَسْعِ اَبَابِ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِہٖ“ یا یہ ”مَبْعُوْنَا اِلَیْہُمْ اَذْهَبْ اِلَیْہُمْ فَا لَقِیْ مُوسٰی عَصَاہُ وَ اَدْخَلَ یَدَہُ فِیْ حَبِیْبِہٖ ثُمَّ اَذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِہٖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ اِنَّا مُبْصِرَةٌ قَالُوْا اِهْذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ“

وَجَدُوْا اِیْہَا وَ اَسْتَفْقَتْہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَ عَلُوًّا فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝

”اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حال آنکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے لے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا۔ پس آپ ملاحظہ فرمائیے کیا (ہولناک انجام ہوا) فساد برپا کرنے والوں کا ہے“

یعنی انہوں نے ہماری علامات کا انکار کر دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اس کا عطف قَالُوْا پر ہے اور اَسْتَفْقَتْہَا اَنْفُسُہُمْ اصل میں ہے ”وَقَدْ اَسْتَفْقَتْہَا“ کیونکہ یہ داؤد حالیہ ہے۔ اور استحقاق ابقان کی نسبت زیادہ بلند ہے۔

عَلَّ ظُلْمًا وَ عَلُوًّا یہ دونوں مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ یا عَجَلُوْا کے فاعل سے حال ہیں۔ یعنی ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔ یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوئے انہوں نے دائمی آگ اجرت پر لے لی اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اس پر ایمان لانے سے تکبر کرتے ہوئے انہوں نے ایسا کیا۔ پس اسے مخاطب اَنَّا بَصِیْرٌ سے دیکھ۔

اس میں کیف کا کنی خبر مقدم ہے۔ اور اسے مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ اَنْظُرْ کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کے انجام کی کیفیت تو دیکھئے کس طرح انہیں دنیا میں غرق کر دیا گیا۔ اور موت کے بعد وہ آگ میں داخل کر دیئے گئے۔

وَلَقَدْ اَتٰیْنَا دَاوُدَ وَ سُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ

عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

”اور (یقیناً ہم نے عطا فرمایا) داؤد اور سلیمان کو علم لے اور انہوں نے کہا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے برگزیدہ

کیا ہمیں لے اپنے بہت سے مومن بندوں پر سے“

لے اور یقیناً ہم نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو ان کی طاقت بشریہ کے مطابق اپنی ذات و صفات اور احکام کا علم، دنیا اور آخرت کے احوال کا علم۔ پرندوں اور چوپاؤں کی بولیوں کا علم، پہاڑوں کی شیع اور لوہے کو نرم کرنے کا علم عطا فرمایا۔

لے اور انہوں نے اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں نبوت، کتاب اور دیگر

اس کے مال کا لگ نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں موقوف و محبوس ہو جاتا ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جو کچھ داؤد علیہ السلام کو دیا گیا تھا سلیمان علیہ السلام کو دہ بھی دیا گیا اور ہوا اور شیطین کی تسخیر کا اضافہ کیا گیا۔ اور مزید کہا کہ مقابلے نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا ملک داؤد علیہ السلام سے بڑا تھا اور سلیمان علیہ السلام اور ان سے زیادہ بہتر فیصلے فرمانے والے تھے اور داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام کی نسبت زیادہ عبادت گزار تھے اور سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ داؤد علیہ السلام بھی اسی طرح تھے۔

یہ اور سلیمان علیہ السلام نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کرنے کا ذکر ہے اور لوگوں کو مجھ سے ذکر کر کے تصدیق کے لیے بلانے کا ذکر ہے۔ نطق اور منطق سے مراد وہ الفاظ ہیں جن سے مافی الضمیر کو بیان کیا جائے، چاہے وہ مفرد ہوں یا مرکب۔ قاموس میں ہے نطق ينطق منطقاً ومنطقاً و نطقاً ایسے حروف اور آواز کے ساتھ کلام کرنا جس سے معانی کو پہچانا جاسکتا ہو (2)۔ تو جب لوگوں کے لیے معانی کی پہچان ان الفاظ میں منحصر ہے جن سے انسان گفتگو کرتے ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے اور جب سلیمان علیہ السلام پرندوں کی آواز سے ان کا مافی الضمیر اس طرح سمجھنے لگے جیسے انسان کی کلام سے سمجھتے تھے تو ان کا نام منطق رکھا۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت کعب سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنگلی کبوتر آکر چلایا۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** (تم موت کے لیے جنم لو اور بربادی کے لیے عمارتیں بناؤ) فائدہ آکر چھٹی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کاش یہ مخلوق پیدا نہ کی جاتی۔ مور آکر بولنے لگا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے **"كَيْفَ قَدِيرُنْ قُدَّانُ"** جیسا کہ مرگے دیا مجھ کو (میرے بد چھیننے لگا تو آپ نے کہا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے **"مَنْ لَا يُزَحِمُ لَا يُزَحِمُ"** (جو نرم نہیں کرے گا اس پر نرم نہیں کیا جائے گا) مرد (ایک چھوٹا سا پرندہ) چیخا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے **"إِسْتَفْغِرُوا اللَّهَ يَا مَعْذِبُونَ"** (اے گنہگارو! اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو) طیلوی (کونج کی قسم کا ایک پرندہ) بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے **"مَنْ خَلَقَ خَيْرَ مَيْثٍ وَشَرِّ خَلْقٍ خَلَقَ يَدَ بَابٍ"** (ہر زندہ مرنے والا ہے اور ہر نئی چیز پرانی ہونے والی ہے) خطاب بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے **"قَلْبُهُمَا خَيْرٌ مِنَ جَذْوَةٍ"** (تم نیکی اور بھلائی آگے سمجھو اسے پالو) کبوتری چلانے لگی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے **"سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى بَلَاءً مَسْمُومًا وَابَهُ وَأَرْجُهُ"** (میری عظمت و شان والے رب پاک نے پاکی سے اپنے آسمانوں اور زمین کو بھرا ہوا ہے) قمری چلائی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے **"سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى"** آپ نے فرمایا کوا چٹکی لینے والوں کو لیے بد دعا کرتا ہے اور جیل کبھی ہے اللہ تعالیٰ کے

سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ قسطاً کہتی ہے جو خاموش رہا وہ سلامت رہا۔ اور طوطا کہتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے جس کا مقصد مدعی دنیا ہے۔ مینڈک کہتا ہے ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ اور باز کہتا ہے ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْوَهَّابِ“ اور مینڈک ہر زبان کے ساتھ رب کریم کی سیاحت کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت کھول سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس آکر دراج (تیتڑ) چلایا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ فرد کہتی ہے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے بلبل کے پاس سے گزرے جو اپنا سر بلارہا تھا اور دم جھکانے ہوئے تھا۔ تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا اللہ اور اس کا نبی ہی بہتر جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے اَكْبَلْتُ وَبَصِيفَ قَصْرَةٍ فَقُلِيَ الدُّنْيَا الْعَفَا (1)۔ یہود کی ایک جماعت سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو کہا کہ ہم سات چیزوں کے بارے میں سوال کریں گے اگر آپ نے ہمیں بتا دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور ہم تعذیب کر لیں گے۔ تو آپ نے فرمایا اتفق کے ارادہ سے پوچھو، نہ کہ تلہیں اور اذیت دینے کے لیے۔ تو پھر انہوں نے کہا ہمیں بتاؤ قصہ (چندول) اپنی آواز میں کیا کہتا ہے؟ سرخ اپنی چیخ مینڈک اپنی آواز میں، گدھا اپنی پیٹنگ میں اور گھوڑا اپنے ہنہانے میں کیا کہتا ہے۔ اسی طرح زرزور اور دراج کیا کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا ہاں سنو۔ قصہ کہتا ہے ”اَللّٰهُمَّ الْعَنُ مُبِيعِضِيْ مُحَمَّدٍ وَمُبِيعِضِيْ اَبِيْ مُحَمَّدٍ“ (اے اللہ! محمد اور ال محمد کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔) سرخ کہتا ہے ”اَذْكُرُوْا اللّٰهَ يَا عَافِلُوْنَ“ (اے غافلو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) مینڈک کہتا ہے ”سُبْحَانَ الْعُظُوْدِ فِيْ لُحُجِّ الْبَحَارِ“ (پاک ہے وہ ذات جس کی عبادت سمندروں کی گہرائی میں کی جاتی ہے۔) گدھا کہتا ہے۔ ”اَللّٰهُمَّ الْعَنُ الْعِشَارَ“ (اے اللہ! چنگی وصول کرنے والوں پر لعنت بھیج) جب معرکہ کارزار میں مفیض بالتقابل ہوتی ہیں تو گھوڑا کہتا ہے ”مَسُوْحٌ قُدُوْسٌ رَبِّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ“ رب کریم کی پاکیزگی اور حمد کرتا ہے۔ زرزور کہتا ہے ”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ قُوَّتَ یَوْمٍ یُّوْمٍ“ (اے اللہ! میں تجھ سے ایک ایک دن کی خوراک کا مطالبہ کرتا ہوں) اور دراج کہتا ہے ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی“ یہ سن کر یہود اسلام لے آئے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا بنایا (2)۔ حضرت امام جعفر بن محمد صادقؑ اپنے باپ اور دادا کے واسطے سے حضرت امام حسینؑ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب گدھ چٹختی ہے تو کہتی ہے اے ابن آدم! جتنا چاہے کسی چیز کو پسند کر لے یا آخر اسے بھی موت ہے۔ جب عقاب چلاتا ہے تو وہ کہتا ہے لوگوں سے دور رہنے میں ملتا ہے۔ جب قصہ آواز نکالے گا تو وہ کہتا ہے اے اللہ! محمد ﷺ کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔ جب خطاف چلتا ہے تو کہتا ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اور پھر الصّٰلِحِیْنَ کو قاری کی طرح مد کے ساتھ پڑھتا ہے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ پرندوں کی آوازوں کی جو شرح حضرت کعب نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے نقل کی ہے اور اسی طرح جو کھول اور فرد کے واسطے آپ علیہ السلام سے مروی ہے یہ اس کا احتمال رکھتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک واقعہ پر محمول کیا جائے۔ یہ مذکورہ کلمات میں ان کی بولی کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ پاک میں جیوتی اور ہدایہ کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ صراحتاً اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اس امر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جو انہیں پیش آئے۔ لیکن یہود کے سوالات اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے ان کے جوابات اس پر دلالت کرتے

ہیں کہ ان کی گفتگو ان ہی کلمات میں محصور ہے جو ذکر کیے گئے ہیں۔ لہذا اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر اس کی تاویل لازم ہے۔ واللہ اعلم۔
اس سے مراد اس شے کی کثرت ہے جو انہیں عطا کی گئی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”فَلَا تَقْصِدْ خُلًّا أَحَدٌ وَتَغْلَمْ كُلُّ شَيْءٍ“ (فلاں ہر ایک کا قصد کرتا ہے اور ہر شے جانتا ہے۔) اور اسی کی مثل یہ بھی ہے وَأَوْفَيْتُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (اور ہر چیز عطا کی گئی)۔ علمنا اور اوتینا میں ضمیر حضرت سلیمان اور آپ کے والد محترم حضرت داؤد علیہم السلام کے لیے ہے۔ یا آپ کے لیے اور آپ کے تبعین کے لیے ہے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کے تبعین آپ سے وہ کچھ اخذ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ یا یہ ضمیر صرف آپ کے لیے ہے اور یہ قواعد سیاست کی رعایت کرتے ہوئے ملوک کی عادت کے مطابق تعظیم کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد نیا اور آخرت کے امور میں سے ہر شے ہے۔ اور مقابل نے کہا ہے یعنی نبوت، ملک اور ہوا اور شیاطین کی تسخیر۔ (1)
یہ بے شک یہ عطا ہمارا استحقاق نہیں یا یہ ہمارے اعمال کی جزاء نہیں بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اس میں ہمارے سوا دیگر لوگوں کی نسبت زیادتی بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ قول بطور شکرانہ نعت وارد ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ”أَنَا سَيِّدٌ وَلِدِ الْأَدَمِ وَمَنْ ذُوْنَةُ تَحْتِ الْبَوَائِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ (2) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر غور نہیں۔ آدم علیہ السلام اور آپ کے سوا تمام لوگ قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی پیروی کی ہے وَأَقَامَ بَهْجَةً رَتَبًا فَصَحَّتْ۔ علامہ بوہوتی نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام زمین کے مشارق ومغرب کے مالک تھے اور آپ نے ساڑھے سات سو سال تک تمام اہل دنیا، جن وانس، پرند، چرند اور درندوں پر حکومت کی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر شے کی زبان (بولی) کا علم بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ اور آپ کے زمانہ میں عجیب و غریب صنعت و کاریگری کا اظہار ہوا۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿٢٥﴾

”اور فراہم کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے لیے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے، پس وہ نظم و ضبط کے پابند ہیں۔“
آپ کے لیے سفر میں جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے لشکر جمع کیے گئے۔ پس وہ رک جاتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یعنی ان کا اول حصہ آخری حصہ کو ساتھ ملنے سے روک لیتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنی کثرت کے باوجود رو نہیں رہتے۔ قابضوں میں ہے وزعہ ای کففتہ۔ اور اسی سے الوزعہ جو ازاع کی جمع ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو محارم، کتے، اور جھگڑا فساد سے روکنے والے ہیں (3) توزیع کا معنی تقسیم اور تفریق ہے۔ اسی طرح ایزاع اور توزع میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔ مقابل نے کہا ہے کہ يُوزَعُونَ کا معنی ہے يُنْصَفُونَ (انہیں چلایا جا رہا ہے)۔ سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے ”يُوزَعُونَ“ (ان سے نظم و ضبط کی پابندی کرائی جاتی ہے)۔ محمد بن کعب نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی چھاؤنی سو فرخ میں تھی۔ ان میں سے بچیس فرخ جنوں کے لیے تھے، بچیس انسانوں کے لیے، بچیس پرندوں کے لیے اور بچیس فرخ دیگر جانوروں کے لیے تھے۔ آپ کے لیے کلوی کے تخت پر سو گھر تھے جن میں آپ کی باندیاں رہائش پذیر تھیں ان میں سے تین سو منگہ تھیں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ آپ چیز ہوا کو

حکم دیتے تھے تو وہ آپ کو اوپر اٹھائی تھی آپ اسے خوشگوار رہنے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ آپ کو لے کر چلتی رہتی تھی۔ پس ایک دن وہ زمین و آسمان کے درمیان چل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے آپ کی حکومت میں اضافہ کر دیا ہے، وہ اس طرح مخلوق سے جو بھی کہیں بات کرے گا ہوا سے آپ کے پاس لے آئے گی اور آپ کو اس سے آگاہ کر دے گی۔ (1)

حَتَّىٰ إِذَا تَوَاسَىٰ وَاِذِ النَّبِيُّ قَالَتْ نَسَلَةٌ يَأَيُّهَا النَّبِيُّ اذْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ لَا يَحْطُمُكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥١﴾

”یہاں تک کہ جب وہ گزرے حیوٹیوں کی وادی سے۔ تو ایک حیوٹی کہنے لگی اے چوہو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں سے کہیں پل کر نہ رکھیں تمہیں سلیمان اور ان کے لشکر سے اور انہیں معلوم ہی نہ ہو (کہ تم پر کیا گزر گئی)۔“

لہٰذا وہ اس نے یہاں کے ساتھ وقف کیا ہے اور پڑھا ہے وادی، جبکہ باقیوں نے بغیر یہاں کے پڑھا ہے۔ اس میں ایتھان کو علی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ ان کا آنا اور پر کی جانب سے تھا یا پھر اس لیے کہ اس سے مراد ہے آپ نے اسے عبور کیا۔ یہ اس قول سے ماخوذ ہے اِنَّمَا عَلٰی الشَّيْءِ۔ جب کوئی اسے عبور کرے اور اس کے آخر تک پہنچ جائے۔ وہ بے بن مہ حضرت کعب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب سوار ہوتے تو آپ اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال، خدام اور ملازمین کو بھی سوار کر لیتے اور اس تخت پر ایسے بار چڑھاتے جتنے جہن میں روٹی کے لیے بڑے بڑے تور ہوں گے اور اتنی بڑی نو دیکھیں ہوتیں جن میں سے ایک دیک میں دس اونٹ پکائے جانے کی گنجائش ہوتی۔ اور اسی پر چو پاؤں وغیرہ کے لیے میدان بھی بنا لیتے۔ چنانچہ آپ کے سامنے ہی طرغ بائیاں تیار کرتے اور نان بانی روٹیاں پکاتے اور زمین و آسمان کے درمیان چو پائے میدانوں میں دوڑتے۔ اور ہوا چلتی رہتی۔ پس ایک دفعہ آپ نے اصطر سے یمن کی طرف سفر کیا۔ اور مدینہ الرسول ﷺ سے آپ کا گزر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا ”هَذَا ذَا هَجْرَةِ النَّبِيِّ اَخْبِرِ الزُّمَانَ طُوبٰى لِمَنْ اَمِنَ بِهِ وَطُوبٰى لِمَنْ اَتْبَعَهُ“ (یہ آخر الزمان نبی ﷺ کا مقام ہجرت ہے، خوش نصیب ہیں وہ جو آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اور مبارکباد کے لائق ہیں وہ جو آپ ﷺ کی اتباع کریں گے) آپ علیہ السلام نے کعب کے ارد گرد بتوں کو دیکھا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کعب شریف سے آگے تہاؤ فرما ہوئے تو وہ رونے لگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی طرف وحی فرمائی کہ یہ چیز تجھے راز رہی ہے؟ تو اس نے عرض کی اے میرے رب! مجھے اس چیز نے رلا یا ہے کہ بے شک تیرے انبیاء علیہم السلام میں سے یہ نبی اور اولیاء کی پوری جماعت میرے پاس سے گزری لیکن انہوں نے میرے پاس نماز ادا نہیں کی حالانکہ تجھے چھوڑ کر میرے ارد گرد بتوں کی عبادت کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی تو نہرو۔ بے شک میں تجھے کچھ وقت کے بعد عہدہ کرنے والے چروں سے بھر دوں گا اور میں تجھ میں بنا قرآن نازل کروں گا۔ اور تجھ میں اپنا وہ نبی آخر الزمان مبعوث کروں گا جو مجھے تمام انبیاء میں سے محبوب تر ہے۔ اور میں تجھ میں اپنی مخلوق میں سے وہ آباد کروں گا جو میری عبادت کرے گی۔ اور میں اپنے بندوں پر ایک فریضہ (ج) فرض کروں گا۔ اور وہ تیرے اس طرح قریب ہوں گے جیسے گلہ اپنے گھونسلے کے قریب ہوتی ہے۔ اپنی اپنے بچوں کے لیے مشتاق ہوتی ہے۔ اور کہوتی اپنے انڈوں کے لیے مضطرب ہوتی ہے۔ اور میں تجھے بتوں اور شیاطین کی عبادت کرنے والوں سے پاک کر دوں گا۔ پھر

آپ چلے گئے یہاں تک کہ آپ کا گزر طائف کی وادیوں میں سے وادی ہمدیر سے ہوا تو اس طرح آپ وادی النمل میں پہنچے (1)۔ کعب نے کہا ہے کہ یہ طائف کی ایک وادی ہے۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ شام کی سرزمین میں ہے (2)۔ یہ قول بھی ہے یہ ایک وادی ہے جس میں جن رہا کرتے تھے اور ان چوٹیوں پر وہ سواری کیا کرتے تھے۔ فرق الکمری نے کہا ہے کہ اس وادی کی چوٹیاں مکھو کی مثل تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بناتی اونٹ کے برابر تھیں۔ اور مشہور یہ ہے کہ یہ قول کرنے والی چوٹی چھوٹی تھی۔ (3) ع۔ امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ وہ چوٹی دو پروں والی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ لنگڑی تھی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس کا نام طایہ تھا۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس کا نام ہمدی تھا۔ (4)

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا لِّقَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِي اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ
عَلَى الْبَرِيَّةِ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ①

”تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیے۔ اس کی اس بات سے جہ اور عرض کرنے لگے میرے مالک! مجھے توفیق دے کہ میں
تاکہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت (عظمیٰ) کا جو تو نے مجھ پر فرمائی اور میرے والدین پر۔ نیز (مجھے توفیق دے کہ) میں
وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے اور شامل کر لے مجھے اپنی رحمت کے باعث اپنے نیک بندوں میں۔“

۱۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کا ماس طرح ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کا قول سنا اور اس کا معنی سمجھا تو آپ نے
جو سنا اس سے آپ خوش ہوئے اور آپ نے اس کا ادا رک کیا جسے آپ کے سوا نہ کوئی سن سکتا تھا اور نہ اس کا ادا رک کر سکتا تھا۔ اور آپ
نے اس پر سرت کا اظہار فرمایا کہ چوٹی نے آپ کو اور آپ کے لشکر کو بدل کے وصف سے متصف کیا یا پھر آپ نے اس چوٹی کے
ڈرنے اور ڈرنے اور اپنے مصالح کی طرف راہنمائی کرنے پر تعجب کا اظہار کیا تو آپ فرحت و انبساط کا اظہار کرتے ہوئے یا تعجب
کنان ہوتے ہوئے مسکرا دیے اور ”ضاحکاً“ یہ تبسم کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ نے اتنا زیادہ تبسم فرمایا کہ وہ خشک
(ہنسنے) تک پہنچ گیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محدوہ یعنی آپ نے اتنا شدید تبسم فرمایا گویا کہ آپ ہنسنے لگے۔ اور یہ فقط قائمہ کے
طریقہ پر ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا زیادہ سے زیادہ تبسم تبسم ہی ہے (۱)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ کے مسکرانے کی
ابتداء تبسم اور اس کی اختتام خشک تھا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے آپؐ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی رسول
اللہ ﷺ کو اس طرح کھل کر ہنسنے نہیں دیکھا کہ میں نے آپ کے طلق کے کوئے کو دیکھا یا ہو۔ آپ ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے۔
اسے بخاری نے روایت کیا ہے (۲)۔ حضرت عبداللہ بن حارث بن جزاء سے روایت ہے کہ میں نے کسی کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ
تبسم کرنے والا نہیں دیکھا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (۳)

۲۔ یعنی آپ چوٹی کے قول کے سبب مسکرائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے لشکر کو روک لیا یہاں تک کہ چوٹیاں اپنی بلوں میں داخل ہو گئیں۔
۳۔ اپنی طرف سے ادا سے شکر کا حق ادا کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شکر پر مدد و طلب کرتے ہوئے آپ نے التجاء کی وارش اور
بڑی نے اُوزِ غنی گویا ہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور معنی یہ ہے اسے میرے
رب مجھے توفیق عطا فرما۔ کہا گیا ہے کہ یہ بھی اس کا اسی طرح حقیقی معنی ہے جیسے اس کا معنی قید کرنا اور دو کنا سے قائموس میں اسی طرح
ہے (۴)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح کر دے کہ میں تیری نعمت کو شکر کے سبب اپنے پاس روک سکوں
اور اسے اس طرح مربوط کروں کہ کہیں بھی نہ وہ مجھ سے جدا ہو اور نہ میں اس سے علیحدہ ہوں۔ اور بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کا
معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح بتا دے کہ میں اپنے آپ کو کفران نعمت سے روک سکوں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مجھے اپنے سوا ہر شے سے
روک لے۔

۴۔ تاکہ میں تیری نعمت عظمیٰ کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی کیونکہ والدین پر تو انعام ہے ہی لیکن لوگوں

میں سے کسی کا صالح اور نیک بیٹا ہونا اس بیٹے پر بھی انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْاَشْيَاءُ بِمَنْزِلَتِهَا وَمَا اَلَكُم مِّنْ عَذَابٍ مِّنْ شَيْءٍ۔

یہ اور میں اپنی بقیہ عمر میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے۔ اور مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے گروہ میں داخل کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ کی اس سے مراد حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوبؑ علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی معیت ہے۔ (1)

وَتَقْفَدْ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِي لَا أَمْرِي الْهَدُّ هُدًى أَمْرُكَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ③

”اور آپ نے (ایک روز) پرندوں کا جائزہ لیا۔ تو فرمانے لگے کیا وجہ ہے کہ مجھے (آج) ہد نہ نظر نہیں آ رہا، یا وہ ہے ہی غیر حاضر؟“

۱۔ آپ نے پرندوں کو طلب کیا اور ان کا جائزہ لیا۔ التفقد کا معنی ہے گمشدہ چیز کو تلاش کرنا۔ تو آپ نے ان میں ہد ہد کو نہ پایا اور اسے طلب کرنے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی منزل پر اترتے تو پرندوں کا لشکر آپ کو سورج کی دھوپ سے سایہ میا کرتا تھا۔ پس ہد ہد زمین کے نیچے پانی کی جگہ اس طرح پالیتا تھا جیسا کہ وہ شمشے میں دیکھ رہا ہو اور وہ پانی کے قریب یا دور ہونے کو پہچان لیتا تھا پھر وہ اس جگہ سے زمین کو کریدتا تھا پھر جنات آجاتے، وہ اسے کھودتے اور وہاں سے پانی نکال لیتے تھے (2)۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ آپ ہی سے حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ذکر کیا تو تابع بن اذرق نے انہیں کہا اے بیان کرنے والے! دیکھ کیا کہہ رہا ہے بے شک ایک بچہ جال بچھا تا ہے اور اس پر مٹی بکھیر لیتا ہے اتنے میں ہد ہد آتا ہے اور وہ جال کو نہیں دیکھ سکتا یہاں تک کہ وہ اپنی گردن میں داخل کر لیتا ہے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے کہا تیری ہلاکت ہو بے شک جب تقدیر آ جاتی ہے تو دیکھا ہی نہیں دیتا۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب تھناؤ قدر آ جاتی ہے تو بینائی جاتی رہتی ہے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام ایک منزل پر اترے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لوگوں نے پانی تلاش کیا لیکن نہ پایا۔ چنانچہ ہد ہد کو طلب فرمایا تا کہ وہ پانی پر راہنما کی کرے (3) لیکن آپ نے اسے نہ پایا اور گمان یہ ہوا کہ وہ حاضر ہے لیکن وہ کسی پر سے یا اور وجہ سے دیکھا ہی نہیں دیا۔

۲۔ یہ جملہ تَقْفَدْ الطَّيْرَ پر معطوف ہے اور وہ محذوف پر معطوف ہے جو اس پر معطوف ہے ”وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ“ تقدیر کلام یہ ہے کہ آپ نے پرندوں کو سایہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس دھوپ آپ کے تحت پر پڑی تو آپ نے دیکھا اور پرندوں کو طلب کیا (أَمَرَ الطَّيْرَ بِالْاِظْلَالِ فَوَقَعَ الشَّمْسُ عَلَى سِرْبِهِ فَظَنَرَ وَتَقْفَدَ الطَّيْرُ) یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ سلیمان علیہ السلام اور آپ کے لشکر کو دکھایا گیا پس آپ ایک منزل پر اترے تو آپ نے پانی نہیں پایا پھر آپ نے ہد ہد کو تلاش کیا اور پرندوں کو طلب کیا تو ارشاد فرمایا ”هَآئِي لَا أَرَى الْهَدُّ هَذَا أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ“ قتالی کو عاصم، ابن کثیر، کسائی اور بشام نے یا مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یا، ساکن کے ساتھ۔ اور اس میں استفہامِ تعجب کے لیے ہے۔ اور جملہ لا ادری ضمیر شکلم سے حال ہے اور اس میں عامل

معنی تعجب ہے۔ پس جب آپ نے اسے تلاش کرنے کے بعد نہیں دیکھا اور یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو آپ نے اس کے بارے پوچھا اور جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے صحیح ہونے کے بارے میں سوال کیا اور فرمایا۔ ”اُمّ کنان“ یہ امّ مقطّعہ ہے اور بیل کے معنی میں ہے۔ یعنی بیل اُکنان اَلْهَذَ هَذَ ”مِنَ الْغَالِبِينَ“ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو فرمایا۔

لَا عَذْبَ بَكَّةَ عَدَا ابَا سَيْدٍ اَوْ لَا اَذْبَحَصَةَ اَوْ لَيْتَنِي بَسْطَنَ مُهْمِبِينَ ①

”(اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں ضرور اسے سخت سزا دوں گا۔ یا اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا یا اسے لانا پڑے گی۔ میرے پاس کوئی روشن سند ہے“

۱۔ میں اُسے سخت سزا دوں گا تاکہ اس سے اس کی جنس کے دیگر افراد (بد بد) عبرت حاصل کریں۔ پھر عذاب شدید کے بارے مختلف اقوال ہیں مثلاً ایک قول یہ ہے کہ عذاب شدید سے مراد یہ ہے کہ اس کے پر اور دم نوج ڈال جائے گی اور اسے بالوں سے تنگا دھوپ میں ڈال دیا جائے گا اس طرح کہ وہ حیوانیوں اور زمینی کیڑے کوڑوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے میں اس پر تار کول کا طلاء کر اسے دھوپ میں ڈال دوں گا (۱)۔ ایک قول یہ ہے کہ میں اسے بھجرے میں بند کر دوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ میں اسے اپنی مادہ سے جدا کر دوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ میں اسے اس کے مخالف کے ساتھ قید کر دوں گا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ میں اسے اس کے ساتھیوں کی خدمت پر مامور کر دوں گا۔ اور یہ قبیح کا عذاب دینا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جائز تھا۔

۲۔ لیتا ہوں کہ ابن کثیر نے دونوں کے ساتھ پڑھا ہے ان میں سے پہلی نون مشد و مفتوح ہے اور دوسری نون و قایہ ہے۔ اور باقی قراء نے ایک نون مشد و مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳۔ بَسْطَنَ مُهْمِبِينَ کا معنی ہے کہ وہ اپنے غائب ہونے کے بارے میں کوئی واضح دلیل اور ظاہر عذر میرے پاس لے آئے۔ حلف فی الحقیقت دو میں سے ایک پر ہوتا ہے جبکہ تیسرا نہ ہو۔ لیکن جب تین میں سے ایک کے وقوع کا تقاضا ہو تو پھر مخلوف علیہ تیسرا ہوتا ہے اور اس کا عطف پہلے دو پر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَوْ لَيْتَنِي میں اَوْ بمعنی الا ہو۔ جیسا کہ اس قول میں ہے لا لزمک او تعطینی حق یعنی الا ان تعطینی حق۔ (میں ضرور تجھے لازم پکڑے رکھوں گا مگر جب تو میرا حق ادا کر دے)

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ نَحْطُ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبِيلٍ لَّيْتَنِي لَئِقْتَنِي ②

”پس کچھ زیادہ دیر نہ گزری (کہ وہ آگیا)۔ اور کہنے لگا میں ایک ایسی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ جس کی آپ کو خبر نہ تھی۔“

۱۔ اور (وہ یہ کہ) میں لے آیا ہوں آپ کے پاس ملک سہا سے۔ ایک یقینی خبر ہے۔“

۲۔ عاصم اور یعقوب نے مَكَثَ کو کاف کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے ضم کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا مفہوم ہے کہ اس کا ظہر نا طویل نہیں تھا یا اس کے غائب رہنے کا زمانہ زیادہ لمبا نہیں تھا۔ اس سے مراد اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ فوراً واپس لوٹ آیا کیونکہ اسے اپنی ذات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا خوف تھا۔

۳۔ علماء نے بد بد کے غیب ہونے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے سرزمین حرم کی طرف نکلے کا ارادہ کیا اور پھر وہاں جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ مقیم رہے۔ آپ مکہ مکرمہ میں اپنے طویل قیام

کے دوران ہر روز پانچ ہزار اونت (نحر) قربان کرتے تھے۔ اور پانچ ہزار تیل اور بیس ہزار مسند سے زنج کیا کرتے تھے۔ آپ کی قوم کے اشراف میں سے جو بھی آپ کے پاس حاضر ہوتا آپ اسے فراتے یہ وہ جگہ ہے جہاں سے عربی نبی (ﷺ) کا ظہور ہوگا اس کے اوصاف یہ ہوں گے کہ مخالفین کے مقابلے میں وہ فتح مند ہوں گے۔ ایک ماہ کی مسافت سے اس کا رب چھا جائے گا۔ اس کے نزدیک دور و نزدیک (رہنے والے) برابر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی لومۃ لائم کی اسے پروا نہیں ہوگی۔ حاضرین نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! وہ کون سادین لے کر آئے گا تو آپ نے فرمایا وہ دین حنیف لے کر تشریف فرما ہوگا۔ پس خوش بخت ہیں وہ جو ان کا زمانہ پائیں گے اور ان پر ایمان لائیں گے۔ پھر حاضرین نے عرض کی ہمارے اور ان کے ظہور کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایک ہزار سال۔ پس تم میں سے جو حاضر ہیں وہ ان تک یہ پہنچادیں جو حاضر نہیں۔ بے شک وہ سید الانبیاء ہیں اور تمام رسولوں کے خاتم ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ آپ مکہ میں مقیم رہے یہاں تک کہ اپنے قربانی کے جانور ختم کر دیئے۔ پھر آپ مکہ سے نکلے اور صبح صبح یمن کی طرف چلے اور زوال کے وقت صنعا پہنچ گئے اور یہ ایک ماہ کی مسافت پر تھا آپ نے ان کی حسین و جمیل زمین دیکھی جس پر سبزہ لہلہا رہا تھا اور وہ انتہائی پر رونق تھی تو آپ نے وہاں اترنا پسند فرمایا کہ یہاں نماز پڑھیں گے اور کھانا تناول فرمائیں گے۔ لہذا جب آپ اتر گئے تو بد نے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو اترنے میں مصروف ہیں میں کیوں نہ آسمان کی طرف چڑھ جاؤں اور دنیا کے طول و عرض کا نظارہ کروں۔ تو اس نے ایسا ہی کیا۔ پس اس نے دائیں بائیں دیکھا تو اس کی نظر بقیس کے باغ پر پڑی۔ چنانچہ وہ اس کی شادابی کی طرف مائل ہوا۔ اور اس میں اتر گیا۔ وہاں بھی ایک بد بد تھا۔ اس کے پاس اتر۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بد بد کا نام عثور تھا اور یمن کے بد بد کا نام عنصر تھا۔ پس عنصر یمن نے عثور سلیمان سے پوچھا تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو اس نے جواباً کہا میں اپنے مالک سلیمان بن داؤد کے ساتھ شام سے آیا ہوں۔ اس نے پوچھا سلیمان کون ہیں؟ تو اس نے کہا وہ جن و انس، شیاطین، طیور و وحش اور ہواؤں کے شہنشاہ ہیں۔ پھر اس نے پوچھا تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے کہا میں انہی شہروں میں رہنے والا ہوں۔ اس نے پوچھا یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ اس نے کہا ایک عورت جسے بقیس کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ تمہارا مالک بھی بہت بڑا بادشاہ ہے لیکن بقیس کی بادشاہی بھی اس سے کم نہیں۔ وہ سارے یمن کی ملکہ ہے اس کے ماتحت بارہ ہزار قاصد ہیں اور ہر قاصد کے ماتحت ایک لاکھ جنگجو آدمی ہے۔ کیا تو میرے ساتھ چلا ہے کہ تو خود اس کی حکومت کا نظارہ کرے؟ اس نے جواباً کہا مجھے یہ خوف ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نماز کے وقت مجھے طلب فرمائیں گے جب انہیں پانی کی ضرورت ہوگی۔ تو یمنی بد بد نے کہا کہ تیرا مالک خوش ہو جائے گا جب تو اس ملکہ کی خبر اسے پہنچائے گا۔ چنانچہ یہ اس کے ساتھ چل پڑا اور بقیس اور اس کے ملک کا نظارہ کیا۔ اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس عصر کے وقت واپس لوٹا۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے نزول فرمایا اور نماز کا وقت داخل ہوا۔ چونکہ آپ کا یہ بڑا اسی جگہ تھا جہاں پانی نہیں تھا۔ پھر آپ نے جن و انس اور شیاطین سے پانی کے بارے میں پوچھا۔ لیکن انہوں نے کہیں نہ پایا۔ تو پھر آپ نے بد بد کو طلب فرمایا لیکن بد بد بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے پرندوں کے قاصد کو بلایا۔ اور وہ گدھ تھی اور اس سے بد بد کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ بادشاہ کے ملک کو سلامت رکھے میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟ اور میں نے اسے کہیں بھی نہیں بھیجا۔ تو اس وقت آپ غصے ہوئے اور فرمایا "لَا عَذِيبَتهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَا ذُبْحَتهٗ اَوْ لَیَّا بَنِي" اور میں نے اسے کہیں بھی نہیں بھیجا۔ تو اس وقت آپ غصے ہوئے اور فرمایا "لَا عَذِيبَتهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَا ذُبْحَتهٗ اَوْ لَیَّا بَنِي"

بِسُلْطَانِ مُبِينٍ“ پھر آپ نے پرندوں کے سردار عقاب کو بلایا اور فرمایا اسی وقت میرے پاس ہد کو حاضر کرو۔ پس عقاب آسمان کے قریب تک بلند ہو گیا یہاں تک کہ وہ ہوا کے ساتھ چٹ گیا۔ اور اس نے دنیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسا کہ تمہارے سامنے ایک پیالہ ہو۔ پھر اس نے دائیں بائیں توجہ ڈالی تو چاہا کہ دیکھا کہ ہد یمن کی طرف سے آ رہا ہے۔ پس عقاب بھی اس کے ارادے سے اس کی طرف چل پڑا۔ جب ہد بد نے اسے دیکھا تو جان گیا کہ عقاب غلط ارادے سے ہی اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ تو اس نے کہا قسم ہے اس اللہ تعالیٰ کی جس نے تجھے جھ پرتوت دی اور قدرت عطا فرمائی، خبردار! تو میرے ساتھ رحم کا سلوک کر اور میرے ساتھ برائی سے پیش نہ آ۔ تو اس کے سبب عقاب نے اس سے پیٹھ پھیر لی اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو، تیری ماں تجھے روئے، بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی نے قسم کھائی ہے کہ وہ تجھے ضرور سزا دیں گے یا تجھے ذبح کر دیں گے۔ پھر دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اڑنے لگے۔ جب وہ فکرمے کہ پاس پہنچے تو گدھ اور دوسرے پرندوں نے اسے چھپت لیا اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو آج کے دن تو کہاں غائب رہا؟ اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام تجھے سزا دیں گے۔ اور جو کچھ آپ نے فرمایا تھا اس کے بارے سے اسے مطلع کیا۔ ہد بد نے یمن کر کہا کیا رسول اللہ علیہ السلام نے کوئی استثناء نہیں کی؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ بلکہ آپ نے فرمایا اُولَئِیْنَ سُلْطَانِ مُبِیْنٍ۔ تو یہ سن کر ہد بد نے کہا تب میں نجات پا جاؤں گا۔ پھر عقاب اور ہد بد دونوں اڑے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو گئے۔ در آنحالیکہ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ تو عقاب نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! میں نے اسے آپ کے پاس حاضر کر دیا ہے۔ جب ہد بد نے آپ کو دیکھا تو اس نے اپنا سر بلند کیا اور اپنی دم اور پروں کو جھکا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں تواضع اور عاجزی کے اظہار کے لیے انہیں زمین پر گھٹنے لگا۔ جب وہ آپ کے قریب ہوا، تو آپ نے اسے سر سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور فرمایا تو کہاں تھا میں تجھے ضرور سخت ترین سزا دوں گا۔ تو ہد بد نے عرض کی کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں اپنے کھڑے ہونے کو یاد رکھیں۔ پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سنا تو آپ کا نب اٹھنے اور اسے معاف کر دیا۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کون سی وہ چیز ہے جس نے تجھے مجھ سے پیچھے چھوڑ دیا۔

اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے تقدیر عبارت یہ ہے فانی فقال۔ الاحاطة سے مراد کسی چیز کو اس کی تمام جہتوں سے جانتا ہے اور اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے علم کے سوا ہر شے میں ہوتا ہے یا بطریق مجاز یا پھر اظہار مبالغہ کے لیے۔ لہذا معنی یہ ہے کہ میں اس شے کا یقینی علم نے کر آیا ہوں جسے آپ نہیں جانتے۔ اور آپ کے لیے اس کے اس خطاب میں یہ تنبیہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ مخلوق میں ایسا فرد ہے جو اس چیز کے بارے میں یقینی علم رکھتا ہے جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام مطلع نہیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو عاجز اور حقیر جانیں اور اپنے علم کو انتہائی قلیل سمجھیں۔ اس میں روانفس کے اس قول کے بظان پر دلیل موجود ہے کہ امام پر کوئی شے غشی نہیں ہوتی اور اس کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر اور کوئی عالم نہیں ہوتا۔

سہ سہا بنین کے ایک شہر کا نام ہے۔ ضحاک اور اس کے درمیان تین دن کی مسافت ہے۔ ابو عمرو اور بڑی نے منہ سنبا اور سورہ سہا میں بسبا پڑھا ہے، یعنی ہمزہ مفتوح بغیر تین کے غیر منصرف پڑھا ہے اور یہ بلند یا مدیدہ ہونے کی تاویل کی بناء پر ہے۔ قنبل نے وقف کے ارادے سے ہمزہ کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کو کمسور اور تینوں کے ساتھ منصرف صورت میں پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ اصل میں آدمی کا نام ہے۔ علامہ بخاری نے کہا ہے کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے سہا کے بارے میں پوچھا گیا تو

آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک آدمی تھا۔ اس کے دس بیٹے تھے ان میں سے چھ یمن میں رہائش پذیر تھے اور بقیہ چار نے شام کو اپنا وطن بنایا تھا۔

ج کہ میں ملک سہا سے ایک یمنی خیر آپ کے پاس لایا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا وہ کیا ہے؟ تو اس نے عرض کی:

إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَبْلُغُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَدِيسٌ عَظِيمٌ ﴿١٠﴾

”میں نے پایا ایک عورت کو جو ان کے برابر ہو اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے ج اور اس کا ایک عظیم (الشان) تخت ہے۔“

۱۔ تَبْلُغُهُمْ امْرَأَةٌ کی صفت ہے۔ اس عورت کا نام بلقیس بنت شرجیل تھا۔ وہ عرب بن قحطان کی نسل سے تھی۔ اس کا باپ بہت بڑی عظمت و شان کا مالک بادشاہ تھا۔ اس کے آباء و اجداد میں چالیس بادشاہ ہوئے تھے اور یہ ان تمام میں سے آخری تھا۔ وہ پورے یمن کی سرزمین پر حکومت کرتا تھا۔ اور اطراف و اکناف کے بادشاہوں کو کہا کرتا تھا کہ تم میں سے کوئی بھی میری کٹو نہیں۔ لہذا اس نے ان میں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے اس کی شادی جنوں میں سے ایک عورت کے ساتھ کر دی جسے ریحانہ بنت الحسن کہا جاتا تھا۔ اس سے بلقیس پیدا ہوئی اور اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حدیث طیبہ میں موجود ہے کہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنات میں سے تھا۔ جب بلقیس کا باپ فوت ہوا۔ تو اس نے حکمرانی کی خواہش کی اور اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی بیعت کریں۔ تو ایک گروہ نے اس کی اطاعت کر لی اور دوسروں نے اس کی اطاعت قبول نہ کرتے ہوئے ایک مرد کو اپنا حکمران بنالیا۔ تو اس طرح وہ لوگ دو فرقہ گردہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر گروہ نے یمن کے ایک ایک حصے پر حکومت قائم کر لی۔ پھر وہ آدمی جسے انہوں نے حکمران چنا تھا اس نے اپنی مملکت کے باسیوں میں انتہائی برادر پیش کیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی رحمت کی حرم میں ہاتھ ڈالنے لگا اور عورتوں کے ساتھ زنا کرنے لگا۔ قوم نے اس سے خلعت شامی اتار پیچکنے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے۔ جب بلقیس نے اس صورت حال کو دیکھا تو اس میں غیرت کے جذبات ابھرے۔ چنانچہ اس نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کرتی ہے (یعنی وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے) بادشاہ نے اسے قبول کر لیا اور کہا کہ مجھے تیری طرف سے پہلے پیغام نکاح بھیجنے میں صرف یہ چیز مانع تھی کہ کہیں تو انکار نہ کر دے۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں تجھ سے اعراض نہیں برتوں گی تو اچھا مسر ہے۔ لہذا تو میری قوم کے افراد مع کر اور ان کی طرف مجھ سے شادی کرنے کا پیغام بھیج۔ چنانچہ اس نے ان سے شادی کی بات کی۔ تو انہوں نے اسے یہ کہا کہ ہم تو یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ ایسا کرے گی۔ اس بادشاہ نے ان سے کہا۔ چونکہ اس نے ابتدا کی ہے اس لیے میں یہ پسند کرتا ہوں کہ تم اس کی بات سنو۔ پس وہ بلقیس کے پاس آئے اور اس سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو اس نے انہیں کہا۔ ہاں میں اولاد پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ جب شب زفاف کے لیے یہ اس کی طرف گئی تو یہاں پہلے لشکر کے بہت سے افراد کے ساتھ نکلی۔ پس جب یہ اس کے پاس پہنچی تو اس نے اسے شراب پلا دی یہاں تک کہ وہ نشے میں ہو گیا۔ پھر اس نے اس کا سر کاٹ لیا۔ اور رات کے وقت ہی وہاں سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ آئی۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ قتل ہو چکا ہے اور اس کا سر اس کے دروازے پر لٹکا ہوا ہے۔ تو تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ نکاح صرف کھرا اور دھوکا تھا۔ پس وہ تمام کے تمام بلقیس کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ اس اور کی نسبت تو اس ملک پر حکومت کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

حدیث: امام احمد، امام بخاری نے اپنی صحیح میں، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبری پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی بنی کو حکمران مقرر کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران مقرر کیا۔ لَنْ يَفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ اَمَرُوهُمْ امْرَاةً (1)

یعنی تمہلکھ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ اور اسے ہر قسم کی چیز دی گئی ہے یعنی جن چیزوں کی آلات اور تعداد وغیرہ میں سے بادشاہوں کو ضرورت ہوتی ہے اور یہاں اس سے مراد مقدار کی کثرت ہے۔

سے وَلَوْ اَعَزَّهُمْ عَظِيمٌ حال کے بعد ایک اور حال ہے۔ یعنی اس کا بہت بڑا تخت تھا جو سونے سے بنایا گیا تھا اس میں موتی، سرخ یا قوت اور ہرز برجد چڑھا ہوا تھا۔ اس کے پائے یا قوت اور زمرہ کے تھے اور اس پر سات کمرے تھے اور ہر کمرے کا ایسا دروازہ تھا جو بند کیا جا سکتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے زبیر بن محمد سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ سونے کا تھا اور اس کے دونوں پہلوؤں پر یا قوت اور زبرد جا رکھا ہوا تھا۔ اس کا طول اسی گز اور عرض چالیس گز تھا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بائیس کا تخت تیس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا اور اس کی بلندی بھی تیس گز تھی۔ اور مقاتل نے کہا کہ اس کا طول اسی گز تھا اور اس کی بلندی تیس گز تھی۔ (3)

وَجَدَلُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّيْطَانِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٣٦﴾

”میں نے پایا ہے اسے اور اس کی قوم کو، کہ وہ سب مجھ کرتے ہیں سورج کو سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور آراء سے رو دیئے ہیں ان کے لیے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال میں پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستے سے پس وہ ہدایت قبول نہیں کرتے۔“

لے مِنْ دُونِ اللَّهِ طرف مسجدوں کے متعلق ہے اور وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ کا معنی ہے کہ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے، یعنی سورج کی عبادت اور دیگر ایسے اعمال۔ ترکیب کلام میں وَزَيَّنَ کا جملہ اپنے معطوف علیہ سمیت مسجدوں کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔

یعنی پس اس نے انہیں سیدھے راستے سے روک رکھا ہے۔ لہذا وہ اس کی طرف سے راہنمائی نہیں پاتے۔ اس جملے کا عطف مسجدوں پر ہے۔

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿٣٧﴾

”وہ کیوں نہ مجھ کریں اللہ تعالیٰ کو، جو نکالتا ہے پوشیدہ چیزوں کو، آسمانوں اور زمین سے۔ اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔“

لے أَلَّا يَسْجُدُوا اس کو ابو جعفر اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ آلا پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ حرف تنبیہ ہے۔ اور یا حرف ند اور اس کا مناد کی محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ”اَلَا يٰ اَهْلَ الْاِيْمَانِ اسْجُدُوا“ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا امر

ہے (۱)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اپنے حاضرین کو حکم ہو۔ اسی بناء پر درج کلام میں ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حرف نداء سے الف کو اجتماع ساکنین کی وجہ سے بولنے میں حذف کر دیا گیا ہے اور لکھنے میں دونوں کو ثابت رکھا گیا ہے۔ اور وقت کی صورت میں وقف یا تو آلا پر ہے یا حرف نداء یا پر۔ اور ابتدائے کلام اُنْسَجِدُوا کے قول سے ہے۔ باقی قراء نے اَلَا یَسْجُدُوا مشدود پڑھا ہے اس لیے کہ اس میں اُنْ مصدر یہ کا نون فعل مضارع پر داخل ہونے والے حرف نفی لام میں مدغم ہے۔ اور اُنْ اپنے صلہ کے ساتھ بتقدیر حرف جر زَیْن لَہُمْ یَا صَدِّقُہُمْ کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے "زَیْن لَہُمْ الشَّیْطَانُ اَعْمَا لَہُمْ فَصَدِّقُہُمْ لِنَلَا یَسْجُدُوا لِلّٰہِ" (شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا پس اس نے انہیں روک دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اُنْ یَسْجُدُوا اَعْمَا لَہُمْ سے بدل ہے۔ یعنی شیطان نے ان کے لیے ان کے سجدہ نہ کرنے کو آراستہ کر دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لا زائد ہو اور اُنْ اپنے صلہ کے ساتھ لا یَهْتَدُوْنَ کے متعلق ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فہم لا یَهْتَدُوْنَ اَنْ یَسْجُدُوا (پس وہ سجدہ کرنے کی ہدایت قبول نہیں کرتے)

۳۔ اس آیت میں الغیب بمعنی المخفی ہے اس سے مراد وہ شے ہے جو دوسرے پر مخفی ہو۔ اور اس کے اخراج سے مراد اسے ظاہر کرنا ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ غیب، السُّمُوت سے مراد بارش ہے اور غیب، الادراض سے مراد نباتات ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد زمین و آسمان کا علم غیب ہے۔ اور یہ لفظ ستاروں کو روشن کرنے، بارش نازل کرنے، نباتات کو اگانے، کسی بھی شے کو قوت سے فعل کی طرف لگانے، چیزوں کو امکان سے وجوب کی طرف اور عدم سے وجوب کی طرف ظاہر کرنے اور ان کا علم جو واجب لذات کے ساتھ مختص ہیں ان تمام کو شامل ہے۔ لہذا وہی یہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔ ۴۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم اپنے رازوں میں چھپاتے ہو۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ عبادت میں کسی غیر کو سہرا اور غلابہ اس کا شریک بنانے سے بچو۔ کسائی اور حفص نے دونوں میخوں کو تاء کے ساتھ اور باقیوں نے غیب کے صیغے قرار دیتے ہوئے یاد کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝۱۱

"اللہ تعالیٰ جس ہے کوئی معبود بجز اس کے، وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔"

۱۔ یہ یا تو تمہیر سے بدل ہے۔ یعنی رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ یا یہ لفظ اللہ کی دو خبریں ہیں۔ اور مکمل جملہ اسجدو کی علت بیان کرتا ہے یعنی وہ جو خدا کا مستحق ہے کوئی اور نہیں۔

قَالَ سَتَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِیْنَ ۝۱۲

"آپ نے فرمایا ہم پوری تحقیق کریں گے اس بات کی کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے۔"

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بد کو فرمایا۔ ہم غور و فکر کریں گے۔ سَتَنْظُرُ النظر سے مشتق ہے۔ اور اس کا معنی ہے غور و فکر کرنا، تحقیق کرنا کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے۔ مباحثہ کے لیے انداز کلام کو تبدیل کیا اور یہ نہیں کہا اَمْ کُنْتَ کَاذِبًا (بلکہ اسے کاذبین میں شمار کرتے ہوئے ان کے ساتھ منسلک کیا اور اس سے بالحقین اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے) اور انداز کلام تبدیل

کرنے کی دوسری وجہ فو اصل کی رعایت ہے۔ پھر ہد ہد نے پانی پران کی راہنمائی کی۔ پھر انہوں نے گڑھے کو دے اور ان سے لوگوں اور چوپاؤں تمام نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط تحریر کیا ”مِنْ عَبْدِ اللَّهِ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ إِلَيَّ بَلْقَيْسُ مُلْكُهَا سَبَا۔ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ السَّلَامُ عَلَيَّ مِنْ اتَّبَعَ الْهَدَىٰ أَمَّا بَعْدُ فَلَا تَغْلُوا عَلَيَّ وَأَتَوْنِي مُسْلِمِينَ“ (یا اللہ تعالیٰ کے بندے سلیمان بن داؤد کی جانب سے ملکہ سبا بلقیس کے نام ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کو قبول کیا اور اس کی ہدایت کی! پس تم مجھ پر فخر اور برتری کا اظہار نہ کرو اور اطاعت گزار بننے ہوئے میرے پاس آ جاؤ)۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اتنا ہی لکھا جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا یہ انبیاء علیہم السلام اسی طرح اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں نہ وہ اسے طول دیتے ہیں اور نہ اس میں کثرت کرتے ہیں۔ پس جب آپ خط لکھ چکے تو اسے کستوری کے ساتھ بند کیا اور اوپر اپنی مہر چسپاں کر دی۔ اور پھر ہد ہد کو فرمایا۔ (۱)

إِذْ هَبْ بِنُفْسِي هَٰذَا فَالْقَاءَ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّىٰ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ﴿۲۸﴾

”اے جاہر ایہ مکتوب اور پہنچا دے ان کی طرف! پھر مٹ کر کھڑا ہو جا ان سے اور دیکھ وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں۔“

۱۔ فَالْقَاءَ میں ابو عمرو، عامر اور حمزہ سے ہوا کو ساکن پڑھا ہے۔ ابو جعفر اور یعقوب نے اسے سادہ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اشباع کسرہ کے ساتھ۔ یعنی کسرہ کو لمبا کر کے پڑھا ہے۔
۲۔ پھر ان سے قرعہ کی طرف دور ہو جا۔ اور دیکھ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ پس ہد ہد نے خط لیا اور بلقیس کے پاس لے آیا۔ وہ اس وقت صنعاء سے تین دنوں کی مسافت پر حارب کے مقام پر تھی۔ پس اس نے وہ خط اس کے محل میں پہنچا دیا حالانکہ دروازے بند تھے اور بلقیس نے چابیاں اپنے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ ہد ہد اس کے پاس آیا اور وہ اپنی گلدی کے بل چٹ سوئی ہوئی تھی تو اس نے خط اس کے سینے پر پھینک دیا۔ عبد بن حمید، ابن اسعد اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہد ہد نے خط اپنی چونچ میں اٹھایا۔ یہاں تک کہ عورت کے سر پر جائے اور حالانکہ اس کے ارد گرد محافظ اور لشکر سپاہی موجود تھے۔ پس یہ تھوڑی دیر پھر چڑھ آیا اور لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے حتیٰ کہ عورت نے اپنا سر اٹھایا اور اس نے خط اس کی گود میں ڈال دیا۔

ابن منہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ سورج طلوع ہونے کی سمت ایک روشندان تھا جس سے سورج طلوع ہونے کے وقت روشنی اندر آتی تھی اور جب یہ سورج کو دیکھتی تو یہ اسے سجدہ کرتی۔ ہد ہد اسی روشندان کی طرف آیا، اسے اپنے دونوں پروں کے ساتھ بند کر دیا۔ پس سورج بلند ہوا، لیکن اسے علم نہ ہوا۔ جب سورج طلوع ہوئے کافی دیر ہو گئی تو وہ اٹھی اور ادھر دیکھنے لگی۔ اس حالت میں ہد ہد نے اس کی طرف خط پھینک دیا۔ بلقیس نے خط اٹھایا اور اسے پڑھنے لگی۔ جب اس کی نظر مہر پر پڑی تو کانپ گئی اور جھک گئی۔ کیونکہ اس کی مہر میں ملک سلیمان لکھا تھا۔ لہذا وہ جان گئی کہ جس نے یہ خط ارسال کیا ہے یقیناً وہ اس سے بڑا بادشاہ ہے۔ اس نے خط پڑھا اور ہد ہد اس سے تھوڑا دور پیچھے رہا۔ پھر وہ آئی اور اپنے شاہی تخت پر بیٹھ گئی اور اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا۔ اور وہ بارہ ہزار قاند

تھے اور ہر قائد کے ساتھ ایک لاکھ سپاہی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس کے ساتھ ایک لاکھ قیل تھے اور ہر قیل کے ساتھ ایک لاکھ افراد تھے۔ اور قیل سے مراد وہ سکران ہے جو ملک اعظم سے مرتبہ میں کم ہوتا ہے۔ قادیہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر تین سو تیرہ افراد تھے اور بھران میں سے ہر آدمی کے ساتھ دس افراد تھے۔ لہذا وہ تمام کے تمام آئے اور انہوں نے مجلس مشاورت قائم کی۔ (1)

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلِكُ إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ ۝

”خدا پڑھ کر (ملکہ نے کہا) اے سردارانِ قوم! پہنچایا گیا ہے میری طرف سے ایک عزت والا خط۔“

۱۔ بلقیس نے انہیں کہا۔ جو لوگ اپنی قوم میں سے اشراف اور سردار تھے۔

۲۔ اِنِّي اُلْقِيَ میں نافع سے یا مافجہ کے ساتھ اور باقیوں نے اس کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳۔ عطاء اور شہاک نے کہا ہے کہ اس نے خط کو کریم (عزت والا) اس لیے کہا ہے کیونکہ اس پر مہر لگی ہوئی تھی (2) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خط کی عزت و تکریم اس کی مہر کے ساتھ ہے (3)۔ اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور ابن مردودہ نے اَلْفَقِي الْكِتَابُ تَكْرِيمٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد مضمون ہے، یعنی ایسا خط جس پر مہر لگی ہو (4)۔ اور ابن جریج سے مروی ہے کہ کریم بمعنی شریف ہے۔ اس لیے کہ اسے لکھنے والا صاحب عزت و شرف اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ کریم بمعنی شریف ہے۔ اس لیے کہ اسے لکھنے والا صاحب عزت و شرف تھا (5)۔ یہ قول بھی ہے کہ اس نے خط کو کریم اس کی غرابت شان کی وجہ سے کہا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے بیت میں چپ لیٹ کر سوری تھی جس کے تمام دروازے مقفل تھے۔ تو بد بردار دشمنان سے اندر داخل ہوا اور اس نے یہ خط اس کے سینے پر ایسے پیچک دیا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے کریم کہنے کی وجہ سے کہ اس کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کی گئی۔ اس کے بعد اس نے ان کا ذکر کیا جن کی طرف سے وہ خط تھا اور کہا۔

إِنَّهُمُ سُلَيْمٌ قَدْ آتَاهُمُ اللَّهُ الرَّخِیْنَ الرَّحِیْمَ ۝ أَلَّا تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ ۝

”یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن اور رحیم ہے۔ تم لوگ غرور و تکبر نہ کرو

میرے مقابلہ میں۔ اور چلے آؤ میرے پاس فرمانبردار بن کر۔“

۱۔ بے شک یہ خط یا مضمون سلیمان کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد اس میں جو مضمون تھا اسے بیان کرتے ہوئے کہا۔ بے شک اس میں یہ لکھا ہوا ہے یا اس کا مضمون یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - اَلَّا تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ اس میں آن مضمون ہے یا یہ مصدر یہ ہے۔ اور یہ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ہو۔ یا اس سے مقصود ان لا تعلموا ہے۔ یا کتاب سے بدل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تم تکبر نہ کرو اور تم اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرو کیونکہ قولیت سے انکار کرنا یہ فخر اور تکبر ہے۔

۲۔ اور چلے آؤ میرے پاس ایمان لاتے ہوئے یا فرمانبرداری کرتے ہوئے۔ یہ کلام انتہائی مختصر ہونے کے باوجود مکمل طور پر اپنے

مقصود پر دلالت کرتا ہے اس طرح کہ یہ بسم اللہ پر مشتمل ہے اور اس اعتبار سے یہ صانع (اللہ تعالیٰ) کی ذات و صفات پر صراحتاً اور التزاماً دلالت کرتا ہے۔ اور اس میں اس تکبر اور فخر سے نبی بھی موجود ہے جو تمام رذالتوں کی اصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اسلام کا وہ حکم موجود ہے جو تمام بنیادی فساد کو جامع ہے۔ اور اس میں اپنی رسالت پر حجت قائم کرنے سے پہلے اطاعت و فرمانبرداری کا حکم موجود نہیں کہ یہ محض تقلید کی دعوت ہو۔ کیونکہ اس کی طرف اس حالت میں خط پھینکنا بذات خود بہت بڑی دلیل ہے۔

قَالَتَ يَا أَيُّهَا الْمَسْكُوَّةُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً مَرَأً حَتَّى تَشْهَدُونِ ③

”ملکہ نے کہا اے سرداران قوم! مجھے مشورہ دو میرے اس معاملہ میں، میں کوئی حجتی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو۔“

یعنی جو کچھ مجھے پیش آیا ہے اس کے بارے مجھے مشورہ دو۔ اور مجھے اس کے بارے جواب دو جس کے بارے میں تم سے مشورہ لے رہی ہوں۔ الفتویٰ اور الفتویٰ سے مراد احکام میں پیدا ہونے والے اشکال کا جواب ہوتا ہے۔

ج میں ایسے حکم قطعی کے ساتھ کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتی کہ اس سے محکوم علیہ کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہاں تک کہ تم میرے پاس حاضر ہو تو ہواور مجھے مشورہ دیتے ہو۔ یعنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اس کے درست ہونے کی شہادت دے دو۔ ترکیب کلام میں قائل کا جملہ اپنی اس تمام عبارت سمیت جو اس کے کل میں ہے سابقہ قائل سے بدل اشتمال ہے۔

قَالُوا خُنْ أَوْ لَوْ أَهْوَاؤُهُ وَأَوْ لَوْ أَبَايَ شَيْدِي ④ وَالْأَمْرُ الْيَسِيرُ فَطَهَّرِي مَا ذَاكَ أَمْرِينَ ⑤

”وہ کہنے لگے ہم بڑے طاقتور اور سخت جنگجو ہیں اور فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور کر لیں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں۔“

انہوں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا ہم تو قتال میں بڑے طاقتور ہیں اور جنگ کے وقت سخت جنگجو ہیں۔ مقابل نے کہا ہے کہ انہوں نے قوت سے مراد کثرت تعداد اور ہاں سے مراد بہت زیادہ شجاعت و بہادری لی ہے (۱) کیونکہ اس کے بارے مشاورت کا انحصار صلح اور جنگ پر ہے۔ (یعنی مشورہ لینے کا مقصود یہ ہے کہ آیا ایسے حالات میں ہمیں صلح کی راہ اپنانی چاہئے یا جنگ کا راستہ اختیار کرنا چاہئے) تو چونکہ ان دونوں امور میں سے قتال کا راستہ مشکل تھا۔ لہذا انہوں نے اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے جنگ کے بارے میں یہ جواب دیا جو کہ یہودیوں کے اس جواب کے بالکل برعکس تھا فَادَّبَ أَثْنَتَ وَرَثَتِكَ فَقَاتِلَا فَأَهْلَاهُمَا فَجَعَلَهُنَّ دُونَ اور ان کا یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلح کے معاملہ میں وہ اس کے حکم کی پیروی بطریق اولیٰ کریں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے دونوں امروں میں اختیار دیتے ہوئے کہا۔

ج صلح اور قتال کے بارے میں اور ہر اس شے کے بارے میں جو آپ کو تقویٰ بھری گئی ہے فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ یعنی جنگ اور صلح میں سے جو چاہیں حکم دیں۔ مَا ذَاكَ أَمْرِينَ میں مانا استغماہیہ ہے۔ اور جملہ تباہیل مفرد ہو کر انظر بئنی کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو بخوبی غور و فکر کر لے یہاں تک کہ تیرے لیے وہ امر متعین ہو جائے جو تیرے لیے نفع بخش ہو تو ہم تیری اطاعت کریں گے اور تیرے فیصلے کی پیروی کریں گے۔

قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْرَافَ أَهْلِهَا آذِلَّةً ۚ وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٣١﴾

”ملکہ نے کہا اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اسے برباد کر دیتے ہیں۔ اور بنادیتے ہیں وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل۔ اور یہی ان کا دستور ہے (اس لیے جنگ کے تاقریں دانشمندی نہیں)۔“

۱۔ اس نے کہا کہ بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں جبراً اور جنگ کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ تو وہ اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے معزز شہریوں کو ان کے اموال چھین کر اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر کے ذلیل کر دیتے ہیں۔ پس اس سے ان کے لیے ملکہ کا فیصلہ واضح ہو گیا۔ اس میں اس نے انہیں سلیمان علیہ السلام کے قہر داخل ہونے سے ڈرایا۔ پھر اس ڈرامے کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔ کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر اسی طرح کریں گے۔ کہا گیا ہے کہ جو بادشاہوں کی حالت بیان کی گئی ہے یہ اس کی تاکید اور تقریر ہے کیونکہ یہ ان کی مسلسل جاری رہنے والی ثابت شدہ عادت ہے۔ یا پھر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قول کی تصدیق ہے۔ اور اس کلام میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ یہ رائے رکھتی تھی کہ صلح زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ قُلْ أَتَمَّ يَوْمَ يَرْجَعُ الْمُرْسَلُونَ ﴿٣٢﴾

”اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف ایک تحفہ۔ پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔“

۱۔ اس سے قبل مصالحت کی جو رائے قائم ہو رہی ہے یہ اس کا بیان ہے اور معنی یہ ہے کہ میں ان کی طرف تحفہ دے کر قاصد بھیجتی ہوں اور میں انہیں یہ تحفہ اپنے ملک کی طرف سے دوں گی۔ ہدیہ ہر اس شے کا نام ہے جو بطور تحفہ دی جاتی ہے۔ جیسا کہ عطیہ اس کا نام ہے جو عطا کی جاتی ہے۔ علامہ بخاری نے فرمایا کہ بلقیس کے تحفہ بھیجنے کا مقصد یہ تھا تا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کو پہچان لے۔ آیا آپ بادشاہ ہیں یا نبی؟ یعنی اگر آپ بادشاہ ہوئے تو ہدیہ قبول کر لیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ اور اگر نبی ہوئے تو راضی نہیں ہوں گے مگر صرف اس صورت میں کہ ان کے دین کی پیروی کی جائے۔

۲۔ پس اس نے آپ کی طرف کچھ غلام اور باندیاں بطور تحفہ بھیجے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی قسم کا لباس پہنا دیا تا کہ لڑکے اور لڑکی کی پہچان نہ ہو سکے۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ غلاموں کو باندیوں کا لباس اور باندیوں کو غلاموں کا لباس پہنا دیا گیا تھا (۱)۔ اور ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ سو غلام اور سو باندیاں تھیں۔ مجاہد نے کہا ہے کہ ان کی تعداد دو سو غلام اور دو سو باندیاں تھیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشم اور دیباچ میں اثیثیں بھیجیں تھیں۔ ثابت بنانی کا قول ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشمی غلافوں میں سوئے کے پیالے بطور ہدیہ روانہ کیے تھے (۲)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سوئے کی چار اثیثیں تھیں۔ اور وہ ب و غیرہ نے یہ بھی کہا ہے کہ بلقیس نے پانچ سو غلاموں اور پانچ سو لڑکیوں کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس نے لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس شیر وانی اور کمر بند وغیرہ پہنا دیئے۔ اور لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس پہنا دیا ان کی کالہیوں پر سوئے کے نگین پہنا دیئے، گردنوں میں سوئے کے ہار ڈال دیئے، کانوں میں بالیاں یا حسن و جمال کی مختلف قسموں سے مرصع زیور پہنا دیئے اور لڑکیوں کو پانچ سو گھوڑیوں اور لڑکوں کو پانچ سو ترکی گھوڑوں پر سوار کر دیا، ہر گھوڑے پر سوئے کی لگام تھی جو

جواہرات سے مرصع تھی اور ان کی یہ چادریں مختلف رنگوں کے دیباچ کی تھیں۔ اس نے آپ کی طرف پانچ سو چاندی کی ایشیں اور ایک تاج جس پر موتی اور عالی شان باقوت جڑے ہوئے تھے دے بھیجا۔ علاوہ ازیں کستوری، عنبر اور گودنخورا رسال کی۔ اور پھر ایک ڈیہ میں ایک قیمتی موتی رکھا جس میں سوراخ نہیں تھا اور گھونگھار رکھا جس میں میڑھا سوراخ کیا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ تیار کرنے کے بعد اپنی قوم کے اشراف میں سے مندر بن عمرو کو بلا دیا اور اس کے ساتھ اپنی قوم کے کئی اصحاب عقل و دانش ملا دیئے۔ اور ایک خط لکھ کر اسے دیا جس میں تمام تر ہدایا کی تفصیل اور فہرست تھی۔ اور ساتھ لکھا کہ اگر آپ نبی ہیں تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیجئے۔ اور جو کچھ ڈیہ میں ہے اسے کھولنے سے پہلے اس کے بارے میں بتائیے؟ موتی میں ایسا سوراخ کرو دیجئے جو دونوں طرفوں سے برابر ہوا اور جن و انس کی مدد کے بغیر گھونٹنے میں دھماکہ ڈال دیجئے۔ بلیقے نے بچوں کو حکم دیا کہ جب سلیمان تم سے بات کریں، تو تم لڑکیوں کی مثل ان سے کلام کرنا اور ایسی باریک آواز میں گفتگو کرنا جو عورتوں کی کلام سے مشابہت رکھتی ہو۔ اور اس نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ وہ ان سے ہماری آواز میں گفتگو کریں جو مردوں سے مشابہت رکھتی ہو۔ پھر اس نے قاصد کو کہا کہ اس آدمی کی طرف غور سے دیکھنا۔ اگر اس نے تمہاری طرف غضب کی نگاہ سے دیکھا تو پھر جان لینا کہ وہ بادشاہ ہے اور اس کا دیکھنا تجھے قطعاً خوفزدہ نہ کرے کیونکہ ہم اس سے زیادہ عزت و شان والے ہیں۔ اور اگر تو اسے خوش و خرم اور لطیف و نرم دیکھے تو پھر یقین کر لینا کہ وہ نبی مرسل ہے۔ لہذا ان کی بات تو جسے سمجھنا اور ادب و احترام کے ساتھ جواب دینا۔ قاصد حدایا لے کر چل پڑے لیکن بد بدان سے پہلے حمزہ کی کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا اور آپ کو ساری خبر پہنچادی۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو سونے اور چاندی کی ایشیوں بنانے کا حکم فرمایا تو انہوں نے فوراً وہ بنا ڈالیں۔ پھر آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ انہیں وہاں ساری جگہ پر بچھلا دیں۔ چنانچہ انہوں نے نور فرخ، تنک، ایک وسیع میدان میں سونے اور چاندی کی ایشیوں لگا دیں اور ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ اس میدان کے ارد گرد سونے اور چاندی کی ایک بلند دیوار کھڑی کر دیں۔ پس انہوں نے یہ سب کچھ کر دیا۔ پھر آپ نے فرمایا کون سا وہ سب سے خوبصورت جانور ہے جو تم نے، بخرو میں دیکھا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! بے شک ہم نے فلاں سمندر میں اس طرح کا ایک جانور دیکھا ہے۔ اس میں مختلف خوبصورت رنگ ہیں، اس کے پر بازو ہیں، سر پر خوبصورت کھنیاں اور حسین و جمیل ماتھے بالوں والے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسی وقت اسے لے آؤ۔ پس وہ اسے لے آئے۔ آپ نے فرمایا اسے سونے چاندی کی ایشیوں پر میدان کے دائیں بائیں باندھ دو۔ اور اس کا چارہ اس کے آٹھے ڈال دو۔ پھر آپ نے جنوں کو فرمایا تم اپنے بچوں کو لے آؤ۔ چنانچہ آپ کے پاس غلغل کثیر جمع ہو گئی۔ آپ نے انہیں میدان کے دائیں بائیں کھڑا کر دیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی مجلس میں اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور چار ہزار کرسیاں آپ کی دائیں طرف اور اتنی ہی بائیں طرف رکھ دی گئیں۔ پھر آپ نے شیاطین کو حکم دیا کہ وہ کئی فراعنہ تک آپ کے دائیں بائیں کھڑے ہو جائیں۔ پس جب بلیقے کی طرف سے آنے والی قوم قریب پہنچی اور ان کی نظر ملک سلیمان پر پڑی اور ایسے ایسے جانور دیکھنے جن کی مثل کبھی بھی ان کی آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے کہ وہ سونے اور چاندی کی ایشیوں پر گوبر کرتے ہیں تو وہ بذات خود اپنے آپ کو حقیر جاننے لگے نتیجتاً انہوں نے وہ تمام تحائف اور حدایا چھینک دیئے جو ساتھ لارہے تھے۔

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سونے چاندی کی ایشیوں کا فرش بچھانے کا حکم دیا اور ساتھ فرمایا کہ ان لوگوں کے راستے میں اتنی ایشیوں کی مقدار راستے سے جگہ چھوڑ دیں جتنی وہ ساتھ لارہے ہیں۔ پس جب ان قاصدوں نے ان ایشیوں

سے وہ جگہ خالی دیکھی حالانکہ وہ تمام زمین پر لگی ہوئی تھیں تو انہیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں ان پر انہیں چرانے کا الزام عائد نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پاس سے تمام انہیں وہاں پھینک دیں۔ پھر جب انہوں نے شیاطین کو دیکھا تو انہیں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ لہذا وہ گھبرا گئے لیکن شیاطین نے انہیں کہا تم آگے چلتے جاؤ تم پر کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ وہ جن دامن، بطور و وحش اور درندوں کے دستوں میں سے گزرتے گئے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جا ٹھہرے۔ تو آپ نے ان کی طرف اچھٹائی خندہ روئی سے بنظر تحسین دیکھا اور فرمایا تمہارے پاس کیا ہے؟ تو قافلے کے سردار نے ان چیزوں کے بارے آپ کو بتایا جو وہ لائے تھے۔ اور آپ کو ملکہ کا خط بھی دیا۔ آپ نے اسے پڑھا تو فرمایا ڈیہ کہاں ہے؟ وہ پیش کی گئی تو آپ نے اسے حرکت دی۔ اتنے میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آگئے اور جو کچھ ڈیہ میں تھا اس کے بارے میں آپ کو مطلع کر دیا۔ پس آپ نے فرمایا اس میں ایک قیمتی موتی ہے جس میں سوراخ نہیں۔ اور ایک سوراخ اور گھونگھا ہے جس میں سوراخ میڑھا ہے۔ یہ سن کر قاصد نے کہا آپ نے سچ فرمایا ہے، اب آپ موتی میں سوراخ کر دیجئے اور گھونگھہ میں دھاگہ ڈال دیجئے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کون میرے لیے اس میں سوراخ کرے گا؟ آپ نے انسانوں سے پوچھا پھر جنات سے۔ لیکن ان میں سے کسی کے پاس یہ علم نہیں تھا۔ پھر آپ نے شیاطین سے پوچھا۔ تو انہوں نے عرض کی آپ یہ لکڑی کے کیڑے (دیکھ) کے حوالے کیجئے۔ چنانچہ اس نے بال اپنے منہ میں لیا اور اسے لے کر موتی میں داخل ہو گیا یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ تو آپ نے اس کیڑے سے کہا۔ تیری کیا حاجت ہے مانگ؟ تو اس نے عرض کی میرا رزق درختوں میں (لکڑی میں) رکھ دیجئے تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا ہی ہوگا۔ اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آپ کے پاس درختوں کا کیڑا حاضر ہوا اور عرض کی سوراخ میں دھاگہ میں ڈال دوں گا اس شرط پر کہ میرا رزق درختوں میں رکھ دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے ایسا ہی کر دیا۔ تو اس نے دھاگہ اپنے منہ میں پکڑا اور سوراخ میں داخل ہو گیا اور دوسری جانب سے پار نکل گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے عرض کی میرا رزق پھلوں میں رکھ دیا جائے۔ تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا کر دیا۔ پھر آپ نے لڑکیوں اور لڑکوں کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ اس طرح کہ آپ نے انہیں ہاتھ منہ دھوئے کا حکم فرمایا۔ پس لڑکیاں برتن سے ایک ہاتھ کے ساتھ پانی لیتی تھیں پھر اسے دوسرے ہاتھ پر ڈالتیں اور پھر وہ اپنے منہ پر مارتی تھیں۔ جبکہ لڑکے جیسے ہی برتن سے پانی لیتے تھے اپنے منہ پر مار دیتے تھے۔ لڑکیاں اپنی کلائیوں کے باطن پر پانی انڈھلتی تھیں اور لڑکے کلائیوں کے ظاہر پر۔ لڑکیاں اچھٹائی سکون کے ساتھ پانی انڈھلتی تھیں اور لڑکے بڑی تیزی سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے تھے۔ پس اس طرح آپ نے انہیں علیحدہ علیحدہ کر لیا۔ پھر آپ نے دو تحائف واپس لوٹا دیئے جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا ہے۔ یہ سب علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے۔ اور مختلف روایات سے ماخوذ ہے۔ ان میں سے بعض ابن ابی حاتم نے سندی سے اور بعض نے ابن المذہر اور ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کی ہیں۔

فَلَمَّا جَاءَ سُلَيْمَانَ قَالَ أَتَيْتُكُمْ بِمِثَالِ مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ فَخَبَّرَهُنَّ وَنَبَّأَهُنَّ ۖ

أَنْتُمْ بِهِدْيَتِكُمْ تُفَرِّحُونَّ ﴿٥٦﴾

”سو جب قاصد آپ کے پاس (ہدیہ لے کر) آیا تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔“ (سنو) جو عطا فرمایا ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا بہتر ہے اس سے جو تمہیں دیا ہے بلکہ تم تو اپنے ہدیہ پر پھولے نہیں سنا

رہے (گویا کوئی بڑی نادر چیز لائے ہو)۔“

۱۔ سو جب سلیمان علیہ السلام کے پاس قاصد آیا یا وہ شے پہنچی جو اس نے آپ کی طرف ہدیہ بھیجی۔ حمزہ اور یعقوب نے تَجِدُوْنِیْ کو تَجِدُوْنِیْ ایک نون مشدودہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں حالتوں میں یاہ متکلم ثابت رکھا ہے۔ اور باقیوں نے دو خفیف نونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاہ متکلم ثابت رکھا ہے۔ اور نافع اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں اسے ثابت رکھا ہے، جبکہ باقی قراء اسے دونوں حالتوں میں حذف کر دیتے ہیں۔ اور قتادہ کی تینون تَحْقِیر کے لیے ہے۔ اور یہ خطاب قاصد اور اس کے ساتھیوں کو ہے۔ یا یہ خطاب قاصد اور اسے بھیجے والے کو ہے۔ اور اس میں مخاطب کو غائب پر غلبہ دیتے ہوئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استفہام انکار کے لیے ہے یعنی مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم میری امداد ہدیہ کے ساتھ کرو اور اس کی میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۔ پس اللہ تعالیٰ نے دین، نبوت، حکمت اور جو ملک مجھے عطا فرمایا ہے یہ اس سے زائد نہیں۔ قالون، حفص اور ابو عمرو نے ان کے برخلاف حالت وصل میں یاہ مفتوح کے اثبات کے ساتھ اور حالت وقف میں یاہ کو ساکن پڑھا ہے۔ وشر نے حالت وصل میں یاہ کو مفتوح پڑھا ہے اور حالت وقف میں اسے حذف کر دیا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاہ کو حذف کر دیا ہے۔

۳۔ یعنی وہ اس سے افضل ہے۔ جو اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں مذکورہ انکار ہی طویل ہو رہا ہے۔ کیونکہ تم حیات دنیا میں سے صرف ظاہر کو ہی جانتے ہو لہذا تم مال کی بہت زیادہ محبت کے سبب اس مال پر فرحت و مسرت کا اظہار کر رہے ہو جو تم بطور ہدیہ لے کر آئے۔ یا تم اپنے ہم منصب لوگوں پر فخر کا اظہار کرنے کے لیے کسی غیر کو متذکر دینے میں خوش محسوس کرتے ہو۔ اور یہ سبب انکار کے مفہوم سے اضطراب ہے، یعنی لَا اَفْرَحُ بَلِّ اَنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ۔ میں خوش نہیں ہوا بلکہ تم خوش ہو رہے ہو۔ اور یہ بیان ہے اس امر کا جس نے انہیں ایسا کرنے پر برا سمجھتے کیا۔ اور اس سے مراد دنیوی ہمت و طاقت کی کمی تھی میں آپ کے حال کو اپنے حال پر قیاس کرنا ہے۔ پھر آپ نے منذر بن عمرو کو فرمایا۔

اِسْمِجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاتِيَبَهُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا اَذِلَّةً وَهُمْ
صَغِيرُونَ ۝

”تو واپس چلا جان کے پاس اور ہم آ رہے ہیں ان کی طرف ۱۔ ایسے لشکر کے لئے کہ جن کے مقابلہ کی ان میں تاب نہیں ہے اور ہم یقیناً نکال دیں گے انہیں اس شہر سے ذلیل کر کے اور وہ خوار اور رسوا ہونے لگیں گے۔“

۲۔ یعنی تو بلقیس اور اس کی قوم کی طرف واپس چلا جاؤ لِنَاتِيَبَهُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور لاء سببیہ ہے۔

۳۔ ایسے لشکر کے ساتھ ہم ان کی طرف آ رہے ہیں جس کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ خود کی صفت ہے۔ ۴۔ اور ہم یقیناً انہیں ان کی زمین سے نکال دیں گے۔ اور وہ ذلیل و رسوا ہوں گے۔ صَغِيرُونَ اَذِلَّةً کی تاکید کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اذلة اعزّٰی کی ضد ہے۔ اذلة سے مراد ان کی عزت اور ملک کا چلا جانا ہے اور صغار سے مراد ان کا قید میں واقع ہونا ہے۔ یعنی ہم انہیں یقیناً ان کی زمین سے نکال دیں گے اگر وہ اطاعت گزار بن کر میرے پاس نہ آئے۔ وہ دب و غیرہ نے کہا ہے کہ جب بلقیس کے قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہو کر واپس پہنچے تو اس نے کہا تم بخدا میں نے پہچان لیا ہے کہ وہ بادشاہ نہیں اور

ہم اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس نے آپ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ میں اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اور میں آپ میں اور آپ کے اس دین میں جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیں گے غور و فکر کروں گی۔ پھر اس نے اپنے تخت کے بارے حکم دیا کہ اسے ان سات کمروں میں سے آخری میں رکھ دیا جائے جو ایک دوسرے کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ اس کے سات محلات میں سے ایک محل میں رکھ دیا جائے۔ اور پھر اس کے دروازے بند کر دیئے اور اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کر دیئے۔ پھر جسے اپنی سلطنت کا خلیفہ بنایا اسے کہا کہ میرے شاہی تخت اور جو چیز تھے سپرد کی گئی ہے اس کی حفاظت کرنا اور میرے آنے تک کوئی تخت تک نہ پہنچے اور نہ اسے خراب کرے۔ پھر منادی کو حکم دیا کہ وہ ہمارے سفر کے بارے تمام اہل مملکت میں اعلان کر دے اور انہیں اس سے آگاہ کر دے اور پھر وہ مملکت یمن کے بارہ ہزار سرداروں کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب چلی (1) اور ہر سردار کے ماتحت کئی ہزار افراد تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انتہائی پارعب آدمی تھے کوئی بھی کسی چیز کے بارے میں سوال کی ابتدا نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ وہی کلام کرتا جس سے آپ بات پوچھا کرتے تھے۔ پس آپ ایک دن باہر تشریف لائے اور اپنے تخت شاہی پر تشریف فرما ہوئے تو آپ نے قریب ہی غباراڑتے دیکھا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ تو آپ کے اصحاب نے عرض کی۔ اس جگہ بقیس اتری ہوئی ہے۔ وہ جگہ آپ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حیرہ اور کوئذ کے درمیان ایک فرسخ کی مقدار فاصلہ تھا۔ تو اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کی طرف متوجہ ہوئے۔ (2)

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَكُ أَلَيْسَ لِي بِهَذَا قَبْلُ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ﴿٥﴾

”آپ نے فرمایا اے (میرے) درباریو! کون تم سے لے آئے گا میرے پاس اس کے تحت کو اس سے پہلے کہ وہ آجائیں میری خدمت میں فرمانبردار بن کر لے“

۱۔ آپ کی اس سے مراد یہ تھی کہ آپ ایک معجزہ کے ذریعے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطانی کی عظمت دکھائیں کہ وہ اس کے ساتھ اس کا تخت بھی لے آئیں اور اس کی عقل کی آزمائش کریں اس طرح کہ وہ اپنے تخت کا انکار کر دے گی۔ پس آپ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب وہ فرمانبردار بن کر آجائے گی تو پھر اس کی رضا مندی کے بغیر اسے اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٍّ أَمِينٌ ﴿٦﴾

”عرض کی عفریت نے جنات میں سے ۱۔ (حکم ہو تو) میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اسے پیش ازیں کہ آپ کھڑے ہوں اپنی جگہ سے ۲۔ اور بے شک میں اس کو اٹھالانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں سے“

۱۔ ضحاک نے کہا کہ عفریت ایک شبیہ جن تھا۔ فراء نے کہا ہے وہ بہت زیادہ قوت والا تھا۔ ابن قتیبہ نے کہا عفریت سے مراد وہ ہے جسے بہت طاقتور پیدا کیا گیا۔ یہ العفر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی مٹی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے (3) عَافَرَةٌ إِذَا ضَاعَتْ فَالْعَافَةُ عَلَى

الغافر آی الثواب (جب کوئی کسی کو بچھا ڈرے تو کہتے ہیں عافہ۔ یعنی اس نے اسے مٹی پر پھینک دیا)۔ وہب نے کہا اس کا نام لودی تھا (۱) علاوہ ازیں اذکمان اور صخر الجنی بھی نام ذکر کیے گئے ہیں یہ پہاڑ کی مثل تھا اور اپنی حد نگاہ پر قدم رکھتا تھا۔
عہ غفریت نے کہا میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں آپ کی اس مجلس سے پہلے جس میں آپ فیصلے فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ ہر روز نصف انھار تک مجلس قضا منعقد کرتے تھے۔ (2)

جہ اور بے شک میں اسے اٹھانے کی قوت رکھتا ہوں اور ان تمام ہیرے جو اہرات پر امین بھی ہوں جو اس میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ جملہ اینک کے قائل سے حال ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا میں اس سے بھی پہلے یہاں موجود دیکھنا چاہتا ہوں۔

قَالَ النَّبِيُّ عِنْدَهُ عِلْمُ مِنَ الْكِتَابِ اَنْ اَتِيَنَّكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرَفُكَ
فَلَمَّا رَاَهُ مُسْتَقَرًّا عِنْدَہٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لَّیْمُنُوْنِیْ عَاشِرُ اَمْرٍ
اَكْفَرُ ۚ وَمَنْ شَکَرَ فَاَنْتَ اَشْكُرْ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاَنْتَ عَنِیْ کَرِیْمٌ ۝

”عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھ جھپکے جہ پھر جب آپ نے اسے دیکھا کہ وہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو فرمانے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل (وکریم) ہے جہ کہ وہ آزمائے مجھے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری جہ اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے جہ اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی۔“

ابن ابی حاتم نے ابن ابیہرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے (3)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سلیمان علیہ السلام کی مدد فرمائی۔ اور اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ حضرت آصف بن برخیا تھے اور یہ صدیق تھے اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جانتے تھے کہ جب بھی اس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے اور جب اس کے ساتھ کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ عطا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت جریر اور مقاتل خماک سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آصف نے نماز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ وہ اپنی آنکھوں کھول کر دیکھیں۔ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے یمن کی طرف دیکھا اور ادھر آصف نے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بھیجا تو انہوں نے تخت کو اٹھایا اور زمین کے نیچے سے زمین چیرے ہوئے لیتے آئے حتیٰ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے تخت کے سبب زمین پھٹ گئی۔ کبھی نے کہا ہے کہ آصف جب دعائے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی تو اس کا تخت زمین کے نیچے چلا گیا یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے پاس سے ظاہر ہو گیا (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو مہینے کی مسافت پر تھا۔

وہ دعا جو حضرت آصف نے مانگی تھی اس میں اختلاف ہے۔ مجاہد اور مقاتل کہتے ہیں کہ وہ یا ذا الجلال والاكرام ہے۔ کبھی نے کہا وہ اسم یا حسنی یا قیوم تھا (5)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہی مروی ہے۔ زہری نے کہا ہے کتاب کا علم

رکھنے والے کی دعا یہ تھی "يَا اَللّٰهُ وَاللهُ مُخْلِ خُسْبِىْ اَلِهٰى وَ اَحَدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اِنِّىْ بَعْرُ شَيْهًا" (1) اسم اعظم کے بارے میں مفصل بحث سورۃ آل عمران کے شروع میں گزر چکی ہے۔ زہری کا قول میرے نزدیک ترجیح یافتہ ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا ہے کہ وہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بذات خود حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فہم عطا فرمایا تھا (2) اور اسے اس طرح بیان اس لیے کیا ہے تاکہ علم کی عظمت و شرف پر دلیل ہو جائے کیونکہ آپ کی یہ کرامت و عزت اس علم کے سبب ہی تھی۔

اس آیت میں آپ کا خطاب مغربیت کے لیے ہے۔ گویا کہ آپ نے مجھ کے اظہار کا ارادہ فرمایا تو پہلے انہیں پہنچایا۔ پس جب مغربیت نے جو کہا تھا کہہ دیا تو آپ نے اس رفتار کو بہت آہستہ اور سست سمجھا اور اسے اس طرح خطاب کیا۔ اور اس سے ارادہ یہ فرمایا کہ وہ اسے اتنا جلدی لے آئیں گے کہ عفاریت بھی اس کی قدرت و طاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ کوئی اور ایسا کر سکے۔ الکتاب سے مراد جنس الکتاب ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ تمام کتب داخل ہیں۔ یا اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ اور انبیک دونوں مقامات پر فعل اور اسم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ طرف سے مراد دیکھنے کے لیے پلکوں کو حرکت دینا ہے۔ اور جب دیکھنے والے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی چیز کی طرف توجہ کے لیے پلکوں کو کھولا تو پھر اس کا مقابلہ و ڈالطوف ہوگا، یعنی اس نے نظر کو واپس لوٹانے کے لیے پلکوں کو بند کر دیا۔ گویا معنی یہ ہوگا کہ آپ کسی شے کی طرف توجہ کرنے کے لیے پلکوں کو حرکت دے کر کھولیں گے تو اس سے قبل کہ آپ انہیں بند کریں میں اس کا تحت حاضر کر دوں گا۔ اس طرح عدد و حرکت رفتار کو بیان کرنا مقصود ہے۔

پس جب سلیمان علیہ السلام نے دیکھا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے "فَاَمَرَهُ سُلَيْمَانُ بِالْمَسْجِدِ فَبَدَأَ بِاسْمِ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ فَمَا لَ عَرْشُهَا نَحْتِ الْاَرْضِ فَنَبَّحَ عِنْدَ مَسْرُوبِ سُلَيْمَانٍ فَلَمَّا رَآهُ" (یعنی سلیمان علیہ السلام نے اسے تحت لانے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی۔ پس اس کا تحت زمین کے نیچے سے ہوتا ہوا سلیمان علیہ السلام کے تحت کے پاس ظاہر ہوا۔ تو جب آپ نے اسے اپنے نزدیک رکھا ہوا دیکھا تو اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کا طریقہ ہے۔ "هَذَا" کہ ان کا بذات خود یا کسی اور کا دو ماہ کی مسافت سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں تحت کو حاضر کرنے کی یہ قدرت میرے رب کا فضل ہے۔ اور یہ ان بہت سے فضلوں میں سے ایک ہے جو اس نے مجھ پر فرمائے ہیں۔

یہ لیتلوئی کو نافع نے یاہ مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاہ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمانے کے لیے مجھ پر فضل فرمایا ہے۔ کہ یا میں نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسے محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل دیکھتا ہوں کیونکہ مجھ میں نہ اس کی طاقت ہے اور نہ قوت۔ اور پھر اس کا حق ادا کرتا ہوں یا تا شکر کی کرتا ہوں اس طرح کہ میں اپنے آپ میں اس کی اہلیت ہونے کا گمان کرتا ہوں یا پھر اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہوں۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں لیتلوئی کی ضمیر منصوب سے بدل ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہیں۔

یہ کیونکہ شکر کے سبب نعمت کو دوام اور اس میں اضافہ حاصل ہوتا ہے۔ فَانَّ الشُّكْرَ قَبْلَةُ النِّعْمَةِ الْمَوْجُودَةِ وَضِلَّةُ النِّعْمَةِ الْمُنْقُودَةِ۔ (کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہوتا ہے اور مفقود (گم شدہ) نعمت کے لیے شکار)۔ اس کے سبب بندہ اپنے واجب کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ اور دار الجزاء میں وہ اجر کا مستحق بن جاتا

ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "الطَّاعِمُ الشَّابُّ يُغْنِيهِ الصَّائِمُ الصَّابِرُ" (1) "شکرا دار کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزہ دار کی مثل ہے۔ اسے امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ شان بن سند سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "الطَّاعِمُ الشَّابُّ لَهٗ مِثْلُ أَجْرِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ" (2) "شکرا دار کرتے ہوئے کھانے والے اکابر صبر کرنے والے روزہ دار کے اجر کی مثل ہے۔"

۱۔ اور جو ناشکری کرتا ہے تو بلاشبہ میرا رب اس کے شکر سے غنی ہے وہ تو شکر کرنے والے اور ناشکری کرنے والے کو نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَنْصُرُ رَبِّي لِأَنَّهُ غَنِيٌّ خَيْرِيَمٌ" (اور جو ناشکری کرتا ہے وہ میرے رب کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا کیونکہ وہ تو غنی بھی ہے اور کریم بھی۔)

قَالَ نَكَرُوا إِلَهًا عَرَشَهُاتَنْظُرُ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ۝

"آپ نے حکم دیا شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تحت کی ۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حقیقت پر آگاہ ہوتی ہے یا ہو جاتی ہے ان لوگوں میں سے جو حقیقت کو نہیں پہچانتے ۱۔"

۱۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا بدل دو، انھیں کے لیے اس کا تخت یعنی اسے اس طرح بنا دو کہ جب وہ دیکھے تو اسے نہ پہچان سکے۔ روایت یہ ہے کہ اس کے نیچے والے حصہ کو اوپر اور اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا گیا اور سرخ جواہر کی جگہ بنرا اور سبز جواہر کی جگہ سرخ دیے گئے۔

۱۔ اَنْتَنْظُرُ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیا وہ اس کی پہچان یا صحیح جواب کے لیے راہنمائی پاتی ہے۔ حضرت کعب اور وہب وغیرہ کی روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسا کرنے پر اس چیز سے براہِ راست کیا کہ شیطان کو خوف لاحق ہوا کہ آپ اس سے شادی کر لیں گے اور وہ آپ کے سامنے جنات کے اسرار اور موزوں ظاہر کر دے گی کیونکہ اس کی ماں پر ہی تھی اور جب اس کے ہاں اولاد ہوگی تو پھر ہمیشہ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور ذریت کے تابع رہنا پڑے گا۔ لہذا انہوں نے اس کی خدمت بیان کرتا شروع کر دی تا کہ وہ آپ کو لغت دلا کر اس سے دور کر سکیں۔ لہذا انہوں نے کہا بے شک اس کی عقل کم ہے، اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پٹیلیوں پر بال ہیں۔ پس یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارادہ فرمایا کہ اس کے تخت کو بدل کر اس کی عقل کو آزمائیں اور ایک بلوریں بکرا اس کے قدموں کو دیکھ لیں۔

فَلَمَّا جَاءَتْ قَبِيلٌ أَهْلَكَاعَرْشَهُۥ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۖ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ۝

"سو جب وہ آئی تو اس سے بوجھا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے ۱۔ کہنے لگی یہ تو وہی ہے جو ہمیں اطلاع ملی تھی اس واقعہ کی اس سے پہلے ۱۔ اور ہم تو فرما کر حاضر ہوئے ہیں ۱۔"

۱۔ کا عطف اس قول پر ہے "فَلَمَّا جَاءَتْ مُسْلِمَانِ قَالِ اتَّجِدُونِ بِمَعَالِی" اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ اسے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہے۔ اس کی عقل کے امتحان اور آزمائش میں شدت اور سختی کرتے ہوئے اس پر معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔

ع. مناقش نے کہا ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا لیکن اس نے انہیں اسی طرح شہ میں ڈال دیا جیسے انہوں نے اسے شہ میں ڈالا تھا۔ (1)
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر صورت حال مشتبه ہو گئی اسی لیے اس نے جواب میں نَعَمْ (جی ہاں) نہیں کہا اور نہ ہی اس نے جھوٹ کے خوف سے لَا (نہیں) کہا۔ پس اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی عقل کو پہچان لیا کہ نہ اس نے اقرار کیا اور نہ ہی انکار۔ اور پھر اسے کہا گیا کہ بے شک یہ تیرا ہی تخت ہے۔ پس دروازوں کے بند کرنے اور پھر سے داروں کے کھڑے کرنے نے تجھے کوئی نفع نہیں دیا۔ تو اس نے کہا ہمیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور سلیمان کی نبوت کے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا ہے۔

ان دیگر علامات کے سبب جو اس تخت کی علامت سے پہلے تھیں۔ مثلاً حد کا خط پہنچانا اور ہدیہ اور قاصدوں کا معاملہ وغیرہ۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کی قوم کا کلام ہے۔ اس کا عطف اس کے جواب پر ہے کیونکہ اس میں اس پر دلالت موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئی۔ تب اسے خیال آیا کہ غالب گمان کے مطابق یہ تخت اسی کا ہو اور اسے یہاں حاضر کرنا ان معجزات میں سے ہو جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ اور ان کا ظہور صرف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے وَأَوْفَيْنَا الْعِلْمَ بِاللّٰهِ تَعَالٰی وَقَدْ رَزَقْنَاهُ مِمَّا جَاءَ مِنْ عِنْدِهِ قَبْلَهَا (کہ ہمیں اس سے قبل ہی اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کی جانب سے آنے والے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا)

ع. اور ہم تو اس کے حکم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے دین پر رہیں گے۔ اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو بیان کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا ہے جو اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائی تھی۔ اور اس کا معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ ہمیں اس کے اسلام لانے اور اس کے فرمانبردار بن کر آنے کا علم اس کے آنے سے پہلے ہی عطا کر دیا گیا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

وَصَدَّاهُمْ أَكَاثُ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

”اور روک رکھا تھا اسے (ایمان لانے سے) ان بتوں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتی تھی اللہ تعالیٰ کے سوا بے شک وہ قوم کفار سے تھی۔“

ع. اور سلیمان علیہ السلام نے اسے سورج کی عبادت کرنے سے روکا۔ اس آیت میں مائل نصب میں ہے اس لیے کہ اس سے پہلے حرف جرح حذف ہے اور فعل کا تعلق بلا واسطہ اس سے ہو چکا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مائل رفع میں ہے۔ اور معنی یہ ہے اسے توحید سے ان بتوں نے روک رکھا تھا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتی تھی۔ نہ کہ اس کی عقل کے ناقص ہونے نے۔ جیسا کہ جنوں نے کہا کہ اس کی عقل کمزور ہے۔

ع. جملہ مستلذہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بے شک یہ اس قوم میں سے تھی جو سورج کی عبادت کرتی تھی۔ چونکہ یہ ان ہی میں پیدا ہوئی۔ لہذا سورج کی عبادت کے سوا اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے پاؤں اور پنڈلیاں دیکھنے کا ارادہ کیا مگر اس طرح کہ اسے ان کو نہ لگا کرنے کا حکم دینے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ شیاطین نے کہا تھا کہ اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ تو اس مقصد کے لیے آپ نے شیاطین کو شیشے کا مائل تعمیر کرنے کا حکم فرمایا اور کہا گیا

ہے کہ ایسا شیشے کا کمرہ تیار کرو جو سفیدی میں پانی کی مثل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الصرح سے مراد گھر کا مچن ہے اور یعنی مچن شیشے کا بنا کر اس کے نیچے پانی جمع کر دیا اور اس میں ہر قسم کے سمندری جانور پھینک دیے مثلاً مچھلیاں، مینڈک وغیرہ۔ پھر اس کے سامنے آپ نے اپنا تخت بچھا دیا۔ اور اس پر تشریف فرما ہوئے۔ اور آپ کے دونوں طرف پرندے، انسان اور جنات کھڑے ہو گئے یہ قول بھی ہے کہ آپ نے بلور سے مچن بنایا اور اس کے نیچے مچھلیوں اور مینڈکوں کی تصویریں بنادیں اس طرح کہ جب اسے کوئی دیکھتو وہ اسے پانی گمان کرے۔ جب آپ تخت پر متمکن ہوئے تو آپ نے بتقیس کو بلایا۔ جب وہ آئی تو اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ

مُسَدَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ ۖ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ إِلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

”اے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔ پس جب اس نے دیکھا اس (کے بلوریں فرش) کو تو اس نے خیال کیا کہ یہ

گہرا پانی ہے اور اس نے اٹھایا کپڑا اپنی دونوں پنڈلیوں سے لے آپ نے فرمایا یہ (پانی نہیں) چند مراحل ہے بلور کا بنا ہوا ہے (اس کی آنکھیں محل گئیں) کہنے لگی اے میرے رب! میں (آج تک) ظلم ڈھائی رہی اپنی جان پر اور اب

ایمان لائی ہوں سلیمان کے ساتھ اللہ پر جو مارے جہانوں کا پروردگار ہے۔“

۱۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر حکام یہ ہے۔ فَلَذْخَلْتَهُ يَغْنِي مِنَ النَّابِ وَرَأَتْهُ أَيْ الصَّرْحَ بِبَلَا حِجَابٍ قَبْلَ وَزُودَهَا فَلَمَّا رَأَتْهُ سووہ دروازے سے داخل ہوئی اور اپنے درود سے پہلے مچن کو بلجاہ دیکھا تو جو بھی اس پر نظر پڑی تو اسے گہرا پانی گمان کیا اور اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا تاکہ وہ اس میں داخل ہو۔ قبیل نے یہاں عن سَاقَيْهَا، سورہ ص میں بِالْشُّوْقِ اور سورۃ النحل میں عَلٰی سُوْقِ قَتْلُوْنَ مقامات پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بانی قراء نے بغیر ہمزہ کے قرأت کی ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے آنے سے پہلے ایک محل بنانے کا حکم فرمایا اس کا مچن سفید شیشے کا تھا۔ اس کے نیچے پانی جاری کر دیا اور اس میں سمندری حیوانات ڈال دیے۔ اور اس کے سامنے اپنا تخت بچھا کر اس پر جلوہ افروز ہو گئے۔ پس جب بتقیس نے اسے دیکھا تو اسے ٹھہرا ہوا پانی گمان کیا اور اس میں داخل ہونے کے لیے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا دیا (۱)۔ اور وہ سلیمان علیہ السلام تک پہنچ گئی۔ پس سلیمان علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ وہ پنڈلی اور قدم کے اعتبار سے لوگوں سے زیادہ حسین ہے۔ مگر اس کی پنڈلیوں پر ہال ہیں۔ پس جب آپ نے یہ دیکھ لیا، تو اس سے اپنی نظر پھیر لی۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی غرض سے پیغام سے قبل اجنبی عورت کو دیکھ لینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِذَا خُطِبَ الْمَرْءُ فَلْيَنْتَظِرْ اَنْ يَنْظُرَ اِلَى مَا يَذْخُوهُ اِلَى بَيْتِهَا فَلْيَفْعَلْ (جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر وہ اس جزو بدن (یعنی چہرہ ہاتھ پاؤں) کی طرف دیکھنے کا موقع پالے جو اسے اس سے نکاح کی دعوت دیتا ہے تو چاہیے کہ وہ ایسا کر لے) اسے ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ (2)

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے بغیرہ بن شعبہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے۔ میں نے عرض کی نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کی طرف

دیکھ لے کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت قائم کرنے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ (1)

ج۔ آپ نے فرمایا بے شک یہ محل ہے جسے شیشے سے چمکدار اور ملائم بنایا گیا ہے۔ امر دہی اسی سے ہے یعنی وہ لڑکا جس کی ڈاڑھی ابھی نہ لگی ہو۔ جس وقت اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو کہا۔ اے میرے رب! بے شک میں کفر اور سورج کی عبادت کے سبب اپنے نفس پر عظم کرتی رہی۔ پس اب میں اس سے توبہ کرتی ہوں یعنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید پر ایمان لے آئی۔ کہا گیا ہے کہ جب وہ اس محل میں پہنچی اور اسے وہاں گھرے پانی کا گمان ہوا تو وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ بے شک سلیمان اسے غرق کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں حالانکہ اس کی نسبت قتل زیادہ آسان تھا۔ تو اس لیے اس نے کہا کہ بے شک میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں اس گمان کے سبب اپنے نفس پر عظم کیا ہے۔ لہذا میں اس سے توبہ کرتی ہوں اور ان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں۔ اس کے اسلام لانے کے بعد اس کے معاملہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ لہذا عاون بن عبد اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے عبد اللہ بن عیینہ سے سوال کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کی تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ اس کا معاملہ اس کے اس قول پر ختم ہو جاتا ہے۔ **وَأَسْكَنْتُكُمْ مَعَهُ مَكِينًا** یعنی اس کے سوا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے (2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ نے اس سے شادی کی تھی۔ اسے ابن عساکر نے مکرہ سے نقل کیا ہے (3)۔ اور جب آپ نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کو اس وقت سخت کراہت ہوئی جب آپ نے اس کی چند بیویوں پر کثرت سے ہال دیکھے۔ چنانچہ آپ نے انسانوں سے پوچھا یہ کیسے دور کیے جاسکتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا استر سے۔ تو اس پر بلیقے نے کہا لوہے سے بھی کچھ مجھے مس نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان نے بھی استر کے استعمال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا یہ تو کاٹ سکتا ہے۔ پھر آپ نے جنات سے پوچھا تو انہوں نے کہا ہم تو نہیں جانتے۔ پھر شیطن سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا بے شک ہم آپ کو ایسا حیلہ بتاتے ہیں کہ جلد سفید چاندی کی طرح ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے نورہ (بال صفا چونہ) اور حمام بنایا۔ پس اس دن سے نورہ اور حماموں کا استعمال شروع ہوا۔ پس جب سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی تو آپ نے اس سے انتہائی گہری محبت کا اظہار فرمایا اور اسے اپنے ملک پر حکمران برقرار رکھا اور جنوں کو حکم فرمایا کہ وہ اس کے لیے سر زمین یمن پر تین قلعے تعمیر کر دیں۔ پس انہوں نے ایسے قلعے بنادئے کہ لوگوں نے ان کی مثل بلند اور حسین و جمیل قلعے کبھی تک نہیں تھے۔ ان قلعوں کے نام یہ تھے سلحون، سنون اور عمران۔ پھر اس کے اپنے ملک واپس لوٹ جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام مرتبہ ایک مرتبہ اس کی ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اس کے پاس تین دن تک قیام فرما رہتے تھے۔ آپ صبح سویرے شام سے یمن کی طرف جاتے تھے اور صبح سویرے ہی یمن سے شام کی طرف واپس لوٹتے تھے۔ اور اس سے آپ کی اولاد بھی ہوئی۔

دوب سے روایت ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بلیقے نے جب اسلام قبول کر لیا تو سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا تو اپنی قوم میں سے کسی آدمی کو پسند کر لے، میں اس سے تیری شادی کیے دیتا ہوں۔ اس نے کہا اے نبی اللہ! کیا میری مثل عورت مردوں سے نکاح کرے گی۔ حالانکہ میری اپنی قوم میں ایسے ایسے سردار اور سلطان بھی تھے تو آپ نے فرمایا میں ہاں۔ اسلام میں ایسا ہو سکتا ہے۔ لہذا تجھے نہیں چاہیے کہ تو اپنے لیے اس شہی کو حرام قرار دے جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے حلال کیا ہے۔ تو پھر اس نے کہا اگر یہ ضروری

ہے تو پھر میری شادی شاہ ہمدان ذی تیج سے کر دیجیے۔ چنانچہ آپ نے اس کا نکاح اس سے کر دیا پھر اسے یمن کی طرف واپس لوٹا دیا اور یمن پر اس کے خاندانی تیج کو حکمران بنادیا۔ اور یمن میں جنات کے امیر روہیو کو بلا کر فرمایا کہ ذی تیج تجھ سے جو کام بھی لے اسے ضرور سرانجام دیتا۔ چنانچہ اس کی حکومت برقرار رہی اور اس نے جو بھی ارادہ کیا وہ اس کے لیے کام کرتا رہا یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا۔ پس جب ایک سال گزر گیا اور جنات کو آپ کی موت کا یقین ہو گیا تو ان میں سے ایک جن تہامہ کے راستہ سے آیا اور وسط یمن میں پہنچ کر بلند آواز سے چیخ کر کہا اے جنات کے گروہ! بے شک شہنشاہ سلیمان فوت ہو چکے ہیں۔ لہذا تم اپنے اپنے کاموں سے ہاتھ اٹھا لو۔ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے اور بکھر گئے۔ پس اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی بقیس اور ذی تیج کی حکومتیں بھی ختم ہو گئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سلیمان علیہ السلام کا بقیس کی پندلیوں کو دیکھنا علماء کے قول کی تائید کرتا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آپ نے اس سے نکاح کیا تھا۔ اور ان کے قول کی تائید نہیں کرتا جنہوں نے کہا کہ آپ نے اس کا نکاح ذی تیج سے کر دیا۔ واللہ اعلم۔ کہا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت ملی تو اس وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر تین برس تھی۔ سُبْحَانَ اللَّهِ مَنْ لَا زَوَالَ لِلْمَلِكَةِ شعر

لَا مُلْكَ سُلَيْمَانَ وَلَا بَلْقَيْسَ لَا اَدَمَ فِي الْكُونِ وَلَا اِبْلَيْسَ

نہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی نہ بلقیس (اس) کا نکات میں نہ حضرت آدم رہے اور نہ ایلیس

وَالْكُلُّ فَصُورَةٌ وَاَنْتَ الْمَغْنَى يَا مَنْ هُوَ لِلْقُلُوبِ مَقْنَطِيرٌ۔ واللہ اعلم

اور یہ تمام نکات تو صورت ہے مٹی اور حقیقت تو صرف تو ہے جو دلوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی شُعُوْدًا خَآهُمْ صٰلِحًا اِنِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ فَاَدَّاهُمْ قَرِيْنٌ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

”اور بے شک ہم نے رسول بنا کر بھیجا شعوڈ کی طرف ان کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی۔ تو وہ دو گروہ بن گئے (اور آپس میں) جھگڑنے لگے۔“

۱۔ یہ محدود قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ اس قول باری تعالیٰ پر معطوف ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِدْرٰیضَ سُلَيْمٰنَ اور صَالِحًا کا قول اَخَاهُمْ سے بدل ہے۔ ”اَنّٰی“ یا تو اَرْسَلْنَا کے لیے مشعر ہے یا یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہے۔ یعنی بیان ہم نے قوم شعوڈ کی طرف ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جو وحدہ لا شریک ہے۔

۲۔ قَدْ اَدَّاهُمْ یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر ما بعد کلام ”فَرِيْنٌ يَخْتَصِمُوْنَ“ ہے۔ يَخْتَصِمُوْنَ فَرِيْنٌ کے لیے صفت ہے۔ تو اچانک وہ متفرق ہوتے ہوئے اور جھگڑتے ہوئے دو گروہ بن گئے۔ پس ایک فریق ایمان لے آیا اور ایک نے کفر کیا۔ يَخْتَصِمُوْنَ میں داوای جمع دونوں فریقوں کے مجموعہ کے لیے ہے۔ ان کے جھگڑے کا ذکر سورۃ اعراف میں کیا گیا ہے۔ اس قول میں قَالَ اَلَمْ اَلْزَيْنِ اَسْئَلُكُمْ اَنْ تَعْبُدُوْا رَبَّكُمْ بِالَّذِيْنَ اَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسِكُمْ فَتُؤْمِنُوْنَ اس قول تک اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

قَالَ يَقُوْمُ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ

لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُوْنَ ۝

”صالح نے فرمایا اے میری قوم! کیوں تیزی کرتے ہو برائی کرنے میں نیک کام کرنے سے پہلے تم کیوں نہیں بخشش

طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے شاید تم پر رحم کر دیا جائے۔“

۱۔ صالح علیہ السلام نے انہیں کہا۔ اے میری قوم! تم عذاب کیوں جلدی طلب کرتے ہو کہ تم یہ کہہ رہے ہو یٰطیغابا ائتینا ہذا بعدنا ان کُنتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ تو یہ سے پہلے، اس طرح کہ تم اسے نزول عذاب تک مؤخر کرتے جا رہے ہو۔ یا استفہام انکار اور تو بخ کے لیے ہے۔ تم عذاب نازل ہونے سے پہلے اپنے کفر سے توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کیوں نہیں طلب کرتے۔ تاکہ اسے قبول کرتے ہوئے تم پر رحم کیا جائے۔ کیونکہ جب تم عذاب دیکھ لو گے تو پھر توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

قَالُوا اَظْهَرُ نَبَاكَ وَرِسْمَكَ قَالَ طَلَبْتُمْ عَنِ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْسِدُوْنَ ۝۷۰

”کہنے لگے ہم تو برا لگھون سمجھتے ہیں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو۔ آپ نے فرمایا تمہارا برا لگھون تو اللہ تعالیٰ کے ہاں

ہے۔ بلکہ تم ایسی قوم ہو جو فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے۔“

۱۔ ہم تمہیں منحوس گمان کرتے ہیں کیونکہ اس وقت سے ہمارے درمیان افتراق پیدا ہوا ہے جب سے تم نے نیا دین ایجاد کیا ہے۔ ہم پر مسلسل مصیبتیں آ رہی ہیں اور بارش کو ہم سے روک دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تمام نقصانات اور تکلیفیں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی غصت کے سبب ہیں۔

۲۔ یعنی تمہاری غصت کا سبب جس کی وجہ سے شر اور تکلیف آئی وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ یا تمہارے وہ اعمال ہیں جو اس کے پاس لکھے ہوئے ہیں۔ قضاء و کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ انسان پر بہت تیزی سے نازل ہوتی ہے۔ کیونکہ قضاء قطعی سے زیادہ تیز اور کوئی چیز نہیں۔ یہاں عمل کو تیزی سے آسمان کی طرف چڑھنے کے سبب طائر کا نام دیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا طائرُ ثَمَمٌ عِنْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے تمہارے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر غصت آئی ہے (۱)۔ اور کہا گیا ہے ثوم (غصت) کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اہل جاہلیت پرندے کی آواز اور اس کے اس مخصوص انداز پر گزرنے سے جو ان کے نزدیک معروف تھا بد لگھونی خیال کرتے تھے جب کہ وہ سفر پر جاتے تھے۔ اسی عرف کی بناء پر لفظ طائر غصت اور بد لگھونی کے لیے استعارۃ استعمال ہوتا ہے۔

۳۔ یہ سابقہ کلام کے منہج سے اضطراب ہے۔ یعنی تمہارا برا لگھون میری اور میرے ساتھیوں کی جانب سے نہیں بلکہ تمہیں تو اپنے کفر کے سبب اس طرح عذاب دیا جا رہا ہے۔ محمد بن کعب نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم خیر اور شر کے ساتھ آزمائے جا رہے ہو۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَذُنُوبُكُمْ بِالْأَيْدِي وَالْأَعْيُنِ وَقَدْ نَفْسَتْ (2)

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝۷۱

”اور اس شہر میں نو شخص تھے جو فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اس علاقہ میں۔ اور اصلاح کی کوشش نہ کرتے۔“

۱۔ یعنی خود کے شہر میں نو آدمیوں کا گروہ تھا اور وہ شہر بھرتھا۔ اس میں دھڑ معنی کے اعتبار سے تِسْعَةُ کی تہمیر ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے ایسی جماعت جس میں تین یا سات سے لے کر دس تک افراد ہوں جیسا کہ نفرتین سے لے کر نو تک کی جماعت ہوتی ہے۔ اور ”يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ“ سنان کی خبر ہے اور اس کا اسم تِسْعَةُ رَهْطٌ ہے۔ اور فِي الْمَدِينَةِ اسے حال ہے یا ظرف ہے۔

یعنی ان کی شان یہ تھی کہ وہ ایسا فتنہ و فساد برپا کرتے جس میں ذرا بھر بھی اصلاح کی آمیزش نہ ہوتی۔ اور یہ ان کے ان سرداروں کے بیٹے تھے جنہوں نے ناتہ کی کوچیں کانٹے پر اٹاق کیا تھا اور وہ صالح علیہ السلام کی قوم کے گمراہ اور بد بخت لوگ تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ شقی قرار بن سالف تھا جس نے اونٹنی کی کوچوں کو کاٹ ڈالا تھا۔

قَالُوا اتَّعَسُوا بِاللّٰهِ لِيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ اَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ
اَهْلِهِ وَانَّا لصَادِقُونَ ﴿٥٦﴾

”انہوں نے کہا آؤ اللہ کی قسم کھا کر عہد کر لیں کہ شب خون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے۔ پھر کہہ دیں گے اس کے وارث سے کہ ہم تو (سرے سے) موجود ہی نہ تھے۔ جب انہیں ہلاک کیا گیا ہے اور (یقین کرو) ہم با کمال کج کہہ رہے ہیں۔“

۱۔ یہ جملہ مستاتھ ہے یا حال ہے اور اس سے پہلے فذلہ مقدر ہے۔ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔ تم اللہ کی قسم کھاؤ اس میں تفاسنموا امر قائلو کا مقولہ ہے۔ یا پھر تفاسنموا فعل ماضی ہے اور قائلو اسے بدل واقع ہو رہا ہے۔ یا پھر قائلو کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے پہلے فذلہ مضمر ہے۔ کہ ہم صالح (علیہ السلام) کو رات کے وقت ضرور قتل کر دیں گے اور ان کی اس قوم کو جو ان پر ایمان لائی۔

۲۔ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لَوَلِيِّهِ ان کے درمیان خطاب کی وجہ سے ہے۔ پہلے صیغہ میں دوسری تاء مفہوم ہے اور دوسرے صیغہ میں لام مضموم ہے تاکہ یہ واحد جمع محذوف پر دلالت کر لے۔ اور یقینہ قراء نے نون متکلم اور تاء اور لام کو کتف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ان کے خون کے وارث کو کہہ دیں گے۔ تو ہم حاضر نہیں تھے جب انہیں ہلاک کیا گیا۔ ۳۔ مَهْلِكَ اَہْلِهِ میں جمہور نے میم کو مضموم اور لام کو مفتوح پڑھا ہے اور یہ اہل لک کے باخوذ ہے۔ یہ مصدر، ظرف زمان اور ظرف مکان ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اور خفض کی قرأت کے مطابق میم مفتوح اور لام مکسور ہے۔ اور یہ ہلاکت سے باخوذ ہے۔ کیونکہ مفعول کے وزن پر کبھی مصدر ہوتا ہے جیسے فوج اور ابوبکر نے تو لام کو مفتوح پڑھا ہے اور اس صورت میں یہ مصدر ہی ہوگا۔

۴۔ اور ہم قسم اٹھا دیں گے کہ ہم کج کہہ رہے ہیں۔ یا حال یہ ہے کہ جو کچھ ذکر ہوا ہے ہم اس میں کج بول رہے ہیں کیونکہ کسی شے کا شاہد عرفا سے کرنے والا نہیں ہوتا۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف آپ کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کی جگہ یا وقت حاضر نہ تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت بھی وہاں حاضر نہ تھے۔ یہ اس قول کی طرح ہے مَا زَايَكُتْ وَجَلَا بَنِي رَجُلَيْنِ (میں نے صرف ایک آدمی کو نہیں دیکھا بلکہ دونوں کو نہیں دیکھا۔)

وَمَكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ مَّكْرُؤٌ ﴿٥٧﴾

”اور انہوں نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور وہ سمجھ ہی نہ سکے (ہماری تدبیر کو)۔“

۱۔ یعنی انہوں نے سخت دھوکہ کیا اس طرح کہ انہوں نے رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ہم نے بھی سخت خفیہ تدبیر کی اس طرح کہ اسے ہی ان کو ہلاک کرنے کا سبب بنا دیا۔ دراصل خلیفہ وہ ہماری تدبیر کو سمجھ ہی نہ سکے۔ ترکیب کلام

میں یہ جملہ مکرنا کے قائل سے حال ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مُكْرِمِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِينَ ۝۱

”تم (خودی) دیکھ لو کیا (ہولناک) انجام ہوا ان کے مکر کا۔ ہم نے برباد کر کے رکھ دیا انہیں اور ان کی ساری قوم کو۔“

۱۔ اس میں غاقبۂ کائنات کا اسم ہے اور تکلیف اس کی خبر ہے۔ اور اس کے لیے صدر کلام لازمی ہونے کی وجہ سے اسے مقدم کیا ہے۔ اور یہ استہمام تعجب کے لیے ہے۔ اور پھر مکمل جملہ استہمامیہ بتاویل مفرد ہو کر انظر کا مفعول ہے۔

۲۔ اَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ میں اہل کوفہ اور یعقوب نے اُنکا کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا پھر یہ کان کے اسم سے بدل ہے یا یہ کائن کی خبر ہے اور تکلیف حال ہے۔ یا تقدیر کلام یہ ہے اِنَّا دَمَّرْنَاهُمْ۔ باقی قراء نے جملہ مستألفہ ہونے کی بناء پر ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر اگر کائن ناقص ہے تو اس کی خبر تکلیف ہے۔ اور اگر کائن تامہ ہے تو تکلیف حال ہے۔ اور اَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ کو ضمیر عائد نہ ہونے کی وجہ سے کائن کی خبر بنانا جائز نہیں۔ انہیں ہلاک کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات ملائکہ کو حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف بھیجا تا کہ وہ آپ کی حفاظت کریں۔ چنانچہ جب وہ آدنی اپنی کماریاں سوئے ہوئے آپ کے گھر کی طرف آئے تو فرشتوں نے ان پر اس طرح پتھر برسائے کہ وہ پتھر تو دیکھتے تھے لیکن ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہذا اس طرح وہ تمام کے تمام قتل ہو گئے۔ اور مقابل نے کہا ہے کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف جانے کے لیے دایرہ کوہ میں بیٹھے اپنے بعض ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے کہ راستے میں ان پر پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا (۱)۔ عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ تدریس فرمائی کہ ان پر ایک چٹان بھیجی جس نے ان تمام کو تباہ کر دیا (۲) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام قوم کو ایک جھکے کے سبب ہلاک کر دیا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَانُوا يَمْسِكُوْنَ ۝۲

”پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث۔ بے شک اس میں عبرت ہے اس قوم کے لیے جو

(کچھ) جانتی ہے۔“

۱۔ یہ ان کے گھر ہیں جو خالی پڑے ہیں خاویۃ خوی البطن سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب نہایت خالی ہو جائے۔ یا معنی ہے یہ ان کے گھر ہیں جو گر چکے ہیں اور مہدم ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں یہ خوی النجم سے ماخوذ ہے۔ یہ تب بولا جاتا ہے جب ستارہ گر جائے۔ ترکیب کلام میں خاویۃ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

۲۔ یعنی یہ گھرانے کے کفر اور ظلم کے سبب اجڑے پڑے ہیں۔ اور جو کچھ خود یوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس میں ہماری کمال قدرت اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر واضح نشانی ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

وَاَنْجِبْنَا لَآلِیْنِ اَمْثَلُوْا وَاَنْتُمْ لَا تَتَّقُوْنَ ۝۳

”اور ہم نے بچالیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور (اپنے رب سے) ڈرتے رہتے تھے۔“

۱۔ اور ہم نے بچالیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور کفر اور گناہوں سے بچتے رہتے تھے۔ اور وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھی تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔

وَلَوْ كُنَّا إِذْ قَالَ الْقَوْمُ أَأَأْتَانَا الْقَاسِحَةُ وَأَنْتُمْ تَبْصُرُونَ ﴿٥٥﴾

”اور یاد کرو لو ط علیہ السلام ۱۔ کو جب آپ نے اپنی قوم کو کفر مایا ۱۔ کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا سہ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو تھے ہو“

۱۔ یہ فعل مضارع کے سبب منصوب ہے۔ جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَنَقَذْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ تقدیر کلام ہے وَأَرْسَلْنَا لُوطًا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اذْخَجُوا فعل محذوف کے سبب منصوب ہو۔

۲۔ یہ فعل مقدر کی طرف ہے جو کہ اذْخَجُوا ہے۔ یا یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے۔ اس بناء پر کہ یہ لُوطُ طائش عامل ہو۔ یا یہ لُوط سے بدل ہوا اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف اذْخَجُوا کے سبب منصوب ہے۔

۳۔ الْقَاسِحَةُ سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح اور برا ہو۔ یہ استفہام انکار اور توبيخ کے لیے ہے۔ اسی طرح دوسرا استفہام بھی اسی معنی کے لیے ہے۔

۴۔ حالانکہ تم اس فعل کی برائی کو جانتے ہو۔ ایسا آدمی جو قبیح کار ارتکاب کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ ان کی قبیح کو جانتا ہو تو ایسا کرنا اور زیادہ قبیح ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم میں سے بعض بعض کو دکھا کر یہ عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اس برائی کا ارتکاب اعلانیہ کرتے تھے۔ اور لوگوں کی موجودگی میں ایسا کرتے رہتے تھے۔ تو اس طرح یہ عمل اور زیادہ فحش ترین تھا۔ یا بھرمعنی یہ ہے کہ تم برائی کا ارتکاب کرتے ہو حالانکہ تم سبایتہ قوموں کے گنہگاروں کے حالات اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے آثار کو دیکھ رہے ہو۔

أَلَيْسَ لَكُمْ لَتَاتُونَ الرِّجَالِ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّجْهَلُونَ ﴿٥٦﴾

”کیا تم جانتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے (اپنی) بیویوں کو چھوڑ کر ۱۔ بلکہ تم تو بڑے نادان لوگ ہو ج“

۱۔ کیا تم مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جانتے ہو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر جنہیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہ ان کے برائی کا ارتکاب کرنے کے عمل کی وضاحت ہے۔ اس میں شَهْوَةٌ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ یہ عمل کے قبیح پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہاں یہ جیبہ بھی ہے کہ عمل جماع کی حکمت اور مقصد طلب نسل ہے فقط شہوت کو پورا کرنا اس کا مقصد نہیں۔

۲۔ تم تو ایسے لوگوں کی طرح یہ فعل کرتے ہو جو اس کی برائی اور قبیح سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں۔ یا معنی ہے کہ تم تو ایسی امتح قوم ہو کہ حسن و قبح کے درمیان تمیز ہی نہیں کرتے۔ یا معنی ہے کہ تم اس کے انجام سے ناواقف ہو۔ تَخْهَلُونَ کے صیغہ میں تاء خطاب کی ہے یعنی جو اس وصف سے متصف ہیں وہ مخاطب کے معنی میں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہاں اَنْتُمْ کے قول کے ساتھ خطاب اور قَوْمُہ کے قول کے ساتھ غائب دونوں جمع ہیں۔ لہذا پھر خطاب کو غیب پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ افعال کا حسن و قبح شریعت کے درود سے قبل فی نفسہ ان کی ذاتوں میں ثابت ہے اگرچہ ان میں سے بعض کی پہچان شریعت پر بھی موقوف ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُو آلَ لُوطٍ قَدْ يَتَّبِعُكُمْ ۖ إِنَّهُمْ

حضرت لوط علیہ السلام کو ہے۔ یعنی قُلْنَا لَهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الْمَخ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ وہ اپنی قوم کے کفار کے ہلاک ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں اور ان لوگوں کو سلام بھیجیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فواجش سے بچنے اور ہلاکت و تباہی سے نجات پانے کے سبب منتخب کر لیا۔ یا محمد ﷺ اور آپ کی امت پر سلام بھیجو کیونکہ سابقہ تمام انبیاء اور ان کی امتوں کو جو اعزازات عطا ہوئے اور جن آزمائشوں اور تکالیف سے وہ محفوظ رہے۔ یہ سب آپ ﷺ کے انور کی برکت سے تھا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کُنْتُ أَوَّلَ النَّاسِ فِي الْخَلْقِ وَآخِرُهُمْ فِي الْبُعْثِ (1) (میں خلق میں تمام لوگوں سے اول ہوں اور مبعوث ہونے میں تمام انبیاء سے آخر ہوں) اسے ابو سعد نے حضرت قتادہ سے مرسل روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: كُنْتُ نَبِيًّا وَأَوَّلُ بَيْنِ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ (2) (میں (اس وقت) نبی تھا اور آسمان کی آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے)۔ اسے ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ مسمرہ بن سعد بن ابی العبداء سے روایت کیا ہے۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

۷۔ اس کا تعلق ابتدائے سورت کی اس آیت سے ہے إِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ اَلِیٰ قَوْلِهِمْ اَلْاَحْزَابُ س میں درحقیقت انہیں الزام دینے، ان کی نادانی اور ان کی رائے کی حماقت کا اظہار ہے۔ ان واقعات اور قصص کے بیان کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے اپنے صالحین، بندوں کو اعزاز و اکرام سے نوازنے پر کامل قدرت رکھنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ اپنی اس شان کے سبب اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس سے خوف لکھایا جائے اور اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کی جائیں وہ اپنے سوا ہر شے سے بہتر ہے۔ کیا وہ بت وغیرہ جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں، جو نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ ان کا نقصان و ضرر نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے، اس اللہ تعالیٰ سے بہتر ہو سکتے ہیں جو قادر بھی ہے اور غالب بھی اور قابل عبادت بھی ہے۔ اب جو عہدہ، عاصم اور یعقوب نے یَنْفِیْضُوْنَ یَاہ کے ساتھ صیغہ غائب بڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے اہل مکہ کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ بڑھا ہے۔

أَمِنْ خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَأَنزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتِ
بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُثْمِرُوا وَسَجَرًا عَالِيًا لَّهُ مَعَالٍ ۖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعِدُونَ ۝

”بھلاہو کون ہے جس نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو؟ اور جس نے اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی۔ پھر ہم نے اگائے اس پانی سے خوش منظر باغات۔ تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگاسکے ان کے درخت سے کیا کوئی دوسرا خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ بلکہ وہ اپنے لوگ ہیں جو راہ راست سے بڑے ہٹ رہے ہیں۔“

۱۔ یہ اُمّ متلہ ہے اور جس پر یہ معطوف ہے۔ وہ معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ءَالِ الْہِکْمِ الْبَیْ لَمْ یَخْلُقُوا شَیْئًا وَهُمْ یَخْلُقُونَ خَیْرًا مِّنْ خَلْقٍ۔ یعنی کیا تمہارے وہ اللہ جنہوں نے کسی شے کو پیدا نہیں کیا حالانکہ وہ خود بنائے گئے ہیں وہ بہتر ہیں یا وہ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ ام مقطوعہ ہے اور نئی کے معنی میں ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مزمعہ سابقہ استفہام سے اضراب (اعراض) کے لیے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر خیر کے لیے مبداء ہوتا بدیہی ہے۔ اور ان میں قطعاً خیر موجود نہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ پس ان کے درمیان موازنہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بارے سوال کسی ممکن ہے۔

یہاں ہمزہ استفہام تقرر کے لیے ہے۔ یعنی مخاطب کو اس اقرار پر براہیختہ کرنے کے لیے کہ بہتر اور افضل وہی ہے جس نے آسانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور انزل لکم میں لام انقار کے لیے ہے۔

یعنی خدائق حدائق کے جمع ہے۔ فرآنے کہا ہے حدیقہ سے مراد وہ باغ ہے جس کے ارد گرد دیوار بنائی جائے۔ لہذا اگر اس کے ارد گرد دیوار نہ ہو تو وہ حدیقہ نہیں ہوگا (1)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ احداق سے ناخود ہے اور اس کا معنی ہے احاطہ کرنا۔ اور "ذات نہیجۃ" اس سے مراد ایسا حسین منظر ہے جس سے خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ حدائق کی صفت ہے۔ بھجیہ مفرد اس لیے ہے کہ حدائق مجموعہ حدائق کی تاویل میں ہے (یعنی باغات میں سے ہر باغ پر رونق اور باعث فرحت و مسرت ہے)۔ اس کلام میں غیب سے شکم کی طرف التفات کیا گیا ہے ایک تو اس تاکید کے لیے کہ یہ فعل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور دوسرا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ ایک ہی قسم کے مواد سے مختلف الانواع اور متباہد المظاہر پر رونق اور دلآویز باغات پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور قدرت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اس نے اپنے اس قول کے ساتھ تصریح فرمائی۔

یعنی کہ تمہارے لیے ممکن نہیں کہ ان کے درختوں میں سے کوئی درخت اگاؤ۔ شجرؤہا میں اضافت جس کے لیے ہے۔ اور مانتان لکم الخ کا جملہ خدائق کی صفت ہے۔

یعنی کیا کوئی اور اللہ ہے اللہ کے ساتھ؟ جو اس پر اس کی معاونت کرے۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے یعنی کوئی ایک نہیں جو اس پر اس کی معاونت کرے۔ اور اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے ساتھ عبادت کا مستحق نہیں کیونکہ وہ پیدا کرنے میں منفرد ہے۔

یہ بلکہ کفار کہہ لوگ ہیں جو انہیں جو کچھ بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو سب کچھ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق سے پرے ہٹ رہے ہیں یعنی توحید سے۔ اس کلام میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

أَمْ كُنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَهْرًا أَمْ أَوْ جَعَلَ خَلْقَهَا أَنْهَرًا أَوْ جَعَلَ لَهَا سِرًا أَوْ جَعَلَ

بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا أَمْ عَلَّمَ الْغَمَامَ اللَّهُ طَبْلًا أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٥﴾

”بھلاسنے بنایا ہے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہریں۔ اور بنادے زمین کے لیے

(پہاڑوں کے) ٹکڑے اور بنادی دو سمندروں کے درمیان آڑ۔ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ بلکہ ان میں سے

اکثر لوگ بے علم ہیں۔“

یعنی کلام آمن خلقی السموات الخ سے بدل ہے۔ اس مقام پر اور اس کے مابعد مقام پر آنے والے آئم کے بارے بحث ویسے ہی ہے جیسے پہلے کر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ اس کے بعض حصہ کو پانی سے ظاہر کیا اور اسے ممکنہ طریقے سے ہموار کر دیا۔ اور اس کے درمیان جاری نہریں بنائیں۔ ترکیب کلام میں یہ ظرف مستقر ہے اور جمل کے دوسرے مفعول کی جگہ واقع ہے۔ بعد میں آنے والے دو جملوں میں بھی اسی طرح ہے۔

یعنی اور زمین کے لیے بنائے ثابت رہنے والے پہاڑ بنائے جو زمین کو حرکت سے روکتے ہیں۔ اور پھر ان پہاڑوں سے دریا نکال دیئے۔

اور ٹھٹھے اور ٹنگین دوسندروں کے درمیان آؤ بنا دی۔ جو ان کے باہم ملنے سے مانع ہے۔

اسی نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور الہ نہیں۔ اور نہ ہی وہ قطعی دلائل ہونے کے باوجود صبح غور و فکر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی جہالت کے سبب دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور بعض یہ جانتے تو ہیں لیکن وہ اپنی نخوت اور عناد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

اَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَا وَ يَكْشِفُ السُّوءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ
الْاَرْضِ ۗ اِنَّ اِلٰهَكُمْ اللّٰهُ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۸﴾

”بھلا کون قبول کرتا ہے ایک بے قراری فریاد جب وہ اسے پکارتا ہے اور (کون) دودھ کرتا ہے تکلیف کو (کس) نے بنایا تمہیں (انگوں) کا غلیف؟ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ تم بہت کم غور و فکر کرتے ہو۔“

۱۔ الْمُضْطَرُّ یہ ام فاعل ہے اور اِضْطَرَّ اسے ما خوذ ہے۔ اور یہ الضمر سے باب افعال ہے یعنی جو کسی ضرر اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی شدت اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس کی فریاد کو قبول کرتا ہے۔ جب وہ اسے پکارتا ہے اگر وہ چاہے۔ کیونکہ اِضْطَرَّ بلام ضمض کے لیے ہے استغراق کے لیے نہیں۔ لہذا اس سے ہر بے قراری فریاد کو قبول کرنا لازم نہیں آتا۔ اور وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے جس نے اسے پکارنے پر مجبور کیا۔

۲۔ اس کا عطف یَجِيبُ پر ہے۔ اور کس نے تمہیں ان کا غلیف بنایا ہے۔ جو زمین میں تم سے پہلے تھے اس طرح کہ اس نے تمہیں ان کی رہائش گاہوں اور ان میں تصرف کرنے کا وارث بنادیا۔ یا اس نے تمہیں ان کی سلطنتوں کا وارث بنادیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کون ہے وہ جس نے تمہیں زمین میں جنوں کا غلیف بنادیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی ہو۔ کون ہے وہ جس نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کا غلیف بنادیا۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ۔

۳۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور الہ ہے جس نے تمہیں ان خاص اور عام نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ یعنی ایسا نہیں۔ مگر اللہ وہ ہے جو ان تمام نعمتوں کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔

۴۔ قَلِيْلًا مَا میں فا زائدہ ہے اور قَلِيْلًا یَنْذَرُ عَزْرُوْنَ کے سبب مصدریت یا ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ (یعنی یا مفعول مطلق ہے مصدر محذوف کی صفت ہونے کی بناء پر یا پھر مفعول فیہ ہے)۔ یہاں قَلَّةٌ سے مراد عدم (یا کُل نہ ہونا) ہے۔ یعنی تم یا کُل ہی غور و فکر نہیں کرتے۔ یا اِس قَلَّت سے مراد ایسی مختارت ہے جو فائدے کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں ابو عمر اور ہشام نے یَنْذَرُ عَزْرُوْنَ صیغہ غائب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تاء یعنی صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ جزہ، کسائی اور حفص نے ذال کو خفص اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے۔

اَمَّنْ يُّهْدِيْكُمْ فِی ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیْحَ بُشْرًا لِّلْبَیِّنِیْنَ
رَاحَتِہٖمْ ۗ اِنَّ اِلٰهَكُمْ اللّٰهُ ۚ تَعٰلٰی عَنْ مَا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱۹﴾

”بھلا کون راہ دکھاتا تمہیں بروبحر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی (باران)

رحمت سے پہلے کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ برتر ہے اللہ تعالیٰ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں۔
 لے بھلا کون نہیں راہ دکھاتا ہے ستاروں اور زمین کی علامات کے ساتھ بروح کی تاریکیوں میں جبکہ تم راتوں کے وقت سفر کرتے ہو۔ مگر وہ
 برکی طرف ظلمات کی اضافت ملاہست کے لیے ہے۔ اور اپنی باران رحمت سے پہلے کون ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے؟
 لے کیا کوئی اور خدا ہے جو اس کی مثل قدرت رکھتا ہو۔ برتر ہے وہ اللہ جو قادر بھی ہے اور خالق بھی ان سے جنہیں وہ عاجز مخلوق میں سے
 شریک بناتے ہیں۔

أَمَّنْ يَبْدُوُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ يُرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ طَعَامًا
 مَعَ اللَّهِ طَعَامًا قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑤

”بھلا کون ہے جو آغاز کرتا ہے آفرینش کا پھر دوبارہ پیدا کرے گا اسے اور کون ہے جو رزق دیتا ہے تمہیں آسمان سے اور
 زمین سے۔ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ فرمائیے (اے مشرک!) پیش کرو اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔“
 لے بھلا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرے گا۔ کفار نے اگرچہ دوبارہ پیدا کیے جانے کا انکار کیا ہے
 لیکن ان کے خلاف ایسے نقلی دلائل قائم کیے گئے ہیں جو اعادہ پر دلالت کرتے ہیں اور ان کی صداقت و حقانیت پر معجزات کے ذریعے
 شہادت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی اعادہ ممکنات میں سے ہے۔ اور کون ہے جو تمہیں اسباب مادیہ اور اسباب ارضیہ
 سے رزق دیتا ہے۔

لے کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اس پر قدرت رکھتا ہو۔ فرمائیے (اے مشرک!) اس پر اپنی کوئی دلیل پیش کرو کہ اللہ تعالیٰ
 کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے جو ان چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تم شریک ٹھہرانے میں سچے ہو۔ کیونکہ کمال قدرت الوہیت کے
 لوازمات میں سے ہے۔ علامہ بخوی نے کہا ہے کہ جب مشرکین نے حضور نبی رحمت ﷺ سے قیامت قائم ہونے کے وقت کے
 بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ط وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ
 يُبْعَثُونَ ⑥

”آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اور وہ (یہ بھی)
 نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا۔“

لے اے محمد ﷺ ان کے جواب میں فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو ملائکہ آسمانوں میں ہیں اور جو جن و انس زمین میں ہیں۔
 اور ان میں سے انبیاء علیہم السلام بھی ہیں۔ اس میں مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ۔ وہ شے جو ان کے حواس سے غائب ہو اور اس پر کوئی عقلی
 دلیل قائم نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو ان سے غائب ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر اللہ تعالیٰ کے جانتے اور مطلع
 کرنے کے ساتھ۔ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان میں استقرار سے منزہ اور مبرہ ہے (لہذا یہ مستثنیٰ نہ میں داخل نہیں
 ہوگا) اور لفظ اللہ کا رفع بنی تحمیل کی لغت کے مطابق ہے، ان کے نزدیک نصب دینا بھی جائز ہے۔ اور مستثنیٰ منقطع میں بدل ایسے ہی ہوتا

ہے جیسے مستفی متصل میں۔ اس پر بطور دلیل شاعر کا یہ شعر ہے۔

وَلَمَّا دَلَّ نَسِيبُهَا أَنِيسَ إِلَّا الْيَعْفِيُو وَالْأَلْيَسِ

یہ شعر ہے جہاں کوئی صدیق و غم خوار نہیں سوائے گدھوں اور بھورے اونٹوں کے

بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے اور محال فرض کرنے کے طریقے پر مستفی متصلی منہ میں داخل ہے۔ اور محال کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔ اور البحر المواج میں ہے کہ مستفی منہ محذوف ہے اور کلام میں حذف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْعُغَيْبَ لَا يَعْلَمُهُ أَحَدٌ إِلَّا اللَّهُ۔ پس یہ جملہ کی علم کی علت بیان کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْعُغَيْبَ بَشَى إِلَّا بِاللَّهِ اِیْ بِتَعْلِيْمِهِ (زمین و آسمان میں رہنے والا کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مطلع کے بغیر غیب میں سے کوئی شے نہیں جانتا)

بلکہ وہ بھی نہیں سمجھے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا یعنی انہیں اٹھائے جانے کا وقت ان چیزوں میں سے ہے جن کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا یہ ایسا غیب ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کے بتلانے بغیر جانتا اور اس پر اطلاع پانا ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر کسی کو بھی مطلع نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس کے علم کو اپنے لیے خاص کیا ہے۔ لہذا اس کے بارے میں ان کے جاننے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کلام تخصیص بعد التعمیم کے قبیلے سے ہے اور یہ تاکید کا فائدہ دے رہی ہے۔ اور دوسرا جواب کو سوال کے مطابق بتانے اور تخصیص کے احتمال کے تقین ہونے کا فائدہ دے رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْعُغَيْبَ۔ یہ قول ان کے علم غیب کی نفی کا فائدہ دیتا ہے اور ان چیزوں کا علم جو انہیں رسولوں کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل ہوا وہ اس سے مخصوص ہے۔

بَلْ اذْكُرْ عَلِيمٌ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا بَلْ هُمْ عَنْهَا غُمُونَ ۝۱۱

”بلکہ تم ہو گمراہ! ان کا علم آخرت کے متعلق بلکہ وہ تو اس کے بارے میں شک میں ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں۔“

لے ابو جعفر، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اذاک کو باب افعال سے انکوڑم کے وزن پر ہمزة قطعی کے ساتھ پڑھا ہے۔ لے جملہہم اور اک کا فاعل ہے اور فی الْآخِرَةِ اذکر کی طرف ہے۔ اور مفعول محذوف ہے۔ اور اس پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے۔ معنی یہ ہے کہ بے شک وہ دنیا میں قیامت قائم ہونے کے وقت کا بالکل ادراک نہیں کر سکتے بلکہ ان کا علم آخرت میں اس تک پہنچنے کا جب وہ اسے آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یا پھر معنی یہ ہے بلکہ آج (دنیا میں) آخرت کے بارے رسول اللہ ﷺ کے انہیں بتانے کے ساتھ ان کا علم اس کا ادراک کر سکتا ہے کہ بے شک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں لیکن وہ اس کے آنے کا وقت نہیں جانتے۔ ہاں قراء نے اسے بل اذکر پڑھا ہے۔ اس کی اصل تذاکر، ہے۔ یعنی ان کا علم کامل ہو گیا اور پختہ ہو گیا اور انہیں یہ آخرت کے احوال کے بارے رسول اللہ ﷺ کے مطلع کرنے سے حاصل ہوا یا ان کو اس کا علم حاصل ہو گا جب وہ اس کا آنکھوں سے معائنہ کریں گے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے تذاکر الفاکھۃ یہ تب کہا جاتا ہے جب پھل مکمل طور پر پک جائے۔ مؤمنین کے لیے دنیا میں علم قطعی کا حصول بالکل ظاہر ہے۔ اور کافروں کے لیے اس اعتبار سے ہے کہ قطعیت کو ثابت کرنے والی ادلہ اس علم کے قائم مقام ہیں۔

یعنی کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ایسی اخبار پائے جانے کے باوجود جو قطعیت کو ثابت کرتی ہیں قیامت قائم ہونے کے بارے میں شک کرتے ہیں حالانکہ آپ کی تائید معجزات سے کی گئی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ بلی اذکرک استہقام کے طریقہ پر ہے۔ اس کا معنی ہے کیا آخرت کے بارے میں ان کا علم عمل اور مضبوط ہو گیا ہے؟ یعنی وہ مکمل نہیں ہو اور آخرت کے بارے میں ان کا علم کم اور غائب ہو گیا ہے۔ پس نہ وہ اس تک پہنچے ہیں اور نہ انہیں اس کا ادراک ہوا ہے۔ کیونکہ استہقام میں انکار کی ایک قسم بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت اس تاویل پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اسے بلی پڑھا ہے۔ یعنی بایہ صورت میں لکھ کر آخرت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے۔ اور ادرک پڑھا ہے یعنی ہمزہ استہقام کو مفتوح پڑھا ہے اور ہمزہ وصل کو مگر دیا ہے۔ اور یہ لَمْ یَلِدْک کے معنی میں ہے۔ اور حضرت ابی کی قرأت میں اَمْ نَذَرک عِلْمُہُمْ ہے۔ اور عرب اَمْ کی جگہ بلی اور بلی کی جگہ اَمْ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ علی بن موسیٰ اور اسحاق نے کہا ہے کہ بلی اذکرک میں بلی لَوْ کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر دنیا میں انہیں آخرت کے بارے میں وہ علم حاصل ہو جاتا جو انہیں آخرت میں ہوتا ہے تو وہ شک نہ کرتے لیکن آج تو وہ قیامت کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

یعنی بلکہ وہ قیامت کے بارے میں اندھے ہو چکے ہیں۔ غمُؤن غمی کی جمع ہے اور اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ان سے علم غیب کی نفی کر دی پھر ان سے ان کے انہام کے شعور کی نفی کر کے اسے مزید مٹا دیا جو ان کے لیے یاقین ہوتا ہے۔ پھر اس میں مبالغہ کیا اس طرح کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے تصریح فرمائی کہ ان کا علم اے علم اور دلائل و آیات میں سے وہ اسباب علم جو کامل ہونے وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ قیامت یاقین قائم ہوگی۔ لیکن وہ اس کے بارے میں ایسا نہیں جانتے جیسے جانا چاہئے (یعنی اس کا وقت کیا ہے وہ کب قائم ہوگی وغیرہ) پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بَلْ لَمْ یَلِدْک عِلْمُہُمْ یعنی شکب مٹھا کہ اذکرک مکمل ہونے کے بعد بھی وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں اس آدمی کی طرح جو کسی کام کے بارے میں سرگرداں اور متحیر ہو اور وہ اس پر کوئی دلیل نہ پاتا ہو۔ پس یہ اپنے شک کو زائل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بلکہ یہ تو اس سے بھی بڑے حال میں ہیں کہ یہ اندھے ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی بصیرت محفل ہونے کی وجہ سے دلائل کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ یہ کیفیات مشرکین کے ساتھ مختص ہیں لیکن ان کی نسبت زمین و آسمان کے تمام بانیوں کی طرف اسی طرح کر دی گئی ہے جیسے بعض کے فعل کو عمل کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلا اضطراب وقت قیامت کے شعور کی نفی کے لیے ہے، یعنی استہزاء کہا کہ آخرت کے امور کے بارے میں تو ان کا علم انتہائی مستحکم ہے یہ قول بھی ہے۔ کہ یہاں اذکرک انہی کے معنی میں ہے، یعنی وہ اپنی انتہا کو پہنچا اور یسٹ و نا بود ہو گیا جیسا کہ عربوں کا قول ہے ادرک الشہرۃ۔ وہ اپنی شہرت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ کیونکہ وہی اس کی ذہن غایت ہوتی ہے جس کے پاس پہنچ کر وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس اور آخرت کے بارے میں ان کے علم سے اضطراب ہے، ایک تو ان سے اس کے علم کی نفی میں مبالغہ کے اظہار کے لیے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لیے کہ قیامت کے بارے میں ان کا شعور یہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں شک کر رہے ہیں اور پھر اس سے بھی اعراض کرتے ہوئے فرمایا ہُمْ مِّنْہَا غَمُؤُنْ کہ وہ تو اس سے اندھے ہو چکے ہیں اور ان میں قیامت کے بارے میں جاننے کی بالکل صلاحیت ہی نہیں ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا دُكِّنَ إِلَيْنَا آيَاتُ مَا بَاءَ وَإِنَّا بِهَا لَنَحْزَنُونَ ﴿٥٠﴾

”اور کفار کہنے لگے: کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی مٹی تو کیا ہمیں (پھر) نکالا جائے گا؟“
 لے اس کا عطف اس قول بَلْ هُمْ فِيْهَا عَمُوْنٌ کے مضمون پر ہے۔ اور یہ اس کے بیان اور وضاحت کی مثل ہے۔ یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے۔ اور قَالُوْا انھیں کہا۔ اس لیے کہ اس سے قبل کافروں کا ذکر مجمل ہے۔

ع۔ نافع نے اِذَا کو ہمزہ استفہام کے بغیر میضہ خبر کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اس پر ہمزہ استفہام مقدر ہے۔ اور باقیوں نے سوالیہ صورت میں دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور کسائی نے اِنْفَا کی دو فونوں کے ساتھ قرأت کی ہے ان میں سے ایک نون وقایہ ہے۔ اور ایک ہمزہ کے ساتھ خبر میضہ کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ہمزہ استفہام کو مقدر کیا ہے۔ اور باقیوں نے استفہام کی صورت پر ایک نون اور دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اِنْفَا کی ضمیر کفار کی طرف اور ان کے آباء کی طرف راجع ہے۔ اس میں غائب پر حکایت بیان کرنے کو غلبہ دیا گیا ہے۔

ع۔ مفہوم یہ ہے کیا ہمیں قیور سے زندہ نکالا جائے گا اور موت کی حالت سے حیات کی طرف نکالا جائے گا۔ یہی ان کے اندھے پن کا بیان اور وضاحت ہے۔ اِذَا کا عامل محذوف ہے جس پر معوجہ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَنُخْرُجْ اِذَا اُنْحَا قُرْبَا اَنُخْرُجْ مُخْرَجُوْنَ جَنَّتِلَہٗ کیا جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو اس وقت ہمیں نکالا جائے گا؟۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ دوسرا جملہ استفہامیہ پہلے جملے کے لیے تاکید ہے۔ مبالغہ کے اظہار کے لیے دوبارہ اسے انکار کے لیے لایا گیا ہے۔ اور اِذَا میں مُخْرَجُوْنَ کو عامل بنانا جائز نہیں، کیونکہ ہمزہ اِن اور لام اپنے ماقبل میں عمل کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا اَنْحُنْ وَاٰبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلٰیْنَ ﴿۱۸﴾

”بے شک قیامت کے آنے کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا اور ہمارے باپ دادا سے بھی اس سے پہلے لے نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے سن گھڑت افسانے ع۔“

لے تحقیق قیامت کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا ہے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زبان مبارک سے ہمارے ساتھ اور آپ کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے ہمارے آباء کے ساتھ بھی اس سے قبل یہ وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کلام میں هٰذَا کو نَحْنُ پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مقصود قیامت کا ذکر ہے اور جہاں اسے مؤخر کیا گیا ہے وہاں مقصود وہ ہے جسے اٹھایا جائے گا۔

ع۔ یہ وعدہ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی باتیں اور ان کے وہ سن گھڑت افسانے جو انہوں نے لکھے ہیں۔

قُلْ سَيُرَوِّي الْاَسْرَافُ فَاَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

”آپ فرمائیے سیر و سیاحت کرو زمین میں۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ کیسا ہولناک انجام ہوا مجرموں کا لے۔“

لے اے محمد ﷺ! آپ فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مجرموں کا کیسا ہولناک انجام ہوا۔ یہ ان کے جھٹلانے کے سبب ان کے لیے جھڑک ہے اور انہیں اس طرح خوفزدہ کرتا ہے کہ ان پر اسی طرح عذاب نازل ہوگا جیسے ان سے پہلے جھٹلانے والوں پر نازل ہوا۔ اور انہیں مُجْرِمِيْنَ سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ مؤمنین پر جرائم ترک کرنے کی وجہ سے لطف و عنایت ہو۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَكْسِرُونَ ⑤

”اے محبوب! آپ غمزدہ نہ ہوں ان کے رویے پر اور تنگ دل نہ ہو اگر میں ان کے کمر و فریب سے ل۔“
 لے اے محمد! ﷺ ان کے جھٹلانے اور اعراض کرنے کے سبب آپ غم زدہ نہ ہوں اور ان کے کمر و فریب کے سبب آپ تنگ دل نہ ہوں۔ ضیق میں ابن کثیر نے ضاد کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے ضاد کو فتح کے ساتھ اور یہ دو لغتیں ہیں۔ اور ”بمضا یمشکرونی“ میں من سبب بیان کرنے کے لیے ہے اور ماضی مصدر یہ ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ کے ان سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو استہزاء کرتے تھے، یعنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملے کو کمال تک پہنچائے گا۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑥

”اور وہ پوچھتے ہیں کب (پورا ہوگا) یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔“

لے اس کا عطف قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا پر ہے اور ان کے درمیان جملے متر ہے ہیں۔ یعنی عذاب کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ کب پورا ہوگا۔ اگر تم اس میں سچے ہو کہ عذاب نازل ہونے والا ہے۔

قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ رَدِفٌ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ⑦

”آپ فرمائیے قریب ہے کہ تمہارے پیچھے آگاہوں لے اس عذاب کا کچھ حصہ جس کے لیے تم جلدی پجارہے ہو۔“
 لے لکم میں لام زائدہ تاکید کے لیے ہے اصل میں لفظ رَدِفُ لَكُمْ ہے۔ یعنی قریب ہے کہ وہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملتا ہو۔

لے بَعْضُ میں دو فعلوں کا تآثر ہے۔ اور وہ کیوں اور ردیف ہیں ان دونوں میں سے ایک اس میں عمل کرتا ہے اور دوسرے میں ضمیر موجود ہے، یعنی قریب ہے کہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملتا ہو اس عذاب کا بعض حصہ جس کے آنے کی تم جلدی پجا رہے ہو۔ اور اس سے مراد غزوہ بدر کی صورت میں ان پر آنے والا عذاب ہے۔ حضرت علامہ بیضاوی نے فرمایا سلاطین کے وعدوں میں عسی، لعل اور سوف کے الفاظ یقین کے معنی میں ہوتے ہیں وہ ان کا استعمال اپنے وقار کے اظہار کے لیے کرتے ہیں اور ان کے ذریعے احساس دلاتے ہیں کہ ان کا اشارہ دوسروں کے صریح کلام کی مثل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں میں بھی ان الفاظ کا استعمال اسی معنی میں ہے۔ اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے عَسَى وَلَعَلَّ فِیْ سَخْلَامِ اللّٰهِ وَاجِبَةُ الْوَقْعِ اس کا یہی معنی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسی اور لعل کے الفاظ بالیقین واقعہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن وعید کی صورت میں ایمان لانے کی شرط کے ساتھ معافی جائز ہوتی ہے۔ مگر کافر کو مستحق نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَتَقُولُ لَا نَحْنُ بِالْعٰدِلِ یَسْتَكْبِرُوْا وَ یَغْتَبِیْ اِسْ بَابٍ مِّنْ نَّبَیْسٍ ہے۔ اسی وجہ سے فرعون کی جانب سے نہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کا اثر ظاہر ہوا اور نہ اس کے دل میں خوف الہی پایا گیا۔

وَإِنْ رَبَّكَ لَبَدُؤُفْضِلْ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُونَ ⑧

”اور بے شک آپ کا رب فضل (و کرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر۔ لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔“
 لے یعنی اگر وہ چاہے تو مومن کی مغفرت فرما دیتا ہے اور کافر کو جلدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ اسی طرح اس نے اہل مکہ پر بھی عذاب

لانے میں جلدی نہیں کی۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے (1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لغت کے حق کو نہیں پہچانتے لہذا وہ عذاب جہنم جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْتَدُونَ ۝۴۱

”اور یقیناً آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔“

1۔ اور بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جسے لوگوں کے سینوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی عداوت و دشمنی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا ضرور دے گا۔ ان سے عذاب کا خوف ہونا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا حال مخفی اور پوشیدہ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ غشی پر معطوف ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں غشی تحقق اور ثبوت کے لیے ہے۔

وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّاءِ وَالْأَرَضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝۴۲

”اور نہیں کوئی پوشیدہ چیز ل۔ آسمان اور زمین میں مگر اس کا بیان کتاب میں موجود ہے۔“

ل۔ غائبہ معاً کا اسم ہے اور من زائد ہے، یعنی ما من شئ غائب عن أبصار الناس۔ لوگوں کی آنکھوں سے کوئی شے بھی غائب نہیں۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے جیسا کہ خلافہ اور دونوں میں تاہم مبالغہ کے لیے ہے۔ جیسا کہ روایہ میں ہے۔ یا یہ دونوں اس شے کا اسم ہیں جو غائب ہوتی ہے اور چھپ جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کے آخر میں تاہم غائبہ اور عاقبتی تاہم کی مثل ہی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ محذوف کی صفت ہے۔ یعنی حلیہ غائبہ یعنی پوشیدہ راز مخفی امر اور غائب شے۔

ل۔ فی السَّاءِ وَالْأَرَضِ طرف لغو ہے جو غائبہ کے متعلق ہے اور إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ مستثنیٰ مفرغ ہے اور مافیٰ خبر ہے۔ یعنی کھلی ہوئی اور واضح کتاب یا اس کے لیے اپنے ائمہ صحیحہ ہونے اسرار و رموز کو بیان کرنے والی جو اس کا مطالعہ کرے۔ اور اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفْصَحُ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَحْتَلِفُونَ ۝۴۳

”یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اکثر ان امور (کی حقیقت) کو جن میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں۔“

ل۔ بے شک یہ قرآن پاک بنی اسرائیل کے لیے اکثر ایسے دینی امور بیان کرتا ہے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ یہی نے کہا ہے کہ بے شک اہل کتاب آپس میں اختلاف کرتے کرتے گروہوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کو طعن دینے لگے۔ پھر قرآن کریم ان چیزوں کی وضاحت اور بیان میں نازل ہوا جن کے بارے وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے (2)۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت اس ارشاد سے متصل ہے۔ وَإِنَّكَ لَتَنفُلُ الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْكَ حَتَّىٰ يَخْشَوْا رَبَّهُمْ اور یہ اس کے مقام تعلیل میں واقع ہے۔ اور جو جملے ان کے درمیان ہیں وہ معترضے ہیں۔

وَإِنَّهُ لَهْدَىٰ وَسَرَّحَهُ لِيَلْمُوهُ وَيُذَيِّنَ ۝۴۴

”اور بلاشبہ یہ قرآن سرپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے مومنین کے لیے۔“

ل۔ اور بے شک قرآن کریم مومنین کے لیے سرپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے کیونکہ وہی اس قرآن سے نفع اٹھاتے ہیں نہ کہ وہ کفار جو اہل

کتاب سے ہوں یا دوسرے ہوں، ان کے لیے یہ نفع بخش نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَفْضِلُ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٥٠﴾

”یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان۔ اپنے حکم سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا۔“

بے شک آپ کا رب دین کے امور میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن اپنے حکم سے فیصلہ فرمائے گا۔
بے شک یہ یغضیٰ کے متعلق ہے، اگر کہا جائے کہ یغضیٰ کا معنی ہے وہ فیصلہ فرمائے گا تو پھر پہلو ہاس کے متعلق کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس جملے کی مثل ہو جاتا ہے بِنَصْرِهِ بِنَصْرِہ (وہ اس کی مدد کرتا ہے اپنی مدد کے ساتھ) اور یہ جائز نہیں؟ تو اس کے بارے ہم کہیں گے کہ یہاں حکم معنی حکم ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فیصلے کا حکم فرمائے گا جو اس نے قرآن کریم میں ان کے متعلق بیان کر دیا ہے۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ وہ اپنی حکمت کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔ وہ اتنا غالب ہے کہ اس نے اپنے فیصلے کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ اس کی حقیقت اور حکمت کو خوب جانتا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿٥١﴾

”سو آپ بھروسہ کریں اللہ پر، بے شک آپ روشن حق پر ہیں۔“

اے اور آپ ان کی پرواہ نہ کریں جو آپ سے عداوت رکھتے ہیں۔ یہ قول باری تعالیٰ اِنْ زَيْتُكَ يَفْضِلُ بَيْنَهُمْ سے متعلق ہے۔
بے شک آپ روشن حق پر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بین حق پر ہونا توکل کی علت ہے۔ کیونکہ وہ ایسے واضح حق پر ہے جس میں خفا نہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حقیقتاً صاحب حق ہے اسے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے تو اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہوگا۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الشَّعَاعَ ۚ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾

”بے شک آپ نہیں سنا سکتے مردوں کو، اور نہ آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو اپنی پکار۔ جب وہ بھاگے جارہے ہوں پیٹھے پھیرے ہوئے۔“

بے شک آپ کفار کو نہیں سنا سکتے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس میں کہ قرآن کریم کی جو آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں ان کا سامع ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوتا۔ (یعنی وہ اس سے کوئی نفع اور فائدہ حاصل نہیں کرتے کہ وہ کفر چھوڑ کر ایمان قبول کر لیں) جیسا کہ انہیں اس ارشاد باری تعالیٰ میں بہروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اَللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَعْلَمُ عَلَمِیْنَ کے طریقے پر دو فعلوں کا مفعول ہے ابن کثیر نے اسے لَا تُسْمِعُ اِیَّاهُ اور یم کے فتح کے ساتھ صیغہ غائب مجرد سے پڑھا ہے۔ اور فاعل ہونے کی بناء پر الضم مومرفوع پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ روم میں بھی کیا ہے۔ جب کہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ ہونے کی بناء پر تاء کو ضمہ اور یم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تُسْمِعُ یہ اسما سے ماخوذ ہے۔ اور الضم مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ کی قید کا کیا مقصد ہے؟ جب کہ احم ہوتا ہی وہ ہے جو نہیں سنا چاہے وہ وہاں پھرے یا نہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔ اور دوسرا جواب ہے کہ بہرہ آدمی جب حاضر ہوتا ہے تو کبھی وہ بلند آواز کو سن لیتا ہے یا پھر اشارہ یا کتابت کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن جب وہ وہاں چلا گیا تو پھر وہ بالکل نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ یعنی لفظ کارو

جس چیز کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعراض کرنے میں اس میت کی مثل ہو چکے ہیں جس کے لیے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور اس بہرے کی مثل ہو چکے ہیں جو پیٹھ پھیر کر واپس مڑ جاتا ہے اور اسے سمجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ قول بھی ہے کہ تازع القلعین کے طریقہ پر یہ طرف دونوں کے متعلق ہے۔

اعتراض :- یہاں اعراض یہ وارد ہوتا ہے کہ بہرے کی طرف تو واپس بھاگنے کی نسبت کرنا صحیح ہے لیکن مردوں کی طرف یہ نسبت جائز نہیں تو پھر تازع کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟

جواب :- جواب یہ ہے کہ یہاں کافر کو استعارۃً مردہ اور بہرہ کہا گیا ہے۔ اور کافر پیٹھ پھیر کر بھاگنے والوں میں سے ہے (لہذا تازع متصور ہو سکتا ہے) اس استعارہ کا نام استعارہ مجرہ ہے اور یہ وہ ہوتا ہے جس میں مستعار کو ایسے وصف سے متصف کیا جاتا ہے جو مستعار لفظ کے مناسب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعَمَىٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ ۖ إِنَّهُمْ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا ۖ فَهُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿٥١﴾

”اور نہیں آپ ہادی دہائی (دل کے) اندھوں کو ان کی گمراہی سے لے نہیں سنا تے آپ بجز ان کے جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیتوں پر لے چہرہ فرمانبردار بن جاتے ہیں“

لے اعمش اور حمزہ نے یہاں اور سورہ روم میں ہدیٰ کو سینہ مقارن کی بناء پر قہدی پڑھا ہے۔ یعنی تاء مفتوح اور حاء ساکن کے ساتھ بغیر الف کے قرأت کی ہے۔ اور الغنی نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جب وقف کرتے ہیں تو دونوں صورتوں میں قہدی کی یاد کو ثابت رکھتے ہیں۔ اور باقی قراء نے یاد مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح اسم فاعل کا صیغہ الغنی کی طرف مضاف ہے اور وہ مجرور ہے۔ انہوں نے یہاں یاد کے ساتھ وقف کیا ہے اور سورہ روم میں بغیر یاد کے۔ اور انہوں نے ایسا مصحف کی اتباع کرتے ہوئے کیا ہے۔ یعنی آپ انہیں ہدایت نہیں دے سکتے جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان قبول کرنے سے اندھا کر دیا ہے۔

ج۔ اور آپ نہیں سنا سکتے اور نہ ہی آپ کا قرآن سنانا کسی کو نفع دے سکتا ہے۔ مگر جن کے لیے ہم نے ایمان مقدر کر دیا ہے (وہی اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں)۔ پس وہی ظہر ہیں جو اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر لیتے ہیں۔

وَإِذَا وَقَعَتِ الْفُتُولُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٥٢﴾

”اور جب ہماری بات کے ان پر پورا ہونے کا وقت آ جائے گا تو ہم نکالیں گے ان کے لیے ایک چوپایہ زمین سے لے جو ان سے گفتگو کرے گا لے کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے ج۔“

لے جو بات انہیں کہی گئی ہے جب اس کا وقوع ان کے قریب ہوگا۔ یعنی جو انہیں دوبارہ اٹھانے جانے اور عذاب دیے جانے کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔ جب اس کا وقت قریب ہوگا تو ہم ان کے لیے ایک چوپایہ نکالیں گے۔ علامہ بخاری نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس میں چوپائے کی دم نہیں ہوگی لیکن اس کی ڈانگی ہوگی گویا کہ آپ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ آدمی ہوگا۔ اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ وہ چار ٹانگوں والا جانور ہوگا۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہ چوپایہ اون

اور پردوں والا ہوگا اور اس میں ہر قسم کے رنگ ہوں گے، اس کی چار ٹانگیں ہوں گی پھر وہ حاجیوں کے پیچھے سے ظاہر ہوگا (1)۔ جریح نے ابو الزہیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس چو پایہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا اس کا سر تیل کے سر کی طرح، آنکھیں خنزیر کی آنکھوں کی مثل، کان ہاتھی کے کانوں جیسے سینک، بارہ ٹکٹے کے سینکوں کی مثل، سینہ شیر کے سینے کی طرح، رنگ چیتے کے رنگ کی طرح، پہلو ہلکی کے پہلوؤں کی طرح، دم مینڈھ کی دم کی مثل اور اس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں جیسی ہوں گی۔ اس کے ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ذراع کا فاصلہ ہوگا۔ اس کے ساتھ موئی علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگٹھی ہوگی۔ پس کوئی مومن باقی نہیں رہے گا مگر یہ چو پایہ اس کے بعد کرنے کے عضو یعنی پیشانی پر حضرت موئی علیہ السلام کے عصا سے ایک سفید اور روشن نقطہ لگادے گا جس کے سبب اس کا سارا چہرہ روشن ہو جائے گا۔ اور کوئی کافر باقی نہیں رہے گا مگر یہ اس کے چہرے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگٹھی سے سیاہ نقطہ لگادے گا جس کے سبب اس کا چہرہ مکمل طور پر سیاہ ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کرتے وقت کہیں گے اے مومن! یہ چیز کتنی ہے؟ اے کافر! یہ شے کتنی ہے؟ پھر وہ چو پایہ انہیں کہے گا اے فلاں تو اہل جنت میں ہے اے فلاں تو اہل نار میں ہے۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ہے: **وَإِذَا وَقَعَتِ الْفُتُوحُ عَلَيْنَهُمْ أَخَذْنَاهَا لِيَهُمْ دَأَائُهَا** قنۃ القریض (2)۔ یہ مین الاذنی، آخر جنتا کے متعلق ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا وہ چو پایہ صفا پہاڑی کے ایک شگاف سے گھوڑے کی چال کی مثل دوڑتے ہوئے تین دنوں میں ظاہر ہوگا لیکن وہ تین بار نہیں نکلے گا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حالت احرام میں اپنے عصا کے ساتھ صفا پہاڑی کو کھنکھایا اور کہا کہ چو پایہ میرے عصا کی کھنکھاہٹ کو سن رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ چو پایہ ایک گھائی سے نکلے گا اس کا سر بادلوں کو چھو رہا ہو گا اور اس کے پاؤں زمین میں ہوں گے، وہ بھی اس سے نہیں نکلے ہوں گے اس کا گزر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوگا جو نماز پڑھ رہا ہو گا وہ اسے کہے گا نماز کی مجھے کیا حاجت ہے؟ پھر اس کی ناک پر ضرب لگا کر نشان بنادے گا۔ (3)

علامہ بغویؒ نے حضرت ابوہریرہؓ انصاریؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ چو پایہ تین مقامات سے ظاہر ہوگا۔ ایک بار تو وہ مین سے نکلے گا تو اس کا ذکر صحراء میں بحیل جائے گا اور ساتھ ہی اس کا ذکر مکہ مکرمہ میں بھی ہونے لگے گا۔ پھر ایک دن لوگ مسجد حرام میں ہوں گے جو حرم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مساجد سے اعظم ہے اور سب سے زیادہ معزز ہے تو وہ مسجد کی اطراف میں موجود تمام لوگوں کو دیکھے گا۔ پھر وہ اسی طرح آہستہ آہستہ قریب ہوتا چلا آئے گا عمر نے کہا ہے کہ وہ رکن اسود اور باب بنی مخزوم کے درمیان سے ظاہر ہوگا۔ پس لوگ اسے دیکھ کر نکھر جائیں گے اور ایک جماعت اس کے سامنے ثابت رہے گی وہ یہ یقین کر لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی نہیں سکتے۔ وہ ان کے پاس آئے گا اور اپنے سر سے مٹی بھاڑنے لگے گا یہاں تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر جائے گا اور ان کے چہرے اس طرح چمکنے لگیں گے گویا کہ وہ روشن ستارے ہیں۔ وہ زمین میں چلنے لگے گا کوئی تلاش کرنے والا اسے نہیں سکے گا اور کوئی بھاگنے والا اسے بھاگ نہیں سکے گا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہو گا اور وہ اس کے پاس پیچھے کی جانب سے آکر کہے گا اے فلاں! اب تو نماز پڑھ رہا ہے پھر وہ سامنے سے اس کی طرف آئے گا اور اس کے منہ پر نشان لگادے گا۔ لوگ اپنے گھر وں میں داخل ہو جائیں گے، سفر میں ایک دوسرے کی مصاحبت اختیار کریں گے، مالوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے اور مومنین میں سے کافروں کی پہچان کی جاسکے گی۔ لہذا مومن کو پکارا جائے گا اے مومن! اور کافر کو

اس آیت کے بارے پوچھا کہ یہ تَحْلَمُهُمْ ہے یا تَكْلَمُهُمْ ہے؟ تو آپ نے فرمایا وہ یہ سب کچھ کرے گا۔ وہ مومن سے کلام کرے گا اور کافر کو ذمہ لگائے گا۔ (1)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ دُابَّہ کے نکلنے کا وقت وہ ہے جب نیکی کا حکم نہیں دیا جائے گا اور برائی سے روکا نہیں جائے گا (2)۔ شیخ جلال الدین بخاریؒ نے کہا کہ دُابَّہ کے نکلنے کے ساتھ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر منقطع ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد کوئی کافر ایمان نہیں لائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اِنَّكَ لَنْ تَقُوْا مِنْ مِّنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَن قَدْ اٰمَنَ (کہ آپ کی قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے ان کے جو ایمان لائے)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مفہوم احادیث و آثار سے مستنبط ہے۔

فصل :- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے اپنے اعمال تیزی سے کر لو (1) الدخان (دھواں کا ظاہر ہونا) (2) دجال کا ظاہر ہونا (3) دابة الارض (زمین سے چو پائے کا لکڑا) (4) طلوع الشمس من مغربها (مغرب سے سورج کا طلوع ہونا)۔ (5) امر العامہ (6) عوینۃ احدکم۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ان علامات میں سے جو پہلے ظاہر ہوگی وہ مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ہے اور چاشت کے وقت لوگوں پر دابہ کا خروج ہے۔ ان میں سے جو بھی پہلے ظاہر ہوگی تو دوسری قریب ہی اس کے پیچھے آئے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت حذیفہ بن اسد غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے درآسمان کے ہم مذاکرہ کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کس کے بارے گفتگو کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم قیامت کے بارے گفتگو کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک وہ قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے دس علامات دیکھ لو گے پھر آپ ﷺ نے ان کا ذکر فرمایا (1) دھواں (2) دجال کا آنا (3) چو پائے کا خروج (4) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (5) حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول (6) یاجوج ماجوج کا آنا اور تین خسوف یعنی تین مقامات سے زمین کا دھنسا یا جانا (7) ایک مشرق میں (8) ایک مغرب میں (9) اور ایک جزیرہ عرب میں۔ (10) اور سب سے آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو حشر کی جانب بھگا لے جائے گی (5)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آگ قعر عدن سے نکلے گی جو لوگوں کو حشر کی جانب بانک کر لے جائے گی (6)۔ اور ایک روایت میں دسویں علامت کی جگہ یہ مذکور ہے کہ ایک تیز ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (7)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دابہ زمین سے نکلے گا اس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی ہوگا پس وہ مومن کے چہرے کو عصا کے ساتھ روشن کر دے گا اور کافر کی ناک پر اس انگوٹھی کے ساتھ مہر لگا دے گا یہاں تک کہ اگر لوگ دسترخوان پر جمع ہوں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا اے مومن اور دوسرا سے کہے گا اے کافر! (8)۔ اسے احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا چو پائے نکلے گا اور وہ لوگوں کی ناکوں پر نشان لگا دے گا پھر وہ لوگ تمہارے درمیان ہی آبارہیں گے یہاں تک کہ ایک آدمی جانور خرید کر لائے گا تو اس سے کہا جائے گا تم نے یہ کس سے خریدا ہے؟ تو وہ کہے گا اس آدمی سے جس کی ناک پر مہر لگائی گئی ہے۔ اسے احمد نے روایت کیا

ہے (۱)۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ آیتہ جمعہ کی رات (دسویں ذی الحجہ کی رات) ظاہر ہوگا اور آنحلیکہ لوگ منیٰ کی طرف جا رہے ہوں گے۔ (۲)

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ انہیں آیتہ دکھائے۔ تو وہ تین دن اور تین راتیں نکلا وہ آسمان کی طرف جاتا اور اس کی دونوں طرفوں (کناروں) میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دیتی۔ چنانچہ آپ نے انتہائی ڈرونا اور خوفناک منظر دیکھا۔ تو اپنے رب کی بارگاہ میں اسے واپس لوٹانے کی التجا کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے واپس کر لیا (۳)۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ آیتہ ان مؤمنین جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور ان منافقین کے درمیان امتیاز کرے گا جنہوں نے ایمان ظاہر کیا اور اپنے باطن میں کفر چھپائے رکھا۔ اور کفر سے مراد یا تو اس مجاہدی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے جو حضور نبی کریم ﷺ کے آئے (یعنی زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے)۔ یا پھر اس حقیقی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل تصدیق کرنے میں اس کی زبانوں کے اقرار کی منافقت کرتے ہیں لیکن ان کے نفوس نہ تو ایمان لائے اور نہ مطمئن ہوئے۔ پس اگر کافر سے مراد یہ معنی ہے تو آیتہ کے اس قول ”اے فلاں تو تو اہل جہنم میں سے ہے“ سے مراد یہ ہے کہ اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور کفر سے اعلانیہ کفر کرنے والا کہہ کر لیتا جائز نہیں کیونکہ فتح مکہ کے بعد اعلانیہ کفر کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا اور اب بھی آیتہ کے شروع سے پہلے اعلانیہ کفر کرنے والے مسلمانوں سے صلحہ ہی ہیں۔ لہذا آیتہ کو انہیں مسلمانوں سے ممتاز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿٣٥﴾

”اور جس روز ہم اکٹھا کریں گے ہر امت سے ایک گروہ۔ جو جھٹلایا کرتا تھا ہماری آیتوں کو تو ان کو (اپنی اپنی جگہ پر)

روک لیا جائے گا۔“

یعنی قیامت کے دن ہم اکٹھا کریں گے ہر قرن سے ایک گروہ۔ (امت سے مراد قرن ہے یعنی ہر پیغمبر کی امت جو اس کے زمانہ نبوت کی ہے) اس میں کلمہ من بعضیت کے لیے ہے۔ اور فَوْجًا مِمَّنْ کُلِّ أُمَّةٍ اس سے حال ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرمائے گا اپنی ذریت میں سے جہنم کے لیے حصہ بھیجے یہ حدیث سورہ حج کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

وَمِمَّنْ يُكَلِّبُ بِآيَاتِنَا فَوْجًا مِّنْ بَنِي آدَمَ يَكْفُرُونَ ﴿٣٦﴾ اور یہاں مِّنْ بَنِي آدَمَ یعنی فَوْجًا مِمَّنْ کُلِّ أُمَّةٍ (ہماری آیات کو جھٹلانے والا گروہ)۔ پس ان میں سے پہلے آنے والوں کو آخر میں آنے والوں کے لیے روک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ سب جمع ہو جائیں گے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس سے مراد ان کی تعداد کی کثرت اور ان کی اطراف کا بہت دور دور تک ہوتا ہے۔

حَقْلِي إِذَا جَاءَ وَقَالَ أَكْذَبْتُمْ بآيَاتِي وَلَمْ تُحِطُوا بِهَا عُلَمَاءُ مَا ذَا لَكُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٧﴾

”حق! جب وہ آجائے گا اسے اللہ فرمائے گا کیا تم نے جھٹلایا میری آیتوں کو۔ حالانکہ تم نے اچھی طرح انہیں جانتا بھی نہ

تھا۔ ۲۔ یا اس کے علاوہ اور کیا تھا جو تم کیا کرتے تھے۔“

۱۔ یہ ابتدائے کلام میں جملہ شرطیہ پر داخل ہے۔ جب وہ آجائیں گے میدانِ حشر میں تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا۔ یہ استفہام انہیں زبردستی وقوع کے لیے ہے۔ (کیاتم نے میری آنکھوں کو جھٹکنا ہے)

۳۔ وَلَمْ يَشْعُرْ بِهَا لَوْلَا اَنْهٗ اَعْلَمَ مَا فِي رَاۤىِٕهَا مِنْ مَّحْمُودٍ وَاَوْحَاۤىِٕ اِلَيْهَا مِنْ مَّوَدِّعٍ۔ یعنی کیا تم نے صرف عام رائے سے میری آیتوں کو جھٹلادیا حالانکہ تم نے ان میں اس طرح غور و فکر نہیں کیا تھا کہ تمہارا علم ان کی حقیقت و ماہیت کا احاطہ کر لیتا۔ اور تم حقیقت جان لیتے کہ آیا وہ تصدیق کے قابل ہیں یا تکذیب کے۔ یا پھر وادعا غلط ہے یعنی کیا تم نے آیات کی تکذیب اور ان کی حقیقت میں غور و فکر نہ کرنے کو جمع کر دیا ہے (یعنی غور و فکر کیے بغیر تکذیب کر دی)۔

۳۔ اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَمْ لَمْ نَكْذِبْهُوَ الْفَلَانُ لَمْ نَكْذِبْهُوَ اِلَهْمَا ذَا نَحْنُكُمْ تَعْمَلُوْنَ یا تم نے نہیں جھٹلایا اسے اگر تم نے کھذیب نہیں کی تو پھر کیا تھا جو تم کرتے تھے۔ یعنی کھذیب کے علاوہ کوئی عمل ہے جو تم کرتے تھے۔ یہ کلام بھی زبر و نوح کے لیے ہے چونکہ جہالت کے سبب کھذیب کے لغت نامیوں نے کچھ نہیں کیا اس لیے وہ یہ کہنے کی قدرت نہیں رکھیں گے نہیں، بلکہ اقرار کریں گے کہ ہم نے تو یہ کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ لَا يَظْهَرُونَ ﴿٨٥﴾

”اور پوری ہوگئی (اللہ کی) بات ان پر بوجہ ان کے ظلم کے تو وہ (اس وقت) بولیں گے نہیں۔“

۱۔ اس کا عطف قاتل پر ہے جو شرط کی جزاء کے محل میں ہے۔ یعنی ان پر وہ عذاب ثابت ہو گیا جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔ ان کے اللہ تعالیٰ کی آیات کو چھلانے کے سبب۔ تو وہ اس وقت عذر پیش کرنے کے لیے بولیں گے نہیں کیونکہ ان کا کافی الحقیقت کوئی عذر ہے ہی نہیں۔ یا پھر اس لیے نہیں بولیں گے کہ انہیں عذر پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس لیے نہیں بولیں گے کہ ان کے منہ پر پرمہر لگی ہوگی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عذاب میں مشغول ہونے کے سبب وہ بول نہیں سکیں گے۔ مذکورہ تمام اقوال میں پہلا قول ہی زیادہ واضح ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لَيْسَكُنْوَ فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِن فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُمْنُونَ ﴿٨١﴾

”کیا انہوں نے غور نہ کیا کہ ہم نے بنایا رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور بتایا ہے دن کو جینا بے شک

اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“

یعنی ایمان کو ثابت کرنے والے دلائل اور علامات دیکھنے کے بعد وہ کفر پر کیسے عذر پیش کر سکیں گے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار ثابت ہوتا ہے، یعنی تحقیق انہوں نے دیکھا۔ بے شک ہم نے یہاں کیا ہے رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں خیر اور قرار کے سبب آرام کریں اور دن کو بنایا جینا اصل میں **لِيَبْصُرُوا فِيهِ تَحَا** تاکہ وہ اس میں دیکھیں (کیونکہ دن نہیں دیکھتا بلکہ اس میں لوگ دیکھتے ہیں)۔ پھر اس میں اظہار منافیہ کرتے ہوئے ابصار کو ہی دن کے احوال میں سے بطور حال ذکر کیا کیونکہ یہ اس سے (یعنی ابصار بہار سے) جدا نہیں ہو سکتا۔ اور انا **جَعَلْنَا كَاجَلَمِ اَلَمْ تَرَوْا** کے دو معنوں کو قائم مقام ہے۔ کیونکہ یہاں رویت بمعنی علم ہے۔ یعنی کیا وہ

نہیں جانتے کہ ایک مخصوص طریقہ پر نور و ظلم (دن اور رات) کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا نفع بخش ہے اور معاش و معاد (دینا و آخرت) کی مصالح کی علت و سبب ہے۔ تو یقیناً اس کا خالق حکیم، قادر اور غالب آنے والا ہے۔ اور وہ جو اس پر قدرت رکھتا ہے وہ یقیناً رسولوں کو بھیجے پر بھی قادر ہے تاکہ وہ اس کی مخلوق کو اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں، وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنی اطاعت کرنے والوں کو انعام سے نوازے اور نافرمان کو سزا کا مستحق ٹھہرائے۔ اور وہ موت کو حیات کے ساتھ بدلنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جیسے وہ خلقت کو نور سے اور بیداری کو نیند سے بدلنے پر قادر ہے۔ اور معجزات رسولوں اور ان کے لائے ہوئے دین کے سچا ہونے پر واضح دلیل ہیں۔

اے بے شک ان امور میں "لائیبت" واضح نشانیاں ہیں جو توحید اور رسول کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا اس کے بعد کھدیب کرنے والے کے پاس کون سا سنا کرے کہ وہ پیش کرے۔ اور آیات کے ثبوت کو اپنے اس قول کے ساتھ مقید کیا ہے۔
 س (ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں) کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اَلَمْ یَؤْذِکَ اَجَلًا اَخْرَجَ حَشْرَکِ
 دلیل ہے۔ کیونکہ نیند کے پیچھے بیداری کا آنا موت کے بعد حیات آنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

و یَوْمَ یُنْفَعُکُمُ الْوُجُوہُ فَفَرِّغْ مَنْ فِی السُّبُوتِ وَمَنْ فِی الْاَمْرِضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ
 اللہ ۱؎ وَلَکِنْ اَتُوْهُ ذَخِیْرًا ۝۱۱

"اور جس دن پھونکا جائے گا سورہ تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے مگر جنہیں خدا نے چاہا
 (وہ نہیں گھبرا ئیں گے) س اور سب حاضر ہوں گے اس کی بارگاہ میں عاجزی کرتے ہوئے س"

اے اس کا عطف و نونم نَحْشُوْکَ قول پر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے صور کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ سینک ہے جس میں پھونکا جائے گا (1)۔ اسے ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے اسے مسند نے مسند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کیسے راحت و سکون میں ہو سکتا ہوں جبکہ صور والا اسے منہ میں لیے ہوئے ہے، اپنی پیشانی جھکائے ہوئے ہے اور ہمتن گوش ہے کہ کب اسے اس میں پھونکے گا حکم دیا جاتا ہے۔ پس جو نبی آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے یہ سنا۔ تو یہ ان پر شاق گزرا (اور انہیں پریشانی لاحق ہو گئی) تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو "حَسْبُنَا اللہ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ" (اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) (2)۔ امام احمد، حاکم، بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابوسعیدؓ سے اور ابونعیمؓ نے حضرت جابرؓ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل علیہ السلام اس کی دائیں طرف، میکائیل علیہ السلام اس کی بائیں طرف ہیں اور وہی صاحب صور ہے (3)۔ یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام۔ علامہ قرطبیؒ نے کہا ہے کہ تمام امتوں کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہی صور میں پھونکیں گے۔

۱۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 65 (وزارت تعلیم)
 2۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 309 (احمدیہ)

3۔ ابن سعید بن منصور، جلد 3 صفحہ 1121 (دارالمصنعی)

اختلاف ہے کہ آیا یہ تفسیر اصعق (ہلاک کرنے والا تھج) ہے یا کوئی اور؟ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ کجیات تین ہیں (یعنی تین بار صورت چھوٹکا جائے گا) ان میں پہلا تھج الفزع ہے یعنی اس سے مخلوق میں گھبراہٹ اور افراتفری پھیل جائے گی۔ دوسرا تھج اصعق ہے یعنی اس سے ساری مخلوق کی موت واقع ہو جائے گی اور تیسرا تھج البعث ہے (یعنی دوبارہ مخلوق زندہ کھڑی ہوگی) لہذا یہ آیت تھج الفزع پر دلالت کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصُوتُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِثَ فِيهِمْ اٰخٰرٰی فَاٰذَانَهُمْ يَسْمَعُوْنَ تھج اصعق اور تھج البعث دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ یہ موقف علامہ ابن عربی کا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں تین تھجوں کی تصریح کی گئی ہے۔ ہم مقرر یہ اس کا ذکر کریں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تھجے صرف دو ہیں۔ ایک تھج الفزع اور یہی تھج اصعق ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں امر لازم و ملزوم ہیں یعنی لوگ گھبرائیں گے اور پھر اسی گھبراہٹ کے سبب مر جائیں گے۔ اسے علامہ قرطبی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ تھج الفزع سے استثنیٰ اسی طرح کی گئی ہے جیسے تھج اصعق سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں مقامات پر ارشاد فرمایا "اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ"۔ تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں سے اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ کے ساتھ استثناء دونوں تھجوں کے ایک ہونے پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی دونوں میں استثنیٰ کے اتحاد پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ دونوں کاموں میں استثنیٰ مذہب ایک ہو۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اس استثناء میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس ارشاد گرامی "اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ" کے بارے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ شہداء کے بارے ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں کوئی گھبراہٹ ان تک نہیں پہنچے گی (1)۔ پھر علامہ بغوی نے کبھی اور مقابل کا قول ذکر کیا ہے اور وہ حدیث ذکر کی ہے جو ہم مقرر یہ ذکر کریں گے۔ لیکن علامہ بغوی کا اس آیت کے بارے اختلاف کا قول تھج الفزع اور تھج اصعق کے اتحاد پر مبنی ہے (یعنی ان دونوں سے مراد ایک تھج ہے) حالانکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب ہم استثناء کے بارے وارو ہونے والی احادیث اور آثار ذکر کریں گے۔ ابو یعلیٰ، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے جبرائیل امین علیہ السلام سے اس آیت کے بارے پوچھا وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصُوتُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ مِنْ الَّذِيْنَ لَمْ يَشَأْ اللّٰهُ اَنْ يُّصَفِّحَهُمْ یعنی کون وہ لوگ ہیں جن پر صفحہ مسلط کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا؟ تو انہوں نے کہا ان سے مراد شہداء ہیں جو ابھی تکوین میں اپنے عرش الہی کے ارد گرد کھڑے ہیں (2)۔ محدثین نے فرمایا ہے کہ شہداء کی استثناء صحیح ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بعض آثار میں اس طرح ہے کہ شہداء وہ ہیں جن کی استثناء خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔ اس طرح ہناد بن السری سے مروی ہے اور بیہقی اور نحاس نے معانی القرآن میں حضرت سعید بن جبیر سے اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ کے تحت نقل کیا ہے کہ یہ وہ شہداء ہیں جو عرش کے ارد گرد تلواریں پہنے کھڑے ہیں (3)۔ اور کبھی اور مقابل نے کہا ہے یعنی حضرت جبرائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام (4)۔ اس لیے کہ فریابی نے اپنی تفسیر میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصُوتُ مَنْ فِي

السُّلُوبُ وَفِي الْأَرْضِ شَعَاءُ اللَّهِ تَوْصِيَاهُ بَعَثَ فِي يَاسُورِ اللَّهِ ﷺ كُونُ هُنَّ وَهَ لُوكُ جَنِّ كِي اسْتِثَاءُ اللَّهِ تَعَالَى نَ فَرَمَانِي
ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل، میکائیل، ملک الموت، اسرافیل اور حنظلہ العرش۔ پس جب اللہ تعالیٰ مخلوق کی ارواح قبض
فرمائے گا تو ملک الموت سے فرمائے گا کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا شُبْحَانَكَ رَبِّي تَبَارَكَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى
ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا اسرافیل کی جان لے
لے۔ لہذا وہ اسرافیل کی جان قبض کر لے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کناں ہوگا
شُبْحَانَكَ رَبِّي تَبَارَكَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو
رب کریم اسے ارشاد فرمائے گا میکائیل کی جان لے لے۔ لہذا وہ میکائیل کی روح قبض کر لے گا۔ پس وہ بہت بڑے نیلے کی طرح گر
جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا جبرئیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ پھر رب کریم
فرمائے گا اے ملک الموت! تو بھی مر جا۔ چنانچہ وہ بھی مر جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے جبرئیل! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض
کرے گا تیری ذات کریم، باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور جبرئیل فانی اور مرنے والا ہے۔ تو رب کریم فرمائے گا تیرے لیے بھی تو
موت ضروری ہے۔ پس وہ سجدے میں گر جائے گا اور اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے شک جبرائیل کی
خلقت کو میکائیل کی خلقت پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے بہت بڑے نیلے کو ایک چھوٹے نیلے پر ہوتی ہے (1)۔ بیہی نے حضرت انس
سے فَتَحَ فِي الصُّورِ الْأَيَّہِ کے بارے میں مرفوع روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمائی ہے وہ تین
ہیں۔ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو
وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی اور کریم ہے تیرا بندہ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو
میکائیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی
اور کریم ہے اور تیرا بندہ جبرائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو جبرئیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم سب کچھ
جانتے کے باوجود فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے تو وہ عرض کرے گا ایک تیری ہمیشہ رہنے والی کریم ذات باقی ہے اور
ایک تیرا بندہ ملک الموت اور وہ مرنے والا ہے۔ تو رب کریم اسے فرمائے گا تو مر جا۔ پھر رب کریم فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کی ابتداء
کی ہے پھر میں ہی اسے دوبارہ اٹھاؤں گا۔ کہاں ہیں وہ جبر کرنے والے اور تکبر کرنے والے؟ تو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو جواب نہیں دے
گا۔ پھر وہ ندا دے گا آج کے دن کسی کی بادشاہی ہے؟ تو کوئی بھی اسے جواب نہیں دے گا۔ تو پھر رب کریم فرمائے گا یقیناً اللہ ہی واحد
اور قہار ہے۔ پھر دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو وہ اٹھ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔ (2)

بیہی نے زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں بارہ افراد کی استثناء ہے یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک
الموت اور آٹھ حاملین عرش علیہم السلام (3)۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے یہ روایت بھی کی جاتی ہے کہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کی روح
قبض کی جائے گی پھر حاملین عرش کی۔ پھر حضرت اسرافیل علیہ السلام اور پھر آخر میں ملک الموت کی روح قبض کی جائے گی۔ بیہی نے
مقاتل بن سلیمان سے نقل کیا ہے کہ پہلے میکائیل علیہ السلام کی روح قبض کی جائے گی پھر جبرائیل علیہ السلام کی روح پھر اسرافیل علیہ

سے آئیں گے وہ ان کے منہوں پر ماریں گے تو وہ واپس مڑ جائیں گے۔ اور لوگ ایک دوسرے کو بلاتے ہوئے پیٹھ پھیر کر رہائیں گے۔ اور یہی وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التماذر فرمایا ہے۔ یہاں تک راوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس دن مرنے والوں کو کسی چیز کا علم نہیں ہوگا۔ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کون ہیں وہ لوگ جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ”إِنَّهُ خِزْنُ شَاءَ اللَّهِ“ میں فرمائی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ شہداء ہیں۔ بے شک گھبراہٹ زندوں کو لاحق ہوگی اور وہ تو اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں اور رزق دینے جاتے ہیں۔ ”وَهُمْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُؤْذِفُونَ“ اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ دے گا۔ کیونکہ وہ تو عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے شریر افراد پر مسلط کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ إِنَّ ذُلُّ لَوْلَاكَ الشَّقَاءُ لَكُنْ عَظِيمٌ الایہ۔ لہذا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا لوگ اسی حال پر رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو بھیجے الصعق کے بارے حکم فرمائے گا تو اس کے سبب تمام اہل زمین و آسمان گر جائیں گے مگر وہ محفوظ رہیں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ ملک الموت عرض کرے گا جن کے بارے تو نے چاہا ان کے سوا تمام زمین و آسمان کے باقی مر گئے ہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ پھر اس میں بھی جبرئیل امین، میکائیل، حاملین عرش اور ملک الموت علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ پھر آگے طویل حدیث مذکور ہے جس میں اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے ہمیشہ دوزخ میں باقی رہنے تک کا ذکر ہے (۱)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فزع (گھبراہٹ) صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے شریروں پر یعنی جنوں اور انسانوں میں سے شیاطین پر طاری ہوگی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی آسمان میں تو نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس قول ”فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ“ کا معنی کیا ہے؟ تو اس بارے میں کہتا ہوں کہ اس کا دارودار فرض گمان کرنے پر ہے یعنی (اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ ان کا کوئی فرد آسمان میں ہوگا تو وہ اس سے محفوظ نہیں رہے گا) یا پھر یہ معنی ہوگا کہ چونکہ شیاطین بھی کبھی چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں اس لیے یہ فرمایا۔ یا پھر السماء سے مراد بادل ہے۔ کیونکہ السماء کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جو تیرے اوپر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلْيَسُدُّ سَيْمِیْ اِنِّی السَّمَاءُ اِیَّیْہِ کُوْہِ حِجَّتْ تَنْکَرِیْ تَا نَلِے۔ تو اس میں السماء سے مراد تیرے گھر کی چھت ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اہل آسمان کے گھبرانے والوں میں سے مراد بعض مؤمنین کی ارواح ہیں۔ اور سَبَقَتْ لَہُمْ مَوْتًا اَلْخُسْفٰی سے مراد انبیاء اور مقررین بارگاہ الہی ہیں۔ اور جن کی بھیجے الصعق سے استثناء کی گئی ہے ان کے بارے صحیح قول وہی ہے جو صاحب العلم الکبیر نے کہا ہے کہ صعق سے مراد وہ کیفیت ہے جو موت کی نسبت عام ہے۔ یعنی جو ابھی تک نہیں مرے ان کے لیے موت ہے اور جو مر چکے ہیں ان کے لیے غشی ہے۔ یہ عموم مجاز کے قبیلے سے ہے۔ اور یہ غشی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا دیگر انبیاء علیہم السلام پر بھی چھا جائے گی۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو غشی لاحق ہونے کے بارے تردید ہے۔

شعین نے صحیحین میں، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی نے مدینہ طیبہ کے بازار میں کہا تم سے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ تو اسنے میں انصار میں سے ایک آدمی نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اسے طمانچہ دے مارا اور اسے کہا۔ کیا تو یہ قول کہتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے

اور میان موجود ہیں۔ پھر اس نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَتُفِخُ فِي السُّمُورِ فَصَبَّوْهُنَّ فِي السَّلْمِ وَفِي الْأَنْهَارِ وَالْأَعْرَابِ فَتَأْكُلْنَ مِنْ ثَمَرِهِمْ وَقَدْ أَهْلَمْنَ فِيهَا مِنْ مَنَظَرٍ ذُوْنَ۔ پس میں سب سے پہلے اپنا سر اٹھاؤں گا لیکن میں دیکھوں گا کہ اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو پکڑ کر کھڑے ہوں گے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ اپنا سر مجھ سے پہلے اٹھائیں گے یا وہ ان میں سے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمادی ہے۔ تو جب صبح موت اور غشی دونوں معنوں کو شامل ہے اور انبیاء پر غشی طاری ہوگی تو پھر شہداء اور ملائکہ پر بطریق اولیٰ غشی طاری ہوگی۔ ملائکہ میں سے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حاملین عرش مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان پر موت تجھ کے سبب طاری نہیں ہوگی بلکہ وہ اس کے بعد فوت ہوں گے جیسا کہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

یعنی زمین اور آسمان کے مابینوں میں سے ہر ایک تختہ البعث (دو بارہ اٹھانے جانے کے لیے تختہ) کے بعد موقف (میدان حشر) میں ظاہر ہوگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کرے گا۔ جمہور نے اتقوا کی قرأت صیغہ اسم فاعل ہونے کی بناء پر مد اور تاء کے ضم کے ساتھ کی ہے۔ یعنی اتقوا۔ حفص اور حمزہ نے صیغہ ماضی ہونے کی بناء پر الف کو مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مستقبل کے معنی میں ہے۔ لیکن اس کے بالحقین واقع ہوئے کی وجہ سے اسے صیغہ ماضی کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا عطف فزع پر ہے۔

وَيَسْرِي الْجِبَالُ تَحْسِبُهَا جَمَادٍ لَا يُخْرِجُ سَازِمَ السَّحَابِ ط صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتَقَنَ
كُلُّ شَيْءٍ ط إِنَّهُ حَمِيدٌ مَبْدُوعُونَ ﴿٥٠﴾

”اور تو جب (اس روز) پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال میں۔ یہ کاری گری ہے اللہ کی جس نے (اپنی حکمت سے) مضبوط بنایا ہر چیز کو بے شک وہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔“

اے دیکھنے والے! تو جب تجھ فزع کے وقت پہاڑوں کی طرف دیکھے گا۔ اس کا عطف یوم ینفخ پر ہے یا یوم نفخش پر کہ وہاں تری ماتری مقدر ہو۔ تو تو انہیں ایک جگہ ٹھہرا ہوا گمان کرے گا۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں تری کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے مفعول سے۔ یعنی تو انہیں گمان کرے گا کہ وہ ایک جگہ کھڑے ہیں غیر متحرک ہیں۔

یہ جملہ تفسیر کا ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی درآئیں ایک پہاڑ بادلوں کی رفتار میں چل رہے ہوں گے یہاں تک کہ وہ زمین پر گر جائیں گے۔ اور ہموار ہو جائیں گے۔ اور یہ اس لیے ہوگا کیونکہ بڑے بڑے اجسام جب ایک ہی سمت میں حرکت کرتے ہیں تو ان کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔

اسے یہ مصدر ہے اور سابقہ جملے کے مضمون کی تاکید کے لیے ہے۔ اس میں اس کے علاوہ کوئی احتمال نہیں۔ اس کا نام تاکید لنفسہ ہے اور یہ صانع اللہ صانع کے معنی میں ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پختہ اور مضبوط بنایا۔ اور اسے اس طرز پر بنایا جیسے اسے ہونا چاہیے، ابن کثیر اور ابو عمرو نے صیغہ غائب کی بناء پر تفعلوٰں کو کیا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے۔ یعنی وہ ہر گنہگار اور فرامیاد کو اس کے فعل و عمل کے مطابق جزا دے گا۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا ۖ وَهُمْ مِّنْ قَرَابَةِ يَوْمٍ ابْنُونَ ۝

”جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا۔ تو اسے کہیں بہتر اجر ملے گا اس نیک عمل سے ملے اور یہ نیک بندے اس دن گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔“

ابن ابوشمر نے کہا ہے کہ ابراہیم بغیر استثناء کے قسم اٹھایا کرتے تھے کہ حسنہ سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اخلاص ہے (۱) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد ہر نیکی ہے۔

ع۔ کہا گیا ہے کہ منہا میں من سببہ ہے۔ تفصیل کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی شے نہیں جو لا الہ الا اللہ سے بہتر ہو۔ پس معنی یہ ہوگا۔ جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا تو اس کو ثواب حاصل ہوگا۔ اور پھر نیک عمل کے سبب عذاب سے محفوظ و مامون رہے گا۔ محمد بن کعب اور عبد الرحمن بن زید نے کہا ہے کہ من تفضیلہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا نیک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسے ثواب ملے گا۔ گویا اس ارشاد کی مثل سے من جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرًا مِّثْلِهَا۔

ع۔ جس دن صورت میں پھونکا جائے گا۔ یہ نیک بندے گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ کوئیوں نے فزع کو توہین کے ساتھ کرہ پڑھا ہے۔ اور یونینید کو ظریف ہونے کی بناء پر منسوب۔ اور توہین تکبر استغراق کا فائدہ دیتی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ نفی کی قوت میں ہے اس لیے کہ ابْنُونَ کا معنی یہ ہے کہ وہ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ گھبراہٹ میں ہوں گے۔ اور کرہ جب نفی کے محل میں ہو تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ دوسروں نے فزع کو بغیر توہین کے یومند کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے اور اضافت استغراق پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ یا پھر یہ اضافت عہد کے لیے ہے کیونکہ اس فقرہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پس اکثر نے یومند کو اضافت کے سبب جو کے ساتھ پڑھا ہے لیکن نافع نے نیم کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبنی ہے۔ اور اسے یہ بناء اپنے مضاف الیہ کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وَجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ۖ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

”اور جو برائی لے کر آئے گا اس کو منہ سے مل اور نہ چھینک دیا جائے گا آگ میں لے۔ (اے بدکارو!) کیا تمہیں بدلہ ملے گا بجز اس کے جو تم عمل کرتے تھے۔“

ع۔ اور جو برائی یعنی شرک لے کر آئے گا کُبَّتْ وَجُوهُهُمْ میں فاعل مخذوف عبارت پر عطف لے لیے ہے۔ یہ فاعل جزا یہ نہیں کیونکہ وہ بغیر قد کے فعل ماضی پر داخل نہیں ہوتی۔ تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَهُ جِزَاءُ السَّيِّئَةِ أَوْ اسْتَحَقَّ الْعَذَابَ فَكُبَّتْ وَجُوهُهُمْ (جو برائی لے کر آئے گا تو اس کے لیے برائی کی جزاء ہوگی یا وہ عذاب کا مستحق ہوگا پس انہیں منہ سے مل اور نہ آگ میں پھینک دیا جائے گا)۔ یا پھر منہ سے مراد ان کے نفس اور جان ہے۔ (یعنی انہیں آگ میں پھینک دیا جائے گا)

ع۔ یعنی اسے بدکارو! تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ مگر ان اعمال کا پورا پورا بدلہ جو تم نے کیے۔ کیونکہ شرک سب سے بڑا جرم ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی برائی نہیں اور جہنم سب سے شدید اور سخت بدلہ ہے۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ لہذا تقدیر کلام یہ ہوگی کہ انہیں جہنم کا دار و نہ کہے گا تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر ان ہی اعمال کا جو تم کرتے تھے۔

إِنَّمَا أُوتِىَ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَذِهِ الْبَلَدِ ۖ أَلَمْ يَكُنْ لَّيَاسِيًا وَمَلْأَتْ كُلَّ شَيْءٍ وَ

أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝

”مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اس (مقدس) شہر کے رب کی۔ جس نے عزت و حرمت والا بنایا ہے اس کو۔ اور اسی کی ہے ہر شے اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں شامل ہو جاؤں فرما خیر داروں کے زمرہ میں سے۔“

۱۔ اس میں بلدۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس میں رب کی اضافت البلدۃ کی طرف کی گئی ہے ایک تو اس شہر کی عظمت و شرف کو ظاہر کرنے کے لیے اور دوسرا اس کا احساس دلانے کے لیے کہ اس میں وہ کعبہ معظمہ ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مرکز ہے۔

۲۔ ”الَّذِي خَوَّفَهَا“ ترکیب کلام میں رب کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے حرم اور امن والا بنادیا اس میں نہ تو کسی کا خون بہایا جاسکتا ہے، نہ کسی پر ظلم کیا جاسکتا ہے، نہ اس کے شکار کو بھگا یا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے درختوں اور گھاس وغیرہ کو کاٹا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ وصف ذکر کر کے قریش پر یہ احسان بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مسکن ایسی جگہ کو بنایا ہے جو عرب میں ظاہر ہونے والے فتنوں سے امن دینے والی ہے۔

۳۔ اور اس شہر سمیت ہر شے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ ترکیب کلام میں وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ کا یا تو حرمہا پر عطف ہے یا یہ اس کی ضمیر مرفوع مستتر سے حال ہے۔ اس میں آئی سے پہلے ہاء مقدر ہے۔ یعنی مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جھکے والوں اور عاجزی کرنے والوں میں سے ہو جاؤں یا دین اسلام پر ثابت اور قائم رہنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس کا عطف اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ پر ہے۔

وَأَنْ أَتْلُو الْقُرْآنَ ۚ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ

إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝

”نیز (یہ بھی کہ) میں تلاوت کیا کروں قرآن کی۔ جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے۔“

۱۔ اور یہ کہ میں ایمان کی طرف دعوت دینے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کیا کروں۔ یا پھر یہ الطلوعے شفق ہے اس کا معنی اتباع کرتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں قرآن کی اتباع کروں۔ اَنْ اَتْلُو الْقُرْآنَ کا عطف اَنْ اَكُونَ پر ہے۔ اور اِنَّمَا اُمِرْتُ کا جملہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے اِنْ هَلَى الْقُرْآنَ يَفْقَهُ عَلَىٰ نَبِيٍّ اَسْرَآءُ مِلَّةِ اِلَٰهٍ لَّهْدَىٰ ذُرِّيَّتَهُ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم فرمایا کہ وہ ان کے لیے دنیا و آخرت اور قیامت کے احوال کی وضاحت کرنے کے بعد ان سے یہ کہیں۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو جائے کہ آپ نے دعوت کو مکمل کر لیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو ادا کر دیا ہے جو آپ پر لازم تھیں۔ لہذا اب آپ پر اس کے سوا کچھ باقی نہیں، کہ آپ اپنی شان کے مطابق اپنے رب کی یاد میں مصروف اور اس کی عبادت میں مستغرق رہیں۔ اُمِرْتُ سے پہلے لفظ قل مقدر ہے۔ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو اس کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ پس جس کسی نے آپ کی دعوت کے سبب ہدایت قبول کی اور اپنے وعدہ لا شریک رب کی عبادت کی جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ تو

اس کے مناہج اور فوائد سے ہی حاصل ہوں گے۔ لہذا اس کے لیے قطعاً درست نہیں کہ وہ آپ پر احسان جتلاتا رہے۔

سے اور جو کوئی حق کے راستے سے ہٹک جائے گا اور وہ آپ کی طرف سے دعوت مکمل ہونے کے بعد بھی آپ سے پیچھے ہی رہتا ہے تو اس کو فرما دیجئے۔ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ یعنی میں تم پر وکیل نہیں ہوں (یعنی میں تمہاری کارستانیوں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی تمہاری گمراہی اور خطا کا ذیال۔ مجھ پر ہوگا کیونکہ مجھ پر تو صرف تم تک پیغام حق پہنچانا اور اس کی تبلیغ کرتا ہے۔

وَقُلِ الْمُحْسِنُ لِلَّهِ سِيرُهُمْ إِلَيْهِمْ فَتَعْرِفُونَهَا ۖ وَمَا رَبُّكَ بِعَافٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٣٦﴾

”اور آپ کہئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ وہ ابھی دکھائے گا تمہیں اپنی نشانیاں تو تم (انہیں) پہچان لو گے۔“

سے اور آپ کہئے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں کہ اس نے آپ کو نعمت نبوت عطا فرمائی اور فریضہ دعوت و تبلیغ مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

سے اے گمراہ ہوئے والو! اللہ تعالیٰ ابھی تمہیں دکھائے گا اپنی نشانیاں جو دنیا میں اس کی حقیقت پر واضح دلالت کرتی ہیں جس کی طرف میں نے تمہیں دعوت دی ہے جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا کہ ان کے افراد قتل ہوئے، قیدی بنائے گئے اور فرشتوں نے اتر کر ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگائیں۔ اسی طرح انہوں نے چاند کو ٹکڑے ہوتا دیکھا اور کنکریوں کو تسبیح پڑھتے سنا۔ اور اسی نوع کی کئی دیگر علامات دیکھیں۔ ان ہی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ آیت کا خروج ہوگا اور کئی دیگر نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جمعی ہے سَأُوبِيكُمْ إِلَيْهِ ۖ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ۚ یا پھر معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ عنقریب آخرت میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اور فرمایا کہ عنقریب وہ تمہیں آسمانوں، زمین اور تمہارے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائے گا جیسا کہ یہ ارشاد ہے سَلَوْنَهُمْ إِلَيْتَنِي ۚ وَالْأَفْئَاتِ ۚ وَتِي ۚ أَنْتُمْ ۚ تَمَّ بِحِجَابِ لَوْ كَسَّ كَبَّ شَكَّ يَهُ ۚ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن اس وقت کی پہچان تمہیں کوئی نفع نہیں دے گی۔

سے اے محمد! ﷺ نہیں ہے آپ کا رب بے خبران کا مومن سے جو اے لوگو تم کرتے ہو۔ لہذا وہ وقت مقررہ پر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

حمت بالخیر

بفضلہ تعالیٰ ترجمہ سورہ نمل 4 رب 1420ھ 13 اکتوبر 1999

بروز بدھ رات سوا دس بجے اختتام پزیر ہوا۔

www.muhammadiyah.com

فساد برپا کرنے والوں سے تھا۔“

۱۔ بے شک فرعون متکبر اور سرکش ہو گیا اس نے سرزمین مصر میں اپنی عظمت اور بڑائی کا اظہار شروع کر دیا۔ یہ جملہ مستانہ ہے جو اس بعض واقعہ کا بیان ہے۔ اور اس نے اس زمین کے باسیوں کو گروہ گروہ بنادیا۔ یعنی جب وہ خدمت لینے کا ارادہ کرتا تو وہ گروہ گروہ ہو کر جاتے تھے۔ یا اس نے بعض گروہوں کو بعض کے تابع بنایا ہوا تھا یا اس نے ان کے گروہ بنادے اور ان میں ایک یعنی قبطیوں کو عزت و احترام دے کر معزز بنادیا اور دوسروں یعنی بنی اسرائیل کو توہین و تحقیر کے سبب ادنیٰ اور گھٹیا بنادیا یا خدمت اور کام کے لیے اس نے مختلف گروہ بنادے اور ہر گروہ سے علیحدہ علیحدہ کام لیتا۔ یا معنی پر ہے کہ اس نے انہیں مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کی عداوت اور دشمنی پر براعت کی تاکہ وہ اس کے خلاف متفق نہ ہو سکیں۔ اور قاموس میں ہے شیعة الرجل سے مراد آدمی کے قبیعین اور مددگار ہیں اور علیحدہ فرماتے ہیں۔ (1)

۲۔ وہ ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو کمزور کرتا چاہتا تھا۔ يَسْتَظْفِعُ طائفة کا جملہ جعل فضل کے فاعل سے حال ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستانہ ہے۔ وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا کرتا۔ کیونکہ کسی کا بہن نے اسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیرے ملک اور بادشاہی کو اپنے قبضے میں لے گا (یعنی اس کے سبب تیرا اقتدار اور بادشاہت ختم ہو جائے گی) عبدالرزاق، عبد بن حمید اور ابن منذر نے حضرت قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے (2)۔ اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔ ترکیب کلام میں يَسْتَظْفِعُ سے بدل ہے۔ بچوں کے زندہ چھوڑنے کو استضعاف (کمزور کرنا) کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے نفسوں کو اس کے ظلم و ستم سے بچانے اور اس کا دفاع کرنے سے عاجز اور کمزور تھے۔ بے شک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اسی لیے اس نے ایک فاسد خیال کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے بہت سی مخلوق کو قتل کرنے کی جرات کی۔ جبکہ نو مولود بچوں کا یہ قتل عام اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا تھا، چاہے کا بہن نے قح کہا یا جھوٹ بولا۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَهْلًا
وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ﴿۱۰﴾

”اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنادیا گیا تھا ملک (مصر) میں ۱۔ اور بنادیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج و تخت کا) وارث ۲۔“

۱۔ اور ہم نے چاہا کہ ہم احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں کمزور بنادیا گیا تھا۔ یعنی ہم نے انہیں اس کی قوت اور طاقت سے بچانا چاہا۔ یہ جملہ ماضی کی حالت کو بیان کر رہا ہے اور اس کا عطف اس حیثیت سے اِنْ فِرْعَوْنُ غَلَا پر ہے کہ یہ دونوں بناء کی تفسیر واقع ہو رہے ہیں۔ یکا یہ جملہ يَسْتَظْفِعُ کے فاعل سے حال ہے اور تقدیر عبارت ہے وَنَحْنُ نُرِيدُ۔ یا پھر اس کا عطف يَسْتَظْفِعُ پر ہے۔ اور اس میں موصوف کے ساتھ رابطہ کے لیے اسم ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے جو کہ اَلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا ہے۔ ارادہ کو استضعاف کے ساتھ ملانے سے مراد لہذا ملانا لازماً نہیں آتا کیونکہ اس وقت ارادے کا تعلق زمانہ مستقبل کے اعتبار سے تھا اس کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں نجات دلا کر احسان کرنے کا قریب موجود ہے تو پھر اسی کا مقارن کے قائم مقام ہونا جائز ہے۔

۱۔ ائمہ سے مراد وہ ہیں جن کی دینی امور میں اقتداء اور پیروی کی جاتی ہے اور بھلائی اور عمل خیر کی طرف دعوت دینے والے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ائمہ سے مراد حکمران اور بادشاہ ہیں (۱)۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَجَعَلْنَاكُمْ مُلُوكًا۔ ”اور ہم انہیں وارث بنادیں کیونکہ وہ فرعون کی ملکیت اور اس کی قوم میں سے ہے۔“

وَتُسَبِّحُ لَهُمْ فِي الْأَمْرِ وَتُرِي قِيَمَهُمْ وَهَاطَمَ وَجُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْتَمُونَ ①

”اور تسلط بخشیں انہیں سرزمین (مصر) میں ۱۔ اور ہم دکھائیں فرعون اور ہامان اور ان کی فوجوں کو ۱۔ ان کی جانب سے (وہی خطرہ) جس کا وہ اندیشہ کیا کرتے تھے ۱۔“

۱۔ اور ہم انہیں سرزمین مصر اور شام میں تسلط بخشیں۔ نمکن کا اصلی معنی یہ ہے کسی شے کے لیے ایسی جگہ بنانا جس میں وہ قرار اختیار کر سکے۔ پھر اسے مجازاً مسلط کرنے اور حکم نافذ کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۱۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے نُفْرَی کو یغری پڑھا ہے۔ یعنی یام کو مفتوح اور راء کے فتح کو امالہ کے ساتھ۔ اور تینوں اسماء یعنی فرعون، حامٹن اور جنود کما کوصل ہونے کی بناء پر مفتوح پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے نون مضموم، راء مکسور اور اس کے بعد یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور تینوں اسماء کو مفعول ہونے کی وجہ سے نصب دی ہے۔

۱۔ الخذل کا معنی ہے ضرر اور نقصان سے بچنا۔ چونکہ انہیں یہ خبر دی جا چکی تھی کہ ان کی ہلاکت اور تباہی بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کے سبب ہوگی اور اس کا خطرہ اور اندیشہ ہمہ وقت انہیں رہتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں وہی کچھ دکھایا جس سے بچاؤ کی وہ تدبیریں کرتے رہتے تھے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَلَإِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ قَالِقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۚ إِنَّا كَرِّمْنَا دُودَهُ ۚ إِنَّ لَكَ إِلَيْنَا رَجْعًا ۚ وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ ②

”اور ہم نے الہام کیا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف ۱۔ کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہے ۱۔ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریامیں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ ٹھنکنا ہونا۔ یقیناً ہم کو ٹلاؤں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے ۱۔“

۱۔ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف الہام کیا۔ آپ کی والدہ کا نام یوحنا بنت لاوی بن یعقوب علیہ السلام تھا۔ جیسا کہ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ آپ کی والدہ کے ذہن میں یہ بات وحی نبوت کے سبب القا نہیں کی گئی کیونکہ نبی تو صرف مرد ہو سکتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں بات ڈالی (۲) اصطلاح صوفیہ میں یہی الہام کہلاتا ہے۔ اور اسی کی جنس سے وہ سچے خواب بھی ہیں جو یقین اور اطمینان قلب کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ بھی الہام کے قبیلے سے ہوتے ہیں۔ لہذا یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ الہام بھی اسباب علم میں سے ہے، اگرچہ وہ علم ظنی ہوتا ہے اور ایسے نیک افراد کا الہام معتبر ہوتا ہے جن کے دل پاک ہوں اور نفس مطمئن ہو۔ اور دوسرے اور الہام کے درمیان فرق یہ ہے کہ الہام سے یقین اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے

جبکہ وسوسہ سے یہ حاصل نہیں ہوتا۔

عَنْ أَنَسٍ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ مَعْمَرَةَ هِيَ أَوْ خَيْفَةَ كَلِمَةٍ لَمْ يَكُنْ فِيهَا مَعْنَى مَوْجُودَةٍ بِأَجْمَرٍ أَيْ مَعْدُومَةٍ هِيَ - معنی یہ ہوگا کہ تو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہ جتنا اسے چھپانا تیرے لیے ممکن ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے کتنی مدت دودھ پلایا۔ اس کے بارے ایک قول آٹھ ماہ ہے دوسرا چار ماہ اور تیسرا قول تین مہینے کا ہے کہ وہ آپ کو اپنی گود میں دودھ پلاتی تھیں اور آپ علیہ السلام نہ تو روتے تھے اور نہ ہی حرکت کرتے تھے۔

پھر جب اس کے متعلق جنہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اس کے بارے علم ہو جائے گا تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ اور اس سے مراد دریا نے نیل ہے۔ اور اس کے ضائع ہونے کا خوف نہ کرنا اور اس کے فراق میں غمزدہ نہ ہونا، یقیناً ہم غریب ہی اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اس طرح کہ تو انہیں بالکل محفوظ پائے گی اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔

حضرت عطاء اور سخاک نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب مصر میں بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، انہوں نے لوگوں پر قلم و ستم شروع کر دیا۔ ایسے اعمال میں مصروف ہو گئے جو معصیت اور گناہ تھے وہ نہ کسی کو نیکی کا حکم دیتے اور نہ برائی سے روکتے تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر قبطیوں کو مسلط کر دیا۔ پس وہ ان پر ایسے غالب آئے کہ انہیں انتہائی کٹر و درک کر دیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کے تسلط سے نجات دلائی (۱)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے آپ کو ختم دینے کا وقت قریب آیا۔ تو آپ کی دانی بھی ان دانیوں میں سے تھی جنہیں فرعون نے بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے آپ کی والدہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ جب انہیں دروازہ شروع ہوا۔ تو انہوں نے اسے بلا بھیجا۔ اور کہا بچے کی ولادت ہونے والی ہے اور اس کیفیت سے تو واقف ہے تیری میرے ساتھ جو دوستی ہے آج مجھے اس کا فائدہ ہونا چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی دایہ نے آپ کا علاج کیا۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر تشریف فرما ہوئے تو آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے ظاہر ہونے والے نور نے اسے مدہوش کر دیا، اس کا ہر ہر جوڑ کاٹنے لگا اور اس کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ پھر اس نے کہا اے میری دوست! جب تیری دعوت پر میں تیرے پاس آئی تو تیرے پیچھے تیرے بچے کو قتل کرنے والے موجود تھے۔ لیکن اب میں تیرے بچے کی اتنی محبت اپنے دل میں پاری ہوں کہ اس کی مثل کسی کی محبت میں نے نہیں پائی۔ لہذا تو اپنے بیٹے کی حفاظت کر۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ پس جب دایہ آپ کے گھر سے نکلی تو کسی جا سوس نے دیکھ لیا۔ تو وہ آپ کے دروازے پر آگئے تاکہ وہ آپ کی والدہ کے پاس اندر داخل ہو جائیں۔ تو یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا اے اماں! یہ دروازے پر سپاہی کھڑے ہیں۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پڑے میں لیٹا اور چلتے نور میں ڈال دیا اور اس دوران اس کی عقل ایسے گم ہو گئی کہ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ پس اتنے میں سپاہی اندر داخل ہو گئے نور جل رہا ہے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیکھا کہ نہ تو ان کی رنگت تبدیل ہوئی ہے اور نہ ہی انہیں دودھ اترتا ہے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا وہ دایہ آپ کے پاس کیوں آئی تھی؟ تو آپ نے فرمایا وہ میری دوست ہے میری ملاقات کے لیے آئی تھی۔ پس یہ سن کر وہ چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی عقل بھی واپس لوٹ آئی۔ تو اس وقت آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے پوچھا جب کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے تو معلوم نہیں تو اتنے میں آپ نے نور سے بچے کے

رونے کی آواز سنی۔ آپ دوڑی ہوئی اس کی طرف گئیں تو کیا دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر آگ کو اتنا ٹھنڈا کر دیا ہے جو سلامتی والی ہے۔ پس آپ نے اطمینان سے اپنے بچے کو اٹھالیا۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے دیکھا کہ فرعون بچوں کی تلاش میں بہت زیادہ کوشاں ہے تو انہیں اپنے تخت جگر کے بارے میں بھی خوف لاحق ہوا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ بچے کے لیے ایک صندوق لے لے اور بچے کو اس میں بند کر کے بھرا سے دریائے نیل میں ڈال دے۔ چنانچہ آپ فرعون کی قوم کے ایک بڑھی کے پاس گئیں اور اس سے چھوٹا صندوق خریدا۔ اس بڑھی نے آپ سے پوچھا تو اس صندوق کو کیا کرے گی۔ تو آپ نے جھوٹ بولنا پسند نہ کیا اور اسے سچ سچ بتا دیا کہ میں اس میں اپنے تخت جگر کو چھپاؤں گی۔ اس نے پوچھا کیوں؟ تو آپ نے کہا میں اس کے بارے میں فرعون کے ظلم سے خوفزدہ ہوں۔ جب آپ صندوق خرید کر واپس چلیں تو وہ بڑھی ان سپاہیوں کی طرف چلا گیا جو بچوں کو قتل کرنے پر مامور تھے۔ تاکہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے واقعہ سے مطلع کرے۔ چنانچہ جب اس نے وہاں پہنچ کر کلام کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی اور وہ غفلت گزرا کہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے لگا لیکن سپاہیوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب اس نے انہیں خوب پریشان کیا تو ان کے سردار نے کہا اسے مار پیٹ کر یہاں سے نکال دو۔ ہوا یہ کہ جب بڑھی اپنی جگہ واپس پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی واپس کر دی اور وہ کلام کرنے لگ گیا۔ وہ دوبارہ چل پڑا تاکہ ان سپاہیوں کو اس واقعہ سے باخبر کرے اب کی بار اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی کے ساتھ ساتھ قوت بصارت کو بھی سلب کر لیا۔ چنانچہ نہ تو وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی کسی شے کو دیکھ سکتا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا کہ انہوں نے اسے مارا پیٹا اور وہاں سے نکال دیا۔ اور وہ گرتا پڑتا ایک وادی میں جا پہنچا اور اس میں حیران و پریشان پھرتا رہا۔ اب اس نے پختہ ارادہ کیا کہ اگر اس کی زبان اور بصارت واپس لوٹا دی جائے تو وہ قطعاً آپ کے بارے میں کسی کو آگاہ نہیں کرے گا اور آپ جہاں بھی ہوں گے ساتھ ساتھ رہ کر آپ کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صدق نیت کو پہچان کر اس کی بصارت اور قوت گویائی کو اس پر واپس لوٹا دیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بحمد رب ہو گیا۔ اور عرض کی اسے میرے پروردگار! تو اس صالح اور نیک بندے پر میری راہنمائی فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی فرمائی۔ وہ وادی سے نکلا اور آپ پر ایمان لایا اور اقرار تصدیق بھی کی۔ اور یہ یقین کر لیا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا۔ (۱)

حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا کہ ان دنوں فردوس بن منبہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ آپ سے حاملہ ہوئیں تو آپ نے تمام لوگوں سے اس معاملہ کو چھپا کر رکھا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے حمل پر مطلع نہ ہو سکا۔ یہ وہ شے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چھپایا، جب اس نے بنی اسرائیل پر احسان کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جس سال میں آپ کی ولادت ہوئی یہ بیس سال سے جس میں فرعون نے دائیوں کو بھیجتا تھا کہ وہ عورتوں کا جائزہ لیں۔ چنانچہ اس نے عورتوں کی ایسی تفتیش اور چھان بین کرائی جیسی اس سے قبل کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کہ آپ کی والدہ حاملہ تھیں لیکن نہ تو ان کا پیٹ پھولا، نہ رنگ تبدیل ہوا اور نہ ہی انہیں دودھ اترنا۔ نتیجہ دائیاں ان سے کوئی تعرض نہ کیں۔ جب وہ رات آئی جس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت نہ تو ان کے پاس کوئی حافظہ تھا اور نہ ہی کوئی دایہ تھی۔ اور آپ کی بہن مریم کے سوا کوئی اس پر مطلع نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی اَن اَنْرٰی وَیُؤْتِیْہُنَّ مِمَّا کُنَّ یَاسِیٰتٍ

عَلَيْهِمْ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْآيَةُ چنانچہ تین ماہ تک آپ کی والدہ نے آپ کو چھپائے رکھا اور اپنی گود میں ڈال کر دودھ پلاتی رہیں آپ نہ تو روتے تھے اور نہ حرکت کرتے تھے۔ جب ماں کو آپ کے بارے شدید خطرہ لاحق ہوا۔ تو جب انہوں نے آپ کے لیے ایک سر بند صندوقچہ لیا جس میں تار کول سے مٹلا کیا گیا تھا انہوں نے اس میں آپ کے لیے بستر لگا کر آپ کو اس میں رکھ دیا۔ اور پھر بند کر کے رات کے وقت سمندر میں ڈال دیا۔ (1)

عمون کی صرف ایک بیٹی تھی اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہذا وہ اس کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیاری تھی۔ ہر روز اس کی تین حاجات اور خواہشات ہوتیں جنہیں وہ فرعون کے پاس پیش کر کے پورا کراتی۔ اسے شدید برص کی بیماری تھی۔ فرعون نے اس کے علاج کے لیے سارے مصر سے اطباء اور جادو گروں کو اکٹھا کیا۔ جب انہوں اس کے معاملہ میں غور و فکر کی۔ تو اسے مخاطب ہو کر کہا اے ملکہ! تو صحت یاب نہیں ہوگی مگر دریا کی سمت سے۔ دریا میں انسان کی مثل کوئی چیز پانی جائے گی۔ اس کا لعاب لے لیا جائے گا اور وہ اس کے برص کے دواؤں پر لگایا جائے گا تو یہ صحت یاب ہو جائے گی۔ اور یہ قلائد دن قلائد ساعت میں اس وقت ہوگا جب سورج نکل رہا ہوگا۔ پس دوسرے دن پیر کا دن تھا فرعون نے دریائے نیل کے کنارے اپنے بیٹھنے کی جگہ تیار کرائی اور وہاں جا کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اس کی بیوی آسیہ بنت مزاح بھی تھی۔ فرعون کی بیٹی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی اور دریا کنارے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ آپس میں کھیلنے لگیں اور دریا کا پانی اپنے چلوؤں پر لے کر ایک دوسرے کے چروں پر پھینکتے لگیں۔ اچانک دریا میں ایک صندوق آتا دکھائی دیا جسے دریا کی موجیں دھکیل رہی تھیں۔ فرعون نے دیکھ کر کہا یہ دریا میں کوئی شے ہے جو درخت سے متعلق ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔ ہر جانب سے کشتیوں نے اسے بڑی تیزی سے گھیر لیا یہاں تک کہ اسے لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اسے کھولنے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن اس پر قادر نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اتنے میں آسیہ قریب ہوئیں تو انہوں نے صندوق کے اندر سے ایسا نور دیکھا، جسے ان کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا۔ جب انہوں نے صندوق کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ تو کیا دیکھا کہ اس میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنے پیچھونے پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں ایک نور چمک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک اس کے دونوں آنکھوں میں رکھی ہوئی ہے جن میں سے وہ دودھ چوس رہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت آسیہ کے دل میں ڈال دی۔ فرعون بھی آپ سے محبت کرنے لگا اور آپ پر ہر مان ہو گیا۔ اور ساتھ ہی فرعون کی بیٹی بھی ادھر آ پہنچی۔ پس جو بیٹی انہوں نے بچے کو صندوق سے باہر نکالا، تو فرعون کی بیٹی نے آپ کو آپ کے لعاب کو حاصل کیا اور اپنے برص کے نشاناتوں پر لگا دیا۔ وہ فوراً تندرست ہو گئی۔ تو وہ آپ کو بوسے دینے لگی اور اپنے سینے سے چٹالیا۔ یہ دیکھ کر جادو گروں نے فرعون کو کہا اے بادشاہ ہمارا خیال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہی وہ بچہ ہے جس سے بچنے کی تو کوشش کر رہا ہے۔ اسے اس خوف کی وجہ سے دریا میں پھینک دیا گیا ہے کہ تو اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ فرعون نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر آسیہ نے کہا قُوتُ عَيْنِي وَكَذَلِكَ تَقْتُلُونَهُ عَسَى أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَنْفَعَهُ وَكَذَلِكَ يَمُرُّ لِي مِثْلُ مَا تَصْنَعُونَ اس لیے آنکھوں کی ٹھنک ہے تم اسے قتل نہ کر قریب ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچے یا ہم اسے جینا بنالیں۔ آسیہ کے پاس کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ انہوں نے فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کو مانگ لیا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام انہیں صہبہ کر دیئے۔ اور ساتھ ہی فرعون نے کہا مجھے اپنی ذات کے لیے اس کی

کوئی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر فرعون بھی اس دن کہہ دیتا کہ یہ اسی طرح میرے لیے بھی آنکھوں کی ضد تک ہے جیسے تیرے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرمادیتا جیسے کہ اس نے آسیہ کو عطا فرمائی۔ پھر آسیہ کو کہا گیا اس بچے کا نام رکھ دیجئے تو اس نے کہا میں نے آپ کا نام موسیٰ رکھا۔ کیونکہ ہم نے اسے پانی اور درختوں کے درمیان سے پایا۔ پس ”موسٰی“ سے مراد پانی اور ”مسا“ سے مراد درخت ہے۔ (1)

فَالْتَفَتَهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَرًّا ۗ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ
جُودُهُمَا كَاَنُوْا خٰطِئِيْنَ ۝۱

”(پس دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھروالوں نے تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج و الم بنے۔
بیشک فرعون، ہامان اور ان کے لشکری خطا کار تھے۔“

۱۔ لِيَكُوْنَ میں لَام عاقبت کے لیے ہے۔ اور کسی بھی کام کا انجام اور نتیجہ اس غرض کے مشابہ ہوتا ہے جو اس فعل کا باعث بنتی ہے تاکہ اس کا وقوع تحقق اور ثابت ہو جائے (تو معنی یہ ہوا کہ) فرعون کے گھروالوں نے اسے دریا سے نکال لیا تاکہ انجام کار وہ ان کے لیے دشمن ہو جائے جو ان کے مردوں کو قتل کر دے اور باعث رنج و الم بن جائے، یعنی ان کی عورتوں کو باندیاں بنا لے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی حَزَّاء۔ اور باقیوں نے دونوں حروف کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مصدر میں یہ دونوں نہیں ہیں اور یہاں مصدر بمعنی قاتل ہے۔

۲۔ بے شک فرعون اس کا وزیر ہامان اور ان کے لشکری ہر شے میں خطا کار تھے۔ پس ان میں سے کسی کو چھوڑ انہیں گمیا ان میں سے ہزاروں افراد موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے قتل کیے گئے۔ پھر وہ آپ کو پکڑ کر آپ کی پرورش کرنے لگے تاکہ آپ بڑے ہو کر ان سے وہ کچھ کریں جس سے وہ بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ چونکہ وہ گنہگار تھے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سزا دی کہ ان کے دشمن کی پرورش ان ہی کے ہاتھوں سے کرائی۔ یہ جملہ معترضہ ہے یا تو ان کی خطا کی تاکید کے لیے ہے یا پھر اس سبب کو بیان کرنے کے لیے جس کی وجہ سے انہیں اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔

وَقَالَتْ اِمْرَاتُ فِرْعَوْنَ قُرْتُ عَيْنِيْ وَلَكَ لَا تَقْسُوْهُ عَسٰی اَنْ يُّفْعِنَا
اَوْ تَخَذَ لَنَا وَلًا ۗ اَوْ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱

”اور کہا فرعون کی بیوی نے (اسے میرے سر تاج) ۱۔ یہ بچہ تو میری اور تیری آنکھوں کے لیے ضد تک ہے اسے قتل نہ کرنا
۲۔ شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے اپنا فرزند بنالیں ۳۔ اور وہ (اس تجویز کے انجام کو) نہ سمجھ سکے۔“

۱۔ اس کا عطف فَاَلْتَفَتَهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ پر ہے۔ وہب بن معین نے کہا ہے کہ جب صندوق فرعون کے سامنے رکھا گیا اور انہوں نے اسے کھولا اور موسیٰ علیہ السلام کو اس میں پایا۔ تو جو نبی فرعون نے آپ کی طرف دیکھا تو کہا یہ عبرانی ہے اور دشمنوں میں سے ہے۔ چنانچہ وہ آپ پر غصے ہونے لگا اور کہنے لگا یہ بچہ کیسے گیا ہے؟ فرعون نے نبی اسرائیل کی ایک عورت سے نکاح کیا ہوا تھا جسے آسیہ بنت مزاحم کہا جاتا تھا وہ انتہائی شریف عورتوں میں سے تھی اور انبیاء علیہم السلام کی بیٹیوں میں سے تھی۔ وہ مساکین کے لیے تو مال بھی ان سے حد

درجہ شفقت اور رحم کرتی تھی، ان پر صدقہ کرتی اور انہیں مال و منال عطا کرتی تھی۔ اس نے فرعون سے کہا اس حال میں کہ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اس بچے کی عمر ایک سال سے زائد ہے اور تو نے تو اس سال پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے لہذا تو اسے چھوڑ دے یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ (1)

یہ مبتدا معذوف کی خبر ہے۔ ”لَا تَقْتُلُوْهُ“ میں صیغہ جمع کے ساتھ خطاب تعظیم کے لیے ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ اس نے کہا یہ تو ہمارے پاس ایک دوسری سرزمین سے آیا ہے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔

عَلَىٰ أَنْ يَنْتَقِلَ قَوْلُ بَارِي تَعَالَى لَا تَقْتُلُوْهُ کی علت ہے کیونکہ اس میں یمن و برکت کی علامات اور نفع کے دلائل موجود ہیں۔ اور وہ یہ تھے کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس بچے کی آنکھوں کے درمیان نور ہے۔ یہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھوں سے دودھ چوستا ہے اور اس کا لعاب لگانے سے برص کے نشانات مٹا چکے ہیں۔ باہم اسے بیٹا بنالیں کیونکہ یہ اس اہل ہے۔ لہذا ان تمام نے اس کی بات تسلیم کر لی۔

یہ اس میں ان دریا سے نکالنے والوں کی حالت بیان کی جا رہی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ دریا آسمانیک وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ہلاکت اور بربادی اسی کے ہاتھوں ہوگی۔ چنانچہ فرعون نے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اس بچے کی محبت ڈال دی۔ ابن جریر نے محمد بن قیس سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا یہ تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے نہیں۔ اور اگر وہ یہ کہتا کہ یہ میرے لیے ایسے ہی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جیسے تیرے لیے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرمادیتا جیسے اس کی بیوی کو عطا فرمائی (2)۔ اور ابن وہب نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا دشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے اسی طرح کہہ دیتا۔ جیسے آئینہ نے کہا تھا عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَكَ (کہ امید ہے یہ ہمیں نفع دے) تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے نفع دیتا۔ لیکن اس نے تو اس شقاوت اور بد بختی کی وجہ سے انکار کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ دی تھی۔ (3)

وَأَصْبَحَ قُوَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فِرْعَوْنَ إِنْ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَنْ رَّأَيْنَا عَلَىٰ قُلُوبِنَا

لِتُتَنَبَّأَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ⑤

”اور موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دے اس راز کو جسے اگر ہم نے مضبوط نہ کر دیا ہوتا اس کے دل کو سن تاکہ وہ خبر دے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی ہے۔“

یہاں اَصْبَحَ صَارَ کے معنی میں ہے اور اس کا عطف قَالَتْ اِمْرَاةُ فِرْعَوْنَ پر ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے سنا کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں آگئے ہیں تو اس کا دل شدت خوف اور غم سے عقل سے خالی ہو گیا (یعنی بہت زیادہ بے قرار ہو گیا) جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”وَالَّذِي نَفْسُكَ فِيْهَا“ یعنی ان کے دل خالی ہیں ان میں عقل باقی نہیں ہے۔ اور اگر مفسرین نے کہا ہے کہ ان کا دل موسیٰ علیہ السلام کی یاد اور آپ کی فکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اور حسن نے کہا ہے کہ فَاِذَا غَاكَ مَعْنٰی ہے کہ وہ اس وحی کو قبول لگیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اس وقت فرمائی جب آپ کو دریا میں بھیجنے کا حکم ارشاد فرمایا (5) کہ ”وَلَا تَخَافُ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اَدَّوْكَ اِلَيْكَ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ“ (اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا یقیناً ہم لوگوں میں سے اسے تیری طرف، اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں) اتنے میں شیطان اس کے پاس آیا اور کہا یہ تو ناپسند کرتی ہے کہ فرعون تیرے لیے کو قتل کرے حالانکہ اس کا

نقل کرنا تیرے لیے باعث اجر و ثواب ہوتا۔ اور اب تو نے خود اسے قتل کر دیا ہے کہ اسے دریا میں پھینک کر غرق کر دیا۔ پس جب ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ دریا نے نسل میں سے فرعون نے بچے کو پالیا ہے تو کہنے لگی وہ تو اپنے دشمن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ نیچے اس بہت بڑی آزمائش نے اسے وہ وعدہ بھلا دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس کے ٹمکن ہونے کی علت یہ تھی کہ جو اسے الہام ہوا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اولیاء کا الہام دلیل قطعی ہوتا ہے۔ لہذا الہام میں خطا کے احتمال نے انہیں گھبرا دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کا دل غم سے خالی ہو گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی صداقت کا یقین تھا۔ لیکن قطعی نے اس معنی کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ معنی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ آگے یہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ (1)

ع۔ اس میں ان مخففہ عن المطفلة ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور لنبیدی پر لام فارقہ ہے (یعنی ان نافیہ اور ان مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے) معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ وہ شدت غم کی وجہ سے یہ اظہار کر دیتی کہ موسیٰ اس کا بیٹا ہے۔ جیسا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ بے شک قریب تھا کہ وہ یہ کہہ دیتی ہائے میرے بیٹے۔ اور مقابل نے کہا ہے کہ جب اس نے صندوق کو دیکھا کہ دریا کی ایک موج اسے اوپر اٹھاتی ہے اور دوسری اسے نیچے لے جاتی ہے تو اسے ان کے غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو قریب تھا کہ وہ اپنی محبت اور شفقت کی بناء پر جیج اخصی اور حقیقت حال ظاہر ہو جاتی۔ اور کبھی نے کہا ہے کہ قریب تھا وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے اور یہ اس وقت ہوا جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد لوگوں کو یہ کہتے سنا موسیٰ بن فرعون (یعنی موسیٰ فرعون کا بیٹا ہے تو یہ بات ان پر اتنی شاق اور گراں گزری کہ قریب تھا کہ وہ کہہ دیتیں یہ تو میرا بیٹا ہے (2)۔ آیت کا معنی اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے یہ سنا کہ فرعون نے اسے اپنا بیٹا بنالیا ہے تو اس کا دل غم اور پریشانی سے خالی ہو گیا۔ اور اس سے اسے اس حد تک فرحت و مسرت ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ یہ اظہار کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے گھروالوں کی طرف جو تمہارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اپنی ماں کو لے آئی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کا دودھ پیتا شروع کر دیا تو یہ قریب تھا کہ وہ کہہ دیتی یہ میرا بیٹا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے سچا لیا (3)۔ اور ابو عبیدہ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور حزن سے خالی ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا لَا تَحْزَنْیْ۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر اتنا یقین تھا کہ قریب تھا کہ وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ یا یہ اظہار کر دیتی کہ بذریعہ الہام اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے میری طرف واپس لوٹا دے گا اور اسے مرطین میں سے بنائے گا۔

ع۔ غلیٰ قلبہا ظرف لغو زینٹنا کے متعلق ہے اور یہ زینٹنا بتاویل مصدر مبتدأ ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لَوْ لَا زینٹنا غلیٰ قلبہا مَوْجُودَ (یعنی اگر ہمارا تسلط اس کے دل پر موجود نہ ہوتا) یا پھر ظرف مستقر مبتدأ کی خبر ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی لَوْ لَا زینٹنا ثابت غلیٰ قلبہا (اگر اس کے دل پر ہمارا تسلط ثابت نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ وہ حقیقت حال ظاہر کر دیتی۔ یعنی اگر ہم اس کے دل کو گھبراہٹ اور پریشانی کے وقت صبر کرنے یا پہلی اور دوسری تاویل کے مطابق خوشی اور مسرت کو چھپانے

کے لیے یا پھر ابو عبیدہ کی تاویل کے مطابق اسرار خداوندی کو مخفی رکھنے کے لیے پختہ اور مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا وہ حقیقی معاملہ کا اظہار کر دیتی۔ یہاں لَوْلَا کا جواب محذوف بھی ہے اس کا مقابل اس پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی لا بدت بہ۔
 ۱۰. اِنَّكَ تَكُونُ مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ ربطنا کے متعلق ہے۔ یعنی ہم نے اس کے دل کو خزن و ملال صبر کرنے اور فرحت و انبساط کو چھپانے کے لیے مضبوط اور پختہ کر دیا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ یا یہ اَصْبَحَ کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور خزن سے خالی ہو گیا تاکہ وہ ان مؤمنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اور جو وضاحت ہم نے ذکر کی ہے اس سے تضحیٰ کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو اس نے ابو عبیدہ کی تاویل پر کیا تھا۔
 اس صورت میں لَوْلَا اَنْ رَّيْتُنَا جملہ معترضہ ہے۔

یوسف بن حسین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا، دو چیزوں سے منع کیا گیا اور دو چیزوں کی بشارت دی گئی لیکن کسی بھی شے نے اسے نفع نہیں دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی، اس کے دل کو مضبوط کیا اور شدہ غم یا خوشی سے حاصل ہونے والے اضطراب کو سکون عطا کیا تاکہ وہ ان مؤمنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین اور اعتماد رکھتے ہیں نہ کہ وہ فرعون کے آپ کو بیٹا بنانے پر اعتماد کرے۔

وَقَالَتْ لِأُحْتَمَ مِنِّيْ فَصُرْتُ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَهَمٌّ لَا يَسْعُرُوْنَ ۝۱۱

”اور اس نے کہا موسیٰ کی بہن سے کہ اس کے پیچھے پیچھے ہولے۔ پس وہ اسے دیکھتی رہی دور سے اور وہ اس (حقیقت کو) نہ سمجھتے تھے۔“

۱۱. اس کا عطف اصبح پر ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کی بہن مریم بنت عمران سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے ہولے اور اس کی اطلاع رکھے۔

۱۲. فَصُرْتُ بِهٖ کا معطوف علیہ محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہے فقضت فصرت لہ (پس اس نے ایسا ہی کیا اور اسے دور سے دیکھتی رہی)۔ ترکیب کلام میں یہ ضمیر مرفوع یا ضمیر مجرور میں سے کسی سے حال ہے۔ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ بے شک وہ ایک طرف کچھ فاصلے پر چلتی بھی رہی اور نظر پچا کر دیکھتی بھی رہی اور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نہیں دیکھ رہی۔ اور وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ اس کی تاک میں ہے۔

وَحَرَّمَ مَاعَلَيْهِ الْبِرَاصُ مِنْ قَبْلِ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ

لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ۝۱۲

”اور ہم نے حرام کر دیں اس پر ساری دودھ پلانے والیاں اس سے پہلے کہ تو موسیٰ کی بہن نے کہا کیا میں پتہ دوں

تمہیں ایسے گھر والوں کا جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر۔ اور وہ اس بچہ کے خیر خواہ بھی ہوں گے۔“

۱۳. اس کا عطف ففصرت پر ہے۔ اور یہاں تحریم سے مراد منع نکوئی ہے یعنی نہیں۔ اور مَوَاضِعُ یا مَوَاضِعُ کی جمع ہے یعنی ہم نے اس سے ہر دودھ پلانے والی کا دودھ روک لیا۔ پس اس نے ان میں سے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ یا یہ مَوَاضِعُ بالفصح کی جمع ہے اس بناء

پر یہ مصدر تہی ہے اور اس کا معنی رضاع ہے یا یہ اسم ظرف ہے اور اس کا معنی پستان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرعون کی بیوی نے یہ قصد کیا کہ دنیا بھر سے اسے کوئی ایسی عورت ملے جو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلا سکے۔ لہذا مسلسل کئی دودھ پلانے والی آئیں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کسی کے پستان پر منہ نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے آپ کو اس حال میں دیکھ لیا۔ اور واقعہ میں یہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ راتیں اسی طرح گزار دیں اور کسی کا دودھ نہیں پیا بلکہ چیتے رہے۔ (1)

عَلَفَاتُ کا عطف حوً متنا پر ہے۔ تو آپ کی بہن نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھروالوں کا پتہ دوں جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر اس میں لکم لاجلکم کے معنی میں ہے جو اہل بیت کی صفت ہے۔

سے اور وہ اس بچے کے خیر خواہ بھی ہوں گے۔ یعنی وہ اسے دودھ پلانے اور اس کی تربیت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ النصیح۔ عیش یعنی کھوٹ ملاوٹ کی ضد ہے۔ اس سے مراد ایسا عمل ہے جو فساد اور خرابی کی آمیزش سے صاف اور پاک ہو۔ ترکیب کلام میں یہ یکھلو نہ کے فاعل سے حال ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا وہم لہ فاصحون تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تو اس بچے کے گھروالوں کو جانتی ہے تو ان کے بارے میں ہمیں بتا۔ اس نے جواباً کہا میں تو انہیں نہیں پہچانتی (2)۔ اور جو میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بادشاہ کے لیے بڑے خیر خواہ ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس نے کہا میں نے تو بادشاہ کی خوشی اور اپنا اس کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کی رغبت میں یہ کہا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ جب اس نے کہا لعل اذ لکم علی نبیت۔ تو ان لوگوں نے کہا وہ کون ہیں تو اس نے جواباً کہا وہ میری ماں ہے۔ پھر انہوں نے کہا کیا تمہاری ماں کا بیٹا ہے تو اس نے کہا جی ہاں ہارون ہے (اور ہارون اس سال پیدا ہوئے تھے جس میں ابھی بچوں کو نقل نہیں کیا جاتا تھا)۔ پھر انہوں نے کہا تو اسے ہمارے پاس لے آ۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کے پاس گئی اور اسے بیٹے کے حال کے بارے میں مطلع کیا اور پھر اسے ان کے پاس لے آئی۔ پس جو نبی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کی خوشبو کو پایا تو اس کے پستان پر منہ رکھا اور اسے چوسنے لگے یہاں تک کہ آپ نے خوب سیر ہو کر پیا۔ سدی نے کہا ہے کہ وہ اسے ایک دینار یومیہ اجرت دیتے تھے (3)۔ اور روایت یہ ہے کہ آپ اسے اس لیے قبول کر لیں تھیں کیونکہ وہ عربی کا مال تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلٰكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

”تو (اس طرح) ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف لے تاکہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور (اس کے فراق

میں) غمزدہ نہ ہو اور وہ یہ بھی جان لے کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔“

اس کا عطف محذوف جملوں پر ہے جو آپس میں ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام کا مفہوم یہ ہے پس موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راجھائی کروں۔ تو انہوں نے کہا تو ہمیں بتا تو اس نے اپنی ماں کے بارے میں مطلع کیا، انہوں نے کہا اسے لے آ چنانچہ وہ گئی اور اسے لے آئی۔ پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی گود میں رکھا، اس نے انہیں دودھ پلایا تو آپ نے دودھ پی لیا۔ چنانچہ انہوں نے دودھ پلانے کے لیے آپ کو اس کے حوالے کر دیا، تو اس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی طرف لوٹا

وای۔ عربی کلام یہ ہے (فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَقْصِرَةٍ فَعَالُوا ذُلِّيْ فَذَلْتُ عَلَىٰ أَمِيَّتِهَا فَقَالُوا أَيْبَا بِهَا فَأَتَطَلَّقْتُ فَأَنْتَ بِهَا فَوْضُوهُ فَبِيْ خُبْرِهَا فَأَرْضَعُهُ فَرَضَعَهُ فَلَسْمُوهُ إِلَيْهَا لِلْإِرْضَاعِ فَرَزَذَنَاهُ إِلَىٰ أَمِيَّتِ)

ع۔ تاکہ موسیٰ علیہ السلام کے اس کی طرف واپس لوٹنے سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ اور وہ اس کے فراق میں غمزدہ ہو۔ اس کا عطف تقریر پر ہے۔ اور تاکہ وہ جان لے بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق اور سچ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف لوٹا دے گا (اس کا عطف لَا تَخْزَنُ پر ہے) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور وعید کے خوف سے ان افعال کا ارتکاب نہ کریں۔ جن کے کرنے سے اس نے منع کیا ہے اور اس کے وعدہ کے طمع اور حرص میں اس کے اوامر کو قطعاً ترک نہ کریں۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر تعریفیں ہیں جبکہ وہ بہت زیادہ گھبراہٹ اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ اَصْبَحَ فَوْادُ امِّ مُوسَىٰ فَارِغًا کا معنی یہ ہو کہ اس کا دل صبر سے خالی ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے نہ تو وہ لوگ اس وعدہ کو جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ ماں یہاں تک کہ آپ دودھ چھڑانے کی مدت تک اپنی ماں کے پاس بٹھیرے رہے۔ پھر وہ آپ کو فرعون کے پاس لے آئی اور آپ اسی کے پاس پرورش پاتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشعراء میں دکھایا ہے اَلَمْ نُنْزِلْكَ فَيَنْتَهِزْ۔

وَلَسَّابَدْنَمُ اَشَدُّ كَاوَاَسْتَوَىٰ اَتَيْنَهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

”اور جب پہنچے گئے موسیٰ اپنے شباب کو اور ان کی نشوونما مکمل ہو گئی۔ تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو۔“

ع۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام پہنچے گئے اپنے شباب کو۔ اشدہ یہ شدہ نقلی جمع ہے اس کا معنی قوت اور طاقت ہے جیسا کہ نعم نعمتی جمع ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ جب آپ اس حد کو پہنچے گئے جس سے آگے مزید نشوونما نہیں ہوتی۔ کبھی نے کہا ہے کہ الاشدہ سے مراد اٹھارہ سال لے کر تیس سال تک کی درمیانی عمر ہے۔ اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ اس سے مراد تھیں برس کی عمر ہے (1)۔ اور ان کی عقل مکمل ہو گئی یعنی وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ استوی سے مراد یہ ہے کہ آپ کا شباب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

ع۔ تو ہم نے انہیں حکم یعنی نبوت عطا فرمائی اور علم عطا فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام کی پہچان۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نبوت عطا کرنا نہیں۔ کیونکہ وہ تو آپ کو ہجرت کے بعد مدین سے واپسی پر عطا ہوئی تھی۔ بلکہ اس سے مراد احکام شرعی کی فقہانہت اور علم کا عطا کرنا ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں حرف عطف واو مطلق جمع کے لیے ہے۔ اس میں ترتیب پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ نبوت اگرچہ ہجرت کے بعد آپ کو عطا ہوئی۔ لیکن یہاں اس کے ذکر سے مقصود یہ ہے تاکہ اس وعدہ کے بیان کی تکمیل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ سے کیا تھا اور فرمایا تھا: اِنَّا رَاٰخُوهُ اِلَيْكَ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

یعنی وہ گن پڑے گا جسے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہے جز آء تکذ لیک۔ ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں جیسے ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو دیا۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ
يَقْتُلَانِ كُذَّابًا مِّنْ شِيعَتِهِمْ وَهَذَا مِنْ عَدُوِّكَ ۖ فَاسْتَعَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ
عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّكَ ۖ فَوَكَرَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَذَا مِنْ عَمَلِ
الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝

”وہ شہر میں داخل ہوئے اس وقت جب بے خبر سو رہے تھے اس کے باشندے آپ نے پایادوں دو آدمیوں کو آپس
میں لڑتے ہوئے یہ ایک ان کی جماعت سے تھا اور یہ دوسرا ان کے دشمنوں سے۔ پس مدد کے لیے پکارا آپ کو اس نے جو
آپ کی جماعت سے تھا اس کے مقابلہ میں جو آپ کے دشمن گروہ سے تھا تو سید میں گھونسا مارا موسیٰ نے اس کو اور اس کا کام
تمام کر دیا۔ آپ نے فرمایا یہ کام شیطان کی انجلیت سے ہوا ہے بے شک وہ کھلا دشمن ہے بہکا دینے والا۔“

۱۔ اس کا عطف لُغاً بَلَّغَ اَنْفَعاً ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر مدینہ ہے جو سرزمین مصر میں ہے (1)۔ مقاتل کا قول ہے
کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جسے خاتین کہا جاتا تھا اور یہ مصر سے دوفرخ کے فاصلے پر تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مین الغفس
کا شہر ہے (2)۔ اور بخاری نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر منف ہے۔ آپ کا کافی مدت اس شہر سے غائب رہنے کے بعد اس میں اس وقت
داخل ہوئے۔ جب اس کے باشندے بے خبر سو رہے تھے۔ یہ دو پہر کا وقت تھا اور لوگ قیلولہ کر رہے تھے (3)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا
ہے کہ آپ مغرب اور عشاء کے درمیان اس میں داخل ہوئے (4)۔ سدی نے کہا ہے کہ واقعہ یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا بیٹا کہا
جاتا تھا آپ فرعون کی سواریوں کی مثل سواری پر سوار ہوتے تھے اور اسی کی طرح لباس بھی زیب تن کرتے تھے۔ ایک دن فرعون سوار
ہوا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام پاس موجود نہیں تھے۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آئے اور آپ کو بتایا گیا کہ فرعون تو جا چکا ہے۔ تو آپ
بھی سوار ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ تو آپ جب سرزمین منف میں پہنچے تو دو پہر کا وقت ہو چکا تھا لہذا آپ دو پہر کے وقت اس شہر
میں داخل ہوئے اور اس وقت اس کے راستوں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ (5)

ابن اسحاق نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک جماعت بنی اسرائیل میں سے تھی جو ان کا کلام سختی تھی اور آپ کی اقتداء کرتی
تھی۔ پس جب وہ حق ظاہر ہو گیا جس پر آپ تھے تو آپ نے فرعون اور اس کی قوم سے علیحدگی اختیار کی اور دین میں انہیں مخالف قرار
دیا، یہاں تک کہ اس کا ذکر فرعون سے بھی کر دیا گیا۔ لوگوں نے آپ کو ڈرایا اور خوب خوفزدہ کیا۔ اس لیے آپ کسی گاؤں میں داخل
نہیں ہوتے تھے مگر ڈرتے ہوئے اور خفیہ طور پر۔ نتیجہ آپ اس شہر میں بھی ایسے وقت داخل ہوئے جب وہاں کے باسی بے خبر سو رہے
تھے (6)۔ ابن زید نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی چھوٹی عمر میں فرعون کو عصا سے مارا اور اس نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا
تو فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو چھوٹا ہے۔ لہذا اس نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے شہر سے انہیں نکال دینے کا حکم دے دیا لہذا پھر اس
شہر میں تب ہی داخل ہوئے جب آپ بڑے ہو چکے تھے (7)۔ اور جب شباب کی عمر کو پہنچ گئے۔ لہذا آپ شہر میں اس وقت داخل ہوئے

1- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	2- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	3- تفسیر جلالین صفحہ 327 (ازارت تعلیم)
4- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	5- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	
6- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	7- تفسیر بنوئی، جلد 5 صفحہ 138 (انتہاریہ)	

جب اس کے باشندے غفلت میں سو رہے تھے یعنی وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے بے خبر تھے کیونکہ وہ درمیان میں طویل مدت کا وقفہ گزرنے کی وجہ سے آپ کے بارے سب کچھ بھول چکے تھے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے قول باری تعالیٰ حنین غَفَلَةً مِّنْ أَهْلُهَا کے بارے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ ان لوگوں کی عیذ کا دن تھا اور وہ اپنے بہو وحب میں مشغول تھے (1)۔ (اس لیے وہ آپ کی آمد سے بے خبر تھے)۔

لَمْ يَقْتُلِيَنَّ زُجَلَيْنِ کی صفت ہے۔ یعنی دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے اور جھگڑ رہے تھے۔ ایک ان کی جماعت بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے۔ یعنی وہ قبیلہ تھا۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت رحلین سے حال ہے۔ واؤ حالیہ ذکر نہیں کی گئی اس لیے کہ اس جملہ سے قبل کلام محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے فَوَجَدَ زُجَلَيْنِ يُقَاتِلَانِ هَذَا مِنْ شَيْعَتِهِ ۱۴ اور یہ بھی جائز ہے کہ هَذَا وَ هَذَا كُوزُ جُلَيْنِ سے بدل بنا دیا جائے اور مِّنْ شَيْعَتِهِ اور مِّنْ عَدُوِّهِ مشارع الیہ سے حال ہو اور اس میں عامل معنی اشارہ ہو۔

لَمْ يَأْتِ شَعْبَهُ الْآخَرُونَ مِنْ شَيْعَتِهِ کا عطف و جند پر ہے۔ استقامت کا معنی ہے مدد طلب کرنا۔ یعنی اسرائیلی نے فرعونؒ کی خلاف مدد طلب کی۔ پس موسیٰ علیہ السلام غصے ہوئے اور آپ کا عصا انتہائی شدید ہو گیا۔ فرعونؒ اسرائیلی کو پکڑے ہوئے تھا اور یہ جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور آپ ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور عام لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے ساتھ تعلق صرف رضاءت کا ہے کہ ان میں سے ایک عورت نے آپ کو دودھ پلایا ہے۔ تو آپ نے فرعونؒ سے کہا اسے چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے تو اسے اس لیے پکڑ رکھا ہے کہ یہ لکڑیاں اٹھا کر تیرے باپ کے مطبخ تک پہنچا دے۔ یہ جواب سن کر آپ اس سے جھگڑ پڑے۔ فرعونؒ نے کہنے لگا اب تو میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ لکڑیاں اٹھ پر لا دوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھاری بھر کم جہم بھی عطا کیا گیا تھا اور قوت و طاقت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ ابن مسعودؓ نے فَوَجَدَهُ كُوفَةً كُوفَةً مُؤَمَّسِي پڑھا ہے۔ دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ ہے گھونسا مارنا۔ یہ قول بھی ہے کہ دُكُوعُ کا معنی ہے سینے میں ضرب لگانا اور لُكُوعُ کا معنی ہے پیچھے میں مارنا۔ فراء نے کہا ہے دونوں کا معنی دھکا دینا ہے (2)۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ دُكُوعُ کا معنی ہے انگلیوں کے کناروں سے دھکا دینا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خراسی کا عقد بنا کر اس کے سینے میں ضرب لگا دی (3)۔ اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یعنی اسے قتل کر دیا اور اسے ریت میں دفن کر دیا بجلی نے اسی طرح کہا ہے اور اس کا معنی ہے وہ اس کے معاملے سے فارغ ہو گئے۔ پس وہ شے جس سے تو فارغ ہو جائے اسی کے لیے کہا جائے كَافِفَتِهِ وَ قَصَبَتِ غَلِيْبِهِ یعنی تو نے اسے مکمل کر دیا تو چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے دانستہ قتل نہیں کیا تھا لہذا آپ اس پر نام ہوئے۔

یہ جملہ مستأخّر ہے۔ اور کہا یہ قتل شیطان کی انکیت سے ہوا ہے۔ اور یہ آپ نے اس لیے کیا اس وقت تک آپ کو کفار کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یا اس لیے کہ آپ ان میں محفوظ و مامون تھے اور آپ کی جانب سے ان کے ساتھ ایسے عمل کا ہونا درست نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ آپ کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔ کیونکہ یہ قتل خطا ہوا تھا۔ آپ نے اسے شیطان کی عمل قرار دیا اور اسے ظلم کا نام دیا اور اس سے استغفار بھی کیا۔ جیسا کہ مقررین کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کوئی حقیر سی غلطی ان سے سرزد ہو جائے تو اسے بڑا جھکر استغفار کرتے ہیں۔ بے شک شیطان کھلا دشمن اور بیکار دینے والا ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرْتَهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَفُوفُ الرَّحِيمُ ①

”آپ نے عرض کی میرے پروردگار! میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر پس بخش دے مجھے۔ اے تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا اسے بے شک وہی غفور رحیم ہے۔“

۱۔ یہ جملہ مستفاد ہے۔ آپ نے عرض کی میرے پروردگار! بے شک میں نے تیرے حکم کے بغیر ایک نفس کو قتل کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ پس تو میری خطا بخش دے۔

۲۔ اس کا عطف قال پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنا حق معاف کر دیا۔ چونکہ قطعی معصوم الدم نہیں تھا اس لیے معافی اور بخشش کے لیے قصاص کا ہونا یا مقتول یا اس کے ورثاء کی جانب سے معافی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ بے شک وہی اپنے بندوں کے گناہ بخشنے والا ہے۔ اور ان کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ كُنْ لِي أَكُوْنَ ظَهِيْرَ الْمُسْجِرِيْنَ ②

”عرض کرنے لگے میرے رب! مجھے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر فرمائے اب میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔“

۱۔ یہ دوسرا جملہ مستفاد ہے۔ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ کُنْ لِي أَكُوْنَ ظَهِيْرَ الْمُسْجِرِيْنَ کے لیے ہے اور اس کا مابعد جواب قسم ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فَلَنْ أَكُوْنَ مَعْذُوْفٍ عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْقِسْمُ بِأَنْعَامِكَ عَلَيَّ بِالنُّبُوَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ وَغَيْرِ ذَلِكَ ثَبُتَ فَلَنْ أَكُوْنَ ظَهِيْرَ الْمُسْجِرِيْنَ انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر نبوت، مغفرت اور دوسری صورتوں میں فرمائے میں اس سے توبہ کرتا ہوں کہ میں ہرگز نہیں بنوں گا۔ یا بے باع معذوف کلام کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے رَبِّ اغْصُنِيْ مِنَ الزَّلَّاتِ بِعَقْدِ أَنْعَامِكَ عَلَيَّ اے میرے رب مجھے اپنے ان انعامات کے طفیل لغزشوں سے بچا جو تو نے مجھ پر فرمائے۔ اس ترکیب کی بناء پر قول باری تعالیٰ فَلَنْ أَكُوْنَ مَعْذُوْفٍ دعا ہے۔ یعنی چاہئے کہ تو مجھے محفوظ رکھے تاکہ میں جرم کرنے والوں کے لیے مددگار نہ بنوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مجرمین سے مراد کافرین ہیں۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو پھر یہ اس کی دلیل ہے کہ اسراہیل کا فر تھا (۱)۔ یہی قول مقاتل کا بھی ہے۔ اور قارہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے میں اس کے بعد خطا کے معاملہ میں ہرگز کسی کی مدد نہیں کروں گا (۲)۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے میں ہرگز ایسے شخص کی مدد نہیں کروں گا جس کی معاونت مجھے جرم تک پہنچا دے۔

فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ حَافِيًا يَّتَرَقَّبُ قَادًا الَّذِي اسْتَنْصَرَكَ بِالْأَمْسِ
يَسْتَصْرِحُهُ ③ قَالَ لَهُ مُوسَى إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ④

”پھر آپ نے صبح کی اس شہر میں ڈرتے ہوئے۔ اس انتظار میں کہ کیا ہوتا ہے۔ تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ موسیٰ نے اسے فرمایا بے شک تو کھلا ہوا گمراہ ہے۔“

۱۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اس شہر میں صبح کی جس میں آپ نے قطعی کو قتل کیا تھا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فقط فی غلبہ پر ہے۔ اپنے آپ پر ڈرتے ہوئے۔ اور مقتول کے ورثاء کی جانب سے انتقام کی انتظار کرتے ہوئے یا اپنے رب کی طرف سے مدد اور نصرت کا

انتظار کرتے ہوئے۔ ترکیب کلام میں خائفانہ اور متعجب دونوں اصباح کے قائل سے حال ہیں۔

۱۔ فَاِذَا مَقَابِلَاتُكَ لِيْهِ۔ تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔
يَنْصَحُكَ الصَّرَاحُ سے مشتق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لوگ فرعون کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ بنی اسرائیل نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ لہذا آپ ہمیں ہمارا حق دلو ایسے (یعنی انہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا) تو اس نے انہیں کہا قاتل تلاش کرو اور ایسا شاہد پیش کرو جو اس کے خلاف شہادت دے کیونکہ بغیر گواہوں کے فیصلہ کرنا درست نہیں۔ وہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر کھوٹے رہے لیکن وہ کوئی پختہ ثبوت نہ پاسکے۔ اچانک دوسرے روز موسیٰ علیہ السلام گزر رہے تھے کہ آپ کی نظراسرائیلی پر پڑ گئی۔ وہ آج پھر ایک فرعون سے لڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے دیکھ کر پھر فرعون کے خلاف آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ پس موسیٰ علیہ السلام اس سے ملے اس حال میں کہ آپ گزشتہ روز قبیلہ کو قتل کرنے پر بہت نادم اور پریشان تھے (۱)۔ تو آپ نے اس اسرائیلی سے فرمایا بے شک تو تو کھلا گمراہ ہے۔ یعنی تیری گمراہی اس طرح واضح اور بین ہے کہ گزشتہ کل تو ایک آدمی کے قتل کا سبب بنا اور آج پھر تو دوسرے آدمی سے لڑ رہا ہے اور مجھے ہی مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے یہ اس فرعون کو کہا کہ بے شک تو اپنے ظلم کے سبب کھلا گمراہ ہے (انک لغوی مبین بظلمک)۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو آپ کے دل میں اسرائیلی کے لیے رقت اور نرمی پیدا ہوئی۔ پس آپ نے فرعون کو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

فَلَمَّا اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لِّهَآ اَقَالَ لِيُؤْتِيْ اَثَرِيْذُ اَنْ
تَقْتُلِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۚ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِيْ
الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

”پس جب آپ نے ارادہ کیا کہ بھٹ پڑیں اس پر جو ان دونوں کا دشمن تھا وہ کہنے لگا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر ڈالے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا تھا تو نہیں چاہتا بجز اس کے کہ تو ملک میں بڑا جاہل بن جائے اور تو نہیں چاہتا کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو۔“

۱۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ آپ سے پکڑ لیں جو ان دونوں کا دشمن ہے۔ دونوں سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور اسرائیلی ہے۔ کیونکہ فرعون ان دونوں کے دین پر نہیں تھا۔ کیونکہ قبیلہ بنی اسرائیل سے عداوت رکھتے تھے۔ تو یہ دیکھ کر اسرائیلی کو یہ گمان ہوا کہ آپ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ تو جو نبی اس نے آپ کو غصے میں دیکھا اور آپ سے انک لغوی مبین کا قول سنا تو وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ! کیا تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا۔ یا یہ قول اس قبیلے نے کہا کیونکہ آپ کے کلام سے اسے بھی یہ وہم ہو چکا تھا کہ بے شک یہی وہ ہے جس نے اس اسرائیلی کی وجہ سے کل اس قبیلہ کو قتل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلا قول زیادہ واضح ہے۔

۲۔ تو نہیں چاہتا مگر یہ کہ غضب کے سبب سرزمین مصر میں بہت زیادہ قتل کرنے والا بن جائے۔ اس طرح کہ تو لوگوں پر ظلم تو کرتا ہے اور

ظلم و ستم کرنے والوں سے ہے۔

۱۔ پس موسیٰ علیہ السلام اس شہر سے خوفزدہ ہو کر اور ڈرتے ہوئے نکلے۔ اپنے پیچھے سے تلاش کرنے والوں کا انتظار کرتے ہوئے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اپنے رب کی مدد کا انتظار کرتے ہوئے۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر اللہ سے ڈرنا جائز ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں) تو پھر ان کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اپنے بارے میں خوفزدہ ہونا یہ فطرتی اور طبعی تقاضوں میں سے ہے۔ اور یہ نبوت کے منافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل پیرا ہونے اور اس کی منامی سے رکنے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی جانب سے لاحق ہونے والے نقصان اور تکلیف کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ بخلاف عام لوگوں کے۔ کیونکہ یہ تو عام لوگوں سے ایسے ہی ڈرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی اذیت دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے دی گئی اذیت کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مثل ہی جانتے ہیں۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی۔ یہ یا تو جملہ مستاتھ ہے یا پھر خرچ کے فاضل سے حال ہے اور اس سے پہلے قدمقدہ ہے۔ ظالمین سے مراد کافریں ہیں۔ یعنی اسے میرے پروردگار! مجھے ان ظلم و ستم کرنے والوں سے بچالے اور اس سے مجھے محفوظ رکھ کہ وہ مجھے پائیں۔ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ جب فرعون کو یہ خبر موصول ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام یہاں سے چلے گئے ہیں تو اس نے آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور ان سے کہا کہ سوار ہو کر مختلف راستوں پر اسے تلاش کرو کیونکہ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ آپ کون سے راستے پر چلے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سُبُوَاعَ السَّبِيلِ ۝

”اور جب آپ روانہ ہوئے مدین کی جانب (تو دل میں) کہنے لگے امید ہے میرا رب میری راہنمائی فرمائے گا
سیدھے راستہ کی طرف ہے۔“

۱۔ زجاج نے کہا کہ وہ اس راستے پر چلے جو مدین کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہ گاؤں ہے جس کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے نام پر مدین رکھا گیا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے تو نہ آپ کے پاس سواری تھی اور نہ ذرا راہ تھا۔ اور مصر سے مدین آٹھ دنوں کی مسافت پر تھا (۱)۔ اور یہ فرعون کی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ اس میں لٹا طرف ہے اس میں شرط کے معنی ہیں اور یہ قول باری تعالیٰ قاتل کے متعلق ہے۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس پر یقین رکھتے ہوئے کہا۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے دبی کو فتح کے ساتھ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ اور اَن يَهْدِيَنِي سُبُوَاعَ السَّبِيلِ یہ جملہ قاتلِ ذَبِّ نَجَسِي پر معطوف ہے۔ اور سواء کی السبیل کی طرف اضافت میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ میری ایسے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرمائے گا جس میں کوئی زحمت اور تکلیف نہیں ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام اس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ نہیں جانتے تھے۔ پس جب

آپ نے یہ الفاظ کہے تو آپ کے پاس ایک فرشتہ آگیا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا تو آپ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو درختوں کے چوں اور بنریوں کے سوا آپ کو کوئی شے میسر نہ آئی یہاں تک کہ آپ پیٹ میں بھی بنری کے نشانات دیکھنے لگے (اجابت سے مراد ہے) اور جب آپ مدین پہنچے تو آپ کے پاؤں پھٹ چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی پہلی آزمائش تھی۔ (۱)

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةٌ مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمْ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّى يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ۝

”اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر لوگوں کا ایک انبوه ہے جو (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا ہے۔ اور دیکھیں اس انبوه سے الگ تھک دو عورتیں کہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا تم کیوں اس حال میں کھڑی ہو۔ ان دونوں نے کہا ہم نہیں پلا سکتیں۔ جب تک چرواہے اپنے مویشیوں کو لے کر واپس نہ چلے جائیں۔ اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔“

۱۔ اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے۔ یہاں ماء سے مراد وہ کنواں ہے جس سے وہ اپنے جانوروں کو پانی پلاتے تھے۔ تو آپ نے پانی پر یعنی کنوئیں کے کنارے پر ایک انبوه کثیر پایا جو اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ اور آپ نے ان کثیر لوگوں کے علاوہ نشینی جگہ میں دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں۔ تَذُودَانِ (غیر افعلیں سے حال ہے یا ان دونوں کی صفت ہے۔ کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی سے روکے کھڑی ہیں تاکہ وہ ان لوگوں کے ریوڑوں کے ساتھ نہ مل جائیں۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کو کہا۔ تمہاری یہ حالت کیوں ہے کہ تم اپنی بکریوں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہو۔ خطاب کا معنی ہاں اور حالت میں اسی طرح ہے (۲)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی اس روکنے سے تمہارا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ ان دونوں نے کہا ہم اپنے ریوڑوں کو نہیں پلا سکتیں

۳۔ یَصْدِرُ کو ابو جعفر، ابو عمرو اور ابن عامر نے یَصْدُرُ یعنی یاء کے فخر اور دال کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل لازم ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ضم اور دال کو کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے یہاں تک کہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی سے واپس لے جائیں۔ اس کلام میں يَسْقُونَ، تَذُودَانِ اور لَا نَسْقِي کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا اور وجہ یہ ہے کہ یہاں مقصود فعل ہے مفعول نہیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ آپ نے ان دونوں کے ساتھ اس لیے رحم اور مہربانی فرمائی کہ یہ اپنی کمزوری اور ضعف کے سبب پانی پلانے کی ضرورت اور حاجت کے باوجود جانوروں کو روکے ہوئے تھیں۔ اور لوگ پلا رہے تھے کسی نے ان کے ساتھ مہربانی نہیں کی۔ اس لیے کہ ان کے جانور بکریاں تھیں اور ان کے جانور اونٹ تھے۔ اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ ان دونوں عورتوں کی عفت و پاکدامنی اور مردوں کے ساتھ اخلاط سے اجتناب پر دلالت کرتی ہے۔

۴۔ اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔ یعنی ان کی عمر اتنی ہو چکی ہے کہ وہ مویشیوں کو پانی پلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے ہمیں

موسیٰ کو پانی پلانے کے لیے آتا پڑتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ لَا تَسْقِيْكَ فاعل سے حال ہے۔ بظاہر ان کا جواب آپ کے سوال کے مطابق دیکھا کی نہیں دیتا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ جواب کی سوال کے ساتھ وجہ مطابقت یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں سے جانوروں کو روکنے کا سبب پوچھا تھا۔ تو ان دونوں نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم پر وہ دار کزور عورتیں ہیں۔ ہم مردوں کی مزاحمت کی طاقت نہیں رکھتیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کے ساتھ اختلاط سے شرم و حیا بھی محسوس کرتی ہیں۔ لہذا ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے جانوروں کو روک کر رکھیں اور پلانے کو مؤخر کریں تاکہ ریوڑوں کا اختلاط نہ ہو جائے۔ علامہ بخاری نے کہا ہے کہ ان دونوں عورتوں کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ مجاہد، ضحاک، سدی اور حسن نے کہا ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ اور وہب اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس کا نام شیروان تھا جو حضرت شعیب علیہ السلام کا بھتیجا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام تو اس سے قبل اپنی بصارت ختم ہو جانے کے بعد وفات پا چکے تھے اور آپ کو مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان دفن کیا جا چکا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے یہ ایک مومن انسان تھا جو شعیب علیہ السلام پر ایمان لایا تھا۔ (1)

فَسَقِيْ لَهُمَآ تَوْنِيْ اِلَى الْظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَمَّا اَنْزَلْتَ اِلَیْ مِنْ خَبِيْرٍ فَقَبِيْرٌ ۝۳۱

”تو آپ نے پانی پلایا ان (کے ریوڑ) کو پھر لوٹ کر سایہ کی طرف آ گئے۔ اور عرض کرنے لگے میرے مالک! واقعی میں اس خبر و برکت کا جو تو نے میری طرف اتاری ہے، مجھے محتاج ہوں۔“

۱۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کی گفتگو سنی تو آپ نے ان پر مہربانی فرمائی اور ان کی بکریوں کو پانی پلادیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ آپ لوگوں میں گھس گھے اور انہیں کنوئیں کی سند پر سے دور ہٹایا اور ان دونوں عورتوں کے ریوڑ کو پانی پلایا۔ بعض (۱) نے یہ کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کنوئیں کے قریب ہی دوسرے کنوئیں کے منہ سے ایک بھاری پتھر کو اکھیر دیا جو اتنا وزنی تھا کہ اسے لوگوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی اور یہ روایت بھی ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے دس افراد کار کرتے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آپ نے ایک ڈول نکالا اور اس میں برکت کی دعا کی تو تمام بکریاں اسی سے سیراب ہو گئیں (2)۔ پھر آپ درخت کے سایہ کی طرف لوٹ کر آ گئے۔ اور سخت گرمی کے سبب اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا امتحان طویل ہوا۔ تو اپنے موٹی سے ہی اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے لگے اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ رب کی بھیجی ہوئی آزمائشوں پر شکوہ بھی اسی سے ہو سکتی ہے۔ نہ ہو۔

۲۔ اہل علم نے کہا ہے کہ یہاں لام الہی کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے فقیر لغار فقیر الیہ۔ اور انزال سے مراد عطا کرنا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی نِعْمَةًۭۤ یَّابِغْمَةً عَلٰی الْخَلْقِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے نعمتیں عطا فرمائیں۔ پھر کبھی تو نعمت کی عطا اسی شے کو بالذات اتارنے کے ساتھ ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم کو نازل کرنا اور بارش برسانا وغیرہ۔ اور کبھی عطا و نعمت اس کے اسباب

1۔ تفسیر بخاری، جلد 5 صفحہ 140 (انجاریہ)

2۔ تفسیر بخاری، جلد 5 صفحہ 140 (انجاریہ)

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مدین کے پانی پر تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کا ایک جھوم دیکھا جو پانی پلا رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انہوں نے کنوئیں کے منہ پر پتھر کو اوپس رکھ دیا جسے اٹھانے کے لیے دس افراد کار کرتے۔ تو اسے میں آپ نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔ پس ان دونوں نے آپ سے گفتگو کی۔ تو آپ اس پتھر کے پاس آئے اور اسے اٹھالیا پھر آپ نے صرف ایک ڈول ہی نکالا جس سے سارا ریوڑ سیراب ہو گیا۔ پھر وہ دونوں عورتیں لوٹ کر اپنے والد کے پاس گئیں اور اسے سارا واقعہ سنایا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف واپس لوٹ آئے۔ اور عرض کی اے میرے پروردگار! جو خبر و برکت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے واقعی میں اس کا محتاج ہوں۔

اتارنے اور اس کی طرف راہنمائی کر دینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَأَنْزَلْنَا الْقُرْآنَ** (اور ہم نے لوہا نازل کیا) **وَأَنْزَلْنَا لَكَ هَذِهِ الْقُرْآنَ فَتَنبِئْهُ** (اور اس نے تمہارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے اتارے) **وَأَنْزَلْنَا لَهُمْ كِتَابًا** (اور ہم نے تم پر لباس اتارا) اس آیت کریمہ میں **وَأَنْزَلْنَا** صیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد مستقبل ہے۔ یا پھر یہ قدرت النزالہ الہی کے معنی میں ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ بے شک وہ نعمت جو تو مجھے عطا فرمائے گا۔ یا وہ خیر و برکت جسے عطا کرنا تو نے میرے لیے مقدر کر دیا ہے۔ اس سے مراد خیر و برکت ہے چاہے طعام قلیل ہو یا کثیر۔

سے محتاج ہوں میں سائل ہوں۔ یعنی تو جو چاہے مجھے عطا فرما چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو۔ چونکہ یہ لفظ سوال کے معنی کو متضمن ہے اس لیے الٰہی کی بجائے لام کے ساتھ تعدی کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک لقمہ کا سوال کیا جس کے سبب وہ اپنی پشت کو سیدھا کر سکیں۔ امام باقرؑ نے فرمایا کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا کیونکہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے بھی محتاج تھے۔ اور سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عرض کی **رَبِّ اِنِّیْ لَمُنْزَلٌ اِلَیْیْ مِنْ خُبْرٍ فَفَقِّرْ** حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے معزز و مکرم تھے۔ لیکن اس وقت کھجور کے ایک ٹکڑے کے لیے محتاج تھے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف خیر ہی کا سوال کیا ہے (۱)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہذا انزلت میں لام سببیہ ہے۔ اور خیر سے مراد دین و حکمت ہے۔ معنی یہ ہے جو خیر تو نے مجھے عطا فرمائی اس کے سبب میں دنیا میں فقیر ہو گیا۔ کیونکہ میں نے دین میں فرعون کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ آپ جب تک فرعون کے پاس تھے خوش حال تھے۔ اور یہ کہنے سے غرض اور مقصود اس نعمت پر اظہار مسرت اور اداوائے شکر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے، بے شک وہ دین و حکمت جو تو نے مجھے عطا فرمائی میں اس میں اور اضافے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ گویا آپ نے عرض یہ کی **رَبِّ اِنِّیْ عَزَمْتُ** (میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ انزلت نزل سے مشتق ہو۔ یعنی اس میں نون اور زاد دونوں مضموم ہیں۔ اور اس سے مراد وہ کھانا ہے جو مہمان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے انزلت فلاں یعنی میں نے اس کی میزبانی کی اور الٰہی فقیر کے معنی یہ ہے کہ میں کھانے میں سے ہر اس شے کا محتاج ہوں جو تو مجھے عطا فرمائے۔

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَبْعِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۖ قَالَتْ إِنَّ ابْنِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرًا مَا سَقَيْتَ لَنَا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۖ قَالَ لَا تَخَفْ ۚ نَجَوْتَ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝

”کچھ دیر بعد آنی آپ کے پاس ان دونوں میں سے ایک خاتون شرم و حیا سے چلتی ہوئی (اور آ کر) کہا میرے والد تمہیں بلا رہے ہیں تاکہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں۔ پس جب آپ ان کے پاس آئے اور اپنا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا ڈرو نہیں۔ تم بچ کر نکل آئے ہو ظالموں (کے بچہ) سے۔“

۱۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ وہ دونوں عورتیں لوگوں سے پہلے جلدی جلدی اپنے باپ کی طرف لوٹ کر

آئیں۔ اور ان کی بکریوں نے اونٹوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تو ان کے باپ نے ان دونوں سے کہا تم جلدی کیسے آگئیں۔ انہوں نے جواباً کہا کہ ہم نے ایک صالح اور نیک آدمی کو پایا، اس نے ہمارے ساتھ مہربانی کی اور ہماری بکریوں کو پانی پلا دیا۔ یہ سن کر باپ نے ان میں سے ایک کو کہا تم جاؤ اور سے میرے پاس بلاؤ۔ پس ان میں سے ایک آپ کے پاس آئی۔ شرم و حیا میں چلتی ہوئی۔ یہ جار مجرور ظرف تمشقِ فضل کے فاعل سے حال ہے۔ اور پھر یہ مکمل جملہ بخاء ث فضل کے فاعل سے حال ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ وہ عورت ان جری خواتین میں سے نہیں تھی کہ مردوں کے پاس بے باک چلی آتی بلکہ وہ تو آپ کے پاس اس طرح پیچھے چھپاتے آئی کہ شرم و حیا کی وجہ سے اپنی قمیص کی آستیں اپنے چہرے پر رکھے ہوئی تھی (1)۔ اور آنکر کہا میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں۔ ابن عساکر نے اور اسی طرح بغویؒ نے بھی ذکر کیا کہ ابو حازم سلمہ بن دینار نے کہا جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو چاہا کہ نہ جائیں لیکن چونکہ آپ کئی دنوں سے بھوک برداشت کر رہے تھے۔ اس لیے آپ نے جانے کے بغیر کوئی چارہ نہ پایا۔ پس عورت آگے آگے چلی اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے، لیکن تیز ہوا کے سبب اس کی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹ جاتا تھا اس لیے آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ آپ کی نظر اس کی تنگی پنڈلیوں پر پڑے۔ لہذا اسے فرمایا تو میرے پیچھے پیچھے چل۔ اور اگر میں راستہ بھولنے لگوں تو میری راہنمائی کر دینا۔ چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔ جس پس آپ شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ شام کا کھانا کھانے لگے تھے۔ انہوں نے کہا اے نوجوان! بیٹھ جا اور کھانا کھالے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ تو شعیب علیہ السلام نے کہا ایسے کیوں کیا تم بھوکے نہیں ہو؟ آپ نے کہا کیوں نہیں۔ لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ اس عمل کا عوض نہ ہو جو میں نے ان عورتوں کی بکریوں کو پانی پلانے کی صورت میں کیا۔ اور میں ایسے گھرانے کا فرد ہوں جو اعمال آخرت میں سے کسی عمل کا عوض دنیا میں طلب نہیں کرتے۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا تم بخدا! اے نوجوان! ایسا نہیں۔ بلکہ میری اور میرے قبیلے کی یہ عادت اور طریقہ ہے کہ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد قَالَتْ اِنَّ اٰیٰیَیْہِیْہٖہٗکَ لَیَحْزُنْکَ اَجْزَہٗا سَقِیْتَ لَنَا اس معنی میں بالکل صریح اور واضح ہے کہ اس عورت نے موسیٰ علیہ السلام کو اجر عطا کرنے کے لیے ہی بلایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور اس کے ساتھ چل پڑے۔ اور یہ بھی درست نہیں کہ پہلے آپ کے نہ جانے کا ارادہ تھا بعد میں بن گیا۔ جیسا کہ ابو حازم نے کہا ہے۔ گویا یہ آیت اس واقعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ دعوت کے بعد اس کے انکار پر دلالت کر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے بھی معارض ہے جو آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تَوَشَّیْتُ لَتَلْحَقَنَّ عَلَیْہِوْ اَجْرًا (اگر تو چاہے تو اس پر اجرت لے لے)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھی مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس نے بکریاں چرائیں۔ تو صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے عرض کی کیا آپ بھی یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی قیراٹ لے کر اہل مکہ کی بکریاں چراتا رہا۔ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ (3) اور محقریب ہم یہ بھی ذکر کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

شرکاء کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کی خاطر اپنے آپ کو آٹھ یا دس سال کے لیے اجرت پر دینے رکھا (۱)۔ حق تو یہ ہے کہ وہ اعمال جو بذات خود عبادت مقصودہ ہیں یا عبادت مقصودہ کے لیے شرط ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ ہے۔ جیسے اذان، امامت اور تعلیم القرآن وغیرہ۔ لیکن ایسے اعمال جو فی نفسہ مباح ہیں اور نیت صالحہ کے سبب وہ اطاعت و فرمانبرداری بن جاتے ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ نہیں۔ حضرت امام شافعیؒ نے ابتداء ہی اذان وغیرہ اعمال پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔ اور متاخرین احناف نے بھی قرآن کریم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ یہ مخدوف جملوں پر محظوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ جب وہ عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے مذکور کلام کیا، تو موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کے پاس آئے، پس جب آپ ان کے پاس آئے۔ یعنی جہاں موسیٰ عندہ امی عند شعیب۔ تو اس میں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا قصص مصدر معنی مفعول ہے۔ قاموس میں ہے قص اثرو فصا و قصصا (وہ اس کے پیچھے اس کے نشانات قدم پر چلا) (۲)۔ اور قص الخیر کا معنی ہے۔ اس نے اسے واقعہ مکمل طور پر بتا دیا۔ لہذا آیت کا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو قطعی کو قتل کرنے کا واقعہ اور فرعون کے انہیں قتل کرنے کے ارادہ سے مکمل طور پر آگاہ کر دیا۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا فرعون اور اس کی قوم سے خوف نہ کرو اور انہوں نے یہ اس لیے کیا۔ کیونکہ بدین پر فرعون کی حکومت نہیں تھی۔ اور جملہ نجوت قول باری تعالیٰ لا تخف کی علت ہے معنی یہ ہے۔ ڈرو نہیں تم خالوں کے بچے سے بچ کر نکل آئے ہو۔

قَالَتْ اِخْلُدْ سَهْمًا يٰ اَبَتِ اسْتَنْجِزْ اِنْ خَيْرٍ مِّنْ اسْتَأْجَزْتَ الْقَوٰى الْاَمِيْنُ ﴿٣١﴾
 ”ان دو میں سے ایک خاتون نے کہا میرے (محترم) باپ اسے نوکر رکھ لیجئے۔ بے شک بہتر آدمی جس کو آپ نوکر رکھیں وہ ہے جو طاقتور بھی ہو یا اندرا بھی ہو۔“

۱۔ ان دونوں عورتوں میں سے اس ایک خاتون نے کہا جو آپ کو بلا کر لائی تھی اسے میرے محترم باپ اسے بکریاں چرانے کے لیے ملازم رکھلو۔ بے شک جسے آپ کام کے لیے ملازم رکھیں تو بہتر ملازم وہ ہے جو کام کرنے کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور اندرا بھی ہو۔ اور علت کو دلیل کے قائم مقام رکھنا جائز ہے۔ اس بناء پر کہ حقیقتاً اچھے البکی اوصاف ہیں۔ اور اس میں مزید مبالغہ کے لیے ان کا ام لفظ خیر اور پھر فعل ماضی ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس میں معنی مستقبل کا ہے۔ تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ آپ کے ان اوصاف کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں حضرت ابو ذرؓ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ اس لڑکی کو اس کے باپ نے کہا تجھے اس کی قوت و طاقت اور امانت کیسے معلوم ہے؟ تو اس نے جواباً عرض کی کہ اس کی قوت کا علم تو اس طرح ہوا کہ اس نے نونیس کے منہ سے وہ پتھر اکیلے اٹھایا جسے دس یا چالیس افراد لے کر اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس کی امانت کی نشانی یہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کے لیے کہا تاکہ تیز ہوا کے سبب کپڑا اڑنے کی وجہ سے اس کی نظر میرے بدن پر نہ پڑے (۳)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تمام لوگوں سے زیادہ ذہین تین افراد تھے، ایک شعیب علیہ السلام کی بیٹی، دوسرا یوسف علیہ السلام کا وہ ساتھی جس نے یہ کہا تھا غسائی اَنۡ يُّنْفَعَنَا (امید ہے یہ

میں نفع دے گا) اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے اپنی حیات میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَفْكِكَ إِحْدَى ابْنَتَيْ هَاشِمٍ عَلَى أَنْ تَأْجُرَنِي شَهْرًا
حَجَّجَ فَإِنْ أَتَمَمْتُ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ ۖ
سَجَدَ لِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّلَاةِ ۚ ⑤

”آپ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں بیاہ دوں تمہیں ایک اپنی ان دو بچیوں سے بشرطیکہ تو میری خدمت کرے آٹھ سال تک۔ پھر اگر تم چورے کر دو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کروں مگر تو پائے گا مجھے اگر اللہ نے چاہا نیک لوگوں سے (جو وعدہ ایفا کرتے ہیں) ہے۔“

۱۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے کہا ”ابنی“ میں نافع نے یاہ کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ان دو بچیوں میں سے کسی ایک سے تمہارا نکاح کر دوں۔ شعیب جنابی کے قول کے مطابق ان دونوں کے نام صفورہ اور لیا تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ ان کے اسماء صفورہ اور شرقا تھے۔ اور کئی دوسروں نے یہ کہا ہے کہ ان میں سے بڑی کا نام صفراء اور چھوٹی کا نام اصغیرا تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ انہوں نے آپ کی شادی بڑی لڑکی سے کی۔ جبکہ اکثر کی رائے یہ ہے کہ آپ کی شادی چھوٹی لڑکی سے کی اور اس کا نام صفورہ تھا اور وہی آپ کو بلانے کے لیے بھی مٹی تھی (۱)۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ حضرت امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب چھ سے پوچھا جائے دو عورتوں میں سے کونسی عورت کے ساتھ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح کیا تھا؟ تو یہ کہو کہ ان میں سے چھوٹی کے ساتھ۔ یہ وہ عورت ہے جو آپ کو بلانے آئی تھی۔ اور اسی نے کہا تھا یا نبی استغفرہ۔ لہذا ان دو میں سے چھوٹی کے ساتھ آپ کی شادی ہوگئی (۲)۔ اس شرط پر کہ تو اپنا نفس مجھے اجرت پر دے اور تو میرا اجر اور ملازم بن جائے۔ فراء نے کہا ہے کہ تم اس خدمت کو اس شادی کا عوض بنالو۔ عرب کہتے ہیں اجورک یا جورک ای اثابک (اس نے تجھے بدلہ دیا) (۳)۔ معنی یہ ہے کہ تو اس شادی کے بدلے آٹھ سال تک میری بکریوں کو چرائے۔ پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق لغوی طرف ہے اور فراء کی تاویل کے مطابق یہ مفعول ہے یہ اور اس میں مضاف مضمر ہے۔ اور حجاج خجۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی سال ہے۔

۲۔ پھر اگر تم نے ریوڑ چرانے میں دس سال مکمل کیے تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہوگی اور تمہاری طرف سے نیکی اور احسان ہوگا۔ تم پر لازم اور ضروری نہیں ہوگا۔ یہ عقد نکاح کی دعوت ہے۔ نفس نکاح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ عقد نکاح ہوتا تو آپ ان دونوں بچیوں میں سے ایک کو متعین کرتے ہوئے کہتے اَنْتُمْ خَتَنُکُمْ ہذہ (میں نے تیرا اس سے نکاح کر دیا)۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اس مشورہ کے بعد ان دونوں میں سے ایک معینہ نیکی کے ساتھ آپ کا نکاح کیا۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک بکریاں چرانے کو یا تو اس کا مکمل مہر قرار دیا یا پھر اسے کسی دوسرے مال کے ساتھ ملا کر مہر کا بعض حصہ قرار دیا۔ اور اسی

پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے امام احمد اور ابن ماجہ نے عقبہ بن منذر سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے پڑھا طہسم یہاں تک کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرمگاہ کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کے لیے اپنے آپ کو آٹھ سال تک کے لیے اجرت پر دے دیا۔ (1)

مسئلہ :- اس آیت کریمہ اور حدیث طیبہ سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس آدمی نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ بطور مہر خاندانی بیوی کی بکریاں چرائے گا تو یہ جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا اور اپنی شریعت میں اس کی نفی بیان نہیں کی۔ ابن سماعہ نے امام اعظم ابو حنیفہؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ لیکن مہسوط اور جامع کی روایت کے مطابق امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ اور مذکورہ حدیث طیبہ سے استدلال صرف اس صورت میں جائز ہے۔ جبکہ ریوڑ لڑکی کی ملکیت ہو کیونکہ ہماری شریعت میں مہر بالا جماع عورت کا حق ہوتا ہے نہ کہ اس کے دلی کا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بکریاں حضرت شعیب علیہ السلام کی ملکیت تھیں۔ اور اتباع اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم ان کی شریعت میں تھا ہماری شریعت میں نہیں۔ یہ مسئلہ سورۃ النساء کی آیت وَأُولَئِكَ لَكُمْ مَآوَا ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِهَا مَآوَا لَكُمْ کی تفسیر میں ہم نے مفصل ذکر کر دیا ہے۔

اسے اور میں نہیں چاہتا کہ تم پڑس سالوں کی تکمیل لازم کر کے یا اوقات کی پابندی اور پورا پورا کام لینے کے لیے طرح طرح کی جرح قدح کر کے آپ پر بھنی کروں۔ مشقت العنق سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے الفرق۔ یعنی متفرق ہو جانا، پھٹ جانا۔ چونکہ وہ کام جو تجھ پر مشکل ہوتا ہے اسے برداشت کرنے کے بارے میں اعتقاد اور اسے بجالانے کے بارے میں تیری رائے متفرق ہو جاتی ہے (اس لیے مشکل اور دشوار کام کو حق کہا جاتا ہے)

یہ مستحب دینی میں نافع نے یا مد مفتوح اور ہاتھوں نے ساکن پڑھا ہے عمر نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تو مجھے حق صحبت کی حفاظت کرنے والوں اور جو کچھ میں نے کہا اسے پورا کرنے والوں میں سے پائے گا (2)۔ یہ جملہ اس ارشاد گرامی کی تاکید کے لیے ہے وَمَا أَهْرَبْنَاهُ أَنْ تُفْلِحَ عَلَيْنِكَ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ شرط کرنے سے مراد یہ ہے کہ نیکی کے وعدے کی تکمیل اور وفا کا انحصار اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد پر ہے۔ محض اپنی ذات پر توکل اور بھروسہ نہیں۔ اس شرط سے قطعاً یہ مقصود نہیں کہ انہیں وعدے کو وفا کرنے کے بارے میں تردد اور شک ہے۔

قَالَ ذَلِكْ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ آيَا آلَا جَلَلِكُنْ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٥٨﴾

”موسیٰ نے کہا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے پاگئی۔ ان دو میعادوں سے جو میعاد میں گزرادوں میں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اسے اور اللہ تعالیٰ جو قول و قرار ہم نے کیا ہے اس پر نگہبان ہے۔“

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شرط اور وعدہ میرے اور آپ کے درمیان ثابت اور پختہ ہو گیا۔ پس جو ذمہ داری آپ نے مجھ پر عائد کی ہے وہ میں آپ کے لیے ادا کروں گا۔ اور دو بیچوں میں سے ایک سے شادی کے بارے میں جو حق آپ نے میرے لیے مقرر کیا

ہے وہ آپ میرے لیے ادا کریں گے۔

عَنِ ابْنِ قُطَيْبَةَ كَيْ بَاءَ بِمَنْصُوبٍ هـ۔ اس میں ماضی زائدہ ہے جو ابہام کی تائید کے لیے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان دو میعادوں یعنی طویل مدت یا چھوٹی مدت جو بھی میں آپ کے لیے گزار دوں۔ یعنی میں آپ کے لیے پوری کر دوں۔

عَنِ ابْنِ قُطَيْبَةَ فَلَا تُؤَدُّونَ عَنِّي كَاجَلِ اس معنی شرط کی جڑا ہے جسے ایضاً کالفظ مضمن ہے۔ اور جملہ شرطیہ ذَالِکَ بَيْنِي وَبَيْنَکَ سے بدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ زیادتی کے مطالبہ کے سبب مجھ پر زیادتی نہیں کریں گے۔ اور جس طرح دس سال مکمل ہونے کے بعد مجھ سے مدت میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح آٹھ برس مکمل ہونے کے بعد بھی مزید خدمت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر آٹھ سال مکمل ہونے کے بعد میں خدمت چھوڑ دوں تو اس اوپر والی زائد مدت کو چھوڑنے کے سبب میری طرف تعدی کی نسبت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی مجھ پر کوئی حرج اور گناہ ہوگا۔ اختیار کو ثابت کرنے میں یہی انداز زیادہ بلیغ ہے اور اس میں دونوں مدتوں کو پورا کرنا مساوی ہے۔ بحسبیت اس انداز کے کہ یہ کیا جاتا کہ اگر میں نے قلیل مدت پوری کر دی تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

ہے اور اللہ تعالیٰ انی شرائط پر جو ہم بیان کر رہے ہیں تمہاں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان جو قول و قرار ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے (1)۔ یہ جملہ ماقبل کلام سے حال ہے۔ اور وکیل وہ ہوتا ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے اور یہاں یہ شاہد اور نگہبان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ اسی لیے اس کا صلہ علمی ذکر کیا گیا ہے۔

شہداء بن اوس نے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت شعیب علیہ السلام اتنا زیادہ روئے کہ ان کی بیٹائی جاتی رہی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت لوٹا دی۔ وہ پھر روئے گئے یہاں تک کہ پھر بیٹائی ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بیٹائی عطا فرمادی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ رونا کیسا ہے کیا جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے؟ تو آپ نے عرض کی اے میرے پروردگار! ایسا ہرگز نہیں یعنی نہ تو میں جنت کے شوق میں روتا ہوں اور نہ ہی جہنم کے خوف سے روتا ہوں۔ بلکہ میں تو صرف تیرے دیدار کے شوق میں رو رہا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی اے شعیب! اگر ایسا ہے تو پھر تجھے میری ملاقات مبارک ہو۔ اسی لیے میں نے تیری خدمت کے لیے موی کو مقرر کر دیا ہے (2)۔ جب ان دونوں کے مابین معاہدہ مکمل ہو گیا تو شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کو حکم ارشاد فرمایا کہ موی کو لاٹھی لا کر دو جس کے ساتھ وہ بکریوں کی درندوں سے حفاظت کریں گے۔ اب اس عصا (لاٹھی) کے بارے علماء کی مختلف آراء ہیں حضرت نکرہ کا قول ہے کہ یہ لاٹھی حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لانے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس عصا کو اٹھالیا، پھر یہ انہی کے پاس رہا یہاں تک کہ ایک رات وہ حضرت موی علیہ السلام سے ملے اور وہ انہیں دے دیا۔ اور دوسروں نے یہ کیا ہے کہ یہ عصا جنت کے درخت اس سے بنا ہوا تھا آدم علیہ السلام سے جنت سے ساتھ لائے تھے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کو ورثہ میں ملتا رہا۔ نبی کے علاوہ کوئی اور اسے نہیں لے سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ پھر ان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہنچا۔ پھر ان سے شعیب علیہ السلام تک پہنچا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا عصا انہی کے پاس رہا۔ پھر انہوں نے موی علیہ السلام کو عطا کر دیا۔ (3)

سدی نے کہا ہے کہ یہ عصا ایک فرشتے نے انسانی صورت میں ان کے پاس امانت رکھا ہوا تھا۔ پس جب آپ نے اپنی بیٹی کو عصا لانے کا حکم دیا۔ تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو وہی لا کر دے دیا۔ جو نبی شعیب علیہ السلام نے اسے دیکھا تو نبی کو فرمایا یہ عصا اب اس لیے جاوڑ اس کے سوا کوئی اور لا کر اسے دے دے۔ چنانچہ اس نے اسے واپس رکھا اور اس کے علاوہ دوسرا اٹھانے کی کوشش کی مگر ہر بار نبی عصا اس کے ہاتھ میں آیا اس نے مسلسل تین بار ایسا کیا۔ بالآخر نبی عصا شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا اور موسیٰ علیہ السلام اسے اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ بعد ازاں حضرت شعیب علیہ السلام اس پر خوب نادم ہوئے کہ وہ تو ان کے پاس امانت تھا۔ نتیجہ آپ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چل پڑے تاکہ انہیں تلاش کر کے عصا واپس لے آئیں۔ مگر اب موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ تو میرا عصا ہے۔ بالآخر وہ دونوں اس پر متفق ہوئے کہ جو آدمی اب سب سے پہلے انہیں ملے گا اس کا فیصلہ دونوں قبول کریں گے پس اسٹے میں ایک فرشتہ انسانی صورت میں ان کے پاس آیا اس نے فیصلہ یہ کیا کہ وہ عصا کو زمین پر پھینک دیں پس جس نے اسے اٹھا لیا وہ اسی کا ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے زمین پر رکھ دیا گیا پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے اٹھانے کی پوری کوشش کی مگر نہ اٹھا سکے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے جو نبی اسے اٹھانے کی کوشش کی فوراً اٹھا لیا نتیجہ حضرت شعیب علیہ السلام نے وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے اور شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی ان کے حوالے کر دی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے کہا اپنے باپ سے یہ مطالبہ کر دو کہ کچھ بکریاں تمہیں بھی دیں۔ چنانچہ اس نے اپنے والد محترم سے اس کا مطالبہ کیا۔ تو جواباً شعیب علیہ السلام نے کہا اس سال جتنے دور ننگے پیچے پیدا ہوں گے وہ تمہارے ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حسن کارکردگی اور اسن انداز میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے اعزاز میں اور اپنی بیٹی کے ساتھ اظہار شفقت و محبت کے طور پر انہیں کچھ دینے کا ارادہ فرمایا تو کہا میں نے تمہیں بکریوں کے وہ تمام پیچے دے دیئے جو اس سال چشتبر سے پیدا ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ خواب بتایا کہ وہ اپنا عصا اس پانی پر ماریں جو وہ اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر عصا مارا پھر بکریوں کو وہ پانی پلایا۔ پس جس نے بھی وہ پانی پیا۔ ان تمام نے آگے فراورادہ چشتبر سے پیچے دیئے۔ یہ دیکھ کر شعیب علیہ السلام جان گئے کہ یہ تو خاص رزق اور انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے وہ تمام چشتبر سے پیچے موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کر دیئے۔ (1)

فَلَمَّا أَتَىٰ مُوسَىٰ الْأَجَلَ وَسَاءَ لَهُ هَٰذِهِ النَّاسُ مِنْ جَانِبِ الظُّلُمِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِيهِ
امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا تَلْعَنُ أُولَٰئِكَ مِنْهَا بَعَثَ اللَّهُ مُوسَىٰ وَجَدُوا قَوْمًا لَّعَنُوا لَكُمْ تَقْطُلُونَ ۝

”پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی۔ اور (وہاں سے) چلے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر تو آپ نے دیکھی طور کے ایک طرف آگ آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ہٹھو میں نے آگ دیکھی ہے۔ (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا آگ کی کوئی چمکری ہے۔ تاکہ تم اسے تپ سکو۔“

۱۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی اور اس سے فارغ ہو گئے۔ علامہ بغوی نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا جب سے حمیرہ کے یہودیوں میں سے ایک نے پوچھا موسیٰ علیہ السلام نے دو مدتوں میں سے کوئی پوری کی تھی؟ تو میں نے

کہا میں تو نہیں جانتا البتہ میں حمر العرب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جاؤں گا اور ان سے اس بارے میں دریافت کروں گا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوا اور اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو دنوں میں سے زیادہ اور اچھی مدت کو مکمل کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول جب کچھ کہتا ہے تو اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ (1)

علامہ بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب تجھ سے پوچھا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی؟ تو تیرا جواب یہ ہونا چاہیے کہ دو دنوں مدتوں میں سے بہتر اور خوشگوار مدت انہوں نے مکمل کی (2) ”رواہ ابوہریرہ“ اور عابد نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے تو آپ مزید دس سال تک اپنے خسر کے پاس ٹھہرے رہے۔ گویا اس طرح آپ میں برس تک وہاں رہے۔ پھر آپ نے مصر واپس لوٹنے کی اجازت طلب کی، تو حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو اجازت دے دی۔ لہذا آپ مصر کی طرف چلے گئے (3)۔ یہاں تک کہ جب آپ طور سیناء کے قریب صحراء میں پہنچے صورت حال یہ تھی کہ موسم سرما کی انتہائی سخت سرد اور تاریک رات تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ تو آپ نے کوہ طور کی ایک سمت آگ دیکھی۔ تو آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ٹھہرو۔ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے ساتھ اپنی اہلیہ کے بغیر اور کوئی نہ تھا تو پھر جمع کی خمیر ذکر نہ ہوتی جس کا مرجع اہل ہے۔

ع۔ ”ابنہ“ سے نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے ساتھ اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور انسٹ نازا کا جملہ انکھوا کی علت بیان کر رہا ہے (تم خمیر کو کیونکہ میں نے آگ دیکھی ہے)۔

یعنی اس میں کوئی فونی نے یاء کو ساکن اور باقیوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ یعنی اس طرح ہے شاید میں وہاں سے تمہارے پاس راستے کو روشن کرنے کے لیے کچھ آگ لے آؤں۔ کیونکہ وہ راستہ بھول چکے تھے۔ یا آگ کی چنگاری لے آؤں۔ پس جلدوہ میں صام نے جم کو مفتوح جزء نے مضموم اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے، یعنی اس میں یہ تینوں لغات ہیں۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے کہ قذادہ اور مقال نے کہا ہے کہ جلدوہ سے مراد وہ لکڑی ہے جس کا کچھ حصہ جل چکا ہو۔ اس کی جمع جذی آتی ہے (4)۔ قاموس میں ہے کہ جلدوہ سے مراد آگ کا تہائی حصہ اور آگ کی چنگاری ہے۔ (5)

یعنی ہم اسے آگ میں سے لے لیں گے۔ من النار میں من یا تو ابتداء سے یا حقیقیہ ہے۔ اور علامہ بیہقی نے کہا ہے کہ جلدوہ موسیٰ لکڑی کو کہتے ہیں چاہے اس کے سرے پر آگ ہو یا نہ ہو (6)۔ اسی لیے اس کی وضاحت من النار کے قول سے فرمائی۔ گویا اس میں من بیان یہ ہے۔ تاکہ تم اسے تاپ سکو۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ
أَنْ يُّؤْمِنُوا بِئِيَّ أَنْ أُنَالِلَهُ سَرَابَ الْعَالَمِينَ ﴿٦﴾

”پس جب آپ وہاں گئے تو ندا آئی وادی کے دائیں کنارہ سے، اس بارکت مقام میں ایک درخت سے اُن کے پاس

2۔ تفسیر بیہقی، جلد 5 صفحہ 142 (انجاریہ)

1۔ تفسیر بیہقی، جلد 5 صفحہ 142 (انجاریہ)

4۔ تفسیر بیہقی، جلد 5 صفحہ 143 (انجاریہ)

3۔ تفسیر بیہقی، جلد 5 صفحہ 143 (انجاریہ)

6۔ تفسیر بیہقی، مع حاشیہ کا زرونی، جلد 4 صفحہ 291 (الکر)

5۔ قاموس الکحید، جلد 2 صفحہ 1667 (الترات العربی)

موسیٰ! اسے بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے۔“

۱۔ پس جب آپ وہاں گئے تو وادی میں آپ کی دائیں جانب سے ایک کنارے سے ندا دی گئی۔

۲۔ نوادی کے متعلق ہے۔ یعنی یہ مقام موسیٰ کے لیے اس حیثیت سے بابرکت ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا اور آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ عطا نے کہا ہے کہ مبارکہ سے مراد مقدس ہے (۱) ترکیب کلام میں من الشجرة من الشاطئ سے بدل اشتغال ہے۔ کیونکہ یہ اس کنارے پر آگاہ ہوا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے یہ سرسبز درخت تھا جو چمک رہا تھا۔ قیادہ، مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ عوج تھا، وہب نے کہا ہے یہ علق تھا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے یہ عذاب تھا۔ (2)

۳۔ اُن مفسرہ ہے جو نوادی کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ انہی میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاہ کو مفتوح اور ہاتھوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ (کہ اسے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے) سورۃ طہ میں فرمایا اِنَّا اَنَّا وَتُحْک (بلاشبہ میں ہی تیرا رب ہوں)۔ سورۃ نمل میں فرمایا اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (بے شک وہ اللہ ہی ہے) ہوں جو غالب حکمت والا ہے۔ (مذکورہ آیات میں الفاظ گونا گونا گوں مختلف ہیں لیکن مقصود ایک ہے۔ یہ یا تو روایت بالمعنی کے اعتبار سے ہے۔ یا پھر وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت تو مذکورہ تمام صفات ذکر فرمائیں۔ لیکن قرآن کریم میں بیان کرتے وقت ان میں سے بعض پر ہی اختصار کیا۔ جیسا کہ بعض دیگر مقامات پر بھی کلام میں یہ اختصار موجود ہے۔ مثلاً سورۃ طہ میں ذکر فرمایا اِنَّا اَنَّا لَشَدِيدُ الْعِقَابِ اِنَّكَ بِالْاَلْوَادِ الْاَبْدَانِ طٰوْمِ الْعِ وَمَا تِلْكَ بِبَيْتِكَ يَا مٰؤِسٰ اور سورۃ نمل میں فرمایا يٰمُؤْمِنُ رَاٰكَ تَعٰنِي فِي الْاَثَارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحٰنَ الْعِ (یعنی اس امر الفاظ تو مختلف ہیں مگر معانی سب میں ایک ہی مراد ہیں۔ جیسے روایت بالمعنی ہوتی ہے)۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاَهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا ۚ وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ
يُمَوِّلُ اَقْبَلُ وَلَا تَخَفْ ۚ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝

”اور (ذرا) ڈال دو (زمین پر) اپنے عصا کو اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو۔ آپ پیٹھ پھیر کر

چل دیے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! اسے آواز دو اور ڈرو نہیں یقیناً تم (ہر خطرہ سے) محفوظ ہو۔“

۱۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے پس آپ نے عصا ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا اور لہرا لے لگا۔ پس اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو، یعنی وہ حرکت کی تیزی اور اپنے اضطراب کی شدت میں چھوٹے سانپ کی مثل تھا۔ آپ اس سے پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ تو آواز آئی اے موسیٰ! اسے آواز دو اور ڈرو نہیں۔ یقیناً تم ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ ہو۔ کیونکہ میرے رسول کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں۔

اَسْلٰكَ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضًا ۖ وَمِنْ غَيْرِ سَوَءٌ ۚ وَاصْمُ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ

الرَّوْءِ ۚ قُلْ لَنْ يَبْرُءَالِهٰلِكَ مِنْ شَيْءٍ اِلٰى غُرْعَةٍ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْتُمْ كَانُوْا اَوْ مٰفِيْ سِقْدِيْنَ ۝

”ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں وہ نکلے گا سفید (چمکتا ہوا) بغیر کسی تکلیف کے۔ اور رکھ لے اپنے سینہ پر اپنا ہاتھ خوف دور کرنے کے لیے۔ تو یہ دو دلیلیں ہیں۔ تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں (کی طرف لے

جانے) کے لیے بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔“

۱۔ اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں داخل کیجئے ”شُخْرُجُ“ امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور ”بَيْضَاءُ“ تخرج کے معذوف مفعول سے حال ہے۔ یعنی تو اسے نکالے گا درآسمانیکہ وہ سفید چمکدار ہوگا۔ بغیر کسی تکلیف کے مِنْ غُرٍ مَوْءٍ بَيْضَاءِ کے متعلق ہے۔

۲۔ الزُّهْبُ میں حفص کے سوا کوئیوں اور اہل شام نے راہ کو مضموم اور حاء کو ساکن پڑھا ہے۔ حفص نے راہ کو مفتوح اور حاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو مفتوح پڑھا ہے۔ ان تمام لغات میں اس کا معنی خوف ہی ہے۔ عطائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیں تاکہ ان کا خوف ختم ہو جائے۔ اور آپ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ڈرنے والا جب اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیتا ہے تو اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔ (۱)

نہجائے نے کہا ہے جو بھی گھبرانے والا اپنے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ ملا لیتا ہے تو اس کی گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ جنات سے مراد مکمل ہاتھ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بازو ہیں۔ عصا کے سانپ میں تبدیل ہونے کے وقت جو سینے پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ اس سے مراد سکون، جرأت اور استقامت و ثبات ہے۔ گویا اس میں پرندے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ بھی خوف کی حالت میں اپنے پروں کو پھیلا لیتا ہے۔ اور جب امن اور اطمینان کی حالت ہو تو وہ انہیں سمیٹ لیتا ہے۔ (۲)

علامہ بخاری نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے تم اپنے خوف کو دور کر دو اور اپنے پہلو کو اپنے لیے نرم کر لو کیونکہ ڈرنے والے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل مضطرب ہوتا ہے اور بدن کا پ رہا ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی ہیں وَالْحُفُصُ جَنَاحُكَ لَمَنِ اتَّخَذَكَ مِنَ الْمَوْتِ مِثْقَلًا ۖ اور وَالْحُفُصُ لَهَا جَنَاحُكَ لَمَنِ اتَّخَذَكَ ۖ اس سے مراد ان سے نرمی کرنا ہے۔ فرائے نے کہا ہے کہ جنات سے مراد عصا ہے۔ تو معنی یہ ہوگا تم اپنا عصا اٹھا لو۔ اور زُہب سے مراد بنی حیر کی لغت کے مطابق آستین ہے۔ آسمانی نے کہا ہے کہ میں نے بعض عربوں کو یہ کہتے سنا ہے اَغْطِیْ بِمَافِیْ زُہْبِکَ اُنْیَ مَافِیْ کُفْکَ (یعنی جو کچھ تمہاری آستین میں ہے مجھ سے دو)۔ تو آیت کریمہ میں معنی یہ بنا کہ آستین سے نکال کر اپنا ہاتھ سینے سے لگا لو (۳) کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ فرمایا تھا۔ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ اس وقت وہ عصا کو پکڑے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ آستین میں تھا۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ”اَسْلُکْ یَذْکَ فِیْ جَنْبِکَ وَاضْمُکَ اِلَیْکَ جَنَاحُکَ“ میں عطف تفسیری ہے۔ یعنی دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر اور وضاحت بیان کرتا ہے۔ گویا دوسرے جملے سے بھی مقصود یہی ہے کہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو۔ اس نکرار سے مقصود دوسرا کو بیان کرنا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ جرأت اور ضبط نفس، خوف کا ازالہ اور قوت و ثبات کا اظہار۔ اور دوسری مفہوم اس قول سے مقصود ہے اَضْمُکَ اِلَیْکَ جَنَاحُکَ یعنی تمہارے وہ دونوں ہاتھ جنہیں تم نے سانپ سے بچنے کے لیے پھیلا ہوا ہے خوف کو دور کرنے کے لیے انہیں گریبان میں ڈالو۔ اور ان میں سے دوسری چیز ایک دوسرے مجرہ کا اظہار ہے۔ اور اس قول سے یہی مقصود ہے فُخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غُرٍ مَوْءٍ ۖ اور اس پر تو سورہ طہ میں موجود اللہ تعالیٰ کا ارشاد صراحتہ دلالت کرتا ہے وَاضْمُکَ اِلَیْکَ ۖ فِیْ جَنَاحُکَ تَخْرُجُ

بِجَمَاعَةٍ مِنْ غَيْرِ سَوَاءٍ اَيْ اُخْرَى

اسے یہ اشارہ عصا اور تھک کی طرف ہے۔ ابن کثیر اور ابن عمرو نے اس کی نون کو مشدود اور باقیوں نے مخفف پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے کہ البرہان کا معنی جیتہ (دلیل) ہے۔ اور برہن علیہ کا معنی حجت قائم کرنا ہے (۱)۔ اور اس کا وزن فَعْلَانٌ ہے۔ اور بعض نے اس کا وزن فَعْلَانٌ کہا ہے۔ اس کا مادہ البَوْفُ ہے۔ مثلاً جب کوئی آدمی سفید ہو جائے تو کہا جاتا ہے بَوْفُ الرَّجُلِ اور سفید عورت کے لئے بَوْرَهَاءُ اور بَوْرَهَاءُ کہا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ اَبْوَفَ کا معنی ہے اس نے دلیل قائم کی یا اس نے عجیب و غریب باتوں کا اظہار کیا اور لوگوں پر غالب آ گیا۔ (۲)

اسے یہ دونوں دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ بونہانی کی صفت ہے اور یہ شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ان دونوں کے ساتھ نہیں فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ یہ باتو برہانان کی صفت کے بعد دوسری صفت ہے۔ یا پھر یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی اَفْعَبَ بِجَمَاعَةٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاحِيہ (توان دونوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف جا)۔ بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ یہ جملہ لکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ حق رکھتے تھے کہ ان کی طرف رسول بھیجا جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَقْتُلُوْنِ ۝۳۱

”آپ نے عرض کی میرے رب! میں نے قتل کیا تھا ان سے ایک شخص کو پس میں ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے قتل نہ کر ڈالیں۔“
اَنْ یَقْتُلُوْنِ میں ضمیر مفعول محذوف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے اَنْ یَقْتُلُوْنِ۔

وَ اِنِّیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنْیْ لِسَانًا فَاَنْرِیْ سُلْطٰنًا مَّعِیْ رَاۤیْضًا فِتْنٰی اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ۝۳۲

”اور میرا بھائی ہارون وہ زیادہ فصیح ہے مجھ سے گفتگو کرنے میں۔ تو اسے بھیج میرے ساتھ۔ میرا مددگار بنا کر جسے تارکہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔“

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اس لیے کہا چونکہ منہ میں آگ کی چنگاری رکھنے کے سبب آپ کی زبان میں گرہ اور رکنت پڑ گئی تھی۔
۲۔ حفص نے معنی کی یاد کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

۳۔ مثلاً کہا جاتا ہے اَوْدَعْتُ یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ ترکیب کلام میں وِذًا اور سلہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ رد اصل میں اس شے کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مدد کی جاتی ہے۔ جیسے وِفْعٌ۔ نافع نے وِذًا کی دال کو بغیر حمزہ کے مفتوح پڑھا ہے۔ باقیوں نے دال کو ساکن اور حمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں دونوں کو ساکن پڑھا ہے۔

۴۔ عاصم اور حمزہ نے وِذًا کی صفت ہونے کی بناء پر یُضَدُّ فِتْنٰی کو مرفوع پڑھا ہے۔ یعنی رَدًا مصدقانی (میری تصدیق کرنے والا معاون و مددگار) اور دوسروں نے اسے جواب دعا ہونے کی وجہ سے مجزوم پڑھا ہے۔ اور اس میں ضمیر عائد ضمیر مرفوع ہے یعنی اگر تو اسے میرے ساتھ بھیجے گا تو وہ پختہ دلائل، شہادت کو ختم کرنے اور زبان کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ میری تصدیق کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کی توضیح و تقریر کے سبب قوم کا تصدیق کرنا ہے۔ لیکن فعل کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے اس لیے کہ آپ

قوم کی تصدیق کا سبب بنیں گے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ضمیر مرفوع فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی یہ ہے اگر تو ہاروں کو میرے ساتھ بھیجے تاکہ ہاروں کی حسن تقریر کے سبب فرعون میری تصدیق کرے۔

۵۱ "ایٰی" میں نافع، امین، کثیر اور ابو عمرو نے یا کو مفتوح اور باقیوں نے یا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور "اَنّٰی یُکَذِّبُوْنِی" کو جمہور نے حذف یا کے ساتھ پڑھا ہے اور دوش نے حالت وصل میں یا کو قائم رکھا ہے، یعنی یکذبونی۔ معنی یہ ہے میں ڈرتا ہوں کہ فرعون اور اس کی قوم مجھے جھٹلائیں گے کیونکہ ضرورت کے وقت میری زبان میرا ساتھ نہیں دیتی۔

قَالَ سَتَشِدُّ عَصَدَكَ بِأَخِيكَ وَتَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ إِلَيْكُمَا
بِأَيَّتِنَا أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ ۝

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم مضبوط کریں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے لے اور ہم عطا کریں گے تمہیں ایسا غلبہ (اور شوکت) کہ وہ تمہیں (اذیت) نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہماری نشانیاں کے باعث تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب آئیں گے۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط اور قوی کر دیں گے۔ بازو کو مضبوط کرنے سے مراد تقویت دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی قوت کا انحصار کسی کام کو سرانجام دینے میں اس کے ہاتھ کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے بد (ہاتھ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ہاتھ کی قوت بازو کی قوت سے ہوتی ہے۔ اور ان دونوں مصرعوں میں تھے۔

۲۔ اور ہم تمہیں ایسا غلبہ یا حجت عطا کریں گے کہ فرعون اور اس کی قوم تمہیں ہماری نشانیاں کے سبب کوئی اذیت نہیں پہنچا سکیں گے۔ ۳۔ یا یہ فعل مہذوف کے متعلق ہے یعنی اذہبا بایشنا (تم ہماری نشانیاں لے کر جاؤ) یا پھر یہ تَجْعَلُ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم تمہیں ایسے معجزات عطا کریں گے جو تمہیں دشمن پر غلبہ عطا کر دیں گے۔ یا یہ لَا يَصِلُوْنَ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم اپنی نشانیاں یعنی معجزات کے سبب فرعون اور اس کی قوم کو روک رکھیں گے وہ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ یا پھر یہ قسم ہے اور اس کا جواب لَا يَصِلُوْنَ ہے۔ یا یہ غَالِبُونَ کا بیان ہے۔ یا تو یہ اس کے درمیان صلہ ہے یا یہ اس کے لیے صلہ کے معنی میں ہے جب کہ اس میں تعریف (معرف) کے لیے ہے نہ کہ یعنی الذی ہو۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسٰی بِآيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّقْتَرٰى وَمَا سَمِعْنَا
بِهٰذَا اِفَّاۤی اٰبَآئِنَا اَوْ لٰوْنِیْنَ ۝

"پھر جب آئے فرعونوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری روشن نشانیاں لے کر۔ انہوں نے کہا نہیں ہے یہ مگر جادو مگر اہوا۔ اور ہم نے نہیں سنی اس قسم کی باتیں اپنے پہلے آباء اجداد کے زمانہ میں لے"

۱۔ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ نقد پر کلام اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کی طرف واضح اور روشن نشانیاں یعنی عصا اور ید بیضاء لے کر آئے پس جب آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا یہ عصا اور دیگر نشانیاں نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو۔ جس کی مثل اس سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ یا یہ جادو ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کرتے ہیں پھر اس کی جھوٹی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر

دیتے ہیں۔ یا یہ جادو بھی جادو کی دوسری تمام قسموں کی طرح گھڑا ہوا اور جھوٹا ہے۔ اور ہم نے اس جادو یا دعویٰ نبوت کے بارے اپنے پہلے آباء و اجداد کے مانہ میں نہیں سنا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّيَ أَعَلِمَ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٥﴾

”اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو اس کی بارگاہ سے (نور) ہدایت لے کر آیا ہے

لے۔ اور وہی جانتا ہے کہ اس کا انجام اچھا ہوگا۔ بے شک با مراد نہیں ہوتے ظلم و ستم کرنے والے مع۔“

لے دیتی ہے میں نافع، امن کثیر اور ابو عمرو نے یاہ کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ (اور موسیٰ علیہ السلام) نے کہا میرا رب تمہاری نسبت اسے خوب جانتا ہے۔ جو اس کی بارگاہ سے نور ہدایت لے کر آیا ہے۔ پس وہ جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور تم باطل پر ہو۔ تم ظلم و زیادتی کی بناء پر حق کا انکار کرتے ہو حالانکہ وہ روشن علامات کے ساتھ واضح ہو چکا اور تمہارے نفس اندرونی طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں۔ اس کا عطف قالو پر ہے۔ اور مقصود دونوں قولوں کو بیان کرتا ہے تاکہ وہ دونوں میں غور و فکر کر کے صحیح کو قول فاسد سے ممتاز کر سکے۔ امن کثیر نے واو عطف کے بغیر قال موسیٰ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں اسی طرح ہے۔ کیونکہ یہ ان کے کلام کے جواب میں ہے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ ان کے جواب میں فرمایا وہ نیا کلام ہے۔

وَمَنْ تَكُونُ عَاقِبَةُ الدَّارِ اور کسائی نے یاہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تاء کے ساتھ۔ چونکہ اس کا مسند الیہ مؤنث غیر حقیقی ہے لہذا اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔ اس جملہ کا عطف مَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جس کا انجام دار آخرت میں اچھا ہوگا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ دار سے مراد دنیا ہے اور اس کا انجام اصل تو جنت ہے۔ کیونکہ دنیا کو آخرت کی بھٹی قرار دیا گیا ہے آخرت میں اسی پر جزا دی جائے گی۔ اس کا مقصود حقیقی تو ثواب ہے اور عقاب (سزا) مقصود بالعرض ہے (۱) اور محققین نے کہا ہے کہ عقیبی اور عاقبہ کا اطلاق اس ثواب اور جزاء پر ہوتا ہے جو نیکیوں پر دیا جائے گا۔ اور عقاب، عقوبہ اور معاقبہ اس سزا کو کہا جاتا ہے جو برائیوں اور گناہوں پر دی جائے گی۔ یعنی عقیبی اور عاقبہ اچھے انجام کو کہتے ہیں اور عقاب، عقوبہ اور معاقبہ برے انجام کو۔ مثلاً رب کریم نے فرمایا: **مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ**۔ فَحَقُّ عِقَابٍ، حَبِيدُ الْعِقَابِ، وَإِنْ عَاقَبْتُمْ لَعَاقِبْنَاهُمْ بِشَيْءٍ مِمَّا كَفَرْتُمْ بِهِ۔ بے شک ظلم و ستم کرنے والے دنیا میں ہدایت کے ساتھ اور آخرت میں حسن و ثواب کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي ۚ فَأَوْقِدْ لِي يَا هَٰذَا الْمَلَأُ النَّارَ ۚ فَاغْلُظْ ۚ فَقَالَ إِبْرَاهِيمُ إِنَّكَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٦﴾

”یہ (سن کر) فرعون نے کہا اے اہل دربار! میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور خدا ہے۔ پس آگ جلا

میرے لیے اے ہامان! اور اس پر ایشیں پکوا میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کر۔ شاید (اس پر چڑھ کر) میں سراغ لگا

سکوں موسیٰ کے خدا کا۔ اور میں تو اس کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے مع۔“

۱۔ فرعون نے اپنے سوا کسی اور اللہ کے علم کی نفی کی ہے۔ وجود کی نفی نہیں کی، کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی پختہ دلیل نہیں تھی جو اسے عدم وجود کا یقین دلاتی۔ اسی لیے اس نے کہا کہ پس اے ہامان! میرے لیے آگ جلا۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا۔ فرعون نے اسے کہا تھا میرے لیے ایشیں بکوا۔ کہا جاتا ہے یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ایشیں بکوا کر ان سے عمارات تعمیر کرائی۔ ”یٰۤاَیُّهَا صُورُخَا“ پس میرے لیے انتہائی اونچا محل تعمیر کر۔

۲۔ اے یہ وہم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا خدا آسمان میں ہے اور اس تک چڑھنا ممکن ہوگا۔

۳۔ میں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ یہ کہنے میں جھوٹے ہیں کہ زمین و آسمان کا خالق ایک ہے۔ چونکہ فرعون دیر ہی تھا اس لیے وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا تھا کہ تمام ممکنات کی نسبت یہ حیثیت خلق واجب کی طرف کرنا درست ہے۔ بلکہ اس کا خیال یہ تھا کہ جو بھی سلطان دوسروں پر غالب ہو وہی اللہ ہے اور عبادت کا مستحق ہے۔ صُورُخَا میں توین حکیم تعظیم کے لیے ہے۔ اور لعلی میں کوئیوں نے یاہ کو ساکن اور بایقوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہامان نے پچاس ہزار افراد کا کام کرنے والے جمع کیے۔ متعین، مغرور و ایشیں اور چونا پکانے والے ہلکڑی کا کام کرنے والے اور کھل بنانے والے ان کے سوا تھے۔ انہوں نے انتہائی بلند بالہ اور مضبوط پختہ عمارت کھڑی کر دی یہاں تک کہ وہ اتنی بلند تھی کہ اس سے قبل کسی کی عمارت بھی اس کی بلندی کی ہم نگیں پہنچ سکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں انہیں آزمائے اور قند میں جلا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پس جب وہ تعمیر سے فارغ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کے افراد اس کے اوپر چڑھے۔ تو اس نے انہیں تیر بھینکنے کا حکم دیا۔ پس جو بھی تیر آسمان کی طرف پھینکا جاتا تو وہ خون آلود ہو کر واپس آتا۔ یہ دیکھ کر فرعون نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کو قتل کر دیا (نعوذ باللہ من ذالک) فرعون عربی گھوڑے کے ذریعے اس پر چڑھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے غریب انقلاب کے وقت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ پس اس نے اسے اپنا پر مار کر تین ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔ ان میں سے ایک فرعون کے لشکر پر جا کر اس سے لاکھوں افراد مارے گئے، ایک سمندر میں جا کر اور ایک ٹکڑا مغرب میں۔ اور جس نے بھی اس کام میں حصہ لیا تھا وہ باقی نہیں بچا بلکہ ہلاک ہو گیا۔ (۱)

وَأَسْتَكْبِرُ هُوَ وَجُنُودُهُ كَذٰلِكَ لَا تَرْضٰ لِبَعْدِ الْحَقِّ دَعْوَتُوْا اَنَّهُمْ اَلَيْسَ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۳۱

”اور تکبر کیا اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق لے اور وہ یہ گمان کرتے رہے کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹنا پڑے گا۔“

۱۔ اور بغیر استحقاق کے اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں تکبر کیا۔ کیونکہ بڑائی کے اظہار کا حق اسے ہے جس سے اوپر یا اس کی مثل بلکہ اس سے کچھ کم بھی اور کوئی بڑا نہ ہو۔ اور یہ وصف صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے جو اپنے سوا ہر شے کا خالق ہے۔ پس وہی حقیقت میں بڑا ہے بلکہ کبریائی میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”اَلْكِبْرِيَاءُ وَدَعَائِي وَالْعَظَمَةُ اِذَا رِىَ فَمَنْ نَّازَعْنِيْ فِيْ وَاحِدٍ مِّنْهَا فَلَقَدْ فُتِنَ فِيْ النَّارِ“ (بڑائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے پس جس نے بھی ان میں سے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے جہنم میں بھیجوں گا۔) اسے احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے (۲)۔ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں ”اَلْكِبْرِيَاءُ وَدَعَائِي فَمَنْ نَّازَعْنِيْ فِيْ دَعَائِي فَصُمْتُ“ (کبریائی میری چادر ہے پس جس نے میری چادر مجھ

سے چھیننے کی کوشش کی میں اسے توڑ دوں گا (یعنی ہلاک کر دوں گا) اور اسی حدیث کو سونی نے ابو سعید اور ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ”الْكَفْرُ بِنَاءٌ ذِي فِعْلِ وَالْعُرْ إِذَا رُفِعَ فَمَنْ نَازَعَ عَنِّي شَيْءٌ مِّنْهُمَا عَذْبُهُ“ (کفر یا کی میری چادر ہے اور عزت میری ازرا پس جس کسی نے ان میں سے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے عذاب دوں گا)

یہ لفظ عَذْبُون میں نافع، یعقوب، حمزہ اور کسائی نے یا کو مفتوح اور جیم کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل مجرد اور معزوف ہے۔ اور باقیوں نے یا کو مضموم اور جیم کو مفتوح پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل مجہول ہے اور ار جارح سے ماخوذ ہے۔

فَاَخَذْنَاهُ وَجُودَهُ فَتَبَدَّلْنَاهُ فِي الْبَيْمِ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٢٠﴾

”پس ہم نے پکڑ لیا اسے اور اس کے لشکریوں کو اور پھینک دیا انہیں سمندر میں۔ دیکھو! کیسا ہولناک (انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا)۔“

لے پس ہم نے اسے اور اس کے لشکریوں کو پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ دیکھو! کیسا ہولناک انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا۔ لہذا آپ اپنی قوم کو اس قسم کے عذاب سے ڈرائیے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اٰيَةً يُّدْعَوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُونَ ﴿٢١﴾

”اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلارہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف لے اور روز حشر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔“

لے اور ہم نے انہیں گمراہ لوگوں کا پیشوا بنادیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرنے پر برا بھلا کرتے تھے۔ یا ہم نے انہیں مال و جاہ عطا کر کے دنیا میں پیشوا اور سردار بنادیا۔ جو لوگوں کو آگ کی طرف بلارہے تھے۔ یعنی کفر اور گناہوں کے ایسے اسباب کی طرف جو انہیں جہنم میں ڈالے جانے کا موجب تھے۔ ترکیب کلام میں يَدْْعَوْنَ النِّمَّةَ کی صفت ہے۔ اور قیامت کے دن ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔ اس کا عطف بدعوں پر ہے۔

وَاتَّبَعْنَاهُمْ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُورِيْنَ ﴿٢٢﴾

”اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا۔“

لے اور ہم نے انہیں رحمت سے دور بھگا تے ہوئے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی۔ یا ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت کرنے والوں کی لعنت لگا دی۔ کہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور مومنین ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اس کا عطف جعلنا پر ہے۔ اور وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ مقبورین کے متعلق ہے (اور قیامت کے دن ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا)۔ تبصرہ ص ۱۷۷ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں رحمت سے دور کر دیا گیا ہے اور ان پر لعنت کی گئی ہے۔ ابو سعید نے کہا ہے یہ وہ ہیں جنہیں ہلاک کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی شکلوں کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے چہرے سیاہ ہیں اور آنکھیں نیلی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے قبحہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بد صورت بنادیا۔ اسی معنی میں یہ بھی کہا جاتا ہے شوہہ اللہ۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہر قسم کی بھلائی اور خیر سے دور کر دے تو کہا جاتا ہے قبحہ قبحا و قبحا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٠﴾

”اور ہم نے دی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اس کے بعد کہ ہم نے ہلاک کر دیا تھا پہلی (نافرمان) قوموں کو۔ (یہ کتاب) لوگوں کے لیے بصیرت افزا اور ہدایت و رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

۱۔ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ کلام مخدوف قسم کا جواب ہے اور مَا أَهْلَكْنَا میں ماصدریہ ہے۔ ”الْقُرُونَ الْأُولَىٰ“ سے مراد حضرت نوح، عیسیٰ، صالح اور لوط وغیرہ کی قوم ہے اور ”بَصَائِرَ لِلنَّاسِ“ الکتاب سے حال ہے۔ یعنی اس حال میں کہ یہ کتاب بصیرت کا سبب تھی۔ بَصَائِرَ بصیرت کی جمع ہے۔ اور بصیرت سے مراد دلوں کا نور ہے جس کے ساتھ قلوب بشری طاقت کے مطابق اشیاء کی حقائق یعنی واجب اور ممکن ہونے کو دیکھ سکتے ہیں اور حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے مابین تمیز کر سکتے ہیں۔

۲۔ اور سرِ پادایت تھی۔ یعنی وہ اس کے سبب راہِ نجات کی طرف راہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ اور اس میں دنیا و آخرت کے امور کی اصلاح موجود تھی۔ اور سرِ پادایت تھی۔ یعنی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ تھی اگر وہ اس سے رحمت حاصل کرتے۔ یا یہ ایسی کتاب تھی جو ان پر اللہ تعالیٰ کی ازلی رحمت ہونے کا تقاضا کرتی تھی۔

۳۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ یا پھر وہ اس حال میں ہو جائیں کہ ان سے نصیحت قبول کرنے کی امید رکھی جاسکے۔ کیونکہ نصیحت قبول کرنا اور خشیت کا ہونا بے دونوں علم کے ثمرات ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَا اِلَىٰ مُوسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ ﴿٥١﴾

”اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف رسالت کا (حکم) بھیجا اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے۔“

۱۔ اور آپ موسیٰ علیہ السلام کے مقام یعنی طور سے مغربی سمت میں نہیں تھے۔ قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ آپ مغربی پہاڑ کی جانب نہیں تھے۔ اور بجلی نے کہا ہے کہ آپ مغربی وادی کی سمت نہیں تھے (۱)۔ ان تمام کی مراد یہ ہے کہ اس میں صفت موصوف کی طرف مضاف نہیں بلکہ موصوف مخدوف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب سے شرف ہم کلامی حاصل ہوا (۲)۔ اور کُنْتَ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی اے محمد! آپ وہاں حاضر نہیں تھے۔ جب ہم نے وحی فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ آپ فرعون اور اس کی قوم کے لیے رسول ہیں۔

۲۔ اور آپ گواہوں میں شامل نہیں تھے۔ یعنی آپ ان کی طرف وحی کے نزول کے وقت حاضر نہیں تھے یا پھر آپ ان کی طرف نازل ہونے والی وحی پر گواہوں میں سے نہیں تھے۔ اور شاہدین سے مراد وہ سزاخوار ہیں جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر لے جانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یعنی آپ کا موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی خبر دینا یا اخبار بالغیب ہے۔ جس پر اطلاع وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ پس یہ آپ کے لیے معجزہ ہے اور آپ کے دعویٰ نبوت پر مضبوط دلیل ہے۔ اسی لیے استدراک اپنے اس قول سے فرمایا۔

وَلَكِنَّا اَشْنَاكَ قُرْآنًا قَطْوًا وَلَعَلَّهُمْ الْعَمَىٰ وَمَا كُنْتَ اَوْ يَانِ اَهْلَ مَدْيَنَ

تَشَلُّوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِنَا وَلَکِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۝

”لیکن ہم نے پیدا فرمائیں کئی قومیں (یعنی بعد دیگرے) اور کافی لمبا عرصہ گزر گیا ان پر (اور انہوں نے عہد خداوندی بھلا دیا)۔ اور آپ اہل مدین میں مقیم نہ تھے۔ تاکہ آپ پڑھ کر سنا سکتے ہوں انہیں ہماری آیتیں، لیکن ہم ہی رسول بنا کر بھیجے والے تھے۔“

لیکن ہم نے کئی قومیں پیدا فرمائیں، یعنی ایسے افراد پیدا کیے جو یا ہم ہم عصر تھے۔ یا مختلف اہل زمانہ کو پیدا کیا۔ اس اعتبار سے قرن کا معنی زمانہ ہے اور اس سے پہلے مصافحہ مذکور ہے۔ یعنی اہل قرون۔ لیکن ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے بعد کہ بہت سا زمانہ بغیر کسی نبی اور رسول کے گزر چکا تھا، علوم ختم ہو چکے تھے، ماقبل شریعتوں کے احکام تبدیل ہو چکے تھے اور خبر وہی میں اضطراب اور تعارض پیدا ہو چکا تھا اس لیے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد مختلف قوموں کو پیدا کیا تھا اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا۔ اور وہ یا ہم ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور ایک دوسرے کو جھڑپانے لگے۔ لہذا یہاں مستدرک کو حذف کر کے اس کے قائم مقام سبب کو رکھ دیا گیا۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے حضور نبی رحمت ﷺ پر ایمان لانے اور علاوہ ازیں کئی دیگر عہد بھی لیے۔ لیکن جب مدت دراز گزر گئی اور کئی بعد دیگرے کئی قومیں پیدا ہوئیں، تو وہ ان معابدوں کو بھول گئیں اور انہیں پورا کرنا انہوں نے چھوڑ دیا (۱)۔ پس اس اعتبار سے آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس وقت حاضر نہ تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے آپ کے بارے میں عہد لیا۔ اور وہ عہد آپ کی استعا پر نہیں لیا گیا۔ بلکہ وہ تو محض ہماری جانب سے فضل تھا اور علت یہ تھی کہ آپ کے مخالفین کا عذر رکھنا ختم ہو جائے۔ لیکن جب ہم نے کئی بعد دیگرے کئی قومیں پیدا فرمائیں اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا تو وہ اس عہد کو بھول گئے۔ اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ **وَ اِذَا اَخَذْنَا مِثٰکَ مِنْ بَیْنِیْ وَ اَنتَ مِنْ عَلٰہِمْ رَہِمَہُمُ الٰہِی قَوْلَہٗ اَنْ تَشْفُوْا لَیْسَ لَہٗمُ الْغٰفِلِیْنَ**۔

اے اور آپ اہل مدین میں مقیم نہیں تھے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام ان میں مقیم تھے۔ تاکہ آپ انہیں وعدے اور وعیدیں سنا کر نصیحت کرتے ہو۔ ترکیب کلام میں **تَشَلُّوْا عَلَیْہِمْ مَحْشٰتِی** کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ قلوب مالکی خمیر سے حال ہے۔ مقال ہے لے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے آپ اہل مدین میں حاضر نہیں تھے کہ آپ اہل مکہ کو ان کی خبریں بتا رہے ہو۔ لیکن ہم ہی آپ کو اہل مکہ اور دوسرے تمام لوگوں کی طرف معجزات اور اخبار غیبیہ کے ساتھ بھیجے والے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ انہیں ان واقعات سے آگاہ نہ کر سکتے۔

وَمَا کُنْتُ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادٰیْنَا وَلٰکِن رَّحِمَۃٌ مِّنْ رَّبِّکَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَلٰہُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّہُمْ یَتَذٰکُرُوْنَ ۝

”اور آپ (اس وقت) طور کے کنارہ پر بھی نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) ندا فرمائی۔ لیکن یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے۔ (کہ اس نے آپ کو ان حالات پر آگاہ کر دیا)۔ تاکہ آپ (قہر الہی سے) ڈرائیں اس قوم کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے شاید وہ نصیحت قبول کریں۔“

۱۔ اور آپ اس وقت اس طور پہاڑ کے کنارے پر نہیں تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی عطا فرمایا۔ جب ہم نے انہیں ندا فرمائی کہ اس کتاب کو قوت و مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو **خُذُوا الْكِتَابَ يٰمُوسٰى**۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو قورات عطا فرمائی اور ما کنت بجانب الغربی سے مراد آپ کو نبوت عطا ہونے کا وقت ہے۔ وہب نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے محمد ﷺ کا دیدار کرادے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم ہرگز ان تک نہیں پہنچ سکو گے اور تم چاہو تو میں ان کی امت کو ندا دوں اور تمہیں ان کی آواز سنو دوں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! ضرور۔ تو رب کریم نے امت محمدیہ کو ندا دیتے ہوئے فرمایا اے محمد (ﷺ) تو انہوں نے اپنے آپاء کی صلیوں سے اس آواز پر لبیک کہی۔ ابوزرعیہ بن عمرو بن جریر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ندا فرمائی اے محمد ﷺ کی امت میں نے تمہاری دعا کو قبول فرمایا اس سے قبل کہ تم مجھ سے دعا مانگو اور میں نے تمہیں عطا فرمادیا اس سے پہلے کہ تم مجھ سے سوال کرو۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ کی امت! تو انہوں نے آیاء کی صلیوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا **لَيْسَكَ اِنَّ الْخَمْدَ وَالْغَمَّةَ لَكَ وَالْمَلِكُ لَكَ لَا خَرْيَكَ لَكَ**۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے احمد ﷺ کی امت۔ بے شک میری رحمت میرے غضب پر اور میری معافی میری سزا پر سبقت لے گئی میں نے تمہارے سوال کرنے سے پہلے تمہیں عطا فرما دیا تمہارے دعا مانگنے سے پہلے میں نے اسے قبول کر لیا اور میں نے تمہاری مغفرت فرمادی اس سے قبل کہ تم میری نافرمانی کرو۔ جو یہ شہادت دیتے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہوگا **"اَلَا اَللهُ اِلَّا اللهُ وَاِنِ مُحَمَّدًا عَبْدِي وَرَسُولِي"** (کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اللہ نہیں اور محمد ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں) وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس کے غناہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں (۱)۔ لیکن ہم نے آپ پر رحمت فرمائی اور یہ آپ کے رب کی بخش رحمت ہے کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا، آپ کی طرف وحی فرمائی اور آپ کو معصیت سے آگاہ کیا یا ہم نے آپ کو بھیجا یا ہم نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ تو یہ آپ کے رب کی رحمت ہے۔

۲۔ **لَنْتَلِذَ اِسْ فَلَ مَذْرُوفٍ** کے متعلق ہے جو کہ حصفہ کے قول کو نصب دے رہا ہے۔ یعنی وحشناک یا ارمناک یا علمناک **لَنْتَلِذَ**۔ **مَآ اَتَهُمْ قَوْمًا كِى صَفْتِ** ہے اور **"مَنْ لَنْفِذٍ"** اتاہم کا فاعل ہے اور اس سے پہلے جن زائدہ ہے قوم سے مراد اہل مکہ ہیں کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اہل مکہ کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسروں کی دعوت فقط بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

۳۔ تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔ اس کا تعلق قول باری تعالیٰ **لَنْتَلِذَ** سے ہے۔

وَلَوْلَا اَنْ تُصِيبَهُمْ مُّصِيبَةٌ مِّمَّا قَدْ مَتَّ اَيُّنَ يُّهْمُ فَيَقُولُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَنْزَلْتَ
اِلَيْنَا سُرُوْلًا فَتَنْبِئُ الْاَيْتَانَ وَنَكُوْنُ مِنَ الْمُوْثِقِيْنَ ۝۵۰

"(اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب پہنچے انہیں کوئی مصیبت ان اعمال کے باعث جو انہوں نے کیے ہیں۔ تو وہ یہ نہ کہیں لگنیں کہ اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تاکہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی۔ اور ہم ہو جاتے ایمان لانے والوں سے۔"

۱۔ جب انہیں کوئی عذاب اور تکلیف پہنچے اس کفر اور گناہوں کے سبب جو انہوں نے کیے۔ چونکہ اکثر اعمال ہاتھ کی کوشش اور محنت سے ہوتے ہیں اس لیے اکثر اور اغلب اعمال کی نسبت ہاتھوں کی طرف کی جاتی ہے۔ اگر چہ جان میں سے بعض دل کے افعال ہوتے ہیں۔

۷۔ فَيَقُولُوا يَا مَعْصُومُ اسْ كَافِرٌ اِس کا عطف نصیب نہ ہوا ہے۔ اور فاعلیہ کے ساتھ عطف کرتا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے تاکہ یہ یہ لوگ ان کے جواب کے انکار کا سبب نہ ہو جائے۔ اور ان سے یہ قول صادر نہیں ہوگا مگر انہیں عذاب پہنچنے کے بعد فتنے اس لیے منصوب ہے کیونکہ یہ لوگ جو کہ شخص کے لیے ہے اور مشابہ بالا مر ہے کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ”هَلَّا كَانَ مِنْكَ اِذَا سَأَلَ رَسُوْلُ الْاِيْمَانِ فَاَتٰبَاعًا مِّنْهُ“ کیونکہ انہیں تیری طرف سے ہماری طرف کوئی رسول بھیجا گیا کہ ہم بیروی کرتے تیری آیات کی۔ اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جاتے۔ اس کا عطف نصیب پر ہے۔

ہے۔ لہٰذا جواب مخدوف ہے۔ معنی یہ ہے۔ اگر ان کے کفر اور گناہوں کے سبب انہیں عذاب پہنچنے کے بعد ان سے اس قول کا خدشہ نہ ہوتا "وَمَا نُنَبِّئُكَ أَنَّ هَٰذَا مُلْكُ اللَّهِ" اے ہمارے رب اتنے ہمارے طرف کیوں نہیں رسول بھیجا جو ہمیں تیری آیات کی تبلیغ کرتا تو ہم ان کی پیروی کرتے اور ہم تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جاتے۔ تو ہم آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر نہ بھیجتے۔ اور ہم انہیں ان کے کفر کے سبب۔ عذاب سے پیشگی ڈرانے سے قیل ہی عذاب میں مبتلا کر دیتے۔ لیکن ہم نے تو آپ کو ان کی طرف مبعوث کیا تاکہ ان کے منہ خشم ہو جائیں اور ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ لَوْلَا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ ۚ بَعْدَ الْوَسْطِ۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا الْوَيْلَ لَنَا مِنْ مِثْلِ مَا أُوتِيَ مُوسَى ۖ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوا اسْحَبْ مِنْ طَهْرًا ۗ وَقَالُوا لَئِنْ لَمْ يَنْصُرُنَا اللَّهُ لَبِئْسَ لَنَا الْبَرَاءُونَ ﴿٥٠﴾

”بھرجب آگیا ان کے پاس حق ہماری جناب سے تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیے گئے انہیں اس قسم کے معجزے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے۔ (ان تابکاروں سے پوچھو) کیا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا ان معجزات کا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ان ہی نے کہا (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) جا دو اگر ہیں جہاں ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ نیز انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان تمام انکار کر رہے ہیں۔“

۱۔ پھر جب ان کے پاس حق آگیا۔ یعنی قرآن کریم یا حضرت محمد ﷺ ایسے رسول بن کر جن کی تصدیق قرآن کریم کے ساتھ کی گئی۔ ہماری جانب سے تو کفار مکہ نے سرکشی اور ضد کی بنا پر کہا آپ ﷺ کو اپنے حجرات کیوں نہیں عطا کیے گئے جیسے حجرات موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے۔ مثلاً عصا، بیضا۔ یا یہ مکمل کتاب ایک ہی بار کیوں نہیں نازل کی گئی جیسے موسیٰ علیہ السلام کو رات ایک ہی بار دے دی گئی تھی۔ یہ جملہ سابقہ جملے کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر کا یہ ہے وَلَٰكِنْ بَعَثْنَاكَ إِلَيْهِمْ قَطْعًا لَا عَيْدَ لَهُمْ وَالْزَّامَةُ لِلْحُجَّةِ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ اِلْحَاحُ لَوْلَا هَذَا كَلَامِ مَعْنٰی میں ہے۔

۷۔ کیا انہوں نے قرآن سے پہلے جو معجزات موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ان کا انکار نہیں کر دیا تھا؟ یہ استفسار اٹکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ واذ عاقرہ ہے اور اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کا یہ ہے اَنَّمْ یُکَذِّبُواْ مُؤَسًّی وَاَوْحٰی مُؤَسًّی۔ یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہوں نے ان معجزات کا انکار

کیا جو اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ تو یہ آپ سے کیسے ان کی مثل معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے؟ یعنی رائے اور مذہب میں وہ بھی ان ہی (کفار مکہ) کی جنس سے تھے۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافر تھے جنہوں نے ان معجزات کا انکار کیا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ بکلی نے کہا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو مدینہ طیبہ کے یہودی علماء کی طرف بھیجا۔ پس انہوں نے ان سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے پوچھا تو انہوں نے انہیں بتایا کہ آپ کی تعریف و توصیف ان کی کتاب تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے واپس آ کر اہل مکہ کو یہودی علماء کی باتوں سے آگاہ کیا (۱)۔ تو اہل مکہ نے موسیٰ علیہ السلام اور انہیں دیے گئے معجزات کا انکار کر دیا۔

سید بختیاریؒ کو بھارہ، بلخ، اور شام کے قراء نے اسے اسم قائل کے وزن پر منجوز ان پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام لیتے ہیں (کہ یہ دونوں جادوگر ہیں) اور کوفیوں نے بختیاریؒ کو کسور اور حاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے اضاف محذوف ہے۔ یا انہوں نے ان دونوں کو مبالغہ کے طور پر جادوئی کہہ دیا۔ یا انہوں نے سحرین سے مراد تورات اور قرآن لیا ہے۔ جبکہ بکلی کے علاوہ دوسروں نے یہ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافروں نے کہا یہ دونوں یعنی موسیٰ اور ہارون جادوگر ہیں۔

یہ دونوں یعنی محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی کتابیں ایک دوسرے کے موافق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ یا پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہما السلام باہم ایک دوسرے کے تعاون کر رہے ہیں۔ اور کفار مکہ نے یا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے کافروں نے کہا ہے شک ہم ان دو میں سے ہر ایک کا یا انبیاء میں سے ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔ بکلی کا قول اس مفہوم کے زیادہ مناسب ہے جس کا تقاضا ساق کلام کرتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔

قُلْ قَاتِلُوا إِيَّائِي يَكُنْ مِنَ عِدَّةِ اللَّهِ هُوَ أَلْهُدَىٰ مِنْهُمْ أَسْبَغَ إِنَّ لَكُمْ صِدْقَيْنِ ۝

”آپ فرمائیے تم لے آؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو زیادہ ہدایت بخش ہو ان دونوں (قرآن و تورات) سے لے لو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو۔“

۱۔ اے محمد ﷺ آپ فرمائیے۔ اے اہل مکہ! لے آؤ۔ یہ فائدہ مند شرط کے جواب میں ہے۔ یعنی اگر تم قرآن اور تورات دونوں کتابوں کا انکار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں تو لے آؤ۔ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہو یعنی قرآن اور تورات کی نسبت جو کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ کلام میں ان دونوں کو ضم کر رکھا۔ کیونکہ معنی ان پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ اَلْجَنَّةُ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ یعنی اگر تم ایسی کتاب لے آؤ گے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہوگی تو میں اس کی پیروی کروں گا۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں۔ اور جو انہیں لے کر آئے ہیں وہ جادوگر ہیں۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر باقی کلام دلالت کرتا ہے۔ اور وہ فائدہ دہا ہے۔ اور یہ ایسی شرط ہے جس سے مراد التزام دینا اور انہیں لا جواب کرنا ہے۔ اور حرف شک تو ان سے استہزاء اور تحکم کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا يُفِيدُ شَيْئًا وَهُمْ مُّقِرُّونَ ۝
 هُوَ الَّذِي يُهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

”پس اگر وہ قبول نہ کریں آپ کے اس ارشاد کو کہ تو جان لو کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔“

اے پس اگر وہ ہدایت بخش کتاب لانے کی تمہاری دعوت کو قبول نہ کریں۔ اس میں مفعول معلوم ہونے کی وجہ سے محذوف ہے۔ فعل استجابہ دعاء کی طرف بذات خود بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ اور ذامعی (بلانے والا) کی طرف لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ اور جب اس کی طرف متعدی ہوتا ہے تو اکثر دعا (دعوت) محذوف ہوتی ہے۔ اور معنی یہ ہوگا اگر وہ ہدایت بخش کتاب نہ لائیں۔ اے تو جان لیجئے انہیں الزام دے دیا گیا اور ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہوتی تو وہ ضرورت کے وقت اسے ضرور پیش کرتے۔

یعنی اس سے زیادہ گمراہ کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اس میں بغیر ہڈی مِنَ اللہ تاکید یا تہقید کے لیے حال کے محل میں ہے۔ کیونکہ کبھی خواہش نفس بھی حق کے موافق ہو جاتی ہے جب آدمی کا ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ نَبْعًا لِّمَا جُنْتُ بِهِ“ (تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کے تابع ہو جائے جو میں نے لے کر آیا ہوں۔ 1X)۔ اسے بغوی نے شرح السنہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے۔ اور امام ندوی نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ان لوگوں کو جو خواہش نفس کی پیروی میں منہمک ہونے کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

”اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

اے فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے۔ ہم قرآن کریم کی آیات کیے بعد دیکھ کر مسلسل نازل کرتے رہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ترکیب کلام میں یہ وصلنا کے متعلق ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ تسلسل آیات نازل کرنے میں ہے تاکہ مسلسل یاد دہانی ہوتی رہے۔ یا پھر اس سے مراد نظم قرآن میں تسلسل کا ہونا ہے تاکہ دعوت حجت کے ساتھ، چند موعظت و وعد و وعید کے ساتھ اور نصائح عبرتوں کے ساتھ پختہ اور مضبوط رہیں (3)۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ التوصل ہے مراد اتصال کا کثرت سے اور بار بار ہونا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے وَصَّلْنَا كَمَا مَعْنَىٰ هِيَ (4)۔ (یعنی ہم نے واضح طور پر بیان کر دیا)۔ میں کہتا ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات دوسری بعض کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور قارہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم میں گزشتہ لوگوں کے حالات مسلسل بیان کر دیئے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور مقابل کا قول ہے کہ ہم نے کفار مکہ کے لیے ام ماضیہ کی

1- معاص السنہ، جلد 1 صفحہ 33 (اعلیٰ)

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (انجاریہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (انجاریہ)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زورنی، جلد 4 صفحہ 297 (الفر)

خبریں کھول کر بیان کر دی ہیں کہ انہیں جھٹلانے کے عوض کیسے عذاب دیا گیا۔ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کے لیے دنیا کی خبر کو آخرت کی خبر کے ساتھ ملا دیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کا مشاہدہ کر لیا (1)۔ ابن جریر اور طبرانی نے رفاعہ قرظی سے نقل کیا ہے کہ آیت **وَلَقَدْ وَصَّيْنَا لَهُمْ يَقُولُوا دَسْ** آدیسوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں ان میں سے ایک ہوں (2)۔ اور ابن جریر نے علی بن رفاعہ سے نقل کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے دس افراد اہل کفر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے ان میں سے ایک علی کے باپ رفاعہ بھی تھے۔ پھر انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ لہذا یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (3)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمْ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٧﴾

”جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزل) قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔“

۱۔ جن کو ہم نے محمد ﷺ یا قرآن سے پہلے کتاب عطا فرمائی۔ وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔ ابن جریر نے قتادہ سے قول نقل کیا ہے کہ ہم بیان کرتے تھے یہ آیت اہل کتاب میں سے ان افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو حق پر تھے یہاں تک کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو وہ آپ کے ساتھ ایمان لے آئے انہی میں سے ایک عثمان اور عبد اللہ بن سلام ہیں (4)۔ علامہ بخاری نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نجاشی کے ساتھیوں میں سے چالیس افراد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے، ان میں سے بعض دشمن بھی ہوئے، لیکن شہید کوئی نہیں ہوا۔ پھر جب انہوں نے اہل ایمان کو سخت حاجت مند دیکھا۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے ملک میں بہت خوش حال ہیں۔ ہمیں اجازت عطا فرمائیے ہم وہاں سے مال لاکر مسلمانوں کی حاجات پوری کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمْ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُوْنَ** ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نجاشی کے پاس پہنچے۔ تو اس نے انہیں اپنے پاس رکھا اور انتہائی حسن سلوک سے پیش آیا پھر جب انہوں نے وہاں سے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ تو اس کی مملکت کے وہ افراد جو ایمان لائے تھے انہوں نے نجاشی سے اجازت طلب کی کہ ہم ان لوگوں کی سمندر میں خدمت کریں گے۔ ہم ان ہی (ﷺ) کے پاس حاضر ہوں گے اور ان سے کسی عہد کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ پھر وہ آپ ﷺ کی معیت میں غزوہ احد، حنین اور خیبر میں شریک بھی ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی شہید نہیں ہوا۔ فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہمیں اجازت عطا فرمائیے کہ ہم واپس اپنی سرزمین میں چلے جائیں کیونکہ وہاں ہمارا بہت سامان و منال ہے۔ ہم اسے وہاں سے لاکر یہاں مہاجرین پر خرچ کریں گے کیونکہ ہم انہیں یہاں سخت معصیت اور مشقت میں دیکھ رہے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرمادی اور وہ واپس چلے گئے۔ پھر وہ اپنے مال لے کر آئے اور اسے مہاجرین پر خرچ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان

کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ علامہ بغویؒ نے سعید بن جبیر سے اسی طرح ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِيْنَ اَتَيْنٰهُمْ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهِمْ يَهْتَفِئُوْنَ مِنْهُمْ وَيَقْتُلُوْنَهُمْ يَنْفِقُوْنَ تک ان کے بارے میں نازل فرمائی۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ آیت انجی اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ان میں سے چالیس نجران سے تعلق رکھتے تھے تیس حبشہ سے اور آٹھ شام کے رہنے والے تھے (2)۔ بجز اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَ اِذَا يُثَلِّ عَلَيْهِمْ قَالُوْا اَلْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٥٦﴾

”اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے۔ ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے۔“

۱۔ اور جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ عَلٰیہُمْ ظَرْفٌ مَّا بَعْدُ قَوْلِ کے متعلق ہے تو کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لے آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا مطلب یوں منوں پر ہے اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ یہ جملہ مستأنف ہے اس لیے کہ اس نے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ بے شک ہم تو اس کے نزول سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے یعنی توحید میں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص تھے اور محمد ﷺ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے کہ وہ نبی ہیں اور یہ اس وقت سے تھا جب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی مَسِيْحٌ مَّارِثُ سُلٰىمٰنِ بْنِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلٰمُ اور آپ ﷺ کا ذکر تو رات اور انجیل میں بھی ہے۔ اور یہ دوسرا استیغاف ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ان کا ایمان ناختم نہیں تھا بلکہ یہ قواب قدیمی ہو چکا تھا۔ لہذا یہ جائز ہے کہ یہ جملہ زُنْثًا اَمْنَا کا بیان ہو کیونکہ وہ توحید و قریب (جدید و قدیم) دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن اس آیت سے قریب (جدید) کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایمان قدیم ثابت ہو جاتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُّوَكَّلُوْنَ اَجْرُهُمْ مَّا تَكُنْ بِمَا صَبَرُوْا وَاَوْفٰى سَعٰوُنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ وَاَمَّا رَاٰهُمْ يَنْفِقُوْنَ ﴿٥٧﴾

”یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دوسرے بوجہ ان کے صبر کے ۱۔ اور وہ دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔“

۱۔ یہ لوگ ہیں جنہیں دوسرے بوجہ ان کا اجر دیا جائے گا ایک مرتبہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے اپنے نبی اور کتاب کی شہادت کے سبب اپنی کتاب اور قرآن کریم کے ساتھ ایمان لانے کی بناء پر اور ایک بار قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ایمان لانے کے سبب۔ اس وجہ سے کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ان کا ایمان باقی رہا اور وہ اس پڑھنے سے جیسے کہ قرآن کریم کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ بخلاف دوسرے اہل کتاب کے جو قرآن کریم کے نزول سے پہلے تو ایمان رکھتے تھے اور وہ اس کے سبب کافروں کے خلاف فحش کے لیے دعا مانگتے تھے لیکن جب وہ ان کے پاس آگیا تو انہوں نے نہ پچھانا اور حسد کی بناء پر اس کا انکار کر دیا اور اپنے سابقہ ایمان پر صبر نہ کر سکے۔ شیخین نے صحیحین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کے لیے دوا درج ہیں ایک اہل کتاب میں سے وہ آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام پر بھی ایمان لایا اور پھر حضور نبی رحمت ﷺ کے

ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی اور انہوں نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ یا یہ آیت پنجابی کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی جبکہ وہ حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آئے اور وہ بھی 6ھ میں غزوہ خیبر کے وقت آئے۔ یا پھر یہ آیت اہل نجران میں سے چالیس افراد اور اہل شام میں سے آٹھ افراد کے بارے نازل ہوئی۔ یہ تمام واقعات ہجرت کے بعد ہوئے جبکہ قرآن کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ واللہ و اعلم۔ امام مسلم اور دیگر محدثین نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب سے کہا کہہ دو لا الہ الا اللہ تو میں قیامت کے دن تمہاری شہادت دوں گا تو انہوں نے کہا اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ قریش کی عورتیں عار دلائیں گی اور کہیں گی کہ موت کی گھبراہٹ نے اسے کلمہ پڑھنے پر برا بھانتہ کیا ہے تو میں یہ کلمہ پڑھ کر آپ کی آنکھوں کو ضرور غصا کرتا۔ تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۵۰﴾

”بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو۔“

بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ ہدایت دینا پسند کریں۔ یا جسے آپ قرا بتداری کی وجہ سے پسند کریں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے وہ ہدایت دینا چاہتا ہے (اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے)۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کے لیے ہدایت مقرر کر دی ہے۔ امام نسائی نے اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں سید جید کے ساتھ ابو سعید بن رافع سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت کے بارے پوچھا کہ کیا إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ابو جہل اور ابوطالب کے بارے نازل ہوئی؟ تو انہوں نے فرمایا جی ہاں یہ انہی کے بارے میں ہے (2)۔ شیعین، امام نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو النبیخ، ابن مردودہ اور ترمذی نے حضرت سعید بن مسیب کی حدیث نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب ابوطالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ تو آپ نے ان کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ بن مخمرہ کو موجود پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے چچا! ایک بار کلمہ طیب لا الہ الا اللہ الخ کہہ دو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لیے اس کی شہادت دوں گا۔ یہ سن کر ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھرنے کی ترغیب دے رہے ہو؟ پس رسول اللہ ﷺ ان پر مسلسل یہ کلمہ پیش کرتے رہے اور انہیں کلام بار بار دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ ابوطالب نے سب سے آخری کلام یہ کیا علی ملۃ عبد المطلب۔ (کہ میں عبد المطلب کے دین پر ہوں) (اور انہوں نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تک مجھے منع نہیں کیا جائے گا میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَا كَانَ لِلْبَنِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ الْعَظِيمِ (اور ابوطالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ) (3)

وَقَالُوا إِنَّا تَتَّبِعُ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَتَّخِطُّ مِنْ أَصْحَابِكَ أَوْ لَمْ يُكُنْ لَهُمْ حَرَمًا

کیونکہ واجب تو یہ ہے کہ وہ اپنے گھر اور گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں (لیکن وہ ایمان لانے سے ڈر رہے ہیں)۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا قَتَلَتْكَ مَسْكَنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ قَرْيَةً
بَعْدَهُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكَانَ خُنُوءُ الْوَارِثِينَ ۝۵۹

”اور ہم نے کتنے شہر پر باد کر دیے جب وہ فخر کرنے لگے۔ اپنی خوشحالی پر۔ پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ اور (آخر کار) ہم ہی ان کے وارث بنے۔“

۱۔ یہ اصل میں اہل قریہ ہے۔ یعنی ہم نے کتنے شہروں کے رہنے والوں کو ہلاک کر دیا جن کی حالت تمہاری حالت کی مثل تھی۔ وہ نازاں ہوئے اور سرکش ہوئے۔ یہ حقیقت میں شہر میں رہنے والوں کا وصف ہے جس سے قریہ کو مستغف کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل قریہ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سبب سرکش اختیار کر لی اور انہوں نے ان پر شکر ادا نہیں کیا عطا نے کہا ہے کہ انہوں نے فخر اور تکبر کرتے ہوئے زندگی گزار لی اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا رزق کھایا اور اسی کی نافرمانی کی اور ساتھ ہی پوجا پاٹ بتوں کی کی۔ (1)
۲۔ مَعِيشَتُهَا ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی یہ اپنی خوش حالی کے عرصہ میں فخر کرتے رہے تو نتیجہً اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور ان کے گھروں کو برباد کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر جو برباد ہو چکے ہیں۔ ان سے مراد حجر اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یہ جملہ ہلاک القریٰ کی علت بیان کرتا ہے۔

۳۔ ترکیب کلام میں لم تسكن مساکنهم سے حال ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔ اور إِلَّا قَلِيلًا یہ یا تو مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا ظرفیت کی بناء پر۔ (پہلی صورت میں مفعول مطلق ہے اور دوسری صورت میں مفعول فیہ ہے)۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے إِلَّا مَسْكُونًا قَلِيلًا يَزِمَانًا قَلِيلًا (مگر بہت کم یا بہت کم وقت)۔ یہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ان میں سکونت اختیار نہیں کی مگر کسی مسافر نے یا راستے سے گزرنے والے نے اور وہ بھی صرف ایک دن کے لیے یا ایک ساعت کے لیے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کے گناہوں کی نعمت کی وجہ سے سوائے تھوڑی مدت کے کسی کی سکونت ان میں باقی نہیں رہ سکی (2)۔ آخر کار ہم ہی ان کے وارث بنے جبکہ ان کے پیچھے کوئی ایسا نہیں رہا جو ان کے گھروں میں سکونت اختیار کرتا اور ان کی دیگر اشیاء اپنے تصرف میں لاتا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمَمٍ سَابِقَةٍ يُنَادُوا بِعِلْمِهِمْ لِيُنذَرَكُمْ
وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۝۶۰

”اور نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو یہاں تک کہ بھیجے ان کے مرکزی شہر میں کوئی رسول جو پڑھ کر سنائے وہاں کے رہنے والوں کو ہماری آیتیں۔ اور ہم نہیں ہیں ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے لئے والے ظالم ہیں۔“

۱۔ یعنی اس کی عادت کافروں کی بستیوں کو تباہ کرنا نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بڑے عظیم شہر میں کوئی رسول بھیجے۔ جو انہیں ڈرائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت کے لیے بڑے بڑے شہروں کو مختص کیا ہے کیونکہ رسول اشراف کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیروکار ایمان اور کفر میں انہی کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر قحط روم کی طرف خط لکھا کہ تو

اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تیری رعایا کے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ہوگا۔ اور اشراف بڑے بڑے شہروں اور ایسے مقامات پر سکونت پذیر ہوئے ہیں جو اپنے گرد و نواح کا مرکز ہوں۔ متاعل نے کہا ہے کہ رسول انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ان پر عذاب نازل ہوگا (۱)۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے لئے دالے رسولوں کو بھجلائے اور کفر کے ساتھ سرکشی اختیار کرنے کے سبب ظالم ہیں۔

وَمَا أَوْفَيْتُمْ مِّن شَيْءٍ مِّمَّا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ حَيٰوٌۢ وَّآٰبِلٰی ؕ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

”اور جو چیز دی گئی ہے تمہیں تو یہ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اس کی زیب و زینت ہے۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور دیر پا ہے۔ کیا تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے؟“
 لہ اور دنیا کے خزانوں میں سے جو چیز بھی تمہیں دی گئی تم اس سے زندگی بھر لطف اندوز ہوتے ہو اور زیب و زینت حاصل کرتے ہو۔ اور جو جنت اور مراتب قرب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ ذاتی طور پر اس سے بہتر ہیں کیونکہ وہ تو خالص لذت اور کامل سرور ہیں۔ وہ دیر پا ہیں کیونکہ وہ ابدی ہیں۔

لہ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ میں استہمام انکاری ہے اور قاطعہ تعجبیہ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ”الا تفکرون فلا تعقلون“ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

أَفَمَنۢ وَعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَا فِیۡهِ مَقْنَعٌ مِّمَّا عٰتٰ اللّٰهُ الْحَیٰوةَ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ الْمُخْضَرِّیۡنَ ۝۱۱

”تم خود سوچو (آیا وہ (نیک بخت) جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا ہے بہت اچھا وعدہ اور وہ اس کے پانے والا بھی ہے۔ اس (بد بخت) کی مانند ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے۔ پھر وہ (اس چند روزہ آسائش کے بعد) روز قیامت (بھروسوں کے کٹہرے میں) پیش کیا جائے گا۔“

لہ اس کا عطف وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ حَیٰوٌۢ وَّآٰبِلٰی پر ہے۔ اور اس میں ہمزہ برائے استہمام انکاری ہے۔ یہ معطوف علیہ کے پیچھے معطوف آنے کے انکار پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یعنی کیا اتنے واضح اور روشن تفاوت کے بعد بھی تم نے اس شخص کو جس سے ہم نے بہت اچھا وعدہ یعنی جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کیونکہ وعدہ کا حسن موعود کے حسن کے ساتھ ہوتا ہے (تو چونکہ جنت بذات خود حسین ہے اس لیے اس کا وعدہ بھی حسین ہے) اور وہ اسے بالیقین پانے والا بھی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے وعدہ میں اس کا خلاف ہونا متنع ہے۔ اسی لیے یہاں بطور حرف عطف فاء ذکر کی گئی ہے جو سوسیت کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کی کش ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے۔ جو سامان دروں اور مصائب سے گھرا ہوا ہے، مشقتوں اور تکالیف سے مکدر ہے اور ختم ہونے کے بعد اپنے پیچھے حسرت اور مایوسی کو لانا والا ہے۔

لہ پھر اسے یوم قیامت کو حساب یا عذاب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس میں فَمِ بعد زمانی کے لیے ہے یا بعد زمانی کے لیے ہے۔ نافع،

ابن عامر نے ایک روایت میں اور کسائی نے فہم ہو کر ہاؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ضمیر منفصل کو ضمیر متصل کے مشابہ پڑھا ہے۔ قنّادہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے (1)۔ بلکہ ممکن بہت اچھی حالت میں ہو گا۔ علامہ بخاری نے اور اسی طرح ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے کہ غابہ نے کہا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان سے ایک دوسری سند سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور علامہ بخاری نے کہا ہے کہ متاخر اور محمد بن کعب کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ یا حضرت علی اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ عمار اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٣٦﴾

”اور اس دن اللہ انہیں آواز دے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے۔“

اس کا عطف یوم القیامہ پر ہے۔ یا یہ اذکثر فضل محذوف کے سبب منصوب ہے یعنی مقول یہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ شریکین سے فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم دنیا میں میرا شریک خیال کرتے تھے۔ یہاں تَزْعُمُونَ کے دونوں مقول محذوف ہیں کیونکہ کلام ان پر دلالت کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں شاید شرکام سے مراد کافروں کے وہ مردار ہیں جن کے سبب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر ان کی عبادت اور اجاب اختیار کر لی۔ اور یہاں انہیں شرکاء کا نام بطور استہزاء دیا گیا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَهُمْ كَمَا
اغْوَيْنَا تَبَيَّنَ إِلَيْنَا أَلَيَّا كَانُوا يُعْبَدُونَ ﴿٣٧﴾

”کہیں گے وہ لوگ جن پر عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا۔ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں بھی گمراہ کیا۔ جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔“

وہ لوگ کہیں گے جن پر عذاب کا فرمان قول کے متفقین کے وجوب کی وجہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ اور قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اور دیگر آیات و عید ہیں لَا تَسْلُبْ لَهُمُ آلَهُمْ مِنَ الْغَيْبِ تَوَدُّوا أَنَّا نَجْعَلِ لَهُمُ آلَهُمْ (کہ میں جنہم کو جنات اور آدمیوں سے بھر دوں گا)۔ تو یہ قول کافروں کے رسوا کہیں گے۔

یہ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ما بعد کلام ہے۔ اغْوَيْنَا میں وہ ضمیر منصوب جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ یعنی اغْوَيْنَاهُمْ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ بیدار و کار جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں گمراہ کیا تو وہ گمراہ ہو گئے۔ مع گمراہی میں کاف فعل محذوف کے مصدر کی مفت ہے۔ جس پر اغْوَيْنَاهُمْ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَهَؤُلَاءِ اغْوَيْنَاهُمْ كَمَا اغْوَيْنَا تَبَيَّنَ إِلَيْنَا أَلَيَّا كَانُوا يُعْبَدُونَ۔ یعنی وہ اسی طرح گمراہ ہو گئے جیسے ہم خود گمراہ تھے۔ اور یہ جملہ مستند ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بیشک وہ اسی طرح اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے جیسے ہم اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے اور ہم نے ان کے ساتھ تو دوسرا انداز اور لالچ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اگرچہ ہمارا دوسرا اور فریب انہیں کفر کی طرف دعوت دینے والا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دلائل قائم

کرتے ہوئے، رسول بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر انہیں جو دعوت دی وہ زیادہ بہتر اور اس الٰہی قسمی کہ یہ ہماری وسوسہ اندازی کی نسبت اس کی پیروی کرتے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَقَالَ اللَّهُ لَنْ نَسْأَلَكَ عَلَيْهِمْ الْقِيَامَ يَوْمَ يَكُونُ جَزَاءُ كُلِّ امْرِئٍ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور اغوٰیہم خبر ہوا اس کے لیے جو اس کے ساتھ مقتدر اور محفوظ کلام میں سے متصل ہے۔ یعنی فَعَوَّزُوا غَمًّا اَوْ غَوَيْنَا۔ پس اس نے صفت پر زیادتی کا فائدہ دیا ہے اور وہ اگرچہ فضلہ ہے لیکن وہ لوازم میں سے ہو چکی ہے۔

یہ ہم ان سے اور اس کفر سے جسے انہوں نے اپنی خواہش نفس کی بناء پر اختیار کیا ہے بیزار ہیں۔ "اَلَيْكَ سِرُّ اَنَا كَيْسَ تَحْلِقُ" ہے۔ اور توجہ کے معنی کو متضمن ہے۔ یعنی ہم ان سے بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ماصدر یہ ہے جو تیرا انا سے متصل ہے یعنی ہم اس سے بیزار ہیں کہ وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

وَقَبِيلٌ اَدْعَوْا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمُ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَاسْأَوْا الْعَذَابَ لَوْ
اَنْتُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿١٦﴾

”اور (انہیں) کہا جائے گا (لو) اب پکارو اپنے شریکوں کو تو وہ انہیں پکاریں گے۔ لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور دیکھ لیں گے عذاب کو لے کیا اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔“

اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ پر ہے۔ اور کفار کو کہا جائے گا اب اپنے شریکوں کو پکارو کہ وہ اگر تمہیں عذاب سے نجات دلائیں۔ یہاں شرکاء سے مراد بت اور انجمن کی طرح کے معبودان باطلہ ہیں۔ تو وہ انہیں پکاریں گے اس حال میں کہ وہ حد درجہ حیرت زدہ اور بدحواس ہو چکے ہوں گے یا پھر اس لیے کہ وہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ لیکن وہ جواب دینے اور مدد کرنے سے عاجز ہونے کے سبب انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اور کفار اپنے نفسوں اور معبودوں کے لیے عذاب دیکھ لیں گے۔

اَلَوْ كُنَّا جَوَابٌ مُّخَدَّفٌ بِهٖ تَقْدِيرِ مہارت یہ ہے اگر وہ دنیا میں ہدایت حاصل کر چکے ہوتے تو وہ عذاب نہ دیکھتے۔ اظہر قول یہ ہے کہ لو تَحْسَنُ کے لیے ہے یعنی وہ خواہش کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا آجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧﴾

”اور اس دن اللہ تعالیٰ آواز دے گا انہیں پھر پوچھے گا تم نے کیا جواب دیا تھا (ہمارے) رسولوں کو۔“

اَلْاَيَةُ کا عطف پہلے سوال پر ہے۔ ان سے پہلا سوال ان کے شرک کرنے پر جزو تو بیع کے لیے ہے اور دوسرا سوال رسولوں کو بھٹلانے کے بارے میں ہے۔

فَحَيِّثُ عَلَيْهِمُ اَلْاَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُوْنَ ﴿١٨﴾

”تو اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں۔ اس دن اس دن پس وہ (مارے دہشت کے) ایک دوسرے سے کچھ پوچھ نہ سکیں گے۔“

۱۔ تو ان پر خبریں اندھوں کی مثل ہو جائیں گی کہ وہ ان تک راہنمائی ہی نہیں پا سکیں گے۔ اس میں اصل کلام تو اس طرح ہے فَعَمُوا عَنِ الْاَنْبَاءِ کہ وہ خبریں دینے سے اندھے ہو جائیں گے۔ لیکن مبالغہ کے لیے انداز کلام میں تبدیلی کی گئی اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ جو کچھ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے اور اس پر باہر سے وارد ہوتا ہے۔ لیکن جب قیامت برپا ہوگی تو ان کے پاس کوئی بیرونی حیلہ موجود نہیں ہوگا اس لیے وہ جواب بھی نہیں دے سکیں گے۔ یہاں انباء سے مراد رسولوں کو جھٹلانے کے عذر ہیں۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان سے مراد دلائل ہیں (۱)۔ معنی یہ ہے کہ وہ کسی بھی شے کے ساتھ جواب نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی دلائل پیش کر سکیں گے۔ یا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔

۲۔ یَوْمَئِذٍ قَوْلَ بَارِئِ تَعَالٰی یَوْمَئِذٍ یُنَادِیْہُمْ کَلِّیۡمَ تاکید ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ جب اس قسم کے جواب میں خوف کی وجہ سے رسولوں کی زبانیں بھی لٹکرائیں گی اور وہ اپنے جواب اللہ تعالیٰ کے علم کو تقویض کر دیں گے تو پھر کفار کے جواب کے بارے کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟ آیت طیبہ میں عجبی فعل صلہ غلی سے متعدی ہے اس لیے کہ یہ کفار کے معنی کو متضمن ہے۔ (۲) معنی یعنی وہ بہشت اور خوف کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے جواب کے بارے پوچھ بھی نہیں سکیں گے یا وہ اس وجہ سے سوال نہیں کریں گے کہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ جس سے سوال کریں گے وہ بھی اسی کی مثل لا جواب ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاَمَّا وَعِیۡلًا فَعَسٰی اَنْ یَّکُوۡنَ مِنَ الْمُنْقَلِحِیۡنَ ﴿۳۱﴾

”تو وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں ہوگا۔“

۱۔ تو وہ جس نے شرک سے توبہ کی اور اس نے ایمان کے ساتھ عمل کیا تو یقیناً وہ اللہ کے نزدیک کامیاب و کامران لوگوں میں سے ہوگا۔ یہاں پر عسی یا تو حقیقتاً شراف اور بادشاہوں کے طریقہ کے مطابق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ یقینی بات کو بھی الفاظ شک سے ظاہر کرتے ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ امید کی نسبت توبہ کرنے والے کی طرف ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اسے چاہیے وہ فلاح و کامرانی کی توقع کرے۔

وَسَبَّكُۢمۡ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ۚ مَا كَانَ لَہُمُ الْخِیۡرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِكُوۡنَ ﴿۳۲﴾

”اور آپ کا رب پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جسے چاہتا ہے)۔ ۱۔ نہیں ہے انہیں کچھ اختیار۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

۱۔ اور آپ کا رب جسے جسے چاہے اور پسند کرتا ہے پیدا فرماتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ پس اس نے تمام لوگوں میں سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبوت کے لیے پسند فرمایا۔ علامہ بخاری نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے جواب میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا کہ اِنَّا لَنَرٰکَ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرۡنِیۡنِ سَاقِیۡنَ (یہ قرآن دونوں بیستوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا) اور اس سے ان کی مراد ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود ثقفی ہوتا تھا۔ (۳)

۲۔ اَلْخِیۡرَةُ یہ اختیار سے اسم ہے۔ جو قائم مقام مصدر کے ہے اور یہ مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے مُحَمَّدٌ

معصیت کے لیے اس کا حکم بدعتی اور غسوت کا ہے (۱)۔ اور اسی کے فیصلے کی طرف تم موت کے بعد اٹھا کر لوٹا جائے گا۔

قُلْ اَسْأَلُكُمْ اِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ الْاَيْلَ سَرْمَدًا اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ اِلَهٌ غَيْرُ
اللّٰهِ يَا تَيْتِيمُ بَرِيًّا ۚ اَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿۱﴾

”آپ فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر بناوے اللہ تعالیٰ تم پر رات ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لاوے تمہیں روشنی۔ کیا تم سن نہیں رہے ہو۔“

اے محمد! آپ ﷺ فرمائیے اے اہل مکہ! تم مجھے بتاؤ اگر تم پر اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے رات بناوے۔ سَرْمَدًا سرود سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس میں ہم زمانہ ہے۔ کہ قیامت تک تم پر سورج طلوع ہی نہ ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کون سا خدا ہے جو تمہیں روشنی لا کر دے جس میں تم وراثت معاش تلاش کرتے ہو۔ اس میں فن برائے استہدام انکار ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اللہ نہیں جو تمہیں روشنی لا کر دے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ حق تو یہ تھا کہ کہا جا تاہل اللہ؟ لیکن فن اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کے سوا بھی اللہ ہیں (۲)۔ کیا تم میری فصاحت کو سن نہیں رہے ہو کہ اس سے مدبر و غور و فکر کرو۔

قُلْ اَسْأَلُكُمْ اِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ اِلَهٌ
غَيْرُ اللّٰهِ يَا تَيْتِيمُ بَرِيًّا ۚ اَفَلَا تَبْصُرُونَ ﴿۲﴾

”فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر بناوے اللہ تعالیٰ تم پر دن ہمیشہ کے لیے روز قیامت تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لاوے تمہیں رات جس میں تم آرام کر سکو۔ کیا تمہیں (کچھ) نظر نہیں آتا؟“

اے فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ تم پر دن بناوے کہ سورج آسمان کے وسط میں روز قیامت تک ٹھہر جائے تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو تمہیں رات لاوے جس میں تم کا روزگار حیات کی تحکات سے راحت اور سکون حاصل کر سکو۔ کیا تمہیں ہماری آیات و نشانیاں دیکھائی نہیں دیتیں۔ اور ضیاء (روشنی) کو کسی وصف سے متصف نہیں کیا جب کہ اس کے مقابل رات کو سکون سے متصف کیا ہے کیونکہ روشنی بذات خود ایسی نعمت ہے جو مقصود بذات ہے۔ اور رات اس طرح نہیں کیونکہ دن کے منافع اور فوائد اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ وہ دیکھے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اَفَلَا تَسْمَعُونَ ذکر کیا گیا ہے جب کہ رات کے ذکر کے بعد اَفَلَا تَبْصُرُونَ فرمایا ہے۔ کیونکہ عقل (مح) (سننے) سے استفادہ نہایت بصر (دیکھنے) کے زیادہ کرتی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ الْاَيْلَ وَالنَّهَارَ لَتَسْكُنُوا فِيهِ وَلَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۳﴾

”اور رحمت اپنی رحمت سے اے اہل مکہ! نے بنا دیا ہے تمہارے لیے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔“

اے وہیں رحمت میں من برائے سعیت ہے۔ اور یہ بابت جعل لکم کے متعلق ہے۔ اور اسے حصر کے معنی کے لیے فعل سے مقدم کیا۔

گیا ہے۔

جہاں اور اس نے محض اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنا دیا ہے تاکہ تم رات میں آرام کرو اور دن کے وقت دنیا اور آخرت کے منافع تلاش کرو۔ اس کلام میں لف وشر مرتب ہے (یعنی لنسکوا کا تعلق رات سے ہے اور لنبغو کا تعلق دن سے ہے) اور ز جانے نہ کہا ہے کہ اس میں یہ معنی بھی جائز ہے کہ تم آرام کرو دونوں (رات اور دن) میں اور دونوں میں اس کا فضل (رزق) تلاش کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر بائیل والنہار مذکور ہو اور جعل لکم الرفاق نہیں کہا گیا کیونکہ رات اور دن دونوں میں آرام کرنے اور کام کرنے یعنی اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرو۔

وَيَوْمَ مَنَّا بِهِمْ فَيَقُولُ آيِنُ شُرَكَائِيَ الْيَمِينُ لَكُمْ تَرْتَضَوْنَ ۝۴۰

”اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا کہ فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے۔“

لہ اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا کہ فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری شفاعت کریں گے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائیں گے۔ یہ گویا ایک ڈانٹ کے بعد دوسری ڈانٹ ہے یہ احساس دلانے کے لیے شرک سے بڑھ کر کوئی شے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی نہیں۔ پہلے مقام پر انہیں اس پر زبرد و توجہ تھی کہ انہوں نے اپنے سرداروں کی اتباع کی اور ان کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ اور اس مقام پر ان کی اس رائے اور امید کو فاسد اور باطل قرار دینا مقصود ہے کہ یہ پتھروں کے بت اور انہی کی طرح دیگر معبودان باطلہ ان کی غارش کریں گے۔

وَنَرَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝۴۱

”اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ پھر (ان امتوں کو) ہم کہیں گے اے آدمی وہاں دلیل تو وہ جان لیں گے کہ بے شک

حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور ہم ہو جائیں گے ان سے جو افتراء وہ باندھا کرتے تھے۔“

لہ یا تو اس کا عطف یقول پر ہے۔ اور یہ علی سبیل الانقاف ہے یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ جو ان کے خلاف اس عمل کی شہادت دے گا جس پر وہ عمل پیرا ہے اور وہ ان کا نبی ہوگا۔ پھر ان امتوں کو ہم کہیں گے کہ تم اپنے عقائد صحیح ہونے پر دلیل لے آؤ جس پر تم رہے۔ پس اس وقت وہ جان لیں گے کہ بے شک الوہیت میں حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کوئی بھی اس میں شریک نہیں۔ اور وہ ان سے ضائع ہونے والے غیب کی طرح غائب ہو جائیں گے جو افتراء وہ دنیا میں باندھا کرتے تھے۔

إِنَّ قَالِيُونَ كَانُوا مِنْ قَوْمٍ مُّوسَىٰ قَبْلِي عَلَيْهِمُ ۖ وَاتَّيْنَهُ مِنَ الْكُتُبِ مَا إِنْ مَفَاتِحُهَا

لَتَنُوبُوا بِالنُّصْبَةِ أُولَىٰ النُّفُوزِ ۖ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝۴۲

”(بے شک قارون موسیٰ علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا۔ پھر اس نے سرکشی کی ان پر۔ اور ہم نے دے دیے تھے

اسے اتنے خزانے کہ ان کی چابیاں (اپنے بوجھ سے) جھکا دیتی تھیں ایک طاقتور جتھہ (کی کمروں) کو جسے جب کہا اسے

اس کی قوم نے زیادہ خوش نہ ہوئے بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو۔“

میں نے انجیل میں قارون کے خزانوں کی چابیوں کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ ساتھ خچروں کا بوجھ تھیں۔ ان میں سے ہر چابی انگلی سے بڑی نہیں تھی اور ہر خزانے کے لیے علیحدہ چابی تھی (1)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قارون جہاں بھی جاتا تھا اپنے خزانوں کی چابیاں اپنے ساتھ اٹھا کر لے جاتا تھا اور وہ چابیاں لوہے کی بنی ہوئی تھیں۔ پھر جب وہ اس پر بوجھل اور بھاری ہو گئیں۔ تو اس نے لکڑی کی چابیاں بنوائیں۔ پھر جب ان کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ تو اس نے ایک انگلی کی لمبائی کے چمڑے کی چابیاں تیار کروا کر وہ تو اس کے ساتھ ساتھ چالیس خچروں پر لا کر اٹھائی جاتی تھیں جہاں بھی وہ جاتا۔ لیکن قرآن کریم ان روایات کی تائید نہیں کرتا۔ کیونکہ عصبہ کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے نہ کہ خچروں پر۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ علماء نے عصبہ کی مقدار میں اختلاف کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ عصبہ سے مراد اس سے لے کر پندرہ تک افراد ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر دس تک کے درمیان افراد ہیں۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق دس سے لے کر چالیس تک کے درمیان افراد پر ہوتا ہے (2) اور قاسم میں اسی طرح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ستر افراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس کی چابیوں کو مردوں میں سے قوی ترین چالیس افراد اٹھاتے تھے (3)۔ اور قتادہ پانچ عصبہ کا معنی ہے کہ وہ جماعت انہیں اٹھا کر چلتی تھی تو ان کے بوجھ کی وجہ سے وہ جھک جاتے تھے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اسی طرح تھی ما ان العصبہ لثوبہا (کہ وہ جماعت ان کے بوجھ کے سبب جھک جاتی تھی) مثلاً کہا جاتا ہے ناء فلان بكذا کر فلان اس بھاری بھر کم بوجھ کے ساتھ اٹھا (4)۔ یہ جملہ ان کی خبر ہے اور وہ اپنے جیل کے ساتھ مل کر ماکا کا صلہ ہے۔ اور یہ اثینا کے دو فضولوں میں سے دوسرا ہے۔ اور اپنے سے مقدم الکوز سے حال ہے۔

س۔ اذ قال لہؤ قوئدہ یقتو علی طرف ہے۔ اور فرح کا معنی سرور خوشی اور مرغوب فیہ شے پانے کے سبب پیئے کا مکمل جانا ہے اور وہ فرح جس سے منع کیا گیا ہے وہ ہے جس میں تکبر اور غرور موجود ہو یعنی اپنے نفس کو بر شے سے مستغنی کرتے ہوئے حق کو قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی اختیار کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِۦٓ اَنْۡ اَشْرٰۤكًا اَسْتَعْتٰی فَاَمَوٰں میں ہے کہ الفرح کا معنی ہے خوش ہونا اور اپنے آپ کو دیکھنا (5)۔ بغوی نے لافرح کی تفسیر اس طرح کی ہے تکبر نہ کر، غرور نہ کر اور نہ اکثر (6) کیونکہ مرغوب فیہ چیز کے حصول کے وقت فرحت و مسرت کا ہونا طبیعی امر ہے جس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہوتا لہذا اس سے روکنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ دنیا کے حصول پر فرحت و خوشی کا ہونا مطلقاً مذموم ہے کیونکہ دنیا کی محبت اور اس کی پسند اس کے فانی اور ذوال پنے پر ہونے کے تصور سے غفلت کا موجب ہے اور یہ غفلت بالیقین مذموم ہے۔ کیونکہ اس شے کا یقین ہونا کہ دنیا کی تمام لذات فانی اور ختم ہونے والی ہیں وہ بالیقین اس سے دور رہنے کا موجب بنتا ہے (7)۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَاْمَنُوْا اَعْلٰی مَا تَمْرُقُوْا وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰکُمْ (تم اس چیز پر افسوس اور غم نہ کرو جو تم سے فوت ہو جائے اور جو کچھ اس نے تمہیں عطا فرمادیا ہے اس پر خوش نہ ہو) اور یہاں اس جہی کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی محبت سے روکتی ہے۔ پس فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْرِحِیْنَ۔

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 150 (اتحادیہ)

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 68 (الامیریہ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 150 (اتحادیہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 150 (اتحادیہ)

6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 150 (اتحادیہ)

5۔ القاسم للخیط، جلد 1، صفحہ 351 (اتراث العربی)

7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی، جلد 4، صفحہ 303 (المکر)

ہرمک و غناک قبل ففوک (1) (پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اپنی زندگی کو موت آنے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری آنے سے پہلے، اپنی فراغت کو کسی کام میں مشغول ہونے سے پہلے، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اور اپنے غنی ہونے کو غربت و افلاس سے پہلے) اسے حاکم اور تابعی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام احمد نے زہد میں نقل کیا ہے اور علامہ بغوی، ابن حبان اور ابویعم نے حلیہ میں عمر بن میمون الاودی سے اسی طرح مرسل روایت کیا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کر دیا جائے اور اتنا روک لیا جائے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اور منصور بن زاذان نے کہا ہے کہ لا تنس نصیبک من الدنیا کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خوراک (روزی) کا سامان نہ چھوڑو۔ (2)

ع اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر احسان کیا کر یا ذکر، شکر اور اطاعت پر دوام اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کر چیسے اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے اس طرح کہ بغیر کسی انقطاع کے اس نے مسلسل اتنی نعمتوں سے نوازا جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ع اور ملک میں فتنہ فساد کی خواہش نہ کر۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس میں ظلم اور بغاوت سے منع کیا گیا ہے (3) اور علامہ بغوی نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تحقیق وہی زمین میں فساد کا طلب گار ہوتا ہے (4)۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد پر پا کر نے والوں کو ان کے اعمال کی برائی کے سبب دوست نہیں رکھتا۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيْنِيْهِ عَلَى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۖ أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ
مِنَ الْفُرْقَانِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَ أَكْثَرُ جَعْلًا ۚ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ دُنُوْهِمُ
الْبَحْرِ مُوْنٌ ۝۳

”وہ کہتے تھے مجھے دی گئی ہے یہ (دولت و ثروت) اس علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے۔ کیا اس (مغرور) کو اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر ڈالیں اس سے پہلے قومیں جو اس سے قوت میں کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں کہیں زیادہ تھیں ع اور نہیں دریافت کیے جائیں گے بحر میں سے ان کے گناہ سے۔“

۱۔ یہاں ضمیر مرفوع سے حال ہونے کی بناء پر علی علیہ السلام محل نصب میں ہے۔ اور ”عندی“ میں مانع، ابن کثیر اور ابو عمرو کو یاد کو متوجہ اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ یہ یا تو طرف مشرق ہے اور علم کی صفت ہے یا پھر طرف لغو ہے اور اُزینہ کے متعلق ہے۔ جیسے تیرا یہ قول لہذا عندی یعنی یہ میرے گمان میں ہے اور میرے اعتقاد میں ہے۔ اور اس میں ان کے اس قول کا رد ہے۔ جو انہوں نے قارون سے کہا تھا کہ اَحْسِنَ اللَّهُ إِلَيْكَ۔ یعنی اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر استحقاق کے شخص فضل کرتے ہوئے مجھ پر احسان نہیں کیا کہ مجھ پر اس کا شکر واجب ہو اور اس کے بندوں پر احسان کرنا ضروری ہو۔ بلکہ مجھے یہ جاہ و شہرت، مال و دولت اور لوگوں پر فوقیت اس علم کی بناء پر دی گئی جو میرے پاس ہے یا جو میرے اعتقاد میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس علم سے مراد علم کیسا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کیسے ماری کہ اس علم جانتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس علم کا ایک تہائی پوشع بنون کو سکھایا، ایک تہائی کالب بن یوتقا کو سکھایا اور ایک تہائی قارون کو سکھادیا۔ پھر قارون نے ان دونوں کے ساتھ دھوکہ کیا یہاں

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (اتحادیہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (اتحادیہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (اتحادیہ)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی، جلد 4 صفحہ 304 (الفر)

تک کہ ان دونوں کا علم بھی سیکھ لیا اور یہ علم ہی اس کی دولت و ثروت کا سبب تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ علی علیہ السلام سے مراد تجارت، زراعت اور کمانے کے دیگر مختلف الانواع ذرائع کا علم ہے (۱)۔ بل نے کہا ہے کہ جس کسی نے اپنے آپ کی طرف نہیں دیکھا اس نے فلاح اور کامیابی حاصل کر لی۔ سعید اور خوشمت وہ ہے جس نے اپنے اقوال و افعال سے اپنی ناکاہ کو بچھیر لیا اور اپنے تمام تر افعال و اقوال میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو دیکھنے کی راہ کھول لی اس کے برعکس شقی اور بد بخت وہ ہے جس نے اپنے اقوال و افعال اور احوال کو اپنے ہی سامنے حزیں کیا پھر ان پر فخر کیا اور اپنے خالق ہونے کے لیے ہی ان کا دعویٰ کیا تو عترتِ اب سے کسی دن اسی طرح ہلاک کر دیا جائے گا جیسے قارون کو دھنسا دیا گیا کیونکہ اس نے بھی اپنی ذات کے لیے فضیلت اور برتری کا دعویٰ کیا تھا۔

یہ جملہ معترضہ ہے اور ہمزہ استفہام تعجب اور توبيخ کے لیے ہے اور اوادؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کا یہ ہے۔ اَلَمْ يَنْظُرُوا فَاَرَوْا وَلَمْ يَعْلَمُوا۔ کیا قارون نے غور و فکر نہیں کیا اور اسے اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی قومیں ہلاک کر ڈالیں جو قوت میں اس سے کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ تھیں اگر وہ یہ جان لیتا تو وہ اپنے مال کے سبب غرور اور تکبر نہ کرتا۔ اور اگر اسے یہ علم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہلاک کرنے والا ہے، وہی عطا کرنے والا ہے اور وہی روکنے والا ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کا کوئی حق ہے۔ اس میں اس کے دعویٰ علم و عظمت کا رد اس علم کی نفی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل قوم عاود کو تباہ و برباد کر دیا حالانکہ وہ قوت و طاقت اور کثرت تعداد کی وجہ سے اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور تھی۔ اور ان میں شداد بن عادی و ساری زمین کا بادشاہ تھا۔

اور ہجر مومن سے ان کے گناہ دریافت نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر مطلع ہے اسے سوال کرنے اور معلومات لینے کی ضرورت نہیں۔ پس وہ انہیں دنیا میں ہلاک کر کے اور آخرت میں جہنم میں داخل کر کے ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو ان لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کا ذکر کر کے خوف زدہ کر دیا جو اس سے قبل اپنی قوت و طاقت اور مال کی کثرت میں اس سے کہیں زیادہ تھے تو پھر اس آیت میں اسی حکم کو مزید مؤکد کیا کہ وہ ہلاکت صرف انہی لوگوں کے ساتھ تنقش نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ تو ان تمام ہجر مومن کے گناہوں پر آگاہ ہے جو پہلے تھے اور بعد میں ہوں گے وہ تمام کو ان کے گناہوں کی سزا بالیقین دے گا۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انہیں بغیر پچھ گچھ کے اور حساب و کتاب کے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور مجاہد کا قول ہے کہ ملائکہ ان سے سوالات نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہیں ان کی پیشانیوں سے پچھان لیں گے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ ان سے معلومات حاصل کرنے کے لیے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ان سے سوالات زجر و توبیخ اور ہجر کرنے کے لیے کیے جائیں گے۔ (2)

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا لِيَلْبِسَتْ لَنَا
مِثْلَ مَا اُوْتِيَ قَارُونُ ۚ اِنَّهٗ لَكُ وَّحِطٌ عَظِيْمٌ ۝

”الغرض (ایک دن) وہ نکلا اپنی قوم کے سامنے بڑی زیب و زینت کے ساتھ لہ کہنے لگے وہ لوگ جو آرزو مند تھے دنیوی زندگی کے اے کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ و جلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو داتی وہ تو بڑا خوش نصیب ہے۔“

۱۔ اس کا عطف ظاہر ہے۔ ابراہیم غفرانی نے کہا ہے کہ قارون اپنی قوم کے ساتھ نکلا اور آٹھ لاکھ وہ سب ہزار اور سرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے زینے کہا ہے کہ وہ ستر ہزار افراد کے ساتھ باہر نکلا وہ سب زعفرانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ سفید گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر آئے ان پر ارغوانی زینیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ خود زعفرانی لباس میں بیٹھے تھے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ سفید خیمہ پر سوار تھے جس پر سنہری ارغوانی زین پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ چار ہزار گھوڑے سوار تھے اور ان کے گھوڑوں پر بھی ارغوانی زینیں تھیں۔ اور اس کے ساتھ تین سو سفید رنگ کے باندیاں تھیں جو زیورات سے آراستہ تھیں اور سرخ لباس پہنے سفید خیموں پر سوار تھیں۔ (۱)

۲۔ تو وہ لوگ کہنے لگے جو دنیوی زندگی کے آرزو مند تھے جیسا کہ رغبت کی لوگوں میں عادت ہوتی ہے۔ یعنی اے قوم! کاش انہیں بھی اسی قسم کا جاہ و جلال نصیب ہوتا جیسا قارون کو دیا گیا ہے۔ تو اس میں انہوں نے قارون کی مثل کی آرزو کی، اس کی اپنی دولت اور جاہ و شہرت کی آرزو نہیں کی تو انہوں نے ایسا حد سے بچنے کے لیے کیا اور یہ احتیاط اس لیے برقی کیونکہ بنی اسرائیل دنیا کے طالب ہونے کے باوجود مومن تھے۔ وہ وہ واقعی بڑا خوش نصیب تھا کہ اسے دنیا میں خط وافر نصیب ہوا۔ تو یہ جملہ ان کی آرزو اور تمنا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنِ اهْتَدَىٰ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلْقِيهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿۵۱﴾

”اور کہان لوگوں نے جنہیں (دنیا کی بے ثباتی کا) علم دیا گیا تھا۔ حیف تمہاری عقل پر ہے۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے۔ اس کے لیے جو ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے۔ اور انہیں رحمت کی جاتی یہ نعمت مجرب کر نے والوں کے ہے۔“

۱۔ جنہوں نے اس طرح کی آرزو کی تھی انہیں ان لوگوں نے کہا جنہیں اس نے علم دیا گیا تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے آخرت میں وعدہ کر رکھا ہے۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے علماء تھے۔ (۲)

۲۔ وَيْلَكُمْ میں ويل مصدر ہے اور اس کا معنی ہلاکت ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی هَلَكْتُمْ هَلَاكًا۔ یا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْوَيْلُ لَكُمْ اَللّٰهُ هَلَاكًا (اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور ہلاک کرے)۔ یہ حقیقت میں تو دعا ہے لیکن یہ ایسے عمل پر زبرد توابع کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ راضی نہ ہو۔

۳۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ثواب اس سے بہتر ہے جو کچھ قارون کو دیا گیا بلکہ دنیا و مافیہا سے بہتر اور افضل ہے اور تین اہل حق و صالحہ یا تو خیر کے متعلق ہے یا ثواب اللہ کے متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ثواب ایمان لانے والوں کے لیے بہتر ہے۔ یا یہ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ کے متعلق ہے۔ یعنی انہوں نے یہ اہل ایمان کو کہا۔

۴۔ یہ نیا کلام ہے یا یہ خیر میں موجود خیر سے حال ہے اور خیر کا مرجع وہ کلمہ ہے جس کے ساتھ ان علماء نے گفتگو کی۔ یا اس خیر کا مرجع ثواب ہے کیونکہ اس میں ثواب یعنی معصوبہ ہے۔ یا پھر یہ خیر جنت یا ایمان اور عمل صالح کے لیے ہے کیونکہ یہ دونوں سیرت اور طریقہ کے معنی میں ہیں۔ یعنی وہ کلمہ یا ثواب یا جنت یا سیرت عطا نہیں ہوگی مگر صرف ان لوگوں پر جنہوں نے طاعات پر قائم رہنے میں مبر

اختیار کیے رکھا اور معاصی اور گناہوں سے بچنے کے لیے دنیا سے دور رہے۔

فَحَسْبُنَا بِهِ وَدِدًا مِمَّا الْأَمْرُضُ ۖ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ
اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُتَنَصِّرِينَ ﴿٨٥﴾

”پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں۔ تو نہ تھی اس کے حامیوں کی کوئی جماعت جو (اس وقت) اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنا انتقام نہ لے سکا۔“

لے نہیں ہم نہ اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں غرق کر دیا تو اس کے حامیوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ فتنہ سے مراد ایسے ساتھیوں کا گروہ ہے جن کی طرف آدمی مصیبت اور تکلیف کے وقت رجوع کرتا ہے۔ فَحَسْبُنَا میں فاء تعلیلیہ ہے۔ کہ وہ اس سے عذاب الہی کو روکتے اور اسے بچا لیتے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا اس عذاب اور گرفت سے جو نصف اور غرق کی صورت میں اس پر اتری۔ مثلاً کہا جاتا ہے نصرہ من عدوہ فانصرو۔ (اس نے دشمن کے خلاف اس کی مدد کی پس وہ محفوظ ہو گیا) جب کہ وہ اسے روکے تو وہ رک جائے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فہما کئی پر ہے۔ علماء نے بذریعہ اخبار یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ علم رکھتا تھا، وہ تورات کا بہت بڑا قاری تھا، شکل و صورت کے اعتبار سے حسین تھا، بہت زیادہ مال و دولت کا مالک تھا اور آواز کے اعتبار سے انتہائی خوش الہان تھا۔ لیکن اس نے بغاوت اور سرکشی اختیار کر لی۔ اور اس کی بغاوت اور نافرمانی میں سب سے اول یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اپنی چادروں کے ساتھ چاروں طرف ایسے نیلے رنگ کا دھاگا باندھ لیں جس کی رنگت آسمان کی رنگت کی مثل ہو۔ تو وہ جب بھی اسے دیکھیں گے تو وہ انہیں آسمان کی یاد دلاتا رہے گا۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ بے شک میرا حکام اسی سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! کیا تو نے انہیں یہ حکم نہیں فرمایا کہ وہ اپنی چادریں مکمل طور پر نیلے رنگ میں رنگ لیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل تو ان دھاگوں کو حقیر جانیں گے۔ تو رب کریم نے جواب میں ارشاد فرمایا اے موسیٰ! بے شک میرے احکام میں سے چھوٹا حکم بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ پس جب انہوں نے ہر صغیر میں میری اطاعت و فرمانبرداری نہ کی، تو وہ بڑے حکم میں بھی میری اطاعت بجا نہیں لائیں گے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ساری قوم کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنی چادروں کے ساتھ آسمانی رنگ کے نیلے دھاگے باندھ لو۔ تاکہ تم بھی انہیں دیکھو تو اپنے رب کو یاد کرو۔ پس بنی اسرائیل نے ویسے ہی کیا جیسے موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا تھا لیکن قارون نے اظہار تکبر کیا اور آپ کی بات تسلیم نہ کی اور کہنے لگا کہ یہ عمل تو مالک اپنے غلاموں سے کراتے ہیں تاکہ وہ انہیں دوسروں سے ممتاز کر سکیں۔ یہی اس کی نافرمانی اور بغاوت کا پہلا اظہار تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر کو عبور کر لیا تو آپ نے ان کی قربانیاں ہارون علیہ السلام کے سپرد کر دیں یعنی قربانیوں کا انتظام و انصرام ان کے حوالے کر دیا۔ پس بنی اسرائیل اپنی قربانی کے جانور لے کر حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے پھر انہیں مذبح میں ذبح کر کے رکھ دیتے پھر آسمان سے آگ اترتی تھی اور انہیں کھا جاتی تھی قارون نے اسے اپنے دل میں بر مانتا یا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر کہا اے موسیٰ! رسالت تیرے لیے ہے، قربانیوں کا انتظام ہارون کے سپرد ہے اور میرے لیے کچھ بھی نہیں حالانکہ میں تو تورات کا بڑا قاری ہوں میں اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواباً

فرمایا۔ ہارون کو یہ عہدہ میں نے نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ تفویض کیا ہے۔ پھر قارون نے کہا میں تو آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم تفصیلاً مجھے دکھا دو۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو جمع کیا اور ارشاد فرمایا اپنے اپنے عصا لے آؤ۔ چنانچہ وہ لے کر آئے تو آپ نے انہیں اپنے انخیسے میں گاڑ دیا جس میں آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ پس وہ اپنی لافنیوں کی حفاظت کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ تو صبح کے وقت کیا دیکھا کہ صرف ہارون علیہ السلام کا عصا ان کے سامنے سبز پتوں کے ساتھ لہلہا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر قارون نے کہا قسم بخدا! یہ اس جادو سے زیادہ تعجب خیز نہیں جو آپ کرتے رہتے ہیں۔ پھر قارون اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر موسیٰ علیہ السلام سے علیحدہ ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے ساتھ قرابت داری کا تعلق ہونے کی وجہ سے نرم سلوک کرتے رہے اور وہ ہر وقت آپ کو اذیتیں پہنچاتا رہا اور اس کی سرکشی، تکبر و غرور اور عداوت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک گھر بنایا اور اس کا روزانہ سونے کا بنوایا اور اس کی دیواروں پر سونے کی پتیاں لگوائیں۔ بنی اسرائیل کے سردار صبح و شام اس کے پاس آتے جاتے تھے وہ انہیں کھانا کھلاتا اور وہاں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مسخر و استہزاء کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ تو قارون نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ اس طرح مصالحت کی کہ وہ ایک ہزار دینار کے بدلے ایک دینار، ہر ہزار درہم کے بدلے ایک درہم، ہر ہزار بکری میں سے ایک بکری اور ہر ہزار شے میں سے ایک شے بطور زکوٰۃ دے گا۔ پھر جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گیا اور اس کا حساب لگایا تو اسے بہت زیادہ پایا۔ لہذا اس نے اپنے آپ کو دینے کے لیے تیار نہ پایا پھر اس نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس سے کہا اے بنی اسرائیل! موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جس شے کا بھی حکم دیا تم نے اسے پورا کیا اور وہ شے اسے دی اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے مال بھی لے لے۔ یہ سن کر انہوں نے اسے کہا تو ہمارا سردار ہے جو چاہے حکم دے ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں کہا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فلاں زانیہ عورت کو لے آؤ۔ وہ اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے ہم اسے مال و دولت دیں گے۔ پس جب اس نے بنی اسرائیل کی موجودگی میں ایسا کر دیا تو یہ موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عورت کو بلایا اور قارون نے اس کے لیے ایک ہزار درہم مقرر کیے۔ ایک روایت ہے کہ ایک ہزار دینار مقرر کیے، ایک روایت میں ہے کہ سونے کا بھرا ہوا ایک طشت مقرر کیا اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اسے کہا کہ میں تجھے مال و دولت سے نوازاؤں گا اور تجھے اپنی بیویوں میں شامل کر لوں گا بشرطیکہ کل جب بنی اسرائیل حاضر ہوں تو تو موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی تہمت لگائے۔ پس دوسرے دن قارون نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ بنی اسرائیل آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ تم انہیں اور امروا ہی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ پس موسیٰ علیہ السلام باہر تشریف لائے۔ اس وقت بنی اسرائیل ایک کھلے میدان میں موجود تھے۔ آپ ان میں تشریف لائے اور فرمایا اے بنی اسرائیل! جس کسی نے چوری کی ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے۔ جس کسی نے دوسرے پر تہمت عائد کی ہم اسے اسی کوڑے لگائیں گے۔ اور جس نے زنا کیا اس حال میں کہ اس کی بیوی نہ ہو (یعنی وہ شادی شدہ نہ ہو) تو ہم اسے ایک سو درے لگائیں گے اور جو کوئی بیوی کے ہوتے ہوئے زنا کرے گا (یعنی شادی شدہ ہونے کی حالت میں) تو ہم اسے رجم کریں گے یہاں تک کہ وہ مر جائے گا۔ یہ سن کر قارون نے آپ کو کہا اگرچہ آپ خود ہی یہ کیوں نہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا اگرچہ میں بھی ایسا کروں۔ پس یہ سن کر اس نے کہا کہ بنی

اسرائیل تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ آپ نے فرمایا اسے بلاؤ۔ اگر اس نے بھی ایسا کہہ دیا تو ایسے ہی ہوگا جیسے اس نے کہہ دیا (یعنی میں تسلیم کر لوں گا)۔ پس جب وہ عورت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا فلا نہ! کیا میں نے تیرے ساتھ ایسے کیا ہے جیسے یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اس پر بڑا زور دیا اور اس رب کے وسیلے سے کہا جس نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو چھڑا دیا اور تورات نازل فرمائی کیا تو جہنم میں بولے گی؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ذہن کو بدل دیا۔ اس نے اپنے ہی دل میں کہا۔ آج کے دن تو جب کہ لیتا تیرے لیے اس سے کہیں افضل ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول کو اذیت پہنچاؤں۔ چنانچہ اس نے کہا ایسا نہیں انہوں نے جھوٹ بولا ہے۔ بلکہ قارون نے تو میرے لیے معاذہ مقرر کیا ہے کہ میں تم پر اپنے سے بدکاری کرنے کی تہمت لگاؤں۔ پس موسیٰ علیہ السلام روئے ہوئے مسجد میں گر گئے اور کہنے لگے اے اللہ! اگر میں تیرا رسول ہوں تو میرے لیے اس پر غضب نازل فرما تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی میں نے زمین کو تیرا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ جو چاہے اسے حکم دے وہ بجا لائے گی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! ابے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے قارون کی طرف بھی اسی طرح بھیجا ہے جیسے اس نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے۔ پس جو اس کے ساتھ ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ ٹھہرا رہے اور جو کوئی میرے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام کے تمام علیحدہ ہو گئے اور دو آدمیوں کے سوا قارون کے ساتھ کوئی بھی باقی نہ رہا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیتے ہوئے فرمایا انہیں پکڑ لے پس زمین نے انہیں پاؤں تک اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اس وقت وہ اپنے تخت اور فرش پر تھا۔ پس زمین نے اسے پکڑا تو اس کے تحت کواپے اندر غیب کر لیا۔ پھر آپ نے زمین کو حکم دیا انہیں پکڑ لے۔ پس زمین نے گھنٹوں تک انہیں اپنے اندر دھنسا لیا۔ پھر فرمایا اے زمین! انہیں پکڑ لے۔ تو زمین نے کروں تک انہیں گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پھر فرمایا اے زمین! انہیں اور پکڑ لے۔ تو زمین نے گردوں تک انہیں قبضے میں لے لیا۔ قارون اور اس کے ساتھی ہر بار عاجزی و ذاری کرتے رہے، قارون اللہ تعالیٰ اور اپنی قربت کے واسطے دیتا رہا حتیٰ کہ ستر بار اس نے آپ کو یہ واسطہ دیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے شدت غضب کی وجہ سے کسی بار بھی اس کی جانب توجہ نہ فرمائی۔ پھر فرمایا اے زمین! اسے پکڑ لے۔ پس زمین ان پر جڑ گئی (یعنی زمین نے انہیں مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا اور اوپر سے بند ہو گئی)۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی تیرا دل بھی کتنا سخت ہے کہ اس نے ستر بار تجھ سے فریاد کی لیکن تو نے اس کی دادری نہ کی مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم وہ اگر ایک بار بھی تجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی مدد ضرور کرتا۔ اور بعض آثار میں اس طرح مروی ہے کہ رب کریم نے فرمایا تیرے بعد میں زمین کسی کے تابع فرمان نہیں کروں گا (1)۔ قادیان نے کہا ہے زمین نے اسے اپنے اندر دھنسا لیا ہے پس وہ ہر روز آدمی کے قدم برابر نیچے دھنسنے لگا۔ لیکن یوم قیامت تک وہ زمین کی اتھاہ گہرائی تک نہیں پہنچے گا۔ قارون کا یہ حال ملاحظہ کرنے کے بعد بنی اسرائیل آپس میں یہ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے اس لیے بددعا کی ہے تاکہ اس کے گھر بار خزاں اور اس کے مال و متاع کے خود مالک بن جائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام تک یہ بات پہنچی تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی یہاں تک کہ زمین نے اس کے گھر خزاں اور تمام اموال کو اپنے اندر دھنسا لیا۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بیان کیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ مِنْكُمْ مَنْ يَتَذَكَّرُ مِنْ ذُنُوبِهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُتَتَّبِعِينَ (2)

وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَتَّبَعُوا مَكَانَهُ بِإِذْنِ اللَّهِ يَسْبُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْ لَا أَنْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا
وَيَكَاذِبُ الْكَافِرُونَ ﴿٥٥﴾

”اور صبح کی ان لوگوں نے جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے یہ کہتے ہوئے: اے اللہ! (اب پتہ چلا) حق کہ اللہ تعالیٰ

کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) حق اگر اللہ

تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا۔ اے اللہ! (اب پتہ چلا) کہ کفار ہمارا نہیں ہوتے۔“

۱۔ اور یہ کہتے ہوئے ان لوگوں نے صبح کی جو اس کے مرتبہ کی کل تک یعنی زمانہ قریب تک آرزو کر رہے تھے۔

۲۔ ”وَيَكَاذِبُ“ یہ لفظ بھریوں کے نزدیک وحی اور سخاوت سے مرکب ہے۔ اس میں وحی تعجب کے لیے ہے اور سخاوت تشبیہ کے لیے ہے۔

اور اس کا معنی ہے دونوں امر ایک دوسرے کے کتنے مشابہ ہیں۔

۳۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے)

یعنی یہ دونوں امر برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ اس کی وسعت و کشادگی کا سبب عزت و تکریم ہے جو اس میں

فراخی کا تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی رزق میں تنگی کسی اہانت اور حقارت کے سبب ہوتی ہے جو اس میں تنگی اور کمی کا باعث بنتی ہے (ایسا ہرگز

نہیں بلکہ دونوں کا مدار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے)۔ ظلیل نے کہا ہے کہ وحی اسم فعل ہے اور تعجب کے معنی کے لیے ہے۔ اور عناد امت

کے اظہار کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ لوگ نادم ہوئے اور انہوں نے اپنے گزشتہ اعمال پر عناد امت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا۔ اور سخاوت

کا معنی ہے میں ایسا گیان کرتا ہوں اور میں (میرا یہ اندازہ ہے) ایسا خیال کرتا ہوں جیسا کہ کوئی کہتا ہے ”سَخَاةُ الْفَرْخِ

فَذَاتُكَ“ (میں یہ خیال کرتا ہوں یا مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خوشی حیرا مقدر ہے)۔ قطرب نے کہا ہے وَنَيْكٌ وَنَيْلُكَ کے معنی میں

ہے اس سے لام حذف کر دی گئی ہے اور اُن فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَنَيْلُكَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ يَسْبُطُ

الرِّزْقَ وَيَقْدِرُ (تو بلاک ہو جائے یہ یقین کر لے اللہ تعالیٰ ہی رزق کو وسیع بھی کرتا ہے اور تنگ بھی)۔ یہ قول بھی ہے کہ وَنَيْلُكَ حَرْفُ

تنبیہ ہے اور قائم مقام آلا کے ہے۔ اور حسن سے مراد یہ ہے کہ یہ کلمہ ابتدائیہ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاِنَّ اللّٰهَ اَخْبَرَ عِبَادَهُ

اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا تو نہیں جانتا۔ قتادہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا تو نہیں دیکھا۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ کلمہ تقریر

ہے جیسے کسی کا یہ قول ”اَمَّا تَوَسَّى اِلٰی صُنْعِ اللّٰهِ وَاسْتِغْنَانِهِ“ کیا اللہ تعالیٰ کے حسن سلوک اور اس کے احسان کی طرف تو نہیں دیکھ رہا

ہے۔ یعنی تو ضرور دیکھ رہا ہے۔ فراء نے یہ بھی ذکر کیا کہ میں ایک بدوی عورت کو اپنے خاندان کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اِنَّ اَيْنُكَ (تیرا بیٹا

کہاں ہے؟) تو اس نے جواب دیا ”وَيَكَاذِبُ وَزَاةُ النَّبِیِّ“ یعنی کیا تو اسے گھر کے پیچھے نہیں دیکھ رہی؟ (۱) یعنی تو دیکھ رہی ہے کہ وہ

وہاں ہے۔)

۴۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا ”لَخَسَفَ“ میں حفص اور یعقوب نے فضل معروف کی صورت میں خاء اور سین کو مفتوح پڑھا

ہے۔ اور عام قرآن نے فضل مجہول ہونے کی بناء پر خاء کو غموم اور سین کو مکسور پڑھا ہے۔ تو وہ ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا جیسے اس نے

تارون کو گاڑ دیا۔

ہے اور وہ اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والے، اور رسولوں کو اور ان وعدوں کو بھٹانے والے جو انہوں نے آخرت کے ثواب کے بارے ان سے کیے ہمارے نہیں ہوتے۔ یہاں پر تثنیہ کے علاوہ ویکانۃ کے دیگر تمام معانی مراد لیا صحیح ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمَشْقِينِ ﴿٣٧﴾

”یہ آخرت کا گھر ہم مخصوص کر دیں گے اس (کی نعمتوں) کو۔ ان لوگوں کے لیے جو خواہش نہیں رکھتے زمین میں بڑا بے نیکی کی اور نہ فساد برپا کرنے کی اور اچھا انجام پر ہیزگاروں کے لیے ہے۔“

۱۔ تلک اسم اشارہ تعظیم کے لیے ہے اور یہ اس کی صفت کی صفت ہے (یعنی الاخرۃ الدار کی صفت ہے اور الدار تلک کی صفت ہے)۔ گویا کہ فرمایا یہ ہے کہ یہ دار آخرت جس کے بارے تم نے سن رکھا ہے اور اس کے اوصاف تم تک پہنچ چکے ہیں۔ نَجْعَلُهَا تلک مبتدا کی خبر ہے۔

۲۔ کلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ہیں جو ایمان قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی نہیں کرتے۔ عطاء نے کہا ہے وہ جو لوگوں پر غلبہ پانے اور جبر کرنے کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ حسن نے کہا ہے وہ لوگ جو بادشاہ کے پاس عزت و شرف کے طالب نہیں ہوتے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ یہ آیت ان حاکموں اور با اختیار لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو قدرت ہونے کے باوجود تواضع اور انکساری کرتے ہیں (1) یعنی والیوں میں سے وہ جو قدرت کے باوجود تواضع کرتا ہے اور زمین میں بڑا بے نیکی کی خواہش نہیں رکھتا۔

۳۔ کلبی نے کہا ہے فساد سے مراد غیر اللہ کی عبادت کے لیے دعوت دینا ہے۔ مگر مے نے کہا ہے اس سے مراد بغیر حق کے لوگوں کا میل و متاع لینا ہے۔ اور ابن جریج اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد معاصی اور گناہ کا عمل کرتا ہے۔ (2)

۴۔ قتادہ نے کہا ہے عاقبت سے مراد جنت ہے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ نیکیوں کے انجام اور ان پر دیے جانے والے ثواب کے لیے عاقبت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ برائیوں کے انجام اور ان پر ہونے والے عذاب کے لیے عقاب استعمال ہوتا ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٨﴾

”جو کرے نیکی تو اس کے لیے بہتر صلہ ہے اس نیکی سے اور جو ارتکاب کرتا ہے برائی کا تو نہ بدلہ دیا جائے گا انہیں

جنہوں نے بدکاریاں کیں۔ مگر اتنا جتنا انہوں نے کیا۔“

۱۔ نیکی کا صلہ دینا سے لے کر سات سو گنا تک ہے اور اس سے آگے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے اور وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ میں مضمرب کی جگہ مظہر کو رکھا گیا ہے یعنی فلا یعجزون کی جگہ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ رکھا گیا ہے تاکہ ان کی طرف

برائی کی نسبت دوبار کرنے سے ان کے حال کی حقارت اور برائی بیان ہو۔

یعنی اِلاَ یَجْعَلْ مَا کَانُوا یَعْبُدُونَ مگر اسی کی مثل، جتنا عمل انہوں نے کیا۔ اس میں لفظ محذوف ہے اور مَا کَانُوا یَعْبُدُونَ کو مماثلت میں مباہلہ کے اظہار کے لیے اس کے قائم مقام بنادیا ہے۔ (یعنی برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کی برائی کے برابر سزا دہی جائے گی)

إِنَّ الْإِنَّمَىٰ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِمَ آدُوكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۖ قُلْ رَبِّیْ أَعْلَمُ مِنْ جَاءِ
بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي صُلُبِ مُؤْمِنٍ ﴿٥٨﴾

” (اے محبوب) یقیناً وہ (قادر مطلق) جس نے آپ پر قرآن کی تبلیغ فرض کی ہے آپ کو واپس لے جائے گا جہاں آپ

چاہے ہیں۔ آپ فرمائیے میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو آیا ہدایت یافتہ ہو کر اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے۔“

۱۔ یعنی بے شک وہ قادر مطلق جس نے آپ پر قرآن کریم کی تلاوت، تبلیغ اور اس کے مطابق عمل فرض کیا ہے۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔ اور بخونٹی نے کہا ہے کہ اگر مفسرین نے کہا ہے اس کا معنی ہے۔ یعنی بے شک وہ جس نے آپ پر قرآن کریم نازل کیا ہے۔ وہ آپ کو مکہ کی طرف واپس لے جائے گا (1)۔ تحقیق رب کریم نے آپ کو فتح مکہ کے دن واپس مکہ مکرمہ میں لوٹا دیا۔ معاذ کو کفرہ ذکر کیا ہے۔ اور اس کی تئیں اس کی (مکہ) عظمت و شان کو بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ یہی وہ شہر ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ لوٹ کر تشریف لائے۔ دشمنوں پر آپ کو غلبہ عطا ہوا، اسلام کو بلندی نصیب ہوئی اور کفر و شرک ذلیل و خوار ہوا۔ عوفی نے حضرت ابن عباس سے یہی روایت نقل کی ہے (2)۔ اور معاذ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ فقہی نے کہا ہے کہ کسی آدمی کا معاد سے مراد اس کا وہ شہر ہوتا ہے جس سے جانے کے بعد پھر وہ اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے (3)۔ علامہ بخونٹی نے ذکر کیا ہے کہ حضور بنی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے غار سے نکلے تو آپ ﷺ دشمن کے تعاقب کے ڈر سے عام راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے پر چلے گئے۔ پس جب آپ خطرے سے محفوظ ہوئے تو صحیح راستے کی طرف لوٹ آئے اور مکہ اور مدینہ کے درمیان جھکے کے مقام پر آپ نے نزول فرمایا۔ تو جب آپ ﷺ نے اس مقام سے مکہ کی طرف جانے والے راستہ کو پہچانا تو آپ میں مکہ مکرمہ کا اشتیاق پیدا ہوا تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا کیا آپ اپنے شہر اور اپنی جائے ولادت کے لیے مشتاق ہیں؟ تو آپ نے فرمایا جی ہاں۔ تو اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَإِنَّا لَأَنزِلُكَ عَلَىكَ الْغُرْآنَ لِتَرْكَأَهُ إِلَىٰ مَعَادٍ** اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے دن آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ واپس لوٹا دیا۔ ابن ابی حاتم نے ضحاک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہ آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان جھکے کے مقام پر نازل ہوئی۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کی ہے کہ معاد سے مراد موت ہے (4)۔ میں کہتا ہوں چونکہ موت کے ذریعے اصلی حالت کی طرف لوٹنا ہوتا ہے۔ اسی لیے معاد کو موت کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **لَنُنَبِّئَنَّكَ أَمْرًا فَاغْنِيَاكَ عَنْهُ** **لَنُنَبِّئَنَّكَ** زہری اور مکرمہ نے کہا ہے کہ معاد سے مراد قیامت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد جنت ہے (5) کیونکہ جب اللہ تعالیٰ

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التحریر)

3- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التقاریہ)

5. تفسير بغوي، جلد 5 صفحہ 154 (التجارة)

۱۔ اور (خیال رہے) کفار کہ آپ کو ہرگز نہ روکیں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔ اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف نازل کی گئیں اور لوگوں کو اپنے رب کی معرفت، توحید اور عبادت کی طرف بلائیے۔ اور کفار کی امداد کرنے کے سبب ہرگز مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ
الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۹﴾

”اور نہ پکارو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو۔ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس

کی ذات کے۔ اے اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹا یا جائے گا۔“

۱۔ اس آیت اور ماقبل آیات میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ مشرکین کی اس حرص اور امید کو کلیۃً ختم کر دیں کہ آپ ان کی کوئی امداد کریں گے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ یہ ایک مذکورہ نمبی کی علت بیان کر رہی ہے۔ اور كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کا معنی ہے کہ اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا ہر شے ٹھکن ہے اپنی ذات کے اعتبار سے ہلاک ہونے والی اور معدوم ہے۔ ہر شے کا وجود اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ہے اور مستعار ہے۔ بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ ہر عمل لغو اور باطل ہے مگر وہ جس سے اس کی ذات کی رضا مقصود ہو۔ جملہ کل شیء سابق کلام کی علت ہے۔

۲۔ مخلوق میں اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں آخرت میں لوٹا یا جائے گا۔ پس وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دے گا۔

سورۃ القصص کی تفسیر 28 ربیع الاول بمطابق 1206ھ انتقام پذیر ہوئی بحمد اللہ۔

سورۃ القصص کا ترجمہ 3 رمضان المبارک 1420ھ، 12 دسمبر 1999ء بروز اتوار بوقت سوا دس بجے شب اپنے انتقام کو پہنچا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ ذَٰلِكِ

سورة العنكبوت

﴿انباہا ۶۹﴾ ﴿سورة العنكبوت ۲۹﴾ ﴿مکہوعاھا ۷﴾

سورة العنكبوت کی ہے اور اس کی انہر آیتیں اور سترہ رکوع ہیں۔ اس کی پہلی دس آیتیں مدنی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان بخیر رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَمْ اَحْبِبِ النَّاسَ اَنْ يُّشْرِكُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اَمْنًا وَّهُمْ لَا يُفْقِنُوْنَ ①

”الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔“

۱۔ ابن ابی حاتم نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مکہ میں ہی مقیم تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف لکھا کہ تمہاری جانب سے اسلام کا اقرار قابل قبول نہیں ہوگا یہاں تک کہ تم ہجرت نہ کرو۔ چنانچہ وہ یہ خط پا کر مدینہ طیبہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ لیکن مشرکین مکہ نے ان کا تعاقب کیا اور انہیں واپس پھیر لائے۔ تو ان اہل ایمان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (۱)۔ اَلَمْ اَحْبِبِ النَّاسَ اَنْ يُّشْرِكُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اَمْنًا وَّهُمْ لَا يُفْقِنُوْنَ پھر اہل مدینہ نے ان کی طرف لکھا کہ تمہارے متعلق اس طرح حکم نازل ہوا تو پھر انہوں نے کہا کہ اب ہم نکلے گئے۔ اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔ چنانچہ مشرکین نے پھر ان کا تعاقب کیا تو انہوں نے ان سے قتال کیا۔ نتیجہ کچھ ان میں سے شہید ہو گئے اور کچھ نکلے۔ مدینہ طیبہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو پھر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ رَبَّكَ لَذِيْ نُّعْنٌ فَاجْزُوْا وَاَنْتُمْ بِنِعْمِ اللّٰهِ عَلٰی سَاحِلٍ اَمْنٍ اور قادیان سے بھی اسی طرح منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے۔ پس مشرکین نے ان سے تعرض کیا تو وہ واپس لوٹ آئے۔ پھر مدینہ طیبہ میں ان کے رہنے والے ان کے اہل ایمان بھائیوں نے ان کی طرف یہ آیت لکھ کر بھیج دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں نازل فرمائی۔ تو پھر وہ بارہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ پس ان میں سے جو شہید ہوئے سو شہید ہوئے اور جو نکلے گئے میں کامیاب ہوئے سو کامیاب ہوئے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ رَبَّكَ لَذِيْ نُّعْنٌ فَاجْزُوْا وَاَنْتُمْ بِنِعْمِ اللّٰهِ عَلٰی سَاحِلٍ اَمْنٍ اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے الناس سے مراد وہ لوگ لیے ہیں جو مکہ مکرمہ میں ایمان لائے یعنی سلمہ بن ہشام، عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور عمار بن یاسر وغیرہ۔ (3)

ابن سعید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبید اللہ بن عسیر سے نقل کیا کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسرؓ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اذیتیں دی جاتی تھیں۔ یعنی اَحْبِبِ النَّاسَ (۴)۔ علامہ بغوی نے ابن جریج کا قول بھی اسی طرح نقل

۱۔ الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ 268 (العلیہ)

۱۔ الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ 268 (العلیہ)

۴۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 83 (الامیر یہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد ۵، صفحہ 155 (التجاریہ)

کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت حضرت عمر فاروق اعظم بن خطابؓ کے غلام کنج بن عبد اللہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اور یہی وہ بلند اقبال آدمی ہے جسے اس امت میں سے سب سے پہلے باب جنت کی طرف بلایا جائے گا (1)۔ میں کہتا ہوں یہی وہ آدمی ہے جو غزوہ بدر کے دن مسلمانوں کی صفوں سے سب سے پہلے مقابلے کے لیے باہر نکلا تھا اور پھر عامر بن حصیری نے تیر مار کر انہیں شہید کر دیا۔ اور سب سے پہلے شہید ہونے والا یہی ہے جیسا کہ نبیل الرشاد میں ہے۔ اور جب اس کے والدین اور بیوی نے اس کی شہادت پر اظہار غم کیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اَلَمْ کے بعد ہمزہ استفہام کا واقع ہونا اس کے مستقل آیت ہونے کی دلیل ہے (کیونکہ ہمزہ استفہام صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ مستقل آیت نہ ہوتی تو پھر ہمزہ اس کے بعد کی بجائے اس سے پہلے آتا۔ مترجم)۔ جسبان سے مراد ظن (گمان) ہے اور اس کا تعلق جملہ کے مضمون سے ہے کیونکہ یہ اس کے ثبوت کی حجت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے یہ دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے یا پھر اس کا جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہو۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اَنْ يُّنْزِلُوْا اَنْتُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ اور اس میں وَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ يَنْقُلُوْا کے قائل سے حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں بغیر کسی آزمائش میں جلا کیے صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے (اَظَنُّوْا فَرَحَهُمْ غَيْرُ مَفْتُوْنِيْنَ لِقَوْلِهِمْ اَنْتُمْ) تو اس میں ترک مفعول اول اور غیر مفتونین سے مکمل کرنے کے لیے ہے۔ اور لِقَوْلِهِمْ دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ اس قول کی مثل ہے۔ حسب ضربه للعذاب۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ اِدْعَا اِيْمَانُكُمْ اِنْ تَرَوْهُ مُضِلٌّ سَبِيْغًا يُّغْوِيْكُمْ اور اس میں اِدْعَا اِيْمَانُكُمْ کے معنی ہیں۔ یعنی انہیں ایسا گمان نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ تو انہیں بڑی مشقت آجیز آزمائشوں میں مبتلا کرے گا مثلاً ہجرت، جہاد اور دیگر طرح طرح کی مصیبتیں جن کا تعلق ان کی ذاتوں، مال اور اولاد سے ہے۔ تاکہ وہ منافقین سے مجلس کو اور مضطر سے دین پر ثابت قدم رہنے والے کو ممتاز کر دے۔ اور اس لیے بھی تاکہ وہ ان آزمائشوں میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامنے کے سبب درجات علیا پر فائز ہو سکیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتداء میں صرف ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور پھر ان پر نماز، زکوٰۃ اور دیگر تمام احکام شریعہ فرض کیے۔ تو ان میں سے بعض پر یہ امور شاق گزرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ تو اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا۔ کیا وہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں صرف ایمان پر ہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں مزید اوامر و نواہی کے سبب آزمایا نہیں جائے گا؟۔ ایسا نہیں کیونکہ بے شک صرف ایمان بھی ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہنے کے مانع ہے لیکن اعلیٰ مراتب اور بلند درجات تو طاعات پر عمل بردار ہونے اور شہادت چھوڑنے کے سبب ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلْيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَصْدَقُوْا وَلْيَعْلَمَنَّ الَّذِيْنَ يَكْذِبُوْنَ ۝۱

”اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔ پس ان میں سے بعض کو آدوں سے چیم ڈالا گیا، بعض ایمان) میں نیچے تھے۔ اور ضرور دیکھے گا (ایمان کے) جموں نے (جو یہ اردن کو سن)“

۱۔ اور بے شک ہم نے ان انبیاء اور مؤمنین کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزرے۔ پس ان میں سے بعض کو آدوں سے چیم ڈالا گیا، بعض کو قتل کر دیا گیا۔ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے سبب آزمایا گیا کہ وہ انہیں شدید ترین عذاب دیتا رہا۔ یہ جملہ یا تو اخسیب کے قول کے

ساتھ متصل ہے یا پھر لَا یُفْقِدُونُ کے ساتھ یعنی یہ قدیمی طریقہ ہے جو تمام امتوں میں جاری رہا لہذا کسی کو بھی اس کے برعکس توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یا پھر یہ جملہ مترجمہ ہے اور مؤمنین کی تسلی کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا جو اپنے قول امتنا میں سچے تھے۔ یہ جملہ وَلَقَدْ فَتَنَّا پر معطوف ہے۔ اور اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ تو ازل سے جانتا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم کا اس حالت کے ساتھ تعلق ہو جائے جس کے سبب وہ انہیں جو ایمان میں سچے ہیں ممتاز کر دے گا جو ایمان میں جھوٹے ہیں۔ اور اس کے سبب وہ انہیں ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر عذاب مسلط کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سچ بولنے والوں کو جھوٹ بولنے والوں سے الگ ظاہر کر دے گا تاکہ اس کی معلومات کا اظہار ہو جائے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا اور بعض نے کہا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک اور طیب سے ممتاز کر دے لَیْسَ بِیَوْمِئِذٍ لِلْعَنِیَّتِیْنِ حَافِظٌ۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۷﴾

”کیا خیال کر رکھا ہے انہوں نے جو کرے ہیں برے کر تو ت کو وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے۔ بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔“

۱۔ کیا انہوں نے خیال کر رکھا ہے جو کفر اور گناہ کر رہے ہیں۔ (اس میں لفظ عمل دل اور دیگر اعضاء جسمانی کے تمام افعال کو شامل ہے) کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے اور ہم ان سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اُن اپنے صلہ کے ساتھ مل کر حسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور وہ حسب پر معطوف ہے۔ اس میں اُم منقطعہ بمعنی مل ہے۔ اور یہ اضراب اس لیے ہے کیونکہ یہ حسبان پہلے حسبان کو باطل کرتے رہا ہے۔ کیونکہ پہلے حسبان میں گمان یہ ہے کہ ایمان کے سبب انہیں مزید آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا اور اس میں یہ ہے کہ انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ پہلا گمان کرنے والے اہل ایمان تھے اور یہ دوسرا گمان رکھنے والے کافر تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ اُم متعلق ہو۔ اور انکار دو گمانوں میں سے ایک پر وارد ہو۔ اس طرح ان دونوں میں ہمزہ اور ام کے ذریعے تردید پیدا کر دیا گیا۔ اور انکار سے حاصل ہونے والی نفی کے محل میں مکرہ عام ہوگا۔ پس معنی یہ ہوگا کہ یہ دونوں گمان باطل ہیں۔ پس اے مؤمنین تم یہ گمان نہ کرو کہ تمہیں آزمایا نہیں جائے گا بلکہ تمہیں تو شدید ترین تکالیف اور مصائب کے ساتھ آزمایا جائے گا تاکہ تم مرا تب ر فید اور درجات علیا کو پاسکو۔ اور تمہارے دشمن یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں انہیں عذاب نہیں دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں مؤمنین کے اتھوں عذاب اور تکلیف میں مبتلا رکھے گا اور آخرت میں اپنی طرف سے عذاب دے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل ایمان کو پہلے مصائب و آلام سے آزمایا جائے گا پھر بالآخر انہی کو غلبہ بھی عطا ہوگا۔

۲۔ سَاءَ مَا یَحْكُمُونَ میں ماموصلہ ہے اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا پھر یہ ماسموصوفہ ہے اور ضمیر مرفوع مستتر بہم سے تیز ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور مخصوص بالذم محمد ذوف ہے۔ یعنی بہت برا ہے ان کا یہ فیصلہ جو وہ کر رہے ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہے بِئْسَ الَّذِیْ یَحْكُمُوْنَهُ حُكْمُهُمْ هٰذَا بِئْسَ حُكْمًا یَحْكُمُوْنَهُ حُكْمُهُمْ هٰذَا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُو الْإِقَاءَ اللَّهُ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ①

”جو شخص امید رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی (تو وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے۔

اور وہی ہر بات سننے والا، ہر چیز کو جاننے والا ہے۔“

۱۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں مراد خوف ہے۔ یعنی جو شخص دوبارہ قبروں سے اٹھائے جانے کا حساب و کتاب اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی حرص اور طمع رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کی آرزو رکھتا ہے (۱)۔ پس اسی آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا مگر یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج اپنے رب کریم کو دیکھا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ دیدار اس دنیا سے خارج تھا۔ لہذا جس کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس دنیا میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیدار الہی کیا ہے تو اس نے کذب بیانی کی ہے۔

۲۔ اَجَلَ اللَّهِ میں لفظ اللہ سے پہلے لفظ مصناف مجزوف ہے۔ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مقررہ وقت بالیقین ضرور بر ضرور آنے والا ہے۔ متقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے قیامت کا دن بالیقین آنے والا ہے (۲)۔ پس آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے کاموں کی طرف جلدی کرے جنہیں کرنے کے سبب وہ اپنی آرزو اور امید کو پا سکتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس سے وہ ڈر رہا ہے۔ اور یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے قَدْ كَانَ يَرْجُو الْإِقَاءَ رَبَّهُ فَنِعْمَ الْعَبْدُ الَّذِي لَقِيَ اللَّهَ ۚ

وَمَنْ جَاهَدْ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ① إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ②

”اور جو شخص کوشش کرتا ہے (حق کو سر بلند کرنے کی) تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے

تمام کائنات سے۔“

۱۔ اور جو شخص جنگ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کفار کے خلاف کوشش کرتا ہے۔ یا اپنے نفس کے خلاف اسے ایسی خواہشات پوری کرنے سے روک کر جہاد کرتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور اطاعت و فرمانبرداری پر صبر و استقامت اختیار کر کے اور شیطان کے وسوسوں سے بچنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے کیونکہ اس کے منافع اسی کی طرف راجع ہوں گے اس جملے کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی کوئی حاجت نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے محض ان پر رحمت فرماتے ہوئے اور ان کے مصالح و منافع کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں عبادت کا تکلف بنایا۔ یہ جملہ سابقہ کلام کے لیے علت بن رہا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ

أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ①

”اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔ تو ہم دور کر دیں گے ان سے ان کی برائیوں (کی نحوست کو)۔ اور

ہم انہیں بہت عمدہ بدلہ دیں گے۔ ان (اعمال حسد) کا جوہہ کیا کرتے تھے۔“

یعنی ہم ان کی برائیوں کو نیکیوں کے سبب ختم کر دیں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان المبارک دوسرے رمضان المبارک تک ان تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیان وقت میں کیے جائیں بشرطیکہ آدمی گناہ کبیرہ سے اجتناب رکھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ اس کی وضاحت اس ارشاد کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ **إِنْ تَجِدُوا آدَمِيًّا مَرْغُوبًا فَهُوَ مِنْكُمْ وَعَلَى اللَّهِ عِلْمُكُمْ سَبِيلُكُمْ**

یعنی اور ہم انہیں ان کے احسن اعمال کا بہت عمدہ بدلہ دیں گے احسن عمل سے مراد اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ یعنی ہم انہیں ضائع نہیں کریں گے۔ اور اس کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہم انہیں اس سے کہیں زیادہ حطافہ مانگیں گے جو انہوں نے عمل کیے یعنی دس دن سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر اسے جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں احسن بمعنی حسن ہے۔ یعنی یہ امر تفصیل کے معنی میں نہیں بلکہ صفت مشبہ کے معنی میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ①

”اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اور اگر وہ یہ کوشش کریں تیرے ساتھ کہ تو شریک بنائے کسی کو میرا جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو (اس بات میں) ان کی اطاعت نہ کر۔ میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے۔ پھر میں آگاہ کروں گا تمہیں ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے۔“

لے وصیت سے مراد کسی غیر کو ایسے کام کی تلقین کرنا ہے جس میں نصیحت موجود ہو۔ یعنی ہم نے اسے والدین کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا حکم دیا جو حسین ہو۔ گویا کہ وہ اپنی ذات میں بہت زیادہ حسن پائے جانے کے سبب مر یا حسن ہو اور وہ فعل اس کے والدین کے شایان شان ہو۔ یعنی ان کے ساتھ حد درجہ نیک سلوک کرے اور ان پر مہربان رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے صاحب حسن انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ابی حاتم اور ابن مردودہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ سعد بن مالک ابو اسحاق زہری اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے، ان کا شمار سابقین الاولون میں تھا اور اپنی والدہ کے بہت زیادہ فرمانبردار تھے کہ جب آپ شرف باسلام ہوئے تو ان کی ماں نے کہا (اور وہ حسد بنتی اسفیان بن امیہ بن عبد شمس تھی) (تحقیق اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ ایک روایت میں سے) کہ یہ کیا ہے جو تو نے نبیادین اپنا لیا ہے۔ قسم بخدا! میں ہرگز نہ کھانا نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی پانی پیوں گی یہاں تک کہ میں مر جاؤں گی۔ جب تک کہ تو اس نئے دین کا انکار نہ کر دے (2)۔ اور ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ تو اس دین کی طرف واپس لوٹ آئے جس پر تو پہلے تھا۔ ورنہ میں اسی حال میں مر جاؤں گی اور ہمیشہ کے لیے تجھے یہ کہہ کر عار دلائی جاتی رہے گی کہ یہ اپنی ماں کا قاتل ہے۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی **وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا**۔

یعنی اور ہم نے اسے کہا اگر تیرے ساتھ یہ کوشش کریں کہ تو کسی کو میرا شریک بنائے۔ جس کی الوہیت

کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو اس میں تو ان کی اطاعت نہ کر یہاں الوہیت کی نفی کو اس کے علم کی نفی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس شے کے صحیح ہونے کا علم نہ ہو اس کی اتباع جائز نہیں ہوتی۔ اگر چاہے باطل ہونے کا علم بھی نہ ہو چہ جائیکہ ایسی چیز جس کے بطلان کا علم دلائل قطعیہ سے ہو تو پھر اس کی اتباع کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خالق کی معصیت و نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں۔ اسے احمد اور حاکم نے روایت کیا ہے (1)۔ اور اسے صحیح کہا ہے انہوں نے اسے عمران اور حکم بن عمرو انفاری سے نقل کیا ہے۔ اور حسین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اطاعت تو نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے (2)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ پھر حضرت سعد کی والدہ ایک دن رات ٹھہری رہی نہ اس نے کچھ کھانا نہ پیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تین دنوں تک ایسے ہی ٹھہری رہی۔ پھر حضرت سعد آئے اور کہا اِنَّمَا لَمْ تَكُنْ لَكَ بِمَاءٍ نَفْسٍ فَخَرَجْتُ نَفْسًا نَفْسًا مَا تَرَكْتُ ذِيْنِي اِنْ شِئْتَ كَلْبِيْ وَ اِنْ شِئْتَ فَلَا تَخْلِيْ - فَلَمَّا اَبَسَتْ بَنُوْهُ اَكَلَتْ وَ شَرِبَتْ (4)۔ (اے میری ماں! اگر تیرے لیے جو جانیں ہوتیں پھر وہ ایک ایک کر کے نکل جائیں تو بھی میں اپنا دین نہیں چھوڑوں گا اب اگر چاہے تو کھالے اور اگر چاہے تو نہ کھا۔ پس جب وہ ان سے مایوس ہو گئی تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔) اور وہ آیت بھی اس حد کے قصہ میں ہی نازل ہوئی جو سورۃ لقمان میں ہے اور وہ بھی جو سورۃ الاحقاف میں ہے۔

نہ پھر میں تمہیں ان اعمال کی جزا دے کر تمہیں آگاہ کروں گا جو تم کیا کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ①

”اور جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے۔ تو ہم ضرور شامل کر لیں گے انہیں نیکوں (کے زمرہ) میں لے۔“

۱۔ صالحین سے مراد انبیاء شہداء اور اولیاء ہیں یعنی ہم اعمال صالحہ کرنے والے اہل ایمان کو ان کے گروہ میں شامل کر لیں گے اور ان ہی کے ساتھ انہیں اٹھائیں گے۔ یا انہی کے ساتھ انہیں جنت میں جگہ دیں گے۔ صلاح میں کمال ہی مومنین کے درجات کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء و مرسلین کی بھی مستجابی ہے۔ کیونکہ اصلاح کمال سے مراد اعتقادہ اعمال، اخلاق اور دیگر مشاغل میں کسی بھی اعتبار سے فساد اور خرابی کا نہ ہونا ہے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ پر ہے۔ اور ان کے مابین جملے معترضے ہیں۔ ابن جریر اور ابن منذر نے تکرار کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ میں سے ایک قوم اسلام لائی۔ اور وہ لوگ اسلام کو سختی سے رکھ رہے تھے کہ مشرکین انہیں غزوہ بدر میں اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ لوگ مقتول ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے بارے میں یہ کہا کہ یہ تو مسلمان تھے۔ انہیں جنگ میں مجبور لایا گیا۔ پس آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا مغفرت کی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَقَّعْتُمْ لَكُمْ اَلَيْكَةِ تَطَالِيْحٍ اَنْتُمْ لَكُمْ (4)۔ یہ آیت سورۃ النساء میں ہے۔ تو اہل مدینہ نے یہ آیت لکھ کر ان کی طرف بھیج دی جو ان میں سے مکہ مکرمہ میں باقی رہے تھے۔ اور لکھا کہ اب ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ کے ارادہ سے نکل پڑے۔ تو مشرکین انہیں پیچھے سے جا ملے اور انہیں واپس لوٹا کر لے گئے۔ تو پھر آیت وَ مِّنَ النَّاسِ نَازِلٌ ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةً النَّاسَ
كَعَذَابٍ لِلّٰهِ ۖ وَلَٰكِنَّ جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۖ أَوَلَيْسَ
اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝

”اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اللہ پر۔ پھر جب ستایا جائے اسے راہ خدا میں تو بتا دیتا ہے لوگوں کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر لے اور اگر آجائے نصرت آپ کے رب کی طرف سے تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہر اس چیز کو جو لوگوں کے سینوں میں (پہنا) ہے ج۔“

لے اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ پہلے مؤمنین کا ذکر فرمایا اور پھر منافقین کا ذکر کیا۔ یعنی جب کفار انہیں اسلام لانے کی بناء پر اذیتیں دیتے ہیں تو وہ انکار کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کا آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر بتا لیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگوں کی اذیت سے گھبرا جاتے ہیں اور صبر نہیں کر سکتے۔ پس وہ لوگوں کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اور اسلام کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں جیسے مسلمان آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ڈر سے کفر اور معاصی کو ترک کر دیتے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرط کا عطف من کے صلہ پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے ان کی طرف یہ آیت کریمہ لکھ کر بھیج دی تو پھر انہوں نے آپس میں گروہ بندی کی، اور کہا اب ہم ٹھکس گئے اگر کسی نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی لَمْ يَأْتِ رَبَّكَ الْبَلَاءُ حَتَّىٰ تَأْتِيَكَ بِهَا تِلْكَ الْأَيَاتُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْكَ آيَاتُكَ فَكَفَىٰ ۚ اُنہوں نے یہ آیت لکھ کر بھیج دی۔ تو پھر وہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ مشرکین نے ان کا تعاقب کیا۔ پس جنہوں نے نجات پائی سو نجات پائی اور جو قتل ہوئے سو قتل ہو گئے۔ اور قحادہ سے یہ مروی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں مشرکین واپس مکہ کی طرف لوٹا کر لے گئے تھے۔ (۱)

ج۔ اور اگر مؤمنین کے لیے آپ کے رب کی طرف سے فتح اور نصرت کی صورت میں مدد آجائے۔ تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو دین میں تمہارے ساتھ تھے۔ یہ لفظوں میں محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور معنوی طور پر شرط کی جڑا ہے۔ اور یہ جملہ شرطیہ سابقہ جملہ شرطیہ فَاِذَا اُوذِيَ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے۔ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ حالیہ ہے۔ اور انکار حال کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے حال ایسا نہیں کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں پوشیدہ چیزوں کو نہیں جانتا بلکہ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جو لوگوں کے سینوں میں پہنا ہے، چاہے وہ اخلاص ہو یا نفاق۔ اور وہ منافقین کو ان کے نفاق کے مطابق سزا دے گا۔ یا پھر یہ واؤ سابقہ کلام کے مضمون پر عطف کے لیے ہے یعنی وہ نفاق کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں ہے۔ (ناقفا و) وَلَا يَخْفَىٰ ذَٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَعْلَمَنَّ السَّٰفِقِيْنَ ۝

”اور ضرور دیکھ لے گا اللہ تعالیٰ لے انہیں جو ایمان لائے اور ضرور دیکھ لے گا منافقوں کو ج۔“

لے محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ شرطیہ مؤمنین کے لیے وعدہ اور منافقین کے لیے وعید ہے یا پھر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی 1- تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 86 (الامریہ)

کے انکار کے مضمون پر معطوف ہے اور اس کے لیے تاکید ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ آمَنُوا اسے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے میں غلط ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا جو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ شمس نے کہا ہے کہ سورت کی ابتدا سے لے کر یہاں تک یہ وہ دس آیات ہیں جو مدنی ہیں اور ان کے بعد کی تمام آیات مکی ہیں۔ (1)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا الَّذِينَ آمَنُوا أَتَّبِعُونَا وَلَنُحْصِلَنَّهُمْ حَطَبًا ۖ وَهَٰؤُلَاءِ
يُحْصِلُونَ مِنْ حَطَبِهِمْ قَوْمٌ شَرٌّ ۖ إِنَّهُمْ لَكَذِبُونَ ۝

”اور کہا کافروں نے ایمان والوں سے تم چلو ہماری راہ پر لے اور ہم اٹھالیں گے تمہارے گناہوں (کے بوجھ) کو اور وہ نہیں اٹھا سکتے ان کے گناہوں سے کہ کچھ بھی وہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں۔“

۱۔ یعنی کفار مکہ نے کہا ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ (2)۔ جبکہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے کہ ابو سفیان نے یہ قریش میں سے ایمان لانے والوں کو کہا تھا کہ ہمارے دین اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی پیروی کرو (3)۔ اس کا عطف سابقہ منافقین کے ذکر پر ہے۔
۲۔ یعنی اگر یہ راہ غلط ہوئی اور وہ بارہ اٹھا کر مٹوا دیا تو اس صورت میں وہ بذات خود ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے اور ان سے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ان کا بوجھ اٹھانے کو اپنے دین کی پیروی کے ساتھ معلق کر دیا تا کہ ان پر آباؤ اجداد کے دین کی پیروی آسان ہو جائے۔ اور بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ اس لیے کیا تا کہ ان میں سابقہ دین کی طرف بھرنے کی جرأت ہو جائے۔ اور فرما نے کہا ہے کہ وَلَنُحْصِلَنَّهُمْ لفظ کے اعتبار سے صیغہ امر ہے۔ لیکن معنوی طور پر یہ شرط محذوف کی جڑ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِن اَتَّبِعْنٰهُمْ سَبِيلَنَا حَمَلْنَا حَطَبًا نَحْمُ۔ یعنی اگر تم ہمارے راستے پر چلو گے تو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس ارشاد پاک میں ہے فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ يَا سَاحِلِيَّ، یعنی دریا سے ساحل پر پھینک دے گا۔ جو چونکہ ان کے کلام میں کفر اور معاصی پر تشبیہ دلائی گئی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ان کے منہ پر دے مارا اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کی تکذیب کر دی وَهَٰؤُلَاءِ يُحْصِلُونَ مِنْ حَطَبِهِمْ قَوْمٌ شَرٌّ یہ جملہ قائل کے فاعل سے حال ہے۔ بے شک وہ ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کی خبر دینے میں صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ آیت طیبہ میں پہلا من بیان ہے اور دوسرا ازمانہ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کوئی شے بھی نہیں اٹھا سکتے۔

وَلْيَحْصِلْ أُنْقَالَهُمْ وَأُنْقَالًا مَّعَ أُنْقَالِهِمْ ۚ وَلَيَسْئَلَنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۝

”اور ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ لے اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ ۲ اور ان سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن ان (جھوٹوں) کے متعلق جو وہ گھڑا کرتے تھے۔“

۱۔ اور وہ اپنے ان اعمال کے بوجھ ضرور اٹھائیں گے جو انہوں نے خود کیے۔ یہ قسم مقدم کا جواب ہے۔ اور یہاں صیغہ امر قسم کی حکایت کیلئے ہے انشاء کیلئے نہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر کے معنی میں ہے۔ اور مَا هُمْ بِحَالِيْن پر معطوف ہے۔

۱۷۔ کیونکہ وہ انہیں گمراہ کرنے کے باعث اس بوجھ کا سبب بنے ہیں۔ لہذا ایسے گناہوں کا بوجھ بھی انہی پر ہوگا مگر اس کے باوجود ان کی پیروی کرنے والوں کا بوجھ کم نہیں ہوگا۔

۱۸۔ اس سوال کا مقصود انہیں مزید خوفزدہ کرنا اور رانا ہوگا۔ یعنی وہ جھوٹی اور گھڑی ہوئی باتیں جن کے سبب انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا، ان کے بارے قیامت کے دن ان سے پوچھا جائے گا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا
فَآخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۱﴾

”اور بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو وہ ٹھہرے رہے ان میں پچاس کم ہزار سال۔ آخر کار آیا انہیں طوفان نے۔ اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔“

۱۔ اس کا عطف وَلِیَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِیْنَ پر ہے۔ اور اس میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ”فَلَبِثَ“ اس کا عطف اُزْسَلْنَا پر ہے۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ رسالت کی ذمہ داری سوچے جانے کے بعد ان میں پچاس کم ہزار سال ٹھہرے رہے۔ آخر کار انہیں پانی کے طوفان نے آلیا۔ جب بھی کوئی چیز کثرت سے گردش کرے، چاہے پانی یا ہوا کوئی اور چیز، اسے طوفان کہا جاتا ہے تو یہاں مراد پانی کا طوفان ہے یعنی وہ اس میں غرق ہو گئے۔

۲۔ اور وہ کفر کے سبب ظلم کرنے والے تھے۔ وَهُمْ ظَالِمُونَ ترکیب کلام میں اخذہم کے مفعول سے حال ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا کی گئی اور پھر آپ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے اور طوفان کے بعد بھی مزید ساٹھ برس تک آپ زندہ رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد کثیر ہو گئی اور ہر طرف پھیل گئے۔ آپ کی عمر شریف ایک ہزار پچاس برس تھی (۱)۔ اسے ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، حاکم اور ابن مردودہ نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور حضرت وہب سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام ایک ہزار چار سو برس تک زندہ رہے (۲)۔ پھر آپ کو ملک الموت علیہ السلام نے کہا اے تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت زیادہ عمر پانے والے! آپ نے دنیا کو کیسے پایا؟ تو آپ نے جواب فرمایا ایسے ہی جیسا کہ ایک دار (حویلی) ہو اور اس کے دو دروازے ہوں۔ پس میں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل گیا۔ آیت کریمہ میں تَسْمَعُ مَانَةً وَخَمْسِينَ عَامًا (ساڑھے نو سو سال) نہیں فرمایا ایک تو اس لیے کہ لفظ الف میں اختصار ہے۔ اور دوسرا اس لیے کہ یہاں مقصود اس طویل عرصہ تک صبر کرنے کا بیان ہے جو آپ اپنی امت کی پرفریب اور اذیت ناک تدبیروں کے مقابلہ میں کرتے رہے۔ اس لیے لفظ الف ذکر فرمایا کیونکہ یہ انتہائی عظیم الشان اور ذی وقار لفظ ہے۔

فَاتَجَنَّبُهَا وَأَصْحَبُ السَّيِّئَةِ وَجَعَلَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾

”پس ہم نے نجات دے دی نوح علیہ السلام کو اور کشتی والوں کو اور ہم نے بنادیا اس کشتی کو ایک نشانی سارے جہان والوں کے لیے۔“

۱۔ تو ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دے دی۔ اور ان لوگوں کو جو آپ کی اولاد اور متبعین میں سے آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئے۔

ان کی تعداد اسی تھی۔ بعض نے کہا ہے وہ اٹھتر افراد تھے۔ اور ایک قول کے مطابق ان کی تعداد صرف دس تھی۔ ان میں سے نصف مرد تھے اور نصف عورتیں تھیں۔ یہ مفصل واقعہ سورہ ہود اور سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے کثی یا اس واقعہ کو بنادیا سارے جہان والوں کے لیے ایک نشانی۔ جس سے وہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

وَاٰیٰتِہِمْ اِذْ قَالُ لِقَوْمِہِمْ اَعْبُدُوا اللّٰہَ وَالتَّقُوْهُ ۚ ذٰلِکُمْ حَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰﴾

”اور ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو جب آپ نے فرمایا اپنی قوم کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس سے ڈرتے رہا کرو۔

یہی بہتر ہے تمہارے لیے۔ اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو۔“

اس کا عطف نو خارج ہے یعنی اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا۔ یا پھر اس سے پہلے اذکھول محذوف ہے اور اسی کے سبب یہ منصوب ہے۔ اور اذکھول لِقَوْمِہِمْ وَاللّٰہَ وَالتَّقُوْهُ اَزْ سَلَفًا فعل کی طرف ہے۔ یعنی ہم نے انہیں اس وقت رسالت عطا فرمائی جبکہ ان کی عقل کامل ہو چکی تھی۔ اور غور و فکر کی صلاحیت اس طرح مکمل ہو چکی تھی کہ انہوں نے حق کی معرفت حاصل کر لی اور لوگوں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔ اور اگر اذکھول محذوف مانا جائے تو پھر یہ اس سے بدل اشتمال ہے۔

یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہ تمہارے لیے اس سے بہتر ہے جس نظریہ پر تم اب ہو۔ یہ عبادت اور تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کی علت ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ تقدیر کا نام اس طرح ہے۔ اگر تم خیر و شر کو جانتے ہو اور ان کے مابین تمیز کر سکتے ہو۔ یا اگر تم نظر علم کے ساتھ بغیر کسی تعصب اور فساد کے غور و فکر کر سکتے ہو یا اگر تم صاحب علم ہو اور امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہو تو پھر تم پر یہ امر مخفی نہیں رہے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا فوہ تمہارے لیے یقیناً اس نظریہ سے بہتر ہے جسے تم اب اپنائے ہوئے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا وَتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ۚ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَسْلُبُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَاَتَّبِعُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَ

اَشْكُرُوْا لَہٗ ۚ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

”تم تو پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی اور گھڑا کرتے ہو نر جھوٹ۔ بے شک جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کو

چھوڑ کر وہ مالک نہیں تمہارے رزق کے۔ پس طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے رزق کو اور اس کی عبادت کیا کرو۔ اور اس کا

شکر ادا کیا کرو۔ اسی کی طرف تم لوٹے جاؤ گے۔“

اَوْثَان (بت) یہ پتھر ہیں نہ نقصان دے سکتے ہیں اور نہ ہی نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اور ”اِفْکًا“ مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی ای دکذبون کذبہ۔ تم تو نر جھوٹ بولتے ہو۔ یا تقولون قولاً ذا افک۔ یعنی تم ان بتوں کو الہ کہتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے سفارش ہونے کا دعویٰ کر کے بالکل صریح جھوٹ بولتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول لہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور یہ اپنے فعل سابق کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی تم انہیں محض جھوٹ کی وجہ سے تراشتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور معنی یہ

ہے کہ تم شخص جھوٹی شے گھڑتے ہو۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ان کی شفع اور بری حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اس کا ما بعد جملہ بھی ہے۔ یا پھر یہ ان کی اس شرارت (فتیج حرکت) پر استدلال ہے جسے وہ اپنائے ہوئے تھے کہ وہ محض جھوٹ اور باطل ہے۔

۷۔ یہ اس اعتبار سے ان کی شرارت پر دوسری دلیل ہے کہ وہ اپنے قبضے میں کوئی نفع اور رزق نہیں پاتے۔ رزق مصدر ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں رزق دینے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ احتمال بھی ہے کہ مصدر بمعنی مفعول ہو اور اس سے مراد وہ شے ہو جو دی جاتی ہے۔ اس صورت میں ردھا کی توہین تعیم اور تحقیر کے لیے ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ رزق میں سے کوئی حقیر اور ادنیٰ شے بھی دینے کے مالک نہیں ہیں۔

نئے پس تم تمام کا تمام رزق اللہ تعالیٰ سے طلب کرو کیونکہ اس کا مالک وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس کی عبادت کیا کرو اور اس کا شکر ادا کیا کرو۔ یعنی اپنے مطالب و مقاصد کے حصول کے لیے انہیں وسیلہ بناؤ اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں تمہیں عطا فرمائی ہیں ان پر اس کا شکر ادا کرو اور پھر اسی عبادت اور شکر کے سبب اس کی ملاقات کے لیے تیار ہو کیونکہ اسی کی طرف تم لوٹنا چاہو گے۔ ترکیب کلام میں اَلَيْسَ بِجَوْنٍ اُنْكَرُوا کے فاعل سے حال مقدرہ ہے۔

وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبْ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۖ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

”اگر تم جھٹلاتے ہو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) جھٹلایا (اپنے نبیوں کو) ان امتوں نے بھی جو تم سے پہلے تھیں۔ اور رسول پر

فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ (اللہ کا حکم) صاف طور پر پہنچا دے۔“

۱۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ مجھ سے پہلے رسولوں کو بھی تم سے پہلی امتوں نے جھٹلایا ہے۔ لیکن ان کے جھٹلانے نے ان رسولوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچایا، یعنی اس جھٹلانے کے سبب انہیں عذاب دیا گیا۔ پس اسی طرح تمہیں بھی جھٹلانے کے سبب عذاب ہوگا۔ اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ اللہ کا حکم اتنا صاف طور پر پہنچا دے جو شکوک و شبہات کو زائل کر دے۔ یعنی جو بھی رسول کو جھٹلائے اس کی تکذیب اسے (رسول کو) کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ مخلوق کو ہدایت دینا اس پر فرض نہیں کیونکہ یہ تو اس کے اختیار میں ہی نہیں بلکہ اس کے ذمہ تو پیغام پہنچانا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد قَدْ مَكَانَ جَوَابِ قَوْمٍ تَكَلَّمُوا آیات ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بطور جملہ معترضہ مذکور ہوں اور نبی مکرم ﷺ کی شان اور قریش کی حالت، ان کے مذہب کے غلط ہونے اور ان کی بری عادات پر وعید کا ذکر اس فقرے کے درمیان کر دیا گیا ہو تاکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے باعث تسلی ہو کہ آپ کے باپ ابراہیم علیہ السلام سے بھی ان کی قوم نے آپ ہی کی مثل مخالفت کی اور اسی طرح انہیں جھٹلایا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

”کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح آغاز فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا۔ پھر وہ (کس طرح) اس کا

اعادہ کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔“

۲۔ اَوَلَمْ يَرَوْا کُودًا و کبر حمزہ کسائی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ قرات کی ہے۔ اس میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے۔ اور واء مخذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَلَمْ يَبْطُرُوا وَلَمْ يَبْرُوا (کیا انہوں نے غور

فکر نہیں کی اور نہیں دیکھا) یا پھر واؤ حالیہ ہے اور انکار تکذیب کے وقت عدم ردیت کی حالت کے انکار کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تحقیق تم سے پہلے امتوں نے بھی جھٹلایا حالانکہ انہوں نے اپنی تخلیق کے آغاز کی کیفیت کو دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نطفہ سے پھر جتے ہوئے خون سے پھر گوشت کے کوٹھڑے سے بنایا اور پھر پیچے بنا کر انہیں باہر نکالا۔ پھر وہ پچ مختلف اور متفرق حالات سے گزر رہا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے موت آ جاتی ہے۔

ج۔ پھر وہ اسے موت کے بعد دوبارہ حیات کی طوف لٹا دے گا۔ یَعْبُدُكَ عَطْفٌ اَوْ لَمْ يَبْرُوا پر ہے نہ کہ یَبْدُئُ پر۔ کیونکہ ردیت اس پر واقع نہیں ہوئی۔ اور اعادہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نباتات اور پھلوں وغیرہ کو ہر سال اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے اس نے انہیں گذشتہ سال پیدا کیا تھا۔ اس صورت میں اس کا عطف یَبْدُئُ پر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف یَبْدُئُ پر ہو اور اس پر ردیت کا اطلاق مجاز آ گیا ہو جو اعادہ کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

ج۔ بلکہ اعادہ یا دوا مردوں میں سے جو ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فعل میں کسی شے کا محتاج نہیں اور نہ وہ الیہا کرنے میں ٹھکتا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”فرمائیے۔ سیر و سیاحت کرو زمین میں اور غور سے دیکھو۔ کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ (اسی طرح) پیدا فرمائے گا دوسری بار یہ ملک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“

ج۔ یہ یا تو اس خطاب کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اس صورت میں قول مقدر ہے، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کہا فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے مختلف اجناس اور احوال پر خلق کی ابتدا فرمائی یا پھر یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

ج۔ قیاس تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتا۔ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ (غور سے دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے پھر وہ اسی طرح دوسری بار پیدا فرمائے گا) (یعنی پہلے فعل کے ساتھ قائل ظاہر ہوتا اور دوسرے فعل میں ضمیر اس کی طرف راجع ہوتی)۔ لیکن اس میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کیونکہ اس سے مقصود اعادہ کے جوڑ کو ثابت کرتا ہے۔ پس جب ان کے لیے یہ ثابت کر دیا کہ خلق کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو یہی اس کی دلیل ہے کہ اعادہ بھی ابتداء کی مثل ہے۔ لہذا جو ذات تخلیق کی ابتداء پر قادر ہے وہ اس کے اعادہ سے قطعاً عاجز نہیں ہو سکتی۔ گویا کہ فرمایا ہے جس ذات نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی وہ ذات ہے جو دوسری بار بھی پیدا فرمائے گی۔ پس اسی معنی پر تنبیہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ظاہر ذکر فرمایا اور اسے بطور مبتدا ابتدا میں ذکر فرمایا۔ بعض محققین نے یہ کہا ہے۔ کہ لَمْ يَبْدُئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ کا ساتھ کلام سے حاصل ہونے والے محذوف مفہوم پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام کچھ اس طرح ہے۔ فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پہلی بار پیدا فرمایا پھر اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی دوسری بار پیدا فرمائے گا۔ ابن کثیر اور ابو عمر و نے النَّشْأَةَ شَیْنِ کو مفتوح اور الف کو محذوفہ پڑھا ہے اور سورۃ نجم اور واقعہ میں بھی اسی طرح پڑھا ہے اور باقیوں نے شَیْنِ کو

ساکن اور بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور ہمزہ نے اس میں دو جہوں کی بناء پر وقف کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شین کو حرکت دیتے ہیں اور پھر قاس کے مطابق اسے ساقط کر دیتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ شین کو فتح دیتے ہیں اور خط کی اتباع کرتے ہوئے ہمزہ کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ دانی نے کہا ہے کہ اس کی مثل عربوں سے سنا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شے پر اس کی قدرت تقاضا کرتی ہے اور تمام تر نعمتوں کی طرف اس کی ذات کی نسبت مساوی ہے۔ پس وہ دوسری بار پیدا کرنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جس طرح پہلی بار پر قادر ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ﴿١١﴾

”سزا دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے۔ رحمت فرماتا ہے۔ جس پر چاہتا ہے۔ اور اسی کی طرف تم پھرے جاؤ گے۔“

لے وہ سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ وہ آخرت میں عذاب دے گا آگ کے ساتھ اور دنیا میں اس کے عذاب دینے کے مختلف انداز ہیں، یعنی رسوا کر دے یا تحریص اور لاٹھی باندے یا باذات اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والا باندے یا کسی بدعت کا ارتکاب کر دے۔

لے اور رحمت فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے آخرت میں اس کی رحمت یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل فرمائے گا اور دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنی تائید عطا فرماتا ہے، قناعت عطا کر دیتا ہے، حسن خلق عطا فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢﴾

”اور تم نہیں ہو تم سے بس کرنے والے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں (جہاں گ کر) اور نہ آسمان میں (پناہ لے کر)۔ اور تم نہیں ہے۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ہے۔“

لے اور تم اپنے آپ کو پانے سے اپنے رب کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ یعنی اگر تم قضاء خداوندی سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے زمین میں چھپ جاؤ یا اس کی عماروں میں داخل ہو جاؤ یا آسمان اور ایسے قلعوں میں پناہ گزین ہو جاؤ جن کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے تو پھر بھی تم قضاء خداوندی سے بچ نکل نہیں سکتے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ولانی السماء میں تقدیر عبارت یہ ہو ولا من فی السماء یعنی تم ان ملائکہ کو بھی عاجز نہیں کر سکتے جو آسمانوں میں ہیں۔ اس صورت میں اس کا عطف ما کے اسم پر ہوگا جیسا کہ حضرت حسان کا قول ہے فَمَنْ يَهْجُو رَسُولَ اللَّهِ مِنْكُمْ ۖ وَيَمْدَحُهُ وَيُضْفِرُهُ سِوَاهُ (تم میں سے جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرے اور جو کوئی آپ کی مدح اور مدد کرے وہ سب آپ کے لیے برابر ہیں)۔ (یعنی کسی کی ہجو آپ کو ضرر نہیں پہنچا سکتی اور کسی کی مدح آپ کو نفع نہیں دے سکتی)۔ اللہ تعالیٰ ہی تمہاری حفاظت کرتا ہے ایسی بلاؤں اور مصیبتوں سے جو زمین میں ظاہر ہوتی ہیں یا آسمان سے نازل ہوتی ہیں اور انہیں تم سے دور ہٹاتا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَكْسِبُونَ سُوءًا مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٣﴾

۱۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا۔ اس کا عطف ”قَالَ يَنْفِقُوا اَعْبُدُوا اللَّهَ“ یہ ہے۔ مَوْذُوۡۃ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی مَوْذُوۡۃ۔ یا اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ یعنی سب مودۃ (محبت کے سبب)۔ ابن کثیر، ابو عمرو، کسائی اور یعقوب نے اسے مرفوع پڑھا ہے اور اسے مابعد بَیِّنُکُمْ کی طرف مضاف کیا ہے۔ اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے (یعنی ہي مَوْذُوۡۃ اَوْ مَسَبِّ مَوْذُوۡۃ بَیِّنُکُمْ) یعنی تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور ان بتوں کی عبادت پر اپنے اجماع کے سبب ایک دوسرے سے پیار کا سلوک کرتے ہو۔ اور پھر یہ جملہ یا تو اَوْفَانًا کی صفت ہے یا ان کی خبر ہے اس بناء پر کہ مایا تو مصدر یہ ہے یا موصول ہے اس میں ضمیر عائد محذوف ہے اور وہی مفعول اول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنَّمَا اتَّخَذُ مَوْذُوۡۃً مِّنْ ذُوۡنِ اللّٰهِ اَوْفَانًا مَّسَبِّ لِمَوْذُوۡۃٍ مِّنْکُمْ۔ اور خفض اور مخرجه نے مَوْذُوۡۃ کو مفعول لہ ہونے کی بناء پر بَیِّنُکُمْ کی طرف مضاف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور بتوں کی عبادت پر اپنے متفق ہونے کے سبب ایک دوسرے سے ملو۔ اس صورت میں اِتَّخَذْتُمْ کا مفعول اول اَوْفَانًا ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ اِتَّخَذْتُمْ اَوْفَانًا مَّعْبُوۡۃً مِّنْ ذُوۡنِ اللّٰهِ (تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنالیا ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول ثانی مودۃ ہو۔ اس بناء پر کہ اس سے پہلے مضاف مقدر ہوا یہ مودودہ فعل تاویل میں ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِتَّخَذْتُمْ اَوْفَانًا مَّسَبِّ الْمَوْذُوۡۃِ بَیِّنُکُمْ اَوْ مَوْذُوۡۃً (تم نے بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے) اور نافع، ابن عامر اور ابوبکر نے مودۃ کو توہین کے ساتھ منصوب پڑھا ہے۔ اس صورت میں بَیِّنُکُمْ بھی منصوب ہے۔ جیسا کہ ہم نے فیض کی قرأت میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ مودۃ کے متعلق ہے، یعنی تمہارے درمیان محبت صرف دینی زندگی تک ہی محدود ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی۔ پھر قیامت کے دن تو وہ دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

۳۔ یعنی کفار باہم ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے یا پھر وہ کفار بتوں کا انکار کرتے ہوئے ان پر لعنت کریں گے۔ یہ جملہ قال کے مقولہ پر معطوف ہے۔

۴۔ اسے عبادت کرنے والو! اور اے معبودو! تم تمام کا ٹھکانا آتش جہنم ہوگا۔ اور تمہیں اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

فَاَمِّنْ لَهُ لَوْطًا وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ۚ اِنَّهُ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

”تو ایمان لائے ان پر لوط اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔ بے شک

وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔“

۱۔ اس کا عطف قال پر ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام پر لوط علیہ السلام ایمان لے آئے کیونکہ وہ انبیاء کی تکذیب کرنے سے محفوظ و مامون تھے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی۔ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہابان کے بیٹے تھے۔

۲۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا بے شک میں اپنی قوم سے ہجرت کرنے والا ہوں اس جگہ کی طرف جہاں میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ یا اس جگہ کی طرف جہاں میرے لیے اپنے رب کی عبادت آسان ہوگی۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک میں اپنی قوم سے

اعراض کرتے ہوئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہجرت کرنے والا ہوں (۱) اصطلاح صوفیہ میں اسی کو طعن میں سفر کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی (یہ شبر کوفہ کے نواح میں واقع ہے) سے حران کی طرف ہجرت کی پھر وہاں سے شام تشریف لائے حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ آپ کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ آپ ہی وہ پہلے شخص (ب) تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی۔ آپ نے فلسطین کو اپنا مسکن بنایا اور لوط علیہ السلام مدد میں ٹھہرے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر محترمہ برس تھی۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَجْرًا فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ⑤

”اور ہم نے عطا فرمایا آپ کو اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا پوتا) اور ہم نے رکھ دی ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جائیداد) کا اجر اس دنیا میں اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین کے (زمرہ) میں ہوں گے۔“

۱۔ اور ہم نے آپ کو اسماعیل کے بعد عطا فرمایا اسحاق جیسا فرزند، اس کے بعد کہ آپ اپنی گہرینی اور زوجہ کے عمر رسیدہ اور ہاتھ ہونے کے سبب کسی بچے کی ولادت سے مایوس ہو چکے تھے اور پھر مزید یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا اور ہم نے ابراہیم کی اولاد میں رکھ دی نبوت اور کتاب یعنی تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم اور ہم نے انہیں ہماری راہ میں ہجرت کرنے کا اجر دیا جس میں عطا فرمایا، یعنی کہ ہم نے انہیں عمر زندہ ہونے کے باوجود بچے عطا فرمائے اور پاکیزہ نسل عطا فرمائی۔ سہی نے اسی طرح کہا ہے (۱)۔ اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس اجر سے مراد یہ ہے کہ آپ کی اولاد میں نبوت مسلسل جاری رہی، تمام مذاہب و ادیان کا آپ کی طرف منسوب ہوتا اور تا قیام قیامت آپ کی ذات پر درود و سلام کا پڑھا جاتا وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا میں اجر سے مراد ذکر و فکر اور عبادت الہی میں لذت کا حاصل ہونا ہے۔ کیونکہ اہل دنیا جن امور حلت اور طیبہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں آپ کو ان میں ان کی نسبت کہیں زیادہ لذت نصیب تھی۔ اسی کی مثل رب کریم کا یہ ارشاد ہے لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْآخِرَةِ لَمَّا تَبَيَّنَ لَهُمُ الدُّنْيَا ۚ وَفِي الْآخِرَةِ ۚ

۲۔ اور یہ فک و آخرت میں کا ملین فی الصلاح کے زمرہ میں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف اِتَيْنَاهُ أَجْرًا فِي الدُّنْيَا پر ہے۔ عام اسلوب کے بغیر جملہ اس کا جملہ فعلیہ پر عطف اس پر ولادت کرنے کے لیے ہے کہ آخرت کا اجر اور درود حاصل ہے۔ دنیا کو نہیں۔

وَلَوْ كُنَّا إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرْهَانُ لَكُمْ عَلَىٰ مَا تَدْعُوا مِن دُونِ اللَّهِ كَآلِ الْفِتْنَةِ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَفَتَنُوا قُلُوبَهُمْ قُلُوبُهُمْ مُّكْوَّنَةٌ سَعِيدٌ فَخَلَسُوا ۚ وَكَانَ اللَّهُ مُّصِيبًا لِلظَّالِمِينَ ⑥

الْعَالَمِينَ ⑥

۱۔ تفسیر ربوئی، جلد 5 صفحہ 159 (البحار)۔

(۱) حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ حضرت عثمان نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے ہجرت کی ہے۔

(ب) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی وہ عثمان بن عفان ہیں جیسا کہ لوط علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہجرت کی۔

”اور (ہم نے) لوط کو رسول بنا کر بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ کہ نہیں پہل کی تم سے اس (بے حیائی) کی طرف کسی قوم نے دنیا بھر میں۔“

۱۔ وَلَوْ كُنَّا كَاغْتَفَ اِبْرَاهِيمَ پر ہے۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے اَنْتُمْ کو وہ حمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں سے ایک حمزہ برائے استفہام، انکاری زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر صرف ایک حمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ لَتَأْتُنَّ مَحْذُوفِ قسم کا جواب ہے۔ اور ”الْفَاحِشَةُ“ سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح ہو۔
۲۔ یہ جملہ الفاحشہ صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ اَمَرُ عَلٰی اللّٰہِیْمَ یَسْتَبِیْ (تحقیق میں لیم کے پاس سے گزرتا ہوں، وہ مجھے گالی گلوچ دے رہا ہوتا ہے) میں جملہ صفت ہے۔ یا یہ جملہ حال ہے یا پھر یہ جملہ متاخذ ہے۔

اَنْتُمْ لَتَأْتُنَّ الرَّجَالَ وَتَقَطُّعُونَ السَّبِيلَ ۚ وَتَأْتُنَّ فِيْ نَادِيْكُمْ اَنْتُمْ ۚ فَمَا

كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦ اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَنْتُمْ اَبْعَدُ اِلٰہِ اللّٰہِ اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۱۱

”کیا تم بد فعلی کرتے ہو مردوں کے ساتھ اور ڈاکے ڈالتے ہو عام راستوں پر۔ اور اپنی کھلی مجلسوں میں گناہ کرتے ہو۔ تو نہیں تھا کوئی جواب آپ کی قوم کے پاس بجز اس کے کہ انہوں نے کہا اے لوط۔ اے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔“

۱۔ یہ اس برائی کا بیان ہے۔ اور راستہ کاٹنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو مسافر ان کے پاس سے گزرتے تھے وہ ان سے برائی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لہذا لوگوں نے ان کے پاس سے گزرتا چھوڑ دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ عورتوں پر مردوں کو ترجیح دیتے ہوئے عورتوں کا راستہ کاٹ دیتے تھے۔

۲۔ العادی سے مراد ایسی مجلس ہے جس میں اہل مجلس موجود ہوں۔ ام حاتفی بنت ابی طالب کے غلام ابو صالح سے علامہ بغوی نے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا وَتَأْتُنَّ فِيْ نَادِيْكُمْ اَنْتُمْ میں نے عرض کی کون سا وہ گناہ ہے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ راستے سے گزرنے والوں پر غلیل مارتے اور ان سے تسخر کرتے تھے۔ اسے احمد اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے (۱)۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ وہ اپنی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے ہر آدمی اپنے پاس ایک پیالے میں کچھ کنکریاں لیے ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی مسافر ان کے قریب سے گزرتا تھا تو آپس میں کہتے اسے پکڑ لو پھر وہ اس پر کنکریاں پھینکتے تھے جس کی کنکری اسے لگ جاتی وہی اس کا زیادہ حق دار ٹھہرتا۔ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے وہ اس سے سامان چھین لیتا، پھر اس کے ساتھ بد فعلی کا ارتکاب کرتا اور پھر اسے تین درہم دے کر فارغ کر دیتا۔ ان کے لیے ان کے سردار کا فیصلہ اسی طرح تھا۔ قاسم بن محمد نے کہا ہے کہ وہ اپنی مجالس میں ہوا خارج کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ اپنی مجالس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑتے تھے۔ عبد اللہ بن سلام سے مروی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر تھوکتے تھے اور کھولنے نے کہا ہے کہ قوم لوط کی بری عادات یہ تھیں کہ وہ معطلی چناتے، انگلیاں مہندی سے رنگتے، تہبند کھول دیتے، سیٹیاں بجاتے، کنکریاں مارتے اور بد فعلی کا ارتکاب کرتے تھے۔ (۲)

طرف سے یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو تسلیم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی زیادتی علم کا دعویٰ بھی کیا۔ اور آپ کو جواب اس شخص میں سے مراد لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کے سوا دوسرے افراد ہیں۔ اور ہلاک صرف انہیں ہی کیا جائے گا۔ یا ان کی ہلاکت کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس شہر سے نکلنے کے بعد اس کے باشندوں کو ہلاک کیا جائے گا۔ تو یہاں فرشتوں نے اپنے پہلے قول میں یہ وضاحت نہیں کی۔ بلکہ حضرات ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کی اس حکم سے مستثنیٰ ہونے کی وضاحت کی ہے تو یہ وضاحت خطاب سے مؤخر ہے اور یہ تاخیر جائز ہے۔ البتہ وقت حاجت سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہوتا۔

اس سوائے اس کی عورت کے۔ اللہ تعالیٰ سے علم میں ہے کہ وہ عذاب میں یا گاؤں میں رہ جائے گی۔ کُفَّتِ مِنَ الْعُیُونِ استثناء کی علت بیان کرتا ہے۔

وَلَمَّا أَتَى جَاعَتِ مُرْسِلًا لَوْ طَائِيٍّ عَرِبِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَمْرًا وَقَالُوا لَا تَحْضَوْا
لَا نَحْزُونَ ۖ إِنَّا مَسْجُوكٌ وَأَهْلَكَ إِلَّا أَمْرًا تَكَّ كَانَتْ مِنَ الْعُيُونِ ۖ

”جب آئے ہمارے فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس تو وہ بڑے غمزدہ ہوئے ان کی آمد سے لے اور دل تنگ ہوئے اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا نہ خوف زدہ ہو اور نہ ہی رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تجھے اور تیرے کنبہ کو سوائے تمہاری بیوی کے وہ پیچھے رہ جائے والوں میں سے ہے س۔“

لے اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو انہیں غم اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ ان فرشتوں کے سبب اس خوف کی بناء پر کہ ان کی قوم ان کے بارے میں برا ارادہ رکھتی ہے۔ اس جملہ میں ان دونوں اہلکاروں کی تاکید اور ان کے اتصال کے لیے صلہ ہے۔ لے اور لوط علیہ السلام دل تنگ ہوئے ان آنے والے فرشتوں کے سبب ”ذَمْرًا“ ترکیب کلام میں نسبت سے تسمیہ ہے۔ اور الذرع کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے فلاں طویل الذراع۔ فلاں لمبے ہاتھوں والا ہے، یعنی بہت زیادہ طاقتور ہے۔ کیونکہ لمبے ہاتھوں والا ان چیزوں تک بھی پہنچ سکتا ہے جہاں تک چھوٹے ہاتھوں والا نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی طاقت ان ملائکہ کی عظمت و شان کے مطابق کم تھی اور وہ اس سے عاجز تھے کہ وہ اپنی قوم سے ان کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا تدبیر کریں۔

سے اور جب ملائکہ نے آپ پر غم و اندوہ کے آثار دیکھے تو کہا تم اس سے خوفزدہ ہو نہ رنجیدہ خاطر کہ وہ ہم پر قدرت پا کر غالب آجائیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس سے خوفزدہ نہ ہو کہ وہ ہم پر قدرت نہ پاسکیں گے اور اس سے غم نہ ہو کہ ہم انہیں ہلاک کر دیں گے۔

سے یہ مذکورہ نبی کی علت ہے۔ ابن کثیر حمزہ کسائی اور ابوبکر نے اسے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ چڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعل سے تشرید کے ساتھ۔ کوئیوں کے نزدیک کاف محل نصب میں ہے اور اس کی تائید یہ عطف کرتا ہے۔ ”وَأَهْلَكَ“ کیونکہ یہ منصوب ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک کاف محل جر میں ہے۔ اور أَهْلَكَ کی نصب کا سبب اس سے پہلے فعل مضمر ہے۔ یعنی و ننجی اہلک۔ یا یہ کاف کے محل بعید پر عطف ہونے کے سبب منصوب ہے کیونکہ اضافیہ لفظی انفصال کے حکم میں ہوتی ہے اور وہ اصل میں تو منصوب ہے۔

إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ بَرِئًا مِنَ السَّاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٠﴾

”بے شک ہم اتارنے والے ہیں۔ اس بستی کے باشندوں پر بے عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔“

۱۔ إِنَّا مُنْزِلُونَ کو ابن عامر نے باب تفعیل بناتے ہوئے مشدود پڑھا ہے اور باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔
۲۔ بَرِئًا سے مراد عذاب ہے۔ اور عذاب کو رجز اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ اسے مضطرب کر دیتا ہے جسے عذاب دیا جائے۔ یہ عربوں کے قول اور قحز سے ماخوذ ہے جبکہ کوئی آدمی بے چین اور بے قرار ہو جائے تو وہ کہتے ہیں اور قحز فلان۔ متاعل نے کہا ہے کہ رجز سے مراد زمین میں دھنسانے اور اوپر سے پتھر پھینکنے کا عذاب ہے۔ (1)

وَلَقَدْ شَرَكْنَا مِمَّا آيَةً بِبَيْتَةِ الْقَوْمِ يَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾

”اور بے شک ہم نے باقی رہنے دے اس بستی کے کچھ واضح آثار ۱۔ ان لوگوں (کی عبرت) کے لیے جو عقلمند ہیں۔“
۱۔ اور بے شک ہم نے لوط علیہ السلام کی بیٹیوں میں واضح آثار باقی رہنے دیے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیۃ بئیسۃ سے مراد ان کی تباہ شدہ گھروں کے نشانات ہیں اور قحز وہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہیں جو انہیں ہلاک کرنے کے لیے اوپر سے ان پر برسائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں باقی رکھا۔ یہاں تک کہ اس امت کے پہلے لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آیۃ بئیسۃ سے مراد سطح زمین پر سیاہ رنگ کے پانی کا ظاہر ہونا ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے واقعہ کا مشہور ہونا ہے۔
۲۔ ان لوگوں کی عبرت کے لیے جو ان آیات میں صاحب عقل لوگوں کی طرح غور و فکر اور مدبر کرتے ہیں۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْأَخِيرَ

لَا تَعْتَوُوا فِي الْأَرْضِ مَفْسِدِينَ ﴿٥٢﴾

”اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور امید رکھو پیچھے آنے والے دن کی اور ملک میں فتنہ و فساد پر پاندہ کرو۔“

۱۔ فیصل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَارْجُوا إِلَىٰ مَدْيَنَ۔ اور اس کا عطف ”وَلَقَدْ ارْسَلْنَا نوحًا“ پر ہے۔
۲۔ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْأَخِيرَ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہاں رَجَا خوف کے معنی میں ہے۔ یعنی خافُوا عَذَابَ الْيَوْمِ الْأَخِيرِ (تم یوم آخرت کے عذاب سے ڈرو)۔ یا معنی یہ ہے تم ایسے افعال کرو جن کے عوض تم آخرت میں ثواب کی امید رکھو۔ پس مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

۳۔ مُفْسِدِينَ سے عامل کے لیے حال مؤکدہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حال منقطع ہو۔ اور معنی یہ ہے کہ فساد برپا کرنے کے ارادہ سے زمین میں فساد اور فتنہ برپا نہ کرو۔ لہذا اس میں اس معنی سے احتراز ہے، جبکہ وہ اصلاح کے ارادہ سے فساد برپا کریں۔ مثلاً قتل و غارت، گھروں کو گرانا، آبادیوں کو تباہ کرنا اور جنگ کے دوران اہل حرب کے درختوں کو کاٹنا وغیرہ۔

فَكَذَّبُوهُ فَاصْبِرْ إِنَّ دَارَ بَرٍّ جَنَّاتٍ ۝

”اور پھر انہوں نے جھٹلادیا تو آیا انہیں زلزلہ (کے جھکوں) نے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھنٹوں کے بل گرے پڑے تھے۔“

۱۔ پھر انہوں نے آپ کے دعویٰ نبوت کو جھٹلایا تو انہیں شدید زلزلے نے آیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام کی حج ہے کیونکہ اس سے ان کے دل کا پٹنہ گئے تھے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھنٹوں کے بل مردہ حالت میں گرے پڑے تھے۔ دارِ ہم سے مراد ان کے شہر یا ان کے گھر ہیں۔ دار کو جمع اس لیے نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں۔

وَعَادًا وَشُعُودًا وَقَدْ يُشَبِّهَنَّكُمْ مِنْ مَّسْكِينِهِمْ ۚ وَذَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّاهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝

”اور (ہم نے برباد کیا) عادی اور شعوہ کو اور واضح ہیں تمہارے لیے ان کے مکانات حق اور آراستہ کردیا تھا ان کے لیے شیطان نے ان کے برے عملوں کو اور روک لیا انہیں راہ (راست) سے حق حالانکہ وہ اچھے بھلے سمجھدار تھے حق۔“

۱۔ یہ دونوں منصوب ہیں ان سے پہلے اذکور فعل محذوف ہے۔ یا ان سے پہلے وہ فعل ہے جس پر ماقبل دلالت کرتا ہے مثلاً اَهْلُكُمْ وغیرہ اور یہ فَاخَذْنَهُمُ الرُّجْفَةُ پر معطوف ہے۔ حمزہ مفعول اور یعتوب نے فَمُؤَذَّاتٍ کی تاویل پر غیر منصرف فَمُؤَذَّاتٍ پڑھا ہے۔ ۲۔ وَقَدْ يُشَبِّهَنَّ یہ اپنے معطوف سمیت جملہ مترفعہ ہے۔ اے اہل مکہ! تمہارے لیے ان کے بعض مکانات واضح ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے ان کا ہلاک ہونا ان کے مکانوں سے واضح ہوتا ہے جب تم ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہو۔ ۳۔ اور شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال مثلاً کفر اور دیگر معاصی وغیرہ کو آراستہ کردیا تھا۔ اور شیطان نے انہیں اس راستے سے روک لیا جو انہیں رسولوں نے بتایا اور وہ جنت تک پہنچانے والا ہے۔

۴۔ مقاتل، قتادہ اور کبھی نے کہا ہے کہ وہ لوگ اپنے دین اور اپنی گمراہی کو پسند کرتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ اپنے دین کے معاملہ میں اچھے بھلے سمجھدار تھے۔ اور فرما نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ ذی عقل تھے (۱)۔ صاحب بصیرت تھے اور وہ نظر و فکر اور دیکھ بھال کی قدرت رکھتے تھے لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ اور اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسولوں کے خبر دینے کے سبب ان پر یہ واضح تھا کہ ان پر عذاب ضرور آئے گا۔ لیکن وہ اپنے موقف پر مصر رہے حتیٰ کہ نتیجہ ہلاک کر دیئے گئے۔

وَقَارُورُونَ وَفِرْعَوْنُ وَهَامَانَ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي
الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا اسْمِقِينَ ۝

”اور (ہم نے ہلاک کر دیا) قارون فرعون، اور ہامان کو اور بلاشبہ تشریف لائے موسیٰ ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ پھر بھی وہ غرور و تکبر کرتے رہے زمین میں اور وہ (ہم سے) آگے بڑھ جانے والے نہ تھے۔“

۱۔ ان تمام کا عطف غاذیٰ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان میں سے قارون کو نبی شرف کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سے یہ احساس دلا تا مقصود ہے کہ شریف النجب آدمی کے لیے کفر اور گناہ کا ارتکاب دوسروں کی نسبت زیادہ قبیح ہوتا ہے۔

۲۔ اور بلا شبہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ تشریف لائے پھر بھی وہ زمین میں غرور و تکبر کرتے رہے اور وہ ہم سے آگے بڑھ جانے والے نہ تھے، یعنی وہ ہماری گرفت سے بچ نہ سکے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عذاب نے انہیں اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ یہاں سبقتین فائتین کے معنی میں ہے۔ یہ سبق طالبہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ اپنے تلاش کرنے والے سے آگے نکل گیا اور اس کے ہاتھ نہ آیا۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَنۢ أَسْرَلْنَا عَنكِيۤهٖ حَاجِبًا ۖ وَمِنْهُمْ مَّنۢ أَخَذْنَا
الصَّبِيۡحَةَ ۖ وَمِنْهُمْ مَّنۢ حَسَفْنَا بِهٖ الْإِمْرَءَ ۖ وَمِنْهُمْ مَّنۢ أَعْرَفْنَا ۖ وَمَا كَانَ
اللَّهُ لِيُظِلَّهُمۡ وَلَكِنۡ كَانُوا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٠﴾

”پس ہر (سرکش) کو ہم نے پکڑا اس کے گناہ کے باعث پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں بعض کو آلیا شد یہ کڑک نے اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا زمین میں اور بعض کو ہم نے (دور میں) ڈوبو دیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے تھے۔“

۱۔ یہ مابعد فعل کے سبب منصوب ہے۔ پس ان میں سے ہر ایک کو ہم نے پکڑا اور اسے اس کے گناہ کے عوض سزا دی۔ پس ان میں سے بعض پر ایسی ہوا چلائی جو پتھر کی ٹنگریاں اٹھائے ہوئے تھی۔ حصبا سے مراد چھوٹی چھوٹی ٹنگریاں ہیں۔ اور وہ تو موطی تھی۔ اور ان میں سے بعض یعنی قوم اور مدین کو شد یہ کڑک نے آیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قارون کو ہم نے زمین میں غرق کر دیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قوم نوح بغرغون اور اس کی قوم کو ہم نے (پانی میں) ڈوبو دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ایک ظالم جیسا معاملہ کرے اور انہیں بغیر کسی جرم کے سزا دے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں کو عذاب کے لیے پیش کرنے کے سبب خود ان پر ظلم ڈھاتے رہے تھے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَشَلِ الْعَنَكُبُوتِ ۖ إِتَّخَذَتْ
بَنِيٓسَآءُ وَإِنَّ أَوَّهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنَكُبُوتِ ۖ لَو كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥١﴾

”ان نادانوں کی مثال جنہوں نے بنائے اللہ کو چھوڑ کر اور دوست بکڑی کی سی ہے۔ اُس نے (جالے کا) گھر بنالیا۔ اور

(تم سب جانتے ہو) کہ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر بکڑی کا ہوا کرتا ہے۔ کاش! وہ بھی اس حقیقت کو جانتے نہ۔“

۱۔ یعنی کفار کی مثال اس میں جو انہوں نے جنوں کو مل اعتماد بنا رکھا ہے اور انہیں پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ بکڑی کی سی ہے جس نے جالے کا گھر بنایا، یعنی ان کا یہ اعتقاد و اعتماد اپنی کمزوری اور ضعف میں بکڑی کے جالے کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیونکہ جالے کی کچھ حقیقت ہے اور اس کا بکڑی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اتنا بھی نہیں۔ یعنی ان کا مذہب اور دین کی مثل بکڑی کے جالے کی ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کفار کی مثال جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دوست بنالیا یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے بکڑی کا جالا ایسے آدمی کے مقابلہ میں جس نے اپنا گھر پتھر اور چوٹے سے انتہائی مضبوط

بنایا ہو۔ لفظ تکبوت (۱) کا اطلاق واحد جمع اور مذکر مؤنث تمام پر ہوتا ہے۔ اس میں تا و طاعت کی تا کی مثل ہے۔ اس کی جمع عن کب، عکاب اور اکب آتی ہے۔

۱۔ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مگر مکی کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کمزور اور گرمی، سردی سے اس کی نسبت کم بچانے والا اور کوئی گھر نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے یا مستأکھ ہے۔ کاش وہ علم کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً جان لینے کے یہی ان کی مثال ہے اور ان کا دین و مذہب اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۰﴾

”یقیناً اللہ جانتا ہے جس چیز کو وہ پوجتے ہیں اس کو چھوڑ کر اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے۔“

۱۔ یہاں قول مضمر ہونے کی بناء پر ان پڑھا گیا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے لَقَدْ كَفَرَ اِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ آپ کفار کو بتا دیجئے بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ مَا يُدْعُونَ کو ابوہریرہ اور عاصم نے صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسے سابقہ استوں پر محمول کیا ہے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ خطاب کی بناء پر تاہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے کفار مکہ پر محمول کیا ہے۔ اس میں مَا اسْتَفْهَمَ یہ ہے اور یہ یُدْعُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی وہ اللہ کے سوا کس چیز کو پوجتے ہیں؟ پس اللہ تعالیٰ اس سے متعلقہ چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ اس صورت میں مِنْ شَيْءٍ ہے۔ یا مَا تَأْتِيہ ہے اور مِنْ زَانِدہ ہے اور شئیء یدعون کا مفعول ہے (یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی چیز کو نہیں پکارتے)۔ اس صورت میں کلام ان کی جہالت کے اظہار کے لیے ہے۔ اور مثال کی تاکید کے لیے ہے۔ یا مَعَا صَدْرِ یہ ہے اور مَعَا صَدْرِ ہے۔ یعنی اللہ ان کی غیر اللہ کی عبادت کرنے کو جانتا ہے۔ یا مَعَا مَوْصُولہ ہے اور یُعْلَمُ کا مفعول ہے اور یُعْلَمُ کے مفعول کی طرف نوٹنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور یہ کلام ان کے لیے بطور وعید مذکور ہے۔ اور وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ مابعد کلام کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ سب سے زیادہ حماقت اور گمراہی یہ ہے کہ ایسی شے جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کو اس ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانا جس کی شان یہ ہے کہ وہ سب پر غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ بے شک ہماہم اس ذات کے مقابلہ میں معدوم کی طرح ہے جو ہر شے پر قادر ہے، ہر شے کا علم رکھتی ہے اور اپنے فعل میں مستقل بالذات ہے۔ اور بے شک جس کی یہ صفت ہو وہ انہیں سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ اَمْثَالُ نَصْرِ بُهْلِ النَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَلْمُونَ ﴿۱۱﴾

”اور یہ مثالیں ہیں بہیمانہ کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم۔“

۱۔ ان مثالوں کے حسن اور فائدہ کو نہیں سمجھتے مگر صرف وہ اہل علم ہی ان کو سمجھتے ہیں جو اشیاء میں ایسی غور و فکر کرتے ہیں جیسے کرنی چاہئے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ علامہ بغوی نے عطا اور ابوہریرہ کے واسطے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت کی وَتِلْكَ اَمْثَالُ نَصْرِ بُهْلِ النَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَلْمُونَ۔ اور کہا کہ عالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ عطا ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے اعمال کرتا رہے اور محسنت سے اجتناب رکھے۔ (۱)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 164 (اتحادیہ)

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور ابوہریرہ میں داخل ہوئے تو کمزوریوں نے جمع ہو کر دروازے پر جالا بن دیا لہذا ہم انہیں نہیں گزرتے۔

نکلی اور واحدی نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابو داؤد بن الحر نے کتاب الفضل میں حارث بن اسامہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

حَقَّقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ يَعْنِي ۝

”پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ بے شک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔“

لے کیونکہ ان کی تخلیق سے مقصود بالذات خیر و بھلائی کا پہنچانا اور اس کی ذات و صفات پر دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول (إِنَّ فِي ذَلِكَ) سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، بے شک اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے وجود، علم، قدرت، ارادہ، وحدت اور کمزوریوں سے پاک ہونے پر دلالت ہے۔ بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

أَتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ

الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۖ وَلَذِكْرِ اللَّهِ أَكْبَرُ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ۝

”آپ تلاوت کیجئے اس کتاب کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف لے اور نماز صحیح ادا کیجئے۔ بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے لے۔ اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔“

لے آپ تلاوت کیجئے اس قرآن کی جو آپ کی طرف وحی کیا گیا تاکہ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو، اس کی نعمتوں اور احکام کی حفاظت ہو، اس کی امثال اور قصص سے سامان عبرت حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اظہار ہو۔ کیونکہ غور و فکر کرتے ہوئے پڑھنے والے کے لیے بار بار پڑھنے سے ایسے اسرار و رموز کھلتے ہیں جو پہلی مرتبہ پڑھنے سے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ نتیجہ آدمی اس کے اوامر کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے اور اس کی منافی سے رک جاتا ہے۔

لے فرض نماز صحیح ادا کیجئے بے شک نماز ایسے کاموں سے روکتی ہے جن کی فتح اور برائی شرعاً اور عقلاً ظاہر اور واضح ہے۔ اور گناہوں سے روکتی ہے اس طرح کہ نماز اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے اور نفس میں غشیت اور خوف پیدا کرتی ہے۔ جملہ اقامتہ صلوٰۃ کے حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ حضرت انس سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک نوجوان تھا جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں پانچوں نمازیں ادا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب کرتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی یہ حالت عرض کی گئی۔ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یقیناً اس کی نماز کسی دن اسے ان گناہوں سے روک دے گی۔ پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے توبہ کر لی اور اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی (۱)۔ مسند اسحاق، بزار اور ابی یعلیٰ میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رضوی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، فلاں آدمی رات کو نماز پڑھتا ہے پھر صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اس کی نماز اسے برے اعمال سے روک دے گی (۲)۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا بے شک نماز میں روکنے اور گناہوں سے بچنے کی طاقت ہے۔ پس جس آدمی کو اس کی نماز نیکی کا حکم نہ

دے اور برائی سے منع نہ کرے سو اس کی نماز اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دوری میں اور اضافہ کرے گی (1)۔ حسن اور قداد نہ کہا جس کی نماز اسے بے حیائی اور گناہ سے نہ روکے تو اس کی نماز اس کے لیے وبال ہوگی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں صلوة سے مراد قرآن ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَلَا تَجْهِنُوا بِاللَّحَاجِّ۔ تو اس میں صلوة سے مراد نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن بے حیائی اور گناہ سے روکتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ بے شک ایک آدمی ساری رات قرآن پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عنقریب قرأت قرآن اسے اس کام سے روک دے گی۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کہ بے شک فلاں آدمی دن کے وقت نمازیں پڑھتا ہے اور رات کے وقت چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز اسے اس کام سے روک دے گی۔ (3)

سید ابن عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بہت بڑا ہے کہ کوئی گناہ باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام گناہوں کو وہ مٹا ڈالتا ہے۔ مترجم) یہاں ذکر اللہ سے مراد بے حیائی اور گناہ سے روکنے والی نماز ہے (4)۔ اور نماز کو ذکر سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نماز ذکر الہی پر مشتمل ہے اور اسی ذکر کے سبب ہی نمازیکیوں تک پہنچانے والی اور برائیوں سے روکنے والی ہے۔ ذکر کی فضیلت میں کوئی احادیث موجود ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(1) حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسے اعمال پر متنبہ نہ کروں جو تمہارے مالک کے نزدیک زیادہ بہتر اور پاکیزہ تر ہوں، تمہارے درجات میں سب سے بلند درجہ ہوں تمہارے لیے سونا، چاندی خرچ کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہوں اور تمہارے لیے اس سے بہتر ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جہاد کرو اور تم ان کی گردنیں مار دو اور وہ تمہاری گردنوں کو ماریں۔ تو تمام نے عرض کی کیوں نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ اسے امام مالک، احمد ترمذی اور اپنے مابین نے روایت کیا ہے۔ مگر امام مالک نے اسے ابو الدرداءؓ سے موقوف نقل کیا ہے۔ (5)

(2) حضرت ابوسعیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کون سے بندے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے کون بلند ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجاہد اپنی تلوار کے ساتھ کھارے گا تو اس حد تک مارے کہ کوئی ٹوٹ جائے اور خون سے رنگیں ہو جائے تو اس سے بھی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے درجہ میں افضل ہیں۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حد بے غرض ہے۔ (6)

(3) حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کون سے لوگ بہتر ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا خوشی اور مبارک ہے ایسے آدمی کے لیے جس نے لمبی عمر پائی اور اچھے عمل کئے۔ پھر اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کون سے اعمال افضل ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اس حال میں دنیا سے جدا ہو کہ تیری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (انتخابیہ)

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (انتخابیہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (انتخابیہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (انتخابیہ)

5- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

6- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

ترہو۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ (1)

(4) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے ایک راستے پر چل رہے تھے تو آپ کا گزرا ایک پہاڑ کے قریب سے ہوا جسے حمران کہا جاتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا چلے چلو یہ حمران ہے۔ مفردون آگے نکل گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (2)

(5) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ملائکہ راستوں میں گھومتے پھرتے اہل ذکر کو تلاش کرتے ہیں پھر جب وہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں آجاؤ اپنے مطلوب و مقصود کی طرف۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا کہ فرشتے انہیں آسمان تک اپنے پروں کے ساتھ ڈھانپ لیتے ہیں۔ مزید فرمایا پھر ان سے ان کا رب سوال کرتا ہے (حالانکہ وہ خود انہیں خوب جانتا ہے) میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری تسبیح، تکبیر، تہلیل اور تہلیل (حمداً) کہہ رہے تھے (یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ، الْحَمْدُ لِلَّهِ، اللَّهُ أَكْبَرُ اور اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ)۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو وہ اس سے زیادہ تیری عبادت کرتے۔ اس سے زیادہ تیری ثناء بیان کرتے اور اس سے کہیں زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے وہ کون سی شے کے بارے سوال کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں وہ تجھ سے جنت مانگ رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھ رکھا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں قسم بخدا انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔ پھر وہ کہتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا؟ تو وہ عرض کرتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو یاقین ان کی حرص اور طلب اور شدید ہوتی اور اس میں ان کی رغبت بڑھ جاتی۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا وہ کسی شے سے چاہ بھی طلب کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں ہاں وہ جہنم کی آگ سے چاہ طلب کر رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا اے پروردگار انہوں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ وہ کہتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو وہ اس سے بہت زیادہ ڈرتے اور اس سے بہت دور بھاگتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر رب کریم فرماتا ہے کہ میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔ پھر ملائکہ میں سے ایک کہتا ہے ان میں غلاں آوی ہے جو ان میں سے نہیں ہے۔ بے شک وہ تو اپنے کام آیا تھا۔ تو رب کریم فرماتا ہے وہاں بیٹھنے والے وہ خوش نصیب ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بد بخت نہیں رہتا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور مسلم نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اس میں اس طرح ہے کہ فرشتے کہتے ہیں اے پروردگار! ان میں ایک بندہ خطا داخل ہو گیا ہے۔ کہ وہ ادھر سے گزرا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تو رب کریم فرماتا ہے میں نے اسے بھی بخش دیا۔ وہ ایسی قوم ہے جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بد بخت نہیں رہتا۔ (3)

(6) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جنت کے باغوں کے پاس سے گزرو تو تم ان سے حصہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔ رواہ الترمذی (4)

(7) ”مسلم“ نے حضرت معاویہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے حلقہ کی طرف تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں کس شے نے یہاں بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کی ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس پر اس کی حمد و ثناء بیان کر رہے ہیں کہ اس نے اسلام کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی اور اس دین اسلام کے ساتھ ہم پر احسان فرمایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ ملائکہ کے سامنے تم پر فخر و مباہات فرما رہا ہے۔ (1)

(8) حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل لوگوں کے مابین ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے میدان جنگ سے پیچھے بھاگنے والوں میں میدان میں ثابت قدمی سے جنگ لڑنے والا، غافلین میں اللہ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درخت میں ہزہنی، غافلوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ہی زندگی میں جنت میں اس کا ٹھکانہ کھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کا اتنے گناہوں کو رب کریم معاف فرما دیتا ہے جتنی تعداد تمام انسانوں اور چوپایوں میں سے بولنے اور نہ بولنے والوں کی ہے۔ (2)۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

(9) حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر آدمی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہو۔ اسے امام مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔ (3)

(10) حضرت ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں متبہمتی ہے تو ملائکہ اس کا احاطہ کر لیتے ہیں، رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے، ان پر سکینت و راحت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان سقر میں میں کرتا ہے جو اس کے قرب میں موجود ہیں۔ رواہ مسلم۔ (4)

(11) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسے وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ پس اگر وہ میرا ذکر تنہائی میں بذات خود کرتا ہے تو میں بھی تنہائی میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور اگر وہ جماعت اور مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر جماعت میں کرتا ہوں۔ متفق علیہ۔ (5)

اور بعض نے کہا ہے کہ وَلَذِكْرِ اللَّهِ الْكِبْرُ مَا مَعْنٰی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہارا ذکر کرتا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل واعلیٰ ہے۔ یہ معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ مجاہد، بحر مدار، سعید بن جبیر نے بھی یہی کہا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ معنی اس مرفوع سند سے بھی مروی ہے عن مومنی بن عقبہ عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ۔ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوتاہی اور غفلت نہ برتو۔ کیونکہ تمہارا اس کا ذکر کرنا اس کے تمہارا ذکر کرنے تک پہنچا دیتا ہے اور اس کا تمہارا ذکر کرتا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل واعلیٰ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اس پر کوئی شئی غفلتی نہیں۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔ (6)

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَ
قُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ

1- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 346 (قدیمی)

2- مشکوٰۃ الصالح، صفحہ 199 (قدیمی)

3- سنن ابن ماجہ صفحہ 277 (ذرات تعلیم)

4- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 345 (قدیمی)

5- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (انجاریہ)

6- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)

مُسْلِمُون ①

”اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقے سے۔ مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے علی اور تم کو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تمہاری طرف۔ اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔“

یعنی تم باہم جھگڑا نہ کرو۔ اس کا عطف اَقِمِ الصَّلَاةَ پر ہے، یعنی اے محبوب ﷺ تم اور مومنین اہل کتاب سے بحث مباحثہ نہ کیا کرو۔ مگر ایسے طریقے سے جو بہت شائستہ اور عمدہ ہو۔ یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات کے سبب بلانے اور اس کے دلائل پر متبذکر کرنے کے ساتھ۔ یہ مشتبی مفرغ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم ایسے طریقے سے مباحثہ کرو جو اس طریقے سے بہتر اور اچھا ہو جو کفار اختیار کرتے ہیں۔ یعنی شدت کے مقابلے میں نرمی، غصے اور غضب کے مقابلے میں تحمل و برداشت اور شور و شغب کے مقابلے میں نصیحت اختیار کرو۔ کیونکہ نصیحت مجاہد اور مباحثہ میں داخل نہیں اس لیے یہ مشتبی منقطع ہوگا۔

مگر ان میں سے جنہوں نے عہد تو ذکر کیا جز یہ قبول نہ کر کے ظلم کیا۔ پس تم ان سے اس وقت تک قتال کرو یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں یا وہ حقیر و ذلیل ہو کر جز یہ ادا کریں۔ سیدنا جبریل نے اسی طرح کہا ہے کہ اہل حرب کی استثنائی گئی ہے (۱) اور استثنائے بعد باقی رہنے والے اہل ذمہ ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حسین مباحثہ کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے کیونکہ یہ آیت تاکید ہے۔ لہذا اس صورت میں اَلَّذِينَ ظَلَمُوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو عدوت اور عناد میں حدود سے بہت تجاوز کرنے والے ہیں اور یہ کہنے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ (نعوذ باللہ) بندھے ہوئے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ فقیر اور محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ تو ایسی صورت میں درشتی اور نخشی کے ساتھ بھی ان سے مجاہد کرنا جائز ہے۔ اسی بناء پر قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ (2)

اس لیے حسن مجاہد کا بیان ہے۔ اور وَلَا تُبَايِعُوا أَهْلَ الْكِتَابِ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ تمہیں ان چیزوں کی خبر دیں گے جو ان کی کتابوں میں ہیں تو تم ان کی تکذیب نہ کرو مگر ان لوگوں کی جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا۔ یعنی وہ لوگ جو ایسی شے کی خبر دیں جس کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہو کہ یہ اس میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ جیسے ان کا یہ قول کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین ہمیشہ رہے گا یعنی علیہ السلام قتل کر دیئے گئے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یا اسی نوع کے اور اقوال۔ تو ایسی صورت میں ان کی تکذیب واجب ہے اور مبالغہ ضروری ہے۔ اور ان سے کہہ دو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو تمہاری طرف اتارا گیا تھا۔

یعنی اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔ یعنی صرف اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اور اس میں اس امر کی تصریح ہے کہ اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا رکھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اہل کتاب تو رات عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر بیان کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو اور کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَمَا اَنْزَلَ الْبَیِّنَاتِ وَمَا اَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ الْاِیَّہِ۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (3)۔ ابو سلمہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ اس اثنا میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں

یہودیوں میں سے ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ اور اسی وقت ایک جنازہ بھی ادھر سے گزرا۔ تو اس نے کہا اے محمد! ﷺ کیا یہ میت کلام کرتی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو نہیں جانتا۔ تو یہودی نے کہا یہ میت کلام کرتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اہل کتاب جو کچھ تمہیں بتائیں تم نہ تو اس کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔ اور کہو ہم اللہ کے ساتھ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لائے۔ پس اگر وہ باطل ہو تو ان کی تصدیق نہ کرو اور اگر وہ حق ہو تو ان کی تکذیب نہ کرو۔ (1)

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ ۚ فَالَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِالْيَتِيمَ إِلَّا الْكُفْرُونَ ۝

”اور (اے حبیب!) اس طرح ہم نے نازل کی آپ کی طرف کتاب ہے۔ وہ جنہیں ہم نے دی تھی کتاب (تورات) وہ ایمان لاتے ہیں قرآن پر۔ اور ان اہل مکہ سے بھی کئی لوگ ایمان لارہے ہیں قرآن پر۔ اور نہیں انکار کرتے ہماری آئیوں کا مگر کفار ہیں۔“

۱۔ جیسا کہ ہم نے کتاب میں اتاریں ان پر جو آپ سے پہلے تھے۔ اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی کتاب نازل کی جو کہ ساتھ تمام کتب الہیہ کی تصدیق کرتی ہے اور یہ اس قول کی تحقیق ہے۔

۲۔ پس وہ جنہیں ہم نے کتاب (تورات) دی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ بھی ایمان لاتے ہیں۔ ان سے مراد عبد اللہ بن سلام اور ان کے دیگر وہ ساتھی ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔ اور ان اہل مکہ میں سے یا اہل عرب میں سے یا حضور نبی رحمت ﷺ کے مقدس زمانہ میں اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں جو قرآن کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔

۳۔ یافینا میں اضافہ عہدی ہے یعنی قرآن کی آیات کا انکار نہیں کرتے مگر کفار۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور تمام کتابوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ یعنی جس نے قرآن کو جھٹلایا تحقیق اس نے تورات اور انجیل کو بھی جھٹلادیا۔ کیونکہ یہ دونوں قرآن کی تصدیق کرتی ہیں۔ لہذا قرآن کی تکذیب ان دونوں کی تکذیب ہوگی۔ پس جس نے قرآن کا انکار کیا اور تورات پر ایمان کا دعویٰ کیا تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انکار معرفت کے بعد ہوتا ہے (2)۔ اہل کتاب یہ جانتے تھے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور قرآن بھی حق ہے تو اس کے بعد انہوں نے انکار کر دیا۔

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّوا بِيَمِينِكُمْ إِذَا لُمْتُمُ الرَّبَّابِ الْمُبْطِلُونَ ۝

”اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے۔ اپنے دائیں ہاتھ سے ۲۔ (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل سے۔“

۱۔ اس کا عطف محذول ہے اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ پر ہے، یعنی اے محمد ﷺ اور نہ آپ کوئی کتاب آپ کی طرف کتاب نازل کیے جانے سے قبل پڑھ سکتے تھے۔ اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے۔

۲۔ یہاں یمنین (دایاں) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لیے کہ اس سے لکھنے کی نفی کی زیادہ تصویر کشی ہوتی ہے اور دوسرا اس لیے کہ یہ

معلوم ہو جائے کہ یہاں یہ لفظ مجازی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہاں حقیقی معنی ہی مقصود ہے۔

یعنی اگر آپ سابقہ کتابوں کو پڑھ لکھ سکتے تو کفار یعنی اہل مکہ اس میں ضرور شک کرتے اور یہ کہتے کہ شاید آپ نے یہ عقیدہ تین کی کتابوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ قرآنہ نے اسی طرح کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کفار کو مبطل کہا ہے یا تو ان کے کفر کی وجہ سے یا ان کے شک میں پڑنے کی وجہ سے کیونکہ اتنے کثیر معجزات پائے جانے کے سبب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کفر کرتے یا شک میں پڑتے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ یہاں مطلبین سے مراد اہل کتاب ہیں چونکہ آپ کا وصف اُمّی ان کتابوں میں موجود ہے اس لیے انہیں تو آپ کے اُمّی ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اسی طرح مقال نے کہا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مبطل ہونا واقعہ ہے نہ کہ تقدیر!۔

بَلْ هُوَ الْبَاطِلُ بَيِّنٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿٥﴾

”بلکہ وہ روشن آیتیں ہیں۔ جو ان کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ظالموں کے بغیر ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“

۱۔ بلکہ وہ قرآن روشن آیتیں ہیں جو اپنی چھائی پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ یہ سابقہ کلام سے پیدا ہونے والے مفہوم سے اضراب ہے، یعنی یہ قرآن نہ تو آپ کی اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور نہ ہی آپ کے دلائل ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو روشن اور واضح آیات ہیں۔
۲۔ یعنی ان مومنین کے سینوں میں جو قرآن کے حامل ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ کوئی بھی اس میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ قرآن کریم کے خصائص میں سے ہے کہ اس کی آیات واضح معجزہ ہیں اور تحریف و اسقاط سے محفوظ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّهُ لَحَافِظُونَ۔ اور یہ قرآن مومنین کے سینوں میں محفوظ ہے بخلاف دیگر تمام کتب کے۔ کیونکہ وہ معجزہ نہیں۔ اس لیے وہ ان میں جگہ جگہ الفاظ میں تحریف اور تغیر و تبدل کرتے تھے اور وہ صرف دیکھ کر ہی پڑھی جاتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت میں ہُو سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان روشن اور واضح علامات کے حامل ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جنہیں اہل کتاب میں سے علم دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف کو پاتے ہیں۔ (۱)
۳۔ ظلم کا معنی ہے ”وضع الشيء في غير موضعه“ یعنی کسی شے کو اس کے علاوہ اور مقام پر رکھنا۔ ہماری آیات معجزہ ہیں لفظاً اور معنی اپنی صداقت پر ان کی دلالت واضح اور بین ہے۔ لہذا جو بھی معجزہ ہونے کے بعد ان کا انکار کرے گا یقیناً وہ ظالم (بے جا) کوشش کرنے والا) اور حق کا منکر ہوگا۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا أُنْزِلَتْ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٥﴾

”اور انہوں نے کہا: کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے؟ آپ فرمائیے نشانیاں تو اللہ

تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔“

۱۔ اس کا عطف قال اللہین کفرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلَنَا ہے۔ اور ان کے درمیان تمام جملے مترفعہ ہیں۔

۲۔ یہاں لَوْلَا ہذا کے معنی میں ہے، یعنی انہوں نے کہا کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے جیسا کہ ان سے

پہلے انبیاء پر اتاری گئیں۔ مثلاً نوح صالح، عیسیٰ علیہ السلام کا دسترخوان۔ نافع، ابن عامر، بصریان اور حفص نے اپنا ہجرت کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے واحد کی صورت میں آیت قرأت کی ہے۔

اے محمد ﷺ آپ فرمادیجئے نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اسی کے ارادہ کے ساتھ مربوط ہیں میں ان کا ملک نہیں کہ میں تمہاری تجاویز اور فرمائشوں کے مطابق انہیں لاتا رہوں۔ میری ذمہ داری تو صرف ذرا تا ہے اور جو نشانیاں مجھے عطا کی گئی ہیں ان کا اظہار ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُثَبِّتُ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَ
ذِكْرًا لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾

”کیا انہیں کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اتاری ہے کتاب جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے مومنوں کے لیے۔“

۱۔ یہ معجزہ انکار اور توجیح کے لیے ہے اور داؤد فضل مقدر کے قائل سے حال ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ آپ سے کسی معجزہ اور نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ انہیں وہ کوئی نشانی کافی نہیں جو انہیں کسی اور نشانی کے مطالبہ سے مستغنی کر دیتی ہے کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو معجزہ ہے، علوم شریفہ کی تمام انواع کی جامع ہے اور سابقہ کتب سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ حالانکہ آپ تو ای تھے۔ اس کی تلاوت ان پر ہمیشہ ہوتی ہے درآ خالیکہ وہ اس سے متحد اور متفق ہیں۔

لَمْ يَغْيِرْ بَرْمَانٍ وَهَىٰ نُحْبِرُنَا عَنْ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَعَنْ إِدَمَ
ذَامَتْ لَدُنَّا فَفَاقَتْ كُلَّ مَفْجَرَةٍ مِنَ السَّيْنِ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدْمِ

آپ ﷺ ایک زمانہ میں نہیں تھے اور یہ کتاب آخرت اور قوم عاد و ارم کے بارے میں خبر دے رہی ہے۔ اس کی آیات ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے فائق اور ارفع ہیں کیونکہ ان کے معجزات کو دوام نصیب نہیں ہوا۔

۲۔ بے شک اس کتاب میں جو کہ واضح اور دائمی معجزہ ہے عظیم نعمت ہے اور نصیحت ہے ان کے لیے جنہوں نے اس پر ایمان لائے کا قصد کیا نہ کہ سرکشی اور ہمت دہری کا۔ یہ آیت زجر و توجیح کی علت ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، داری نے اپنی مسند میں اور ابو داؤد نے مراسیل میں عمرو بن دینار بن یحییٰ بن جعدہ کی سند سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ حبانہ کی بڈی لے کر آئے اس پر انہوں نے یہود سے سنی ہوئی کچھ چیزیں لکھ رکھی تھیں۔ تو اسے دیکھ کر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے جو کچھ ان کا اپنا ہی لے کر آیا اس سے وہ اعراض برتیں اور اس کی طرف متوجہ ہوں جو دوسروں کی طرف ان کے انبیاء لے کر آئے (1) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُثَبِّتُ عَلَيْهِمْ۔ روایت ہے کہ کعب بن اشرف نے کہا اے محمد (ﷺ) (کون شہادت دیتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ بَيِّنًا وَبَيِّنَاتٍ شَهِيدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٥٢﴾

”آپ فرمائیے کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اے اور

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں باطل پر اور انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وہی لوگ گھائے میں ہیں۔“

اے آپ فرمائیے میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس پر کوئی شے مخفی نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو شہیدۃ کی صفت ہے یا پھر کھفی کی علت ہے۔

جے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس میں باطل سے مراد غیر اللہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں پر ایمان لائے۔ اور مقابل نے کہا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے شیطان کی عبادت کی (1) اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھائے میں ہیں اپنی تمہادوں میں۔ کیونکہ انہوں نے حق کے مقابلہ میں باطل کو پسند کیا اور جنت کے مقابلہ میں دوزخ کو خرید لیا۔ یہ جملہ کھفی پر معطوف ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۖ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ۖ وَ
لَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْضَةً ۖ وَهُمْ لَا يُشْعُرُونَ ﴿٣٧﴾

”وہ آپ سے جلدی عذاب نازل ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر میعاد مقرر نہ ہوتی تو آجاتا ان پر عذاب (اپنے وقت

پر)۔ لہٰذا وہ ان پر اچانک آئے گا اور انہیں ہوش تک نہ ہوگا۔“

اے اس کا عطف قالوا: لَوْلَا اَنْزَلْنَاهُ عَلَيْهِ الْآيَةِ پر ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہنر بن حارث نے کہا تھا اُفْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا ۖ فَمِنْ السَّمَاءِ۔ (ہم پر آسمان سے پتھر برسائے)۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصل مسمیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے آپ سے یہ وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میں آپ کی قوم کو عذاب نہیں دوں گا اور انہیں جڑ سے نہیں اکھڑوں گا اور میں ان کا عذاب قیامت کے دن تک مؤخر کر دوں گا تو عذاب آجاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْوٰى وَاسْمُؤُا ۖ بَلٰك قِيَامَتُكِي گھڑی ان کے عذاب کے لیے مقرر ہے اور قیامت کی گھڑی انتہائی خوف ناک اور سخت کرؤی ہے (اور شحاک نے کہا ہے کہ آجئ مُسَمًّى سے مراد ان کی مدت عمر ہے کیونکہ جب وہ مرجائیں گے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد غزوہ بدر کا دن ہے۔ (3)

جے اور ان پر اچانک عذاب آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا مرجع الاجل ہے، یعنی عذاب میعاد مقرر پر آئے گا۔ دنیا میں جیسا کہ واقعہ بدر یا پھر آخرت میں جب کہ ان پر موت طاری ہوگی۔ اور انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۖ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَهِيطَةٌ ۖ بِالْكَافِرِينَ ﴿٣٨﴾

”وہ آپ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں (قرآسی دیر ہے) جہنم یقیناً گھیرے گا ان کافروں کو۔“

اے یہ تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَهِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ کا عطف لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْضَةً پر ہے۔ یعنی عفریب جس دن ان پر عذاب آئے گا وہ انہیں گھیر لے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ گویا جہنم اب بھی انہیں گھیرے ہوئے ہے کیونکہ وہ کفر اور معاصی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جو ان کے لیے جہنم کواد جب کرتے ہیں۔ الکافروں پر الف لام عہدی ہے اور ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لیے رکھا گیا

ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے جو اس احاطہ کا مؤثر ہے۔ یا الف لام عنی ہے تو اس صورت میں جنس کے حکم سے کافروں کے حکم پر استدلال ہوگا۔

يَوْمَ يَعْلَبُ الْعَذَابُ مِنْ قُوَّتِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٥﴾

”جس دن ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا لو اب چمکوا اپنے کرتوتوں کا مزہ۔“

۱۔ یَوْمَ یا تو محیطۃ کی طرف ہے یا فعل مقدر کی طرف ہے مثلاً کان کیت و کیت وغیرہ۔ جس دن عذاب انہیں تمام اطراف سے ڈھانپ لے گا۔ نافع اور کوفیوں نے یَقُولُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا اس کے حکم سے بعض مانگہ کہیں گے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ جمع محکم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ چھوٹا ان اعمال کی جزاء کا مزہ جو تم کرتے رہے۔

يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْجَىٰ وَأَسَعَةً لِّأَيِّ قَاعٍ عَبْدُونَ ﴿٥٦﴾

”اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو میری زمین بڑی کشادہ ہے ۱۔ سو میری ہی تم عبادت کیا کرو ۲۔“

۱۔ ابو عمر و حمزہ اور کسائی نے یعبادی کو حالت وصل میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے حالت وصل میں یاء کو مفتوح اور حالت وقف میں یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے اُرْضَىٰ کو یاء مفتوح اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ۲۔ یا ایہی فعل حذف کا مفعول ہے جس کی تفسیر مابعد فعل شرط کر رہا ہے۔ اور فاعل شرط حذف کی جزاء کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ کہ اگر تم طاقت نہیں رکھتے کہ تم میری عبادت کرو اس زمین میں جس میں تم ہو تو اس کے علاوہ کسی اور زمین میں جا کر میری عبادت کرو۔ اس میں شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس حذف کے عوض مفعول کو مقدم کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ ضمیر متصل کی بجائے ضمیر منفصل ذکر کی گئی۔ اور مفعول کی اس تقدیم نے اختصاص کا معنی دیا اور معنی یہ ہو گیا کہ تم صرف میری ہی عبادت کرو۔ پھر اسے نصب دینے والے فعل کو حذف کر دیا گیا اور اس کی تفسیر فاعبدونی کے قول سے کی۔ تاکہ یہ تاکید کا فائدہ دے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا فاعبدونی فاعبدونی۔ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ کے کزور اور ضیف مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی رب کریم ان سے فرما رہے ہیں کہ اگر مکہ مکرمہ میں رہ کر تمہارے لیے ایمان کا اظہار مشکل ہے تو مکہ کو چھوڑ کر کسی دوسری ایسی زمین کی طرف نکل جاؤ جہاں تمہارا لیے ایمان کا اظہار ممکن ہو۔ جیسا کہ مدینہ طیبہ کیونکہ میری زمین تو بہت وسیع ہے۔ مجاہد نے کہا ہے مطلب یہ ہے کہ جب میری زمین بہت وسیع ہے۔ پس تم ہجرت کرو اور اس میں جہاد کرو۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ جب کسی زمین میں گناہ کے اعمال کیے جائیں تو اس سے نکل جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ عطاء نے کہا ہے جب تمہیں گناہ کا حکم دیا جائے تو بھاگ جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ اسی طرح ایسا آدمی جو ایسے شہر میں رہتا ہو جہاں گناہ کے اعمال کیے جاتے ہوں اور اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کا امکان نہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ اسے چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ اپنے آپ کو عبادت کے لیے تیار کر سکتا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے لیے نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں ہجرت کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم

ہجرت کریں تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کی ہجرت کرنے کے اس عذر کو قبول نہیں کیا۔ مطرف بن عبد اللہ نے کہا ہے کہ اِنْ اَوْحِیَ وَاصِعَةً کا معنی ہے میرا رزق تمہارے لیے بہت وسیع ہے لہذا تم ہجرت کرو (1)۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کوئی اپنے دین کی خاطر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف بھاگ کر گیا اگرچہ وہ ایک بالشت ہی ہو وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ساتھی ہو گیا (2)۔ ثعلبی نے اسے حسن کی حدیث سے مرسل روایت کیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَا رِيقَةٍ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿۵۱﴾

”ہر ایک موت کا رِیقہ رکھنے والا ہے۔ پھر ہماری طرف ہی تم لوٹے جاؤ گے۔“

یعنی ہر نفس موت کی حرارت اور اس کی تپتی کو بائیں پانے والا ہے جیسا کہ چھینکے والا کسی بھی شے کے ذائقہ کو پاتا ہے۔ لہذا تم موت کے خوف سے دارالشر میں مقیم نہ رہو بلکہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم عبادت الہی کے ذریعے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔ پھر ہماری طرف ہی تم لوٹے جاؤ گے۔ تو ہم تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دیں گے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کرو تو ہم تمہیں اس کی جزا عطا فرمائیں گے۔ ابو بکر نے خز خفون کو صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بناء پر اسے ساتھ پڑھا ہے۔ تو اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُؤْتِيَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نِعَمَ أَجْرًا لِلْعَامِلِينَ ﴿۵۲﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہیں ہم تمہیں گے جنت کے بالا خانوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ وہاں ہمیشہ بہہ رہیں گے۔ کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا۔“

لَنُؤْتِيَنَّهُمْ کو حمزہ اور کسائی نے لَنُؤْتِيَنَّهُمْ پڑھا ہے یعنی ثناء ساکنہ، واؤ مخفہ اور حمزہ کی بجائے یاہ کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے ثوی الجبل والْأَنْهَارُ جب آدمی کو کسی خاص منزل میں اتارا جائے تو یہ کہا جاتا ہے۔ اور باقیوں نے اسے باء مفتوحہ، واؤ مشدودہ اور اس کے بعد حمزہ سے پڑھا ہے، یعنی ہم انہیں جنت کے بالا خانوں میں اتاریں گے۔ صاحب البحر المعراج نے کہا ہے کہ لَنُؤْتِيَنَّهُمْ باء کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدي ہونے والا فعل ہے اور اس کا مجرور لازم ہے۔ اور غُرَفًا حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یہ اس فعل کا دوسرا مفعول نہیں۔ ہاں فعل کے لَنُؤْتِيَنَّهُمْ کے معنی کو متعین ہونے کی بناء پر یہ دوسرا مفعول بن سکتا ہے۔

لَنُؤْتِيَنَّهُمْ أَجْرًا الْعَامِلِينَ میں مخصوص بالمدح محذوف ہے، باقی اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت ہے۔ غرف الجنة او اجروہم۔ یعنی کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا اور وہ جنت کے بالا خانے یا ان کا اجر۔

الَّذِينَ صَدَقُوا وَعَلَىٰ رَأْسِهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۵۳﴾

”وہ جنہوں نے (ہر حال میں) صبر کیا اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔“

وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے مشرکین کی اذیت ہجرت اور دیگر مشقتوں اور آزمائشوں میں صبر کیا اور صرف اپنے

رب پر بھروسہ کیے ہوئے یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ انہیں وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے انہیں وہم و گمان بھی نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ان مومنین سے فرمایا جو مکہ مکرمہ میں باقی رہ گئے تھے کہ وہ مشرکین کی اذیتوں سے بچنے کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر آئیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ مدینہ طیبہ کی طرف کیسے آجائیں جبکہ نہ ہمارا وہاں کوئی گھر ہے نہ مال۔ پس کون ہمیں کھانے پلانے کا انتظام کرے گا؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

وَكَايْنِ مِنْ ذَا بُرْجٍ إِذْ قَالَ لِرَبِّهِمَا اللَّهُ يَبْرِزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

”اور کتنے ہی زمین پر چلنے والے ہیں جو اٹھائے نہیں پھرتے اپنا رزق اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے انہیں بھی اور تمہیں بھی ملے اور وہ سب باتیں سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اے اور کتنے ہی ایسے جو بائیں اور پرندے ہیں جو غذا کے محتاج ہیں جو اپنے ساتھ اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اور نہ ہی آنے والے لکل کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں۔ سفیان بن علی بن ارقم نے کہا ہے انسان، چوہے اور چوہنیوں کے سوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی شے نہیں ہے جو خوراک کا ذخیرہ کرتی ہو۔ (2)

اے اللہ تعالیٰ انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی جہاں تم ہو۔ یعنی بے شک وہ اپنے ضعف اور اپنا رزق ذخیرہ نہ کرنے اور تم اپنی قوت اور کوشش کرنے کے باوجود آپس میں برابر ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ وہ بھی تمہاری طرح وہی رزق کھا کر جیتے ہیں اور بالآخر ویسے ہی مر جاتے ہیں جیسے تم۔ لہذا تمہاری رزق جمع کرنے کی کوشش عبث اور رایگاں ہے۔ اس لیے تم ہجرت کے سبب اپنی معاش کے بارے خوف زدہ نہ ہو۔

اے اور وہ تمہاری سب باتیں سننے والا ہے اس نے تمہارا یہ قول سن رکھا ہے کہ ہم مدینہ طیبہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں پائیں گے۔ اور وہ تمہارے دلوں میں پائے جانے والے یقین کے ضعف اور کمزوری کو جاننے والا ہے۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، بیہقی اور ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انصار کے باغات میں سے ایک باغ میں گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ اپنے دست مبارک سے تازہ کھجوریں توڑ توڑ کر کھانے لگے پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! تو بھی کھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں تو کھانے کی طلب نہیں رکھتا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تو اس کی طلب رکھتا ہوں آج چوتھی صبح ہے کہ میں نے کوئی شے نہیں کھائی اور نہ ہی میں نے کھانے کے لیے کوئی شے پائی۔ میں نے کہا اناللہ المستعان۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! اگر میں اپنے رب سے سوال کروں تو وہ مجھے بالیقین شہناہ کسریٰ و قیسریٰ مثل بلکہ اس سے بھی کئی گنا تازہ و عطا فرمائے۔ لیکن میں تو ایک دن بھوکا رہتا ہوں اور ایک دن سیر ہو کر کھاتا ہوں اے ابن عمر! اس وقت تیری کیا حالت ہوگی جب کہ تو اس عمر کو پہنچے اور ایسی قوم میں باقی رہے جو ایک سال کے لیے رزق کو ذخیرہ کر لے گی اور ان کے یقین کمزور ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں قسم بخدا ابھی ہم وہیں تھے اور وہاں سے بٹنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوگئی **وَكَايْنِ مِنْ ذَا بُرْجٍ** (3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ آنے والے لکل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ (4) حضرت عمر بن خطابؓ سے

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (اتحادیہ)

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (اتحادیہ)

4- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 59 (دارالتعلم)

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (اتحادیہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 165 (اتحادیہ)

روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسے توکل کرتے جیسے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں ایسے ہی رزق عطا فرماتا جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔ اسے ترندی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی شے نہیں ہے جو تمہیں جنت سے قریب کرنے والی ہو اور جہنم سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں جہنم کے قریب کرنے والی ہو اور جنت سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس سے منع کر دیا ہے بے شک روح القدس جبرائیل امین نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی نفس اپنا رزق مکمل کرنے سے پہلے ہرگز نہیں مرے گا۔ خبردار! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی طلب میں حسن پیدا کرو رزق ملنے میں دیر ہونا تمہیں اس پر برا بیخفتہ نہ کرے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں کے ذریعے اسے تلاش کرنے لگو۔ کیونکہ جو بچہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسے صرف اور صرف اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسے بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔ (2)

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لِيُقُولُنَّ
اللَّهُ قَالَ يَرُوفُونَ ۝

”اور (اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبرداری بنادیا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ تعالیٰ نے، پھر وہ کہاں تو حید سے پھیرے جاتے ہیں۔“

یعنی اگر آپ ان اہل مکہ سے پوچھیں کہ مخدوف قسم کے جواب میں یہ شرط ہے۔ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ یہ جملہ استنہامیہ بتاویں مفرہ ہو کہ سَأَلْتَهُمْ کے لیے مفعول مطلق ہونے کی بنا پر کل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے سَأَلْتَهُمْ ہذا السؤال (اگر آپ ان سے یہ سوال پوچھیں۔) لِيُقُولُنَّ اللہ میں لفظ اللہ فعل مخدوف کا فاعل ہے۔ تقدیر عبارت ہے لِيُقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ اللہ۔ اور قول باری تعالیٰ لِيُقُولُنَّ لفظ جواب قسم ہے اور معنی شرط کی جزاء ہے۔ یعنی قسم بخدا وہ نہیں کہیں گے مگر یہی جواب۔ جب مقول میں یہی بات راسخ ہو چکی ہے کہ ممکنات کی انتہاء اس واحد و یکتا ذات پر ہوتی ہے جس کی ذات واجب الوجود ہے تو اس اقرار کے بعد وہ پھر تو حید سے کیسے پھیرے جاتے ہیں؟

اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ إِنَّ اللَّهَ وَكُلَّ شَيْءٍ عِنْدَهُ ۝

”اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔“

بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

۱۔ اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لیے چاہتا ہے کبھی اس کا رزق وسیع کر دیتا ہے اور کبھی تنگ کر دیتا ہے۔ یہ دونوں عمل زمانے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاقب میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر مَنْ يَشَاءُ کی جگہ کبھی غنی ہے، یعنی وَيَقْدِرُ لِلْمِسْكِينِ يَشَاءُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے مَنْ يَشَاءُ غیر معین ہیں۔ اور اس کی مثل ضمیر بھی بہم ہے۔

جے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے منافع اور مفاسد کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے باب عبادت کا سوال کرتے ہیں تو میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تاکہ ان میں تکبر اور غرور داخل نہ ہو جائے کہ وہ انہیں تباہ و برباد کر دے۔ میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف دولت اور ثناء سے ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں فقر اور افلاس میں مبتلا کر دوں۔ تو وہ انہیں تباہ کر دے۔ اور میرے اہل ایمان بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف فقر کے ساتھ ہی سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر میں انہیں دولت عطا کر دوں تو وہ اسے فاسد کر دے اور بعض اہل ایمان ایسے ہیں جن کا ایمان صرف صحت کے سبب ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں بیماری لگا دوں تو وہ انہیں تباہ کر دے۔ اور بعض مومن بندے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان صرف بیماری کے سبب سلامت رہتا ہے، اگر میں انہیں صحت عطا کر دوں تو وہ اسے فاسد کر دے۔ بے شک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اس شے کے علم کے مطابق کرتا ہوں جو ان کے دلوں میں ہے بے شک میں خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہوں۔ اسے علامہ بغوی نے ایک طویل حدیث میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ہم اسے عنقریب سورۃ الشوریٰ میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ تَزُولُ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكٌ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا
لِيَقُولَنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ طَبْلٌ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٣٧﴾

”اور اگر آپ پوچھیں ان سے کہ کس نے آسمان سے پانی، پھر زعمہ کر دیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے بغیر بن جانے کے بعد تو ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے اے آپ فرمائیے الحمد للہ (حق واضح ہو گیا) جے بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں جے“

یعنی اگر آپ اہل مکہ سے سوال کریں۔ اس کا عطف لیکن سَأَلْتَهُمْ پر ہے۔ اور اس میں بحث بھی حسب سابق ہے۔ یعنی اہل مکہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بے شک تمام کی تمام اشیاء چاہے وہ بساط ہوں یا مرکبات، اصول ہوں یا فروغ، ان کا موجد اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس اعتراف کے باوجود اس کے ساتھ عبادت میں وہ اس کی ایسی حقوق کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی بھی شے پر قدرت نہیں رکھتی۔

جے آپ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ دیجیے الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قسم کی ذلت و گمراہی میں واقع ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ یا اس پر شکر ادا کیجیے کہ انہوں نے آپ کے موقف کی تصدیق کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حجت کو غالب عطا فرمایا ہے۔

جے بلکہ ان میں سے اکثر تو اپنے کردار کی قباحت اور اپنے اقوال کے تضاد اور تناقض کو سمجھتے ہی نہیں۔ اس طرح کہ وہ اقرار یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر شے کا موجد ہے اور پھر اس کے باوجود موجودات میں سے خیس ترین اور عاجز ترین کو عبادت میں اس کا شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَآتَىٰ لِهِيَ الْحَيَوَانِ
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾

شرک کو چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن مصائب سے نجات پانے کے بعد دوبارہ شرک کا ارتکاب شروع کر دیتے تھے۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَهُمْ وَلِيَسْتَعْمِلُوا^ط قَسُوفَ يَعْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

”وہ ناشکری کر لیں جو نعمت ہم نے انہیں دی ہے۔ اور لطف اٹھالیں (اس سے)۔ وہ غریب جان لیں گے حقیقت کو۔“

لے لِيَكْفُرُوا پر لام امر ہے۔ اور یہ تہدید اور وعید کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں امراسی معنی میں ہے اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ اِنَّكُمْ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرُونَ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا انکار کریں جو اللہ نے انہیں مصیبت سے نجات دلانے کی صورت میں عطا فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام نخی ہے۔ یعنی وہ شرک کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے شرک کے سبب نجات دلانے کی نعمت کا انکار کرنے والے ہو جائیں۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کے لیے اس شرک کرنے میں کوئی فائدہ نہیں سوائے کفر اور ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے جن سے وہ دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے تھے آخرت میں اس کا کوئی حصہ اور فائدہ نہیں۔ بخلاف ظلم موثرین کی عادت کے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ انہیں مصیبت سے نجات عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہ اسی احسان کو اطاعت میں اضافے اور زیادتی کا سبب اور ذریعہ بناتے ہیں۔

ع وَلِيَسْتَعْمِلُوا میں اِن کثیر حمزہ، کسائی اور قالون نے نافع سے لام کو سکون کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لہذا ان کی قرأت کے مطابق یہ لام امر ہے اور باقیوں نے لام کو سحر پڑھا ہے اور اسے لِيَكْفُرُوا پر عطف کیا ہے۔ اس صورت میں یہ لام لام امر اور لام نخی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

ع جب انہیں سزا دی جائے گی تو وہ اس کے انجام کو جان لیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مِّنَّا وَيَتَحَفَّظُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَقْبَالًا بَاطِلًا

يُؤْمِنُونَ وَنِعْمَةَ اللّٰهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦١﴾

”کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنادیا ہے حرم کو امن والا۔ حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے

آس پاس سے ع کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں ع اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں ع“

لے یہ اسقہام انکاری ہے۔ اور دو افعال محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اَلَمْ يَنْظُرُوا وَلَمْ يَرَوْا اَهْلَ مَكَّةَ۔ (کیا ان مکہ کے رہنے والوں نے غور و فکر نہیں کی اور نہیں دیکھا کہ ہم نے مکہ کو حرم بنادیا ہے کہ وہ لوٹ مار اور ظلم و تعدی سے محفوظ ہے۔ اس کے باقی قتل اور قید کی صعوبتوں سے پر امن ہیں۔

ع وَيَتَحَفَّظُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کا عطف اس جملہ محذوف پر ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جا رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَنَّا جَعَلْنَا مَكَّةَ حَرَمًا مِّنَّا لَا يُغَارُ وَلَا يُتَعَرَّضُ اَهْلُهَا وَيَتَحَفَّظُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (ہم نے حرم کو امن والا بنادیا ہے اس میں غارت گری نہیں کی جاتی اور نہ اس کے باسیوں سے کوئی تعرض کیا جاتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کے آس پاس سے اچک لیا جاتا ہے)۔ تحقیق عرب لوگوں کو قتل اور قید و بند کے لیے اٹھا کر لے جاتے تھے لیکن وہ اہل مکہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔

سے اکیلا باطلی یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء سابقہ مضمون پر تفریع کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اہل مکہ پر یہ احسان فرمایا حالانکہ وہ اس نعمت ظاہرہ اور دیگر نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی باطل یعنی بتوں اور شیطان کے سبب قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ مفہوم بھی درست ہے کہ باطل سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سب سے اچھا قول بید کا ہے۔

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ بَاطِلٌ (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے) (1)

یہ کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ پیغمبر اللہ کو پیغمبر ذاتی سے ماننے کے طریقے پر اہتمام یا اختصاص کے لیے مقدم کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے نعمۃ اللہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ اور قرآن ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ۝۱۱

”اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یا حق کو جھٹلایا جب وہ اس کے پاس آیا۔

کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا کفار کے لیے؟“

۱۔ اور کون شخص زیادہ ظالم ہے۔ اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یعنی یہ گمان کیا کہ اس کا کوئی شریک ہے۔ یا حق یعنی رسول اور قرآن کو جھٹلایا۔ یعنی جو نبی حق ان کے لیے ظاہر ہوا تو انہوں نے رسول کے آتے ہی نہ توقف کیا اور نہ ہی غور و فکر کی پہلی بار ہی جو کچھ سنا اسے جھٹلادیا۔

۲۔ اَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ میں استفہام تقریری ہے اور جہنم میں ان کے ٹھکانے کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے۔ کیا وہ جہنم میں قرار پذیر ہونے اور ٹھہرنے کے مستحق نہیں ہیں حالانکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بھی بہتان تراشی کی اور حق کو بھی مکمل طور پر جھٹلادیا۔ یا یہ استفہام ان کی جرات کی تقریر کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں جانتے کہ کافروں کے لیے جہنم میں ٹھکانا ہے کہ انہوں نے اس افتراء پر دازی اور تکذیب کی جرأت کی ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝۱۲

”اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راہیں کرنے کے لیے۔ ہم ضرور دکھادیں گے انہیں اپنے راستے۔“

اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بروقت) محسنین کے ساتھ ہے۔“

۱۔ اَلَّذِينَ جَاهَدُوا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الظَّالِمِينَ (جہاد کا معنی ہے اپنی وسعت اور طاقت کو خرچ کر دینا) اور یہاں مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر وسعت (وسائل) اور طاقت کفار سے جنگ کرنے، نفس اور خواہشات کی مخالفت کرنے میں صرف کر دی۔ ”فینا“ ہماری رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، ہمارے دین کی مدد اور نصرت کے لیے، ہمارے اوامر کی پیروی کرنے کے لیے اور ہماری منع کی ہوئی چیزوں سے رکھنے کے لیے۔

مع تو ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھادیں گے۔ یعنی ایسے راستے جو ہماری طرف لے کر آئے والے ہیں اور ہماری بارگاہ تک بلا کیف پہنچانے والے ہیں۔ یا ہم انہیں ضرور بھلائی اور نیکی کے راستے دکھادیں گے اور ان پر چلنے کی توفیق بھی ارزانی فرمائیں گے۔ رب کریم نے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَزِيدُهُمْ مَّا وَعَدْنَاهُمْ** (جو لوگ ہدایت پالیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ان چیزوں میں اپنی طاقت کو صرف کیا جنہیں وہ جانتے ہیں تو ہم ضرور ان کی راہنمائی ان چیزوں کی طرف کر دیں گے جنہیں وہ نہیں جانتے۔

حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ہماری رضا کے حصول کے لیے اپنی وسعت و طاقت کو خرچ کیا ہم انہیں ضرور اپنے ثواب کے راستے دکھادیں گے۔

حضرت حنیذ بغدادی سے یہ معنی منقول ہے کہ جنہوں نے توبہ کے لیے اپنی طاقت خرچ کی ہم انہیں اخلاص کے راستے ضرور دکھا دیں گے اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو تم اس کی طرف دیکھو جس پر اہل سرحد ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَكْفِيَنَّهُمْ مَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ** (1) (گویا آپ کے نزدیک جہاد سے مراد کفار سے جہاد کرنا ہے) حسن نے کہا ہے کہ افضل ترین جہاد خواہشات کی مخالفت ہے (افضل الجہاد مخالفة الهوى)۔ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جنہوں نے علم کی تلاش میں اپنی طاقت اور کوشش صرف کی ہم انہیں ضرور عمل کی راہیں دکھائیں گے۔ سہیل بن عبد اللہ نے کہا ہے کہ جنہوں نے سنت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہم ضرور انہیں جنت کے راستے دکھائیں گے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جنہوں نے ہماری اطاعت میں اپنی طاقت صرف کی ہم انہیں اپنے ثواب کے راستے ضرور دکھائیں گے (2) اور حدیث طیبہ میں ہے کہ جس کسی نے اس کے مطابق عمل کیا جس کا وہ علم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ان کا علم عطا فرمائے گا جنہیں وہ نہیں جانتا۔

لَنَكْفِيَنَّهُمْ مَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ کا جملہ حذف قسم کا جواب ہے۔ اور جملہ قسمیہ موصول کی خبر ہے۔ اور اسم موصول مبتدا اپنی خبر کے ساتھ مل کر **الَّذِينَ آمَنُوا** اور **عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ** پر معطوف ہے۔

مع اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر وقت محسنین کے ساتھ ہے، یعنی دنیا میں مدد اور معاونت کے ذریعے اور آخرت میں ثواب اور مغفرت۔ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صوفیائے نے کہا ہے کہ محسنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت غیر متکلیف ہے۔ اس کا ادراک صرف اہل بصیرت ہی بصیرت کے سبب کر سکتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا** پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ **لَنَكْفِيَنَّهُمْ** کے فاعل سے حال ہو۔ اور ضمیر عائدی جگہ اسم ظاہر کو رکھ دیا گیا ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو۔ **وَأَنَّا لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ**۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی صراحتہ ذکر کرنا تاکید میں اضافہ کے لیے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سورہ عنکبوت کی تفسیر 9 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورہ عنکبوت کا ترجمہ 7 شوال 1420ھ بمطابق 15 جنوری 2000ء بروز ہفتہ ساڑھے نو بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس آگے سورہ الروم کا ترجمہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

www.muhammadiyah.com

سے نکلے گا۔ مگر یہ ہے، یعنی رومی اس کے بعد کہ ان پر غلبہ پایا گیا، غریب فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔

فِي بَعْضِ سِنِينَ ۖ لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُ السُّيُوفُ ۖ

”چند برس کے اندر اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ کی مدد سے۔“

۱۔ البضع سے مراد تین سے سات سال کی مدت ہے۔ ایک قول ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر نو سال تک کی درمیانی مدت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دس سال سے کم کا عرصہ ہے۔ جوہری نے کہا ہے کہ جب تعداد دس تک ہو تو اس کے لیے توضع اور بضعة استعمال ہوتا ہے لیکن جب تعداد دس سے تجاوز کر جائے تو پھر آپ بضع و عشرون نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ موقف اس حدیث طیبہ کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلَا يُبَاسُ بَضْعٌ وَ سَبْعُونَ شُعْبَةً کہ ایمان کے ستر سے زائد حصے ہیں۔ (1)

علامہ بخاری نے کہا ہے کہ فارس اور روم کے درمیان جنگ تھی۔ مشرکین یہ پسند کرتے تھے کہ اہل فارس روم پر غالب آئیں کیونکہ اہل فارس مجوسی (آتش پرست) تھے اور ان کے پاس کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں تھی۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اہل روم فارس پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ چنانچہ کسریٰ فارس پر یزید بن ہرمل بن نوشروان نے ایک لشکر روم کی طرف بھیجا اور اس کا امیر شہر یزید نامی آدمی کو مقرر کیا۔ اور قیصر روم نے بھی ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر تھیسس نامی آدمی کو بنایا۔ ان دونوں لشکروں کا مقابلہ شام اور بصری کے علاقہ اذرعات میں ہوا۔ (شام کا یہ علاقہ سرزمین عرب و عجم کے قریب تھا)۔ نتیجہ فارسی لشکر رومی لشکر پر غالب آ گیا۔ پس جونہی یہ خبر کہ عرصہ کے مسلمانوں تک پہنچی تو ان پر انتہائی شاق گزری اور اس پر انہیں دلی رنج و غم ہوا۔ اور کفار مکہ کو اذ حد خوشی ہوئی۔ اور انہوں نے مسلمانوں سے کہا تم بھی اہل کتاب ہو اور نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں۔ اور ہم تو کتاب سے خالی ہیں۔ لیکن ہمارے فارس کے رہنے والے بھائی تمہارے روم کے رہنے والے بھائیوں پر غالب آ گئے ہیں۔ لہذا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ لڑی تو ہم بھی بالیقین تم پر غالب آئیں گے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کفار کی طرف تشریف لے گئے اور جا کر فرمایا۔ تم اپنے بھائیوں کے غلبے سے بہت خوش ہو۔ لیکن قسم بخدا رومی اہل فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے ہمیں اس کی خبر دی۔ یہ سن کر ابی بن خلف جمعی نے کہا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تو جواباً آپؐ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن! تو بہت زیادہ جھوٹا ہے۔ اس پر ابی نے کہا اپنے اور ہمارے درمیان ایک مدت مقرر کر لو دس اونٹ بطور شرط میری طرف سے ہوں گے اور دس آپ کی طرف سے۔ اگر اہل روم اہل فارس پر غالب آ گئے تو میں تاوان ادا کروں گا اور اگر اہل فارس رومیوں پر غالب آ گئے تو تم تاوان ادا کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کر لیا اور تین سال کی مدت مقرر کر لی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ کو سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ (یہ واقعہ جوئے کی حرمت سے پہلے کا ہے)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تو اس طرح جان نہیں کیا تھا بلکہ بضع سے مراد دو تین سال سے نو برس تک کی درمیانی مدت ہے۔ لہذا ہاں جاؤ مال میں اضافہ کرو اور مدت بڑھا دو۔ چنانچہ ابوبکر صدیقؓ باہر تشریف لائے تو آپؐ نے ابی کو دیکھا تو اس نے فوراً کہا شائد اب تو تم اپنی شرط پر نادم ہو گے۔ آپؐ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو تیرے لیے

مال میں اضافہ کرنے لگا ہوں اور تیرے ساتھ مدت مقررہ میں توسیع چاہتا ہوں۔ چنانچہ نو سال تک کی مدت مقرر کر کے اونٹنیوں کی تعداد اسو سو کر دی۔ بعض نے کہا ہے سات سال کی مدت مقرر کی۔ یہ سن کر انہی نے بھی کہہ دیا میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ پس جب اُبی بن خلف کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکہ مکرمہ سے نکل جانے کا خطرہ لاحق ہوا۔ تو وہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے چٹ کر کہا۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے اس شرط کو قبول کر دیا۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن ابی بکر کو ضامن مقرر کر دیا۔ چنانچہ اس نے یہ کہا تھا تم بخدا میں تم کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ تم مجھے اپنا کفیل دے دو۔ چنانچہ آپ نے اسے ضامن دے دیا۔ اس کے بعد اُبی بن خلف جنگ احد میں شریک ہونے کے لیے مکہ سے نکلا اور وہاں مقابلہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے زخمی ہو گیا اور اسی زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں سے مکہ کی طرف واپسی کے دوران مر گیا۔ پھر حدیبیہ کے دن رومی اہل فارس پر غالب آ گئے۔ یہ ان کی شرط کے دن سے لے کر ساتویں سال کا آخر تھا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بدر کے دن رومیوں کو فارسیوں پر غلبہ نصیب ہوا (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ ابھی تک اہل مکہ اور ان کے صاحب شرط اُبی بن خلف اور مسلمانوں اور ان کے صاحب شرط حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان طے پانے والی مقررہ مدت مکمل طور پر نہیں گزری تھی کہ رومی فارس پر غالب آ گئے اور انہوں نے اپنے گھوڑے مدائن میں بیچ کر باندھ لیے اور تیر اندازی کے لیے مخصوص جگہیں بنالیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُبی سے اپنی شرط جیت لی، اور اس کے وارثوں سے آپ نے معینہ مال وصول کر لیا۔ آپ وہ مال لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے صدقہ کر دو (2)۔ ترمذی نے ابوبکر صدیقؓ کی حدیث سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ (یہ واقعہ قتار کی حرمت کے حکم سے پہلے کا ہے)

مسئلہ :- حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان عقود فاسدہ جائز ہیں مثلاً سود کی بیع وغیرہ۔ اور اس کا استدلال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسی واقعہ سے کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ کفار کا مال محفوظ نہیں ہوتا اس لیے اسے لینا جائز ہوتا ہے۔ البتہ انہیں امان دینے کے بعد وھو کے سے ان کا مال لینا جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مکرمہ کے قول کے مطابق اہل روم کے فارس پر غلبے کا سبب یہ تھا کہ روم پر غلبہ پانے کے بعد شہر یزید اور یمنوں کو روندنا اور ان کے شہروں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے فلسطین تک جا پہنچا۔ پس اسی اثناء میں ایک دن اس کا بھائی فرخان اس کے تخت پر بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اپنے آپ کو کسریٰ کے تخت پر بیٹھ دیکھ رہا ہوں۔ اس کی بات کسریٰ تک پہنچ گئی، تو اس نے شہر یزید کی طرف لکھا کہ جو نبی آپ کے پاس میرا یہ خط پہنچے تو فرخان کا سر میری طرف بھیج دینا۔ اس کے جواب میں شہر یزید نے اسے لکھا اے شہنشاہ تو فرخان کی مثل ہرگز کسی کو نہیں پائے گا، اس کے بہت کارنامے ہیں اور دشمن پر اس کا بہت رعب ہے۔ لہذا آپ اس سے غافل نہ رہیں۔ چنانچہ کسریٰ نے اس کی طرف دوبارہ لکھا کہ فارس کے لوگوں میں بہت سے ہیں جو اس سے اچھے ہیں۔ لہذا تم اس کا سر فوراً میری طرف بھیج دو۔ اس نے دوبارہ وہی جواب لکھا۔ جس سے کسریٰ غضبناک ہو گیا اور اب اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ڈاک کے ذریعے اہل لشکر کی طرف یہ حکم بھیج دیا کہ میں نے تمہاری امارت سے شہر یزید کو محروم کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ تمہارا امیر فرخان کو بنا دیا ہے۔ پھر ساتھ یہ ایک مختصر سا خط ڈاک لانے والے کو دیا جس میں شہر یزید کے قتل کا حکم تھا۔ اور اسے کہا کہ جب فرخان ولایت کے

اختیارات حاصل کر لے اور اس کا بھائی اس کے تابع فرمان ہو جائے تو یہ خط اب اسے دینا۔ چنانچہ جب شہر یزاد نے وہ خط پڑھا تو کہا سَمْعًا و طَاعَةً کی میرا اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ اور اپنے تخت سے اتر گیا اور اس کی جگہ فرخان نے اختیارات سنبھال لیے تو اس وقت اس نے وہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد فرخان نے کہا کہ شہر یزاد کو میرے پاس لاؤ۔ پس اس نے اسے مزید آگے کیا تاکہ اس کی گردن مار دے۔ لیکن شہر یزاد نے اسے کہا مجھے قتل کرنے میں اتنی جلدی نہ کر، یہاں تک کہ مجھے وصیت لکھنے کی مہلت دے۔ فرخان نے کہا ٹھیک ہے۔ پس شہر یزاد نے اپنا دستہ منگوا دیا اور اس سے تین خط نکال کر اس دے دیے۔ اور کہا یہ تمام وہ خطوط ہیں جو میں نے تیرے بارے میں کسریٰ کو جواباً لکھے ہیں۔ اور تو صرف ایک خط کے سبب مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ فرخان نے ولایت کے تمام اختیارات اپنے بھائی کے حوالے کر دیے۔ تو اس کے بعد شہر یزاد نے شہنشاہ روم قیصر کی طرف لکھا کہ مجھے تیرے ساتھ ایک ضروری کام ہے لیکن ڈاک و لالہ تو اسے بصورت پیغام اٹھا کر لا سکتا ہے۔ اور نہ ہی بصورت خط پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ ملاقات کرو۔ اور ملاقات کے لیے تمہارے ساتھ پچاس رومیوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اور میرے ساتھ پچاس فارسیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ قیصر اپنے ساتھ پچاس رومیوں کو لے کر آیا۔ چونکہ اسے اس کی جانب سے حکم اور دھوکے کا خوف تھا اس لیے اس نے راستے میں آگے آگے جاسوس بھیج دیے۔ جنکی کہ جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ شہر یزاد کے ساتھ بھی پچاس آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ پھر دونوں کے لیے ایک ریشمی خیمہ لگایا گیا جس میں دونوں نے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک خنجر تھا۔ اور دونوں کے درمیان ترجمان بھی موجود تھے۔ چنانچہ شہر یزاد نے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے تیرے شہروں کو برباد کیا ہے وہ میں اور میرا بھائی ہیں ہم نے اپنی چال اور شجاعت کے ساتھ ایسا کیا ہے۔ لیکن کسریٰ نے ہمارے ساتھ حسد کیا ہے۔ اور اس نے یہ خواہش کی کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے میرے بھائی کو مجھے قتل کرنے کا حکم دیا۔ ہم تو اکٹھے پیدا ہوئے ہیں (اس لیے ہم اس کے کہنے پر عمل نہیں کر سکتے)۔ لہذا اب ہم تیرے ساتھ مل کر اس سے قتال کرنا چاہتے ہیں۔ تو قیصر نے کہا تم دونوں نے صحیح کیا۔ پھر دو میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا کہ راز دواؤ آدمیوں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ جب وہ دوسرے تہاذر کر جائے تو پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے خنجروں کے ساتھ اپنے ترجمانوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا۔ پس اس وقت سے رومیوں کو اہل فارس پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ رومیوں نے اہل فارس کو تلاش کر کے قتل کیا۔ اور کسریٰ بھی مر گیا۔ اور یہ خبر حدیبیہ کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ اور آپ کے ساتھی یہ سن کر اڑھد خوش ہوئے۔ اسی کے بارے میں یہ ارشاد گرامی ہے۔ اَللّٰهُ غَلَبَتِ الْاَوْثَمُ فِيْ اَذَى الْاَنْرَضِ الْاَيَمُ (1)۔

غَلَبَتِ کو صیغہ معروف کی صورت میں فتح کے ساتھ غَلَبَتْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور سَبَّحَتْ عَلَيُّوْنَ کو سُبْحَہ کے ساتھ سَبَّحَتْ عَلَيُّوْنَ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک رومی اہل فارس کی سر زمین پر غالب آ گئے اور مسلمان عقرب اب ان پر غالب آ جائیں گے۔ چنانچہ رومیوں کے غلبے کے نوے سال میں مسلمانوں نے ان سے جنگ لڑی اور ان کے بعض شہروں کو فتح کر لیا۔ ابن ہناء پر الغلب فعل معروف کا مصدر ہے جو کہ فاعل کی طرف مضلف ہے۔ اس قرأت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ترمذی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے کہ جب یوم بدر تھا تو رومی اہل فارس پر غالب آ گئے۔ تو اس خبر نے مؤمنین کو اڑھد خوش کیا۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اَللّٰهُ غَلَبَتِ الْاَوْثَمُ (2)۔ بنسْبُورِ اللّٰہ۔ تو اس میں غَلَبَتْ کی ثنیں مفتوح ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح

روایت نقل کی ہے۔ لیکن قرأت شاذہ ہے اور پہلی متواترہ ہے۔ جب رومی اہل فارس پر غالب آئے تو شاید حضور نبی کریم ﷺ نے وہی غیر متلو کے ذریعے جان لیا کہ بے شک آج رومی اہل فارس پر غالب آئے ہیں حالانکہ رومیوں کو اہل فارس پر غلبہ پانے کے بعد عتق رب مومنین ان پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ تب رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس طرح قرأت کی جیسے ترمذی نے ابوسعید سے اسے نقل کیا ہے۔ یعنی غلبت کو صیغہ معروف کی صورت میں اور سَيَعْلَمُونَ کو صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے رومیوں کے اہل فارس پر غلبہ پانے سے پہلے بھی۔ جبکہ وہ مغلوب تھے۔ اور ان کے ان پر غلبہ پانے کے بعد بھی۔ جس وقت کہ وہ غالب تھے اور ان دونوں کے درمیان اس کے فیصلے اور اندازے کے بغیر کوئی شے وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ یہ جملہ سَيَعْلَمُونَ کی علت بیان کرتا ہے۔ اور اس دن جبکہ رومیوں کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو ان پر غالب کر دیا جو اہل کتاب نہیں، مومنین نے مشرکین کو جو خبر دی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی صداقت کو ظاہر کر دیا اور انہیں اپنی شرط میں غلبہ عطا کیا اور ساتھ ہی اپنے دین کے بارے میں ان کے یقین اور ثبات میں مزید اضافہ فرمایا۔ مدئی نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بدر کے دن بہت خوش ہوئے کہ مسلمانوں کو مشرکین پر فتح نصیب ہوئی اور اہل کتاب کو اہل شرک پر غلبہ عطا ہوا (۱)۔ علامہ جلال الدین خلجی نے کہا ہے مسلمانانِ غلبہ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے اور انہیں اس واقع کا علم یوم بدر کو ہوا کہ اس روز جبریل امین علیہ السلام یہ خبر لے کر آئے اور اس کے ساتھ ہی اس دن مسلمانوں کو مشرکین پر اپنے غلبے کی بھی امداد بخشی تھی (۲)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ وَفَعْلَمُونَ تَعْلَمُونَ سَيَعْلَمُونَ پر معطوف ہے۔

يَنْصُرُ اللَّهُ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦﴾

”وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“
۱۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ پس وہ کبھی ایک فریق کی مدد کرتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی اور وہی سب پر غالب ہے۔ کبھی اپنے بعض بندوں پر دوسروں کو مسلط کر کے انہیں سزا دیتا ہے۔ اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور ان کی مدد فرما کر انہیں دوسروں پر غالب کر دیتا ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدًا وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٧﴾

”یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ ۱۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ کیا ہے۔ اس میں وعدہ مصدر ہے جو اپنی ہی ذات کی تاکید کے لیے ہے نہ کہ ماقبل کی اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَفَعْلَمُونَ تَعْلَمُونَ سَيَعْلَمُونَ کیونکہ یہ وعدہ کے معنی میں ہے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی طرف کذب کی نسبت متنع ہے لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی جہالت اور غور و فکر نہ کرنے کے سبب اس وعدے اور اس کے صحیح ہونے کو نہیں جانتے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ۝

”وہ جانتے ہیں دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو۔ اور وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں۔“

۱۔ یعنی وہ جانتے ہیں امور معاش کو کہ انہیں کیسے حاصل کرنا ہے، تجارت کیسے کرنی ہے اور بھتی باؤی اور دیگر ایسے طریقے کیا ہیں۔
۲۔ اور وہ اس آخرت سے جو ہمیشہ رہنے والی ہے وہ بالکل غافل ہیں۔ یعنی اس کا تصور بھی ان کے دلوں میں نہیں نکلتا۔ دوسری ہم ضمیر پہلے ہم کی نگریرت کید کے لیے ہے۔ یا دوسری ہم ضمیر مبتدا ہے اور غافلون اس کی خبر ہے۔ اور پھر یہ جملہ پہلے کی خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ مبتدا کے لفظ کا دوبارہ مذکور ہوتا ہے جیسے اَلْعَاقِلَةُ مَالِ الْعَاقِلَةِ ۝ میں ہے۔ اور یہ دونوں ترکیبوں کی بناء پر آخرت سے ان کی غفلت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون کی تاکید اور اسے پختہ کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ لا یعلمون کے قول سے بدل برائے تقریر ہے۔ اور انہیں ان حیوانات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جن کا ادراک دنیا کی بعض چیزوں کے ظاہر تک محدود ہوتا ہے تمام چیزوں کے بارے انہیں معلومات نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ظاہر کے علم سے مراد اشیاء کی حقائق، صفات، خصائص افعال اور اسباب کی پہچان ہے اور اسباب سے چیزوں کے صادر ہونے کی کیفیت اور ان میں تصرف کی کیفیت کی پہچان ہے۔ اسی لیے ظاہر کو نگہ ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دنیا کے باطن کا علم، کہ یہ دنیا آخرت کی نگہ گاہ ہے، آخرت کے حصول تک پہنچانے والی ہے اور یہ دنیا احوال آخرت کے لیے نمونہ ہے (اس سے تو جانور قطعاً ناواقف ہیں) اور یہ اس کا احساس دلانے کے لیے ہے کہ عدم علم اور اس علم کے درمیان کوئی فرق نہیں جو صرف دنیا کے ظاہر کے ساتھ مختص ہو۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ ۚ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا

بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لِبَلٰغٰی رَآیِهِمْ لَکٰفِرُوْنَ ۝

”کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا اپنے جی میں۔ نہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ ایک مقررہ مدت تک کے لیے۔ اور بلاشبہ اکثر لوگ اپنے رب کی مافات کے سخت منکر ہیں۔“

۱۔ یہ ہمزہ استفہام ز جروتوح کے لیے ہے۔ اور او و محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کا یہ ہے کیا انہوں نے اپنی نظروں کو صرف دنیوی زندگی کے ظاہر تک محدود رکھا اور کبھی بھی غور و فکر نہیں کیا، یعنی انہوں نے دنیا میں غور و فکر کیا ہی نہیں کر ان کے لیے اس کے باطن کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا۔ یا معنی یہ ہے کیا انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں غور و فکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تو کسی اور کی نسبت ان کے زیادہ قریب تھے۔ اور نفس میں غور و فکر کرنے والے کے لیے وہ سب کچھ متکشف ہو جاتا ہے جو کچھ تمام مخلوقات میں غور و فکر کرنے والے کے لیے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انسان عالم صغیر ہے (اور عالم کبیر کے لیے نمونہ ہے)۔ اگر وہ غور و فکر کرتے تو جان لیتے اور یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں باطن، بے کار اور بغیر حکمت بالغہ کے پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں کامل حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور انہیں ہمیشہ باقی رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ ایک معینہ مدت تک کے لیے پیدا فرمایا جب وہ مدت مقررہ ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی۔ اور حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا وقت آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفَصَبِيْكُمْ اَمْ عَلٰی خَلْقِنَا عَلٰی مَا وَاٰلَکُمْ اِلٰہًا لَا تُدْعَوْنَ (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے) تو یہ

ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں واپس لوٹائے بغیر ویسے چھوڑ دینا عبث اور بے کار ہے۔ پس جو بھی آسمانوں، زمین اور ان کے مابین موجود کائنات کے نظام میں غور و فکر کرتا ہے وہ یقیناً یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اس نظام کا خالق حکیم اور دانا ہے اور حکیم سے کبھی بھی بے کار اور عبث فعل صادر نہیں ہوتا۔ اور ان کی تحقیق میں حکمت خالق کی ذات و صفات کی پہچان ہے۔ اور اگر قیامت برپا نہ ہو، حشر و نشر نہ ہو اور جزا و سزا کا تصور نہ ہو تو پھر پہچاننے والا اور کافر مساوی ہو جائیں گے۔ پس جو ان میں غور و فکر کر کے آخرت کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے تو پھر وہ غافلین میں شمار نہیں ہوتا۔

اے بلاشبہ اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی کند و بانی اور غور و فکر نہ کرنے کے سبب اپنے رب کی ملاقات کے۔ یعنی دنیا ختم ہو جانے کے وقت اس کی جانب سے جزاء پانے کے سخت متحرک ہیں۔ اور وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی ہے نہ قیامت قائم ہوگی اور نہ ہی حساب و کتاب ہوگا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوا وَهَاجَأَتْهُمْ
رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١﴾

”کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے۔ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ زیادہ تھے ان سے زور میں۔ اور انہوں نے خوب مل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے اسے آباد کیا۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر سے پس تھی اللہ کی یہ شان کہ وہ ان پر ظلم کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے۔“

اے یہ ہمزہ استفہام انکاری اور زبرد تو بخ کے لیے ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ اور اوّٰی محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کیا اہل مکہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی۔ تاکہ وہ دیکھتے یہاں فَيَنْظُرُوا جواب نفی میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔

اے کیف کا کنی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے لیے حد رکلام کا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر یہ مکمل جملہ فَيَنْظُرُوا کا مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی بے شک انہوں نے اپنے سفر کو دور ان سیر و سیاحت کی ہے اور ان لوگوں کے نشانات کو دیکھا ہے جنہوں نے ان سے قبل اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور پھر اسی تکذیب کی بناء پر وہ تباہ و برباد کر دیے گئے۔ وہ زور میں ان سے زیادہ تھے۔ جیسے قوم عاد اور ثمود وغیرہ کیونکہ اھم مافیہ آئے والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ زور آور، طویل العمر اور کثیر الآثار تھیں۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ کے جواب میں مستأنف ہے۔

اے یہ جملہ اپنے معطوف سمیت كَانُوا پر معطوف ہے۔ یعنی انہوں نے پانی نکالنے اور معدنیات برآمد کرنے کے لیے سطح زمین کو پلٹ دیا اور زراعت اور دیگر امور کے لیے اس میں مل چلائے۔ اور انہوں نے زمین کو اچھی طرح آباد کیا۔ اس میں اُكْفَرُو محذوف

مصدق کی صفت ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی عَمَرُوْهَا عِمَارَةً اَکْثَرَ مِنْ عِمَارَةِ اَهْلِ مَكَّةَ اِنِّهَا۔ یعنی انہوں نے زمین کو اہل مکہ کی نسبت زیادہ آباد کیا۔ کیونکہ اہل مکہ وادی غیر ذی زرع میں سکونت پذیر تھے اور کہیں ان کا پھیلاؤ بھی نہیں تھا۔ اور اس میں ان پر اس حیثیت سے طعن بھی ہے کہ وہ دنیا پر فریفتہ ہیں اور اس پر فخر کیاں ہیں حالانکہ ان کی حالت دنیا میں انتہائی کمزور ہے۔ کیونکہ دنیوی ترقی کا دار و مدار شیروں میں پھیلنے، لوگوں پر تسلط حاصل کرنے اور زمین کی اطراف و اکناف میں آبادی کی مختلف انواع کے ساتھ تصرف کرنے میں ہے۔ حالانکہ وہ تو کمزور تھے، ایسی وادی میں پناہ لیے ہوئے تھے جو ان کے لیے نفع بخش نہ تھی۔ اور اگر وہ موسم سرما اور گرمی میں بین اور شام کی طرف سفر نہ کرتے اور وہاں سے ساز و سامان نہ لاتے تو بھوک سے مر جاتے۔ وَجَاءَهُمْ مُّسْتَبَشِّرٌ بِالنَّبِیِّتِ کَا عَظْفٍ کَانُوا اَشْدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً پر ہے۔

یہ دو محذوف جملوں پر معطوف ہے۔ اور وہ دونوں جَاءَهُمْ پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے انہوں نے انہیں جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں عیبتاہ و برہاد کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں تھی کہ وہ ان پر ظلم کرتا۔ یعنی ان پر ظلم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان نہیں۔ لَیْظَلِّمُهُمْ مِّثْلَ لَامٍ اَلَمْ یَجِدْ دے۔ اور اس کے بعد ان مقدور ہے۔ یعنی مَا کَانَ صِفَةً لِلّٰہِ اَنْ یَّفْعَلَ بِہِم مَّا یَفْعَلُ الظَّالِمَةُ مِنَ التَّعْذِیْبِ بِغَیْرِ جُرْمٍ وَلَا تَذْکِیْرٍ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ظالموں جیسا سلوک کرتا، یعنی بغیر جرم اور نصیحت کے عذاب دیتا وغیرہ)۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ یعنی انہوں نے ایسے افعال کیے جنہوں نے انہیں ہلاکت اور تباہی تک پہنچا دیا۔

لَمْ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السَّوْاۤی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِہَا یَسْتَهْزِءُوْنَ ①

”آخر کار ان کا انجام یہ جنہوں نے برائی کی تھی یہ بہت برا ہوا ہے کیونکہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو اور وہ ان کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔“

یہ دنیا میں ہلاک اور تباہ کرنے کے بعد اس کا عطف جملہ مقدورہ پر ہے اور وہ ہے قدموہم اللہ ثم پس اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور پھر اہل حجاز اور یسریوں نے عاقبتہ کو کھان کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے اور اب بعد کلام کھان کی خبر ہے۔ یا پھر خبر محذوف ہے۔ جیسا کہ ہم غریب و ذکر کریں گے۔ اور اہل کوفہ و شام نے اسے کھان کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور اُن کَذَّبُوْا کو اس کا اسم قرار دیا ہے۔

یہ پھر ان کا انجام جنہوں نے برے اعمال کیے تھے بہت برا ہوا۔ اصل عبارت اس طرح تھی ثُمَّ کَانَ عَاقِبَتُهُمْ۔ اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا تاکہ ان بعض امور پر دلالت ہو جائے جو اس انجام کا تقاضا کرتے ہیں۔

سے السَّوْاۤی یہ اسمی کو مؤنث ہے۔ جیسا کہ حسن کی مؤنث حسی ہے۔ یعنی ایسی خصلت اور عادت جو انہیں برا بنا دیتی ہے۔ یا ایسی سزا جو تمام سزاؤں سے شدید ترین ہے۔ یا پھر یہ مصدر ہے جیسا کہ بُشْرِی۔ لہذا مبالغہ کے لیے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ السَّوْاۤی جہنم کے ناموں میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام محسنی ہے۔

سے وَکَانُوْا بِہَا یَسْتَهْزِءُوْنَ کا عطف کَذَّبُوْا پر ہے۔ اور اُن کَذَّبُوْا اپنے معطوف سمیت فَکَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السَّوْاۤی کا

مفعول لہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے بِأَن كَذَّبُوا (کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا) اور یہ بھی جائز ہے کہ لُئِلْوَ آتٰی سے بدل ہو یا عطف بیان ہو۔ یعنی پھر برائی کرنے والوں کا انجام تکذیب ہوا۔ یعنی ان برے اعمال نے انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے پر برا بھینٹ کیا۔ اور وہ ان کے ساتھ مذاق کرنے لگے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے اور گناہ کو چھوڑ کر رب کریم سے مغفرت طلب کر لے تو اس کا دل صاف شفاف ہو جاتا ہے (یعنی وہ داغ مٹ جاتا ہے) اور اگر وہ اور گناہ کرے تو وہ داغ بھی بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ سارے دل پر پھیل جاتا ہے۔ اور یہی وہ رنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے وَلَا تَبْلُغْ إِلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا ظَنُّوا بِاللَّهِ يَكْفِيهِمْ (اسے احمد، ترمذی اور نسائی وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَن كَذَّبُوا اپنے معطوف کے ساتھ مل کر مکان کی خبر ہو اور السَّوْءِ اَمْسَاءُ وَاَفْعُلْ کا مفعول مطلق یا مفعول بہ ہو۔ اور معنی اس طرح ہو۔ پھر ان گناہ کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مرہش کر دی یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلادیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ السَّوْءِ اَمْسَاءُ وَاَفْعُلْ کا مصدر اور مفعول ہو اور اَن كَذَّبُوا بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے اس کا تابع ہو۔ اور ابہام اور تہویل کے لیے خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہو پھر ان جھٹلانے والوں کا انجام جہنم ہو اور اس میں ان کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کی پچکان نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَن كَذَّبُوا اِساءۃ (برے اعمال) کی تفسیر ہو۔ اور جب اِساءۃ کی تفسیر تکذیب اور استہزاء سے ہوگی تو یہ قول کے معنی کو مطمئن ہوگا۔

اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

”اللہ تعالیٰ ابتداء کرتا ہے مخلوق کی پھر (فناء کرنے کے بعد) دوبارہ پیدا کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹناے جاؤ گے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ ہی انہیں ابتداء (پہلی بار) پیدا فرماتا ہے۔ پھر وہی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرے گا، یعنی موت کے بعد اٹھائے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹناے جاؤ گے۔ پس وہی انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ ابوبکر نے تو جمعوں کو یاہ کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ کیونکہ ضمیر خلق کی طرف عائد ہے۔ اور باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہاں مقصود میں اظہار مباذلہ کے لیے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝

”اور جس روز ہر پوچھا قیامت مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی۔“

۲۔ یہ ظرف مابعد فعل کے متعلق ہے۔ اور یہ جملہ اللہ یَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ پر معطوف ہے۔ قادمہ اور کبھی نے کہا ہے (قیامت قائم ہونے کے دن) مجرم ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ رسوا ہو جائیں گے۔ اور فرما نے کہا ہے ان کا کلام اور دلائل (عذر) منقطع ہو جائیں گے (۱)۔ قاموس میں ہے کہ بَلَسَ سے مراد ایسا آدمی ہے جس کے پاس کوئی خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور مُبْلِسٌ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی بات دل میں رکھتے ہوئے خاموش رہے (۲)۔ اور اَبْلَسَ کا معنی ہے وہ مایوس ہو اور حیران و ششدر ہوا۔ اسی سے لفظ اَبْلِسَ بھی ہے۔ یا پھر یہ بھی لفظ ہے۔ اور جزری نے کہا ہے کہ مُبْلِسٌ سے مراد حزن و ملال اور خوف کے سبب

خاموش رہنے والا آدمی ہے۔ اور ابلاس کا معنی ہے حیران و ششدر ہونا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِّنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءٌ وَكَانُوا بِهِنَّ كَافِرِينَ ۝

”اور انہیں ہوں گے ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے شفاعت کرنے والے نہ اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے۔“

۱۔ اور ان کے لیے ان شریکوں میں سے نہیں ہوں گے جنہیں انہوں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہرایا اور گمان یہ رکھا کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کریں گے۔ لیکن وہ ان کے لیے شفاعت نہیں کریں گے کہ وہ انہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ چونکہ اس واقعہ کا وقوع یقینی ہے اس لیے اسے صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔
۲۔ اور جس وقت وہ ان کی شفاعت سے ناامید ہو جائیں گے تو اپنے معبودوں کا انکار کر دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دنیا میں اپنے ان شریکوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُنْفِثُونَ ۝

”اور جس روز ہر باہوگی قیامت اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے۔“

۱۔ یہ ظرف اپنے ابا بعد فعل یُنْفِثُونَ کے متعلق ہے۔ اور یَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ سے بدل ہے یا اس کے لیے تاکید ہے۔ یعنی اس دن جبکہ وہ ناامید ہو جائیں گے اور اپنے شرکا کا انکار کر دیں گے تو وہ جدا جدا ہو جائیں گے (۱)۔ مقاتل نے کہا ہے حساب کے بعد لوگ متفرق ہوں گے اس طرح کہ مؤمنین کو جنت کی طرف اور کفار کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ پھر وہ کبھی بھی جمع نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل اپنے اس قول سے ارشاد فرمائی۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ۝

”تو وہ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے۔ وہ باغ (جنت) میں سرور (اور محترم) ہوں گے۔“

۱۔ پس وہ لوگ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے وہ جنت کے باغات میں سے نہروں اور پھولوں والی زمین میں ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ان کی انتہائی عزت و تکریم کی جائے گی۔ قتادہؓ نے کہا وہ انتہائی نعمتوں اور عیش میں ہوں گے اور ابوسعیدؓ نے کہا وہ انتہائی خوش اور سرور ہوں گے۔ اور الجبرفہؓ کا معنی ہوتا ہے سرور اور خوشی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر اچھی نعمت کو حیرہ کہا جاتا ہے۔ اور حسینؓ بنادینے کو تغبیر کہا جاتا ہے (۲)۔ اور علامہ جزریؒ نے کہا ہے کہ الجبرفہ حاء کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے نعمت اور خوش حال زندگی۔ اور اگر الجبرفہ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے حسن و جمال اور اچھی حالت اور کبھی حاء مفتوحہ کے ساتھ بھی یہی معنی ہوتا ہے۔ اور قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اگر میں یہ جانتا کہ آپ میری قرأت سماعت فرما رہے ہیں تو میں یقیناً آپ کے لیے اس میں تحمیر کرتا، یعنی میں اسے مزید اپنی آواز کے ساتھ خوبصورت بنا تا (۳)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ امام اور اعلیٰ نے نیچے بن کثیر کا قول نقل کیا ہے۔ کہ بحیرون جنت میں آسمان کا نام ہے۔ اسی طرح ہناد اور ہتکتی نے

بھی سچی بن کثیر سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور امام اوزاعیؒ نے کہا ہے جب وہ سماع میں شروع ہوگا تو جنت میں کوئی ایسا درخت باقی نہیں رہے گا جس پر پتے نہ ہوں۔ اور یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں حضرت اسرافیل علیہ السلام سے بڑھ کر حسین اور خوبصورت آواز والا اور کوئی نہیں۔ پس جب وہ سماع میں شروع ہوں تو ساتوں آسمانوں میں رہنے والوں کی صلوات اور تسبیحات منقطع ہو جاتی ہیں (1) اور ابن عباسؓ نے اسی آیت کے ضمن میں امام اوزاعیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن جبرون سے مراد سماع ہے جب اہل جنت وجد و طرب کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کی طرف وحی فرمائے گا جنہیں عطا نہ کیا جاتا ہے تو وہ تازہ موتیوں کے بیستاں میں داخل ہو کر اسے حرکت دیتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ گرا کر بجتے ہیں جس سے اہل جنت کو وجد و طرب حاصل ہوتا ہے۔ تو یہ طرب میں ہوتے ہیں تو پھر جنت میں کوئی درخت باقی نہیں رہتا جس پر پتے نہ ہوں (2)۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی بھی جنت میں داخل ہوگا اس کے سر اور پاؤں کی جانب چبھ کر دو حوریں انتہا حسین و جمیل آواز کے ساتھ کچھ گائیں گی جسے انسان اور جنات میں سے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ وہ شیطانی کلام نہیں ہوگا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تحمید و تقدیس ہوگی (3)۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے غناء جنت کے بارے سوال کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کستوری کے رومال ہیں جن پر وہ اللہ تعالیٰ کی ایسی خوبصورت آواز کے ساتھ تسبیح و تحمید بیان کریں گے جس کی مثل آواز کبھی کسی کان نے نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں شعر اور گائے سے لذت دوسروں حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں انتہائی موزوں اور حسین آواز میں موزوں کلام کے ساتھ محبوب کا ذکر ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب لوگ جمال الہی کے دیدار میں کامیاب ہوں گے اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی جمال ہے اور نہ ہی اس کے سوا اور کوئی محبوب ہے۔ تو وہ بالیقین انتہائی خوبصورت اور حسین آواز میں اس کا ذکر سن کر خوش ہوں گے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ غزالیہ چشم خورشید اپنے خاندنوں کے لیے ایسی حسین آوازوں میں کچھ گائیں گی جس کی مثل آواز کبھی بھی کسی نے نہیں سنی ہوگی۔ پس جو کچھ وہ گائیں گی اس میں سے بطور نمونہ کچھ یہ ہے

نَحْنُ الْخَيْرَاتُ الْحَسَنَاتُ أَزْوَاجُ قَوْمٍ بِحَرَامٍ

نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوتُنَّ نَحْنُ الْأَعْنَاتُ فَلَا نَخَافُنَّ نَحْنُ الْمَقِيَمَاتُ فَلَنْطَعُنَّ

(ہم انتہائی حسین اور اعلیٰ مرتبہ ہیں۔ ہم معزز و لوگوں کی بیویاں ہیں۔ ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی فوت نہیں ہوں گی، ہم پر امن ہیں ہمیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ ہم مقیم رہنے والیاں ہیں اور کبھی کوچ نہیں کریں گی)۔ طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً ایسی طرح روایت کیا ہے۔ اور طبرانی بیہقی اور ابن ابی الدنیا میں حضرت انسؓ سے بھی ایسی طرح نقل کیا ہے۔ اور امام احمدؒ نے مالک بن دینار سے الزہد میں یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ داؤد علیہ السلام سے فرمائے گا کہ اپنی خوبصورت اور حسین آواز کے ساتھ میری تسبیح و تحمید کیجئے۔ پس جب داؤد علیہ السلام اپنی آواز کے ساتھ اس میں شروع ہوں گے تو وہ اہل جنت کی نعتوں پر غالب آ جائے گی۔ اصبہا میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت نقل کرتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ جنت کے درخت کو حکم دے گا میرے ان بندوں کو میری تسبیح و تقدیس سناؤ جنہوں نے میرے ذکر کی وجہ سے تمام باجوں اور سرگیوں کو چھوڑ دیا رکھا تو وہ درخت انہیں ایسی حسین آواز میں سناے گا جس کی مثل آواز مخلوق نے کبھی بھی نہیں سنی ہوگی (4)۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ حکیم نے نوادر الاصول میں حضرت ابو موسیٰؓ سے

2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 294 (العلیہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 169 (اباریہ)

4- کنز العمال، جلد 14، صفحہ 479 (التراث الاسلامی)

3- کنز العمال، جلد 14، صفحہ 488 (التراث الاسلامی)

روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے گانے کی آواز سنی اسے روحائیں کی آواز سننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ روحائیں کون ہیں؟ فرمایا اہل جنت کے سامنے پڑھنے والے (1)۔ دیوری نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ندا دینے والا ندا دے گا۔ بے شک جن لوگوں نے اپنی آوازوں اور اپنے کانوں کو لبو و لعب اور شیطانِ مزامیر سے پاک رکھا ہے اللہ تعالیٰ انہیں خوشبودار باغات میں اتاریں گے اور ملائکہ کو فرمائیں گے میرے بندوں کو میری تمجید و تجہید سناؤ۔ اور انہیں یہ اطلاع دے دو کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں کوئی حزن ہوگا (2)۔ دہلی نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ

مُخْضَرُونَ ﴿١١﴾

”اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے۔“
 اے اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں اور آخرت یعنی یومِ بعثت اور قیامت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا۔ تو وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے اس سے وہ غائب نہیں ہو سکیں گے۔

فَسُبْحُنَ اللَّهُ جِئِن نُّسْئُونَ وَجِئِن نُّصْبِحُونَ ﴿١٢﴾

”سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔“

اے یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَسُبْحُوا اللَّهَ مَسْبُحَانًا۔ پس اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ اس میں فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اور پہلے فاسیہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ صفات ابداء، اعادہ (خالق اور معید) وغیرہ سے یہ نتیجہ ہے۔ اور تسبیح سے مراد نماز ہے یعنی اللہ کے لیے نماز پڑھو۔ جب تم شام میں داخل ہو تو نماز مغرب ادا کرو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہ تمہارا دن سلامتی سے گزرا، اس نے طرح طرح کی تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور راحت و سکون کے لیے رات داخل ہو گئی۔ چونکہ مہینوں اور دنوں میں رات دن سے مقدم ہوتی ہے اس لیے مغرب کی نماز سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا۔ اور جب تم صبح کرو تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز صبح ادا کرو کہ رات و سلامتی کے ساتھ رات پائے تکمیل کو پہنچی اور دنیا و آخرت کی کمائی کے لیے دن کا آغاز ہو گیا۔ چونکہ صبح شام کے بالقابل ہوتی ہے اس لیے مغرب کے بعد صبح کی نماز کا ذکر فرمایا۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّلَوتِ وَالْأَمْرِ وَعَشِيًّا وَجِئِن تُظْهِرُونَ ﴿١٣﴾

”اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں نیز (پاکی بیان کرو) صبح پہر کو۔ اور جب تم دوپہر کرتے ہو۔“

اے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تمام آسمانوں اور زمین کے باسی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تمجید بیان کرتے ہیں اور اس کی عبادت میں

مصرف رہتے ہیں (۱)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو لفظ اللہ سے حال ہے یا مقررہ ہے۔

۱۔ عشی العین سے ماخوذ ہے جب کہ سورج کا نور کم ہو جاتا ہے۔ اس کا عطف تَصْبِيْحُونِ پر ہے۔ یعنی عصر کی نماز ادا کرو جو کہ صلوٰۃ الوسطی ہے۔ چونکہ یہ وقت بازار کے معاملات میں لوگوں کے مصروف و مشغول ہونے کا وقت ہے اس لیے خاص اہتمام کے تحت اس کا ذکر نظر کی نماز کے ذکر سے پہلے کیا، یعنی تمہارے لیے اس وقت نماز میں مصروف ہونا ضروری ہے جب کہ لوگ دنیوی معاملات میں مصروف ہوتے ہیں۔ تا کہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جو انہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور جب تم دوپہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔ سورج کی گرمی تم پر غالب آتی ہے اور وہ تمہیں نارجہنم کی گرمی اور قیامت کے دن سورج کی تپش کی یاد دلاتی ہے۔ ان اوقات کو نماز کے لیے اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اس کی نعمت و احسان کی تجدید ہوتی ہے اور ان میں تنزیہ باری تعالیٰ اور اس کے حمد و شکر کے مستحق ہونے پر واضح شواہد اور روشن دلائل کا ظہور ہوتا ہے۔ تنبیہ زمین و آسمان کے باسی اس کی عبادت میں مصروف ہو کر اس کی حمد و ثنایاں کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں میں سے چار کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جِئِْن تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ ابن جریر بطبرانی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت پانچوں نمازوں کی جامع ہے۔ اور جِئِْن تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اکتھا اشارہ ہے۔ علامہ نقویؒ نے کہا ہے کہ نافع بن اذرقؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کیا آپ پانچوں نمازوں کا ذکر کرتے ہیں تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جی ہاں۔ اور پھر آپ نے یہی دو آیتیں پڑھی اور فرمایا اس آیت میں پانچوں نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر ہے (۲)۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی صبح اور شام کے وقت یہ پڑھے **جِئِْن تُمْسُوْنَ اللّٰہُ جِئِْن تُمْسُوْنَ وَ جِئِْن تَصْبِيْحُوْنَ وَ لَہُ الْحَمْدُ فِی السُّبُوْتِ وَالْاَوْضِ وَ غَیْثًا وَ جِئِْن تَنْظَرُوْنَ** سے وَ تَخَذَ الْکَفَّ فُجُوْنَ تک تو اس دن اس سے جو کچھ فوت ہوا اسے وہ پالے گا۔ اور جو انہیں شام کے وقت پڑھے گا تو وہ اسے پالے گا جو رات کے وقت اس سے فوت ہوگی (۳)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے جسے یہ بات خوش کرے کہ اس کے لیے پورے پیمانے کے ساتھ ناپ تول کیا جائے (یعنی اسے پورا پورا اجر دیا جائے) تو اسے چاہیے کہ وہ یہ پڑھے **فُتْبِحَانَ اللّٰہُ جِئِْن تُمْسُوْنَ الْاَیَہ**۔ اسے شلبی نے انتہائی ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دن میں ایک سو مرتبہ **سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہ** کہا تو اس کے گناہ مٹا دیے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ متفق علیہ (۴)۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے صبح و شام ایک سو مرتبہ **سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہ** کہا تو قیامت کے دن اس سے افضل عمل کوئی نہیں لائے گا سوائے اس آدمی کے جس نے اسی کی مثل یہ پڑھ لیا اس سے زائد پڑھا۔ متفق علیہ (۵)۔ آپ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر انتہائی خفیف یعنی ان کی ادائیگی انتہائی آسان ہے میزان میں انتہائی ثقیل اور وزنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی محبوب ہیں۔ وہ ہیں **سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہ** **سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ**۔ متفق علیہ (۶)

۲۔ تفسیر بنوی، جلد ۵ صفحہ ۱۷۰ (الہامیہ)

۱۔ تفسیر بنوی، جلد ۵ صفحہ ۱۷۰ (الہامیہ)

۴۔ صحیح بخاری، جلد ۲ صفحہ ۹۴۸ (وزارت تعلیم)

۳۔ سنن ابی داؤد صفحہ ۶۹۲ (نورم)

۵۔ صحیح بخاری، جلد ۲ صفحہ ۹۴۸ (وزارت تعلیم)

۵۔ صحیح مسلم، جلد ۲ صفحہ ۳۴۴ (قدیمی)

حضرت جویریہ بنت حارث بن ابی ضرارؓ سے روایت ہے (ان کا نام برہ تھا) ایک صبح حضور نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے نکلے اور یہ مسجد میں تھیں۔ پھر خوب دن چڑھنے کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور فرمایا میرے نکلنے کے بعد سے لے کر اب تک اسی جگہ بیٹھی ہو؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تو تجھ سے جانے کے بعد چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں، اگر تیرے کلمات کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو وہ ان سے وزنی ہوں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَذَّ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِنَةُ عَرْشِهِ وَمِذَاذٌ كُلِّ مَنَاقِبَةٍ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت عمرہ بن عبد جہلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ افضل ترین کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ۔ اور ایک روایت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ارگاہ میں پسندیدہ کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ۔ ان میں سے جس سے بھی تم نے آغاز کیا تمہارا لیے باعث ضرر نہیں ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا کلام افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے پسند فرمایا۔ اور وہ ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ کہا اس کے لیے کھجور کا ایک درخت جنت میں لگا دیا گیا۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا ہے (4)۔

يُخْرِجُ النَّحْيَ مِنَ السَّبْتِ وَيُخْرِجُ السَّبْتَ مِنَ النَّحْيِ وَالنَّحْيُ الْأَرْضُ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ⑤

”نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد لے اور

یونہی (قبروں سے) تمہیں نکالا جائے گا۔“

لے جیسے انسان کو نطفہ سے اور پرندے کو انڈے سے۔ اور نطفہ اور انڈے کو حیوان (جانور) ہے۔ یا اس کا معنی ہے وہ حیات کو موت کے پیچھے اور اس کے برعکس موت کو حیات کے پیچھے لاتا ہے۔ اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو نباتات کے ساتھ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد۔

یعنی اسی طرح تمہیں بھی اپنی قبروں سے موت کے بعد زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ پس تم زندہ کرنے کی اس طرح کی مثالوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد پھر اس کا انکار کیوں کرتے ہو؟ پس یہی موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی علت اور دلیل ہے۔ حذرہ اور کسائی نے اسے صیغہ معروف ہونے کی بناء پر تا کو مفتوح اور را کو مضموم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے جمول کی بناء پر تا کو مضموم اور را کو مفتوح پڑھا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَشِيرُونَ ⑥

”اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے لے پھر تم اچانک بشر بن کر

(زمین میں) پھیل رہے ہو۔“

۱۔ قیامت برپا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری اصل یعنی آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۲۔ اس میں اذانِ ماضیہ جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل معنی مفاجات ہے۔ اور معنی یہ ہے پھر تم اچانک بشر ہو کر (آدی بن کر) زمین میں پھیل رہے ہو جبکہ اس سے قبل تم بے حس و حرکت ہمارا (مٹی) تھے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٣١﴾

”اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں لے تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے ۲۔ اور پیدا فرمادیے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) ۳۔ بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ۴۔“

۱۔ اس میں جن ابتداء ہے۔ کیونکہ حضرت مائی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پہلی سے پیدا کیا گیا۔ پھر تمام عورتوں کو مردوں کے نطفے سے پیدا کیا گیا۔ یا یہ جن بنیاد ہے کیونکہ عورتیں مردوں کی جنس سے ہی ہیں نہ کہ کسی دوسری جنس سے۔

۲۔ تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو اور ان کے لیے الفت پیدا کرو۔ کیونکہ ہم جنس ہوتا باہم محبت و پیار اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کی علت ہے اور جنس کا مختلف ہونا باہم نفرت کا سبب ہے۔

۳۔ اور مردوں اور عورتوں کے درمیان یہ ایک جنس کے افراد کے درمیان پیدا فرمادیے اور ازدواجی تعلقات کے واسطے سے محبت و رحمت کے جذبات جب بھی مثنوی خواہشات کا غلبہ ہوتا کہ امور معاش منظم رہیں۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ ان میں ایسے جذبات نہیں پائے جاتے۔ یا پھر اس لیے کہ انسانی زندگی کی خوش حالی باہمی تعاون پر موقوف ہے اور تعاون باہم ایک دوسرے سے محبت اور رحم کرنے کے جذبات کا محتاج ہوتا ہے (اس لیے مردوں اور عورتوں کے درمیان محبت و رحمت کے جذبات پیدا کر دیے)۔

۴۔ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت میں غور و فکر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں اس میں جو حکمتیں ہیں اور جس طرح سلسلہ تاسل جاری ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلاف الیسبتکم والوایکم ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٣٢﴾

”اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے نیز تمہاری زبانوں لہ اور گلوں کا اختلاف ۳۔ بے شک اس میں بھی نشانیاں ہیں اہل علم کے لیے ۴۔“

۱۔ یعنی تمہاری زبانوں (لغوں) کے اختلاف۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے مصنف اور قوم کو علیحدہ زبان سکھادی، اس کے بارے الفاظ اس کے ذہن میں القاء کر دیے اور اس کے بولنے پر اسے قادر کر دیا۔ یا پھر زبانوں کے اختلاف سے مراد ہے تمہارے بولنے کی مختلف اجناس و اشکال اور تمہاری آوازوں کی کیفیات کا مختلف ہونا اس طرح کہ کسی کی آواز دوسرے سے ملتحمس نہیں ہوتی (یعنی ان کے مابین

اشتباہ نہیں ہوتا۔

۷۔ اور جلد کے رنگوں کا اختلاف ہے مثلاً سیاہ ہونا، سفید ہونا وغیرہ یا اس سے مراد ہے اعضاء کے تشخص، ہیئت، رنگ اور جلد میں اس طرح مختلف ہونا کلی طور پر کسی کی دوسرے سے مشابہت نہیں ہوتی۔

۸۔ بے شک اس میں اہل علم کے لیے نشانیاں ہیں جو کہ کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہیں چاہے وہ فرشتہ ہو، انسان ہو یا جن۔ حفص نے لِلْعَلَمِينَ میں لام کو مکسور پڑھا ہے۔ اور اہل علم کا خصوصی ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ یہ معرفت اور پہچان کا زیادہ حق رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَصَافِعِلْمًا اِلَّا الْعِلْمُونَ۔

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٦﴾

”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات کے وقت اور دن کے وقت اور تمہارا تلاش کرنا اس کے فضل کو لے بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔“

۱۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا دونوں زمانوں (رات اور دن) میں توانے نفسانیہ کو راحت پہنچانے کے لیے اور توانے طبعیہ کو قوت دینے کے لیے سونا ہے۔ دونوں زمانوں (رات اور دن) میں اس کے فضل میں سے تمہارا معاش و معاد کو تلاش کرتا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے تمہارا رات کو سونا جو دن کو اللہ کا فضل تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ پس دونوں کو دو حروف عطف کے ساتھ دو اوقات کے ساتھ ملا دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اگرچہ دونوں اوقات میں سے ہر ایک ایک فعل کے ساتھ متخفص ہے لیکن ضرورت کے وقت وہ دوسرے فعل کی بھی صلاحیت رکھتا ہے (یعنی اصلاً رات سونے کے لیے اور دن کام کے لیے ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رات کو کام کر لیا جائے اور دن کو سویا جائے)۔ اس کی تائید ان تمام آیات سے ہوتی ہے جو اس بارے میں وارد ہیں۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فہم و بصیرت کے کانوں سے سنتے ہیں۔ کیونکہ اس میں حکمت ظاہر اور واضح ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمْ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ وَطَبْعًا وَيُرِيكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾

”اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دیکھاتا ہے تمہیں بجلی لے ڈرنے اور امید دلانے کے لیے سور اور اتارتا ہے آسمان سے پانی اور زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقائد میں سے۔“

۲۔ فضل سے پہلے یا توانے مقدر ہے یا پھر فضل قائم مقام مصدر کے ہے۔ جیسے اس قول میں تَسْمَعُ لِلْمُعَذِّبِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ یا یہ موصوف محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی آيَةُ يُرِيكُمْ بِهَا الْبَرْقِ۔

۳۔ بجلی کی کڑک سے اور حالت سفر میں ڈرنے کے لیے۔ اور بارش کی امید دلانے کے لیے جبکہ تم اپنے گھروں میں ہو۔ یہ دونوں (خَوْفًا وَطَمَعًا) اس فعل کی علت ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جسے فعل مذکور مستلزم ہے۔ کیونکہ انہیں دکھانا ان کے بجلی کی طرف خوف

اور امید کے لیے دیکھنے کو مستحکم ہے۔ یا یہ فعل مذکور کی علت ہیں۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا، یعنی لا راء، فحوف و طمع۔ یا خوف اور طمع، اخافہ اور اطماع (ڈرنا اور امید دلانا) کی تاویل میں ہے۔ حیران یہ قول ہے فَعْلَتُهُ رَغْمًا لِلشَّيْطَانِ۔ یا یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جیسے یہ قول۔ کلمتہ شفاہا۔

سے اور آسمان سے بارش اتارتا ہے۔ اور نباتات کے سبب زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اس کی موت (شک ہونے) کے بعد یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل مند ہیں، یعنی وہ اپنی عقلوں کو استعمال کرتے ہیں اور صالح کمال قدرت اور حکمت کا ادراک کر لیتے ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّيِّئَةُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهَا ۖ ثُمَّ إِذَا دَعَاكَمُ دَعْوَاكُمْ
الْأَرْضُ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ۝

”اور اس کی قدرت کی نشانیاں میں سے ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے اے پھر جب بلائے گا تمہیں زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے۔“

اے اور اس کی نشانیاں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان اور زمین اپنے چیز میں اس کے حکم سے باقی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں قائم رکھنے اور انہیں باقی رکھنے کا ارادہ کرنے کے سبب وہ باقی ہیں۔

اے پھر جب تمہیں بلائے گا زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے۔ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر اَنْ تَقُومَ پر معطوف ہے۔ گویا یہ کہا ہے اور اس کی نشانیاں میں سے ہے آسمانوں و زمین کا قائم ہونا پھر تمہارا قبروں سے نکلنا جب کہ وہ تمہیں ایک ہی بار بلائے گا۔ اس میں قُمْ یا قَوْ تراخی زمانہ کے لیے ہے یا پھر قیامت کی عظمت و شان کو بیان کر کے مکے لیے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک قِیَمَ الْاَرْضُ تَخْرُجُونَ کے متعلق ہے (1)۔ لیکن علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ اذا کا مابعد فعل اس کے ماقبل میں عامل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ دُعَاكُمْ کے متعلق ہوگا (یعنی جب اللہ تم کو زمین سے بلائے گا)۔ جیسا کہ یہ قول ہے۔ دَعْوَتُهُ مِنْ اَسْفَلِ الْوَادِئِ (میں نے اسے وادی کی چٹائی طرف سے بلا یا (2))۔ ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے ارشاد باری تعالیٰ وَاسْتَبْرَأْ يَوْمَ يَبْسُوقُ السَّيِّئَةُ مِنَ قُلُوبِ قَوْمٍ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صحرة بیت المقدس (میں المقدس میں موجود خاص پتھر) پر کھڑے ہو کر یہ آواز لگائیں گے اے یسیدہ ہڈیو! یعنی ہوئی جلد اور کئے ہوئے بالو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ حساب و کتاب کے فیصلے کے لیے جمع ہو جاؤ۔ دوسرا اذا مفاعلات کے لیے ہے۔ اسی لیے پہلے کے جواب میں قائم مقام علماء کے ہے۔ ترکیب کلام میں یہ ظرف ہے اور جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل مفاعلات کا معنی ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے فَمَا جَاءْتُمْ وَقَفْتُ خُورُوجَكُمْ (یعنی تم اچانک اس وقت نکل آؤ گے)۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلُّ لَهٗ قٰنِیْنٌ ۝

”اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔“

اے اور اسی کی ملکیت اور مخلوق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسی کا تابع فرمان ہے۔ کہی نے کہا ہے کہ یہ

ان میں سے مطیع اور فرمانبرداروں کے ساتھ خاص ہے (1)۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے قہار اور غالب ہونے کا بیان ہے۔ اور اس سے مراد امر اور تکویہ میں اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ہر کوئی موت و حیات اور قیامت کے دن انھیں وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اگرچہ وہ عبادت میں نافرمان ہی ہو۔ (2)

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمُسْئَلُ الْأَعْلَىٰ
فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣٠﴾

”اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر (نہا کرنے کے بعد) اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ آسان تر ہے اے اور اسی کے

لیے برتر شان ہے۔ آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے۔“

۱۔ ابن ابی حاتم نے حضرت نکر مٹے سے نقل کیا ہے کہ کفار کو مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (3) اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر فنا کرنے کے بعد اسے دوبارہ بنائے گا۔ ہو ضمیر خبر کے مذکر کی وجہ سے مذکر ذکر کی گئی ہے یا امادہ معنی ان یعیض ہے اور اَهُونٌ عَلَیْهِ مَعْلُ جملہ یعیض کے فاعل سے حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ ربيع بن خثیم، حسن، قتادہ اور کعبی نے کہا ہے اہون بمعنی ہین ہے۔ (آسان ہوتا) اور اللہ تعالیٰ پر کوئی شے بھی غالب اور مشکل نہیں۔ اور افضل اتم تفصیل کا وزن فعلیل صفت مشبہ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی عوفی نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (4)۔ مجاہد اور کرمہ نے کہا ہے یہاں اَهُونٌ ضربِ اشل کے انداز میں استعمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر دوبارہ اٹھانا آسان تر ہے اور یہ بات تمہاری عقلوں میں بھی آنے والی ہے کیونکہ لوگوں کی عقلوں کے مطابق بھی دوبارہ اٹھانا پہلی بار پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس پر یہ کام تمہارے نزدیک زیادہ آسان ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ مخلوق پر دوبارہ اٹھانا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی چیز کے ساتھ دوبارہ اٹھنے لگے ہوں گے اور یہ ان پر اس کی نسبت آسان تر ہے کہ وہ نطفہ ہوں پھر علقہ اور پھر مضغہ اور اس کے بعد وہ مرد یا عورت ہو کر ظاہر ہوں۔ یہی معنی ہے اس روایت کا جو حبان نے اور کلبی نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ (5)

۲۔ اس کی شان اتنی بلند اور وصف اتنا اعلیٰ ہے کہ کسی غیر کے لیے نہ تو اس کے مساوی شان ہے اور نہ اس کے قریب تر۔ جیسا کہ قدرت کا ملامہ اور حکمت تامہ وغیرہ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ شان اتنی بلند ہے کہ اس کی مثل اور کوئی شان نہیں (6)۔ عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے قول باری تعالیٰ وَلَهُ الْمُسْئَلُ الْأَعْلَىٰ کے بارے کہا کہ اس سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ (7)۔ میں کہتا ہوں کہ مغل الا علی سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔

۳۔ یعنی ہر وہ شے جو زمین و آسمان میں ہے وہ اسی کی صفت بیان کرتی ہے، زبانِ قال سے بھی اور زبانِ حال سے بھی۔ اور وہی سب پر غالب ہے، یعنی وہ اپنی ملکیت اور خلاقیت میں غالب ہے اور ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ کوئی شے بھی اسے پہلی بار پیدا

1- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 171 (انجاریہ)

2- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 171 (انجاریہ)

3- الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 297 (احمدیہ)

4- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 171 (انجاریہ)

5- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 172 (انجاریہ)

6- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 171 (انجاریہ)

7- تفسیر بنوی، جلد 5 صفحہ 172 (انجاریہ)

کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور حکمت والا ہے۔ یعنی جیسے اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسے وہ افعال کرتا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین یہ تبلیہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ لَيْتَکَ لَا شَرِیکَ لَکَ اِلَّا شَرِیکَا هُوَ لَکَ مُتَبَلِّغُکَ وَمَا مَلَکَتْ۔ (اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جسے تو نے شریک کر لیا ہے تو اس کا مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

صَرَبَ لَکُمْ مَثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ ۖ هَلْ لَّکُمْ مِّنْ مَّا مَلَکَتْ اَيْمَانُکُمْ مِّنْ شُرَکَآءَ فِیْ مَا رَزَقَکُمْ فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَہُمْ کَخِیۡفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ ۚ کَذٰلِکَ نَقۡصِلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝۱۱

”اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ۔ حتیٰ کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم ڈرتے ہو اپنی میں ایک دوسرے سے۔ یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے۔ تمہارے لیے اے مشرک! ایک مثال تمہارے ہی احوال سے اخذ کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے امور کے ہی قریب تر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم بتاؤ کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال و غیرہ میں جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ پس تم اور وہ اس میں ملکیت اور تصرف کے اعتبار سے برابر ہوتے ہو کہ وہ بھی اس میں ایسے ہی تصرف کر سکتے ہیں جیسے تم؟ حتیٰ کہ تم ان کے بغیر اس میں تصرف کرنے سے ڈرنے لگو جیسے تم آپس میں ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو جو تمہاری مثل آزاد ہیں۔ یہ استنبہام برائے انکار ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں۔ اور بے شک یہ تمہارے لیے باعث عار ہے اس کے باوجود کہ وہ تمہاری مثل بشر ہو تو پھر تم یہ کیسے جائز قرار دیتے ہو کہ وہ پھر جو تمام مخلوقات میں سے عاجز ترین مخلوق ہیں وہ اس اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہوں جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اسی تفصیل کی مثل مفصل نشانیاں ہم بیان کرتے ہیں کیونکہ تمہیں معافی کو ظاہر کرتی ہے اور ان کی وضاحت کرتی ہے۔ اس قوم کے لیے جو امثال میں غور و فکر کرنے کے لیے اپنی عقلیں استعمال کرتی ہے۔ آیت کے سبب نزول میں طبرانی کی مثل جویر نے بھی ایک روایت اس سند سے نقل کی ہے۔ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی جعفر محمد بن علی عن ابیہ علیہم السلام۔

بَلِ اَسْبَغَ اَلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا اَھُوَآءَھُمْ بِغَدْرِ عَلِیۡمٍ ۚ فَمَنۡ یَّھْدِیۡ مِّنۡ اٰصۡلِ اللّٰہِ ۭ وَمَا لَہُمْ مِّنۡ نَّصِیۡرٍ ۝۱۲

”بلکہ پیر دی کرتے رہے ظالم اپنی (نفسانی) خواہشات کی ۱۔ بغیر کسی دلیل کے پس کون ہدایت دے سکتا ہے ۲۔ جسے (پیغمبر مانی کے باعث) اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے۔ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

۱۔ اس میں سابقہ کلام کے مضمون سے مضارب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے

رہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اپنے نفسوں کو عذاب کے لیے پیش کیا۔

۳۔ یہ اُتھو اسکے فاعل سے حال ہے، یعنی درآ تحالیکہ وہ اذن سے جا مل تھے جنہیں جانتا ان پر واجب تھا۔ پس کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔ قَسَمٌ یُجَبِّیْہِیْ میں فاء سببیہ ہے اور استقامت اہم انکاری ہے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہ کیا تو پھر کوئی بھی انہیں ہدایت نہیں دے سکتا۔

اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کیا ہے۔ پس کون ہے جو ان کی ہدایت پر اب قادر ہو سکتا ہے؟ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں ان آفات سے نجات دلائے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

”ہیں آپ کر لیں اپنا رخ (دین) اسلام کی طرف پوری یکسوئی سے۔ (مقبوطی سے پڑلو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔ کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا اللہ کی تخلیق میں سے یہی سیدھا دین ہے لیکن اس کفر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔“

۱۔ یہ فاء سبب ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت ہوگئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ مشرکین نے جہالت کے سبب اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تو آپ خالص طور پر پوری یکسوئی سے اپنا رخ دین اسلام کی طرف کر لیں۔ یعنی کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہوئے بغیر اسلام کی طرف مائل ہوتے ہوئے اور اس براستیقامت اختیار کرتے ہوئے۔

۱۔ یہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی فطرت یعنی دین اسلام کو مضبوطی سے چکڑلو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ اور مفسرین کی جماعت نے کہا ہے (۱)۔ آیت میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے آپ کی امت کو ہے۔ پس یہ آیت سابقہ کلام کی تاکید یا تفسیر کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرت کا نام دیا ہے کیونکہ یہ ساری مخلوق کو لازم ہے جیسا کہ اس پر یہ ارشاد گرامی دلالت کرتا ہے اَللّٰہُ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہِا یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا اور ان میں دین کی استعداد اور اس کے اور اک کی قدرت رکھ دی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عہد ہے جو آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے لیا گیا، یعنی اَلْاَنْسَ ثَمَّ بِرَبِّکُمْ۔ قَالُوْا بَلٰی (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو تمام نے جواب دیا کیوں نہیں (تو ہی ہمارا رب ہے)۔ ان علماء نے کہا ہے کہ اس عالم میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اسی اقرار پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اقرار ہی وہ ضغیف ہے جس پر حلقہ واقع ہوتی ہے۔ سورہ اعراف میں اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں جیسا کہ ایک چوپایہ صحیح سالم چوپائے کو حتم دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی ناک کشا پاتے ہو پھر آپ ﷺ نے یہ آیت طیبہ تلاوت فرمائی فِطْرَتِ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہِا لَا تَبْدِیْلَ لِّخَلْقِ اللّٰہِ۔ متفق علیہ (2)۔ یعنی ہر بچہ ابتداً فطرت سلیہ اور ایسی طبیعت پر پیدا کیا جاتا ہے جسے حق کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ پس اگر اسے اسی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ باطن میں اسی فطرت پر برقرار رہے کیونکہ اس دین کا حسن عقول سلیہ میں انتہائی مضبوطی کے

ساتھ مذکور ہے اور اس سے اعراض وہی کر سکتا ہے جو بیرونی آفات میں سے کسی آفت (سبب) کے سبب اس سے اعراض کرے گا مثلاً اپنے آیۃ اجداد کی تقلید و پیروی وغیرہ۔ ارشاد گرامی ہے لَا تَتَّبِعُوا آيَاتِهِمْ (سبب)

اس میں طرف مستقر خبر ہے اور جملہ خبریہ فیہی کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اللہ کے دین کو تبدیل نہ کرو۔ مجاہد اور ابن ابی نعیم نے کہا ہے اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، اس کی اتباع کرو اور توحید کو شرک سے نہ بدلو (1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَطَرَهُ اللَّهُ اس فعل کا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے جس پر اس کا مابعد دلالت کر رہا ہے۔ یعنی فَطَرَ اللَّهُ النَّاسَ فَطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ غُلَامًا (اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں وہی فطرت رکھی ہے جس پر اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے حدیث كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ کا معنی اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ہر بچہ کو سعادت و شقاوت (خوش بختی اور نصیبی) میں اس فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر وہ علم الہی میں ہے۔ اور ان میں ہر ایک اپنے انجام کے لحاظ سے اس فطرت تک پہنچ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور وہ دنیا میں ایسے عمل کرتا ہے جو اس کی فطرت کے مشابہ ہوتے ہیں (2)۔ اس بناء پر قول باری تعالیٰ لَا تَتَّبِعُوا آيَاتِهِمْ کا معنی یہ ہوگا کہ سعادت و شقاوت میں سے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا جاتا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ پس کوئی بد بخت سعادت مند نہیں بنتا اور کوئی سعادت مند شقی نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ صادق و مصدق رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیث بیان فرمائی کہ بے شک تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے لیے چالیس دن تک لطفہ رحم مادر میں جمع رہتا ہے۔ پھر وہ اسے ہی دن جتے ہوئے خون کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر اسی ہی مدت کے لیے گوشت کے لوتھڑے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ فرشتہ اس کا عمل، عمر، رزق اور سعادت یا شقاوت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ جاتا ہے تو اس پر اس کی نکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے۔ پس اس سے اہل نار کا مکمل سرزد ہو جاتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدمی اہل نار کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ جاتا ہے تو اس پر نکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے۔ پس وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ نتیجہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے (متفق علیہ 3)۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر یہ مذاکرہ کر رہے تھے کہ ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب تم یہ سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اس کی تقدیر کو لو اور جب کسی آدمی کے بارے میں یہ سنو کہ وہ اپنی فطرت سے بدل گیا ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ ہمیشہ اسی فطرت پر رہتا ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے (4)۔ اس تاویل کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جس سے وہ تبدیل نہیں ہوگا۔ تحقیق آپ اور آپ کے ساتھی فطرۃ سعادت مند ہیں۔ پس تم اپنا رخ دین کی طرف کرلو۔ اس اعتبار سے فاقم وَجْهَكَ لِلدِّينِ سَابِقَةَ كَلَامِ كِي عِلَّتْ بَيَانِ كَرْنِے اور اخلاص کی توجہ و ترغیب دینے کے لیے ہے۔ اس تاویل کے مطابق یہ بھی جائز ہے کہ فِطْرَةَ اللَّهِ اس تقدیر کی بناء پر منصوب ہو۔ فَلْيَرْزُقْ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ كُمْ عَلَيْنَا۔ ضمیر کی جگہ پر لفظ الناس کو ظاہر رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تمام کے تمام لوگ ایک فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ لہذا تم اپنے رخ دین کی طرف

سیدھے کرلو۔ مکر اور مجاہدے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو نہ بدلو سے مراد یہ ہے کہ تم جانوروں کو قسمی نہ کرو۔ (۱)
یہ اشارہ اس دین کی طرف ہے جسے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا یہ اشارہ فطرت کی طرف ہے۔ اللہ فی القیوم یعنی تاویل کے مطابق
معنی یہ ہے، یہی سیدھا دین ہے، یعنی یہ ایسا دین مستقیم ہے جس میں کوئی کجی نہیں لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ نہیں جانتے کہ یہ دین مستقیم
ہے کیونکہ وہ غور فکر ہی نہیں کرتے۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُسْرِكِينَ ﴿۳۱﴾

”اے غلامانِ مصطفیٰ ﷺ تم بھی اپنا رخ اسلام کی طرف بدلو۔ (اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے) اور اس
سے اور قائم کرو نماز کو اور نہ ہو جاؤ ان (مشرکین) میں سے“

۱۔ یہ آیت سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہے یکے بعد دیگرے (بار بار) رجوع کرتے ہوئے اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے غیروں سے
اللہ کی طرف کٹتے ہوئے۔ یہ انساب سے ماخوذ ہے۔ اور یہ فعل مقدر کے سبب منصوب ہے۔ اور وہ فعل کُتُونُوا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ
ہے کہ لَا تَكُونُوا اس پر معطوف ہے۔ یا پھر یہ الزموا یا ملتزموں کی ضمیر سے حال ہے۔ اور یہ فطرۃ اللہ کو نصب دینے والے
افعال مقدرہ ہیں۔ یا پھر اَقِمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ کیونکہ اس آیت میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو ہے۔ رسول
اللہ ﷺ کی تعظیم کے لیے آیت کا آغاز آپ کے خطاب سے کیا گیا جیسا کہ اس ارشاد میں ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ الْبَيْتَاعَ اس
مقبوم پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَاتَّقُوا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُسْرِكِينَ۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَحْمِلُ صَلَاتَكُمْ وَكُلَّ حَرْبٍ بِأَلَدِيهِمْ فَرَحُونُ ﴿۳۲﴾

”جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ گروہ ہو گئے ۱۔ ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے۔“

۱۔ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَحْمِلُ صَلَاتَكُمْ یہ مشرکین سے بدل ہے۔ یعنی وہ مشرکین پارہ پارہ ہو گئے اور اپنی خواہشات مختلف ہونے کی بناء پر مختلف
معبودوں کی عبادت کرنے لگے۔ حذرہ اور کسانے نے اسے فَاذْهَبُوا پڑھا ہے، یعنی انہوں نے اس دین کو چھوڑ دیا، جس کا انہیں حکم دیا گیا
تھا۔ اور خود گروہ گروہ ہو گئے۔ اور ہر گروہ نے اپنے لیے اسے امام بنالیا جس نے ان کے لیے کوئی دین ایجاد کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان
سے مراد اس امت کے اہل بدعت ہیں کہ انہوں نے دین ترک کر دیا اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی۔ اور ان کے لیے مشرکین کا
لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جنہوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت تجہر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے سوا باقی تمام جہنم میں ہوں گے۔ عرض کی گئی یا
رسول اللہ! ﷺ وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ وہ فرقہ جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام
ہیں۔ (رواہ الترمذی۔ ۲)

۲۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اعتقاد کے ساتھ خوش ہے اس گمان کے ساتھ کہ وہی حق پر ہے۔ داری نے ابیرہم بن اسحاق سے اور
انہوں نے ابن مبارک کے واسطے سے امام اوزاعیؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اٹلیں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کون سی شے کے سبب
نبی آدم کے پاس پہنچتے ہو؟ انہوں نے کہا ہر شے سے اس کو بہکا سکتے ہیں۔ تو اس نے کہا کیا تم استغفار کے راستے سے بھی ان کے پاس

پہنچتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ بہت بعید شے ہے کیونکہ یہ توحید کے ساتھ ملی ہوئی ہے تو اس نے کہا۔ میں بالیقین ان میں ایسی شے پھیلادوں گا جس سے وہ استغفار بھی نہیں کریں گے۔ راوی نے فرمایا پس شیطان نے لوگوں میں خواہش نفس کی پیروی کو عام کر دیا۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاهُمْ وَنَسُوا حَمَتَهُ
إِذْ أَذَيْنَهُمْ مِنْهُمْ يَصْغُرُونَ ﴿٣١﴾

”اور جب پہنچتی ہے لوگوں کو کوئی تکلیف تو پکارنے لگتے ہیں اپنے رب کو رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب ان کو (ان کی فریاد قبول فرما کر) چکھاتا ہے رحمت اپنی جناب سے تو یکا یک ایک گروہ ان میں سے اپنے رب کے ساتھ شکر کرنے لگتا ہے۔“

۱۔ اور جب پہنچتی ہے لوگوں میں کوئی کفار مکہ کو کوئی مصیبت اور قحط تو اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارنے لگتے ہیں معذور ایسے وقت میں اس کے سوا کسی کو بھی نہیں پکارتے۔ پھر جب رب کریم ان کی فریاد قبول کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت عطا فرماتا ہے۔ یعنی مصیبت اور تکلیف سے انہیں نجات اور ربانی عطا فرماتا ہے یا انہیں خوشحالی (سبزہ شادابی) اور رحمت عطا کرتا ہے۔ تو انہی میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شریک بھرا لیتا ہے جس نے انہیں عافیت عطا فرمائی اور وہ اس نجات اور عافیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی طرف کرنے لگتے ہیں۔ حضرت زید بن خالد جعفی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھائی بارش کے ان نشانات پر جو رات کو ہوئی تھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ ورسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں) تو آپ نے فرمایا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا صبح کے وقت میرے بندوں میں سے بعض مومن رہے اور بعض کافر۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ بارش عطا کی گئی۔ پس وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور وہ ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کے سبب بارش دی گئی تو وہ میرے سے کفر کرنے والے ہیں اور ستارے کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ (شقی علیہ)۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بھی آسمان سے برکت (بارش) نازل فرماتا ہے تو لوگوں میں سے ایک گروہ اس کا انکار کرنے لگتا ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ برساتا ہے اور وہ گروہ کہتا ہے کہ یہ فلاں ستارے کے وسیلہ سے ہوئی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (۲)

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَسَمِعُوا فَأَسُوفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

”اچھا! ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے دی ہے انہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھاؤ تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔“

۱۔ اس میں لام عاقبت کے لیے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام امر ہے اور تہدید کے معنی میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَسَمِعُوا اچھا ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے انہیں دی ہے۔ پس اے ناشکرو! لطف اٹھاؤ۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔

تمہیں اپنے اس لطف کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

أَمْ أَرْتَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُمْ يَنْتَكِمُونَ ﴿٣٥﴾

”کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل کہ پس وہ گواہی دیتی ہے اس شرک (کی سچائی) کی جو وہ کرتے ہیں؟“

۱۔ اس میں اُمّ مقطوعہ بمعنی بل ہے۔ اور ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ اس کا عطف کُلّی حزب بِمَا لَدَيْنَهُمْ فِرْعَوْنُ پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ام متصل ہو اور مقدر کلام پر معطوف ہو۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے اَيُّسِرُ كُنُونَ بِمَا حُجَّةٌ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا۔ کیا وہ حجت کے بغیر شرک کر رہے ہیں یا ہم نے ان پر کوئی دلیل اتاری۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سلطان سے مراد دلیل اور عذر ہے۔ اور حضرت قتادہؓ نے کہا ہے اس سے مراد کتاب ہے (1)۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ذو سلطان (صاحب دلیل) ہے۔ یعنی کیا ہم نے ان پر کوئی ایسا فرشتہ نازل کیا جس کے ساتھ دلیل ہو یا ایسا رسول بھیجا جس کی تائید معجزہ سے ہو۔

۲۔ پس وہ زبان قال یا زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے كَذٰلِكَ يَنْطِقُ عَلَيْنٰكُمْ بِالْحَقِّ (ہماری کتاب تمہارے سامنے حق بیان کرتی ہے)۔ اس شرک کی سچائی کے بارے جو وہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ دلیل گواہی دیتی ہو ان کے شرک کرنے اور اس کی سچائی کی۔ یا اس امر کی جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی الوہیت میں شرک کرتے ہیں۔ اور اَمْ اَنْزَلْنَا میں استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اس اقرار پر براہین پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ بغیر دلیل کے شرک کر رہے ہیں۔

وَ اِذَا آدَا النَّاسُ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ مِّمَّا قَدْ مَتَّ

اٰيِبُهُمْ اِذَا هُمْ يَقْتَضُوْنَ ﴿٣٦﴾

”اور جب ہم لوگوں کو رحمت (کامزہ) تو وہ اس پر پھولے نہیں مٹاتے اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف

بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں ۱۔“

۱۔ اور جب ہم لوگوں کو رحمت یعنی صحت اور خوشحالی جیسی نعمت کامزہ پہنچاتے ہیں تو وہ اس کے سبب خوشی سے پھولے نہیں مٹاتے۔ اور اگر ان کے گناہوں کی نحوست کے بدلے انہیں کوئی تکلیف اور شدت پہنچتی ہے تو وہ یکدم اس کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بندہ مومن کی شان کے خلاف ہے کیونکہ وہ نعمت کے وقت شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور شدت کی حالت میں اپنے رب سے رحمت کی امید رکھتے ہوئے صبر اختیار کرتا ہے اور ثواب کا طالب رہتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ﴿٣٧﴾

”کیا انہوں نے (باربا) مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا

ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) ۱۔ بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے ہیں ۲۔“

۱۔ یہ استفہام انکاری ہے اور واو کلام محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے اور یہ نہیں

جانتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

یہ یقین رکھنا چاہیے وہ تنگ کر دیتا ہے۔ پس کیا ہے انہیں کہ وہ خوشحالی میں تو اترا نہیں اور شکر ادا نہ کریں اور شدت تکلیف کی حالت میں ناامید ہو جائیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مغفرت کے امیدوار بن کر رجوع نہ کریں اس طرح کہ سابقہ گناہوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کریں اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کریں اور نہ وہ صبر کریں اور نہ ہی ثواب کے طالب ہوں جیسا کہ مؤمنین ایسے حالات میں صبر بھی کرتے ہیں اور ثواب کے امیدوار بھی ہوتے ہیں۔

اس لیے تنگ اس تنگی اور کشادگی میں ایسی نشانیاں ہیں جن سے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت اور حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

قَاتِلِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْيَتَامَىٰ وَالسَّبِيلَ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَرِيدُونَ
وَجْهَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۱﴾

”پس دورشتہ دار کو اس کا حق لے، یتیموں اور مسکینوں کو بھلائی دے، یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو رضائے الہی کے طلب گار ہیں۔“

اس میں فاء سیبہ ہے یعنی جب توبہ پہچان چکا کہ رزق میں تنگی اور وسعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے تو بھرا داکرو (قُربانی مصدر بمعنی قربانیت ہے) یعنی رشتہ دار کے لیے اس کا حق یعنی حسن سلوک، صلہ رحمی اور نفقہ جو اس ارشاد باری تعالیٰ وَعَنِ الْيَتَامَىٰ وَفِي ذَٰلِكَ کے مطابق واجب ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ میں اسی آیت کے ضمن میں رشتہ داروں کے نفقہ کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

اس اور ادا کرو مسکین کو اور ایسے مسافر کو جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اگر چہ اس کے اپنے وطن میں اس کا مال ہو۔ تو مال ذکوٰۃ سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے اور دنیا و آخرت میں اس کے فضل کی امید رکھتے ہوئے ان کے حقوق ادا کرو۔

اس اپنی ذاتوں کے لیے لذات کو ترجیح دینے کی نسبت رشتہ داروں وغیرہ کو دینا بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جہت کا ارادہ رکھتے ہیں یعنی اس کے سبب اس کی رضا اور خوشنودی کا قصد کرتے ہیں اور اس پر ثواب کی امید رکھتے ہیں اور ان کے دینے کا مقصد یا کاری اور شہرت کا حصول نہیں ہوتا۔

یہ، وَأُولَٰئِكَ كَافٍ لَّكُم مِّنْهُم مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الَّتِي يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۚ

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبَآلَيْدٍ يُؤَافِي ۚ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرِيضُوا عِندَ اللَّهِ ۚ وَمَا آتَيْتُم
مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْغِفُونَ ﴿۵۲﴾

”اور جو روپیہ تم دیتے ہو بیعت پر نہ تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں سے (سن لو) اللہ کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا

اس اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو رضائے الہی کے طلب گار بن کر۔ پس یہی لوگ ہیں (جو اپنے مالوں کو) کٹی گنا کر لیتے ہیں سے۔“

لے جمہور کے نزدیک وَمَا آتَيْتُم کی قرأت مد کے ساتھ ہے۔ یعنی جو کچھ تم نے سود کھانے والوں کو دیا یا بوائے مراد یا تو وہ زیادتی ہے جو کاروبار میں شرعاً حرام قرار دی گئی ہے۔ یا اس سے مراد ایسا عطیہ ہے جو بدیہ یا مہینہ دینا مباح ہو اور اس غرض سے دیا جائے کہ اس کے

عوض زیادہ ملنے کی توقع ہو۔ اس تاویل کی بناء پر مطلوب و مقصود کی بناء پر عطیہ کو ربوا کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی مقصود زیادتی ہی ہے۔

ابن کثیر نے دونوں جگہوں پر مَا لَيْتَكُمْ پڑھا ہے۔ یعنی جو تم دینے کے لیے لائے جا رہے وہ ایسی زیادتی ہو جو حرام ہے یا مباح عطیہ ہو جس کے عوض وہ زیادہ لینے کی توقع رکھتے ہوں۔

عَلَيْكُمْ لَيْتُمْ کو اہل مدینہ اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں تاء اور باء مغموم ہیں اور داؤ ساکن ہے۔ یعنی لَيْتُمْ اَنْتُمْ وَفَصْلُكُمْ ذَا يَنْفَادَةٍ (کہ تمہیں زیادہ دیا جائے اور تم کثیر والے ہو جاؤ) تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھتا ہے۔ احوال الناس سے مراد یا تو وہ بے مالوں کا مال ہے یا ان کا مال ہے جنہیں دیا گیا ہے۔

باقیوں نے اسے لَيْتُمْ پڑھا ہے، یعنی اس میں یا اور داؤ دونوں مفتوح ہیں۔ معنی یہ ہے تاکہ وہ اپنے مالوں میں اضافہ کریں۔ پس اہل وہ اللہ کے نزدیک اسے نہیں بڑھا سکتے اور نہ ہی اس میں برکت رکھی جاتی ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ علماء نے آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا آدمی ہے جو کسی دوسرے کو اس لیے عطیہ دیتا ہے تاکہ اس کے عوض وہ اسے زیادہ واپس لوٹائے تو یہ عطیہ جائز اور حلال ہے لیکن قیامت کے دن اس پر اسے کوئی ثواب نہیں دیا جائے گا اور قول باری تعالیٰ لَا يَزِيدُكُمْ اَمْوَالَكُمْ کا یہی معنی ہے۔ یہ عمل حضور کریم ﷺ پر حرام تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ فرمایا وَلَا تَسْتَكْبِرُوا (1) اور ضخاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے رشتہ دار یا اپنے دوست کو اس کے مال میں اضافہ کرنے کے لیے دیتا ہے اور اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ارادہ نہیں کرتا۔ (2) اور امام غزالی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے، اس کی خدمت بجالاتا ہے اور اس کے ساتھ سفر پر بھی جاتا ہے۔ پس وہ آدمی اس کے لیے اپنے مال کے منافع میں سے کچھ حصہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ اسے اس کا تعاون اور مدد حاصل رہے۔ اس سے اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مال نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا قصد ہی نہیں کرتا (3)۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہوگا جس کی اس نے نیت کی، پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو حاصل کرنے کی کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے ارادے سے اس نے ہجرت کی (4)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اسے حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ نے بیان کیا ہے۔

یہ اور جو مال بطور صدقہ دیتے ہو یا بطور زکوٰۃ ادا کرتے ہو۔ اور اس سے ارادہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جانب سے ثواب اور رضا کرتے ہو۔ پس وہ لوگ جو زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ثواب کئی گنا کر دیا جاتا ہے۔ پس انہیں ایک ٹنگی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر اسے گنا تک جس کی کوئی انتہا نہیں دیا جائے گا۔ اور ان کے مالوں کو زکوٰۃ کی برکت سے کئی گنا کر دیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ کئی گنا ثواب والے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے قوت والے کو مقوی اور مال والے کو مؤثر کہا جاتا ہے۔ عبارت اور الفاظ کے

اعتبار سے مقابلے کے طریقہ میں تہذیبی مبالغہ کے لیے ہے۔ (یعنی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ لَا يَزِيدُ اَعْدَاءَ اللّٰهِ کے مقابلہ میں يَزِيدُ اَعْدَاءَ اللّٰهِ) اور انہیں اور توہم و توہم کے بعد خطاب سے ضمیر غائب کی طرف التفات تقسیم کے لیے ہے۔ گویا اس کے ذریعے ملانکہ اور مخلوق میں سے خواص کو خطاب کرتے ہوئے زکوٰۃ دینے والوں کی حالت سے انہیں آگاہ کیا یا پھر یہ التفات تقسیم کے لیے ہے۔ گویا یہ فرمایا جنہوں نے ایسا کیا وہ لوگ ہیں جو اپنے مالوں کو کوئی گنا کر لیتے ہیں۔ اگر آپ ماموسلہ بنائیں تو پھر اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر کلام المضعون بہ ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے فَاهْلُهَا هُمْ الْمُضْطَعُونَ (یعنی زکوٰۃ دینے والے ہی مال کو کوئی گنا کرنے والے ہیں)۔

اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ هُمْ يَخْبِيكُمْ ۖ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ

مَنْ يَقْتُلْ مِنْ ذَلِكُمْ مِثْرَ شَيْءٍ سَبْحَنَهُ وَتَعْلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

”اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا پھر (مقررہ وقت پر) تمہیں مارے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے (ضمیر اے ہوئے) شریکوں میں بھی کوئی ہے جو کر سکتا ہو ان کاموں میں سے کوئی پاک ہے

اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) اور بلند ہے ان سے جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔“

۱۔ اللہ اسم جلال مبتدا ہے اور ما بعد کلام اس کی خبر ہے۔ کیا بتوں وغیرہ میں سے جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے کیا وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان میں سے کوئی بھی اس طرح نہیں کر سکتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے لوازم الوہیت کا ذکر فرمایا، انہیں اپنی ذات کے لیے ثابت کیا اور اپنے سوا ہر شے سے ان کی نفی کر دی اور استفہام انکاری کے ساتھ اس کی مزید تاکید ذکر کی جیسا کہ اس پر دلائل اور مشاہدہ و حالات کرتے ہیں اور ہی پر اجتماع بھی واقع ہوا ہے۔ پھر اس کے نتیجے کے طور پر یہ بیان فرمایا کہ اس کی ذات ہر قسم کے شریک سے پاک اور بھرم ہے۔ لہذا اور شاد فرمایا سَبْحَنَهُ وَتَعْلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

حمزہ اور کسائی نے یُفْشِرُوْنَ کو تاء کے ساتھ فُشِّرُوْا مَحْوُوْا پڑھا ہے (اللہ تعالیٰ ہر عیب سے) پاک ہے اور جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں ان سے بلند ہے)۔ اور بانہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ لَفْظِ اللّٰهِ کی صفت ہو

اور اَهْلٰ مِنْ شُرَكَائِكُمْ اس کی خبر ہو۔ اور ان میں رابطہ مِنْ ذَلِكُمْ ہو۔ کیونکہ مِنْ افعال کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے جنہیں پیدا کیا کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو اس کے افعال میں سے کوئی کر سکتا ہو؟ پہلے دونوں مقامات پر مِنْ یہ فائدہ دے رہا ہے کہ ہم شرکاء اور افعال کی جنس میں مشترک ہے۔ اور تیسرے مقام پر مِنْ زائدہ ہے جو تعجب نفی کے لیے ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر شرکاء کو کاہنہ کرنے کے لیے ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي

عَمِلُوْا اَلْعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

”پھیل گیا فسادِ بحر میں لہجہ ان کر توؤں کے جو لوگوں نے کیے ہیں جسے تاکہ اللہ تعالیٰ پھکائے انہیں کچھ سزا ان

کے (برے) اعمال کی سزا شاید وہ بار آجائیں۔“

۱۔ مثلاً قحط سالی اور موت، آگ لگانے، غرق ہونے اور جنگ و جدال کی کثرت، برکتوں کا مٹ جانا، ظلم عام ہونا اور ضرر، امراض اور گمراہی کا کثرت سے ہونا، مسندروں میں فساد برپا کرنے والی آندھیوں اور طوفانوں کا چلنا اور سمندری جانوروں کا باہم ایک دوسرے سے لڑنا وغیرہ۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ البور سے مراد صحراء اور جنگلات ہیں اور بحر سے مراد وہ شہر اور بستیاں ہیں جو جاری پانیوں کے کنارے آباد ہوں (1)۔ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت مکرّمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ عرب مصر کو بحر کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں اَجْدَبَتِ الْبُرِّ وَ انْقَطَعَتْ مَادَّةُ الْبَحْرِ (2) (زمین قحط زدہ ہوگئی اور سمندر پر بھی اس کا اثر ہوا کیونکہ اس کا مادہ منقطع ہو گیا)۔ عطیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ بحر سے مراد سطح زمین پر موجود شہر وغیرہ ہیں اور بحر سے مراد معروف معنی سمندر ہے۔ اور بارش کی قلت جس طرح خشکی (زمین میں اثر انداز ہوتی ہے) اسی طرح سمندر میں بھی مؤثر ہوتی ہے۔ پس سمجھیں اندر سے خالی ہوتی ہیں لیکن جب بارش ہوتی ہے تو یہ سوپ پیچھے سے سمندری ظاہری سطح کی طرف چڑھ آتی ہے اور اپنا منہ کھول دیتی ہے پس بارش کا جو قطرہ اس کے منہ میں پڑتا ہے وہ موتی بن جاتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ الفساد فی البور سے مراد ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنا اور فساد فی البحر سے مراد جابر باہادشاہ کا کشتیوں کو غصب کرنا ہے۔ (4)

فریابی، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین میں فساد قاتل کے اپنے بھائی ہاتل کو قتل کرنے کے سبب ظاہر ہو گیا اور سمندر میں شہنشاہ عمان جلندی کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں) کشتیوں کو پھینکنے سے پھیلا۔ جیسا کہ فرمایا عَزَّ وَجَلَّ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (وہ ہر کشتی کو غصب کر لیتا تھا) (5)۔

اور ضحاک نے کہا ہے کہ زمین سرسبز و شاداب تھی ابن آدم (آدمی) جس درخت کے پاس بھی آتا تھا اسے چھلدا پاتا اور سمندر کا پانی میٹھا اور شیریں تھا اور شیریں گائے اور بکری کو مارنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب قاتل نے ہاتل کو قتل کر دیا تو زمین خشک ہوگئی، درخت کا نئے دار ہو گئے، سمندر کا پانی سخت نمکین ہو گیا اور جانوروں میں سے بعض بعض کو مارنے لگے۔ (6)

۲۔ ایسا لوگوں کے گناہوں کی نحوست کے سبب قحط اور خشک سالی آگئی حتیٰ کہ وہ ہڈیاں اور مردار کھانے لگے۔ ”لِيَذِيْبَقَهُمْ“ کو قاتل نے نون کے ساتھ میضہ صغیرہ منقطع پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال کی کچھ سزا انہیں چکھائے۔ کیونکہ مکمل سزا تو آخرت میں دی جائے گی۔ ”لِيَذِيْبَقَهُمْ“ میں لام علت یا عاقبت کے لیے ہے۔

۴۔ شاید وہ اپنے برے اعمال سے باز آجائیں لَعَلَّكُمْ يَرْجِعُوْنَ کا تعلق لِيَذِيْبَقَهُمْ سے ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل زمین ظلم اور گمراہی سے بھری پڑی تھی۔ پس جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو لوگوں میں سے رجوع کرنے والوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ (7)

2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 32 (الامیریہ)

4۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228

6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (اتقاریہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (اتقاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (اتقاریہ)

5۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228

7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (اتقاریہ)

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۖ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

”تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اپنے فضل و کرم سے بے شک وہ پسند نہیں کرتا کفار کو۔“

۱۔ لِيَجْزِيَ مِنْهُمْ دُونَ کے متعلق ہے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ان کے معاوضہ کی علت بیان کرنے کے لیے ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے اور مِنْ فَضْلِهِ لِيَجْزِيَ کے متعلق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کی نسبت زیادہ ثواب عطا کرے (1)۔ آیت میں صرف اہل ایمان کی جزاء کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود بالذات یہی ہے اور اللہ تعالیٰ تو ثواب ہی دینے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جس نے خود انکار کیا، اپنے آپ پر ظلم کیا اور آخرت میں اپنے لیے جہنم کو پسند کر لیا تو ان کے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ بھی انہیں سزا دے گا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ بے شک اللہ تعالیٰ کفار کو پسند نہیں کرتا۔ پس وہ اپنے کفر کے سبب اس کے فضل کے مستحق نہیں بنتے۔ اور شرج جلال الدین نے کہا ہے کہ لِيَجْزِيَ قول باری تعالیٰ يَصْطَفِيْ عُونِ کے متعلق ہے۔ اس کے مطابق دونوں فریقوں کی جزاء کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ پس إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ کا معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا۔ (2) واللہ اعلم۔ اور ارشاد باری تعالیٰ مِنْ فَضْلِهِ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ثواب دینا کھل اللہ کا فضل ہے۔ اور اگر اس کا معنی عطا یا مقررہ ثواب سے زیادہ ہوتا یا جائے تو یہ ایسی تاویل ہوگی جس میں ظاہر لفظ سے عدول کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام احمد نے الزہد میں ابو الحارث سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ میرے نیک اور صالح بندوں کو ڈرا کیس تا کہ وہ اپنے نفسوں پر اترانے نہ لگیں اور اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کرنے لگ جائیں کیونکہ میرے بندوں میں سے کوئی ایسا بندہ نہیں جسے میں حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اس پر اپنے عدل کے تقاضے پورے کروں گا اور پھر اسے عذاب نہیں دوں گا (3)۔ (یعنی اسے ضرور عذاب دوں گا)۔ ابو نعیم نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کریں۔ کیونکہ میں قیامت کے دن جس بندے کو حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو میں اسے ضرور عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت کے گنہگاروں سے کہہ دیجئے کہ وہ نامید نہ ہو جائیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا۔ بطرانی واہد بن اسحاق سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے آدمی کو اٹھائے گا جس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا تیرے نزدیک دو امروں میں سے کونسا امر پسندیدہ ہے کہ میں تجھے تیرے اعمال کی جزاء عطا فرماؤں یا تجھ پر احسان فرماؤں؟ وہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیری نافرمانی نہیں کی۔ تو رب کریم فرمائے گا میری نعمتوں میں سے ایک نعمت کے ساتھ میرے بندے کے اعمال کا موازنہ نہ کرو۔ تو اس طرح وہ ایک نعمت ہی اس کی تمام نیکیوں کو محیط ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس کوئی نیک عمل بھی باقی نہیں رہے گا۔ پس وہ عرض کرے گا تیرے احسان اور تیری رحمت

کے ساتھ ہی مغفرت کا طالب ہوں (1)۔ بزار نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن آدمی کے لیے تین رجسٹرائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک میں اعمال صالحہ ہوں گے، ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور ایک میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کی جانے والی نعمتوں کا ذکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نعمتوں کے رجسٹر سے چھوٹی سی نعمت لے کر اسے فرمائے گا کہ تو اس کے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنا موازنہ کر۔ تو وہ چھوٹی سی نیکی اس کے تمام نیک اعمال کو گھیر لے گی پس وہ رجسٹر کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے ابھی کبھی طور پر گھیرا نہیں۔ کیونکہ گناہ ابھی باقی ہیں اور تمام کے تمام نیک اعمال ختم ہو چکے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیرے لیے تیری نیکیوں کو لپیٹا کر دیا ہے، تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمتیں بخش دی ہیں (2)۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی نے کہہ دیا لا الہ الا اللہ تو اس کے عوض اس کے لیے (جنت) میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وعدہ ہو گیا۔ اور کسی نے کہا سبحان اللہ تو اس کے عوض اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔ تو پھر ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اس کے بعد ہم ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت ہیں میری جان ہے بے شک قیامت کے دن آدمی ایسا عمل لے کر آئے گا کہ اگر اسے پہاڑ پر رکھا جائے تو وہ اس پر بوجھل ہو جائے لیکن جو نبی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ان کے مقابل آئے گی تو تمام اعمال اس ایک کے مقابلے میں ختم ہو جائیں گے۔ پس اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہی فضل فرمائے گا (3)۔ اور شیخین نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے رہو، ایک دوسرے کا قرب اختیار کرو اور خوش رہو۔ کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و مغفرت کے ساتھ مجھے ڈھانپ لے (4)۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام احمدؒ نے اسے ابوسعید سے بھی نقل کیا ہے۔ بزار نے اسے ابن ابی موسیٰؓ اور شریک بن طارقؓ دونوں سے نقل کیا ہے۔ اور شریک بن طریفؓ، اسامہ بن شریکؓ اور اسد بن کرزؓ کی حدیث سے اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے۔

دو شبہات: یہاں دو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے اور معصیت چھوڑنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ اہل اطاعت کو بھی عذاب دے گا اور اگر اس نے فضل فرمایا تو اہل معصیت کو بھی بخش دے گا اور جنت میں داخل فرما دے گا۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہ مذکورہ بالا احادیث کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معارض ہے اِذْ خَلَوْا لِلَّهِ انْفِصَالًا يَوْمَئِذٍ تَعْمَلُونَ (کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے رہے) کیونکہ یہ ارشاد تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا سبب اعمال ہیں۔ اور یہ ان کا سبب ہے۔

جواب: پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ بے شک اطاعت و فرمانبرداری بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنْ تَنْتَهِبْ شُجُوءَ اللَّهِ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری

اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب اختیار کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں (1)۔ اسے بخاری نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور محبت فضل و رحمت کا تقاضا کرتی ہے اور فضل کی بھلائی لانے اور ہر قسم کا ضرر دور کرنے کا سبب ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جنت کے کئی درجات ہیں انہیں اعمال کے سبب ہی حاصل کیا جائے گا۔ کیونکہ اعمال کے مختلف ہونے کے سبب جنت کے درجات و مراتب میں بھی تفاوت ہے۔ اگرچہ ابتداءً جنت میں داخل ہونا اور پھر اس میں ہمیشہ رہنا محض اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے ہی ہوگا۔ اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ہناد نے الزہد میں حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم پل صراط سے اللہ تعالیٰ کے غلو کے ساتھ گزر دو گے، جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب داخل ہو گے اور تمہیں جنت کے مراتب تمہارے اعمال کے مطابق دیئے جائیں گے۔ اسی کی مثل ایک روایت ابو نعیم نے عون بن عبد اللہ سے نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّياحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ مَّا حَبِطَہُ وَلِتَجْعَلَ الْاُفْلَکُ بِأَمْرِہِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِہِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۳۱﴾

”اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے۔ نیز تاکہ وہ تمہیں پچھائے اپنی رحمت سے اور تاکہ تم چلیں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ تم طلب کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔“

۱۔ اور اس کے دلائل قدرت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بغیر کسی محرک کے اپنے ارادے کے مطابق ہواؤں کو شمال سے جنوب کی طرف اور اس کے برعکس (یعنی جنوب سے شمال کی طرف) اور مشرق سے مغرب کی طرف اور اس کے برعکس (مغرب سے مشرق کی طرف) بھیجتا ہے۔ جیسا کہ قوت حس اس کی شہادت دیتی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے جس کے طور پر اسے الزئبق پڑھا ہے۔

۲۔ ترکیب کلام میں مُبَشِّرَاتِ الرِّیاحِ سے حال ہے۔ اور وَلِيُذِيقَكُمْ مُبَشِّرَاتٍ کے معنی پر معطوف ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ہے لیسرکم وَلِيُذِيقَكُمْ۔ یا اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ تم سے گرمی اور گرم تیز گرمی کو دور کرے۔ اور تمہیں اپنی رحمت سے اناج اور پھلوں کا ذائقہ پچھائے ”مِنْ رَحْمَتِہِ“ میں من ابتداءً یہ ہے۔

۳۔ اور تاکہ اس کے حکم سے ہواؤں کے سبب کشتیاں چلیں اور تاکہ تم سمندری تجارت کے سبب منافع تلاش کرو۔ تاکہ تم ان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ پس تم اس کے فوائد و ثمرات دنیا اور آخرت میں پالو گے۔ مِنْ اٰیَاتِہِ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ الْاٰیَہِ سے متصل ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِہِمْ فَجَاءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَفَخْنَا مِنْ اَنْزِلِیْنَا اَجْرُ مَوْاٰطٍ وَّكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۲﴾

”اور بے شک ہم نے بھیجے آپ سے پہلے پیغمبران کی قوموں کی طرف پس وہ لے کر آئے ان کے پاس روشن دلیلیں۔

پس ہم نے بدلہ لیا ان سے جنہوں نے جرم کیے۔ اور ہمارے ذمہ کرم پر ہے اہل ایمان کی امداد فرمانا۔“

ہم نے آپ سے پہلے ان کی قوموں کی طرف پیغمبر بھیجے۔ پس وہ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے جو ان کی صداقت پر واضح دلالت کرتی تھیں۔ پس ان میں سے بعض ان کے ساتھ ایمان لائے اور بعض دوسروں نے ان کا انکار کر دیا۔ اسی پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَاتَّخَذْنَا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا آيَةً وَمَا كَانَ لِمَنْ كَفَرَ أَنْ يَهْتَكُمُ الْيَمِينَاتُ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

ع۔ اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ وَنَضَرْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَضْرُ الْمُؤْمِنِينَ۔ (اور ہم نے ان کی مدد کی جو ایمان لائے اور اہل ایمان کی مدد فرمانا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔) اور اس میں یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ کفار سے بدلہ لینا اور انہیں سزا دینا اہل ایمان کی مدد اور ان کی کرامت و عزت کے اظہار کے لیے تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ از روئے تفضل و مہربانی اہل ایمان کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار کبھی بھی مؤمنین پر غالب نہیں آسکیں گے حالانکہ کبھی اس کے خلاف بھی دیکھا جاتا ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ نَضْرُ الْمُؤْمِنِينَ میں اضافت اور الق لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جنہوں نے خالصہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے جہاد کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا (اور انہیں غلبہ عطا کرے گا) اگرچہ وہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو مسلمان اپنے بھائی کی عزت کا دفاع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق بن جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس سے جہنم کی آگ کو دور کرے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَضْرُ الْمُؤْمِنِينَ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے (1)۔ اور اسے اسحاق بن راہویہ اور طبرانی وغیرہ نے اسماء بنت یزید کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ کبھی حقا پر وقف کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا تعلق انتقام سے ہوگا۔

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُبْرِئُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَ
يَجْعَلُهُ كَسَافًا تَكْسَفُ الْوُدُقُ يَخْرُجُ مِنْ خَلِيلِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مِنْ يَسَاءٍ مِنْ
عِبَادَةٍ إِذْ أَهْمُ يَسْتَبِيرُونَ ﴿٥٦﴾

”اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پس اللہ تعالیٰ پھیلا دیتا ہے اسے آسمان پر۔ جس طرح

چاہتا ہے اور کر دیتا ہے اسے ٹکڑے ٹکڑے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ کھینچے گی اس میں سے پھر جب پہنچتا ہے

اسے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اس وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔“

ع۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پس وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اسے کبھی مصلحاً آسمان پر پھیلا دیتا ہے۔ اور اس سے مراد اوپر کی سمت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَفَوْقَهَا فِي السَّمَاءِ۔

ع۔ كَيْفَ يَشَاءُ یہ بَسْطُ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی ایک جانب سے دوسری جانب انہیں چلاتے ہوئے کبھی گھنے بادلوں کی

صورت میں اور کبھی بغیر گھٹا کے۔ اور کبھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ابن عامر نے کسفا کے سین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مخفف ہے یا کسفہ کی جمع ہے یا مصدر ہے جس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔
 یہ پھر توبارش کو دیکھتا ہے۔ کہ کبھی اس میں سے بارش نکلنے لگتی ہے۔ پھر اسے اپنے بندوں میں سے جس کی ہستی پر چاہتا ہے پہنچاتا ہے تو وہ ہزہ اور شادابی آنے سے خوش ہو جاتے ہیں۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَكَيْسِينَ ﴿٥١﴾

”اور اگر چودہ بندے اس سے پہلے کہ ان پر بارش ہوتی ہے مایوس ہو چکے تھے۔“
 لے یہ ان مخفف عن المشك ہے اصل میں ہے۔ وَانْتَهُمْ كَانُوا۔ مکی اور مصری نے اسے تخفیف کے ساتھ يَنْزِلُ پڑھا ہے اور ”مِنْ قَبْلِهِ“
 مِنْ قَبْلِهِ کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ ان پر بارش ہوئے طویل وقت گزر چکا تھا اور اب ان کی مایوسی اور ناامیدی مستحکم ہو چکی تھی (یعنی وہ حذر و جد ناامید اور مایوس ہو چکے تھے)۔ ابن مسعود کی قرأت میں مِنْ قَبْلِهِ کے الفاظ نہیں ہیں۔
 لے كَيْسِينَ پر لام ان مخفف اور ان تافید کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے۔ اِنْ تَافِيءُ ہے اور لام الّا کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے۔ وہ اس سے قبل نہیں تھے مگر ناامید۔ وَمَا كَانُوا مِنْ قَبْلِهِ اَلَا اَيْسِينَ۔

فَانْظُرْ اِلَى اَثَرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُعْطِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ اِنَّ ذٰلِكَ لَخُبْرٰى

النَّبْوٰى ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٥٢﴾

”پس (چشم ہوش سے) دیکھو رحمت الہی کی علامتوں کی طرف لے (تمہیں پتہ چلے گا) وہ کیسے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک وہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“
 لے پس تم چشم ہوش سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی علامتوں کی طرف دیکھو، یعنی بارش کے اثرات نباتات، درختوں، اناج اور پھلوں وغیرہ کی صورت میں دیکھو۔ اسی لیے ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور جمہور نے جس کا ارادہ کرتے ہوئے مفرد کی صورت میں اَطْرَاحَتْ اللّٰهُ پڑھا ہے۔

لے وہ کیسے زمین سے ہزہ لگا کر اسے زندہ کرتا ہے۔ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد بے شک وہ جو زمین کے مردہ ہونے کے بعد اسے زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یقیناً وہی خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اے کفار! تمہارے انکار کی کوئی وجہ نہیں جب کہ تم حیات بعد الموت کی مثالوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یعنی تمام ممکنات کی طرف اس کی قدرت کی نسبت مساوی ہے۔

وَلٰكِنْ اَمَّا سَلٰتُنَا بِحَافِرِ اَوْدَٰثٍ مُّصَفَّرٍ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ ۚ اَمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿٥٣﴾

”اگر ہم بھیج دیتے ایسی ہوا (جس کے اثر سے) وہ دیکھتے اپنے سر سبز کھیتوں کو کہ وہ زرد ہو گئے ہیں لے تو اس کے باوجود

وہ کفر پراڑے رہتے۔“

لے اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیتے جو زمین کو خشک کرنے کا موجب ہوتی۔ پس وہ دیکھتے اس کا اثر یا اپنے سر سبز کھیت کہ وہ زرد ہو گئے ہیں

یہی ماہل کلام کا مدلول ہے۔ اور لام مقدر قسم کا جواب ہے۔

۱۔ تو اس کے باوجود کفر پراڑے رہتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے۔ جواب قسم کا تم مقام جزاء کے ہے جو کفار کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ ان میں استعجال اور ثبات کی قلت تھی، ان میں تدبر اور غور و فکر نہیں تھا۔ وہ غور و فکر نہ کرنے کے سبب بہت جلد متزلزل ہو جاتے تھے اور ان کی رائے انتہائی ناقص تھی۔ جبکہ صحیح نظر و فکر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے، اور جب ان پر بارش نہ ہوتی تو وہ استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں السجاء کرتے اور اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہوتے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش عطا فرما دیتا تو وہ اس کا شکر بجالانے اور اس کی اطاعت اختیار کرنے میں تیزی کرتے اور غوشی کے اظہار میں حد سے تجاوز نہ کرتے۔ اور اگر ان کے کھیتوں پر کوئی آفت آجاتی تو وہ اس مصیبت اور آزمائش میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار نہ کرتے۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمُبَوِّقَ وَلَا تُسْمِعُ الصَّمَّ الدُّعَاءَ إِذْ أَوْكَلُوا مُدِيرِينَ ﴿٣٦﴾

”پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے ہیں اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں۔“
۱۔ پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اور وہ بھی مردوں کی مثل ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے خواص کو حق بات سننے اور سمجھنے سے بند کر رکھا ہے۔ اور نہ آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں۔ ابن کثیر نے اسے لَا يُسْمِعُ صِغَرٍ مَجْرُومٍ کی صورت میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الصَّمَّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے باب افعال سے صیغہ مخاطب کی صورت میں اور الصَّمَّ کو مفتوح پڑھا ہے۔ اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں۔ یہ قیاس لیے ذکر کی ہے تاکہ یہ اظہار ہو کہ بالکل ہی نہیں سن سکتے۔ کیونکہ اگر بہرے متوجہ ہوں تو اگرچہ کلام تو اس صورت میں بھی نہیں سننے لیکن حرکات و سکنات کے واسطے سے کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ پیٹھ پھیرے ہوئے ہوں تو پھر تو بالکل ہی کچھ سمجھ نہیں سکتے۔

وَمَا أَنْتَ بِهَادٍ الْعُمَىٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ ۖ إِنَّهُمْ أَلَمْنَ يَوْمَئِذٍ بِالْيَتِيمَاتِ هُمْ مُسْمُونُونَ ﴿٣٧﴾

”اور نہ آپ ہدایت دے سکتے ہیں اندھوں کو ان کی گمراہی سے آپ نہیں سناتے۔“
آیتوں پر پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔“

۱۔ اور نہ آپ اندھوں یعنی کفار کو ان کی گمراہی سے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اور آپ ایسا نہیں سناتے جسے سمجھا جائے اور قبول کیا جائے۔ حزمہ نے فقہی صیغہ مضارع کی صورت میں پڑھا ہے۔ کفار کو اندھا اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے آنکھیں ہونے کے باوجود مقصود حقیقی کی طرف نہ دیکھا نہ اسے پایا۔ یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں کے اندھا ہونے کی وجہ سے انہیں اندھا کہا گیا ہے۔

۲۔ مگر انہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان کا ایمان انہیں الفاظ قبول کرنے اور معنی میں غور و تدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مومن سے مراد وہ لوگ ہوں جو ایمان کے قریب پہنچنے والے ہیں یا وہ لوگ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان مقدر بنا دیا ہے۔ پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔ جب بھی آپ انہیں کوئی حکم ارشاد فرماتے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ ۝

”اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں (ابتداء میں) کمزور پیدا فرمایا۔ پھر عطا کی (تمہیں) کمزوری کے بعد قوت۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دے دیا۔ پھر پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔“

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری ابتدا ضعف طفولیت سے فرمائی یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملے کی بنیاد ضعف کو بنایا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے **خُلِقُوا مِنْ ضَعْفٍ** (فطرنا انسان کو جلت پسند پیدا کیا گیا ہے)۔ یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کمزور اور ضعیف اصل سے پیدا کیا ہے اور وہ لفظ ہے۔ یہ اصل میں ذی ضعف ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **اَلَمْ تَخْلُقْهُمْ مِنْ مَّاءٍ مَهِينٍ** (کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا)

۲۔ پھر طفولیت کی کمزوری کے بعد (قوت دی) قوت سے مراد جوانی شباب ہے۔ ابوبکر اور حمزہ نے تینوں مقامات پر **مِنْ ضَعْفٍ** پڑھا ہے، یعنی ضاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ حفص نے بھی ان مقامات میں عام سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مگر بجز اسے چھوڑ دیا اور ضمہ (چش) کو اختیار کیا اور اس روایت کی اتباع کی جو فضل بن مرزوق نے عطیہ العونی کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فتح کو رد کر دیا۔ اسی طرح ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ الدانی نے کہا ہے اور وہ روایت جو حفص نے عام کے واسطے سے اپنے ائمہ سے نقل کی وہ زیادہ صحیح ہے اور ہاتھوں نے ان مضامین میں ضاد پر ضمہ پڑھا ہے۔ اسی طرح الدانی نے بھی کہا ہے۔ اور علامہ بخاری نے تفسیر میں لکھا ہے کہ حفص نے ضاد کو ضمہ اور فتح دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ پس یہاں یہ دونوں لغتیں ہیں، ضمہ قریش کی لغت ہے اور فتح بنی تمیم کی اور قاموس میں ہے کہ ضاد مفتوح ہو تو معنی رائے کا کمزور ہونا ہے اور اگر ضاد مضموم ہو تو اس کا معنی بدن کا کمزور ہونا ہے۔

۳۔ وہ کمزوری اور قوت، جوانی اور بڑھاپے میں سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی اپنی تخلیق کی تدبیر کو جاننے والا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَنَا بِسَاعَةٍ ۖ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْكَلُونَ ۝

”اور جس روز قیامت قائم ہوگی۔ مجرمیں اٹھائیں گے مجرم کہ نہیں ٹھہرے وہ (دنیا میں) ۱۔ مگر ایک گھڑی یونہی وہ (پہلے بھی) غلط بیانی کیا کرتے تھے۔“

۱۔ اور جس روز قیامت قائم ہوگی۔ یہاں قیامت کو ساعت کا نام دیا گیا ہے۔ یا تو اس لیے کہ قیامت دنیا کی ساعتوں میں سے آخری ساعت میں قائم ہوگی یا پھر اس لیے کہ یہ اچانک واقع ہوگی اور غلبہ استعمال کی وجہ سے الساعۃ قیامت کا علم ہو گیا ہے جیسا کہ زہرہ کو الکوکب کہا جاتا ہے۔

۲۔ مشرکین تمہیں اٹھائیں گے کہ وہ دنیا اور قبروں میں نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے **لَقَدْ لَبِثْتُمْ**

إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ (کہ تم ٹھہرے رہو ہوشیاری کے مطابق روز حشر تک)۔

اسے ایسے انہوں نے آخرت میں اپنے عذاب کی مدت کی نسبت اس مدت کو قلیل سمجھایا اس میں وہ اس ٹھہرنے کی مدت کو بھول گئے یا پھر اس لیے کہا کہ چونکہ وہ مدت گزر چکی تھی گویا وہ ایسے ہو گئے جیسے تھی ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس طرح وہ اب صدق اور تحقیق حال سے بھرے ہوئے ہیں اسی طرح وہ دنیا میں حق سے روگرداں تھے اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قیامت اور روز حشر کا وجود نہیں ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ
الْبَعْثِ ۖ وَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٥١﴾

”اور کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم اور ایمان دیا گیا (انہیں) کہ تم ٹھہرے۔ رہو ہوشیاری کے مطابق ۱۔ روز حشر تک پس یہ (آگیا) ہے یوم حشر لیکن تم نہیں جانتے تھے ۱۔“

۱۔ اس کا عطف نفیس المفعول مؤن پر ہے۔ اور ملائکہ، انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان ان کے قول کا رد کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم اتنا زمانہ ٹھہرے رہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ٹھہرنا لکھ دیا تھا۔ یا تم اتنا زمانہ ٹھہرے جتنا تمہارے ٹھہرنے کا زمانہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد لوح محفوظ ہے یا اس سے ان ملائکہ کے صحف ہیں جو رجوں میں مدت وغیرہ لکھنے کے لیے مقرر ہوئے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے دوران چالیس دن تک رحم مادر میں نطفہ قیام پذیر رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت جسے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی عرصہ کے لیے وہ گوشت کے ٹکڑے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے اس کا عمل اور مدت عمر وغیرہ لکھ دیتا ہے اللہ یہ (۱)۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَذُوْنَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا وَعَشْرًا فِي يَوْمِ يُبْعَثُونَ۔

۱۔ اِنِّ يَوْمَ الْبَعْثِ یہ لبثتہم کے متعلق ہے۔ پس یہ آگیا وہ یوم حشر جس کا تم انکار کرتے تھے یعنی تم دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے اور آج تمہارے انکار کا باطل ہونا ظاہر ہو گیا ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی یہ تو حق ہے لیکن تمہاری نظر و فکر میں کمزوری تھی۔

فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَعْيُنُكُمْ وَلَا هُمْ يُسْعَفُونَ ﴿٥٢﴾

”پس اس دن نفع دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی ۱۔ اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ تو بہ کر کے اللہ کا رشتی کر لیں ۱۔“

۱۔ کوفیوں نے لَا يَنْفَعُ یام کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ لَا تَنْفَعُ پڑھا ہے۔ لیکن فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی ہے (لہذا دونوں صورتیں جائز ہیں)

۱۔ اور نہ ان سے رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ یعنی ان سے ایسی چیزیں طلب نہیں کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا سبب بنتی ہیں مثلاً تو بہ اور اطاعت وغیرہ جیسا کہ دنیا میں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ عربوں کا قول ہے (اسْتَغْنَيْنِي فَلَانَ فَأَغْنَيْنِي فَلَانًا) نے مجھ سے راضی کرنے والی چیزوں کا مطالبہ کیا تو میں نے وہ کر کے اسے راضی کر لیا۔ یا معنی یہ ہے کہ اس دن ظالموں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

راضی ہونے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جیسا کہ مومنین سے ان کی رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے ارشاد فرمائے گا کیا تم راضی ہو؟ تو وہ عرض کریں گے ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہو حالانکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمادیا ہے جو تو نے مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا تو پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ابھی میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا فرماؤں گا؟ تو وہ عرض کریں گے اس سے افضل و بہتر کیا ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا میں اپنی رضا تمہیں عطا فرماتا ہوں اور پھر اس کے بعد کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ متفق علیہ (۱) اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے وَتَسْوَفُ يَرْضَىٰ۔ (حدیث شریف کا عربی متن درج ذیل ہے)

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخَدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ هَلْ رَضِيتُمْ لِقَوْلِي وَمَا لَنَا لَا نَرْضَىٰ وَقَدْ أَغْنَيْنَا مَا لَمْ نُعْطِ أَحَدًا مِنَ الْخَلْقِ فَيَقُولُ أَنَا أُعْطِيتُكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ قَالُوا وَمَا أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ فَيَقُولُ أَجَلَ لَكُمْ وَضَوَائِي فَلَا اسْخَطُ بَعْدَهُ) متفق علیہ۔ (۱)

وَلَقَدْ صَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولُنَّ أَلَمْ يَكْفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿۳۹﴾

”اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے (بھلے) کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال لے اور اگر آپ لے آئیں ان کے پاس کوئی مثال تو (جواباً) یہی کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا نہیں ہو تم مگر باطل پرست ہو۔“

لے اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے بھلے کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال۔ یعنی ایسی طرح طرح کی حکایات جو ندرت اور غرابت میں امثال کی مثل ہیں۔ مثلاً قیامت کے دن کفار کو کیسے اٹھایا جائے گا، وہ کیا کہیں گے، ان سے کیا کہا جائے گا اور یہ کہ اس دن محذرت انہیں نفع نہیں پہنچائے گی اور وہ اس سے مستغنی بھی نہیں ہوں گے وغیرہ۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے ہر ایسی مثال بیان کر دی ہے جو انہیں توحید قیامت اور رسول کی صداقت پر متنبہ کرتی ہے۔

۳۹ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولُنَّ جِئْتُمْكُمْ بِحُجْرٍ قَدِيمٍ۔ آیت سے مراد یا تو آیات قرآن میں سے کوئی ہے۔ یا پھر اس سے مراد معجزہ ہے جیسے عصا موسیٰ علیہ السلام۔ تو جواب یہی کہیں گے جنہوں نے اپنی عبادت کی زیادتی اور قسوت قلبی کے سبب کفر کیا۔ کہ تم نہیں ہو مگر باطل پرست۔ ان کا یہ خطاب رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

”یونہی مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر جو (حق کو) نہیں جانتے۔“

لے جس طرح ہم نے ان کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگائی جنہوں نے کہا اِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو نہیں جانتے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ علم طلب ہی نہیں کرتے اور بیہودہ خرافات پر ہی اعتقاد رکھ رہتے ہیں۔ کیونکہ جہل مرکب حق کی پہچان سے مانع ہوتا ہے۔ اور حق کو جھٹلانے کا سبب بنتا ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ الْإِنِّ لَآ يُؤْتُونَ ۝

”سو آپ صبر فرمائیں بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو پھسلانہ دیں (راہ حق سے) وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔“
 لے سو آپ ان کی اذیت رسانی پر صبر فرمائیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمانے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ سچا ہے۔ اور آپ کو خفت اور اضطراب پر براعت نہ کریں یا وہ آپ کو جہالت اور گمراہی کی اتباع پر نہ ابھاریں جو تکذیب اور ایذا رسانی کے سبب یقین نہیں رکھتے۔

تفسیر کا اختتام: رجب 1206ھ۔ ترجمہ سورہ روم 28 جنوری 2000ء بروز جمعہ المبارک 11 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

www.muhammadiyah.com

www.muhammadiyah.com

سورہ لقمان

﴿ابھا ۳۳﴾ ﴿سُوْرَةُ لُقْمٰنٍ ۳۱﴾ ﴿مَرْكُوعًا ۴﴾

سورہ لقمان کی ہے، اس کی چونتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَمْ تَكُنْ اُولٰٓئِكَ الْكٰثِبِیْنَ ۝ هٰذِیْ وَرَاحَةٌ لِّلْمُحْسِنِیْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ
یُعِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِاٰخِرَتِهِمْ یُوقِنُوْنَ ۝

”الف۔ لام۔ یم یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی لہ سراپا ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لیے جسے وہ جو صحیح صحیح ادا

کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔“

لہ یہ آیتیں ایسی کتاب کی ہیں جو حکمت والی ہے۔ یا حکیم حقیقۃ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور مجازاً اس کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔ اور اُولٰٓئِكَ الْكٰثِبِیْنَ میں اضافہ معنی ہے۔

جہزہ نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ فلک کی خبر کے بعد پھر خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر مہارت یہ ہے ہی
هٰذِیْ وَرَاحَةٌ۔ اور اسے مبالغہ کے معنی پر محمول کیا جائے گا جیسے زید عدل میں ہے۔ یا پھر اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی
ذات هٰذِیْ۔ اور باتوں نے آیات سے حال بناتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُعِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اَلَّذِیْنَ ان کے احسان کا بیان ہے۔ یا پھر یہ تینوں معنی اقامۃ صلوٰۃ، ایفاء زکوٰۃ اور اہتمام آخرت احسان
کے اہم شعبے ہیں اس لیے ان کی تفصیل کے اظہار کے لیے انہیں یہاں بیان کیا گیا ہے۔ ضمیر (ہم) کو کمر و ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے
کیونکہ یہ اس کے اور اس کی خبر کے درمیان حامل ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰی هٰذِیْ قُرْءٰنٍ مَّہِیْمٍ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

”یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی توفیق سے اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں کامران ہیں لہ۔“

لہ وہی لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ وہ عقیدہ حق اور عمل صالح کو اپناتے ہوئے ہیں۔ جو میر نے حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ (گانا گانے والی) خریدی پس جب بھی وہ کسی کے بارے میں سنتا کہ وہ
اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ اسے اس مغنیہ (گانا گانے والی) کے پاس لے جاتا اور اسے کہتا اے کھلاؤ پلاؤ اور گانا وغیرہ
سنناؤ (اور ساتھ ہی اس آدنی کو کہتا) کہ جس نماز، روزے اور اپنی معیت میں قتل کرنے کی طرف محمد (ﷺ) تجھے دعوت دیتے ہیں

اس سے یہ دعوت کہیں بہتر ہے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

وَمِنَ الثَّالِثِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ
يَتَّخِذَ هَاهُنَا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ①

”اور کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوپار کرتے ہیں (مقصد حیات سے) غافل کر دینے والی باتوں کا، تاکہ بھٹکاتے رہیں
راہ خدا سے (اس کے نتائج بد سے) بے خبر ہو کر رہیں اور اس کا مذاق اڑاتے رہیں یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن
عذاب ہے۔“

لَهْوَ الْحَدِيثِ سے مراد وہ بات ہے جو نفع بخش باتوں سے غافل کر دے، یعنی ایسی جھوٹی بات جس کی کوئی اصل نہ ہو، ایسے قصے
کہاں ہیں جن کا اعتبار نہ ہو، علاوہ ازیں چٹکے (بھانسنے والی باتیں) اور فضول کلام کو کہتے ہیں۔ اس میں اضافت بیان یہ ہے، بمعنی من ہے
اگر حدیث سے مراد منکر اور بری بات ہو اور اگر اس سے مراد عام باتیں ہوں (چاہے اچھی ہوں یا بری) تو پھر اضافت جمعیت یہ بمعنی من
ہوگی۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت قریش میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے
میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک گانے والی لونڈی خریدی تھی (2)۔ علامہ بغویؒ نے ابو سلمہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ
نے فرمایا کہ گانے والی عورتوں کو (گانے) کی تعلیم دینا جائز نہیں ہے اور ان کے شمن (قیت) حرام ہیں۔ اور ایسے ہی ایک آدمی کے
بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ وَمِنَ الثَّالِثِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ الْآیۃ۔ اور جو آدمی بھی گانے کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے
اللہ تعالیٰ دو شیطان اس کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ان میں سے ایک اس کے ایک کندھے پر ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے کندھے پر اور وہ
دونوں اسے اپنی ٹانگوں کے ساتھ مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتا ہے (3)۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت ابوامامہؓ سے
روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم گانے والیوں کو نہ بیچو، نہ انہیں خریدو اور نہ انہیں تعلیم دو ان کی تجارت میں کوئی بھلائی
اور منافع نہیں ہے اور ان کے شمن حرام ہیں۔ ایسے آدمی کے بارے میں ہی یہ آیت نازل کی گئی ہے۔ وَمِنَ الثَّالِثِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ
الْحَدِيثِ (4)۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت نصر بن حارث بن مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ
تجارت کی غرض سے حیرہ میں آتا اور وہاں سے عجیبوں کے افسانے خرید کر لے جاتا اور قریش کے سامنے جا کر بیان کرتا اور ساتھ یہ کہتا
تھا کہ محمد (ﷺ) تمہارے سامنے عادی عود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں تمہیں رستم، اسفندیار اور شہنشاہان ایران کے قصے سناتا
ہوں۔ پس وہ لوگ بڑے لطف اور مزے سے اس کی باتیں سنتے تھے اور قرآن کریم سننا چھوڑ دیتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت
کریمہ نازل فرمائی (5)۔ اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی
ہے کہ مجاہد نے کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيثِ سے مراد گانے والی عورتیں اور گانے والے مرد ہیں اس صورت میں لَهْوَ الْحَدِيثِ سے پہلے
مضاف محذوف ہوگا اور وہ ذات یا ذمہ ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا جو بیوپار کرتے ہیں غافل کر دینے والی باتیں کرنے والیوں یا دلوں کا کیا
مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ کا معنی ہوگا نواگاہ اور ان کے آلات قرآن کے بدلے خریدتے یا انہیں پسند کرتے ہیں۔ (6) (یعنی جو قرآن

2- تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 41 (الامریہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (انتھاریہ)

6- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (انتھاریہ)

1- الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 307 (اعلیہ)

3- جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (دارت التعلیم)

5- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (انتھاریہ)

پر انہیں ترجیح دیتے ہیں۔

مکحول کا قول ہے کہ جس کسی نے گانے والی کو خرید ا تا کہ وہ اپنے گانے بجانے کے سبب اسے نفع پہنچائے اور پھر وہ اپنی اسی حالت پر قائم رہا یہاں تک کہ مر گیا تو میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَ هِيَ الْقَائِمُ مِّنْ يُشْثَوْنَ لَهٗوِ الْحَوِيْثِ الْاِی۔ (1)

حضرت ابن مسعود، ابن عباس، حسن، مکرّمہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم تمام نے یہ کہا ہے کہ لَهٗوِ الْحَوِيْثِ سے مراد گانا سننا اور گانا ہے اور یہ آیت بھی اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابوالصمبہاء الکبریٰ نے کہا ہے میں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا اس سے مراد گانا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں آپ نے یہ جواب تین بار دہرایا۔

ابن جریر نے کہا ہے لَهٗوِ الْحَوِيْثِ سے مراد طبل (ذھول، طبلہ) ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ نص وارد ہونے کا سبب اگرچہ خاص ہے اور وہ گانا سننا یا غمیں کے قصے اور افسانے ہیں لیکن لفظ عام ہے۔ اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ اسی وجہ سے قتادہ نے کہا ہے کہ لَهٗوِ الْحَوِيْثِ سے مراد ہر بود و لعب ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ (3)

مسئلہ: فقہاء (۱) کا اس پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی (سرنگی، باجا، طبلہ، اور ذھول وغیرہ) بھانا حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کتے کی قیمت اور بانسری وغیرہ کی کمائی سے منع کیا ہے۔ اسے بغوی نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت ابومالک اشجری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنائیں کہ امت میں سے لوگ شراب پینے لگے اور اسے نام اس کے علاوہ کچھ اور دیں گے اور ان کے پاس باجے بجائے جائیں گے (5)۔ گانے والیاں گانے لگیں گی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمین میں وھنسا دے گا اور انہیں بندر اور زنجیر بٹھا دے گا۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرنے لگے گی تو اس پر بلائیں اور مہیشیں اترنے لگیں گی۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا (1) جب مال نفیست کو دولت سمجھا جائے گا (2) جب امانت کے مال کو مال غنیمت تصور کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (اتحاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (اتحاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (اتحاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (اتحاریہ) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 409 (مندیہ)

(۱) ایضاً میں ہے کہ باجا بھانا اور سننا حرام ہے۔ اور قتادہ کی گہری میں ہے کہ طبل (ذھول) بھانا اور سننا حرام ہے کیونکہ یہ آلات کلبوں سے ہے۔ البتہ جگہ کی اطلاع اور قافلہ کی آمد پر ذھول بھانا بھانا ہے۔ کیونکہ اس میں مہاجرین اور قافلہ کے رفقاء کو اطلاع مقصود ہوتی ہے اور وہ باعث ثواب ہے۔ اور مسئلہ میں ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ کی تقریب میں گانا گانے میں کوئی حرج نہیں کیا آپ دیکھتے نہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ یہ بھی باہمی ایک قسم ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ باعث حرج نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد نکاح کا اظہار اور اعلان ہوتا ہے۔ اور اس کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا اَغْلِقُوْا الدِّبَاغَ وَ فُلُوْا بِالذِّفِّ (اعلان نکاح کرو اگرچہ دف کے ساتھ ہی ہو) اور توئی اسی پر ہے۔ اور ذخیرہ میں ہے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عیدوں کے دنوں میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن اپنے کاشانہ اقدس میں تشریف فرماتھے کہ گھر کی دیوار کے پاس دو دو عمر لکھاں دف بجا کر گاتی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے انہیں فرمایا کیا تم رسول اللہ ﷺ کے گھر کی دیوار کے پاس گاتی ہو؟ تو حضور نبی کریم صلیہ الصلوٰۃ و السلام نے فرمایا نہیں چھوڑ دو۔ آج عید کا دن ہے۔ (ازمضر قدس سرہ)

جائے گا (3) جب زکوٰۃ کو بخشی اور جرمانہ سمجھا جائے گا (4) جب مرد اپنی بیوی کا مطیع و فرمانبردار ہو جائے گا (5) اور اپنی ماں کا نافرمان ہو گا (6) اپنے دوست سے اچھا سلوک کرے گا (7) اور اپنے باپ سے ظلم و زیادتی کرے گا (8) جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں گی (9) جب قوم کا سرداران میں سے رذیل اور سب سے گھٹیا آدمی ہوگا (10) جب کسی آدمی کی تکبر میں اس کے شر سے بچنے کے لیے ہو گی (11) جب شراب پی جائے گی (12) اور ریشم پہنا جائے گا (13) جب گانے والیاں رکھی جائیں گی (14) باجے اور دیگر آلات بجائے جائیں گے (15) اور اس امت میں پیچھے آنے والے لوگ اس کے پہلے آنے والے لوگوں (اسلاف) پر لعنت بھیجیں گے۔ پس ایسے حالات میں لوگوں کو چاہئے کہ وہ سرخ آندھی، زمین میں دھسائے جانے اور صورتیں مسخ ہونے کا انتظار کریں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ (1)

مسئلہ: فقہاء نے کہا ہے کہ اس آیت طیبہ اور ان احادیث کے مطابق جو ہم نے ذکر کی ہیں گناہ حرام ہے کیونکہ یہ لہو الحدیث ہے۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ ایسا آدمی جس کا دل ذکر الہی سے مطمئن ہو، یاد الہی میں مصروف ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو، گانے والا شہوت کا محل اور باعث نہ ہو، مجلس اغیار سے خالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نماز یا کسی طرح کی کسی اور عبادت کا وقت بھی نہ ہو تو اس صورت میں ایسے افراد کے لیے سماع جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ سماع میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے سبب دل میں مستور تجدد آتش محبت بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہی عوام الناس کے حق میں سماع کے حرام ہونے کا سبب ہے کیونکہ عوام کے دل عورتوں اور بچوں (اور لڑکوں) کی محبت میں مشغول و مصروف ہوتے ہیں۔ پس سماع کے وقت وہ محبت مشتعل ہو جاتی ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ ان کے حق میں لہو الحدیث ہے۔ اور وہ آدمی جس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی یاد میں مشغول ہو اور غیر اللہ سے فارغ نہ ہو تو اس کے حق میں سماع محبت الہی کو تیز تر کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ پس ایسے آدمی کے حق میں یہ مستحب (۱) ہے۔

۱۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 44 (وزارت تعلیم)

(۱) شرح کافی میں ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک وہ سماع مکروہ ہے جو لوہب کے لیے اور گناہ کے ارادے سے ہو اس طرح کہ بہت سے فاسق لوگ اس کے لیے اکٹھے ہوں اور اس کے لیے وہ نماز اور قرأت قرآن کو بھی ترک کر دیں۔ اور اگر اجتماع ایسے صالحین اور متقی لوگوں کا ہو جو نماز کے پابند بھی ہوں اور قرأت قرآن کے تارک بھی نہ ہوں تو ان کے لیے سماع حلال ہے اور اس میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف نہیں۔ جبکہ وہ اس سے تو باری اللہ اور اس کی باگاہ کی حاضری کا قصد کرتے ہوں۔ یہ تمام امور قابل تعریف ہیں مذموم نہیں۔ اس صورت میں وہ دھو دھو قس قابل خدمت ہیں۔ اور انور کی شرح پروردی معصفہ ابوالقاسم بن محمد بن عبد اللہ دمشقی میں ہے کہ سماع کے بارے میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ پس ایسا سماع جو لوہب کی طرز پر ہو، فاسق لوگ جمع ہوتے ہوں، وہ شراب پیتے ہوں اور نماز کے تارک ہوں تو ان کے لیے یہ حرام ہے۔ اور اگر ایسے لوگ سماع میں جو صالح اور متقی ہوں، ہمیشہ نماز کے پابند ہوں اور اوراد و وظائف اور قرأت قرآن کے تارک نہ ہوں تو ان کے لیے حلال ہے۔ اس پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ یہی حکم وجد اور قس کا بھی ہے۔ الا قاسم میں ہے کہ سماع سے رقت قلب اور خشوع حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شوق بڑھتا ہے، اس کی ناراضگی اور طرباب سے خوف آنے لگتا ہے اور یہ انکی باگاہ کا قرب و عطا فرماتا ہے۔ پس جب سماع اس طرح ہو تو اس میں لہو اور خواہشات نفسانی کا شائبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے العوارف میں ذکر کیا ہے کہ سماع اللہ کی رحمت کو سمجھنے لاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ملائی الکلام میں ہے کہ یہ جائز ضروری ہے کہ عام مشائخ کے نزدیک کسی غیر کو مانوس کرنے کے لیے گانا کا مکروہ ہے اور بعض نے شادی اور خوشی کے مواقع پر اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک اپنی ذاتی وحشت اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے گانا مکروہ نہیں ہے۔ انام سرخس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک سماع مکروہ ہے۔ جبکہ لوہب کی طرز پر ہو۔ اور بعض علماء کا خیال ہے گانے کی تمام صورتیں مکروہ ہیں۔ امام خواہر زادہ کا نظریہ یہی ہے۔ (جاری ہے)

سماح کی حرمت کے بارے میں مذکورہ نصوص کا جواب یہ ہے کہ آیت طہ نے لَقَدْ اَوْفَوْا بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ کا سماح لَقَدْ اَوْفَوْا بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ نہیں ہے۔ اور وہ احادیث جو غناء کی حرمت کو ثابت کرتی ہیں وہ مخصوص عند البعض ہیں کیونکہ ایسی دوسری احادیث بھی موجود ہیں جو سماح کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا ہم نے ان احادیث کو جن میں حرمت غناء مذکور ہے کو ایسے سماح پر محمول کیا ہے جو طہ و طہ کے ارادہ سے ہو، کوئی شرعی مقصد نہ ہو اور وہ فسق کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ پس اب ہم وہ احادیث ذکر کریں گے جو غناء کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں بلکہ دف بجانا بھی مباح قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ ربیع بنت معوذ بن عمرو رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب میری شادی ہوئی تو اس دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے بستر پر ایسے تشریف فرما ہوئے جیسے تم میرے قریب بیٹھے ہوئے ہو۔ پس ہمارے ہاں کچھ بچیاں دف بجائے لگیں اور آباؤ میں سے ان کا مرثیہ کہنے لگیں جو یوم بدر کو مقتول ہوئے تھے تو اسی دوران ان میں سے ایک لڑکی نے کہا وَفِينَا نِسَاءٌ يَعْلَمْنَ مَا فِي غَدٍ (اور ہمارے درمیان ایک ایسی بی بی ہیں جو آئندہ کل ہونے والے واقعات کا علم رکھتے ہیں) تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دے اور جو کچھ پہلے کہہ رہی تھی وہی کہہ۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (۱)۔ اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تم اس طرح نہ کہو کیونکہ آئندہ کل کی باتیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے انصار میں سے ایک آدمی کے ساتھ شادی کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھ لو (گائے بجانے) کا اظہار نہیں ہے۔ حالانکہ انصار کو تو لھو پسند ہوتا ہے۔ (رواہ البخاری ۲)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان کرو، مساجد میں کرو اور اس پر دف بجاؤ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے (۳)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی ایک بچی تھی میں نے اس کی شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! کیا تو تمہیں گائے گی انصار کا یہ قبیلہ تو غناء کو پسند کرتا ہے۔ اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک قرابت دار لڑکی کی شادی انصار میں سے کسی سے کی، تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نے دو شیئہ کو کچھ تحائف بھی دیئے ہے۔ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی گائے والی بھی بھیجی ہے۔ تو حضرت عائشہ نے عرض کی نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک انصار تو ایسی قوم ہے جس میں غناء پسند ہے۔ پس اگر تم اس کے ساتھ کوئی ایسے بھیج دو جی جو یہ گیت جا کر گاتے اَتَيْنَاكُمْ فَخِينَا وَحَيَاتُكُمْ (تو اچھا ہوتا) (تم تمہارے پاس آئی ہیں پس یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد ۲ صفحہ 775 (دورات تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (دورات تعلیم)

گزشتہ سے چوست

اور جامع المغیرات میں النافع اور الذخیرہ کے حوالے سے ہے کہ اگر گانے والا کسی دوسرے کو نہ سناے بلکہ صرف اپنے آپ سے ہی وحشت دور کرنے کے لیے گائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور کہا ہے کہ میں نے الامام ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ اگر وہ اپنی لونڈی سے بھی اس مقصد کے لیے تو سماح اس کی اس کے لیے مباح ہے۔ انہوں نے اس کی اس قول کی نسبت واقعات حساسہ کی طرف کی ہے۔ اور عوارف میں اپنی لونڈی یا اپنی بیوی مذکور ہے۔ جیسا کہ قادی ابراہیم شامی میں ہے۔ اور الحلیہ میں ہے کہ امام محمد نے السیر الکبیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اپنے بھائی براء بن مالک کے پاس گئے تو اس وقت وہ گارے تھے۔ (ازمیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ہمارے لیے بھی مبارک ہو اور تمہارے لیے بھی مبارک ہو) رواہ ابن ماجہ (1)۔ عامر بن سعد نے کہا ہے کہ میں ایک شادی میں شامل ہوا اور وہاں قرظ بن کعب اور ابو سعود انصاری بھی تھے اور اس وقت چند بچیاں گاری تھیں۔ تو میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور اسے اہل بدر! کیا تمہارے پاس یہ کچھ کیا جا رہا ہے؟ تو ان دونوں نے مجھے کہا اگر چاہے تو بیٹھ جا اور ہمارے ساتھ تو بھی سن۔ اور اگر چاہے تو واپس چلا جا۔ کیونکہ شادی کے موقع پر ہمیں گمان کا شے کی رخصت دی گئی ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ میرے پاس تشریف لائے۔ یہ ایام منیٰ یعنی عید کے دن تھے۔ میرے پاس بیٹھ کر دوڑکیاں دف بجاری تھیں اور حضور نبی کریم ﷺ کپڑا لے کر استراحت فرما تھے۔ پس ابوبکر صدیقؓ نے ان دونوں لڑکیوں کو جھڑکا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رخِ زیبا سے کپڑا اتارا اور فرمایا ابوبکر! انہیں رہنے دو کیونکہ یہ عید کے ایام ہیں۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ اور ابن ماجہ میں ہے۔ بے شک ہر قوم کے لیے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے (3)۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ میں (آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں) آپ کے سر پر (یعنی آپ کے پاس) کوف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (4)۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی نذر جس میں اللہ تعالیٰ کی حکم کی نافرمانی ہو اسے پورا نہ کیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور بنی نجار میں اترے تو بنی نجار کی بچیاں یہ شعر گانے لگیں۔

نَحْنُ جَوَاوُزٌ مِّنْ بَنِي نَجَّارٍ يَا حَبِذَا مُحَمَّدًا مِّنْ جَبَّارٍ

(ہم بنی نجار کی بچیاں ہیں۔ محمد ﷺ بہت اچھے پردی ہیں) (6)۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے بے شک میں تم سے محبت رکھتا ہوں امام بخاری نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو عورتیں، بچیاں اور بچے یہ شعر گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ قِيَابِ الْوَدَاعِ

وَجَبَّ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَىٰ إِلَهُ دَاعٍ

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جَنَّتْ بِالْأَمْرِ الْمَطَاعِ

(ہم پر وداع کی گھائیوں سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔ جب تک کوئی اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے والا باقی رہا ہم پر وداع ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اسے ہم میں مبعوث ہونے والے نبی! ﷺ آپ ایسے احکام لے کر تشریف لائے جن کی پیروی لازم ہے) (7)۔ امام احمدؓ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں حبشیوں نے چھوٹے چھوٹے نیزوں کا کھیل پیش کیا (8)۔ محمد بن حاطبؓ جی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال و حرام کے مابین فرق کرنے کے لیے نکاح کے وقت دف بجانا اور گیت گانا ہے (9)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (اعلیٰ)	2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)	3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (اعلیٰ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 469 (نور محمد)	5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 45 (وزارت تعلیم)	6۔ سنن البیہقی دار الشرا، جلد 3 صفحہ 274 (اعلیٰ)
7۔ سنن البیہقی دار الشرا، جلد 3 صفحہ 271 (اعلیٰ)	8۔ سنن البیہقی دار الشرا، جلد 3 صفحہ 271 (اعلیٰ)	9۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (وزارت تعلیم)

ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پس مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوا کہ وہ غناء حرام ہے جو فسق کی دعوت دیتا ہو اور یا دلہی سے غافل کرتا ہو۔ اور جو غناء اس طرح نہ ہو وہ حرام نہیں۔ مگر تقرب الی اللہ کے لیے غناء کا سماع نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے۔ اسی لیے سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین نے اسے پسند نہیں کیا۔ اگرچہ انہوں نے سماع کا انکار بھی نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

مع تا کہ لوگوں کو بھڑکاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین سے یا اس کے ذکر اور کتاب کی قرأت سے ابن کثیر اور ابو عمرو نے فیض صیف مجرد کی صورت میں بناء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ اپنی گمراہی پر ڈٹا رہتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

اس شخص کی حالت سے بے خبر ہو کر جسے وہ خریدتا ہے یا وہ اس تجارت کی کیفیت سے بے خبر ہے جس کے سبب اس نے قرأت قرآن کے بجائے لہو لعب کو اختیار کر لیا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کسی آدمی کی گمراہی کے لیے یہی کافی ہے کہ باطل اور غلط بات کو حق اور سچی بات پر ترجیح دے۔

جہ اور وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنالے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے یَتَّخِذُ کَالْبَهْلُیِّ پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے یُفْشِرُ بَنی پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ هُزُوا مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی هُزُوا بمعنی مہزوا بہ یعنی جس سے مذاق کیا جائے) یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

وَإِذَا تَثَلَّى عَلَيْهِ الْإِنْسَانُ وَلَّى مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۖ

فَيَسْتَكْبِرُ لِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝

”اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اسے ہماری آیتیں تو منہ پھیر لیتا ہے تکبر کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں۔

جیسے اس کے دونوں کان بہرے ہیں۔ سو آپ اسے دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیں۔“

لہ اور جب اسے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کی طرف تکبر کرتے ہوئے توجہ نہیں کرتا۔ اس جملہ شرطیہ کا عطف یُفْشِرُ بَنی پر ہے اور گان لَمْ يَسْمَعْهَا یہ وُلَّى مُسْتَكْبِرًا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستأنف ہے۔

مَلْ لَّذُنْبِهِ کو نافع نے جنس کے ارادہ پر مفر دلفظ کی صورت میں اَذْنِبْ پڑھا ہے۔ اور ”وَقْرًا“ سے مراد ایسا بو جھ ہے جو سننے سے مانع ہو۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ گان لَمْ يَسْمَعْهَا سے بدل ہے یا لَمْ يَسْمَعْهَا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستأنف ہے۔

اسے آپ اسے دردناک عذاب کی خبر دے دیں جس کے سبب وہ برباد ہو جائے گا۔ یہاں بشارت اور خوشخبری کا ذکر استہزاء اور حکم کے طور پر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا

وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ

رہیں گے۔ اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے۔ اور وہی سب پر غالب بڑا دانہ ہے۔“

لہ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں۔ جنت العظیم اصل میں نعم البہات

ہے اس میں تبدیلی مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔

جَنَّتْ خَلِيلَيْنِ فَيَقَا - لَهِمَّ كَيْفَ تَمِيرُ سِرَ حَالِ مَقْدَرٍ هِيَ يَاجِنَاتُ - اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس کے متعلق لام ہے۔ یعنی جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اس میں ان کا ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے۔

سے یعنی وعد اللہ وعداً (اللہ تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے)۔ اس میں وعدا باقل مذکور وعدہ کی تاکید کے لیے ہے۔ ”حقاً“ کا مفہوم ہے وہ وعدہ بالکل حق ہے۔ حقاً مصدر اپنے غیر کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ وعدے کا حق ہونا نفس وعدہ کا مغاڑ ہے۔

سے اور وہی ہر شے پر غالب ہے۔ کوئی شے اسے اپنا وعدہ اور وعید پورا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ وہی فعل کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ أَلْفَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَا سِیٰ أَنْ تَقْبِلَ بِكُمْ وَبَتْ

فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَ أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَاسِيمٍ ①

”اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اے ستاروں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو۔ اور کھڑے کر دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین ڈولتی نہ رہے ساتھ ساتھ اسے آسمان سے پانی اتارا۔ پس اگائے ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے سے۔“

لے خَلَقَ السَّمَوَاتِ - الحکیم کی صفت ہے اور اس سے پہلے اسم موصول محذوف ہے فقیر کلام ہے اللہی خلق یا پھر اس میں ضمیر مستتر سے حال ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یا پھر کل تعلیل میں جملہ مستأنفہ ہے۔

سے تَرَوْنَهَا کا جملہ عقید کی صفت ہے۔ اور ضمیر اسی کی طرف راجع ہے۔ اور وہ کج فرما رہا ہے کہ ان کے لیے بالکل کوئی ستون نہیں۔ یا ضمیر کا مرجع السموات ہے اور جملہ کا ترکیب میں کوئی گل نہیں ہے یہ مفہوم سورہ رعد میں گذر چکا ہے۔

سے تَرَوْنَهَا سے مراد زمین میں مضبوط گڑھے ہوئے پہاڑ ہیں۔ اَنْ تَقْبِلَ بِكُمْ یہ عبارت ہے لان لا تمید بکم تاکہ وہ تمہارے ساتھ ڈولتی نہ رہے۔

سے اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے اگائے۔ یعنی ہر اچھی اور کثیر المنفعہ نوع سے۔ اس میں غیب سے تکلم کی طرف التفات ہے۔ گویا اس سے اس کے غلبے پر استدلال ہے کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے اور اس کی حکمت پر استدلال ہے جو کہ کمال علم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سے تو حید کی بنیاد کو ہموار کیا اور اپنے اس قول کے ساتھ اسے مضبوط اور پختہ کیا۔ یعنی یہ جو میں نے ذکر کیا ہے تم اسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

هٰذَا خَلَقَ اللَّهُ فَاكْرُوْنِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِي مِنْ دُونِهِ ۚ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ②

”یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکوں!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو، کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں) لے مگر یہ

ظالم کھلی گمراہی میں ہیں س۔“

لے فَاكْرُوْنِي میں فاء سیبہ ہے۔ یعنی جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ تو اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ پس اے مشرکوں! تم دکھاؤ تمہارے معبودوں نے

کیا پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہونے کے مستحق ہو گئے۔ ترکیب کلام میں مآذا یا تو خلق کے سبب منصوب ہے۔ یا بنا استفہام انکاری کے لیے مبتدا ہے اور ذا بمعنی الذی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ فانزونی مطلق عن العمل ہے (یعنی یہ فعل قلب تعلق کے باب سے ہے) اور اس کا مابعد و مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

ج۔ (مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں) یہ اضطراب ان پر ایسی گمراہی کی مہر ثبت کرنے کے لیے ہے جو کسی معمولی غور و فکر کرنے والے پر بھی محفی نہیں۔ اس میں الظالمون اسم ظاہر ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ غلطی کسی کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اسْكُرْ لِلَّهِ ۖ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ

مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

”اور ہم نے عنایت فرمائی لقمان کو ۱۔ حکمت (ودانائی) ۲۔ اور فرمایا اللہ کا شکر ادا کرو ۳۔ اور جو شکر ادا کرتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے ہمنے کے لیے ۴۔ اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے عید ہے ۵۔“

۱۔ علامہ بغویؒ نے لقمان کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا ہے لقمان بن باعور بن ناخور بن تارخ اور بنی تارخ ازرق تھا۔ اور مزید کہا کہ وہ ب کا قول ہے لقمان حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ اور مقابل نے ذکر کیا کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے (۱)۔ اور علامہ بیضاویؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ لقمان زندہ رہے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پایا اور پھر ان سے علم حاصل کیا وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بیعت سے غل فتویٰ دیا کرتے تھے (۲)۔ مگر آپ علیہ السلام کی بیعت کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ میں قاعد اختیار نہ کروں جب میں قاعدت اختیار کر سکتا ہوں (کیا میں فتویٰ دینے سے باز نہ رہوں جبکہ میں اس سے بے نیاز ہو سکتا ہوں)۔ (واقفی نے کہا ہے کہ لقمان بنی اسرائیل کے قاضی تھے (۳)۔ اور درمنثور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ اور احمد نے الزہری میں، ابن ابی الدنیا نے کتاب المسلمین میں، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھتی ہوئی (۴)۔ اسی طرح علامہ بغویؒ نے خالد الریسی سے نقل کیا ہے۔ اور مزید کہا کہ مجاہد نے کہا ہے لقمان غلام تھے۔ ان کی رحمت سیاہ تھی، ہونٹ بڑے بڑے تھے اور ان کے پاؤں پھٹے رہتے تھے (۵)۔ اور حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ لقمان درزنی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ریوڑ (بھیمڑ بکریاں) چرایا کرتے تھے (۶)۔ واللہ اعلم۔

۲۔ قاسموس میں ہے کہ حکمت سے مراد عدل و انصاف علم، حلم (بردباری) نبوت، قرآن کریم اور انجیل سب ہو سکتے ہیں (۷)۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اِنْ مِنْ الشَّيْءِ لِحِكْمَةٍ مِّنْ عِلْمِیْ سِوَا الَّذِیْ اَوْحٰی اِلَیْکَ اِنَّکَ لَکَرِیْمٌ کے ارشاد آلا وظفی زائیدہ جگہ میں حکمت سے مراد عقل ہے۔ یہ مقام مذکورہ معانی میں سے تمام کا احتمال رکھتا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے لقمان حکیم تھے، یعنی آپ فقیہ عالم تھے نبی نہیں تھے۔ مگر حکمران نے کہا ہے کہ آپ نبی تھے۔ لیکن حکمران اپنے اس قول میں منفرد ہیں (۸)۔ ابن ابی حاتم نے وہب بن منبہ سے یہ روایت کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا لقمان نبی تھے تو انہوں نے کہا نہیں۔

- 1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
- 2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5 صفحہ 415 (اعلیہ)
- 3- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
- 4- الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 310 (اعلیہ)
- 5- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
- 6- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
- 7- القاسموس اکیلیہ، جلد 2 صفحہ 444 (التراب العربی)
- 8- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)

ان کی طرف دینی نہیں سمجھی گئی بلکہ وہ حکیم (دانا) آدمی تھے۔ اسی طرح ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لقمان کو نبوت اور حکمت کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو انہوں نے حکمت کو اختیار (پسند) کیا۔ علامہ بغنوی نے لکھا ہے یہ بھی مروی ہے کہ آپ دو پہر کے وقت سو رہے تھے تو غیب سے آواز دی گئی اے لقمان! کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں تجھے خلیفہ بنادے اور آپ لوگوں کے درمیان حق کے فیصلہ کریں۔ تو آپ نے اس نفی آواز کا جواب دیتے ہوئے کہا اگر میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے تو پھر تو میں نے عافیت کو اختیار کیا۔ (یعنی مجھے لوگوں کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں)۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اس کا قطعی فیصلہ اور ارادہ فرمایا ہے تو پھر امانا و صدقنا سر تسلیم خم۔ کیونکہ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ضرور میری معاونت بھی فرمائے گا اور غلطی سے میری حفاظت بھی فرمائے گا۔ یہ سن کر ان ملائکہ نے بلند آواز سے کہا جنہیں وہ دیکھ نہیں رہے تھے اے لقمان! تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو آپ نے کہا کیونکہ سخت ترین اور مبہم مقامات پر فیصلہ ہر جانب سے ظلم و زیادتی سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر لقمان نے اپنی چھان بین اور جستجو سے صحیح فیصلہ کیا تو وہ نجات پائے گا اور اگر اس نے خطا کا ارتکاب کیا تو گویا اس نے جنت کا راستہ کھودیا۔ اور جو دنیا میں عاجز اور حقیر بنا کر رہتا ہے وہ اس سے بہتر ہوتا ہے جو سردار اور بڑا بن کر رہے۔ اور جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کرتا ہے دنیا اس سے ضائع ہو جاتی ہے اور وہ آخرت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پس ملائکہ آپ کے حسن گفتگو سے بہت تعجب ہوئے۔ پس آپ ابھی فینک کی حالت میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرمادی۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ حکیمانہ گفتگو فرمانے لگے۔ پھر اس کے بعد داؤد علیہ السلام کو آواز دی گئی تو آپ نے اسے قبول کر لیا اور لقمان کی طرح آپ نے کوئی شرط عائد نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی بار خطا میں واقع ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ہر بار آپ کو معاف فرمایا۔ اور لقمان اپنی حکمت کے ساتھ ان کی مدد کرتے تھے (۲)۔ یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حکمت سے مراد لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں عدل کرنا نہیں۔ البتہ حکمت کی تفسیر میں علامہ جزری نے انتہاء میں لکھی ہے وہ انتہائی عمدہ ہے کہ حکمت سے مراد افضل ترین علم کے ساتھ سب سے افضل شے کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمام چیزوں میں سے افضل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ خود رب کریم نے ارشاد فرمایا لیس گیشہ شہیۃ۔ اور مزید ارشاد فرمایا آئی تھی ہا آذیہ شہادۃ قل اللہ اور افضل ترین علم وہ ہے جس پر غفلت طاری نہ ہو اور وہ علم حضوری ہے۔ کیونکہ علم حصولی غفلت سے بچ نہیں سکتا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ علم حصولی کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو جاننا ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ علم حصولی سے مراد وہی ہے جس کی صورت کا آتا ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات صورت اور کسی چیز میں ہونے سے مبرا و مزہ ہے۔ بلکہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے وہ علم حضوری سے بھی فائق اور اعلیٰ ہے۔ اور وہ علم حضوری جو عالم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اس کی نسبت اس کے علم کے ساتھ ایسے ہی ہے جو علم حصولی کو علم حضوری کے ساتھ ہے۔ اور وہ علم قلب انسانی کے خصائص میں سے ہے۔ اسی وجہ سے حدیث قدسی میں ہے "لَا يَسْغِي أَوْحِي وَلَا مَسْمُوعِي وَلَكِنْ يَسْغِي قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ" (میری زمین اور آسمان میری وسعت نہیں رکھتے) (یعنی وہ مجھے اپنے اندر نہیں سما سکتے) لیکن بندہ مومن کا دل میری وسعت رکھتا ہے (یعنی وہ مجھے اپنے اندر سما سکتا ہے) اور وہ علم اولیا اللہ میں سے اخص الخواص کو حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حاکم اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ لقمان حضرت داؤد علیہ السلام کے غلام تھے۔ وہ

زر ہیں بتاتے رہے لیکن آپ نے ان سے ان کے بارے کچھ نہ پوچھا۔ پس جب آپ مکمل کر چکے تو اسے پہن کر فرمایا نِعْمَ لِبُنِیْسٍ الْمُخْرُوبِ اَنْتَ (تو بہت اچھا جنگی لباس ہے)۔ تو یہ سن کر لقمان نے کہا اَلْصُّنْتُ حِجْمَةٌ وَفَلَّیْلٌ فَاعْلَمْتُ (۱)۔ (خاموشی حکمت ہے اور اسے اختیار کرنے والے قلیل ہیں)۔ یہ روایت بھی ہے کہ لقمان نے پوچھا گیا لوگوں میں سے کون زیادہ برا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا وہ آدمی جو یہ پروا نہیں کرتا کہ لوگ اسے برائی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ابن ابی شیبہ، احمد اور ابن جریر نے خالد الربیعی سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھی کا پیشہ کرتے تھے تو ایک دن آقا نے آپ کو کہا ایک بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت میں سے پاکیزہ ترین دو بونیاں میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ آپ زبان اور دل لے کر آئے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اس نے پھر وہی حکم دیا اور کہا کہ اب کی بار غلیظ ترین دو بونیاں لے کر آؤ۔ چنانچہ آپ پھر وہی (زبان اور دل) لے کر آئے۔ تو اب اس نے ان کے بارے پوچھا تو آپ نے کہا جب یہ دونوں پاک اور صاف ہوں تو یہ تمام سے اچھے اور اعلیٰ ہیں اور جب یہ دونوں ناپاک اور غلیظ ہوں تو تمام سے بڑھ کر ناپاک اور نجس ہیں۔ (2)

۱۔ ظاہر یہی ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے اور ہم نے لقمان کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو حکمت عطا فرمائی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ انی مفسر دے کیونکہ ایسا حکمت میں قول کا معنی موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ ایسا حکمت سے مراد حکمت کی تعلیم ہے اور تعلیم اکثر قول کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ لہذا اَلْصُّنْتُ اَلْحِجْمَةُ کا معنی ہے ہم نے اسے شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حکمت سے مراد شکر ہے اور ایسا اَلْحِجْمَةُ کا معنی ہے شکر ادا کرنے کا حکم دینا۔ اور اس سے مراد امر نیکوئی ہے نہ کہ تکلیفی۔ کیونکہ امر نیکوئی تو لقمان اور آپ کے سوا تمام کو شامل ہے اور وہ حصول شکر کو مستلزم نہیں، بخلاف امر نیکوئی کے کہ وہ حصول شکر کو مستلزم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایسا حکمت حصول حکمت کو مستلزم ہے۔ اور حکمت پر معنی شکر کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ شکر حکمت کو لازم ہے (اور حکمت شکر کے لیے ملزم ہے) اور مبالغہ کے طور پر لازم اور ملزم میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر کرنا مجازاً جائز ہوتا ہے۔ شکر سے مراد نعمت کا اظہار کرنا ہے اور اس کی ضد کفران ہے اور اس کا معنی نعمت کو چھپانا ہے۔ قاصدوں میں ہے کہ شکر کا معنی احسان کی پہچان اور عرفان حاصل کرنا ہے (3)۔ یہی بھی کہا گیا ہے کہ شکر خشو سے منقلب ہے (یعنی یہ اصل میں خشو تھا پھر اس کے پہلے دو حرفوں میں تقدیر دتا خیر کر کے شکر بنا دیا گیا)۔ خشو کا معنی کھلنا اور ظاہر کرنا ہے۔ اور شکر میں بھی نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔ شکر کی تین قسمیں ہیں (۱) شکر بالقلب ہے یعنی دل سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت کا تصور کرنا ہے۔ (۲) شکر باللسان۔ یعنی زبان سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت پر عطا فرمانے والے کا زبان سے شکر ادا کرنا اور اس کی مدح کرنا ہے۔ (۳) شکر بالجوارح یعنی اعضاء جسمانی سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد نعمت کے بدلے منعم کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکر اصل میں عین خشو سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد مجرا ہوا چشمہ ہے۔ اس اصل کی بناء پر شکر کا معنی ہے منعم اور اس کی نعمتوں کی یاد سے بھر جانا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَفَلَّیْلٌ فَبِیْنِ عِبَادِیَ الشُّكْرُ وَاللَّهْوَ اللّٰہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندوں میں سے دو کو وصف شکر کے ساتھ متعطف فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے فرمایا شُكْرًا لِّمَا یُشْكِرُ اَللّٰہ تعالیٰ نے نفعہ اور دوسرے نوح علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے ارشاد فرمایا ہُوَ اَمَّا کَانَ عَبْدًا لِّاٰمَنُوْا۔ علامہ جزری نے انہما میں کہا ہے کہ نعمت کے مقابلہ میں شکر بالقول بھی ہوتا ہے، بالفعل بھی اور بالبیعہ بھی۔ چنانچہ منعم کی

تعریف زبان سے بھی کرنی چاہیے (یہ شکر بالقول ہے) اور شکر گزار کو چاہیے کہ وہ منعم کی اطاعت و فرمانبرداری میں اپنے نفس کو جھکا دے (اعضائے جسمانی کو اس کا تابع فرمان کر دے یہ شکر بالفعل ہے) اور ساتھ ہی یہ اعتقاد بھی رکھے کہ منعم ہی آقا و مولیٰ ہے (اور یہ شکر بالبدن ہے) اور لفظ شکر شکرت الاصل شکر سے ماخوذ ہے۔ یعنی جب اونٹ چراگاہ پہنچے اور چرنے کے سبب خوب موٹا ہو جائے (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: اور ہم نے اسے کہا کہ جو ہم نے آپ کو حکمت اور اس کے سوا دیگر نعمتیں عطا فرمائیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے (وَقُلْنَا لَهُ اِنَّ الشُّكْرَ لِلّٰهِ عَلٰی مَا اَتَيْنَاكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَغَيْرِهَا)۔

جہ اور جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہے، جو نعمت موجود نہیں اس کے حصول کا ذریعہ ہے، معبود حقیقی پروردگار کے قرب کا موجب ہے اور دار الخلود میں باعث ثواب ہے (فَإِنَّ الشُّكْرَ قَبْدٌ لِّمَنْ جُودٌ وَصِدَّةٌ لِّمَنْفَعَةٍ وَمُوجِبٌ تَقَرُّبٍ إِلَى الرَّبِّ الْمَغْبُودِ وَثَوَابٍ لِّىْ ذَاوِ الْخُلُودِ) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَنْبَنَ شُكْرُكُمْ لَا يَبْلُغُنَّ

یہ اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا اور اللہ تعالیٰ شکر کے لیے اس کا محتاج نہیں ہے۔ (البتہ) وہ حمد و ستائش کا حق رکھتا ہے اور اگر وہ اس کی حمد نہیں کرتا تو تمام مخلوق اپنی زبان حال سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمَنُ لِّبَنِيهِ هُوَ يُعِظُكُمْ بِأَنَّهُ لَا تُشْرِكُ بِاللَّهِ ۚ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿۵۱﴾

”اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا اے نصیحت کرتے ہوئے اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا۔ یہ یقیناً شرک عظیم ہے۔“

جہ اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا۔ اس کا نام انعم، اشکم یا ماٹان تھا۔ وَهُوَ يُعِظُكُمْ تَرْكِبُ کلام میں لُقْمَنُ سے حال ہے۔

جہ (اے میرے پیارے فرزند!) یہ نصیحت میراے اشتقاق ہے۔ ابن کثیر نے یا م کو ساکن، فخص نے یا کو مفتوح اور یا قیون نے کسور پڑھا ہے۔

جہ ترکیب کلام میں بِاللَّهِ لَا تُشْرِكُ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ قسم ہو اور بالحد کلام اس کا جواب ہو۔ کہا گیا ہے کہ آپ کا بیٹا کافر تھا۔ پھر آپ اسے مسلسل نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

جہ یہ جملہ مذکورہ نبی کی علت ہے۔ ظلم سے مراد کسی شے کو اس کے مخصوص محل کے بغیر دوسرے مقام پر رکھنا ہے، چاہے اس میں کمی کی جائے یا زیادتی، تبدیلی اس کے وقت میں کی جائے یا اس کی جگہ میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظلم سے مراد حق سے تجاوز کرنا ہے، چاہے وہ تجاوز تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اسی لیے یہ لفظ غنا و صغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور کبیرہ کے لیے بھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے۔ کیونکہ عبادت کو ایسے محل میں رکھنا جو بالکل ہی صلاحیت نہ رکھتا ہو اپنے محل سے بہت بڑا تجاوز ہے (یعنی معبود حقیقی کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا ظلم عظیم ہے) اور منعم حقیقی کو اس کے مساوی قرار دینا جو مطلقاً انعام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، بہت بڑا ظلم (اور انتہائی بے جا حرکت) ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَفِضْلُهُ فِي عَاصِمٍ

إِنِ اشْكُرْنِي وَلِيَ الْوَالِدَيْنِ ۖ إِنِّي الْمَصِيءُ ﴿۵۲﴾

”اور ہم نے تاکید کی کہم ویا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے اے ظلم میں اٹھائے رکھا ہے اسے اس

کی ماں نے ج کزوری پر کزوری کے باوجود جے اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے جے (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا جے (آخر کار) میری طرف ہی (جہیں) لوٹنا ہے جے۔

یعنی ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ والدین سے حسن سلوک کرے اور ان کا شکر ادا کرے۔ یہ لقمان کے واقعہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔
جے حَکْمَتُہُ اُمَّہ معترضہ کے دوران یہ جملہ معترضہ ماں کے حق میں حسن سلوک کے حکم میں مزید تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے حسن معاشرت کا کون زیادہ حق رکھتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے پھر عرض کی) اس کے بعد کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیرا باپ۔ (پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا) جو تیرا زیادہ قریبی ہو، پھر جو اس کے بعد قریبی ہو۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام قرار دی ہے (متفق علیہ (2))۔

جے علی وحق، وہن کی صفت ہے اور وہ مختلفہ کے قائل سے حال ہے۔ تقدیر کلام ہے ذات وہن یا یوہن وہنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے شدت پر شدت (تکلیف پر تکلیف)۔ ضحاک نے کہا ہے کزوری پر کزوری اور بنیاد نے کہا ہے مشقت پر مشقت۔ کیونکہ عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو اس پر بے درپے کزوری اور مشقت آتی ہے حمل کزوری ہے، درودہ کزوری ہے اصل وضع کرنا ضعف ہے (3) اور دودھ پلانا ضعف ہے۔

جے اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے۔ اور وہ اتنی مدت دودھ پلاتی رہی۔ اسی آیت سے امام شافعی، ابو یوسف اور امام احمد نے یہ استدلال کیا ہے کہ دودھ پلانے کی زیادہ مدت دو سال ہے۔ ہم نے مسئلہ رضاعت سورۃ البقرہ کی آیت وَالْوَالِدَاتُ یُزْجِفْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَ ثَلَاثِ سِنٍ غَالِبِیْنَ الْاَیَّامِ اور سورۃ النساء کی آیت وَامْتَنِعْ لِمَا اَنْتَ عَلَیْہِ مِنَ الْوَالِدِیْنَ کی تفسیر میں تفصیل سے ذکر کر دیا ہے۔

جے "اَنْ اَشْکُرْ لَی" یا تو وَصْفِی کی تفسیر ہے۔ یا پھر وَالدِّیْنِ سے بدلہ اُشمال ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ جس نے پانچ نمازیں ادا کیں تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور جس نے پانچ نمازوں کے بعد اپنے والدین کے لیے دعا کی تو اس نے اپنے والدین کا شکر ادا کیا۔ (4)

جے (آخر کار) میری طرف ہی (جہیں) لوٹنا ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی، یعنی تیرے شکر ادا کرنے اور نافرمانی کرنے پر میں تجھے بدلہ دوں گا۔

وَ اِنْ جَاهَدَكَ عَلَى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِہٖ عِلْمٌ ۚ فَلَا تُطِعْہُمْ ۚ وَاَصَابَتْکُمْ
فِي الدِّیْنِ مَعْرُوْفًا ۚ وَاَتٰیْکُمْ سَبِیْلٌ مِّنْ اَنْتَ اِلٰی شَمَّ اِلٰی مَرْجِعِکُمْ ۚ فَاَنْتَبِہْ لِمَا
کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۵

"اور اگر وہ باؤ ڈالیں تم پر کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اس کو جس کا تجھے علم تک نہیں تو ان کا یہ کہنا نہ مان لے البتہ گزران کرو

ان کے ساتھ دنیا میں خوبصورتی سے ملے اور بیرونی طرف مائل ہو اس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہو اسے پھر میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے پس میں آگاہ کروں گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے۔“

لے وَإِنْ جَاهِلًا يَكُونُ لِي أَنْ اَشْكُوَكَ عَلَى عَظُوفٍ هِيَ۔ اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تو اس کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم تک نہیں کہ وہ شریک بننے کا مستحق ہے (تو تو ان کی بات نہ مان) یعنی پھر (ایسی حالت میں ان کی بیروی کیسے ہو سکتی ہے) جبکہ تو اولہ قطعیہ سے شرک کے بطلان کے بارے جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق ہر صاحب حق پر غالب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت (جائز) نہیں (۱)۔ اسے امام احمد اور حاکم نے عمران اور حکیم ابن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح یہ روایت حضرت علیؓ سے صحیحین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں موجود ہے۔

لے البتہ دنیا میں ان کے ساتھ ایسی خوبصورتی سے گزارنا کرو جسے شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہوں۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے والدین جو فقیر اور محتاج ہوں ان پر مال خرچ کرنا اور ان سے صلہ رحمی کرنا واجب ہے اگرچہ وہ کافر ہوں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ میرے پاس آئی اس حال میں کہ وہ شرک تھی اور قریش کے ساتھ منسلک تھی تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ (مدد کی) خواہش رکھتی ہے، کیا میں اس سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں، تو اس سے صلہ رحمی کا سلوک کر۔ متفق علیہ (۲)۔ سورہ علقموت میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ دونوں آیتیں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کی والدہ کے بارے نازل ہوئیں۔

سے اور بیروی کرو اس کے دین کی جو میری طرف مائل ہو۔ اور میری اطاعت و فرمانبرداری کی۔ اور وہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارادہ فرما رہا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ جب ابوبکر صدیقؓ شرف باسلام ہوئے تو حضرات عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمن بن عوف آپ کے پاس آئے اور کہا کیا تم نے اس آدمی کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ایمان لے آئے ہو؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا جی ہاں، وہ صادق ہیں، تم بھی ان پر ایمان لے آؤ۔ پھر آپ انہیں لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پس یہی وہ اسلام کے اسلاف ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی راہنمائی کے سبب اسلام قبول کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے فرمایا وَابْتِغِ سَبِيلَ مَنْ آتَابَ إِلِيَّ (۳)۔

مسئلہ: والدین جب کسی فرض کو چھوڑنے یا مکروہ تحریمی پر عمل کرنے کا حکم دیں تو اس بارے میں ان کا کہا ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بیروی کو چھوڑنا اور کسی غیر کے حکم کی بیروی کرنا شرک معنوی ہے۔ جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ اور جب والدین ایسی مباح چیز کا حکم دیں جو عقلاً اور شرعاً ممنوع نہ ہو تو ان کی اطاعت و بیروی واجب ہے۔ اگر والدین کثرت ذکر اور نوافل کو ترک کرنے اور ضرورت سے زائد مال کمانے سے روکنے کا حکم دیں تو کیا ان کی بات ماننا واجب ہے؟ میری نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ان کا کہا ماننا واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے کی بیروی کرنے کا حکم دیا ہے جو اس کی طرف مائل ہو۔ اور کثرت نوافل، لائینی چیزوں کو ترک کرنا، دنیا کو

قادر نے کہا ہے کہ یہ خمیر خطیہ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ لقمان کے بیٹے نے اپنے باپ کو کہا تھا اے ابا جان! اگر میں گناہ ایسی جگہ کروں جہاں کوئی بھی مجھے دیکھ نہ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے کیسے جان سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا اِنَّكَ وَمِثَالُكَ حَتَّىٰ قَبْرِ خَدَّيْكَ اِذَا كُنْتَ حَيًّا جَوْنًا ہونے میں رانی کے دانہ کے برابر دینی ہو (1)۔ ترکیب کلام میں نکتہ کا ام خمیر مستتر ہے اور اس کی خبر مضاف ہے۔ کیونکہ جمہور کی قرأت کے مطابق یہ منصوب ہے۔ لیکن نافع نے اسے نکتہ کا ام ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ کان نامہ ہے اور چونکہ مضاف حبتہ کی طرف مضاف ہے اس لیے فعل مؤنث ہے۔ اور اس قرأت کے مطابق انہا کی خمیر خمیر قصہ ہے۔

یعنی وہ انتہائی مخفی اور محفوظ جگہ میں ہو جیسے خوف چٹان یا انتہائی بلند جگہ میں ہو جیسے آسمانوں کی بلندی یا انتہائی پست جگہ میں ہو جیسے زمین کا انتہائی گہرا مقام۔ قادر نے کہا ہے صخرہ سے مراد پہاڑ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے اس سے مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ اور یہ وہی ہے جس میں فاسقوں اور فاجروں کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ اور آسمان کانٹیلوں رنگ اسی کی وجہ سے ہے۔ اور سدی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک پھل پر پیدا فرمایا اور اس کا نام زمین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح فرمایا وَ اَلْقَلَمَ اور یہ پھل پانی میں ایک پتھر کی پشت پر ہے اور وہ پتھر ایک فرشتے کی پشت پر ہے اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر ہے۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ چٹان نہ آسمان میں ہے اور نہ زمین میں بلکہ ہوا پر ہے۔ (2)

ح تو اللہ تعالیٰ اسے حاضر کرے گا اور اس پر عاصی بھی فرمائے گا۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ہر مخفی اور بیک ترین چیز کا بھی علم رکھتا ہے اور ہر شے کی حقیقت سے باخبر ہے۔ حسن نے کہا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ علامہ بنوئی نے کہا ہے کہ بعض کتابوں میں ہے کہ حضرت لقمان کے یہی وہ آخری کلمات ہیں جو انہوں نے کبے بھران کے ایبیت و جلال کی وجہ سے ان کا پتہ پھٹ گیا۔ (3)

يٰۤاَيُّهَا اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْدِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ
اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۵

”میرے پیارے بیٹے! نماز صحیح ادا کیا کرو، نیک کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔ بے شک یہ بڑی اہمیت کے کام ہیں۔“

۱۔ بُنٰی کو شخص اور بڑی نے یا موقوف اور باتوں نے مسموع پڑھا ہے۔ اپنے نفس کی تکمیل کے لیے صحیح صحیح نماز ادا کیا کرو۔ اور دوسروں کی تکمیل کے لیے نیک کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو۔ اور امر بالمعروف بھی عن المنکر یا دیگر اسباب سے جو تکلیفیں اور اذیت تمہیں پہنچیں اس پر صبر کیا کرو۔

۲۔ بے شک صبر یا ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ان امور میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر فرض قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَاِزُهَا یعنی اچھے امور وہ ہیں جنہیں کرنا اللہ تعالیٰ نے قہر پر فرض کر دیا ہے۔ اصل میں عزم کا معنی کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے۔ اس بناء پر عزم مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جنہیں

واجب ہونے کی بناء پر پوری توجہ اور کوشش سے کرتا ہے۔

وَلَا تُضَيِّعْ حَتَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَشِيشْ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝

”اور (تکبر کرتے ہوئے) نہ پھیر لے اپنے رخسار کو لوگوں کی طرف سے لے اور نہ چلا کر زمین میں اتراتے ہوئے لے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا کسی گھمنڈ کرنے والے، فخر کرنے والے کو جس“

لے نافع، ابو عمرو، ابو جعفر اور کسائی نے اسے باب مفاعلہ سے وَلَا تُضَيِّعُ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر، ابن عامر، عاصم، ابو جعفر اور یعقوب نے الف کے بغیر اور ابن کثیر اور مشد پڑھا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو نہ لوگوں سے اکتا اور نہ ہی تکبر کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان سے پھیر۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ تو تکبر نہ کر کہ تو انہیں حقیر جاننے لگے اور جب وہ تجھ سے گفتگو کریں تو تو ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا چہرہ پھیر لے۔ (1)

ع اور تو زمین میں اتراتے ہوئے اور اُترتے ہوئے نہ چل۔ مَرَحًا مصدر حال کی جگہ واقع ہے۔ یعنی یمرح مَرَحًا۔ یا یہ مفعول لہ ہے یعنی لا جل المرح۔ (اترانے کے لیے)۔

جے بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا چال میں گھمنڈ اور تکبر کرنے والے کو اور لوگوں پر فخر کرنے والے کو۔ یہ مذکورہ بھی کی علت ہے۔ رعایت قافیہ کے لیے یہاں لف وشر غیر مرتب ہے (یعنی مختال دوسری نبی کی علت ہے اور فخور پہلی نبی کی علت ہے)۔

وَأَقْصِدْ فِي مَسْجِدِكَ وَاعْظُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۝ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَبِيرِ ۝

”اور درمیانہ روی اختیار کر اپنی رقت میں لے اور دھمی کر اپنی آواز بے شک سب سے وحشت انگیز آواز، گدھے کی آواز ہے۔“

لے اور میانہ روی اختیار کر اپنی رقت میں۔ یعنی ایسی درمیانہ چال جو رنگنے کی چال (یعنی بہت ہی اہستہ) سے زیادہ ہو کیونکہ وہ غرور اور تکبر کرنے والوں کی چال ہے۔ اور اسراع (یعنی بہت زیادہ تیز) سے کم ہو کیونکہ وہ احمقوں اور بیوقوفوں کی چال ہے۔ اور اس سے وقار ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سرعت رفتار مومن کے وقار کو ختم کر دیتی ہے (2)۔ اسے ابن عدی اور ابو نعیم نے اٹھلیہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن عدی نے اسے ابو سعید اور ابن عمرؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ وہ سرعت رفتار جس سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی چال ہے جو طبعی چال سے انتہائی زیادہ ہو۔ لیکن ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہو اور روڑ کی چال سے کم ہو تو وہ محمود اور پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ابن سعد نے یزید بن مرثد سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب چلتے تو رفتاری تیز ہوتی کہ آپ ﷺ کے پیچھے دوڑنے والے بھی آپ کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ وقار اختیار کرو اور تم پر لازم ہے کہ اپنے جنازوں کو اٹھا کر درمیانی چال میں چلو (3)۔ اولیٰ صاحبؒ نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جنازہ کو جلدی سے لے جاؤ۔ کیونکہ اگر وہ نیک اور صالح ہے تو تم اسے جلدی آگے پہنچا دو گے اور اگر وہ برا ہے تو جلد اسے اپنے کندھوں سے اتار دو گے (4)۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ

2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 422 (اعلیٰ)

4- مجمع مسلم، جلد 1 صفحہ 306 (قدیمی)

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریہ)

3- کنز العمال، جلد 15 صفحہ 594 (تراث الاسلامی)

امرا سے مراد وہی ہے جو میں نے ذکر کیا ہے (یعنی ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہووے ناپسندیدہ نہیں) اور قصد سے مراد ایسی تیز رفتاری ہے جو دوڑ کی چال سے کم ہو۔

یہ مقاتل نے اس کا معنی بیان کیا ہے پست کر، جھمی کر (۱) اپنی آواز، بے شک سب سے وحشت انگیز آواز گدھے کی آواز ہے۔ یہ آواز پست کرنے کی علت ہے۔ یعنی گدھوں کی آواز بہت زیادہ بلند ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور اور ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ پس تیری آواز ان کی آواز کی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی آواز ابتدا میں زہیر اور انتہا میں مہین بکھلاتی ہے۔ اور یہ دونوں آوازیں اہل جہنم کی ہیں۔ موسیٰ بن امین نے کہا ہے کہ میں نے قول باری تعالیٰ اِنَّ اَفْكَرَ الْاَحْصَاۃِ اَصْوَاتُ الْغَوَاقِبِ کے بارے حضرت سفیان ثوریؒ کو کہتے سنا کہ اس سے مراد فصیح ترین ناپسندیدہ چیخک ہے (۲)۔ وہب کا قول ہے کہ لقمان نے حکمت سے لبریز بارہ ہزار کلمات کہے ہیں اور لوگوں نے انہیں اپنے کلام اور فیصلوں میں شامل کیا ہے۔ (۳)

اَلَمْ تَرَۤ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَآ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَآ فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعْمَةً ظَٰہِرَةًۭ وَّاَنَّۤ اَبَاطِنَةًۭ وَّمِنَ النَّاسِ مَنۢ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ یُعَدِّرْ عَلَیْہِ وَّلَا یُہْدِی وَّلَا یُکَلِّمُ مُنِیْرًا ۝

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور بنا دیا ہے تمہارے لیے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تمام کر دی ہیں اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ اور بعض ایسے (نادان) لوگ بھی ہیں جو ٹھکرتے ہیں (رسول کریم سے) اللہ تعالیٰ کے بارے میں ندان کے پاس علم ہے۔ اور نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب ہے۔“

لے کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور بنا دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے، یعنی سورج، چاند، ستارے اور جو زمین میں ہے، یعنی سمندر، پہاڑ، معدینات، نباتات اور حیوانات وغیرہ۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے بالواسطہ یا بلا واسطہ منافع اور فوائد حاصل کرنے کی تمہیں قدرت عطا فرمادی ہے۔

یہ اور اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں تمام اور مکمل کر دی ہیں۔ اہل مدینہ ابوعمر اور حفص نے نِعْمَةً میں کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ صیغہ جمع ہے۔ اور حاء کو مضموم پڑھا ہے اس لیے کہ ان کے درمیان اضافت پائی جاتی ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ واحد کی صورت میں مین کو سکون کے ساتھ اور تا کو تون کے ساتھ نِعْمَةً پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے جس مراد لی گئی ہے۔

یہ ظاہر کا ترکیب کلام میں اپنے معطوف کے ساتھ مل کر نِعْمَةً سے حال ہے۔ نعمة ظاہرہ سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو محسوس کی جاسکتی ہیں مثلاً صورت کا حسین ہونا، اعضاء کا ایک دوسرے کے مساوی ہونا، رزق، عافیت اور دیگر دنیوی نعمتیں۔ اسی طرح اسلام، رسول مکرّم، قرآن، احکام شرعیہ میں تخفیف اور آسانی پیدا کرنا، اتباع رسول کی توفیق عطا فرمانا، اسلام کو غلبہ عطا فرمانا اور دشمنوں کے خلاف مدد کرنا وغیرہ سب ظاہری نعمتیں ہیں اور ”باطنہ“ سے مراد دل، عقل، حواس باطنہ، حسن اخلاق، ملائکہ کے ساتھ مدد فرمانا، حق کا اعتقاد رکھنے کا الہام کرنا، گناہوں پر پردہ ڈالنا اور ان کی سزا میں جلدی نہ کرنا، عرقان الہی کا نور، اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کی شدید محبت و عشق اور رسول معظم ﷺ کی شفاعت وغیرہ تمام باطنی نعمتیں ہیں۔

ع کا عطف ومن الثانی من یشتکی لہو العبدین پر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کلام معترضہ ہے۔ اور بعض نادان لوگ رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کے بارے میں ایسے علم کے بغیر جھگڑتے ہیں جو کسی دلیل سے مستفاد ہو۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت نصر بن حارث، ابی بن خلف اور ان جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ (1)

یہ اور نہ ان کے پاس ہدایت ہے جو انہیں رسول مکرم نے فرمائی ہو۔ اور نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ کوئی روشن کتاب ہے۔ بلکہ ان کے جھگڑے کا انحصار صرف اور صرف اپنے آباء و اجداد کی تقلید اور پیروی پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْنَا آبَاءَنَا
أَوَّلُكَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ①

”اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو۔ کیا وہ (انہیں کا اتباع کریں گے) خواہ شیطان انہیں (اس طرح) دعوت دے رہا ہو جھڑکتے ہوئے عذاب کی راہ۔“

۱۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں ہم اس کی اتباع نہیں کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اس آیت میں دین کے اصولی اور بنیادی احکام میں تقلید سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”اتَّبِعُون“۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے قُلْ أَتَبِعُونَ إِبْنَاءَهُمْ (آپ کہہ دیجئے کیا وہ اپنے آباء کی پیروی کریں گے)۔

۲۔ ”وَلَوْ كُنَّا“ میں واو حالیہ ہے یا مقرر عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ یعنی لو لم یکن ولو کان۔ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ میں ضمیر کا مرجع یا تو وہ خود ہیں یا ان کے آباء ہیں۔ خواہ شیطان انہیں اس طرح دعوت دے رہا ہو جھڑکتے ہوئے عذاب کی طرف۔ یعنی اس طرح کہ شیطان ان کے قلوب میں شرک یا تقلید کی حسن اور خوبیوں القاء کرتا ہے۔ یہ استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ
إِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ②

”اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے دراصل حالیکہ وہ محسن ہو۔ تو بے شک اس نے مضبوط سے پکڑ لیا مضبوط حلقہ کو اور اللہ کی طرف ہی تمام کاموں کا انجام ہے۔“

۱۔ اور جو شخص اپنی توجہ کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور کلیۃً اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لیے ہی وہ کوئی فعل کرتا ہے اور کسی کو چھوڑتا ہے اور وہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ دراصل حالیکہ وہ اپنے اعمال میں محسن ہو۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا احسان کا معنی یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ یعنی مکمل طور پر حضور قلب حاصل ہو۔

۲۔ بے شک اس نے مضبوط حلقہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ یعنی اس نے پکڑ لی جانے والی چیزوں میں سے مضبوط ترین چیز کو پکڑ لیا ہے

اور تمام ذرائع میں سے ایک توی ترین ذریعہ کو تمام لیا ہے جس کے ٹوٹنے کا کوئی احتمال نہیں۔ یہ متوکل انسان کی ایسے آدمی کے ساتھ انتہائی لطیف تشبیہ اور تشبیل ہے جو مضبوط حلقہ کو پکڑے ہوئے ہو۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ کیونکہ سب کے سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنُكَ كُفْرُهُ ۚ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٣١﴾

”اور جس نے کفر کیا تو نہ غمزدہ کرے آپ کو اس کا کفر۔ ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پس ہم آگاہ کریں گے انہیں جو

انہوں نے کیا تھا۔ شک اللہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (چھپا) ہے۔“

۱۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی توجہ نہ کی تو اس کا کفر آپ کو غمزدہ نہ کرے۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور اذیت دی وہ آپ کو نہ تو دنیا میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں۔ تو چونکہ ضرر (نقصان) نہ ہوتا حزن (غم) نہ ہونے کا سبب ہے اس لیے ضرر کی جگہ حزن کا ذکر فرما دیا۔ نافع نے اسے لَا يُضْهِئُكَ یعنی یاد کو مضوم اور زاء کو کسور پڑھا ہے کہ یہ الْإِخْرَاج سے ماخوذ ہے

۲۔ دارین میں انہوں نے ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔ پس ہم انہیں عذاب دے کر آگاہ کریں گے جو انہوں نے کیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں چھپا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو سینوں میں چھپے اعتقادات اور وہاں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ چنانچہ ایسے امور جو ظاہر ہیں (یعنی ان کے غنی ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا)۔ پس اللہ تعالیٰ ہر آدمی کو اس کے اعتقاد اور عمل کے مطابق جزا دے گا۔

ثُمَّ يَكْفُرُ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ ۚ

”پھر تم کو کفر سے روکے گا اور تم کو کفر سے پاک کرے گا اور اگر تم محبت کرتے ہو“

۱۔ یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے کہ وہ لطف اندوز ہو لیں تھوڑا سا مزہ اڑالیں یا دنیا میں اپنا مقدرہ و منت گزرنے تک تھوڑی دیر لطف اندوز ہو لیں۔ پھر ہم انہیں ہاک کر لے جائیں گے، یعنی ہم انہیں آخرت میں داخل کریں گے اور لوٹیں گے سخت عذاب کی طرف۔ یعنی ایسے عذاب کی طرف جو سخت چیزوں کے بوجھ کی مثل ان پر ٹپل ہوگا اور وہ جنہم کا عذاب ہے۔

وَلَكُمْ مِّنْ حَقِّ السَّابِقَاتِ وَالَّذِينَ يَبْقَوْنَ اللَّهَ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ
بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

”اور تم کو دریاقت کریں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ فرمائیے الْحَمْدُ لِلَّهِ

(حق واضح ہو گیا) ۱۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

۱۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف خلق کی نسبت سے مانع دلیل انتہائی واضح ہے اس لیے وہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ فرمائیے الحمد للہ (حق واضح ہو گیا) کہ اس نے انہیں اس دلیل کے اعتراف و اقرار پر مجبور کر دیا جو ان کے اعتقادات کو باطل کرنے کا

موجب ہے۔

بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس توحید کا اقرار ان پر لازم ہے اور جب انہیں اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس پر آگاہ نہیں ہوتے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٣١﴾

”اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً اللہ ہی بے نیاز ہے (اور) ہر تعریف کے لائق ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت اور تخلیق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے پس اس کے سوا کوئی اور عبادت کا مستحق نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تعریف کرنے والوں کی تعریف سے بے نیاز ہے۔ وہی ہر تعریف کے لائق ہے اگرچہ کوئی اس کی تعریف نہ کرے۔ ابن اسحاق نے عطا بن یسار سے اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے بھی روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی وَمَا اَوْذَيْنٰهُمْ قَبْلَ الْعِلْمِ وَلَا قَلِيْلًا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ کے پاس یہود کے علماء حاضر ہوئے اور عرض کی کہ کیا ہمیں آپ کی طرف سے یہ بات نہیں پہنچی کہ آپ کہتے ہیں وَمَا اَوْذَيْنٰهُمْ قَبْلَ الْعِلْمِ وَلَا قَلِيْلًا (اور تمہیں علم میں سے تھوڑا سا دیا گیا ہے)، کیا آپ اس سے ہمارا ارادہ کرتے ہیں یا اپنی قوم کا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اس سے تمام کا قصد کیا ہے۔ تو انہوں نے کہا کیا تم اس کلام میں سے تلاوت نہیں کرتے تو تمہارے پاس آیا ہے کہ ہمیں تورات عطا کی گئی اور اس میں ہر شے کا کھلا بیان ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے (1)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اَقْلَمَ رَوْ الْبَحْرِ يَمْدًا مِنْ بَعْدِ سَبْعَةِ اَبْحُرٍ

مَا نَفِدَتْ كَلِمَتُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٢﴾

”اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاحی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر (سے) (مزید) سیاحی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں بلکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب، بڑا داتا ہے۔“

یعنی اگر تمام کے تمام درختوں کا قلمیں ہونا ثابت ہو جائے۔ اور شجرۂ کوہ احد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد آسمان کی تفصیل ہے۔ اور سارے کا سارا سمندر سیاحی بن جائے یعنی اس میں سات سمندر پیچھے سے مل کر اضافہ کریں سَبْعَةُ اَبْحُرٍ۔ فَمُدُّهُ قَاعًا۔ ابومروہ اور یعقوب نے البحر کو منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یا تو یہ اُن کے اسم پر معطوف ہے یا اس سے پہلے فعل مضارع جس کی تفسیر بَعْدُ کر رہا ہے۔ اور باقیوں نے اسے اُن اور اس کے معمول پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں فَمُدُّهُ حال واقع ہو رہا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس میں تو ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہی نہیں ہے۔ تو اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ یہ آپ کے اسی قول کی مثل ہے جنت والحیث قادم۔ اور اسی طرح وہ احوال جن کا حکم ظرف کا ہوتا ہے۔ اور کلام کا متعنی یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاحی ہو جائے اور پیچھے سے سات سمندر اس میں شامل ہو کر سیاحی میں اضافہ کریں۔ لیکن فَمُدُّهُ کا قول (سیاحی) کے ذکر سے متعنی ہے کیونکہ مدالذوات سے ماخوذ ہے اور

اس کا معنی ہے دوات میں سیاهی داخل کرنا۔ علامہ بنوئی نے کہا ہے کہ آیت میں کلام مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَلَوْ اَنْ مَّا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ لَّيُكْتَبَ بِهَا كَلِمَاتُ اللّٰهِ۔ (۱)

یعنی تو پھر بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان قلموں اور اس سیاهی کے ساتھ معلومات باری تعالیٰ کو لکھا جائے بلکہ قلموں اور سیاهی کی مقدار جتنی بڑھ جائے وہ معلومات کو لکھنے کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ معلومات باری تعالیٰ غیر متناہی ہیں۔ ان کا ختم ہونا ممکن نہیں (آیت طیبہ میں کلمت اللہ سے مراد معلومات باری تعالیٰ ہیں) اور یہ احساس دلانے کے لیے جمع قلت کا صیغہ استعمال فرمایا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی معلومات کی قلیل مقدار کو لکھنے کے لیے بھی کافی نہیں، چہ جائیکہ کثیر کے لیے کافی ہوں۔

جس بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے کوئی شے اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور کوئی امر اس کی حکمت اور علم سے خارج نہیں۔ انہی جریر نے حضرت مکرمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ فَقُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا**۔ تو انہوں نے یہ کہا کیا آپ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمیں تصورِ علم عطا کیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تو اسے دی گئی ہے اور جسے حکمت عطا کر دی گئی تحقیق اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا ورنہ **يُؤْتِ الْحِكْمَةَ لِمَن يَشَاءُ** (2) تو پھر یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔ پس ہم نے اس آیت کے سبب نزول کے بارے جو روایات نقل کی ہیں وہ دالالت کرتی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت کبی ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے قریش کے ایک گروہ کو کہا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کریں اور آپ کو اس طرح کہیں اور اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں ہی تھے۔ ابو اسحق نے کتابِ اہل بیت میں اور ابن جریر نے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ یہ کلام غریب فتم ہو جائے گا (3) تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ فَاعِلًا**۔

مَا خَلَقْنَاكُمْ وَلَا بَعَثْنَاكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٢٨﴾

”نہیں ہے تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا (اللہ کے نزدیک) مگر ایک نفس کی مانند ہے بے شک اللہ

تعالیٰ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا ایک نفس کو پیدا کرنے اور اسے مارنے کے بعد پھر زندہ کرنے کی مثل ہے۔ کیونکہ اسے ایک کام دوسرے کام سے قطعاً غافل نہیں کر سکتا۔ اور تمام کے وجود کے لیے اس کی ذاتی قدرت کے ساتھ اس کے ارادے کا تعلق ہی کافی ہوتا ہے۔ لہذا جس طرح اس کے لیے ایک نفس کو پیدا کرنا محض راہ و شکل نہیں اسی طرح اس کے لیے تمام کو پیدا کرنا بھی قطعاً محض راہ و شکل نہیں۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہے اور ہر شے کو دیکھتا ہے۔ یعنی اسے بعض چیزوں کا ادراک دوسری بعض چیزوں کو جاننے سے غافل نہیں کرتا۔ پس اسی طرح تخلیق کا عمل بھی ہے (کہ ایک کو پیدا کرنا دوسرے کی تخلیق سے مانع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ارادے سے سب کی تخلیق ہو سکتی ہے)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ شرکین کے ان اقوال کو مستنا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا کوئی تصور نہیں (یعنی وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں) اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُؤَلِّمُ الْبُرُوجَ وَالنَّجْمَ فِي السَّمَاءِ وَيُؤَلِّمُ الْبُرُوجَ وَالنَّجْمَ فِي السَّمَاءِ
وَالْقَمَرَ كُلَّ يَوْمٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

”کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے (اپنے مدار میں) وقت مقرر تک اور یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، خوب جانتے والا ہے۔“

۱۔ سَخَّرَ یُؤَلِّمُ پر معطوف ہے یا پھر یہ حال ہے اور قد مقدر ہے۔ ان دونوں روشن ستاروں (سورج اور چاند) میں سے ہر ایک آسمان میں چلتا رہے گا وقت مقرر تک اور وہ قیامت کا دن ہے۔ اس قول اور لَا یَجْعَلِ مُسَمًّى کے مابین فرق یہ ہے کہ داخل سے مراد وہ غایت اور آخری حد ہے جہاں ان کی چال رک جائے گی اور وہی غایت اس چال کی حقیقی یا مجازی منزل اور غرض ہے۔ اور یہ دونوں معانی غایات سے حاصل ہوتے ہیں۔ (لہذا اس قول میں الٰہی غایت کے لیے ہے۔ جبکہ دوسرے قول میں لام غایت پر دلالت نہیں کرتا) اور ذَا اللّٰہِ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ کا عطف قول باری تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُؤَلِّمُ الْاَیَّہِ پر ہے۔ اور پھر یہ جملہ اَلَمْ تَرَ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَ ذَا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُم مِّنْ مَّاءٍ السَّلْوٰتِ اور یہ اس کی تقریر کے لیے ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ هُوَ الْحَقُّ ۚ وَاَنَّ مَا لَدُنْہِ عِزٌّ ۚ وَاَنَّ اللّٰہَ هُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۝

”یہ ہیں اس کی قدرت کے کرشمے تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ ہی حق ہے اور بلاشبہ جنہیں وہ پکارتے ہیں، اس کے سوا، وہ سب باطل ہیں اور بلاشبہ اللہ ہی بڑی شان والا اور بزرگ ہے۔“

۱۔ یہ جو اللہ تعالیٰ کی وسعت علم، اس کی قدرت کا ہر شے کو شامل ہونا اور اس کی صنعت و کارگیری کے عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، یعنی وہ واجب الوجود اور اس کے جمیع کمالات و اوصاف ثابت اور محقق ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ اس کی الوہیت ثابت اور محقق ہے۔

۲۔ ابو عمرو، حفص، حمزہ اور کسائی نے یَذْعُوْنَ کو صیغہ غائب ہونے کی بناء پر یاء سے پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے پڑھا ہے۔

۳۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن خداؤں کو وہ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ یعنی یا تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہی معدوم ہیں یا ان کے بارے میں الوہیت کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔

۴۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے سے بلند و برتر اور اس پر غالب ہے۔ اس کی عظمت و کبریاٰ بانی بالکل ظاہر اور واضح ہے اور جس کی یہ شان ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا علم اور اس کی قدرت جمیع اشیاء کو شامل ہو (اور کوئی شے بھی اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہ ہو)۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْکَ تَجْرٰی فِی الْبَحْرِ بِرِغْمَتِ اللّٰہِ لِیَرْسِلَکُمْ مِّنْ اٰیٰتِہٖ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیٰتٍ لِّحَالِ صَابِرٍ شَکُوْرٍ ۝

”کیا تم ملاحظہ نہیں کرتے کہ کشتی چلتی ہے سمندر میں اس کی مہربانی سے تاکہ وہ دکھائے تمہیں اپنی (قدرت

کی نشانیاں جے بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر مبر کرنے والے شکر گزار کے لیے ہے۔“

۱۔ یہ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ فِیۡہِمْ مِّنۡہٗمۡ مَّنۡ یَّشَآءُ۔ یعنی اللہ کا معنی ہے کہ اسباب نعمت تیار اور مہیا کرنے میں اللہ تعالیٰ کا بہت احسان اور مہربانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت واضحہ اور اس کے اعانات کے عام ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس میں باء وصلہ یا حال کے لیے ہے۔

۲۔ تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی بعض نشانیاں دکھائے۔ یعنی قدرت کے بعض دلائل اس سمندر کے عجائبات بھی ہیں جسے تم جانتے ہو۔ جہاں ہاتھ لگایا سے مراد ہے جو مشقتوں پر مبر کرتے ہوئے اپنے آپ کو کائنات اور ذات میں غور و فکر کرنے میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نعمتوں کا عرفان حاصل کرتا ہے اور بھران پر ان کے عطا کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ یا صبار شکور سے مراد مؤمنین ہیں یعنی اس میں مؤمنین کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف ایمان صبر میں ہے اور نصف شکر میں ہے (1)۔ اسے تنبیہ نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے، یعنی وہ خوشحالی میں شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور تنگی کی حالت میں مبر کرتا ہے۔

وَ اِذَا عَشِیۡتُمْ مِّنۡہُمْ مَّوۡجِبَ الْفَلَکِ دَعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیۡنَ لَہُمُ الدِّیۡنَ ۚ فَلَمَّا نَجَّیۡتُمۡ اِلَیّہِ رَبِّہُمۡ مُّقۡصِدًا ۖ وَ مَا یُجَدُّ بِاِلٰتِنَا اِلَّا کُلُّ خِثَارٍ لِّقَوۡرٍ ۝۱۰

”اور جب ڈھانپ لیتی ہیں انہیں، پہاڑوں جیسی موجیں جے اس وقت پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے عقیدہ کو جسے پھر جب بچا لاتا ہے انہیں سائل تک جسے تو ان میں سے (چند ہی) حق پرستے ہیں ھ اور نہیں انکار کرتا ہماری آیتوں کا مگر ہر وہ شخص جو غدار (اور) ناشکر ہو۔“

۱۔ یہ ظرف دَعُوا اللّٰه کے متعلق ہے۔ اس میں شرط اور جزاء کا معنی ہے اور یہ جملہ فجوی فی النسخہ پر معطوف ہو کر ان کی خبر ہے۔ اور عَشِیۡتُمْ کی ضمیر اهل الفلک کی طرف راجع اور اِیۡم اور خیر کے درمیان رابطہ ہے۔

۲۔ غلغلہ کی جمع ہے۔ موج کو اس کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کیونکہ موج میں لہریں یکے بعد دیگرے اٹھتی رہتی ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ غلغلہ سے مراد پہاڑ ہیں اور بکلی نے کہا ہے کہ اس سے مراد بادل ہیں۔ (2)

۳۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اپنے عقیدہ کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کہ وہ انہیں نجات عطا فرمائے۔ اور اس وقت وہ کسی اور کو نہیں پکارتے۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ پختہ ہو چکا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا تکالیف اور مصائب کو دور کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اور شدید خوف کے وقت خواہشات نفسانی اور تقلید آباء کا جو پردہ ان کی فطرت سلیمہ پر پڑا ہوا ہے وہ زائل ہو جاتا ہے۔

۴۔ اِلَیّہِ رَبِّہُمۡ مُّقۡصِدًا کے متعلق ہے اور وہ اوصلہم کے معنی کو متضمن ہے اور فَلَمَّا نَجَّیۡتُمۡ جملہ وَ اِذَا عَشِیۡتُمْ پر معطوف ہے۔

۵۔ فَبِہِمْ مُّقۡصِدًا کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ لَمَّا کا جواب ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ کھٹکا کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں سائل تک بچا لاتا ہے تو ان میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ پس ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں بعض کفر کرتے ہیں اور بعض درمیانی راہ اپناتے ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض کفر اختیار

کرنے میں بعض کی نسبت درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں اور بعض کا خرافہ آزمی اور دیگر اقوال میں بعض دوسرے کا فروں کی نسبت زیادہ سخت اور شدید ہوتے ہیں۔ اور یہاں مقصد کا ذکر اس جانب پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ہے۔ کبھی نے مقصد کا یہی معنی ذکر کیا ہے (۱)۔ لیکن اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مقصد سے مراد وہ آدمی ہے جو اس درمیانی راہ پر مقیم ہو، جو کہ توحید ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عمرؓ بن ابی جہلؓ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ فتح مکہ کے وقت مسند کی طرف بھاگ گئے تو انہیں (مسند میں) سخت طوفان اور آمد عجمی نے آیا۔ تو اس وقت عمرؓ نے یہ دعا مانگی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس طوفان سے ہمیں نجات دے دی تو میں ضرور بر ضرور محمد (ﷺ) کی طرف لوٹ کر جاؤں گا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ چنانچہ آمد عجمی رک گئی، طوفان ختم گیا۔ تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے، ابھی تک حضور نبی کریم (ﷺ) وہیں تھے۔ انہوں نے آپ (ﷺ) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور پھر اپنے اسلام کو خوب حسین بنایا۔ اس وضاحت کے مطابق تقدیر پر کلام یہ ہے کہ ان میں سے بعض معتدل رہتے ہیں اور بعض کفر کر جاتے ہیں۔ اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔

ہے اور ہماری نازل کردہ آیات کے حق ہونے کا انکار نہیں کرتا۔ یا ہمارے دلائل قدرت کا انکار نہیں کرتا اور طوفانی موجوں سے نجات دینا بھی انہی میں سے ہے مگر وہ شخص جو خدا راہو کیونکہ اس نے فطری عہد کو توڑ دیا ہے یا وہ عہد کو توڑ دیا ہے جو شدت اور مصیبت کے وقت اس نے کیا تھا۔ اور المفسر کا معنی ہے انتہائی شہنشاہ اور خدا ترانہ انسان۔ ”مکفوف“ اور جو تعین کی نا شکری کرنے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَأَخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَانِبُ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّكُم بِاللَّهِ الْعُرُوفُ ﴿٧٧﴾

”اے لوگو! ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلوے سکے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے نہ اور نہ ہی بیٹا بدل دے سکے گا اپنے باپ کی جانب سے کچھ بھی نہ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور نہ دھوکہ دہے تمہیں نیکو زندگی نہ اور نہ غریب میں جتنا کرے تمہیں اللہ سے وہ بڑا مکار دھوکہ باز ہے“

۱۔ ولیدہ میں خمیر موصوف کی طرف راجع ہے اور صفت محمد وف ہے، یعنی مومن والد اپنے کافر بیٹے کی طرف سے اس دن بدلہ نہیں دے سکے گا۔

اور وَلَا تَوْفُّوْهُ وَالَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ يَعْلَمُ اَنَّكَ اَنْتَ الْغَافِلُ اور ہُوَ جانی مولود کی صفت ہے۔ یعنی مومن بیٹا اپنے کام سے اپنے کا فر باپ کے لیے کوئی بدلہ نہیں دے سکے گا۔ عَنِ وَاٰلِهٖٓ وَسَلَّمَ لَا يَجْزِيْكَ عَنْهُ شَيْءٌ ہے۔ ہم نے یہاں کا فر کی قید اس لیے ذکر کی ہے کیونکہ مومن تو مومن کے لیے شفاعت کر سکے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اُوَلٰٓئِیْنَ اَسْمٰوٰتِہٖمُ دُوْنِہٖمُ بِاَسْمٰنِہٖمُ اَلْعُلَمَآءُ یَوْمَئِذٍ یَّتْلٰہُمْ ہُمْ ہُوَ موزید ارشاد فرمایا جَنَّاتٌ اَعْدِنَ یَدْخُلُوْنَہَا وَفٰنَ صَلٰوٰتِہُمْ وَہُمْ فٰیہَا یَجْمَعُوْنَ وَفٰیہَا یَنْکِحُوْنَ مصدریت (مفعول مطلق) کی بناء پر منسوب ہے، یعنی لَا یَجْزٰیْکَ شَیْءٌ مِنَ الْاَجْزَآءِ (وہ کچھ بھی بدل نہیں دے سکے گا)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ترکیب کلام میں مَوْفُوْہُ مذمتا ہو اور ہُوَ جانی عَلٰی وَاٰلِہٖٓ وَسَلَّمَ کی خبر ہو۔ اور لفظ کلام میں تبدیلی یعنی فعلیہ کی جگہ جملہ سیدہ ذکر کرنا اظہار تاکید کے لیے ہے۔ کیونکہ

اللہ ﷻ نے فرمایا غیب کی جانیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (1)۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایک کو یہ علم نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یہ علم نہیں رکھتا کہ رمحوں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ قیامت کس وقت مقرر پر قائم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کون سی زمین میں مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو یہ علم نہیں کہ بارش کب آئے گی۔ اسے ائمہ اور بخاری نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ كَعِلْمِ السَّاعَةِ وَيَعْلَمُ الْغَيْبَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضِ حَافِرٌ وَمَا تَرَى نَفْسٌ مَّا أَكْتَثِبُ عَمَّا وَمَا تَرَى نَفْسٌ يَأْتِي أَرْضَ شَيْئٍ (2)۔ اور صحیحین میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال کے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر آپ نے یہ مکمل آیت پڑھی إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ كَعِلْمِ السَّاعَةِ (3) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت خثعمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ملک الموت علیہ السلام ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی کی طرف دیکھا شروع کر دیا۔ تو اس آدمی نے کہا یہ کون ہے؟ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا یہ ملک الموت ہے۔ تو اس آدمی نے کہا شاید یہ میری روح قبض کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لہذا آپ ہوا کو حکم فرمائیے کہ وہ مجھے اٹھائے اور سر زمین ہند میں پہنچا دے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے ایسا کر دیا۔ تو ملک الموت نے کہا میں بھی تجب سے مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں اس کی روح سر زمین ہند میں قبض کروں اور یہ ابھی آپ کے پاس موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف علم کی نسبت کی گئی ہے اور بندے کے لیے روایت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ روایت اس جاننے کو کہتے ہیں جس میں ذاتی حیلہ اور غور و فکر کا دخل ہو۔ اس سے دونوں علموں (علم اور روایت) کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ قاسموس میں ہے ذَرِئَتُهُ عَلِيْفَةُ او بَصْرُبٌ قِنْ حَيْلَةٍ کہ روایت کا معنی جانتا یا حیلہ اور فکر و نظر سے کسی چیز کو سمجھنا ہے۔ آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ خواہ کتنا ہی جلیل کرے اور اپنی ساری ظاہری اور باطنی قوتوں کو صرف کر دے وہ ان چیزوں کو بھی نہیں جانتا جن کا تحقق اس کے ذاتی کسب اور انجام سے ہے۔ تو وہ دوسری چیزوں کو کیسے جان سکتا ہے۔ ان امور کے جاننے کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا علم سکھا دے، خواہ رسولوں کے ذریعے سے یا اس پر دلائل قائم کر کے۔

سے بے شک اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے۔ اور وہ ان کے باطن کا علم ایسے ہی رکھتا ہے جیسے ان کے ظاہر کو جانتا ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ منصور (عباسی خلیفہ) نے حالت خواب میں ملک الموت کو دیکھا اور اس سے اپنی مدت عمر کے بارے پوچھا۔ تو ملک الموت نے اس کی طرف اپنی پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ تو خواب کی تعبیر بتانے والوں نے اس کی تعبیر میں پانچ سال یا پانچ مہینے یا پانچ دن بیان کیے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ارشاد فرمایا یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے کیونکہ یہ پانچوں علوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا) واللہ اعلم۔

سورۃ لقمان کی تفسیر 22 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اس سورتہ کا ترجمہ 6 فروری 2000ء بروز اتوار 12 رجب شب اختتام پذیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

www.muhammadiyah.com

سورة السجده

﴿اٰمِنًا ۲۰﴾ ﴿سُوْرَةُ السَّجْدَةِ ثَلَاثُوْنَ اٰيَةً﴾ ﴿رُكُوْعَاتُهَا ۲﴾

سورة السجده کی ہے۔ اس کی تیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَمْ نَنْزِلْ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَمِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

”الف۔ لام۔ میم اس کتاب کا نزول اس میں ذرا شک نہیں ہے سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔“

اے اگر اَلَمْ کو صورت یا قرآن کریم کا نام قرار دیا جائے تو پھر ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام تنزیل الیکلپ ہے۔

اس بناء پر کہ تنزیل مصدر بمعنی منزل (اسم مفعول) ہے۔ اور یہ اضافت اخلاق ثاب کے قبیل سے ہے۔ بصورت دیگر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اصل کلام هذا فنزل الیکلپ ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لا ریب فیہ ہے۔

۝ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ فیہ کی ضمیر سے حال ہے۔ کیونکہ مصدر خبر کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا کی خبر جانی ہو یا پھر خبر اول ہو اور لا ریب فیہ جملہ معترضہ ہو جس کا کوئی عمل نہیں۔ اور فیہ کی ضمیر جملہ کے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ اَفْتَرٰہٗۤ اَبَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اٰتٰہُمْ مِنْ

نَذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ لَعَلَّہُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝

”کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ہے تاکہ

آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جس نے آپ کے ساتھ کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پا سکیں۔“

اے اَمْ یَقُوْلُوْنَ اَفْتَرٰہٗ ہے۔ اور لا ریب فیہ الیکلپ سے حال ہے۔ یا جملہ معترضہ ہے اور مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ تنزیل کے متعلق ہے۔ اور فیہ میں ضمیر جملہ کے مضمون کے لیے ہے۔ اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے۔

اَبَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ کیونکہ یہ سابقہ کلام کے لیے تقریر دہرائی ہے۔ اس ترتیب کی بناء لفظ کلام نے پہلے قول باری تعالیٰ اَلَمْ کے ساتھ اجازت قرآن کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر اس پر یہ مرتب ہوا کہ یہ بالیقین رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اور اس کی مزید تاکید اس میں ریب اور شک کی نفی فرما کر کی۔ پھر اس کے بعد کلام کو کفار کے اس قول کی طرف پھیر دیا جو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے اس قول کا انکار بھی کیا اور اس پر اظہار توجہ بھی فرمایا۔ کیونکہ اس میں ام مقطعہ بل کے معنی میں ہے اور ہمزہ انکار کے لیے ہے۔ پھر

خدمت پر معذور کیا گیا ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام یا دوسرا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی جانب اس مقام تک چڑھ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

۱۔ یہاں یزوم سے مراد مطلق وقت ہے، صرف دن کی سفیدی مراد نہیں۔ کیونکہ ملائکہ کا اترنا اور آسمان کی طرف چڑھنا صرف دن کے ساتھ مختص نہیں۔ اور گلائِ وقتاً اترتے ترکیب کلام میں حال ہے اور اس سے پہلے تقدیر ہے۔ یعنی اس کے اترنے اور چڑھنے کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شاکر کرتے ہو۔ یعنی اگر انسانوں میں سے کوئی چل کر اسے طے کرے تو ہزار سال میں اسے طے کر سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے سبب اس کا نزول و عروج آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہو جاتا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ تو ملائکہ کے آسمان سے زمین کی طرف نزول و عروج کا وصف ہے۔ لیکن قول باری تعالیٰ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالْمُرُوءُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُورِیْوْنَ گَلاَئِ وَتَقْدِرُ اَمْرًا خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةً میں زمین سے سدرة المنتہی تک کی مدت مسافت کا ذکر ہے اور یہی سدرة المنتہی حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مقام ہے۔ اور جبرائیل علیہ السلام اور وہ فرشتے جو ان کے مقام کے مکین ہیں دنیوی ایام کے مطابق پچاس ہزار سال کی مسافت کو انتہائی قلیل وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ مذکورہ تمام تفسیر مجاہد اور ضحاک کے قول کے مطابق ہے (1)۔ یہ کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آجوں میں زمین سے لے کر سدرة المنتہی تک کی مسافت مراد ہو اور مسافت کا اختلاف چلنے والوں کی رفتار مختلف ہونے کی بنا پر ہو۔ کیونکہ ترمذی میں حضرت عباس بن عبد المطلبؓ کی حدیث میں ہے کہ زمین و آسمان کے مابین فاصلہ اکہتر، بہتر یا تہتر برس کا ہے (2)۔ اور امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان چلنے والوں کی رفتار کے مختلف ہونے کے بغیر تطبیق کا اور کوئی سبب نہیں۔ واللہ اعلم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا معنی یہ ہے امور دنیا کے آثار اسباب بناویہ یعنی ملائکہ وغیرہ کے ساتھ آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ پھر دنیا کے فنا ہونے، امراء کے امر اور حکام کے حکم کے منقطع ہونے کے بعد یہ امر اور تدبیر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو جائے گا اور یہ اس دن ہوگا جس کی مقدار ہزار سال ہے اور وہ یوم قیامت ہے۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فقرا و پانچ سو سال اور نصف دن اغنیاء سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالْمُرُوءُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُورِیْوْنَ گَلاَئِ وَتَقْدِرُ اَمْرًا خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةً سے مراد بھی قیامت کا دن ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بھی کسی خزانے کا مالک اپنے خزانے کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ تو اسے جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس کی چوڑی تلواریں بنائی جائیں گی اور پھر ان سے اس کی پٹیشانی اور پہلوؤں پر داغ دیے جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مابین اس دن فیصلہ فرمائے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پھر وہ اپنا راستہ جنت یا جہنم کی طرف دیکھ لے گا۔ اللہ حد (4)۔ مذکورہ دونوں حدیثوں کے درمیان بھی وجہ تطبیق یہی ہے کہ قیامت کے دن کی طوالت اشخاص کی طرف نسبت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ بعض لوگوں پر وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا اور بعض پر ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر اور بعض پر ایام دنیا سے بھی زیادہ خفیف اور ہلکا ہوگا حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ مرفوع اور موقوف

1- تفسیر ربوٰی جلد 5 صفحہ 183 (التاجریہ)

2- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 167 (دراست التعلیم)

3- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 319 (قدیمی)

4- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 58 (دراست التعلیم)

روایت میں مؤمنین پر یوم قیامت کی طوالت کا ذکر کیا ہے کہ اس کی مقدار ظہر اور عصر کے درمیان وقت کے برابر ہوگی۔ اسی طرح علامہ ابنوٹی نے ابراہیمؒ جی کا قول نقل کیا ہے (1)۔ اور ابو یعلیٰ، ابوہان اور یحییٰ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ یہ دن تو بہت طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک مومن کے لیے وہ دن انتہائی خفیف ہوگا حتیٰ کہ اس پر اس فرض نماز کی نسبت بھی زیادہ آسان اور ہلکا ہوگا جسے وہ دنیا میں ادا کرتا تھا (2)۔ علامہ ابنوٹی نے کہا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے کہا ہے کہ میں اور حضرت عثمان بن عفانؓ کا غلام عبداللہ بن فیروز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور اس آیت طیبہ اور خُصُفِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ کے بارے استفسار کیا۔ تو حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا یہ وہ ایام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہیں؟ اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں کتاب اللہ کے بارے وہ کچھ کہوں جو میں نہیں جانتا (3)۔ امام بیہقی نے ابن ابی طلحہ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے قول باری تعالیٰ یَعْدُ لَیْسَ یُؤْخَرُ وَكَانَ وَقْدُ امْرِئٍ اَلْفَ سَنَةٍ وَمَا تَعْدُوْنَ کے بارے نقل کیا کہ آپؓ نے کہا یہ دنیا میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فِیْ یَوْمٍ وَّكَانَ وَقْدُ امْرِئٍ اَلْفَ سَنَةٍ یہ قیامت کا دن ہے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر عذاب ہے (4)۔ جلال الدین محلی نے اسی روایت کو اپنی تفسیر میں پسند کیا ہے۔ اس آیت کے بارے ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہزار برس تک کے فیصلے فرمادیتا ہے اور فرشتہ انہیں لے کر زمین کی طرف نزول فرماتا ہے۔ پھر ایک ہزار سال گزرنے کے بعد دوسرے ہزار برس کے احکام لینے کے لیے وہ آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی اتارتے ہوئے امور و اطاعت کی تدبیر فرماتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف اس طرح خالص راجع نہیں ہوتا جیسے وہ راضی ہوتا ہے مگر اس طویل مدت میں، کیونکہ اعمال میں تخلصین کی تعداد کم ہوتی ہے۔

ذٰلِكَ عَلَیْمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَةُ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱﴾

”وہی جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ یعنی وہ مدبر جو کہ زمین و آسمان اور ان کے مابین تمام چیزوں کا خالق ہے۔ ترکیب کلام میں یہ ہوتا ہے اور اس کی خبر عَلَیْمُ الْغَیْبِ ہے۔ وہی جاننے والا ہے ہر اس شے کو جو مخلوق سے غائب اور مخفی ہے۔ اور جو ان کے پاس حاضر ہے۔ پس وہ حکمت کے مطابق امور کی تدبیر فرماتا ہے۔ وہ اپنے امر پر غالب ہے۔ اور اپنی تدبیر میں بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنے فضل اور احسان سے بندوں کی مصالحت کی رعایت فرماتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں یا تو عَلَیْمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَةُ کی تائید ہیں یا پھر اسی کی دوسری اور تیسری خبر ہیں۔

الَّذِیْ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ﴿۲﴾

”وہ جس نے بہت خوب بنایا۔ جس چیز کو بھی بنایا اور ابتدا فرمائی انسان کی تخلیق کی گارے سے۔“

۲۔ الذی اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر یا تو مذکورہ دو صفات کے بعد پھر صفت ہے یا پھر یہ اس کی چوتھی خبر ہے۔ ابن کثیر، ابو عمر و اور ابن عامر نے خَلَقَهُ میں لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ کُلُّ شَیْءٍ سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے

کو خوب اچھا بنایا اور حکمت کے مطابق اس میں وہ وافر استعداد رکھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تیار کیا اور جو اس کے مناسب ہیں۔ حضرت قتادہؓ نے اسی طرح کہا ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مفہوم اتقہ و احکمہ بیان کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو انتہائی مضبوط اور محکم بنایا ہے (2)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ أَحْسَنَ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ کے بارے فرمایا کہ بندہ کی سرین حسین نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کو محکم کیا ہے (3)۔ اور مقاتل نے احسن کا معنی علیم کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ ہر شے کو کیسے تخلیق فرماتا ہے۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے فَلَا يُخْسِنُ شَيْئًا۔ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ اس کام کے بارے خوب اچھی طرح جانتا ہو (4)۔ نافع اور کوفیوں نے صیغہ ماضی کی بناء پر خلقہ میں لام کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ شے کی صفت ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝۱

”پھر پیدا کیا اس کی نسل کو، ایک جوہر سے یعنی حقیر پانی سے۔“

۱۔ اور انسان یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء گارے سے فرمائی۔ پھر اس کی نسل کو پیدا کیا۔ چونکہ نسل کا معنی جدا ہونا ہے لہذا اسے نسل اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتی ہے۔

۲۔ نطفہ کو سلا لہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں من مین ماء مہین سلاۃ سے بدل ہے یا اس کا بیان ہے۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۝۲ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۳

”پھر اس (کے قد و قامت) کو درست فرمایا اور پھونک دی اس میں اپنی روح ۱ اور بنادے تمہارے لیے کان، آنکھیں

اور دل ۲۔ تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو۔“

۱۔ پھر انسان کے اعضاء کو ایسی صورت پر درست فرمایا جس پر انہیں ہوتا چاہیے اور پھونک دی انسان میں اپنی روح۔ یہ ضمیر یا تو ال انسان کی طرف راجع ہے یا اس کا مرجع أَحْسَنَ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ہے۔ رُوحہ میں اضافت تشریفی ہے۔ اور اس اظہار کے لیے ہے کہ انسان کی تخلیق انتہائی عجیب اور عظیم الشان ہے اور اس کی نسبت اس کی طرف سے جس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ اس کی کیفیت ہے۔ ۲۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور بنادے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل۔ تاکہ تم سنو، دیکھو اور سمجھو، حالانکہ اس سے قبل تم بغیر کان، آنکھ اور عقل کے صرف نطفہ تھے۔

۳۔ تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ اس میں ماضیہ وقت کی تاکید کے لیے ہے، یعنی بہت کم شکر کرتے ہو یا بہت کم وقت میں شکر ادا کرتے ہو، یعنی یہ نعمتیں عطا فرمانے والے پروردگار کی وحدانیت اور عبادت کا حق بہت کم ادا کرتے ہو۔

وَقَالُوا اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ اَلْفِ حَتَّىٰ جَدِیدٌ ۝۴ بَلْ هُمْ يَلْقَآئِیْ مَرْبُوْمٌ ۝۵

”اور کہنے لگے۔ کیا جب (حمرنے کے بعد) ہم کم ہو جائیں گے زمین میں تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے۔“

درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کر رہے ہیں۔“

۱۔ اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے منکرین کہنے لگے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف خُفِّلَ لَكُمْ السَّمْعُ پر ہے اور اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

۲۔ کیا جب ہم زمین میں غائب ہو جائیں گے، یعنی زمین کی مٹی کے ساتھ مل کر ایسے مٹی ہو جائیں گے کہ دونوں (مٹیوں) کے درمیان تمیز نہیں کی جاسکے گی تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے؟ اس معنی میں اصل عربوں کا یہ قول ہے ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّيْلِ (پانی دودھ میں گم ہو گیا)۔ یہ تب کہا جاتا ہے کہ جب پانی مکمل طور پر دودھ میں مل جائے اور اپنا وجود کھودے۔ ابن عامر نے اِذَا كُوْخِرَ هَوْنُ كَيْ بَاءَ پر ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس پر مابعد کلام عَزَّالَ الْفَنِّ حَقَّقَ صِدْقَ دِلَالَتِ کر رہا ہے اور وہ نَبُعث اور نُجِلُّدُ خَلْقًا ہے۔ تابع، کسائی اور یعقوب نے خبر کی بناء پر اِنَّا کو ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصلاً یہ قول ابی بن خلف کا ہے۔ لیکن اس کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے کیونکہ وہ تمام ان سے مشتق تھے۔ یہ استفہام برائے انکار ہے کیونکہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کو بعید سمجھتے تھے۔

۳۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کر رہے ہیں۔ یعنی اس جزاء کا انکار کر رہے ہیں جو دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد دی جائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے ان کے کفر کا ذکر کیا۔ تو اس سے اس جانب اشارہ کر دیا کہ وہ ان تمام معاملات کے منکر ہیں جو آخرت میں وقوع پزیر ہوں گے۔

قُلْ يَسُوْفُ لَكُمْ مَلِكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ اِلٰى رَبِّكُمْ تَرْجِعُوْنَ ۝۱

”فرمائیے جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

۱۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے تمہاری جان کو موت کا فرشتہ قبض کرے گا یعنی تمہاری جانوں کو اس طرح قبض کرے گا کہ ان میں سے کوئی نہیں نہیں چھوڑے گا یا پھر تم میں سے کسی کو باقی نہیں رہنے دے گا۔ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ باب تفعل اور استعمال دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیے جاسکتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے تَقَضَّيْتُمْ اور اِسْتَقَضَّيْتُمْ، اسی طرح تَعَجَّلْتُمْ اور اِسْتَعَجَلْتُمْ وغیرہ۔

۲۔ علامہ بغوی نے مکرّمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام قسم کی بیماریاں اور دردموت کی خبر دینے والے اور اس کے قاصد ہیں۔ پس جب مقررہ وقت آجاتا ہے تو ملک الموت آتے ہیں اور اگر یہ کہتے ہیں اے بندے! ایک بعد دیگرے کتنی خبریں، کتنے قاصد اور کتنے پیغام تیرے پاس آئے۔ اب میں تو ان کی خبر ہوں جس کے بعد اور کوئی خبر نہیں آئے گی اور میں وہ قاصد ہوں کہ میرے بعد اور کوئی قاصد نہیں آئے گا۔ اب طوعاً کرہاً تو نے اپنے رب کا حکم تسلیم کرنا ہی ہے اور جب فرشتہ اس کی روح قبض کر لیتا ہے تو اس کے (اہل خانہ) اس پر روتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر موت کا فرشتہ کہتا ہے کہ تم کس پر چیخ و پکار کر رہے ہو اور تم کس پر رور ہے ہو؟ قسم بخدا! میں نے اس کی مدت عمر کے بارے اس سے کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ ہی میں نے اس کا رزق کھایا ہے بلکہ اسے تو اس کے رب نے بلایا ہے۔ پس رونے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ پر روتے، قسم بخدا! میں تو

بار بار لوٹ کر آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں رہنے دوں گا۔

سے ہم نے ملک الموت اور ان کے معاون فرشتوں کے بارے احادیث کا تذکرہ سورۃ الانعام کی آیت **حَتَّىٰ اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمُ الْمَوْتُ** **تَوَكَّلْ عَلٰى سُلٰكُمُ سُلٰكُوهُمْ اَلَا يَتَذَكَّرُ لٰكُم مَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** کی تفسیر میں کر دیا ہے۔

مسئلہ: ملک الموت کو کسی کے وقت مقررہ کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ اسے اس کا حکم نہ دیا جائے۔ امام احمد اور ابن ابی الدین نے حضرت معمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت یہ نہیں جانتا کہ کسی انسان کی موت کا مقررہ وقت کیا ہے یہاں تک کہ اسے اس کی روح قبض کرنے کا حکم دے دیا جاتا ہے (تو پھر اسے معلوم ہوتا ہے)۔ ابن ابی الدین نے ابن جریج سے روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت کو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کی روح فلاں دن فلاں وقت قبض کر لے۔ (1)

مسئلہ: ملک الموت مومن کے لیے انتہائی حسین صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کافر کے لیے انتہائی قبیح اور خوفناک صورت میں۔ ابن ابی الدین نے حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلعت عطا فرمایا، تو ملک الموت نے بارگاہ الہی میں عرض کی کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں ابراہیم علیہ السلام کو جا کر یہ خوشخبری سنا دوں۔ تورب کریم نے انہیں یہ اجازت عطا فرمادی۔ چنانچہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو یہ خوشخبری سنائی۔ تو سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا الحمد للہ۔ پھر آپ نے کہا اے فرشتہ موت! یہ تو دکھا تو کفار کی رو میں کیسے قبض کرتا ہے! اس نے جواباً کہا اے ابراہیم! آپ اسے برداشت نہیں کر سکو گے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں! تو اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر فوراً آپ کی طرف متوجہ ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا ایک سیاہ رنگ کا آدمی ہے۔ اس کا سر آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ اور اس کے جسم کے ہر باں میں آدمی کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اس کے منہ اور مساموں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ پس یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر جب کچھ وقت کے بعد آپ کو افاقہ ہوا تو اتنے میں ملک الموت اپنی پہلی صورت اختیار کر چکا تھا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کسی کافر کو تیری صورت کے بغیر کوئی تکلیف اور غم نہ بھی لاحق ہو، تو اسے یہ تیری صورت ہی کافی ہے۔ پھر فرمایا اب یہ دکھا کہ مومنین کی ارواح کیسے قبض کرتا ہے۔ اس نے آپ کی جانب سے منہ پھیر لیا پھر جب وہ آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ نے اسے دیکھا کہ وہ ایک نوجوان آدمی ہے۔ اپنی شکل صورت کے لحاظ سے حسین تر ہے، اس کی مہک اور خوشبو انتہائی پاکیزہ ہے۔ اور سفید کپڑوں میں ملبوس ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کوئی مومن اپنی موت کے وقت تیری اس صورت کے بغیر عزت و کرامت اور آنکھوں کو تراوت بخشنے والی شے نہ بھی پائے، تو تیری یہی صورت اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے (2)۔ اور حضرت کعب سے مروی ہے کہ ملک الموت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی وہ صورت دکھائی جس میں وہ بندہ مومن کی جان قبض کرتا ہے تو آپ نے اسے ایسی پر رونق اور نورانی حالت میں دیکھا جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور جب اس نے اپنی وہ صورت ظاہر کی جس میں وہ کفار و فجار کی رو میں قبض کرتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے حتیٰ کہ آپ کے کندھوں پر عرشہ طاری ہو گیا، آپ نے اپنا پیٹ زمین سے چٹا لیا اور قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جاتی۔

مسئلہ: انسانوں کے سوا دیگر حیوانات کی موت کیسے ہوتی ہے؟

ابو الشیخ اور عقیلی نے الصنعاء میں اور دہلی نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام چوپائوں اور وحشرات الارض کی مدت عمر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کرنے تک ہوتی ہے۔ پس جب ان کی تسبیح و تحمید ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی ارواح قبض فرمالیتا ہے۔ ان میں سے کوئی شے ملک الموت کے سپرد نہیں (1)۔ خطیب نے ایک دوسری سند سے اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن علیہ اور رضی نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی ملک الموت کے واسطے کے بغیر ختم کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روحیں قبض کرنے کے لیے ملک الموت اور اس کے معاونین کو مقرر کیا ہے تاکہ اہل ایمان کی عزت و تکریم ہو اور کفار کے لیے ابانت و رسوائی اور عذاب کا باعث ہو۔ خطیب نے اپنی تفسیر میں شحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کو انسانوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس وہی ان کی ارواح قبض کرتا ہے۔ ایک فرشتہ جنات کے لیے، ایک شیاطین کے لیے اور ایک فرشتہ وحشی جانوروں، پرندوں، درندوں، مچھلیوں اور چوہنیوں کی موت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ چار فرشتے ہیں۔ تمام فرشتے پہلے صفہ میں ہی مرجائیں گے۔ ملک الموت ان کی ارواح قبض کرنے پر مقرر ہے۔ پھر وہ خود بھی مرجائے گا۔ لیکن وہ لوگ جو سمندر میں شہید ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ارواح خود قبض کرتا ہے۔ ان کی عزت و تکریم کی خاطر انہیں ملک الموت کے سپرد نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں سمندر کا سفر طے کرتے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی جویر ہے جو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور شحاک اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان القطاع بھی ہے۔ اور اس کے آخری حصہ کی شاہد روایت مرفوع ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے سمندر کے شہداء کے بغیر تمام لوگوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے ملک الموت کو مقرر کیا ہے۔ کیونکہ ان شہداء کی ارواح قبض کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں عشق و معرفت کے سمندر میں شہید ہونے والے بدرجہ اولیٰ اس عزت و تکریم کے اہل و مستحق ہیں۔ واللہ اعلم۔

پھر موت کے بعد ملائکہ رحمت مومن کی روح لے کر آسمانوں کی طرف چڑھ جائیں گے یہاں تک کہ وہ اسے ساتویں آسمان تک لے جائیں گے۔ اور کافر کی روح ملائکہ عذاب لے جائیں گے یہاں تک کہ اسے لے کر جب آسمان دہرا پہنچیں گے۔ وہ اس کا دروازہ کھولنے کا مطالبہ کریں گے لیکن وہ نہیں کھولا جائے گا۔ پس اس روح کو وہیں سے پھینک دیا جائے گا۔ الحدیث۔ یہ حدیث سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہیں حشر کے بعد حساب و کتاب کے مقام کی طرف زندہ کر کے لوٹایا جائے گا۔ پھر ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی۔ پھر حشر کے بعد ان کے حال کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۖ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا
فَاَرْجِعْنَا عَمَلًا اِنَّا مُوقِنُونَ ﴿۵۰﴾

”اور کاش! تم دیکھو جب مجرم اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے! (کہیں گے) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا ہے اور (کانوں سے) سن لیا ہے پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب

ہم نیک عمل کریں گے۔ ہمیں اب پورا یقین آ گیا ہے۔“

لے اور کاش اے محمد! ﷺ تم دیکھو۔ جب مجرم یعنی وہ مشرکین جنہوں نے یہ کہا: *وَقَالُوا لَوْلَا اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَذًا لِّلَّذِينَ خَلَقُوا* جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے تو ندامت اور غم کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہیں گے ترکیب کلام میں *لَا يَكُونُ* *ذُؤُوبِهِمْ* معجزوں کی نصیر سے جاتی ہے اور عند ربہم *لَا يَكُونُ* کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے لیے حال مترادف ہے۔ یا اس کے جواب میں مستاتھ ہے جو وہ اس وقت کہیں گے۔

لے اسے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اس وعدہ کو جو تو نے ہم سے کیا تھا اور ہم اسے جھٹلاتے تھے۔ اور ہم نے اس بارے میں تیری جانب سے رسولوں کی تصدیق اپنے کانوں سے سن لی ہے جس بارے میں ہم انہیں جھٹلاتے تھے۔ اور ان کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے گناہوں کو دیکھ لیا ہے اور جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہم نے سن لیا ہے۔ پس ایک بار ہمیں دنیا کی طرف بھیج اب ہم نیک عمل کریں گے۔ *نَعْمَلْ* جواب دعا ہونے کے سبب مجزوم ہے۔

لے ہمیں اب اس کے بارے پورا یقین آ گیا ہے جس میں ہم اس سے قبل شک کیا کرتے تھے۔ یہاں *لَوْ* کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے لو ایت امر! قطعاً۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لغوی کے لیے ہو۔ اور *لَوْ* اذ میں ماضی کا مقبوم اس اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو شے ثابت ہے وہ واقعہ ہونے والی کے قائم مقام ہی ہے۔ اور قوی کا مفعول مقدر نہیں ہوگا کیونکہ معنی یہ ہے کاش اس وقت تمہاری جانب سے رویت ہو۔ یا مفعول مقدر ہوگا جس پر اذ کا صلہ دلالت کرتا ہے۔ یعنی کاش آپ ان کے سروں کو جھکا ہوا دیکھیں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ⑤

” (جواب لے گا) اور اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے لے کہ میں ضرور مجرموں کا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے مل۔“

لے اور اگر ہم چاہتے کہ ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیں، یعنی ایسی شے عطا فرمادیں جس سے ایمان اور عمل صالح کی طرف ہدایت حاصل کی جاسکتی ہو۔ اور اپنے اختیار سے قلب و بدن میں رسولِ مکرم کی اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات پیدا کر دے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اگر ہم ہر نفس کی ہدایت چاہتے تو ہم جن و انس میں سے ہر ذی عقل (ہدایت) دے دیتے۔ لیکن انہیں ہدایت نہ دینے والے کے ہدایت نہ پانے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے کے بارے میں رائے عملہ ثبت ہو چکا ہے۔ یا مقبوم یہ ہے کہ میری یہ وعید اور دھمکی سبقت لے جا چکی ہے۔

لے الجنتہ اور الناس دونوں پر الف لام عہدی ہے۔ اور ان سے مراد ان دونوں فریقوں کے مجرم ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے (کہ میں جہنم کو ضرور مجرموں کا تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے)۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو جنت کا اہل کیا اور انہیں اس وقت سے ہی جنت کا اہل بنا دیا اور آسمان علیہ ا بھی وہ اپنے آباء کی صلیوں میں تھے۔ اور بعض کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا اور انہیں اس وقت سے ہی جہنم کے لیے بنا دیا اور آسمان علیہ ا بھی وہ اپنے آباء کی صلیوں میں تھے (رواہ مسلم ۱۸)۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا تم میں سے کوئی بھی نہیں مگر اس کے لیے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے یا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی اس تحریر پر توکل نہ کر لیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا عمل کرو، پس وہی کام آسان کیا جاتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ پس وہ آدمی جو اہل سعادت میں سے ہو اس کے لیے اہل سعادت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے اور جو اہل شقاوت (بد بخت) میں سے ہو اس کے لیے اہل شقاوت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے۔ پھر آیت کریمہ تلاوت فرمائی گئی فَاَمَّا مَنۡ اَعْطٰی وَ اَنْشَقَّ ۙ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی الْاٰیۃِ۔ (متفق علیہ (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ کے دست مبارک میں دو کتابیں تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ہمیں مطلع نہیں فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کتاب کے بارے میں جو آپ ﷺ کے دائیں ہاتھ میں تھی، یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب (میزان) کر دیا گیا ہے۔ پس ہمیشہ کے لیے نہ ان میں اضافہ کیا جائے گا اور نہ ان سے کسی کو کم کیا جائے گا۔ پھر اس کتاب کے بارے میں جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی فرمایا یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جہنم کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب کر دیا گیا ہے۔ پس اب ان میں نہ اضافہ کیا جائے گا اور نہ کسی کی جائے گی۔ تو یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کیا ضرورت ہے جبکہ یہ امر مکمل ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سیدھے (سج) عمل کرتے چلو اور قریب ہوتے جاؤ کیونکہ صاحب جنت کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ اور صاحب نار کا خاتمہ اہل نار کے عمل پر کیا جائے گا اگرچہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا اور ان دونوں کو جھڑپا دیا۔ پھر فرمایا تمہارا رب اپنے بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو چکا ہے۔ پس ایک فریق جنت میں ہے اور ایک جہنم میں ہے۔ اسے ترہی نے روایت کیا ہے (2)۔ جملہ تَلَامَنَ مُحَمَّدٌ قَسَمَ کا جواب ہے۔ اور قول مذکور کا بیان ہے۔ اس میں ہُوَ مقدر ہے یا اس سے بدل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ حق القول قسم کے حکم میں ہے جیسے کہا جاتا ہے حَقًّا لَا فَعْلَنَ كَذَا۔ پس اسی بناء پر تَلَامَنَ اس کا جواب ہوگا۔ مقاسل نے کہا ہے قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ابلیس کے بارے ہے لَا مَلَكٌ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمَنْ يَتَّبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِينَ (3)۔ اور اس میں یہ تصریح ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب عدم مشیت ہے۔ اور حق القول عدم مشیت کے لیے تقریر دیتا نکید ہے اور معنی یہ ہے لیکن میں نے ہی ان کا کفر اور جہنم میں ان کا ٹھکانہ چاہا۔ یا قضاء سابق کے سبب عدم مشیت کی تعلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب کا مزہ چکھنے کا سبب عاقبت کو بھولنے اور اس میں غور و فکر نہ کرنے کو آئندہ ارشاد میں قرار دیا ہے لیکن اس سے قضاء سابق کے علت ہونے کا انکار نہیں ہوگا۔

فَقُلْ وَاٰیۡہَا اَسۡبِیۡتُمْ لِقَآءِ یَّوۡمِکُمۡ هٰذَا ۙ اِنۡ اِنۡ اَسِیۡبُکُمۡ وَ دُوۡقُوۡا عَذَابَ الْخُلٰیۡہَا
لَکُمۡ تَعَمَّلُوۡنَ ﴿ۛ﴾

”پس اب چکھو اس جرم کی کڑم نے بھلا دیا تھا اس روز کی ملاقات کو۔ ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔ اور چکھو ابھی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔“

۱۔ یہ فاعل سید ہے۔ یعنی جب میری طرف سے بات اس طرح طے ہو چکی ہے۔ جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو جہنم کے داروں نے انہیں کہیں گے جہنم کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس سبب سے کہ تم نے اپنے اس روز کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور اس سے مراد یوم بعثت اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا دن ہے اور ہذا، یوم مہم کی صفت ہے۔ یہاں تک کہ تم نے عذاب کا سبب بننے والے اعمال کیے۔
۲۔ تو ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔ یعنی ہم نے تمہیں رحمت سے محروم کر دیا یا عذاب میں چھوڑ کر بھلا دیا گیا۔ اور اس کے جملہ مستاتھ ہونے اور فصل کی بناءً اور اس کے اسم پر کرنا ان سے انتقام اور بدلہ لینے میں شدت کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

۳۔ اور چکھو ابدی عذاب ان کرتوتوں کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔ اس میں ذُوْ قُوۡا امر تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں صراحۃً ان کے عذاب کی علت کفر، معاصی اور ان کے دیگر برے اعمال کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل آخرت کے امور میں غور و فکر اور تدبیر نہ کرنے کو عذاب کی علت قرار دیا ہے۔ لہذا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے عذاب کا تقاضہ کرتی ہیں۔ اور یہی آیت ہماری جبریہ اور قدریہ کے خلاف حجت ہے۔ جبریہ کے خلاف قول باری تعالیٰ بِمَا نَسِیْتُمْ حِجَّتَہِ۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عذاب کا مزہ چکھنے کے سبب آخرت کے امور کو بھولنا اور اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالح کو ترک کرنا قرار دیا ہے (جبکہ جبریہ بندے کو مجبور محض خیال کرتے ہیں) اور قدریہ کے خلاف اس طرح حجت ہے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے تمام بندوں کے بارے میں ایمان اور اعمال صالح کی مشیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی مشیت اور اختیار سے ایمان کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور آیت طیبہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نہ تو مکمل جبر ہے اور نہ ہی مکمل اختیار انسان کے حوالے کیا گیا ہے بلکہ معاملہ ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے۔

اٰتٰمَایُوْمِنْ یَّایٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِہَا حَسِبُوْا اِھْوَۃً سَیِّئًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہُمْ وَّ
ہُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۶

”صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے تو گر پڑتے ہیں
عبدہ کرتے ہوئے ۱۔ اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے ۲۔“
۱۔ صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے چہروں کے بل عبدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ اور ہر اس شے سے پاکی بیان کرتے ہیں جو اس کے لائق نہیں۔ جیسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہونا وغیرہ۔

۲۔ اور وہ اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہیں اس نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے کہ اللہ نے انہیں اسلام لانے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اور اس نے انہیں ہدایت عطا فرمائی۔ چنانچہ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں سبحان اللہ وبحمدہ۔ اور وہ ایمان اور اطاعت قبول کرنے سے غرور و تکبر نہیں کرتے۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُہُمْ عَنِ الْمَصَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّہُمْ حَوَاقًا وَطَعًا ۚ وَّ مِمَّا سَرَّہُمْ
یُبْقَوْنَ ۝۷

”دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے پکارتے ہیں اے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہتے ہیں۔“

اے سبحو! کے فاعل سے حال ہے، یعنی ان کے پہلو اٹھتے ہوتے ہیں اور دور رہتے ہیں ان بستروں سے جن پر وہ سوتے ہیں یَا عَزَّوَجَلَّ جنوہم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور وہ تنجافی کا فاعل ہے اسی طریقہ پر جیسا کہ ذابو لَآءِ مَقْلُوْعٌ مُّضَبِحٰتٍ ہے۔

اے اپنے رب کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے۔ اور اس کی رحمت و ثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ بناد نے اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا۔ پکارنے والا انہیں اپنی آواز یکساں سنا سکے گا اور آنکھ ان تمام کو دوسرے کنارے تک دیکھ سکے گی۔ پس اس صورت میں ایک نداد ہے والا کھڑا ہوگا اور وہ نداد ہے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنی خوشحالی اور غنیگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے۔ تو یہ آواز سن کر کچھ لوگ کھڑے ہوں گے لیکن وہ تعداد میں انتہائی قلیل ہوں گے۔ پس وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ وہ نداد ہے گا کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو بستروں سے دور رہا کرتے تھے۔ پس وہ کھڑے ہوں گے اور تعداد میں تھوڑے سے ہوں گے وہ بھی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر ساری مخلوق کھڑی ہوگی اور اس سے حساب لیا جائے گا (1)۔ ابن راہویہ اور ابو یعلیٰ نے اپنی مسندوں میں اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے وہ پہلے ایسی آواز کے ساتھ نداد ہے گا کہ اسے تمام مخلوق سنے گی اور وہاں جمع ہونے والے تمام لوگ یہ جان لیں گے کون ہے جو سب سے زیادہ عزت و شرف کے اہل ہے۔ حسن، مجاہد، مالک، اور ابی ابراہیم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت سے مقصود تہجد گزار لوگ ہیں جو کہ رات کی نماز کے لئے اٹھتے ہیں (2)۔ احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ اور ابن راہویہ نے اپنی مسندوں میں اور حاکم نے حضرت معاویہ سے نقل کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے ایسے عمل پر مطلع فرمائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور مجھے جہنم سے دور لے جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت عظیم سوال کیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بہت آسان ہے جس پر اللہ تعالیٰ اسے آسان فرمادے تو فقط اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرا۔ نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر، رمضان المبارک کے روزے رکھ اور بیت اللہ شریف کاج ادا کر۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں ابواب الخیر (بھلائی کے دروازے) پر تمہاری راہنمائی نہ کر دوں۔ فرمایا روزہ و افعال ہے، صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور آدمی کی وہ نماز جو رات کے وسط میں ادا کرے (بھی اسی میں سے ہے)۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت یَعْمَلُونَ مَلَاحِدًا فَرَمٰی تَنجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ اَلَدِیْہِ۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہاری راہنمائی نہ کر دوں کہ رُس الامر کیا ہے۔ اس کا ستون کیا ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ! ﷺ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا رُس الامر (دین کا سر) اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں مطلع نہ کر دوں کہ ان تمام کی اصل اور جڑ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا نبی اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا اسے روک کر رکھ۔ یہ سن کر میں نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! کیا ہم زبان سے جو گفتگو کرتے ہیں اس پر ہمارا مواخذہ کیا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ حیر کی ماں تھ پر روزے بانوں کے سبب ہی تو لوگوں کو اپنے مومنوں یا ناکوں کے بل جہنم میں ڈالا جائے گا (3)۔ ابوامالک اشعریٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

شک جنت میں ایسے کمرے ہیں جن کا ظہران کے باطن سے (باہر اندر سے) اور ان کا باطن ظاہر سے (اندر باہر سے) دکھائی دے گا اللہ تعالیٰ نے وہ ان کے لیے تیار فرمائے ہیں جو گفتگو نرمی سے کرتے ہیں، (مستحقین کو) کھانا کھلاتے ہیں، مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کے وقت نماز (تہجد) پڑھتے ہیں جبکہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں (1)۔ اسے بتاتی کہ شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے حضرت عائشہؓ سے اس طرح روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان المبارک کے بعد افضل ترین روزہ محرم کے ہیں جو کہ شہر اللہ ہے اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ اور امام احمد نے اس کے آخری حصے میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین وہ نماز ہے جو رات کے وسط (جوف) میں ادا کی جائے (3)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو پسند کرتے ہوئے اظہار فرماتا ہے، ایک وہ آدمی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے درمیان سے بستر سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت (نماز) کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ اس نے میری جانب سے ملنے والے ثواب کی رغبت رکھتے ہوئے اور میری جانب سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے بستر اور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور دوسرا وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے شریک ہوا۔ پھر نکلت نکلتے ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کی۔ پھر اسی دوران اسے علم ہوا کہ نکلت نکلت کر بھاگنے میں اس پر کتنی زیادہ گرفت ہے اور واپس لوٹنے میں اس کے لیے کتنا زیادہ ثواب ہے۔ چنانچہ وہ واپس لوٹ پڑا۔ یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ یہ میری طرف سے ملنے والے ثواب میں رغبت رکھتے ہوئے اور میری طرف سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے واپس لوٹ آیا یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا (4)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ فرماتے تھے کہ یہ ہیں۔

وَفِينَا رَسُولُ اللَّهِ يَنْتَلُو كِتَابَهُ إِذَا انْشَقَّ مَعْرُوفٌ مِنَ الْفَجْرِ سَاطِعٌ

اور ہم میں رسول اللہ ﷺ ہیں جو کہ سپیدہ فجر کے طلوع ہونے کے وقت کتاب الہی کی تلاوت فرماتے ہیں۔

أَرَأَيْتَ الْهَلْدَى بَعْدَ الْعَمَى فَقُلُوبُنَا بِهِ مَوْقِنَاتٌ أَنْ مَا قَالٌ وَاقِعٌ

آپ ﷺ نے ہمیں اندھے پن کے بعد راہ ہدایت دکھائی۔ پس ہمارے دل اس پر یقین رکھتے ہیں کہ جو آپ نے فرمایا وہی حق ہے اور واقع ہو کر رہے گا۔

يَنْبُتُ بُجَابِي جَنْبَهُ عَنْ فِرَاشِهِ إِذَا اسْتَقَلْتُ بِالْكَافِرِينَ الْمَصَاجِعِ

آپ ﷺ رات اس طرح بسر کرتے ہیں کہ اپنا پہلو بستر سے دور رکھتے ہیں (یعنی نحو عبادت رہتے ہیں) جبکہ کفار کے بستر ان کے بوجھ سے ٹٹل محسوس کرتے ہیں۔

وہ احادیث جو کہ رات کی نماز کی فضیلت کے بارے میں مروی ہیں، ہم نے سورہ مزمل کی تفسیر میں ان کا ذکر کیا ہے (5)۔ ترمذی نے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (دورات تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)

3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 186 (اتحادیہ)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 187 (اتحادیہ)

حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ یہ آیت تَنَحَّاهُ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (مغرب کی نماز کے بعد) عشاء کی نماز کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹتے تھے یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز بھی ادا کر لیتے۔ حضرت انسؓ سے ہی یہ روایت بھی ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ مغرب کی نماز سے لے کر عشاء کی نماز تک نماز پڑھ رہے تھے۔ اسے ابن مردودہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ اس کی اصل سنن ابی داؤد میں ہے۔ یہی قول ابو حاتم اور محمد بن منکدر کا ہے ان دونوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز اذانین ہے (2)۔ ابن نصر نے محمد بن منکدر سے مرسل روایت نقل کی ہے جس نے وہ نماز پڑھی جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہے، پس وہ صلوٰۃ الاذانین ہے۔ بزار سے ضعیف سند کے ساتھ حضرت بلالؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھا کرتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کچھ لوگ مغرب سے عشاء تک نماز پڑھ رہے تھے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تَنَحَّاهُ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (3)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابوالدرداء، ابوذر راور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں مقصود وہ لوگ ہیں جو عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (4)۔ امام مسلمؒ اور امام احمدؒ نے حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی، تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی، تو گویا اس نے ساری رات نماز کے لیے قیام کیا (5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا ثواب جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اذان دینے اور صف اول میں کھڑے ہونے کی وسعت نہ پاتے تو وہ باقیین اس کے لیے قرعہ اندازی کرتے۔ اور اگر وہ نماز ظہر میں شریک ہونے کا ثواب جان لیتے تو وہ باقیین اس کی طرف تیزی سے آتے۔ اور اگر وہ عشاء اور صبح کی نمازوں کا ثواب جان لیتے تو وہ ان کی طرف ضرور آتے اگرچہ سرین کے بل ہی آنا پڑے (6)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمدؒ و نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد فرض صدقہ (زکوٰۃ) ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عام و جودہ خیر ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۰﴾

”پس نہیں جانتا کوئی شخص جو (نعمتیں) چھپا کر رکھی گئی ہیں ان کے لیے، جن سے انھیں ٹھنڈی ہوں گی، یہ صلہ ہے

ان (اممال حسنة) کا جو دہ کیا کرتے تھے۔“

۱۔ پس کوئی شخص نہیں جانتا، یعنی نہ کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ ہی نبی مرسل جو (نعمتیں) ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں۔ مزہ اور یعقوب نے اخفیٰ میں یا کوسا کن پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اخفیٰ کا مضارع ہے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت نُخْفِیٰ بھی کرتی ہے۔ اور باقیوں نے اسے ماضی مجہول ہونے کی بناء پر یا کو مفتوح پڑھا ہے۔

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (اتحاریہ)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (اتحاریہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 337 (مطبعیہ)

6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 182 (قدیمی)

5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی)

ج۔ جن سے آنکھیں بندھنی ہوں گی۔ یہاں بن زائدہ ہے اور قُرْۃُ اَعْيُنِ جزوہ کی قرأت کے مطابق محل نصب میں ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق محل رفع میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے ان کے بارے میں سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا خیال نہیں آیا۔ اگر تم چاہو تو بڑھو فلا تعلم نفس ما اخفي لهم من قُرْۃِ اَعْيُنِ۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا یہ نعمت ہے جس کی کوئی تفسیر و تشریح بیان نہیں کی گئی۔

ج۔ جزاء مفعول مطلق یا مفعول لہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی یجزون جزاء یا اخفي للجزاء۔ (انہیں یہ صلہ دیا جائے گا یا صلہ دینے کے لیے اسے جفی رکھا گیا ہے) علامہ بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ و احدی اور ابن عساکر نے سعید بن جبیر کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے درمیان کسی شے کے بارے میں کچھ جھگڑا ہوا اور باہم گفتگو بھی ہوئی۔ پس ولید نے حضرت علیؓ سے کہا تو خاموش رہ۔ کیونکہ تو ابھی بچہ ہے اور تم بخدا میں تجھ سے زیادہ زبان دراز ہوں، تجھ سے زیادہ بہادر ہوں اور لشکر میں تجھ سے بڑھ کر پہلوان ہوں۔ تو حضرت علیؓ نے جواب فرمایا خاموش ہو جا کیونکہ تو فاسق ہے (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَكُنْ كَانٌ مُّؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ۝۱۰

”تو کیا جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟“ (نہیں) یہ یکساں نہیں ج۔

ل۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی مثل روایت نقل کی ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن عدی نے کبھی کی سند سے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خطیب اور ابن عساکر نے ابن لہیعہ عن عمرو بن دینار عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؓ اور عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان کچھ غلط الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ یہ استفہام انکاری ہے اور قاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا علی المرتضیٰ جو اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں اور ولید جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے برابر ہو سکتے ہیں۔ اور جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ فاسق سے مراد جو اہل ایمان سے خارج ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔

ج۔ یہ شرف اور ثواب میں یکساں نہیں ہے۔ لا یستَوون جمع کا صیغہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد ہمیں مومن اور کافر ہے۔ یہ جملہ مساوات کے انکار کے لیے تقریر اور تاکید ہے۔ پہلے استثنیٰ کا مجمل ذکر فرمایا پھر اس کی تفصیل اس ارشاد سے فرمائی۔

اَمْۤا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جِزَآءٌ مَّاۤوٰی نَزَّلْنَا بِهَاۤ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوۡا ۝۱۱

”پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں بطور نسیانیت ان (نیکوں)

کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔“

ل۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں کیونکہ وہی حقیقی ٹھکانہ ہے۔ اور دنیا تو ایسا گھر ہے جس سے بالیقین کوچ کرنا ہی ہے۔ اہل ایمان جنتوں کو چاہے پناہ بنا رہے ہیں اور کفار اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

شرک کا ارتکاب کر کے ان میں داخل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ ”لَوْلَا“ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان نوازی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جنت سے حال ہے اور وہ طرف کے لیے فاعل ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَسَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُمْ بِهَا تَكْفُرُونَ ①

”اور جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ابدی ٹھکانہ آگ ہے جتنی مرتبہ وہ ارادہ کریں گے کہ (کسی طرح) یہاں سے نکل

جائیں (تو ہر بار) انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں اور انہیں کہا جائے گا چلو آگ کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

۱۔ اور جنہوں نے کفر کیا تو ان کا ابدی ٹھکانہ آگ ہے۔ یعنی انہوں نے جنت میں ٹھکانا بنانے کے بدلے جہنم میں بنالیا۔ اور کُلَّمَا اَسَادُوا اَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا اُعِيدُوا فِيهَا سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اور قِيلَ لَهُمْ اَلَا يَكْفُرُ اَنْ يَكُونَ لَكُمْ رُءُوسُ اَنْ يَكُونَ لَكُمْ رُءُوسُ اور ان کے غیض و غضب میں اضافہ کرنے کے لیے انہیں کہا جائے گا۔

وَلَنَذِرَنَّهُمْ يَوْمَ الْعَذَابِ الْاَلَدِيِّ دُونَ الْعَذَابِ الْاَلَدِيِّ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ②

”اور ہم ضرور پکھڑاتے رہیں گے انہیں تھوڑا تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ وہ (فسق و فجور سے) باز آجائیں۔“

۱۔ یہ مَا وَلَعْنَهُمُ النَّارُ پر معطوف ہے۔ قَوْلَ الْعَذَابِ الْاَلَدِيِّ سے مراد عذاب دینا ہے۔ ابی بن کعب، شہاک، حسن اور ابی انیم نے کہا ہے اس سے مراد دنیا کی مصیبتیں اور بیماریاں ہیں (۱)۔ والہی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کی ہے۔ مکرّم کا قول ہے اس سے مراد حدود ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد مکہ مکرمہ میں وہ سات برس کی قسط سالی ہے جس میں انہوں نے مردار، ہڈیاں اور کتے تک کھائے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد غزوہ بدر میں ان کا کلو اربوں کے ساتھ قتل کیا جانا ہے (۲)۔ اور یہی قول قتادہ اور سعدیؓ کا ہے۔ الْعَذَابِ الْاَلَدِيِّ سے مراد عذاب آخرت ہے۔ تاکہ وہ ایمان کی طرف لوٹ آئیں۔ یعنی ان میں سے وہ جو قسط اور میدان بدر میں مرے سے باقی بچے ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَهُونَ ③

”اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پھر اس نے روگردانی کی ان سے بے

شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے۔“

۱۔ اور کوئی بھی اس سے زیادہ ظلم کرنے والا نہیں جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی گئی پھر اس نے روگردانی کی۔ اور ان میں غور و تدبر نہ کیا۔ اس میں فُتْم اس پر اظہار توبہ کے لیے ہے کہ اس کے باوجود کہ یہ آیات انتہائی واضح ہیں اور دونوں جہاں کی سعادت کی طرف ہدایت اور آہنما کی بھی فراموشی نہیں یہ پھر بھی اغراض ہی کرتے جا رہے ہیں۔ بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے تو پھر اسے کیسے چھوڑ دیں گے جو تمام سے زیادہ ظلم کرنے والا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ ④

”اور بے شک ہم نے عطا فرمائی تھی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب لے تو آپ شک میں مبتلا نہ ہوں ایسی کتاب کے ملنے سے لے اور ہم نے بنایا تھا اسے ہدایت بنی اسرائیل کے لیے لے۔“

لے یہ معذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ اپنے معطوف سمیت اِنَّا مِنَ اللّٰهِ جُزْءٌ مِّنْ فَتْنَتَيْنِ اور اِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَبْخُلْنَ بِكَ جملہ معترضہ ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے آپ کو قرآن عطا فرمایا اسی طرح اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) عطا فرمائی تھی۔ لے اے محمد! آپ ایسی کتاب کے ملنے سے شک میں مبتلا نہ ہوں۔ لہذا مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور فاعل معذوف ہے، یعنی اگر آپ نے قرآن کریم حاصل کیا ہے تو یہ ایسا نیا امر نہیں جو اس سے پہلے نہ ہوا ہو، یہاں تک کہ آپ اس میں شک کرنے لگیں۔ یا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رضامندی اور قبولیت کے ساتھ کتاب حاصل کی تھی آپ کو شک نہیں کرنا چاہئے سدی نے اسی طرح کہا ہے (1)۔ اور برطانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ فَلَا تَكُنْ فِيْ حُزْنٍ مِّنْهُ لَيَقْلِبَنَّ اَمْرُكَ وَاَنْتَ سَاجِدٌ کے بارے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب کے ساتھ ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم شب معراج موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو (2)۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

یہ شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شب معراج موسیٰ علیہ السلام کو گندی رنگ، دراز قد اور گھٹکھریالے بالوں والا آدمی دیکھا۔ گویا کہ آپ (قبیلہ ازد) شبنوآ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ متوسط القامت، سرخ و سفید رنگ اور سیدھے بالوں والے آدمی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو آیات و نشانیاں مجھے دکھائیں ان میں میں نے داروغہ جہنم مالک کو بھی دیکھا اور جال کو بھی۔ پس تو اس ملاقات میں کوئی شک نہ کر۔ فَلَا تَكُنْ فِيْ حُزْنٍ مِّنْهُ لَيَقْلِبَنَّ اَمْرُكَ وَاَنْتَ سَاجِدٌ (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر تھے کہ ہمارا گدڑ ایک وادی کے پاس سے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وادی کون سی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ وادی ازرق ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اب بھی (شب معراج کی مثل) موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں جب کہ اس وقت میں اس وادی سے گزر رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے رنگ اور بالوں کا تذکرہ کیا کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ کر بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کرتے گزر رہے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا پھر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک گھاٹی کے پاس آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ گھاٹی کونسی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ مرثا اغت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، اونٹنی جبہ زریب تن کیے ہوئے ہیں اور اونٹنی کی مہار پکڑے لبیک کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ سورہ بنی اسرائیل میں حدیث معراج کے ضمن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو چھ آسمان پر دیکھا اور نماز کے معاملہ میں ان کی طرف مراجعت فرما ہوئے یعنی بات چیت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مجھے رات کے وقت (معراج کے لیے) آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔ (5)

1- تفسیر بنو، جلد 5 صفحہ 188 (التحاریہ)

2- تفسیر برطانی، جلد 12 صفحہ 160 (الاسیۃ)

5- تفسیر بنو، جلد 5 صفحہ 188 (التحاریہ)

4- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 95 (قدیمی)

3- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 94 (قدیمی)

سَوْخَفَلْنَهُ میں ہضمیر سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور قنادہ نے کہا ہے ہضمیر مفعول کا مرجع حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں (۱)۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے راہبر بنادیا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لِمَا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا لِيَتَّبِعُوا قَوْمُونَ ﴿٢٠﴾

”اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے ۱۔ جب تک وہ صابر رہے اور جب

تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے ۲۔“

۱۔ اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے بعض کو پیشوا بنادیا جن کی ہر بھلائی میں اقتداء کی جاتی تھی۔ اور ان سے مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جو ان میں موجود تھے۔ اور قنادہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد انبیاء علیہم السلام کے پیروکار اور تبعین ہیں (۲)۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ان احکام کی طرف راہبری کرتے رہے جو اس کتاب میں موجود تھے۔ یا اس توفیق سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی۔

۲۔ حمزہ اور کسائی نے لَمَّا کو لَمَّا یعنی لام کو کہہ کر اور صبر کو صَبَر یعنی ان کے صبر کے سبب۔ اور باقیوں نے لام کو مفتوح اور صبر کو مشدد پڑھا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے دین پر اور صبر میں اپنے دشمنوں سے اذیتیں برداشت کرنے میں صابر رہے۔ لہذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ (مصائب و آلام پر) صبر کرنے کے سبب لوگوں کی امامت کا منصب عطا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہماری آیات میں گہری غور و فکر کرنے کے سبب ان پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٢١﴾

”بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن، جن امور میں وہ (باہمی) اختلاف کیا کرتے تھے ۱۔“

۱۔ بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن امور دین میں جن میں وہ باہمی اختلاف کیا کرتے تھے۔ کہ وہ اہل حق کو اہل باطل سے ممتاز فرمائے گا۔ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے إِنَّهُم مِّنَ الْمُخْتَلِفِينَ فَتُفْصَلُونَ۔ اور اس میں نظم سے غیبت کی طرف التفات ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يََسْتَوْنَ فِي مَسْئِلِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۚ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٢﴾

”کیا یہ حیران کی ہدایت کا باعث نہ بنی تھی تو میں تمہیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا حالانکہ یہ چل پھر رہے

ہیں ان کے مکانون میں ۱۔ بے شک ان میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں۔ کیا وہ ان (دردیوار سے داستان

عبرت) نہیں سن رہے ۲۔“

۱۔ حمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور وہ او محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے اور اس میں فاعل ضمیر ہے جو کہ دُشک کی طرف راجع ہے۔ یا فاعل وہ ہے جس پر نَحْمُ أَهْلَكْنَا دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ کیا انہوں نے اپنے اسلاف سے عبرت حاصل نہیں کی

اور تیرے رب نے ان کی راہنمائی نہیں فرمائی یا ان کی کثرت ہلاکت نے ان کی راہنمائی نہیں کی۔ ان سے قبل قرون ماضیہ میں کتنی قومیں تھیں جنہیں ہم نے ان کے کفر کے سبب ہلاک کر دیا۔ حالانکہ اہل مکہ اپنے سفروں کے دوران ان ہلاک ہونے والوں کی جگہوں میں چلتے ہیں۔

اے شک اس ہلاک کرنے میں عبرت کی کئی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انہوں نے جس کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا وہ قبیح ہے اور اس پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ ہم انتقام لینے پر قادر ہیں۔ اَفَلَا يَسْمَعُونَ میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ ہماری آیات سے اعراض کرتے ہیں اور انہیں غور و فکر اور نصیحت حاصل کرنے کے ارادے سے نہیں سنتے۔

أَوَلَمْ يَكِرُوا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ
أَنْعَامُهُمْ وَانْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٥٠﴾

”کیا انہوں نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بخیر زمین کی طرف اور پھر ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے سے کھیتی کھاتے ہیں اس سے ان کے چوپائے اور وہ خود بھی کھاتے ہیں (یہ بھی) نہیں دیکھتے س“

اے ہمزہ برائے انکار ہے اور وہ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے اور نہیں جانتے بلکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بخیر زمین کی طرف۔ الارض الجوز سے مراد ایسی زمین ہے جس سے ہمزہ منقطع ہو چکا ہو اور نباتات زائل ہو چکی ہو۔

اے پھر ہم پانی کے ذریعے نکالتے ہیں کھیتی جس سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں جیسا کہ جھوس اور پتے وغیرہ اور وہ خود بھی مثلاً غلہ اور پھل وغیرہ۔

اے کیا وہ یہ بھی نہیں دیکھتے؟ اس میں ہمزہ برائے استفہام انکاری اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ اپنی نظریں نہیں گاڑتے اور اسے نہیں دیکھتے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ اس سے یہ استدلال کر سکیں کہ ہماری قدرت کامل ہے، ہمارا فضل وسیع ہے اور ہم موت کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ ابن جریر نے حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے اور علامہ بغویؒ نے بھی اسے ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام نے مشرکین سے کہا بے شک ہمارے لیے ایک دن ہے جس میں عنقریب ہم راحت و سکون پائیں گے اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے گا (1)۔ میں کہتا ہوں کہ اس دن سے ان کی مراد وہ قیامت کا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ کبھی نہ کہا ہے اس سے ان کی مراد فتح مکہ کا دن ہے۔ سدی کا قول ہے اس سے مراد یوم بدر ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلامؐ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خلاف ہماری مدد فرمائے گا اور ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو مشرکین بطور استہزاء کہتے اس فتح کا دن کب آئے گا؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٥١﴾

”اور (بار بار) پوچھتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا؟ (تاؤ) اگر تم سچے ہو۔“

۱۔ اور کفار کہ (بار بار) پوچھتے ہیں۔ اس کا عطف افلا یُبصرون کے مضمون پر ہے۔ کیونکہ آیات قدرت کو دیکھنے کی نفی قدرت کا انکار ہے، یعنی کیا قدرت کا انکار کرتے ہیں اور استہزاء کہتے ہیں۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر تم اپنے قول میں سچ ہو تو پھر اس کا معین وقت ہمیں بتاؤ۔

قُلْ يَوْمَ الْقِيَامِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝

”آپ فرمائیے فیصلہ کے دن نہ فائدہ پہنچائے گا کافروں کو ان کا ایمان لانا نہ اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

۱۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے۔ یہ جملہ مستحکم ہے اور ان کے قول کا جواب ہے۔ اس ارشاد سے فوراً ذہن میں یہی آتا ہے کہ یوم القیام سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ اس دن کا ایمان بالیقین نفع بخش نہیں ہوگا۔ اور جنہوں نے یوم القیام کو فتح مکہ اور یوم بدر پر محمول کیا ہے۔ انہوں نے اس کا معنی یہ کیا ہے موت کے بعد عذاب دیکھ کر کفار کا ایمان لانا انہیں نفع نہیں دے گا جبکہ وہ کفر پر ہی مرے یا قتل کر دیئے گئے۔

۲۔ یوم القیام کے بارے ان کے سوال کے ساتھ اس جواب کی وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان کی طرف سے اس سوال میں یوم القیام کا مطلب علی وجہ التکذیب اور استہزاء تھا۔ لہذا انہیں جواب بھی ان کے سوال کی غرض اور مقصود کے مطابق دیا گیا۔ پس اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اس دن کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو اور نہ ہی استہزاء کرو۔ کیونکہ میں تمہیں اس دن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کے عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے لیکن تمہارے ایمان نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ اور تم نے عذاب میں داخل ہونے کے لیے کچھ مہلت طلب کی، لیکن تمہیں مہلت بھی نہیں دی گئی۔

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ إِنَّهُمْ مُنْتَضَرُونَ ۝

”پس (اے حبیب! رخ) (انور) پھیر لیجئے ان سے ۱۔ اور انتظار فرمائیے وہ بھی منتظر ہیں۔“

۱۔ فاء مسبیہ ہے یعنی جب آپ نے ان کے حال اور انجام کو پہچان لیا ہے تو پھر ان سے رخ انور پھیر لیجئے اور ان کے جھٹلانے کی پرواہ تک نہ کیجئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ آیت کا جملہ آیت السیف سے منسوخ ہے۔ (1)

۲۔ میں نے آپ سے جس فتح کا وعدہ کیا ہے اس کا انتظار فرمائیے۔ بے شک وہ بھی آپ کے بارے میں حوادث زمانہ کے منتظر ہیں۔ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ان کے بارے میں آپ ہمارے عذاب کا انتظار کیجئے کیونکہ وہ بھی اسی کے منتظر ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں اَللّٰہُمَّ تَنْزِیْلُ اَوْرَہْل اَتْمٰی عَلٰی الْاِنْسَانِ تلاوت فرماتے تھے (2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ آپ اَللّٰہُمَّ تَنْزِیْلُ اَوْرَتَا زَاکَ الْبُذْیِ بِیْدِہِ الْمَلْکُ پڑھ لیتے (3)۔ اسے احمد، ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ خالد بن معدان نے کہا ہے کہ مجھ تک اَللّٰہُمَّ تَنْزِیْلُ اَوْرَتَا زَاکَ الْبُذْیِ بِیْدِہِ الْمَلْکُ کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ

ایک آدمی یہی دونوں سورتیں پڑھتا تھا، ان کے سوا کوئی شے نہیں پڑھتا تھا اور وہ بہت زیادہ گنہگار تھا۔ پس ان سورتوں نے اس پر اپنے پر پھیلا لئے اور رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اسے پروردگار سے بخش دے کیونکہ یہ مجھے کثرت سے پڑھتا تھا۔ رب کریم نے اس کے حق میں ان سورتوں کی شفاعت کو بول فرمایا ہے اور فرمایا ہے اس کے لیے ہر خطا کے بدلے ایک نیکی لکھ دو اور اس کا ایک درجہ بلند کر دو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی جانب سے قبر میں مجاہدہ کرے گی اور عرض کرے گی کہ اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں تو پھر اس آدمی کے حق میں میری شفاعت قبول فرما لے۔ اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں تو مجھے اس سے منادے۔ بے شک یہ سورت پر نہنے کی مثل اپنے پڑھنے والے پر اپنے پر پھیلا لے گی اور اس کے لیے شفاعت کرے گی اور اسے عذاب قبر سے بچالے گی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ قرآن کریم ہر سورت پر ان دونوں کی فضیلت ساٹھ نیکیوں کے برابر ہے۔ اسے داری نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جس کسی نے اَللّٰہُ تَنْزِیْل اور تَبَارَکَ الَّذِیْ بَیْدَہِ الْمُلُکُ پڑھیں اسے اتنا اجر دیا جائے گا گویا اس نے لیلۃ القدر عبادت میں بسر کی (۱)۔ اسے شعبی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عمر سے بھی اسی طرح نقل کی ہے۔ امام بیہقی نے کہا یہ حدیث موضوع ہے۔ واللہ اعلم

اس سورت کی تفسیر 24 رجب 1206ھ بروز جمعہ اختتام پذیر ہوئی۔

اس سورت کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے 14 فروری 2000ء بروز جمعہ ساڑھے نو بجے شب اپنے اختتام کو پہنچا۔

www.muhammadiyah.com

سورة الاحزاب

﴿انباھا ۷۳﴾ ﴿سورة الاحزاب مكية ۳۳﴾ ﴿مکوعاھا ۹﴾

سورة احزاب مدنی ہے اس کی تہتر آیاتیں اور نو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

”اے نبی مکرم! (حسب سابق) ڈرتے رہئے اللہ تعالیٰ سے ۱ اور نہ کہنا مانئے کفار اور منافقین کا۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتے والا، بڑا دانا ہے ۲۔“

۱۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت ذرؓ سے کہا تم سورة الاحزاب کی کتنی آیتیں شمار کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ تہتر آیات۔ حضرت ابی نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم ابی کھایا کرتا ہے۔ سورة احزاب سورۃ بقرہ کے مساوی تھی یا اس سے بھی طویل تھی۔ اور ہم نے اس میں یہ آیت رجم بھی پڑھی ہے ”الشیخ والشیخۃ اذا زنيا فازجملوهما نکلا من الله والله عزيز حكيم“ (۱)۔ جو ہر نے ضحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ نے من میں ولید بن مغیرہ، شیبہ بن ربیعہ بھی تھے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ آپ اپنے قول سے رجوع کر لیں تو ہم اپنے مال کا ایک حصہ آپ کو دیں گے اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہودیوں نے اپنے آپ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ نے اپنے قول سے رجوع نہ کیا تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے (۲)۔ تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے نبی!۔ یا محمد (ﷺ) نہیں فرمایا۔ اور اس کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس سے مقصود تقویٰ کی عظمت و نشان کو بیان کرنا ہے (کہ یہ نبی کے لیے بھی ضروری امر ہے)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان بن حرب، بکرہ بن ابی جبل اور ابو الاغور بن عمرو بن حنیان سلمی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس طرح کہ وہ غزوہ احد کے بعد مدینہ طیبہ میں آئے اور اس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے پاس آ کر ٹھہرے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ پس ان کے ساتھ عبد اللہ بن ابی سعد اور طعہ بن ابیرق حاضر خدمت ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ سے یہ کہا کہ آپ ہمارے معبودوں لات، عزی اور منات کا ذکر چھوڑ دیں اور ساتھ یہ کہیں کہ جو ان کی عبادت کرے گا۔ یہ اس کی شفاعت کریں گے تو ہم آپ کا اور آپ کے رب کا ذکر (غلط انداز میں کرنا) چھوڑ دیں گے۔ پس آپ ﷺ پر ان کی یہ بات انتہائی شاق گزری۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ اس وقت آپ ﷺ کے پاس موجود تھے

اللَّهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۝

”نہیں بتائے اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کے لیے دودل اس کے شکم میں۔ اور نہیں بنایا اس نے تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری ماں میں۔ اور نہیں بنایا اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے فرزند یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ پر چلنے کی۔“

۱۔ اس میں من زائد ہے اور فُلْبَیْنِ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جَعَلَ کا مفعول اول ہے اور اس کا مفعول ثانی لُزْجِلْ ہے۔ اور فُیْ جَوْفِہ طرف لغو ہے یا فُلْبَیْنِ کی صفت ہے۔ جاننا چاہیے دل روح حیوانی کا خزان اور تمام قوتوں کا منبع ہے۔ اس لیے ایک آدمی کے شکم میں متعدد دلوں کا ہونا ممنوع ہے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی کے دودل ہوں۔ تو وہ ان دوش سے ہر ایک سے افعال قلوب میں سے ایک ہی عمل کرے گا تو اس صورت میں دوسرا دل (فصل) ہوگا جس کی کوئی حاجت نہیں۔ یا پھر ان دوشوں سے ہر ایک سے ایک دوسرے کے مخالف کام لے گا تو ایسی صورت میں دل کے اعمال میں تاقض واقع ہو جائے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور اسی طرح ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن کثیر نے بھی یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو معمر جیل بن معمر الفہری کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ آدمی انتہائی عقلمند اور ایسی قوت حفظ کا مالک تھا کہ جو سنت اسے اذکر کر لیتا۔ تو قریش نے اس کے بارے میں کہا کہ ابو معمر کی اس قوت کا سبب فقط یہ ہے کہ اس کے دل دو ہیں۔ اور وہ خود بھی کہا کرتا تھا کہ میرے دودل ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس سے بہتر اور زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ (متفق علیہ) رکھتے ہیں۔ پس جب میدان بدر میں قریش کے شکست کا سامنا ہوا، اور ان میں ابو معمر بھی شکست خوردہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اس حال میں کہ ایک جوتا پاؤں میں تھا اور ایک ہاتھ میں۔ اسی دوران ابو سفیان اس سے ملا۔ تو اس نے پوچھا اے ابو معمر! لوگوں کو کیا حال ہے۔ تو اس نے جواب دیا شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ پھر اس نے کہا تیری یہ کیا حالت ہے کہ ایک جوتا تیرے پاؤں میں ہے اور دوسرا تیرے ہاتھ میں؟ تو ابو معمر نے کہا میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ دونوں میرے پاؤں میں ہیں۔ پس اس دن قریش نے یہ جان لیا کہ اگر اس کے دودل ہوتے تو یہ اپنے ہاتھ میں جوتا نہ بھولتا۔ (۱)

ابن ابی حاتم نے ضعیف کی سند سے سعید بن جبیر، مجاہد اور کریمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی تھا جسے دودلوں والا کہا جاتا ہے (۲) تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور قتادہ کی سند سے حسن سے اسی کی مثل۔ روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ زائد بھی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے میرا ایک دل مجھے کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور ایک دل منع کرتا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ قیام فرماتھے کہ آپ کے دل میں کچھ خطرہ سالاح ہو۔ تو وہ منافقین جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا کیا آپ نہیں دیکھ رہے، اس کے دودل ہیں ایک دل تمہارے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (۳) اور زہری اور مقاتل نے کہا ہے یہ فقط ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بیوی کے ساتھ ظہار کرنے والے اور کسی غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا (متبنی) بنانے والے کے لیے بیان فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح ایک آدمی کے دودل نہیں ہوتے کہ ان کا اجتماع متنع ہے اسی طرح یہ بھی

نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی عورت مظاہر کی بیوی بھی ہو اور ماں بھی، کیوں کہ ان دونوں نسبتوں کا اجتماع ممکن ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی پچاس کا بیٹا بھی ہو اور غیر کا بھی۔ کیونکہ یہ نسبتیں بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ (1)

ع. قانون اور قبل نے سورۃ مجادلہ، سورۃ طلاق اور یہاں آٹا ہمزہ کے ساتھ بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اور ورش نے یاء کے ساتھ ہمزہ کے پیچھے کسرہ کو ذرا کھینچ کر پڑھا ہے۔ اور وقف کی صورت میں یاء کو ساکن کر دیا ہے۔ بڑی اور ابو عمرو نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بدلے یاء ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بعد یاء پڑھی ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے بین بین پڑھا ہے۔ جن قراء نے ہمزہ پڑھا اور جنہوں نے نہیں پڑھا ہر دو گروہوں نے دونوں حالتوں میں الف اشباع کا ذکر کیا ہے۔ مگر ورش نے اس میں مد اور قصر دونوں جائز قرار دیے ہیں۔

س. عاصم نے نظہر و نون کو باب مفصل سے تاء کے ضم، ظاء کی تخفیف اس کے بعد الف اور ہاء کو کسور پڑھا ہے۔ جبکہ حمزہ اور کسائی نے باب تقابل سے تاء اور ہاء کو مفتوح اور الف کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابتدا میں دو تاء میں سے ایک کو حذف کر دیا ہے۔ اور ابن عاصم نے تاء اور ہاء کو مفتوح، ظاء کو مشدود اور الف کے ساتھ باب تقابل ہی سے پڑھا ہے۔ لیکن تاء کو ظاء سے بدل کر پھر ظاء کو ساکن کر کے دونوں ظاء کو آپس میں ادغام کیا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعل سے تاء اور ظاء کو مفتوح اور ظاء کو مشدود پڑھا ہے۔ اس صورت میں بھی مذکورہ طریقے کے مطابق تاء کو ظاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور پھر نظار کو مومن کے ساتھ اس لیے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ جنس کے معنی کو متضمن ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں ظہار سے طلاق مراد ہوتی تھی۔ لیکن شریعت اسلامیہ میں اس سے مراد ایسی حرمت لی گئی ہے جو کفارہ ادا کرنے کے ساتھ فسخ ہو جاتی ہے (یعنی مظاہر کے لیے کفارہ ادا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے جب تک ادا نہیں کرتا وہ اپنی بیوی سے قربت اختیار نہیں کر سکتا) اور ظہار کی صورت یہ ہے کہ ظہار کرنے والا آدمی اپنی زوجہ سے یہ کہتا ہے اُنت غلّی مخطّطہر اُفی (تو مجھ پر ماں کی بیٹھ کی مثل ہے)۔ ہم نے ظہار کے تفصیلی مسائل سورۃ مجادلہ میں ذکر کیے ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ ظہار میں ظہر (بیٹھ) کا ذکر بطن (بیٹ) سے کنایہ ہے جس کے لیے بیٹھ بھارا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر فرج کے ذکر کے قریب قریب ہوتا ہے۔ یا پھر ظہر کا ذکر خدمت میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہے کیونکہ وہ عورت کے ساتھ اس حال میں قربت اختیار کرنے (جماع) کو حرام تصور کرتے تھے کہ اس کی پشت آسمان کی طرف ہو۔ (2)

ی. اور اذعیبا مختلف قیاس دی کی جمع ہے۔ قیاس کے مطابق دعویٰ ہونی چاہیے جیسا کہ جرمی جرح کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ فعل بمعنی مفعول ہے۔ چونکہ اسے فعل بمعنی فاعل کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کی جمع اس کے مطابق ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ نقلی کی جمع التیاء، جی کی جمع اخیاء اور شقی کی جمع اشتیاء آتی ہے۔ کسی کو نہ بولا بیٹا بنانے سے حقیقی بیٹے کے احکام میں سے کوئی شے ثابت نہیں ہوتی مثلاً وراثت، حرمت نکاح اور دیگر مسائل۔ اس آیت طیبہ میں اہل عرب کی ان باتوں کا رد ہے جو وہ اس وقت کیا کرتے تھے مثلاً عقلمند اور اہل قوت و غلظت رکھنے والے کے دودل ہوتے ہیں، ظہار کرنے والے کی زوجہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور اس پر ماں کی مثل ہمیشہ حرام ہو جاتی ہے۔ اور کسی آدمی کا منہ بولا بیٹا اس کا فرزند ہوتا ہے اور حقیقی بیٹے کی طرح اس کا وارث بنتا ہے۔ اور متحنی کے ساتھ بھی وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسبی بیٹے کے ساتھ حرام ہوتے ہیں۔ تحقیق حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ بن شریل الکعبی کو

وقتی سے قبل آزاد فرمایا اور انہیں منہ بولا بیٹا بنالیا۔ اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور ان کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ پھر جب حضرت زیدؑ نے اپنی زوجہ حضرت زینب بنت جحش کو طلاق دے دی اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔ تو منافقین یہ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے حالانکہ آپ اس سے منع فرماتے ہیں (1)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ یعنی امر واقعہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں جیسا کہ ہذا بیان کے قول کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے۔ یعنی امر واقعہ میں اس کی حقیقت ہوتی ہے جو اس کے قول سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور وہ راہ حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ داری نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سہلہ بنت کلثم بن عمر و حاضر ہوئی (وہ ابوہریرہ بن عتبہ ابن ربیعہ کی بیوی تھی)۔ (اور عرض کی کہ ابوہریرہ کا آزاد کیا ہو؟) ظالم ہمارے گھر آتا ہے درآجھا ایک لڑکے کو اپنے ہونے والی (یا سستی یہ ہے کہ میں اپنے کام کاج کے کپڑے پہنے ہوتی ہوں) اور ہم اسے بیٹا ہی خیال کرتے ہیں اور ابوہریرہؓ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے زید کو مستثنیٰ بنایا ہے۔ گو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي
الدِّينِ وَ مَوَالِيكُمْ ۚ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ ۚ وَلَٰكِنْ مَّا
تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

”لایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے۔ یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک۔ اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے

باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ہیں۔ تمہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو۔ البتہ وہ کام جو

تمہارے دل قصداً کرتے ہیں (ان پر ضرور گرفت ہوگی)۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“

یعنی تم ان کی نسبت ان کے ان باپوں کی طرف کرو جن کے نطفے سے یہ پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے اقوال حق سے یہی افراد مراد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے حقیقی باپوں کی نسبت سے پکارا تھا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ یہ قول اَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ کی علت ہے۔ اَفْسَطُ صیغہ اسم تفصیل ہے۔ اس سے مراد مطلق زیادتی ہے اور یہ قسط بمعنی عدل سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے صدق (سچائی) میں اپنی انتہاء کو پہنچنے والی (یعنی بہت زیادہ سچی بات) امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (ﷺ) ہی کہا کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ (2)۔

اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو کہ تم ان کی نسبت کر سکو تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔ پس تم یہ کہو یہ میرا دینی بھائی ہے اور میرا دوست ہے۔

اس اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں کہ تم نے کسی سے پہلے متعینی کی نسبت سے نادانستہ بیٹا بنانے والے کی طرف کی یا نبی کے بعد ہول

کر یا سبقت لسانی کے سبب ایسا کیا۔ لیکن اس میں گناہ ہے جو تمہارے دل قصد کرتے ہیں۔ یا مفہوم عبارت اس طرح ہے البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصد کرتے ہیں ان میں ضرور گناہ ہوگا۔ حضرت سعید بن ابی وقاص اور ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی دار آنحالیکہ وہ اپنے باپ کو جانتا ہو تو اس پر جنت حرام ہے (1)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد، ابو داؤد، اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی یا کسی آزاد ہونے والے غلام نے آزاد کرنے والے آقا کے سوا کسی اور کی طرف اپنا آقا ہونے کی نسبت کی تو اس پر قیامت کے دن تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو (2)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور امام سیوطی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔

یہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم سے وہ خطا کرنے والے کو معاف فرمادیتا ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے جانتا چاہیے کہ ہمارے نزدیک متحنی کا کوئی اعتبار نہیں۔ (یہ موقوف حضرت امام شافعیؒ کا ہے) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کسی غلام کو متحنی بنانے سے اس کی آزادی ثابت ہو جاتی ہے اور اگر کسی مجہول النسب کو متحنی بنایا گیا، تو اگر اس کا الحاق بیٹا بنانے والے سے ممکن ہو تو پھر اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا (3)۔ لیکن یہ علامہ بیضاویؒ سے ہو ہوئی ہے۔ کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کوئی غلام اس قول سے آزاد نہیں ہوتا کہ تیسک اور جعلتک ابھی (میں نے تجھے متحنی بنالیا اور میں نے تجھے اپنا بیٹا بنالیا) اور نہ ہی یہی قول کسی مجہول النسب کے لیے کہنے سے اس کا نسب ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ آپ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر آقا نے اپنے غلام کے بارے میں دعویٰ کیا یہ میرا بیٹا ہے تو اس سے وہ آزاد ہو جائیگا، چاہے اس کی مثل بچہ اس کی مثل سے پیدا ہو سکا ہو یا ایسا نہ ہو۔ اور آقا کے کلام کے صحیح ہونے کے لیے غلام کے حق میں اسے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ گویا کہ اس نے یہ کہا ہے کہ یہ آزاد ہے۔ یعنی سب کا اطلاق مسب پر کیا ہے۔ کیونکہ بیٹا ہونا آزادی کے لیے سبب ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کسی بھی ذی رحم مکرہ کا مالک بنے گا تو وہ اس کی طرف سے آزاد ہو جائے گا (4)۔ اسے امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔

صاحبین نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے اس صورت میں اختلاف کیا ہے کہ جب آقا نے ایسے غلام کو ہذا ابھی (یہ میرا بیٹا ہے) کہا جو عمر میں اس سے بڑا ہو تو اس صورت میں صحابین کا موقف یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہوگا۔ اس اختلاف کی بنیاد ایک اور اصول میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ امام صاحب کے نزدیک مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے فقط تکلّم اور تکلّم میں، حکم میں نہیں۔ لہذا جب کلام فی الحقیقت صحیح ہو تو آپ کے نزدیک مجاز بھی صحیح ہوگی۔ اس لیے اگرچہ غلام عمر میں بڑا ہی ہو جب آقا نے اپنی طرف اس کے بیٹا ہونے کی نسبت کر دی تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ جب کہ صحابین کے نزدیک مجاز حکم میں حقیقت کا خلیفہ ہے۔ لہذا جب حقیقت اس حکم کا اثبات ممکن نہ ہو تو مجاز ابھی اس کا اثبات صحیح نہیں ہوگا۔ نتیجہ مذکورہ صورت میں وہ غلام آزاد نہیں ہوگا (کیونکہ حقیقت بننے کا باپ سے بڑا ہونا ممکن نہیں) اور وہ آدمی جس نے کسی مجہول النسب کو کہا یہ میرا بیٹا ہے اور وہ اس حیثیت میں ہے کہ اس سے نسب کا ثبوت ممکن ہے۔ تو پھر اس سے نسب ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے بیٹا ہونے کے بارے وہ خود اقرار کر رہا ہے اور نسب کا التزام خالص اس کا ذاتی حق ہے۔ اسی لیے اگر کسی نے مجہول النسب کے بارے یہ اقرار کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اس کے باپ سے ثابت نہیں ہوگا مگر جب کسی غیر کے

1- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 619 (وزارت تعلیم)

2- جامع الاحادیث، سنن، جلد 5 صفحہ 491 (المنکر)

3- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2 صفحہ 274 (المنکر)

4- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شباب، جلد 7 صفحہ 463 (اعلیٰ)

بارے نسب کا اقرار کرنے والا فوت ہو گیا۔ درآئیکہ آخری وقت تک اپنے اقرار پر اصرار کرتا رہا۔ اور اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا وارث بھی نہ ہو تو پھر مزاحم نہ ہونے کی وجہ سے وہی اس کا وارث ہوگا جس کے بارے وہ اقرار کرتا رہا۔ اور ہمارے نزدیک اس کا حق بیت المال کی نسبت مقدم اور ارجح ہے۔ لیکن اصلی درثاء میں سے کسی پر اس کا حق مقدم نہیں ہوگا اگرچہ وہ ذوی الارحام (اصحاب فرائض) میں سے ہی ہوں۔ اور نہ ہی مرنے والے نے اپنے تمام مال کے کسی کے لیے وصیت کی ہو۔ واللہ اعلم۔

علامہ ابنوئی نے لکھا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو جہاد کے لیے دعوت دیتے تھے تو بعض لوگ کہتے تھے ہم جہاد پر ضرور جاتے ہیں تاہم اپنے والدین سے اجازت طلب کر لیں (1)۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلنَّبِيُّ اَوَّلِيُّ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُ اَمْهَاتُهُمْ وَاُولُو الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ اِلَّا اَنْ
تَفْعَلُوْا اِلٰى اَوْلِيَّيْكُمْ مَّعْرُوْفًا ۚ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۱

”نبی (کریم) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔ اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ کتاب اللہ کی رو سے عام مومنوں اور مہاجرین سے سب گھریں کے کم کرنا چاہو اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی (تو اس کی اجازت ہے)۔ یہ (حکم) کتاب (الہی) میں لکھا ہوا ہے۔“

یعنی مومنوں میں سے بعض کو بعض سے جو قرب حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ قرب حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے ہے بلکہ آپ تو ان کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کو ان پر حکم نافذ کرنے کا زیادہ اختیار ہے اور ان پر آپ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری واجب ہے۔ لہذا ان کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے والدین کی نافرمانی و داری قطعاً جائز نہیں۔ اس لیے آپ ﷺ یہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں جہاد پر براہِ غیثہ کریں اور راہِ خدا میں اپنی جان تک خرچ کرنے کی ترغیب دلائیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور عطاء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام انہیں ایک شے کی طرف دعوت دیں اور ان کے اپنے نفس انہیں دوسری شے کی طرف بلائیں۔ تو ان کے لیے اپنے نفسوں کی اطاعت بجائے نبی کریم ﷺ کی فرمانبرداری کرنا اولیٰ اور ضروری ہے۔ (2)۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مطلق فرمانے کے سبب ان کے منافع اور فساد کا علم رکھتے ہیں لہذا آپ ﷺ بالیقین انہیں وہی حکم ارشاد فرماتے ہیں اور ان کے لیے وہ کام پسند فرماتے ہیں جس میں ان کے لیے فوائد اور کامیابی ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا حَرِّضَ عَلَيْنَا بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَافُوفٌ رَّحِيْمٌ جب کہ اس کے برعکس ان کا نفس برائی کا ہی حکم دیتا ہے سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اور وہ انتہائی زیادتی کرنے والا اور نادان ہے۔ اس لیے ان پر یہ ضروری ہے کہ ان کے نزدیک اپنے نفسوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کا رسول زیادہ محبوب ہو، ان پر اس کا حکم نفس کے حکم کے مقابلہ میں زیادہ نافذ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی شفقت نفس کی اپنی ذات پر شفقت کی نسبت کہیں وافر اور زیادہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی ایک مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کے نزدیک میری ذات اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب ہو جائے۔

وارث بنتا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی **وَإِذَا الْوَالِدَاكَ كَاهِلًا بَعْضُهُمْ أَوْفَىٰ بِبَعْضٍ (1)**۔ یہ آیت اپنی عمومیت کے اعتبار سے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے خلاف ہماری دلیل ہے کہ ایسا آدمی جس کے مرنے کے بعد وراثہ میں نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات، تو اس کے وارث اولوالارحام ہوں گے۔ جبکہ ان کے نزدیک فقط اولوالارحام کسی صورت میں بھی وارث نہیں بن سکتے۔ اور اگر مرنے والا ایسا آدمی ہو جس کے وراثہ میں عصبات، ذوی الفروض اور اولوالارحام میں سے کوئی بھی نہ ہو تو اس کا ترکہ بیت المال کے حوالے کر دیا جائے گا۔

مگر تم مؤمنین اور مہاجرین میں سے اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی کرنا چاہو۔ یہاں معروف سے مراد وصیت ہے۔ پس دوستوں میں سے جس کے لیے وصیت کی گئی وہ ان وراثہ کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے۔ یہ عام خص عند بعض ہے۔ اور سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وہ مال کے تیسرے حصے میں سے وارثوں کی نسبت اولیٰ ہے نہ کہ کل مال سے۔ یہ استثناء اس عام حکم سے ہے جس میں اولوالارحام کو اولویت کا درجہ دیا گیا ہے (یعنی انہیں میراث کا زیادہ مستحق قرار دیا گیا ہے) یا پھر یہ منطقی منقطع ہے۔ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے مولات اور ہجرات کے سبب وارث بننے کے احکام کو منسوخ کیا تو یہ اجازت فرمادی کہ آدمی جس سے دوستی رکھتا ہے اگر اپنے مال کے تیسرے حصے میں سے اس کے لیے کچھ وصیت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ **وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ** میں جن بنیائیں ہیں۔ اور محلی ہے کہ مؤمنین میں سے قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کا وارث بننے کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی مسلم اور کافر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نہ ہی مہاجر اور غیر مہاجر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں۔ مگر یہ کہ اگر تم اپنے ان رشتہ داروں میں سے کسی کے لیے وصیت کرنا چاہو تو یہ مباح ہے اگرچہ ایماندار نہ ہوں اور نہ ہی مہاجر ہوں۔ علامہ بیہقیؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ قول حضرت قتادہؒ، عکرمہؒ اور عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں صیغہ اسم تفصیل الف لام، اضافت اور کن تفصیلیہ تینوں صورتوں سے خالی ہو جائے (جب کہ اس کے استعمال کے یہی تین طریقے ہیں) پھر مؤمنین اور مہاجرین میں سے اولوالارحام کا ایک دوسرے کی وراثت کا زیادہ اہل ہونا یہ تقاضا نہیں کرتا کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ نہ تو لفظ اور یہ تو بالکل ظاہر ہے اور نہ ہی معنا۔ کیونکہ مؤمن کا اولیٰ ہونا اس پر دلالت کرتا نہیں کرتا کہ مؤمن وارث نہ ہونے کی صورت میں کافر مؤمن کا وارث نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم۔

یہ (علم) جو ذکر کیا گیا ہے۔ لوح محفوظ یا قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد وراثت ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَ مِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا

”اور (اے حبیب) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ابن مریم

سے بھی۔ اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا تھا۔“

۱۔ اور (اے حبیب) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا۔ جس وقت کہ انہیں صلب آدم سے نکالا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے عہد لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلائیں گے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور

اپنی قوم کو نصیحت کریں گے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے عمومی ذکر کے بعد ان انبیاء علیہم السلام کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اس لیے کہ انہیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ اصحاب شریعت بھی ہیں اور اصحاب کتاب بھی، اور ساتھ ہی یہ اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں۔ اور پھر ان تمام سے پہلے حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر فرمایا ایک تو آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جس سے حضور نبی کریم ﷺ نے بذات خود مطلع فرمایا کہ میں تخلیق کے اعتبار سے تمام لوگوں سے اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر ہوں۔ اسے سعد نے حضرت قتادہ سے مرسل روایت کیا ہے۔ لیکن علامہ بغوی نے اسے اس متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عن قتادہ عن الحسن عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ (۱) اور کہا ہے کہ حضرت قتادہ نے اسے بیان کرنے کے بعد فرمایا یہی مفہوم اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کا وَاِذَا اخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَاهُمْ مِنْ نَفْسِهِمْ (۲) میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے قبل اپنے محبوب ﷺ کا ذکر فرمایا۔ (۲)

ابن سعد اور ابو نعیم نے اٹھلے میں میسرۃ الفجر بن سعد سے اور انہوں نے ابو الجعد عاء سے اور طبرانی نے کبیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدُمُ الْبَيْنَ الْوُفُوحَ وَالْجَحْسِدَ (میں اس وقت نبی تھا اور آسمان کیلئے آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے) (۳)۔

۲۔ اور ہم نے ان سب سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ جو انہوں نے عہد کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کریں گے یا ایسا عہد جسے ایمان کے ساتھ منکوحہ کیا گیا۔ اسے سکرر ذکر کرنے کی علت اسی وصف کو بیان کرتا ہے۔

لَيْسَ سَأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

”یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے چوں سے ان کے سچ کے متعلق ۱۔ اور اس نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے دردناک عذاب ۲۔“

۱۔ اور ہم نے یہ اس لیے کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان انبیاء علیہم السلام سے پوچھے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا اور اس کے بارے جو کچھ انہوں نے اپنی قوموں سے کہا۔ یا کفار سے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے کے متعلق پوچھے گا اور ان سے سوال کا مقصود انہیں مزید ذلیل و رسوا کرنا ہے۔ یا پھر انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے والوں سے پوچھے گا کیونکہ سچ بولنے والے کی تصدیق کرنے والا ابھی سچا ہوتا ہے۔ یا ان مؤمنین سے سوال کرے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے وعدے کی سچائی کے بارے میں انہیں اپنے نفسوں پر شاہد بنائے گا۔

۲۔ اس کا عطف آخذاً پر ہے اس اعتبار سے کہ رسولوں کی بعثت اور ان سے بیٹاق لینے کا مقصد اصل ایمان کو ثواب عطا فرمانا ہے یا پھر اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جس پر یسئلی دلالت کر رہا ہے۔ گویا ارشاد اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو ثواب عطا فرمایا اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كُذِّبَتْكُمُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا

عَلَيْكُمْ رَايِحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝

”اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آگے تھے تم پر (کفار کے) لشکر پس ہم نے بھیج دی وہی پر آندھی لے اور ایسی فوجیں جنہیں تم کو کچھ نہیں سکے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا۔“

لے اذ جاء تکم نعمۃ اللہ کی طرف ہے۔ اور ان لشکروں سے مراد کفار قریش، بنی غطفان اور یہود بنی قریظہ کے لشکر تھے۔ ان میں افراد کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سمیت مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے ارد گرد خندق کھدوائی تھی۔ پس ہم نے ان پر آندھی بھیج دی۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صبا (آندھی، طوفان) سے میری مدد کی گئی اور قوم عاد کو دیور (تیز ہوا طوفان) کے ساتھ ہلاک کیا گیا (۱) اللہ تعالیٰ نے سخت سردرات میں ان پر سختی ڈالی جو ان کے شیعوں کی رسیوں کو توڑ دیا، منوں کو اکھیر دیا، جلنے والی آگ کو بجھا دیا اور ہانڈیوں کو الٹا کر دیا اور ساتھ ہی گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے، اچھلتے کودتے بھاگ نکلے۔

۱۔ اور ملائکہ میں سے ایسے لشکر جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لشکروں کی اطراف میں ملائکہ کی تکبیر کثرت سے بلند ہوئی اور ان کے دلوں میں رعب پڑ گیا۔ حتیٰ کہ ہر قوم کا سردار یہ کہنے لگا اے نبی فلاں! میری طرف آ جاؤ۔ پس جب وہ اس کے پاس جمع ہو گئے تو اس نے کہا تم رات کی تاریکی میں بھاگ جاؤ۔ چنانچہ وہ بغیر قتال کے شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے۔ اور اس دن ملائکہ نے قتال نہیں کیا تھا۔

۲۔ اے مؤمنین! خندق کی کھدائی اور جنگ کے لیے جو تیاری تم کر رہے تھے۔ یہ معنی جمہور کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن بصریوں کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ شترکین گروہوں کو اکٹھا کرنے اور جنگ کے لیے براہیئت کرنے کے بارے جو کچھ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا تھا۔ غزوہ خندق کا یہ واقعہ شوال 4ھ میں وقوع پذیر ہوا جیسا کہ مواہب اللدنیہ میں موسیٰ بن عقبہ کے قول سے مروی ہے۔ یہود کے قبیلہ بنو نضیر کو جلا وطن ہونے آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ وہ جلا وطن ہو کر مختلف شہروں میں پھیل گئے سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع اور جحی بن الخطیب وغیرہ ربیع الاول 4ھ میں خیر جا پہنچے (اس وقت غزوہ خندق پیش آیا) لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ غزوہ شوال 5ھ میں واقع ہوا۔ محمد بن اسحاق نے اسی طرح لکھا ہے (2)۔ علامہ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ یزید بن رومان (جو کرا ل زبیر کے آزاد کردہ غلام تھے) نے عروہ بن زبیر سے اور عبد اللہ بن کعب بن مالک سے اور زہری اور عاصم بن عمرو بن قتادہ سے اور عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے اور محمد بن کعب القرظی وغیرہم سے نقل کیا ہے۔ (چونکہ ان تمام کی روایات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہمارے علماء نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔) کہ یہودیوں کا ایک گروہ جن میں سلام بن ابی الحقیق، جحی بن الخطیب، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، ہودہ بن قیس اور ابوعامر الوائی شامل تھے۔ بنی نضیر اور بنی وائل کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر مکہ مکرمہ میں قریش مکہ کے پاس آئے (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف مختلف گروہوں کو اکٹھا کرنے کا بنیادی کردار ادا کیا)۔ انہوں نے قریش مکہ کو حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس جنگ میں ہم تمہارے ساتھ ہیں گے یہاں تک کہ ان کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے۔ اس پر قریش نے انہیں کہا اے گروہ یہود! تم پہلے ہی اہل کتاب

ہو اور یہ جانتے بھی ہو کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان اختلاف ہے، تم یہ بتاؤ کہ ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا؟ تو یہ سن کر یہودیوں نے کہا تمہارا دین ان کے دین کی نسبت بہتر ہے اور تم ان کی نسبت زیادہ حق پر ہو۔ محمد بن اسحاق نے کہا انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَمْ تَرَ اِلٰی الَّذِیْنَ اَوْثَقُوا بِعِبَادَتِ الْکُفْرِ یُحِبُّونَ بِالْغِیْبِ وَالْمَلَائِکَۃِ..... الی قولہ وَکُفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیۡمًا۔ پس یہودیوں نے جب قریش کے بارے میں یہ کہا تو وہ خوش ہو گئے اور یہودی دعوت قبول کرتے ہوئے رسول اللہ (ﷺ) کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پس انہوں نے اس کے لیے اپنا لشکر جمع کیا۔ بعد ازاں یہودی غطفان کے پاس آئے جو کہ قیس بن خیالان کا ایک ذیلی قبیلہ تھا۔ انہیں جنگ میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ اپنے ساتھ ہونے کا یقین بھی دلایا اور یہ خبر بھی دی کہ قریش نے بھی جنگ کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ سب سن کر انہوں نے بھی ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ یہ بنی نضیر اور بنی وائل کے تقریباً بیس افراد تھے کہ جنہیں ابوسفیان بن حرب نے کہا مہرجا، خوش آمدید! تم ہمارے نزدیک انتہائی پسندیدہ اور محبوب لوگ ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان کو کہا کہ تم قریش میں سے پچاس افراد کو چون لو اور تم بھی ان میں شامل ہو۔ پھر ہم تمام مل کر غلاف کو پکڑ کر اور اپنے سینوں کو کعبہ کی دیواروں سے لگا کر یہ حلف اٹھائیں گے کہ ہم تمام محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر متفق ہیں۔ اور ہم تمام کی بات ایک ہوگی۔ اور ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک محمد (ﷺ) کے خلاف جنگ لڑتے رہیں گے جب تک ہمارا ایک آدمی بھی باقی ہوگا۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب قریش سے معاہدہ کرنے کے بعد یہودی بنی غطفان کے پاس پہنچے اور انہیں رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ جنگ لڑنے پر ابھارا اور ان سے اس شرط پر وعدہ کیا کہ خیر کے درختوں کی ایک سال کی کھجوریں انہیں دیں گے۔ یہ بھی مروی ہے کہ نصف کھجوروں کا وعدہ کیا۔ تو قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصین فزاری نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور بنی اسد میں سے اپنے حلیفوں کی جانب اس نے لکھ بھیجا۔ پس وہ اس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ان گروہوں میں قریش کا سردار ابوسفیان بن حرب، غطفان کا قائد عیینہ بن حصین بن حذیفہ بن بدہ فزاری، بنی مرہ کا سردار حارث بن عوف بن ابی حاتم اطری اور بنی اشجع میں سے مسعر بن رحیلہ بن نویرہ بن طریف اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ جنگ کے لیے نکلے۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ ابوسفیان نے چار ہزار افراد پر مشتمل لشکر جمع کیا اور اس کا علم عثمان بن ابی طلحہ کو دیا۔ ان میں تین سو کھجورے اور ایک ہزار اونٹ بھی تھے۔ یہ کچھ کمرہ سے نکل کر مر الظہر ان میں اترے تو وہاں السلم، اشج، بنو نکرانہ، فزارہ اور غطفان قبائل کے لشکر بھی ان کے ہمراہ ہو گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد س ہزار تک پہنچ گئی پس وہاں سے یہ اکٹھے ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف چلے۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوہ احزاب ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ (ﷺ) نے ان کے جمع ہو کر مدینہ طیبہ آنے کی خبر سنی تو آپ (ﷺ) نے مدینہ کے گرد خندق کھودوادی اور اس کا مشورہ حضرت سلمان فارسی نے رسول اللہ (ﷺ) کو دیا تھا۔ اور یہی وہ پہلی جنگ ہے جس میں حضرت سلمان فارسی رسول اللہ (ﷺ) کی معیت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں آپ آزاد تھے۔ انہوں نے آپ (ﷺ) کی بارگاہ میں عرض کی جب فارس میں ہمارا اس طرح محاصرہ کیا جاتا تو ہم اپنے ارد گرد خندق کھود لیتے تھے۔ پس رسول اللہ (ﷺ) نے اس تجویز کو قبول فرمایا اور

صحابہ کرام کے ساتھ مل کر خندق کو انتہائی مضبوط اور پختہ کر دیا (۱)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو الشکر آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی زبان القدس سے یہ نکلا **خَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ** (ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے)۔ پھر آپ نے مہاجرین و انصار میں سے سرداروں کو جمع کیا اور ان سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ اس دوران حضرت سلمان نے خندق کھودنے کا مشورہ پیش کیا جسے آپ ﷺ نے انتہائی مستحسن قرار دیا۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خود جنگ کے لیے باہر تشریف لائے۔ مہاجرین کا علم حضرت زید بن حارثہ گوار اور انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ کو عطا فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلنے وقت مہاجرین و انصار میں سے تین ہزار افراد تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت بھی ہے کہ ان کے پاس صرف چھتیس گھوڑے اور نکلنے والوں میں آپ کے ساتھ ایسے بچے بھی تھے جو ابھی تک بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں واپس مدینہ طیبہ لوٹا دیا۔ جن کی عمر ابھی پندرہ برس مکمل نہیں تھی۔ اور جن کی عمر پندرہ برس مکمل ہو چکی تھی انہیں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت عطا فرمادی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی بعض اطراف میں خندق کھودنے کے لیے جگہ تلاش کی اور جبل سلح کے قریب جگہ کا انتخاب ہوا۔ آپ ﷺ نے جبل سلح کو الشکر کی پشت پر رکھتے ہوئے اپنے اور کفار کے درمیان خندق کے لیے ایک خط کھینچا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ احزاب کے سال رسول اللہ ﷺ نے خط کھینچا۔ پھر ہر دس افراد کے لیے چالیس گز خندق کی کھدائی مقرر فرمادی۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر مہاجرین و انصار کے درمیان حضرت سلمان فارسیؒ کے بارے کچھ اختلاف ہو گیا۔ چونکہ وہ انتہائی طاقت ور آدمی تھے لہذا مہاجرین نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں اور انصار نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان ہم میں سے ہے، یعنی ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔ حضرت عمر بن عوفؒ نے کہا ہے میں سلمان، حذیفہ، نعمان بن مقرن اور انصار میں سے چھ افراد کے ذمہ خندق کی چالیس گز کھدائی تھی۔ ہم اسے کھود رہے تھے یہاں تک کہ اسی دوران اللہ تعالیٰ کے حکم سے خندق میں ایک سخت ترین چٹان آگئی جس نے ہمارے لوہے کے اوزاروں کو توڑ دیا اور ہم پر بہت مشکل بن گئی۔ پس میں نے سلمان سے یہ کہا کہ اوپر چڑھ کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو اور وہیں سخت چٹان کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کرو۔ پس اگر آپ ﷺ نے مناسب خیال فرمایا کہ ہم یہاں سے خندق کی کھدائی موڑ دیں (تو ہم ایسا کر لیں گے) کیونکہ ابھی موڑنے کا مقام قریب ہے۔ یا پھر جو بھی اس کے بارے میں آپ ﷺ ہمیں حکم ارشاد فرمائیں گے۔ کیونکہ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ ﷺ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ پس سلمان اوپر چڑھ کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ترکی خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں جا کر عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ خندق کے درمیان سے سفید رنگ کی انتہائی سخت چٹان نکل آئی ہے۔ اس نے ہمارے اوزار توڑ دیئے ہیں۔ اور ہم پر انتہائی مشکل پڑ گئی ہے حتیٰ کہ اس پر تھوڑا سا زیادہ کچھ اثر بھی نہیں ہوا۔ اس کے بارے میں آپ ہمیں اپنا حکم ارشاد فرمائیں۔ کیونکہ ہم یہ تو پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت سلمان کے ساتھ تشریف لائے اور خندق میں اترے جبکہ وہ افراد اور بھی خندق میں تھے۔ پس حضور نبی

کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے ہاتھ سے کدال لیا اور ایک شہید ضرب چٹان پر لگائی، جس سے اس میں شکاف ہو گیا اور اس سے ایسی بجلی کی چمک ظاہر ہوئی جس میں مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح کہی اور آپ کے ساتھ اہل ایمان نے بھی تکبیر بلند کی۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر دوسری ضرب لگائی اور اسے توڑ ڈالا اور ساتھ ہی اس سے ایک چمک ظاہر ہوئی جس سے مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح بلند فرمائی اور مسلمانوں نے بھی نعرہ تکبیر لگایا۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر ضرب لگائی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور خندق سے باہر تشریف لے آئے۔ تو حضرت سلمانؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ فداک انہی میں سے ایسی شے ملاحظہ کی ہے جس کی مثل کبھی بھی نہیں دیکھی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے بھی دیکھا ہے جو کچھ سلمانؓ کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب میں نے پہلی ضرب لگائی۔ پس اس سے وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ اس نے میرے لیے حیرہ اور کسریٰ کے کھلتے روشن کر دیے گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ پھر میں نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ تو اس نے مجھے روم کے سرخ محلات دکھا دیے۔ گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں۔ اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر بھی غالب آئے گی۔ پس تمہیں بشارت ہو یہ سن کر مسلمان انتہائی خوش ہوئے اور کہا سب تفریقیں اللہ کے لیے ہیں جس کا وعدہ سچا ہے اور اس نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ ہمارے محصور ہونے کے بعد وہ ہماری مدد فرمائے گا اور فتح سے نوازے گا۔ لیکن منافقین نے یہ کہا کیا تم محمد ﷺ پر تعجب نہیں کرتے کہ وہ تمہیں جھوٹی آرزوئیں دلارہے ہیں اور جھوٹے وعدے کر رہے ہیں۔ اور تمہیں یہ بتا رہے ہیں کہ وہ شراب سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ وہ تمہارے لیے کھول دینے جائیں گے حالانکہ تم تباہ ہونے سے بچنے کے لیے خندق کو دھڑک رہے ہو اور تم پر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ تو راوی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مُّآوِئَتُنَا مِنَ اللَّهِ وَسَمِئَلُهُ أَلَا عُدْوَانًا۔ اور اس واقعہ کے بارے میں آیت نازل فرمائی قُلْ اَللّٰهُمَّ مِلْكَ اِسْمَائِيْلَ تَوَاتَى الْمَلٰٓئِكَةُ لَآ اِیۡ (1)

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی طرف تشریف لے گئے، جبکہ مہاجرین و انصار سخت سردی میں صبح کے وقت خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کام کرنے کے لیے خدام اور غلام موجود نہیں تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں انتہائی تھکن اور بھوک کی حالت میں دیکھا تو فرمایا۔

اِنَّ الْغَيْشَ عَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ

بے شک زندگی کو فقط آخرت کی زندگی ہے (اے اللہ!) انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما دے تو پھر انہوں نے آپ ﷺ کے جواب میں یہ عرض کی

لَنُحْيِي الدِّينَ مَا يَغُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

ہم وہ ہیں جنہوں نے حضور نبی رحمت ﷺ کے دست مبارک پر اس وقت تک ہمیشہ کے لیے جہاد کرنے کی نیت کر رکھی جب تک ہم باقی ہیں۔ (۱)

اور صحیح میں حضرت براء بن عازبؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ غزوہ احزاب کے دن تھے اور رسول اللہ ﷺ نے خندق کھدوائی۔ تو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بذات خود خندق کی مٹی اٹھا کر لارہے ہیں یہاں تک کہ غبار نے آپ ﷺ کے بطن اقدس کو ڈھانپ لیا اور آپ کے جسم پر بال بہت زیادہ تھے۔ اور میں نے مٹی اٹھانے کے دوران آپ ﷺ کو ابن رواحہ کے یہ رجز یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔

اَللّٰهُمَّ لَوْ لَا اَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَضَلُّنَا وَلَا صَلَّيْنَا

اے اللہ! اگر تو مہربانی نہ فرماتا تو ہم ہدایت پاتے۔ نہ صدقہ دیتے اور نہ ہی نماز ادا کرتے۔

فَاَنْتَ لِيْ سَكِيْنَةٌ غَلِيْبًا

پس ہم پر سکینت (طمینیت) نازل فرما اور اگر ہمارا (دشمن سے) مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔

اِنَّ الْاَوَّلٰى قَدْ بَغَوْا غَلِيْبًا

اِذَا اَرَادُوْا الْفَتْنَةَ اَبَيْنَا

بے شک یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہم پر زیادتی کی کیونکہ جب انہوں نے فتنہ و فساد کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ ان کے آخری لفظ خوب سمجھ کر دے اور فرماتے تھے (۲)۔ اور ایک شخص ہے کہ پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے وَاللّٰهُ لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا (قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ مہربانی نہ فرماتا تو ہم ہدایت نہ پاتے)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت سلمان ایک طاقتور آدمی تھے وہ خندق کی کھدائی کے دوران دس آدمیوں کے کام کے برابر کام کرتے تھے اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ ہر روز پانچ ہاتھ عرضاً طوطا خندق کھودا کرتے تھے اور اس کی گہرائی بھی پانچ ہاتھ ہوتی تھی۔ پس قیس بن ابی معصود کی نظر آپ کو لگی تو فوراً بیہوش ہو کر گر پڑے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قیس کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان کے لیے ایک برتن میں وضو کرے اور پھر اس پانی سے مسلمان کو غسل دے اور پھر برتن اٹا کر کے اپنے پیچھے چھینک دے۔ پس انہوں نے اسی طرح کیا تو حضرت سلمان صحت یاب ہو گئے۔

امام احمد اور امام بخاری نے صحیح میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں خندق کی کھدائی کے دوران ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ ہمارے سامنے ایک انتہائی سخت چٹان آگئی۔ صحابہ کرام حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی پہاڑ کا ایک سخت پتھر سامنے آ گیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں آ رہا ہوں۔ پھر آپ ﷺ اٹھے درآٹھالید آپ کے بطن پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اور تین دنوں سے ہم نے بھی کوئی چیز کچھی تک نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کھال اپنے دست مبارک میں لیا اور پتھر پر ضرب لگا کر اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ میں نے گھر جا کر اپنی رفیقہ حیات سے کہا۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو شہید ہو کر کی حالت میں دیکھا ہے جس پر مجھے صبر کا یار نہ رہا، کیا تیرے پاس کوئی شے ہے۔ تو اس نے ایک تھیلہ نکالا جس میں ایک صاع (چار سیر) جو تھے ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ بھی تھا۔ پس میں نے اسے ذبح کیا اور اس نے جو بچیں لیے اور میرے فارغ ہونے تک وہ بھی پینے سے فارغ

ہو گئی۔ میں نے گوشت کاٹ کر ہڈیاں میں ڈالا اور اسے میں گوندھا ہوا آٹا نرم ہو گیا۔ ہڈیاں چولے پر چڑھا دی گئی جب وہ پکنے کے قریب ہوئی تو میں واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ واپس آتے وقت زوجہ نے یہ کہا مجھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے رسوا نہ کرنا۔ پس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے سرگوشی کرتے ہوئے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ﷺ میرے پاس تھوڑا سا کھانا ہے آپ اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمیوں کے لیے کافی ہوگا آپ تشریف لائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کتنا ہے؟ میں نے تفصیل ذکر کر دی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بہت ہے اور پاکیزہ ہے۔ گھر پہنچ کر اپنی زوجہ سے کہہ دیں کہ میرے آنے تک ہانڈی چولے سے نہ اتارے اور نہ ہی روٹیاں تور سے نکالے (یعنی روٹیاں نہ پکائے) پھر تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے باواز بلند فرمایا اے اہل خندق! جاہر نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے پس تم جلدی چلو۔ میں نے گھر پہنچ کر بیوی سے کہا تو ہلاک ہوا! حضور نبی کریم ﷺ مہاجرین و انصار اور اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ تو اس نے کہا اللہ تیرے ساتھ اس طرح کرے! کیا آپ ﷺ نے تجھ سے تعینا پوچھا نہیں تھا؟ میں نے کہا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ہے۔ تو پھر اس نے کہہ دیا اللہ و رسولہ اعلم۔ پس اس نے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا اندر داخل ہو جاؤ لیکن بھیڑ نہ کرنا۔ پھر میں نے آنا آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے اپنا عاب دھن اس میں ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر آپ ﷺ ہانڈی کے پاس تشریف لے گئے۔ اس میں عاب دھن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اے جاہد اب روٹیاں پکانے والی کو بلاؤ تاکہ وہ روٹیاں پکائے اور ہانڈی سے سائیں نکالے۔ اور ہانڈی کو چولے سے نہ اتارنا۔ رسول اللہ ﷺ نے بذات خود روٹی کے ٹکڑے کے شروع کیے اور ان پر گوشت رکھنے لگے اور ساتھ ساتھ ہانڈی اور تور کو ڈھانک کر رکھا۔ آپ ﷺ ان سے کچھ لیتے اور اسے صحابہ کرام کے قریب کر دیتے۔ پھر ڈھانکا اتارتے۔ ہیں اسی طرح روٹی توڑتے رہے اور اس پر گوشت رکھ کر صحابہ کرام کو دیتے رہے یہاں تک کہ ایک ہزار افراد میر ہوئے۔ حضرت جاہر فرماتے ہیں قسم بخدا! صحابہ کرام نے جی بھر کھا یا یہاں تک کہ کھاتے کھاتے تھوڑا دیا اور واپس چل دیے لیکن ہماری ہانڈی ایسے ہی اہل رہی تھی جیسے ابتداء میں تھی اور آٹے سے مسلسل روٹی پکتی رہی مگر وہ جوں کا توں رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس عورت سے ارشاد فرمایا اب تو بھی کھاؤ اور لوگوں کو بطور ہدیہ بھی بھیج دے کیونکہ لوگ انتہائی بھوک اور قافے کی حالت میں ہیں (۱)۔ پھر ہم اسے کھاتے رہے اور سارا دن لوگوں کو بھی بھیجتے رہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحابہ کرام خندق کی کھدائی سے چھ دن میں مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

علامہ بغوی نے کہا کہ اب ہم پھر ابن اسحاق کی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ خندق کی کھدائی سے فارغ ہوئے تو قریش اپنے اہل امیش اور اپنے قبیعین اہل تہامہ سے دس ہزار کا لشکر لے کر دومتہ الجرف اور الغابہ سے مجتمع الاحبال میں آپ ﷺ اور بنی عطفان اور قبیعین اہل نجد وغیرہ فحشی کے جھپٹے حصہ میں کوہ احد کی جانب اترے رسول اللہ ﷺ بھی اپنے علاموں کو ساتھ لے کر باہر تشریف لے گئے۔ لشکر کی تعداد تین ہزار تھی۔ آپ ﷺ نے جنبل سلع کو پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو ٹھہرایا۔ مخالفین اور آپ ﷺ کے درمیان خندق حائل تھی۔ اور آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو ایک محفوظ بلند مقام پر جڑھ جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ بنی نضیر کا سردار دشمن خدا جی بن اخبطہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد قرطی کے پاس آیا۔ درآنحالیہ وہ اپنی قوم کی جانب سے

رسول اللہ ﷺ سے مصالحت کا معاہدہ کر چکا تھا۔ جب کعب بن جحیٰ بن اخطب کے بارے سنا تو اس نے اس کے پیچھے سے پہلے ہی اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ لہذا جب جحیٰ نے اجازت طلب کی تو کعب نے انکار کر دیا اور دروازہ نہ کھولا۔ پھر جحیٰ نے آواز دی اے کعب! میرے لیے دروازہ کھول دے۔ تو اس نے جواب دیا تیری ہلاکت ہو اے جحیٰ! یہ انتہائی بدبختی ہے کیونکہ میں محمد (ﷺ) سے معاہدہ کر چکا ہوں۔ اور میں ان کے ساتھ اپنا معاہدہ توڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں نے انہیں ہمیشہ وعدے کو وفا کرتے ہوئے سچ بولنے والا پایا ہے۔ جحیٰ نے کہا تیری ہلاکت ہو! دروازہ کھول میں تجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کعب نے اندر سے کہہ دیا میں کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جحیٰ نے کہا تم بھلا! تو نے اس خوف سے مجھ پر دروازہ بند کر رکھا ہے کہ میں تیرے ساتھ کچھ کھالوں گا۔ پس یہ سن کر کعب کے جذبات بھڑک اٹھے اور اسی حال میں اس نے دروازہ کھول دیا۔ تو جحیٰ نے اندر داخل ہو کر کہا اے کعب! میں تو زمانے کی عزتیں تیرے پاس لایا ہوں اور قریش کے قائدین اور سرداروں پر مشتمل ایک لہریں مارنا ہوا سمندر تیرے پاس لے کر آ گیا ہوں۔ حتیٰ کہ میں نے قریش کو دو دم کے مقام پہنچا، اسہال پر اتارا ہے۔ اور بنی غطفان کو گزشتہ رات سے اپنی قائدین اور سرداروں سمیت جبل احد کی جانب قحیٰ کے پچھلے حصہ میں اتار دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے معاہدہ اور پختہ وعدہ کیا ہے کہ وہ واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو مکمل طور پر ختم کر دیں گے۔ یہ سن کر کعب بن اسد نے کہا تم بھلا! تو زمانے بھری ذلتیں لے کر میرے پاس ہے اور ایسا بادل لے کر آیا ہے جس کا پانی برس چکا ہے اور اب اس میں گرج چمک کے سوا اور کوئی شے بھی نہیں۔ اس لیے تو مجھے محمد (ﷺ) کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ میں نے ان کی جانب سے صدق اور ایٹھائے عہد کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن جحیٰ بن اخطب کعب کو فریب دینے کے لیے مسلسل اور بے نیچے باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر تیرے ساتھ یہ عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر قریش واپس لوٹ گئے اور وہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع نہ کر سکے تو میں تیرے ساتھ اس قلعہ میں سکونت اختیار کر لوں گا۔ یہاں تک کہ جوازیت اور تکلیف تجھے پہنچے گی میں بھی اس سے دو چار ہوں گا۔ بالآخر کعب نے اپنا معاہدہ توڑ دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ اور اس کے درمیان معاہدہ کے سبب جو پابندیاں عائد تھیں ان سے اس نے برأت کا اظہار کر لیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے پاس پہنچی۔ تو آپ ﷺ نے بنی اشہل میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ بن بنی ساعدہ میں سے قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھ بنی حارث بن خزرج کے بھائی عبد اللہ بن رواحہ اور بنی عمرو بن عوف کے بھائی خوات بن جہیر رضی اللہ عنہم کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اور فرمایا جاؤ اور غور سے دیکھ کر آیا جو خبر ان کی جانب سے مجھ تک پہنچی ہے وہ سچ ہے یا نہیں۔ اگر وہ سچ ہو تو مجھے کتنا ہی مطلع نہ کرو نہ میں جان لوں گا (صراحتاً بتا کر) لوگوں کی قوت و طاقت کمزور نہ کرنا۔ اور اگر وہ اپنے اور ہمارے درمیان والے معاہدہ کے پابند ہوں، اسے پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پھر بلند آواز سے واضح الفاظ میں لوگوں کو بتا دینا۔ پس وہ چلے گئے حتیٰ کہ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں اس سے بھی زیادہ خبیث اور رذیل پایا جتنی خبر ان کے بارے پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کھڑے رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑ چکے تھے اور کہنے لگے کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ تو اس کے بعد حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے درمیان گالی گلوچ کا تبادلہ بھی ہوا، کیونکہ آپ کے جذبات انتہائی تیز تھے۔ تو حضرت سعد بن معاذ نے کہا ان سے گالی گلوچ چھوڑ دو کیونکہ اب ہمارے اور ان کے درمیان معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ حضور علیہ

واصلوہ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا عضل والقارہ (یعنی جس طرح قبیلہ عضل اور قارہ نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے دھوکا کیا تھا اسی طرح انہوں نے بھی معاہدہ توڑ دیا ہے)۔ اللہ اکبر! گروہ مسلمین! تمہیں بشارت ہو۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش بڑھ گئی، خوف شدید ہو گیا اور صحابہ کرام کے دشمن اوپر پیچھے سے ان پر چڑھ آئے۔ حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کو بھی مختلف خیال آنے لگے۔ اور بعض منافقین کا فحاش ظاہر ہو گیا۔ یہاں تک کہ بنی عمرو بن عوی کے بھائی محب بن قیس نے کہا کہ محمد (ﷺ) ہم سے وعدہ کر رہے ہیں کہ ہم قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی قضاے حاجت کے لیے جانے پر قادر نہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہمارے ساتھ سوائے فریب اور دھوکے کے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ **ثُمَّ وَدَّعْنَا اللَّهُ وَمَا نَلْنَا إِلَّا غُرُورًا** اور بنی حارث میں سے ایک آدمی اس بنی قحطی نے یہ کہا ہمارے گھروں میں کوئی محافظ نہیں۔ لہذا ہمیں گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ مدینہ طیبہ سے بہت باہر کی طرف ہیں۔ حالانکہ ان کے اپنے قبیلے کے افراد کی ایک جماعت گھروں کی حفاظت پر مامور تھی۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب کعب نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ توڑ دیا۔ تو اس نے اپنی قوم کے اشراف کو جمع کیا۔ ان میں زبیر بن بطلان، عیاش بن قیس اور عقبہ بن زید وغیرہ شامل تھے۔ اور انہیں اپنے فیصلے کے بارے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے اسے خوب ملامت کی اور عدد درجہ ناپستہ دینے کا اظہار کیا یہاں کہ کعب انتہائی نادان اور شرمندہ ہوا۔ لیکن چونکہ اب معاملے کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اس لیے اس حالت اور نعمت نے اسے کوئی نفع نہ دیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمایا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو بنی قریظہ میں جا کر ان کی خبر مجھ تک لائے گا؟ پس میں چلا گیا اور جب وہاں لوٹ کر آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے اپنے والدین کا اکٹھا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا فداک ابی و امی (میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں) (2)۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجنے سے قبل حضرت زبیر بن عوامؓ کو ادھر بھیجا تھا۔ کیونکہ یہ روایت ہے کہ جب حضرت زبیرؓ نے بنی قریظہ سے واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کو ان کے بارے مطلع کیا کہ وہ اپنے قلعوں کو درست کر رہے ہیں، راستوں اور سرحدوں کو بند کر رہے ہیں، اپنے گھوڑوں اور مویشیوں کو جمع کر رہے ہیں۔ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَئِكَ نَبِيٌّ خَوَارِثًا وَخَوَارِثُ الْوُثْيُ (ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے) علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور شریکین ایک مینے میں سے ہیں سے زائد راتوں تک اپنی اپنی قیام گاہوں میں ٹھہرے رہے اور اس دوران تیر اندازی اور پتھر پھینکنے کے سوا اور کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے لیے آزمائش مزید بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے بنی غطفان کے سرداروں عیینہ بن حصین اور ابوالحارث بن عمرو کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹا کر لے جائیں تو انہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی طرف سے مدینہ طیبہ کے پھلوں میں سے پید اور کا تیرا حصہ دیا جائے گا۔ آپ ﷺ اور ان کے درمیان صلح کی بات طے ہو گئی حتیٰ کہ انہوں نے تحریر بھی لکھ دی۔ لیکن ابھی تک اس پر شہادت ثبت نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ نے اس کا ذکر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے کیا اور اس بارے میں دونوں سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں عرض

کی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم ارشاد فرمایا (اگر ایسا ہے) تو پھر اس پر عمل کیے بغیر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ یا آپ ایسا کرنا خود پسند فرما رہے ہیں (اگر اس طرح ہے) تو پھر ایسا ضرور کیجئے۔ یا آپ ایسا ہمارے لیے کرنا چاہتے ہیں ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی سبب نہیں فقط تمہارے لیے ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ قسم بخدا! میں نے عربوں کو دیکھا ہے وہ ایک قوس سے تم پر تیر پھینکنا چاہتے ہیں۔ ہر جانب سے تم پر اکٹھے ہو کر آگئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں تمہارے خلاف ان کی قوت اور طاقت کو توڑ دوں۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذ نے عرض کی یا رسول اللہ! ایک وقت تمام اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کیا کرتے تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نہ ہی اسے پہچانتے تھے لیکن اس حالت میں وہ یہ طاقت نہیں رکھتے تھے کہ وہ ایک کھجور بھی بغیر مہمانی یا خریدنے کے کھا سکیں۔ لیکن اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے سبب عزت و مکرم عطا فرمائی ہے اور آپ کے سبب ہمیں عظمت و رفعت عطا فرمائی ہے تو ہم انہیں اپنا بلا وجہ دے دیں۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں قسم بخدا ہم انہیں تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاس تمہیں اختیار ہے وہی کرو جو پسند کرو۔ پس حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے صحیفہ پکڑا اور اس پر جو کچھ لکھا گیا تھا اسے مناد یا پھر کہا وہ ہمارے خلاف جو کر سکتے ہیں کریں۔ (۱)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سب سے اول یہ بات حضرت اسید بن حنیس رضی اللہ عنہ نے کہی تھی اور پھر ان کے بعد حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے ہی کہی۔ عیینہ بن حصین اس مجلس میں اپنی ناگہ پھیلے بٹھا تھا۔ تو حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اے بندرا! اپنی ناگ پیچھے سمیٹ لے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے آداب مانع نہ ہوتے تو میں اپنا نیزہ تیری کوکھ میں گاڑ دیتا۔ پس اس طرح عیینہ اور حارث دونوں خائب و خاسر نا کام ہو کر واپس لوٹ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں مدینہ طیبہ پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جب انہوں نے انصار کو اس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا تو وہ لرز گئے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام پذیر رہے اور دشمن محاصرہ کیے رہے لیکن ان کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ قریش کے چند شہسوار جن میں عمرو بن عبدود بنی عامر بن لوی کا بھائی، مکرہ بن ابی جہل خزومی، ہبیرہ بن وہب خزومی، نوفل بن عبد اللہ بنضر ابن خطاب اور بنی محارب بن مہر کا بھائی مرداس بن لوی شامل تھے، جنگ کے لیے آئے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بنو کنانہ کے پاس سے گزرے اور انہیں کہا اے بنو کنانہ! جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج تم جان لو گے شہسوار کون ہے؟ پھر خندق کی طرف آئے اور خندق کے پاس آ کر ٹھہر گئے تو اسے دیکھ کر کہنے لگے قسم بخدا! بے شک یہ تو ایک چال ہے عرب پہلے تو یہ تدبیر نہیں کیا کرتے تھے پھر انہوں نے خندق کے ایک تنگ مقام کو تلاش کیا اور اپنے گھوڑوں کو اس میں ڈال دیا۔ پس گھوڑے انہیں لے کر خندق اور جبل سلع کے درمیان خالی جگہ میں گھومنے لگے۔ ادھر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو داخل کیا تھا۔ اتنے میں گھوڑے سوار بھی ان کے سامنے آ گئے۔ عمرو بن عبدود جنگ بدر میں شریک ہوا اور اس میں زخمی ہونے کے سبب جنگ احد میں حصہ نہ لے سکا۔ لیکن اب جب جنگ خندق کا وقت آیا تو وہ پھر جنگی تدابیر سکھانے اور اپنی قوت دیکھنے کے لیے آ گیا۔ چنانچہ اب وہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل

آکھڑا ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا اسے عمرو اتو نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ جب بھی قریش میں سے کوئی آدمی دو چیزوں کی طرف دعوت دے گا تو تو ان میں سے ایک ضرور قبول کر لے گا۔ اس نے کہا بالکل ایسے ہی ہے۔ تو پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا۔ میں تجھے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں (تو اسے قبول کر لے)۔ اس نے جواب دیا مجھے اس کوئی ضرورت نہیں۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر میں تجھے میدان میں اترنے کی دعوت دیتا ہوں (مقابل آجا)۔ اس نے جوابا کہا کیوں اے تجھے قسم بخدا میں تجھے قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جوابا فرمایا قسم بخدا! میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ پس یہ سن کر عمرو کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ گھوڑے سے اچھل کر نیچے آ گیا۔ اس کی کونجیں ڈھی کر دیں یا اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوا پھر دونوں ایک دوسرے کو پکڑنے لگے اور آپس میں لڑنے لگے یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور اس کا گھوڑا بھاگتے ہوئے خندق سے دوسری جانب کود گیا۔ عمرو کے ساتھ دو اور آدمی بھی قتل ہوئے۔ ان میں ایک منہ بن عثمان بن عبد السیاق بن عبد الدار تھا اسے تیر لگا اور وہ مکہ میں پہنچ کر مر گیا۔ اور دوسرا نوفل بن عبد اللہ بن مغیرہ مخزومی تھا وہ خندق سے کودتے ہوئے اس میں گر پڑا۔ اور اوپر سے اسے پتھر مارے گئے۔ اس نے کہا اے گروہ عرب اس سے احسن انداز میں جنگ کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے اترے اور اسے قتل کر دیا۔ پس اس طرح مسلمان غالب آ گئے۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ وہ اس کا جسم انہیں فروخت کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں نہ اس کے جسم کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے عوض شمن لینے کی۔ پس تم اس کا مردہ جسم لے جاؤ آپ نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور لاش اٹھانے کی اجازت دے دی۔ (۱)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ غزوہ خندق کے وقت ہم بنی حارثہ کے قلعے میں تھیں وہ مدینہ طیبہ کا محفوظ ترین قلعہ تھا۔ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی قلعہ میں ہمارے ساتھ تھے۔ اور یہ واقعہ ہمارے لیے پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ باہر نکلے اس حال میں کہ آپ چھوٹی زرہ پہنے ہوئے تھے مکمل بازو اس سے باہر تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا نیزہ پکڑے ہوئے تھے اور ساتھ یہ کہہ رہے تھے۔

يَا لَيْسَتْ قَلًا مَلَا يُنْذِرُكَ الْهِنْجَاءُ جَمْلًا لَا بَأْسَ بِالْمَوْتِ إِذَا خَانَ الْأَخْلُ

اے کاش! امیر اذنت بھڑکتی جنگ کپالے جب موت کا مقررہ وقت آجائے تو پھر مرنے سے کوئی انکار (حزن) نہیں۔

تو ان کی ماں نے کہا اے بیٹے جلدی رسول اللہ ﷺ سے جا مل قسم بخدا! تو نے دیر کر دی ہے۔ تو میں نے ان سے کہا اے سعد کی ماں! میں یہ چاہتی ہوں کہ سعد کے جسم پر ایسی زرہ ہوتی جو ان کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی مجھے ان کے بارے میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں سے کوئی تیر نہ آگئے۔ تو ان کی ماں نے جواباً عرض کی اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ ہو گا وہ ہو کر رہے گا پس اسی دن انہیں ایک تیر آ کر لگا جس نے ان کی رگ اکھل کو کاٹ دیا۔ یہ تیر بنی عامر بن لوی میں سے ایک آدمی حیان بن قیس غزفہ انہیں مارا۔ جب اس نے آپ کی طرف تیر پھینکا تو اس نے کہا یہ لمے میں ابن غزفہ ہوں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بدعادیہ ہوئے فرمایا اللہ تجھے جہنم کے عذاب میں مبتلا کرے۔ پھر رب کریم کی بارگاہ میں یہ انتحار کی اسے اللہ! اگر قریش کے ساتھ ابھی تک جنگ باقی ہے تو پھر مجھے بھی اس کے لیے باقی رکھ۔ کیونکہ

میرے نزدیک ان سے بڑھ کر اور کوئی ایسی پسندیدہ قوم نہیں جن کے خلاف میں جہاد کروں۔ کیونکہ انہوں نے تیرے رسول ﷺ کو اذیتیں دی ہیں، ان کی تکذیب کی ہے اور انہیں (شہرے نکال دیا ہے اور اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم کر دی ہے تو پھر اسی زخم کو میرے لیے شہادت کا ذریعہ بن دے اور مجھے اس وقت تک موت نہ دے یہاں تک کہ میری آنکھیں بنی قرظہ (کی بر بادی اور ہلاکت) سے ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ حالانکہ یہ لوگ دور جاہلیت میں آپ کے حلیف اور دوست تھے (1)۔ مجاہد اور محمد بن اسحاق یحییٰ بن عباد بن عبد اللہ بن زبیر سے اور وہ اپنے باپ عباد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعے میں تھیں اور حسان بن ثابت بھی وہیں ہم غوروں اور بچوں کے ساتھ تھے۔ پس ہمارے پاس سے یہودیوں کا ایک آدمی گزرا اور قلعے کے گرد گھومنے لگا۔ اس وقت بنو قرظہ جنگ میں شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہمارے اور بنو قرظہ کے درمیان ہمارے دفاع کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو ساتھ لے کر دشمن کے سامنے قیام فرما تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں وہ آدمی گھومتا پھر ہمارے سامنے آگیا۔ میں نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا یہ یہودی ہے تم قلعے کے ارد گرد گھومتے دیکھ رہے ہو قسم بخدا میں اس کے بارے میں پراسن نہیں یہ پیچھے کی جانب سے کسی کمزور جگہ سے یہودیوں کو ہمارے پاس اندر داخل کرنے کی کوشش کرے گا اور صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ لہذا تم اس کی طرف بچے اور اتار اسے قتل کر دو۔ یہ سن کر حسان نے کہا اے عبد المطلب کی بیٹی اللہ تعالیٰ تیری مغفرت فرمائے قسم بخدا! تو جانتی ہے مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پس جب اس نے مجھے یہ کہا، اور مجھے ان سے کوئی امید نظر نہ آئی۔ تو میں نے اپنا ازار بندھ کر مضبوط کیا اور قلعے سے ایک چوب اٹھائی۔ اور پھر قلعے سے بچے اتر کر اس یہودی کی گردن پر ایسے زور سے ماری کہ اسے قتل کر دیا۔ پھر جب اس سے فارغ ہو کر قلعے میں واپس لوٹی تو حسان نے کہا بچے اتر اور اس کے ہتھیار اتار کر لے آؤ میرے لیے اس کے ہتھیار اتارنے میں فقط یہ رکاوٹ تھی کہ وہ اجنبی مرد تھا۔ مگر حسان نے پھر یہ کہہ دیا اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے تو اس کے ہتھیار اتارنے کی کوئی حاجت نہیں۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ یہ روایات بھی ہے کہ بنی قرظہ نے رات کے وقت مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے قریش سے مدد طلب کی۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کے تمام مقامات اور قلعوں کی حفاظت کے لیے سلمہ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ اور زید بن حارثہ کو تین سو افراد کے ہمراہ بھیج دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عباد بن بشر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہر رات رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اور شرمین جب خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو صحابہ کرام انہیں پتھر اور تیر مار کر روک دیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بذات خود بھی پہرہ دیا کرتے تھے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر ایک رات جاگتے رہے اور فرمایا کاش میرے لیے کوئی ایسا صالح آدمی ہوتا جو میری نگہبانی کرتا۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا سعد ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کیسے آئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کی میرے دل میں آپ کے بارے میں کچھ خوف مالا حق ہوا۔ پس میں آپ کی حفاظت کے لیے حاضر ہوا

ہوں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور پھر آرام فرما ہو گئے۔ (1)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں اس دن سے سعد سے محبت کرتی ہوں جب سے وہ غزوہ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے لگے۔ خندق میں ایک مقام تھا جہاں سے کفار کے خندق عبور کرنے کا خطرہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقام کی خود نگہبانی کر رہے تھے۔ جب آپ کو شہید سردی محسوس ہوتی تو میرے پاس تشریف لاتے اور مجھ سے حرارت و گرمائش حاصل کرتے۔ پھر تشریف لے جاتے اور حفاظت کرنے لگتے اور فرماتے تھے مجھے اس مقام کے سوا کہیں سے بھی دشمن کے اندر داخل ہونے کا خوف و خطرہ نہیں۔ پس ایک بار آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تاکہ گرمائش اور سکون حاصل کریں تو فرمایا کا شہ میرے لیے کوئی صالح آدمی ہوتا جو آج کی رات میری نگہبانی کرتا تاکہ میں آرام کو لوں۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی تو آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا سعد ہوں۔ اور ہم اس مقام کی حفاظت کر رہے ہیں یہ سنا تو رسول اللہ ﷺ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے سانس کی آواز سنی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بذات خود نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے حالانکہ سردی انتہائی شدید تھی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ایک رات اپنے خیمہ میں نماز ادا فرمائی پھر پھر وہ دینے کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا یہ خندق کے ارد گرد مشرکین کے گھوڑ سوار ہیں۔ پس آپ ﷺ نے عباد بن بشر کو آواز دی۔ انہوں نے عرض کی بلیک یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ نے پوچھا کیا تیرے ساتھ کوئی ہے؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں میرے ساتھ میری قوم کے افراد ہیں جو آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی قوم کے افراد کو لے جاؤ کیونکہ خندق کے ارد گرد مشرکین کے یہ افراد رات کے وقت سیر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی اے اللہ! ہم سے ان کے شر کو دور فرما اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ پس عباد بن بشر اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق کی طرف گئے۔ اسے میں ابوسفیان اور اس کے شرک ساتھی خندق کے تنگ مقام میں داخل ہو چکے تھے اور مسلمان ان پر چڑھ اور تیر برسارہے تھے پھر عباد بن بشر ان سے جا ملے۔ عباد کہتے ہیں میں مومنین کے ساتھ مل کر ان پر تیر اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ مشرکین شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے۔ جب میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ کر واپس آیا تو آپ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جو نبی آپ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے صورت حال سے آپ کو مطلع کر دیا۔ پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ آرام فرما ہو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کی سونے کی حالت کی آواز سنی اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو آپ بیدار ہوئے پھر آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں اے اللہ عباد بن بشر پر رحمت نازل فرما۔ (2)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خیمہ میں آرام فرما رہے تھے۔ جب نصف رات گزری تو آوازیں بلند ہونے لگیں اور میں نے یہ سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں اے اللہ تعالیٰ کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ۔ اس غزوہ میں یہ مہاجرین کا خصوصی شعار (نشان وغیرہ) تھا (اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کے وقت تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو اس صورت میں تمہارا شعار حتم لا یصرون ہونا چاہئے۔ اب مذکورہ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ یہ انصار کا شعار تھا اور

وہ مہاجرین کا) تو رسول اللہ ﷺ ہند سے بیدار ہو گئے اور اپنے خیمے سے باہر لوگوں کی طرف گئے۔ وہ آپ کے خیمے کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان میں عباد بن بشر بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا یہ آوازیں کیسی ہیں؟ اور ساتھ ہی عباد کو حکم فرمایا کہ ان کی خبر لے آؤ۔ پس حضرت عباد رضی اللہ عنہ گئے اور رسول اللہ ﷺ ان کے واپس آنے تک انتظار فرماتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ یہ عمرو بن عبدود اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور وہ ان پر تیر اور پتھر برسارہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خیمے میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ہتھیار اٹھائے، پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور صحابہ کرام کی ایک جماعت ساتھ لے کر میدان کا رزدار کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر قحطی ہی دیر بعد شاداں و فرحان واپس تشریف لے آئے اور ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے شر کو دور فرما دیا ہے اور وہ زخموں سے چور ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ آرام فرما ہوئے اور سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے سانس کی آواز سنی۔ پھر دوبارہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور حضرت عباد رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو! یہ آوازیں کیسی ہیں؟ وہ گئے اور واپس آ کر بتایا یا رسول اللہ! ﷺ یہ ضرار بن خطاب اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور پھر اوتھر برسارہا ہے۔ آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے اور صبح ہونے کی تک ان سے جنگ کرتے رہے، پھر واپس تشریف لائے اور فرمایا وہ شدید زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں غزوہ مریض، خیر، حدیبیہ، فتح مکہ اور حنین میں آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں غزوہ خندق سے بڑھ کر آپ کے لیے کوئی غزوہ بھی زیادہ شدید اور تکلیف دہ نہیں تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو کثیر زخم آئے۔ موسم کے اعتبار سے شدید سردی تھی اور تنگ حالی کا دور تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن کفار خندق کے ارد گرد جمع ہو گئے اور شدید جنگ لڑتے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور آپ ﷺ نے نماز تک کی فرصت نہ پائی یہاں تک کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں فوت ہو گئیں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں عشاء کے وقت میں قضا فرمایا۔

ترمذی اور نسائی نے ابو عبیدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو غزوہ خندق کے دن چار نمازوں سے مشغول رکھا یہاں تک کہ جتنا اللہ نے چاہا رات کا حصہ بھی گزر گیا پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی، انہوں نے پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ ابو عبیدہ نے اپنے باپ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

نسائی نے اپنی سنن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوہ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے ہمیں روک دیا گیا۔ پھر آخر کار ہمیں وہ ادا کرنے کی فرصت دے دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَخَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْفِتْنَةَ۔ پھر رسول اللہ ﷺ قیام فرما ہوئے (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ایسے ہی ظہر کی نماز پڑھائی جیسے پہلے پڑھاتے تھے۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ پہلے کی طرح عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ویسے ہی مغرب کی نماز پڑھائی جیسے اس سے قبل پڑھاتے تھے اور پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ

ﷺ نے ایسے ہی عشاء کی نماز پڑھائی جیسے آپ ﷺ پڑھاتے تھے۔ یہ واقعہ قر مجلا ۱۰۷ ذُکُھَنَا کی آیت نازل ہونے سے پہلے کا ہے (۱)۔ ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس میں عشاء کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اپنے وقت میں ادا ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری روایت میں اس اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے معتاد وقت سے تاخیر کے ساتھ ادا ہوئی۔

بزار نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ غزوہ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے مشغول رہے یہاں تک کہ رات کا ایک پہر بھی گزر گیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ انہوں نے اذان دی، پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا تو انہوں نے اذان کی، اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا، پس انہوں نے اذان دی اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا، پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا شیخ زمین پر تمہارے سوا ایسی کوئی قوم نہیں جو اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف ہو (۲)۔ اس روایت کی سند میں عبد اللہ بن ابی الحارث راوی کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ خندق کے دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے ابھی تک عصر کی نماز ادا نہیں کی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم بخدا میں نے بھی نماز عصر ادا نہیں کی۔ پھر میں حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں وادی بطنان میں اترے۔ تو آپ ﷺ نے وہاں نماز کے لیے وضو فرمایا اور ہم نے بھی نماز کے لیے وضو کیا۔ پھر آپ ﷺ نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر پڑھائی اور پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھائی (۳)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوہ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا اللہ تعالیٰ (ان کفار) کے گھروں اور قبروں کو آگ سے اسی طرح بھروے جیسے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ و طہی سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا (۴) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ پھر آپ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان یہ نماز ادا فرمائی (۵)۔ مذکورہ احادیث کے بارے میں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ یہ مختلف واقعات ہوں کیونکہ غزوہ خندق کئی دنوں تک جاری رہا تھا۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ ایک ہی حالت کا واقعہ ہو۔ بہر حال ان میں تطبیق ممکن ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔

مسئلہ: جب کئی نمازیں قضا ہو جائیں تو انہیں ادا کرتے وقت پہلی نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں گی اور پھر ہر نماز کے لیے صرف اقامت ہی کہی جائے گی۔ لیکن افضل یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں جیسا کہ حدیث بزار سے ثابت ہے واللہ اعلم۔

جب اہل ایمان پر آزمائش و ابتلاء شدید ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے کفار کے لیے بدعافرمانی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے خلاف بدعافرمانی اور بارگاہ الہی میں یہ عرض کی ”اللَّهُمَّ مَنَزِلَ الْكِتَابِ سَرِيعَ الْحِسَابِ اهْزِمِ الْأَعْرَابَ اللَّهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ

1- مجمع الزوائد، جلد 2 صفحہ 105 (الفلک)
2- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)
3- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 580 (مذہب تعلیم)
4- صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 946 (وزارت تعلیم)
5- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 227 (وزارت تعلیم)

ذَلِّمْ لَهُمْ“ (اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے، جلد حساب کرنے والے ان گروہوں کو شکست سے دوچار فرما اے اللہ! انہیں ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دے اور ان پر زلزلہ (رب، کچکی، طاری کر دے) ۱)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مسلسل تین دن تک مسجد الفتح میں ان احزاب (گروہوں) کے لیے بددعا فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سموار، منگل اور بدھ کے دن تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بدھ کے دن ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا تو ہم نے آپ ﷺ کے چہرہ مقدس پر فرحت و مسرت کے آثار دیکھ لیے۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد جو تکلیف اور مصائب بھی ہم پر آئی اور ہم نے اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لیے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا قبول فرمائی۔

علامہ بغوی، نے ذکر کیا ہے کہ پھر فہم بن مسعود بن عامر بن عطفان رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن ابھی تک میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں۔ اس لیے آپ جو چاہیں مجھے حکم ارشاد فرمائیں تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا تو ہم میں اکیلا آدمی ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو ان گروہوں کو ہم سے جیسرے دیے کیونکہ جنگ تو ایک خفیہ تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ فہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں کہ میں جو چاہوں انہیں کہہ لوں۔ تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ چنانچہ فہم بن مسعود بنی قریظہ کے پاس آئے اور جاہلیت میں آپ ان کے گھر سے دوست تھے انہیں جا کر کہا ہے بنی قریظہ! میری تمہارے ساتھ جو خاص محبت ہے اسے تم پہچانتے ہی ہو۔ انہوں نے کہا تو نے بالکل سچ کہا ہے تو ہمارے نزدیک متم اور مشکوک آدمی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے انہیں یہ کہا کہ قریش اور عطفان کے لوگ جنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں اور تم جنگ میں ان کی مدد کر رہے ہو۔ لیکن قریش اور عطفان کی کیفیت تمہاری طرح نہیں۔ یہ شہر تمہارا شہر ہے۔ تمہارے اموال، اولاد اور عورتیں اسی شہر میں ہیں اور تم اس شہر سے گئی اور شہر کی طرف جانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جبکہ اس کے برعکس قریش اور بنی عطفان کے اموال، اولاد اور ان کی عورتیں یہاں سے دور ہیں۔ اگر انہیں کامیابی اور مال غنیمت دکھائی دیا تو وہ اسے حاصل کریں گے اور اگر حالات اس کے برعکس ہوئے تو وہ اپنے شہروں کو چلے جائیں گے اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان سے نکل جائیں گے۔ اور یہ آدمی تمہارے شہر میں مقیم ہے اور اگر وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں تو تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم اس قوم سے اس وقت تک جنگ نہ کرو۔ یہاں تک تم ان میں سے چند سردار اپنے پاس بطور رہن نہ رکھ لو اس سے تمہیں اعتماد حاصل ہو جائے گا (اور وہ بھاگ کر نہیں جائیں گے) اور پھر محمد (ﷺ) سے جنگ کرنا اور خوب مقابلہ کرنا۔ یہ سن کر انہوں نے کہا تو نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ پھر فہم وہاں سے نکل کر قریش کے پاس آئے اور ابو سفیان بن حرب اور اس کے قریبی ساتھیوں کو کہا تم اپنے ساتھ میری محبت کے بارے اور محمد (ﷺ) کے بارے میں میرے نظریات سے خوب واقف ہو مجھ تک ایک بات پہنچی ہے، میں نے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میرے بارے میں اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے جواب دیا ہم بائیسین ایسا ہی کریں گے۔ تو فہم نے انہیں بتایا کہ تم جانتے ہو کہ گروہ یہود نے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان ہونے والے معاہدہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اب وہ اس پر نامور اور شرمندہ ہیں۔ لہذا انہوں نے ان کی طرف یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے کیے پر حاذق نام ہیں، کیا تم ہم سے اس شرط پر راضی ہو سکتے ہو کہ ہم قریش اور عطفان کے اشراف میں سے کچھ لوگ تمہارے حوالے کر دیں تاکہ انہیں قتل

کر دیا جائے اور پھر ہم تمہارے ساتھ مل کر باقی لوگوں کا مقابلہ کریں؟ تو اس پر محمد (ﷺ) نے اپنی رضامند کیا پیغام بھیج دیا ہے۔ اس لیے اگر یہود تم سے یہ مطالبہ کریں کہ کچھ افراد ہمارے پاس بطور رہن رکھو تو انہیں بالکل ایک آدمی بھی نہ دینا۔ پھر نصیم وہاں سے نکلے اور غطفان کے پاس آئے اور کہا ہمارے گروہ غطفان! تم میرے گھر اور خاندان کے افراد ہو تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہو اور میں قطعاً تمہارے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ تم مجھے ہمہ گیر کرو گے اور میری بات پر خشک کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا تم نے بالکل سچ کہا ہے۔ اس نے انہیں کہا میرا از رکھنا میرے بارے میں کسی کے سامنے اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے کہا ہم ایسا ہی کریں گے اور پھر اس نے ان سے بھی وہی کچھ کہا جو قریش سے کہا تھا اور ان کی طرح اسی شے سے انہیں بھی خوب ڈرایا۔ پھر جب شوال 5ھ پہنچے کے دن کی رات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی خاص مدد فرمائی کہ ابوسفیان نے ورق بن غطفان اور عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے کچھ افراد کے ساتھ بنی قریظہ کی طرف بھیجا۔ اور انہوں نے وہاں پہنچ کر کہا کہ ہم ایسی جگہ پر نہیں جہاں قیام کیا جائے ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس لیے تم جنگ کی تیاری کر دو تا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ کھل کر مقابلہ کریں اور اس صورت حال سے فارغ ہو جائیں جو ہمارے اور ان کے درمیان بنی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے جواب یہ دیا کہ آج پہنچے کا دن ہے یہ تو ایسا دن ہے جس میں ہم کوئی کام بھی نہیں کرتے۔ ہمارے بعض افراد نے اس دن ناکام (بدعت) کیا تھا۔ پس اس سبب سے انہیں جو اذیت پہنچی وہ تم پر پڑتی نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم تمہارے ساتھ مل کر اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک تم اپنے کچھ افراد بطور رہن ہمیں نہ دے دو۔ وہ ہمارے پاس ہوں گے تو ہمیں اعتماد ہے گا اور ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ کھل کر جنگ کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اگر جنگ سے تمہیں نقصان پہنچایا اور اس کی آزمائش ہو گئی تو تم اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ گے اور ہمیں تنہا چھوڑ جاؤ گے۔ اور وہ لوگ ہمارے شہر میں رہنے والے ہیں اور ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہم محمد (ﷺ) کا مقابلہ کر سکیں۔ پس جب واپس لوٹ کر قاصدوں نے انہیں کیا کروہ کچھ بتایا جو بنی قریظہ نے کہا تو قریش اور غطفان نے کہا تم بھڑا تم یقین کر لو جو کچھ ہم نے مسعود نے تمہیں بتایا ہے وہ بالکل صحیح اور حق ہے۔ پھر انہوں نے بنی قریظہ کی طرف پیغام بھیجا تم بھڑا! ہم تو اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی بھی تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لہذا اگر تم ارادہ رکھتے ہو تو نکلو اور جنگ کرو۔ پس جب یہ پیغام لے کر قاصد بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی کہا کہ جو کچھ نصیم بھی مسعود نے انہیں بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ وہ فقط یہی ارادہ رکھتے ہیں کہ جنگ کریں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو یہ غنیمت ہے۔ بصورت دیگر اپنے شہروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان تمہارے شہر میں عداوت پیدا کر دیں گے۔ لہذا انہوں نے قریش اور غطفان کی طرف یہ پیغام بھیجا تم بھڑا! ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہیں لیں گے جب تک کہ تم اپنے آدمی ہمیں بطور رہن نہیں دو گے۔ لیکن انہوں نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا اور ان کے درمیان بھوت ڈال دی اور موسم سرما کی انتہائی سختی رات میں ان پر شدید سرد ہوا چلا دی۔ جس نے ان کی حاضرین کو اور نہ کھا کر دیا اور برتنوں کو اڑا کر دور پھینک دیا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کے معاملات میں باہمی اختلاف کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں ان کی طرف بھیجا تا کہ رات کے وقت جو کچھ وہ کریں دیکھ کر آئیں۔ محمد بن اسحاق نے زید بن زیاد سے اور انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے اور دوسرے بعض نے ابراہیم نخعی سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے، ان دونوں کا بیان ہے کہ اہل کوفہ میں سے ایک نوجوان نے حضرت حذیفہ بن یمان

رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے اباعبداللہ! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور تم نے آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی ہے تو آپ نے فرمایا اے بیٹے! جی ہاں۔ پھر اس نے پوچھا۔ تم کیسا بناؤ رکھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا قسم بخدا! ہم تیار رہا کرتے تھے۔ پھر اس نے پوچھا تو جو ان کے ہاتھ میں تھا اگر ہم آپ ﷺ کو پالیتے تو ہم آپ ﷺ کو زور میں پر چلنے کے لیے نہ چھوڑتے بلکہ ہم آپ کو اپنی گردنوں پر اٹھاتے اور آپ کی خدمت میں مصروف رہتے۔ یہ سن کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بیٹے! قسم بخدا! میں اب بھی اپنے آپ کو غزوہ احزاب کی ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں دیکھ رہا ہوں۔ جبکہ آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی آج ان احزاب کی طرف جا کر ان کی خبر ہمارے پاس لائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائے گا لیکن ہم میں سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ کا کافی وقت تک نماز ادا فرماتے رہے۔ پھر ہماری طرف التفات فرمایا اور پہلے کی طرح پھر ارشاد فرمایا مگر اس بار بھی لوگ خاموش رہے اور ہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ نے کافی وقت نماز پڑھنے میں صرف کیا۔ پھر ہماری جانب توجہ فرمائی اور فرمایا کون آدمی کھڑا ہوگا جو ہمارے لیے ان احزاب کے حالات دیکھ کر آئے۔ پس وہ جنت میں میرا فیض ہوگا لیکن اس کے باوجود بندہ خدیفہ، سخت بھوک اور شدید سردی کی وجہ سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پس جب کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا اے حذیفہ! پس جب آپ ﷺ نے مجھے یاد فرمایا تو میرے لیے اٹھنے کے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ تو میں نے عرض کی لیک یا رسول اللہ! ﷺ اور ساتھ ہی اٹھا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آنکھیں میرے پہلو (سردی ہے) کانپ رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے میرے سر اور چہرے پر اپنا دست مبارک بچھیرا اور پھر فرمایا۔ تم اس قوم کے پاس جاؤ اور ان کی خبر لے آؤ اور کچھ بھی نہ کرنا یہاں تک کہ واپس میری طرف لوٹ آؤ۔ پھر میرے حق میں دعا فرمائی اے اللہ! اس کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے اور اس کے اوپر اور نیچے سے اس کی حفاظت کرنا۔ پس میں نے اپنے تیراٹھائے، اپنے ہتھ پیرا بندھے اور پھر ان کی طرف چل پڑا۔ اور (مجھے ایسا محسوس ہوا جتنا کہ گویا میں حمام میں چل رہا ہوں) (یعنی مکمل طور پر میری سردی ختم ہو گئی)۔ میں وہاں پہنچا اور ان لوگوں میں داخل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت ہوا اور لشکر بھیج دیئے۔ اللہ تعالیٰ کے لشکروں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی کوئی ہانڈی، آگ اور خیمہ اپنی جگہ پر برقرار نہ رہا۔ اس وقت ابوسفیان بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ پس میں نے تیر نکالا، اسے کمان کے چلے پر پڑھایا اور ابوسفیان کو مارنے کا ارادہ کیا۔ اگر میں اسے مارتا تو بالیقین اسے مار دیتا۔ لیکن پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کا یاد ارشاد یاد آ گیا کہ ”کے کچھ عمل بھی نہ کرنا یہاں تک کہ میرے پاس لوٹ آئے“ چنانچہ میں نے اپنا تیر واپس ترس میں رکھ دیا۔ جب ابوسفیان نے وہ حال دیکھا جو وہاں اللہ تعالیٰ کے لشکر ان کے ساتھ کر رہے تھے کہ کوئی ہانڈی سیدھی نہیں رہی۔ آگ چوہے میں موجود نہیں اور کوئی خیمہ سلامت نہیں۔ تو اٹھا اور کہا اے گروہ قریش! تم میں سے ہر کوئی اپنے پاس بیٹھنے والے کو پکڑو اور دیکھو کہ وہ کون ہے؟ پس میں نے اپنے ہم نشین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کہا تو کون ہے؟ تو اس نے جواباً کہا سبحان اللہ! کیا تو مجھے نہیں پہچانتا، میں فلاں بن فلاں ہوں۔ وہ بنی ہوازن میں سے ایک آدمی تھا۔ پھر ابوسفیان نے کہا اے گروہ قریش! قسم بخدا تم ایسی جگہ نہیں ہو جو قیام کے قابل ہو، ہمارے گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے ہیں، بنو قریظہ نے ہماری مخالفت کر دی ہے اور ان کی طرف سے ہمیں ایسا پیغام موصول ہوا ہے جو ہمارے لیے پندیدہ نہیں۔ اور ہوائے ہمارا جو حشر کیا ہے اسے تم دیکھ رہے ہو۔ اس لیے تم یہاں سے چلے چلو۔ پس میں تو کوچ کرنے لگا ہوں۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے اونٹ کے پاس گیا، وہ بندھا ہوا تھا، اس کے اوپر بیٹھ گیا، اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ پس وہ تینوں ناگوں پر ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر اس کے پاؤں کی رسی کھولی گئی۔ میں نے

عطفان کو بھی سنا انہوں نے بھی وہی کیا جو قریش نے کیا تھا۔ پس وہ لگاتار اپنے اپنے شہروں کو لوٹنے لگے۔ آپ فرماتے ہیں پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں واپس لوٹ کر آیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا گویا میں حمام میں چل رہا ہوں۔ جب میں آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو میں نے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں مطلع کیا تو ایسے ہنسے کہ رات کی سیاہی میں آپ ﷺ کے دندان مبارک کی سفیدی ظاہر ہو گئی۔ پس جب میں آپ ﷺ کو خبر دے کر فارغ ہوا اور زیارت کر چکا تو مجھ سے وہ گرمائش بھی جاتی رہی (جس کے سبب مجھے شدید سردی کے باوجود یہ محسوس ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں) تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے قریب بلایا اور مجھے اپنے پاؤں کے قریب کر کے اپنے کپڑے کی ایک طرف مجھے پڑا دی اور میرا سینہ اپنے قدموں کے ٹکوں سے لگایا۔ پھر میں صبح تک مسلسل سو یا رہا۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ”فَقُمْ يَا نَوَافُ“ (اے سونے والے اٹھ کھڑا ہو 1X)۔ میں کہتا ہوں کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لشکر پر ہوا چلائی اور لشکر کی اطراف میں ملائکہ نے تکبیر بلند کی تو طییم بن خویلد اسدی نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے تم پر جا دو کا آقا کر دیا ہے نیزی کر دو اور جلدی سے نکل جاؤ پس وہ جنگ کے بغیر وہاں سے بھاگ گئے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ حماد الدین بن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ رحمت للعالمین نہ ہوتے تو ہوا کفار میں سے کسی کو نہ چھوڑتی مگر یہ کہ انہیں بوسیدہ پڑیوں کو نقل کر دیتی۔ جیسا کہ قوم عاد کے ساتھ رخ عقیقہ نے کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب میں کفار کے لشکر سے واپس رسول اللہ ﷺ کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دوران راہ میں گھوڑا سوار دیکھے جو سفید عا سے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا اپنے صاحب کو کہہ دینا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے اور تم سے تمہارے دشمنوں کا شر دور کر دیا ہے۔ شیخین نے معین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یوم احزاب کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس قوم کی خبر ہمارے پاس کون لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میں یا رسول اللہ! ﷺ۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا کون ہے جو اس قوم کی خبر ہمارے پاس لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو ہمارے پاس اس قوم کی خبر لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک ہر نبی کے لیے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر ہے (3)۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت سلیمان بن ضرر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے غزوہ خندق کے دن، جب کفار کے گرد وہاں سے چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اب ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تم جاؤ گے وہ ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے بلکہ ہم ان کی طرف چل کر جائیں گے اَلَا نَفْعُؤْهُمْ وَلَا يَنْفَعُؤُنَا نَحْنُ نَسِيْلُ الْيَتِيْمِ (4) اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ، حج یا عمرہ سے لوٹ کر واپس اپنے شہر آتے تو تین بار تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَيُّوْنُ تَابُؤُنْ غَابِؤُنْ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِلُوْنَ صُلُقِ اللَّهِ وَغَدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ

الْأَخْزَابِ وَخُذُوا (۱) محمد بن عمر نے کہا ہے کہ غزوہ خندق میں مسلمانوں میں سے چھ افراد نے جام شہادت نوش کیا اور مشرکین میں سے بھی چھ افراد ہی قتل ہوئے۔

إِذْ جَاءَكُمْ مِنْ قَوْمِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلِ مِنْكُمْ وَإِذْ رَاغِبًا إِلَى بَصَارٍ وَبَلَعَتْ
الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝

”جب انہوں نے بلد بول دیا تھا تو ہر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی لے اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھر انگلیں اور کیچے منہ کو آگئے لے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے جی“

لے إِذْ جَاءَكُمْ وَنَحْمُ الْخُجَاءَ تَحْمٌ سے بدل ہے۔ مشرقی سمت سے یعنی وادی کی اوپر والی جانب سے وہ آنے والے بنی اسد اور بنی غطفان تھے۔ ان میں مالک بن عوف انصاری اور عیینہ بن حصین فزاری کی زیریادت بنی غطفان کے ہزار افراد تھے اور ان کے ساتھ بنی اسد کا سردار طحیہ بن خویلد اسدی بھی تھا جبکہ ان ہی کی جانب یہود بنی قریظہ کا سردار جی بن اخطب بھی تھا۔ اور مغربی سمت سے یعنی وادی کی چٹلی جانب سے۔ اور وہ آنے والے بنی کنانہ اور قریش اور ان کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا اور ان کے ساتھ ان کے دیگر ساتھی بھی تھے اور ابوامر و عمرو بن سفیان سلمی خندق کی جانب سے آیا تھا۔

لے اور دشمن کو دیکھ کر خوف کے سبب آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور عرب کی وجہ سے کیچے منہوں کو آنے لگے۔ کیونکہ شدت خوف سے پیچھے ہٹے پھول جاتے ہیں اور دل حلقوم کی طرف اوپر کو اٹھنے لگتا ہے۔ اور کیچے منہ کو آنا ضرب النعل ہے جو شدت خوف کے اظہار کے لیے بولی جاتی ہے۔

جی اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ پس منافقین نے یہ گمان کیا کہ اب محمد (ﷺ) اور آپ کے صحابہ کرام کا نشان تک مٹ جائے گا۔ اور مضبوط ایمان والوں نے نصرت اور کامیابی کا یقین کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی سر بلندی کے لیے وعدہ فرما رکھا ہے۔ اور کٹر و دل لوگ حیران بھی ہو گئے۔ ابوبکر، اہل مدینہ اور ابن عامر نے الظُّنُونَا، الرَّسُولُ، الشَّيْبِلَا پڑھا ہے یعنی حالت وصل اور وقف دونوں میں الف کو ثابت رکھا ہے کیونکہ وہ مصاحف میں ثابت ہے۔ اہل بصرہ اور حمزہ نے دونوں حالتوں میں اصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے اور باقیوں نے حالت وقف میں الف کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ آیات کے آخری حرف ہم وزن ہو جائیں اور اس کے ساتھ تحریر کی اتباع بھی ہو جائے۔ اور حالت وصل میں وصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے۔

هَٰذَا لِكِ اتَّبَعِي الْمُؤْمِنُونَ وَرُدُّنَا لِلَّهِ وَالْشَّيْءِ ۝ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝

”اس موقع پر خوب آزمایا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے چھوڑے گئے لے اور اس وقت کہنے لگے تھے منافق لے اور

جن کے دلوں میں روگ تھا کہ تم وعدہ کیا تھا ہم سے (خ) کا (اللہ اور اس کے رسول نے مکر صرف جھوٹ دینے کے لیے جی“

لے اس وقت اہل ایمان کو خوب آزمایا گیا تاکہ مخلص منافق سے اور ثابت قدم رہنے والے متزلزل لوگوں سے ممتاز ہو جائیں۔

لے منافقین سے مراد معتب بن قیس، عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔ ترکیب کلام میں إِذْ هَٰذَا لِكِ سے بدل ہے۔

سے مرض سے مراد اعتقاد کی کمزوری یا بزدلی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ قول منافقین کا ہے کہ محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ شام و فارس کے نکلات کا وعدہ کر رہے ہیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اپنے مستقر سے باہر جانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ قسم بخدا یہ وعدہ دھوکہ اور فریب ہے (1)۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے کہ انصار میں سے ایک منافق بشر بن معب نے اس طرح کا قول کہا تھا۔

وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا هَلْ يَأْتِيكُمُ الْمَقَامُ وَلَا تَقُولُوا لَهُمْ جَعَلُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنَّ يُرِيدُونَ الْإِفْرَارَ ۝۵۱

”اور یاد کرو! جب کبھی پھرتی تھی ایک جماعت ان میں سے کہ اے یثرب والو! تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ہے (جان عزیز ہے تو) لوٹ چلو (اپنے گھروں کو)۔ اور اجازت مانگتے لگاں میں سے ایک گروہ نبی کریم سے یہ کہہ کر (حضور) ہمارے گھر یا نکل غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے (اس بہانہ سازی سے) ان کا ارادہ شخص (میدان جنگ سے) فزایا تھا۔“

۱۔ اور یاد کرو جب منافقین میں سے ایک جماعت کبھی پھرتی تھی اور اس میں اوس بن قبیطی اور اس کے ساتھی شامل تھے۔ اے یثرب والو! یثرب سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اور ابو عبیدہؓ نے کہا ہے کہ یثرب کی ایک طرف میں واقع زمین کا نام مدینہ الرسول ﷺ ہے (2)۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں موجود ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کو یثرب پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا یہ طابہ ہے (3)۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو ناپسند کیا ہے کیونکہ وہ ثوبہ یثربہ، ثوبہ، ثعرب علیہ اور انزوبہ سے مشتق ہے۔ اور ان تمام کا معنی ہے اس نے اسے طامت کی اور اسے اپنے گناہ پر عار دار لائی، اور منسوب بہت کم عطا کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔

۲۔ لَا مَقَامَ لَكُمْ کو جمہور نے ہم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ حفص نے ہم کو مضموم پڑھا ہے۔ یہ یا تو ظرف مکان ہے یا پھر اقام (باب افعال) سے مصدر ہے۔

۳۔ (جان عزیز ہے) تو میدان جنگ سے اپنے گھروں کو لوٹ چلو اور محمد ﷺ کی رفاقت و شرکت چھوڑ دو۔ یا معنی یہ ہے کہ اب محمد ﷺ کے دین پر تمہارا قائم رہنا ممکن نہیں۔ لہذا شرک کی طرف واپس لوٹ جاؤ۔ اور اسے چھوڑ دو تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ۔ یا معنی یہ ہے کہ اب یثرب میں تمہارے لیے قیام کی جگہ نہیں۔ پس تم شرک کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے چھوڑ دو تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ۔

۴۔ اور ان میں سے بنو حارثہ اور بنو سلمہ نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگتے لگے۔ ترکیب کلام میں يَقُولُونَ يَسْتَأْذِنُ کے فاعل سے حال ہے۔ یہ کہہ کر کہ ہمارے گھر یا نکل غیر محفوظ ہیں ان میں دشمن اور چور آ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے اور وہ اس چھوٹے قول سے صرف میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وَلَوْ دُحِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ آقْصَاهُمُ سُبُلُ الْفِتْنَةِ لَأَنصَرَفُوا وَكَانُوا ثَبَاتٍ وَإِنَّمَا الْإِنْسَانُ لَكَافٌ ۝۵۲

”اور اگر کھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کے اطراف سے لے پھر ان سے درخواست کی جاتی فتنہ انگیزی میں شرکت کی تو فوراً سے قبول کر لیتے اور توقف نہ کرتے اس میں مگر بہت کم ہے۔“

۱۔ اور اگر ان پر افکار کے لشکر ٹکس آتے مدینہ طیبہ میں یا ان کے گھروں میں ان کی اطراف سے۔ یہاں فاعل کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حذف کیا گیا ہے کہ ان گروہوں اور ان کے علاوہ کسی کا داخل ہونا اس پر مرتب ہونے والے حکم کے اقتضاء کے مطابق برابر ہے۔ پھر ان سے شرک یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کی درخواست کی جاتی۔ لائنوں کا واصل جواز نے اسے قصر کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو وہ ضرور آتے اور ایسا کرتے۔ اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جس فتنہ انگیزی کی ان سے درخواست کی جاتی تو وہ فوراً اسے قبول کر لیتے اور وہ اس فتنہ کو لانے اور اس پر عمل کرنے میں توقف نہ کرتے مگر بہت کم وقت۔ یعنی فقط اتنا وقت جتنا سوال و جواب میں صرف ہوتا۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے وہ کفر اختیار کرنے کے بعد انتہائی قلیل وقت مدینہ طیبہ میں قیام پزیر ہیں۔ پھر انہیں ہلاک کر دیا جائے یا جلا وطن کر دیا جائے۔

وَأَقْبَلُوا إِلَيْنَا هَذَا وَاللَّهُ مِنْ قَبْلُ لَا يُؤْتُونَ إِلَّا دَبَّارًا ۖ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝

”حالانکہ یہی لوگ پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے ۱۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے۔“

۱۔ حالانکہ یہی لوگ غزوہ خندق سے پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے دشمنوں سے پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگیں گے۔ یزید بن رومان نے کہا ہے کہ یہ بنی حارثہ تھے جنہوں نے غزوہ احد کے دن بنی سلمہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ پس جب ان کے بارے میں آیت کریمہ نازل ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اس کی مثل دوبارہ نہیں کریں گے۔ اور قودہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوہ بدر میں حاضر نہیں تھے اور جب انہوں نے وہ اعزاز و اکرام دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو عطا فرمایا تو اس وقت انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی جنگ میں حاضر ہونے کا موقع فراہم فرمایا تو ہم ضرور بر ضرور جنگ لڑیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی کی طرف اشارہ فرمایا۔ (1)

۱۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے اور اس پر پورا بھی دی جائے گی۔

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذْ لَا تُسْتَعُونُ إِلَّا قَلِيلًا ۝

”فرما دیجئے (اے بھگوزو!) تمہیں نفع نہیں دے گا اگر تم بھاگنا چاہتے ہو موت اور قتل سے ۱۔ (اور اگر بھاگ کر تم نے جان بچا لی) تو تم لطف اندوز نہ ہو سکو گے مگر تھوڑی مدت ۱۔“

۱۔ اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے (اے بھگوزو!) تمہیں بھاگنا نفع نہیں دے گا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگنا چاہتے ہو۔ کیونکہ جس کا وقت مقرر آجائے تو اس کے لیے مرنا ضروری ہے، چاہے قتل کے سبب مرے یا اپنی ناک ٹوٹنے کے سبب۔ اور جب تک وقت مقرر نہیں آئے گا قطعاً کوئی نہیں مرے گا۔

۱۔ اور اگر تم نے بھاگ کر جان بچا لی تو تم دنیا میں زندہ رہتے ہوئے لطف اندوز نہیں ہو سکو گے مگر انتہائی کم یا بہت تھوڑا وقت۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بغرض حال تمہارے لیے میدان سے بھاگنا نفع مند بھی ہو تو تم بہت تھوڑا وقت اس سے لطف اندوز ہو سکو گے کیونکہ بالیقین یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِيكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنَّ أَسَاذَكُمْ سَوَاءٌ أَوْ أَسَاذِكُمْ رَحْمَةً ۖ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

”فرمائیے کون بچا سکتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے۔ اور نہیں پائیں گے وہ لوگ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار۔“

۱۔ فرمائیے تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟ اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے۔ یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو پھر کون ہے جو تمہیں عذاب دے سکتا ہے۔ یہاں کلام کو مختصر کیا گیا ہے جیسے عربوں کے اس قول میں ہے متقلداً مسيئاً و رمحاً۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرے کو پسے پر محمول کیا جائے کیونکہ عصمتہ (بچاؤ) میں منع (روکنے) کا معنی موجود ہے (یعنی اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو کون ہے جو رحمت خداوندی کو تم سے روک سکے)

۲۔ اور وہ لوگ اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست نہیں پائیں گے جو انہیں نفع پہنچا سکے اور نہ ہی کوئی مددگار جو ان سے ضرر اور نقصان دور کر سکے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّذِينَ مِنْكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلْمْ أَلْيَيْنَا وَلَا يَأْتُونَ
الْبَاسَ إِلَّا قَلِيلًا ۝

”اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاد سے روکنے والوں کو تم میں سے اور انہیں جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں (اسلامی کیمپ چھوڑ کر) ہماری طرف آ جاؤ۔ اور خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر برائے نام۔“

۱۔ مُعَوِّذِينَ غُفُوقٍ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے پھیر دینا، روک دینا۔ اور الْغُفُوقِ کا معنی روکنا، پھیرنا اور العائق سے مراد خیر اور بھلائی سے پھیرنے اور روکنے والا۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہنے سے روکتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ اور اخوان سے مراد مدینہ طیبہ کے رہنے والے لوگ تھے۔

۲۔ کہ ہمارے قریب آ جاؤ اور محمد (ﷺ) کو چھوڑ دو اور ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہو کیونکہ ہم تمہارے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے ان سے مراد منافقین میں سے وہ لوگ ہیں جو انصار النبی ﷺ کو روکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب تو فقط ایک سردار کا لقمہ ہیں اور یہ گوشت ہیں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی انہیں لقمہ بنا لیں گے۔ لہذا تم اس آدمی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ تو ہلاک ہونے والا ہے (۱)۔ مقابلے نے کہا ہے کہ یہودیوں نے منافقین کی طرف پیغام بھیجا اور کہا کہ انہی سے ہے جو تمہیں اس پر برا بھلا کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی جانوں کو ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے قتل کر دو۔ کیونکہ اگر اس مرتبہ قتل کرنے پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی ایک کو وہ باقی نہیں رہنے دیں گے۔ اور ہم تمہارے بارے میں خوفزدہ ہو رہے ہیں کیونکہ تم ہمارے بھائی اور پڑوسی ہو۔ لہذا ہماری طرف آ جاؤ۔ پس اس کے بعد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ اہل ایمان کے پاس آئے اور انہیں ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے روکنے لگے اور انہیں خوفزدہ کرنے لگے۔ اور یہ کہنے لگے کہ اگر وہ تم پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی کو زندہ باقی نہیں چھوڑیں گے۔ تم محمد (ﷺ) سے کیا امید رکھتے ہوئے ان کے پاس خیر اور بھلائی تو ہے نہیں مگر یہ کہ وہ

یہاں ہمیں قتل کرادیں گے۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ ہمارے بھائیوں (یہودیوں) کی طرف چلو۔ مگر منافقین کی ان باتوں کے سبب اہل ایمان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا اور ثواب کی امید مزید بڑھ گئی۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

سے اور منافقین خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر بہت تھوڑا بہت قلیل وقت یا انتہائی معمولی جنگ۔ کیونکہ وہ طرح طرح کے عذر کرتے اور مومنین کو بھی ممکن حد تک روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ یا پھر وہ جنگ کے لیے مومنین کے ساتھ نکلے تو تھے مگر جو قلیل وقت جنگ میں شریک ہوتے وہ بھی ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لیے ثواب کی نیت سے شریک نہیں ہوتے تھے۔ اگر وہ قلیل وقت بھی فقط اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے شامل ہوتے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی کثیر بنا دیتا۔ کہا گیا ہے کہ یہ منافقین کے کلام کا ترجمہ ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب ان گروہوں کے ساتھ یہ جنگ نہیں لڑیں گے اور اسے زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

أَشْحَبَ عَلَيْكُمْ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ مَأْيَتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُومُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشْحَبَ عَلَى الْغَيْبِ ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۖ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝

”پر لے دو رہے کے کنھوں ہیں تمہارے معاملے میں۔ پھر جب خوف (دوہشت) چھا جائے تو پھر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں پکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی فشی طاری ہو۔ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے۔ بڑے حریف ہیں مال غنیمت کے حصول میں۔ (درحقیقت) یہ لوگ ایمان ہی نہیں لائے پس اللہ نے ضائع کر دیئے ان کے اعمال اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔“

۱۔ اَشْحَبَ یہ شہیح کی جمع ہے۔ ترکیب کلام میں یاتوں کے فاعل یا المعوقین سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا ذم کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی بخل پر لے دو رہے کنھوں ہیں۔ تمہاری معاونت کرنے میں یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کرتے ہیں یا پھر تمہارے لیے کامیابی اور مال غنیمت کے حصول میں۔

۲۔ پھر جب خوف و دوہشت چھا جائے تو آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں خوف کے سبب اپنے حلقوں میں پکرا رہی ہوتی ہیں۔ اس شخص کی نظری کی مانند جس پر موت کی فشی طاری ہو۔ یا اس شخص کی آنکھوں کے پکرانے کی طرح جس پر موت کی فشی طاری ہو۔ (پہلی صورت میں مشہ بہ مدہوش آدمی کی نظر ہے اور دوسری صورت میں اس کی آنکھیں ہیں) یا پھر مشہ بہ مدہوش دونوں چیزیں ہیں۔ اور مدہوش آدمی کی آنکھوں کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ جب آدمی قریب الموت ہوتا ہے اور اس پر سکرات الموت طاری ہوتے ہیں تو عقل زائل ہو جاتی ہے اور شدت خوف کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھرا کر ایک جگہ رک جاتی ہیں۔

۳۔ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی وہ تمہاری تنقیص کرتے ہیں، تم میں عیب نکالتے ہیں اور غیبت کرتے ہیں (2) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ تمہیں اذیت پہنچاتے ہیں اور

حالات امن میں تم پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں۔ قتادہ نے کہا ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت وہ تم سے اپنی زبانیں پھیلانے ہوئے کہتے ہیں ہمیں بھی دوہم بھی تمہارے جنگ میں شریک تھے۔ لہذا تم ہم سے زیادہ مال غنیمت کا حق نہیں رکھتے۔ (1)

اس ترکیب کلام میں حال یا مخصوص بالذم ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اس کے سبب کلام میں تکرار غایت نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں مقامات پر یہ لفظ خاص وجہ کے ساتھ مفید ہے۔ (یہاں معنی ہے مال غنیمت کے حصول میں بڑے حریفیں ہیں)۔

یہ درحقیقت یہ غلوں دل سے ایمان ہی نہیں لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے غلوں اور حسن نیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال کا اعتبار ہی نہیں کیا کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اعمال کا ضائع کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ہر ممکن کے وجود کے لیے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اس کے فضل کو کوئی بھی روئیں کر سکتا۔

يَحْسِبُونَ الْآعْرَابَ لَمْ يَدْهَبُوا وَإِنْ يَأْتِ الْآعْرَابَ يَفْعَلُوا لَوْ أَنَّ هُمْ بِأَدُونِ
فِي الْآعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَاءِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۝

” (دشمن بھاگ گیا لیکن یہ بزدل) یہ خیال کر رہے ہیں کہ ابھی جتنے نہیں گئے اگر جتنے (دوبارہ پلٹ کر) آجائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحرا میں بدوؤں کے ہاں ہوتے (آنے جانے والوں سے) تمہاری خبریں پوچھنے لے اگر یہ (بزدل) تم میں موجود بھی ہوتے تو یہ (دشمن سے) جنگ نہ کرتے مگر براے نام میں۔“

یعنی یہ اپنی بزدلی کے سبب گمان کر رہے ہیں کہ جتنے ابھی تک نہیں گئے۔ پس وہ مدینہ کے اندر تک بھاگ گئے۔ اور اگر جتنے دوبارہ پلٹ کر آجائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحرا میں بدوؤں کے ہاں ہوتے یعنی کاش یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ دیہات کی طرف نکلنے والے ہیں۔ جب کوئی دیہات کی طرف نکلے تو کہا جاتا ہے بداییدوا و بندوا۔ اور ”فی الْآعْرَابِ“ ترکیب کلام میں یہ باذون کی ضمیر سے حال ہے یا یہ ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہے، یعنی کانتون فی الاعراب۔ اور یَسْأَلُونَ کا جملہ خبر کے بعد ایک اور خبر ہے۔ یا حال مترادف ہے یا حال متداخل ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ ہے لکان خیرا۔

جہ اور اگر یہ منافقین تم میں موجود بھی ہوتے اور اس بات سے بھاگ کر نہ جاتے تو یہ فظریا یا کاری اور عار کے خوف سے تھوڑی سی جنگ کرتے۔ مقاتل نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ
وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

”بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔ یہ نمونہ اس کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی امید رکھتا ہے۔ اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔“

۱۔ اے مومنین! بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں خوبصورت نمونہ ہے (۱)۔ اسوہ کا معنی قدوہ (نمونہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 449 (انگریزی)

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمزہ امویہ پر جب کہ کہا میں خوب جانتا ہوں کہ تو جتر ہے اگر میں نے اپنے محبوب ﷺ کو

ہے۔ یعنی ایسا طریقہ جس کی اقتداء کی جاتی ہو۔ یہاں مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایسے حسین و جمیل خصال موجود ہیں جو یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی اتباع و پیروی کی جائے جیسے جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمانا اور شہداء و مصائب کو برداشت کرنا وغیرہ۔ یا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لیے ایک نمونہ ہیں ان کی پیروی انتہائی مستحسن ہے۔ اور یہ مفہوم اس قول کی طرح ہے ”فی البیضة عشرون مئاً حدید“ یعنی خود میں تیس ہیر کی مقدار لو با ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسوۃ فعلیۃ کے وزن پر لیساً سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ قذوۃ اقتداء سے ماخوذ ہے۔ یہ اسم ہے جسے مصدر کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ یعنی تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اچھا طریقہ اپنانا لازم ہے۔ یعنی تم بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے دین کی معاونت کرو جیسے وہ کرتے رہے۔ اور جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچے اس پر ایسے ہی صبر کرو جیسے وہ صبر کرتے رہے جبکہ ان کے دنداں مبارک جنگ میں شہید ہوئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، آپ کے چچا شہید ہوئے اور علاوہ ازیں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر انہوں نے اپنی ذات میں یہ سب برداشت کرتے ہوئے تمہارے ساتھ غم خواری اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ اسی لیے تم ایسے ہی صبر کا مظاہرہ کرو اور آپ ﷺ کی سنت پر ہی عمل پیرا رہو۔ (1)

یعنی یہ اس کے لیے اسوہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول، اس کی ملاقات اور دیگر اخروی نعمتوں کا آرزو مند ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ایام خصوصاً یوم آخرت کی امید رکھتا ہے۔ یہ مفہوم عربوں کے اس قول کی مثل ہے۔ اور جو زیداً و فضلہ میں زید خصوصاً اس کی مہربانی کا امیدوار ہوں۔ اور مقابل نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے اس کے لیے (اسوہ ہے) جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس یوم بعثت سے ڈرتا ہے جس میں اعمال کی جزا دی جائے گی (2)۔ قول باری تعالیٰ لغن کنانی ترکیب کلام میں حسنہ کا صلہ ہے یا اس کی صفت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لکھم سے بدل ہے اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ ضمیر مخاطب سے بدل نہیں بنایا جاسکتا۔

اسے اور خوشی اور تکلیف کی حالت میں کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ یہاں رجا (امید) کو کثرت ذکر سے ملایا گیا ہے جو کہ دائمی طاعت و فرمانبرداری تک پہنچانے والا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء و پیروی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو اس طرح ہو (یعنی جو ثواب کا امیدوار بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والا بھی ہو)۔

وَلَسَّارَ الْمُؤْمِنُونَ الْآخِرَابَ لَقَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۝ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝

”منافقین کا حال آپ پڑھ چکے) جب ایمان والوں نے (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو (فرط جوش) سے پکار اٹھے کہ یہ ہے وہ لشکر جن کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا تھا اور اس کے رسول نے اور میں نے

تجھے بوسہ دیتے اور چوتھے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا اور نہ بوسہ دیتا لکھم کنانی لکھم فی ذلک اسوۃ حسنۃ۔ حضرت یحییٰ بن مہزیب سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ طواف کیا تو جب میں اس رکن کے پاس پہنچا جو اس دروازے کے قریب ہے جو حجرے متصل ہے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ وہ بھی چوم لیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں طواف نہیں کیا۔ میں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کو اسے چومتے دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا پھر اسے اپنے سے دور کر کیونکہ ترسے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں اچھا نمونہ ہے۔

کے لشکر جرائع نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

۱۔ اس میں وعدہ سے اشارہ اس ارشاد کی طرف ہے جو سورہ بقرہ میں ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْجِنَّ وَالنَّاسَ اَنْ يَكُنْ لَهُمْ خَلْقًا مِنْكُمْ مِثْلُكُمْ سَمِعْتُمُ النَّاسَ يَقُولُ اَعَزُّوا وَلَوْ لَزَمُوا وَخَفَى يَقُولُ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ کیونکہ یہ آیت اس مفہوم کو مختصم ہے کہ اہل ایمان کو بہت زیادہ تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچیں گی (مگر آخر کار اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے)۔ شاید رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو جنگ احزاب کی خبر اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی دے دی تھی۔ ۲۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا جس کے بارے انہوں نے خبر دی تھی۔ اور دشمن کے لشکر جرائع نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا۔ یہاں ایمان سے مراد اس شے کی تصدیق ہے جو رسول اللہ ﷺ نے کر آئے اور تسلیم سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی تقدیر کے سامنے سر جھکا دینا ہے۔

مِنْ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَبِمِهِمْ مِنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَ
مِنْهُمْ مَّن يَنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا بَیِّنَاتٍ ۝۱۱

”اہل ایمان میں ایسے جو اس مرد ہیں جنہوں نے سچا کر کھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ ان جو اس مردوں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور بعض (اس ساعت سعید کا) انتظار کر رہے ہیں (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویہ میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔“

۱۔ یعنی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کی معیت میں دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے ثابت قدم رہیں گے۔ آیت طیبہ میں صَدَقُوا اس قول کا ہم معنی ہے کہ جب کوئی تجھ سے بچے تو کہے گا صدقینی (اس نے میرے ساتھ سچ بولا) تو چونکہ وعدہ کرنے والا جب اپنا وعدہ وفا کر دیتا ہے تو وہ اسے سچا ثابت کر دیتا ہے۔ (اسی لیے یہاں وعدہ وفا کرنے والے اہل ایمان کے بارے فرمایا صَدَقُوا)۔

۲۔ پس ان جو اس مردوں میں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور انہوں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ پس جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اس میں سے کوئی شے بھی ان کے ذمہ باقی نہیں رہی، یعنی انہوں نے جہاد اور اطاعت پر صبر کئے رکھا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے یا فوت ہو گئے۔ نحب کا معنی نذر بھی ہے اور موت بھی۔ مثلاً کہا جاتا ہے قضیٰ نحبہ اے اجلہ (وہ اپنی زندگی کی مدت پوری کر چکا) پس اسے شہید کر دیا گیا جیسے حضرت حمزہ وغیرہ تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے قضیٰ نحبہ، یعنی اس نے اپنا عہد پورا کر کے لیے اپنی ساری جدوجہد صرف کر دی۔ یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے نَحْبٌ فَلَانِ فِیْ مَجْسِرَةٍ یُزَعَمُ وَتَلْبِیْہِ (غلاں کے رات دن چلنے میں اپنی مکمل طاقت اور کوشش صرف کر دی)۔

۳۔ اور بعض اس ساعت سعید کا انتظار کر رہے ہیں جس میں وہ اپنی نذر پوری کر سکیں اور وہ اس کے آرزومند ہیں کہ ان کی موت ایٹھائے عہد پر ہو۔ (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) انہوں نے عہد کو تبدیل نہیں کیا بلکہ ذرہ بھر بھی رویہ میں تغیر نہیں ہونے دیا۔ شیعین، ترمذی، ابن ابی شیبہ، طحاوی، ابن سعد اور بغوی نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے چچا حضرت انس بن نضرؓ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس کا انہیں بہت قلق تھا۔ انہوں نے کہا یہ پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس

تشریف لے گئے لیکن میں وہاں غیر حاضر تھا۔ اگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ساتھ لڑنے کا موقع فراہم کیا تو وہ دیکھ لے گا میں کیسی جرأت کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ پس جب غزوہ احد کے دن مسلمانوں پر ناکامی کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت انس بن نضر نے رب کریم کی بارگاہ میں عرض کی اے اللہ! جو کچھ ان صحابہ کرام نے کیا میں تیری بارگاہ میں اس پر معذرت خواہ ہوں اور جو کچھ ان مشرکین نے کیا میں اس سے تیری بارگاہ میں اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر وہ مہاجرین و انصار میں سے ان لوگوں کے پاس گئے جو اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک چکے تھے۔ انہیں جا کر کہا کون سی شے ہے جس نے تمہیں بخلا دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ تو شہید ہو چکے ہیں (لڑنے کا کیا فائدہ ہے؟) تو حضرت انس بن نضر نے انہیں کہا حضور نبی کریم ﷺ کی شہادت کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے انھو اور اس دین کی خاطر جانیں قربان کر دو جس پر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ پھر وہ دشمن قوم کی طرف بڑھ گئے تو احد کے قریب حضرت سعد بن معاذؓ سے ملاقات ہو گئی۔ تو انہوں نے کہا میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ حضرت سعد فرماتے ہیں حضرت انسؓ دشمن کی طرف آگے بڑھتے گئے اور انہوں نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا جس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔ پھر انہوں نے کہا اے سعد! (اور ایک روایت میں الفاظ ہیں اے اباعمر) یہ جنت کی ہوا ہے، رب نضر کی قسم میں احد کے قریب جنت کی خوشبو پارہا ہوں پھر دشمن کی صفوں میں داخل ہو گئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا۔ آپ کو اس حال میں پایا گیا کہ آپ کے جسم پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے اسی سے زائد زخم لگے ہوئے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مشرکین نے آپ کا مثلہ کر دیا اور آپ کی پہچان فقط آپ کی ہمشیرہ شامہؓ نے انگلیوں کے پوروں سے کی تھی۔ اس لیے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ آیت کریمہ **وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلٌ جَاءَ فِي سَبْعٍ مِّنَ مَّوَالِدِهِمُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ** حضرت انسؓ بن نضرؓ اور آپ جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت حباب بن ارتؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی۔ اور ہم میں سے کچھ ایسے لوگ تھے جو جلدی ہی اس دنیا سے جہنم کے لوگوں کی طرح ہو گئے۔ ہم نے انہیں کفن دینے کے لیے سوائے ایک کبیل کے اور کوئی چیز انہیں پایا۔ جب وہ ان کے سر پر رکھتے تو پاؤں اس سے باہر نکل جاتے اور جب ان کے پاؤں ڈھانچتے تو سر نیچا ہو جاتا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کبیل سے ان کا سر ڈھانچ دو اور پاؤں کی جانب اڈھکھاس رکھ لو۔ اور کچھ لوگ تھے جن کی مسامی کا کچل پکا اور وہ اسے (دنیا میں ہی) کھار ہے ہیں (2)۔ ترمذی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبد اللہؓ کی طرف دیکھا تو اشارہ فرمایا جو کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھنا پسند کرتا ہے جو چہرہ زمین پر اس حال میں چل رہا ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کر چکا ہے (اور وعدہ وفا کر چکا ہے) (1) تو وہ اس کی طرف دیکھ لے (3)۔ امام بخاریؒ نے قیس بن حازم سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت طلحہؓ کا مثلہ دیکھا جس کے ساتھ وہ غزوہ احد کے دن حضور نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے رہے (4)۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم وغیرہم نے یہ حضرت زبیرؓ کی مرفوع حدیث سے حضرت طلحہؓ کے لیے ثابت کیا ہے۔ (5)

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 204 (انتہاریہ)

4- صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 561 (وزارت تعلیم)

1- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم)

3- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم)

5- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم)

(1) حضرت عیسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں امام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ بنت طلحہ کے پاس آیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

”(اُذن جہاد میں ایک حکمت یہ بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کے سچ کے باعث۔ اور عذاب دے منافقوں کو اگر اس کی مرضی ہو یا ان کی توبہ قبول فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“
 لے اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کی سچائی کی جزا، عطا فرمائے یا ان کی سچائی کے سبب جزائے خیر عطا فرمائے یہاں صدق سے مراد ایقانے عہد ہے۔

ع۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ ان منافقین کی موت کفر اور فاق پر ہی ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ یا اگر چاہے کہ وہ توبہ کر لیں اور اس کے دین کے لیے تخلص ہو جائیں (تو پھر انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے)۔ ترکیب کلام میں لیجیجی قول باری تعالیٰ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ فَعَقَلُوا۔ یہ منطق کلام کی علت ہے اور اس کے ساتھ بیان یہ کیا گیا ہے کہ جس طرح ظلمین نے ایقانے عہد سے ثواب کا قصد کیا ہے اسی طرح منافقین نے وعدہ توڑنے سے عذاب کا ارادہ کیا ہے۔

وَسَاءَ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَيْثِهِمْ لَمْ يَأْتُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝

”اور (نا کام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآئیکہ اپنے عہد میں (سچ) وہاب کھا رہے تھے (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور بچا لیا اللہ نے مومنوں کو جنگ سے اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے۔“
 لے اور اللہ تعالیٰ نے کفار یعنی قریش اور غطفان کے حصوں کو (نا کام) لوٹا دیا اس حال میں کہ انہوں نے جو ارادہ کیا تھا اسے نہ پانے کے سبب وہ غصے میں بیچ وہاب کھا رہے تھے۔ اس لشکر کشی سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا، یعنی نہ تو کامیابی ہوئی اور نہ ہی مال ہاتھ آیا۔
 ترکیب کلام میں یہ ایک حال کے بعد دوسرا حال ہے۔ یا تو یہ حال متداخل ہے یا پھر اس کے پیچھے دوسرا حال ہے۔
 ع۔ اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ہوا اور ملائکہ کے سبب جنگ سے بچا لیا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے۔ یعنی وہ اپنے ملک میں وہ کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے اور وہ (شرکین) سے انتقام لینے میں غالب ہے۔

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي

(ترجمہ سے پیوستہ)

میری بہن عائشہ بنت طلحہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کو کہنے لگی میں تجھ سے بہتر ہوں اور میرا باپ حیر سے بہتر ہے۔ پس حضرت اسماء نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگیں تو مجھ سے بہتر ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا میں تم دونوں کا فیصلہ نہ کروں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں تو پھر انہوں نے فرمایا: ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اَنْتِ عَفِيفٌ مِنَ النَّارِ (تو جہنم کی آگ سے آزاد ہے)۔ پس اس دن سے آپ کا لقب شفیق پڑ گیا۔ اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتِ يَا طَلْحَةُ مِمَّنْ قُضِيَ نَجَاتُہُ (اے طلحہ تو ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں)۔ ترجمہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ طلحہ ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں۔

قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ۝

”اہل کتاب سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قاتلوں سے اتار دیا۔ اور ان کے دلوں

میں رعب ڈال دیا ایک گروہ کو قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔“

۱۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نیچے اتار کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش اور غطفان کے جتھوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ آیت میں اُھل الکُتُب سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ ”صَبَاحُ صَبْؤِهِمْ“ یہ صبح کی جمع ہے اور اس سے مراد اپنا قلعہ ہے جس کے ذریعہ حفاظت کی جاسکتی ہو۔ اسی لیے نیل اور ہرن کے سینک، مرغ کا کاٹنا (چھڑی) اور جولاہے کے تانا بانا براہِ کرنے والے آل کو بھی صیغہ کہا جاتا ہے۔

۲۔ ابن اسحاق کے نزدیک قتل کیے جانے والے مردوں کی تعداد چھ سو تھی اور ابو عمرو نے بھی سعد بن معاذ کے حالات پر بھی اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ اور ابن عساکر نے قتادہ کے مرسل قول نقل کیا ہے کہ مردوں کی تعداد سات سو تھی۔ اور سبکی نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد بیان کرنے والوں نے آٹھ سو سے لے کر نو سو تک تعداد ذکر کی ہے۔ لیکن ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ جاہلی حدیث نقل کی ہے کہ ان کی تعداد چار سو تھی۔ اور یہ جگہ تھے لہذا تطبیق کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چار سو جگہ تھے اور بقیہ ان کے تابع تھے۔ اور ابن اسحاق نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد نو سو بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور دو سو عورتیں اور بچے جنہیں قیدی بنایا گیا۔ ان کی تعداد سات سو پچاس تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کی تعداد نو سو تھی (1)۔ اور سمیل المرشاد میں مذکور ہے کہ ایک ہزار عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔

وَأَسْرَسْتُمْ أَمْوَالَهُمْ وَوَيَا سَرَّهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَنْفُسَهُمْ تَطْغَوْهَا ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

”اور اس نے وارث بنا دیا تمہیں ان کی زمینوں اور ان کے مکانوں اور ان کے مال و متاع کا اور وہ ملک بھی تمہیں دے

دیئے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“

۱۔ اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں یعنی کھیتوں کا، ان کے قلعوں، ان کے مال و متاع کا یعنی نقود و دنانیر وغیرہ (جنہیں زمینوں سے حاصل ہونے والی پیداوار) اور مونسٹیوں کا وارث بنا دیا اور وہ ملک بھی تمہیں عطا فرمادیا جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے تھے۔ مقاتل اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس سے مراد خیبر کی زمین ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد سرزمین مدینہ ہے۔ حسن نے فارس اور روم مراد لیے ہیں جبکہ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ساری زمین ہے جو قیامت تک فتح کی جائے گی۔ (2)

غزوہ بنی قریظہ کا واقعہ: محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ جب مشرکین غزوہ خندق سے واپس چلے گئے تو بنو قریظہ کو شدید خوف (۱) ہوا گیا (3)۔ امام احمد اور شیخین نے مختصراً یہی نقل کیا ہے اور حاکم نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے تصدیقاً نقل کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، ابو نعیم اور بیہقی نے آپ ہی سے ایک دوسری سند سے، ابن عابد نے حمید بن حلال سے، ابن جریر نے

ابن ابی اونی سے پہنچتی نے عروہ سے، ابن سعد نے ملائکوں اور یزید بن اسلم سے اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جب غزوہ خندق سے واپس لوٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ لہذا آتے ہی ہتھیار رکھول دیے اور حضور نبی کریم ﷺ حجرہ عائشہ صدیقہ میں تشریف لے گئے۔ پانی طلب فرمایا اور سر مبارک دھوا شروع کیا (1)۔ اور علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ حضرت زینب بنت جحش کے پاس تشریف فرما تھے۔ وہ آپ ﷺ کا سر مبارک دھو رہی تھیں اور ابھی تک صرف ایک طرف سے دھویا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ نظر ماتی ہیں ہم گھر میں ہی تھے کہ ایک آدمی نے ہمیں سلام کیا (2)۔ محمد بن عمر نے کہا ہے کہ وہ آدمی جنازے رکھنے کی جگہ کھڑا ہوا اور پکار کر کہا۔ تمہارا کیا عذر ہے کہ ہتھیار رکھول دیے ہیں۔؟ پس رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اٹھے اور انتہائی تیزی سے اچھلتے ہوئے اس کی طرف تشریف لے گئے۔ میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے اٹھی اور دروازے کے سوراخوں سے دیکھا کہ وہ حضرت وحیدہ کلبیہ بنی نضیر نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے سر سے گرد و غبار بھماڑ رہے ہیں (اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ آدمی عمامہ شریف باغے ہوئے تھا۔) اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے کتنے جلد ہتھیار رکھول دیے ہیں، آپ کا کیا عذر تھا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے تم نے تو ہتھیار اتار دیے ہیں۔ لیکن ملائکہ نے تو اس وقت سے ہتھیار نہیں اتارے جب سے دشمن نے بلغاری کی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ چالیس راتوں سے ملائکہ نے ہتھیار نہیں کھولے۔ اور ابھی ہم دشمن کے تعاقب سے واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہم نے ان جنوں کو کھرا الاسلام تک پہنچا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھگادیا ہے اور آپ کو بنی قریظہ کے قتال کا حکم دیا ہے۔ اور میں اپنے ساتھی ملائکہ کو لے کر انہی کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دوں لہذا آپ بھی لوگوں کو لے کر آئیے (3)۔ حمید بن بلال نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ شک میرے صحابہ کرام سخت تھکے ہوئے ہیں۔ لہذا اگر تم انہیں چند روز کی مہلت دو (تو بہتر ہے) لیکن انہوں نے کہا آپ ان کی جانب تشریف لے تو جائیں قسم بخدا میں انہیں ایسے ریزہ ریزہ کر دوں گا جیسے کوئی اندھ پتھر پر دے مارا جائے۔ پھر میں ان کے قلعوں کو ہلا کر رکھ دوں گا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ نظر ماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ واپس اندر تشریف لے آئے تو میں نے پوچھا وہ آدمی کون تھا جس سے آپ جو گفتگو تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے بھی اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اس کے کس کے مشابہ پایا؟ میں نے عرض کی وحیدہ کلبیہ کی۔ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں انہوں نے مجھے بنی قریظہ کی طرف جانے کے لیے کہا ہے۔ حمید نے کہا ہے کہ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اور ان کے ساتھی فرشتے پیٹھ پھیر کر چلے گئے یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنی غنم کی گلیوں میں غبار اڑنے لگا۔ بخاری کی روایت میں حضرت انس فرماتے ہیں گویا کہ میں وہ غبار اڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اور ابن عابد نے حضرت قتادہ کی روایت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن منادی کو بھیجا کہ وہ یہ آواز لگے یا خلیل اللہ ارکبہ (اے شمسوارو! اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ) اور حضرت بلالؓ کو حکم ارشاد فرمایا تو انہوں نے لوگوں کو آواز دی کہ جو بھی مطیع و فرمانبردار آواز سن رہا ہے وہ ضرور عصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کرے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ سے پہنچی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور ابن عمرؓ اور ابن عمرؓ اور ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا میں تمہیں

قسم دیتا ہوں کہ تم (بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے) عصر کی نماز ادا نہ کرنا۔ اور مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں ادا کرنا۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام نے عصر کی نماز (یا دوسری روایت کے الفاظ کے مطابق ظہر کی نماز) کا وقت راستے میں ہی پایا۔ تو اس وقت بعض نے کہا کہ ہم تو نماز بنی قریظہ میں ہی پہنچ کر ادا کریں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قسم دے رکھی ہے۔ اور ہم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ لہذا وجہ بنی قریظہ پہنچنے تو انہوں نے غروب آفتاب کے بعد عصر کی نماز ادا کی اور بعض نے یہ کہا کہ ہم تو نماز پڑھ لیں گے کیونکہ آپ ﷺ نے ہمیں نماز چھوڑنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ پس انہوں نے نماز پڑھ لی۔ پھر اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔ (۱)

فائدہ: نماز ظہر اور عصر کی حدیثوں کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک طائفہ پہلے چلا اور دوسرا اگر وہ بعد میں روانہ ہوا۔ پہلے طائفہ کو یہ کہا گیا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر ادا کریں اور دوسرے طائفہ کو عصر کی نماز کے بارے میں کہا گیا۔ یہ قول بھی ہے کہ وجہ تطبیق یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے طاقتور یا وہ افراد جن کے گھر قریب تھے۔ انہیں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کریں اور ان کے سوا کو عصر کی نماز کا حکم دیا۔

مسئلہ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر مجتہد سے اجتہاد کرتے وقت خطا سرزد ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی اور جنہوں نے نہیں پڑھی کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔ زائد اہل اہل ہجرت میں ہے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک قصد اور ارادے کی وجہ سے اجز کا مستحق ہو گیا مگر جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی وہ دو فضیلتوں کے مستحق ہوئے۔ ایک بروقت نماز ادا کرنے کی فضیلت اور دوسری فضیلت یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں بنی قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کی۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ بنی قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں۔ اسے مجازاً امر ادبی تھی کہ حکم کی تعمیل میں تیزی کی جائے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بلایا اور انہیں اپنا علم عطا فرمایا۔ علم ابھی تک اپنی پہلی حالت پر ہی تھا۔ غزوہ خندق سے واپس لوٹنے پر ابھی تک کھولا نہیں گیا تھا کہ اسے میں لوگ تیزی سے ادھر روانہ ہو گئے۔ محمد بن عمرو بن سعد، ابن ہشام اور بلاذری نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو مدینہ طیبہ کا عامل مقرر فرمایا (۲)۔ محمد بن عمرو نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تیس ذی قعدہ کو مدینہ طیبہ سے بنی قریظہ کی طرف تشریف لے گئے (۳)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۵ھ میں پیش آیا (۴)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہتھیار سجائے، زورہ چینی، خود سر پر کھا، نیزہ دست مبارک میں پکڑا، ڈھال لٹکانی اور اپنے لحیف گھوڑے پر سوار ہوئے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے گرد جمع ہوئے۔ وہ بھی ہتھیار سجا کر گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں دشمنوں کی تعداد چھتیس تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے جلو میں بنی قریظہ کی جانب چلے۔ آپ ﷺ کے ارد گرد دشمنوں اور پیادوں کا ایک ہجوم تھا۔ ابن سعد کا قول ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ چلنے والوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

مسئلہ: یہ واقعہ تو اس پر دلالت کرتا ہے شہر حرام میں جنگ کا آغاز کرنا جائز ہے لیکن اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ مجہ

۱۔ سل الہدیٰ والرشاد، جلد ۵ صفحہ ۴ (اعلیٰ)

۲۔ سل الہدیٰ والرشاد، جلد ۵ صفحہ ۵ (اعلیٰ)

۳۔ تغیر بغوی، جلد ۴ صفحہ ۴۵۸ (المر)

۱۔ سل الہدیٰ والرشاد، جلد ۵ صفحہ ۴ (اعلیٰ)

۲۔ سل الہدیٰ والرشاد، جلد ۵ صفحہ ۵ (اعلیٰ)

الوداع میں اشعر حرام میں جنگ کرنے سے منع فرمادیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لیے اس بار اشعر حرام میں جنگ کرنا ہی طرح مباح فرمادیا جو جیسا کہ فتح مکہ کے دن حرم پاک میں دن کے مخصوص وقت میں جنگ کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ اور یہ کہہنا بھی ممکن ہے کہ اس جنگ کا آغاز حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے نہ ہوا بلکہ اس کی ابتدا بنی قریظ کی طرف سے ہوئی جیسا کہ ان کی طرف سے قریش اور ان کی ساتھیوں کی مدد کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ طبرانی نے ابودرائس اور ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بنی قریظ کی طرف تشریف لائے تو آپ ﷺ غلی غلی پشت والے گدھے پر سوار تھے جس کا نام بھٹور تھا اور لوگ آپ ﷺ کے ارد گرد جمع تھے (1)۔ حاکم، بیہقی اور ابویوسف نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سے، محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے، اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گدز رسول بن کے مقام سے بنی نجار کے ایک گروہ کے پاس سے ہوا۔ ان میں حارثہ بن نعمان بھی تھے۔ وہ سب ہتھیار سجائے صف بستہ کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس سے کوئی گزرا ہے؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں وحید کلبی ادھر سے گزرے ہیں۔ وہ ایک خنجر پر سوار تھے اور اس پر نہشتی زین پڑی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے ہمیں بھی ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے بھی ہتھیار اٹھ لیے اور صف بستہ ہو گئے۔ اور انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ابھی ابھی رسول اللہ ﷺ بھی تمہارے پاس تشریف لائے والے ہیں۔ حارثہ بن نعمان نے کہا ہم دو صف بنائے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو رائیل امین تھے جنہیں بنی قریظ کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ وہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دیں اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں اور حضرت علی بن ابی طالبؓ مہاجرین و انصار کے ایک گروہ کے ساتھ آگے چلے گئے اور انہی میں حضرت ابوقحادہؓ بھی تھے (2)۔ محمد بن عمر نے حضرت ابوقحادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ہم بنی قریظ کے پاس پہنچے تو ہم نے انہیں دیکھا اور یہ خیال کیا کہ ان لوگوں کا جنگ کا یقین ہو چکا ہے۔ حضرت علیؓ نے قلعہ کے پاس علم گر دیا۔ پس جو بنی انہوں نے ہمیں اپنے قلعوں کے اندر سے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی افواج مطہرات کے بارے میں نا زیبا لفظ استعمال کرنے لگے۔ ابوقحادہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے خاموشی اختیار کی اور صرف اتنا کہا کہ ہمارے اودھمبار بے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما ہو گئے اور آپ ﷺ نے بھی ان کے قلع کے قریب بنی قریظ کے پتھر بیلے میدان کی کھلی جانب بڑانا کے پاس نزول فرمایا۔ پس جب حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو دیکھا۔ تو انہوں نے مجھے علم تھا سنے کو کہا۔ چنانچہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ حضرت علیؓ کو یہ پسند نہ تھا کہ آقاؐ وہاں ﷺ ان کی جانب سے اذیت ناک اور نا زیبا لفظ سنیں۔ اس لیے انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ان خبیثوں کے قریب آنا آپ پر لازم نہیں (یعنی اگر آپ ان کے قریب نہ بھی آئیں تو یہ باعث حرج نہیں)۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو مجھے واپس لوٹنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا میرا خیال ہے تم نے ان سے اذیت ناک لفظ سنے ہیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کی جی ہاں (ایسے ہی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو وہ قطعاً ایسے لفظ نہ کہتے۔ پس رسول اللہ ﷺ ان کی طرف چلے اور آپ کے آگے آگے حضرت اسید بن حضیرؓ تھے۔ تو انہوں نے کہا اے دشمنان خدا! ہم تمہارے قلعوں کے پاس سے نہیں جائیں گے یہاں تک کہ تم جو کے مر جاؤ گے تم اس لومڑی کی مثل ہو جاؤ گی بنی میں جھپی ہو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا اے ابن خضیر! ہم تو خزعرجہ کے مقابلے میں تمہارے حلیف اور دوست تھے۔ تو آپ نے فرمایا اب میرے اور

تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں اور نہ ہی کوئی دوستی ہے۔ اسنے میں رسول اللہ ﷺ قریب آگئے اور ہم تو آپ ﷺ کے بارے میں کچھ خوف زدہ تھے لیکن آپ ﷺ نے انتہائی بلند آواز سے ان کے سرداروں کو بلایا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی آواز سنوائی۔ آپ نے فرمایا مجھے جواب دو اے ہندروں اور خزیروں کے بھائیو! اے شیطانوں کی پوجا کرنے والو! کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل و خوار اور رسوا کر دیا ہے؟ کیا اس نے تم پر اپنا عذاب نازل کر دیا ہے؟ کیا تم میرے بارے میں غلط الفاظ استعمال کرتے ہو؟ تو وہ دین سے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہنے لگے ہم نے تو ایسا نہیں کیا اور کہنے لگے اے ابو القاسم! آپ تو جاہل نہیں ہیں۔ اور ایک روایت میں الفاظ ہیں آپ تو فحش گو نہیں ہیں۔ شام کے وقت مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے اور حضرت سعد بن عبادہ نے آپ ﷺ کے لیے کچھ کھجوروں کے نوکرے بھیج دیئے۔ اس دن تمام کا کھانا کچھویریں تھیں۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کھجوریں بہت اچھا کھانا ہے۔ پھر آپ ﷺ محرمی کے وقت اٹھے تیر اندازوں کو آگے بھیجا، انہوں نے یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور ان پر پتھراؤ میر برسانے شروع کر دیئے وہ بھی اپنے قلعوں کے اندر سے جواب تیر اور پتھر پھینکتے رہے یہاں تک کہ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضور ﷺ کے جانناؤں نے رات بھر قلعوں کا محاصرہ جاری رکھا وہ بدل بدل کر اپنا فرض ادا کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں تیر اندازی کا مکمل مسلسل جاری رکھا حتیٰ کہ یہودیوں کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں پر تیر پھوڑنا بند کر دیئے اور یہ کہنے لگے تم ہمیں موقع فراہم کرو، ہم تمہارے ساتھ گفتگو کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو مان لیا۔ چنانچہ انہوں نے ناش، بن تھیں کو بھیجنا اتارا۔ تو اس نے آپ ﷺ سے یہ بات کی کہ ہم ہونسیہ کی شرط کے مطابق ہی نیچے اتر آئیں گے، یعنی اپنا تمام تر مال و متاع اور اسلحہ ساتھ لیں گے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے کر تمہارے شہر سے نکل جائیں گے۔ اور اسلحہ کے علاوہ جو سامان اونٹوں پر لاد سکے وہ ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ کہا کہ آپ ہماری جائیں محفوظ رہنے دیں، ہماری عورتیں اور بچے ہمارے حوالے کر دیں اور پھر اونٹوں پر لدے ہوئے سامان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ مگر آپ ﷺ اس شرط کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اب تو میرے حکم اور فیصلے کے مطابق بلا شرط انہیں نیچے اترنا ہوگا۔ ناش یہ سن کر ان کی طرف واپس چلا گیا۔ اور ان کے پاس پہنچ کر مکمل گفتگو سے انہیں آگاہ کر دیا۔ اس وقت کعب بن اسد نے کہا اے گروہ بنی قریظ! قسم بخدا! تم یہ مصیبت نازل ہو چکی ہے جسے تم ملاحظہ کر رہے ہو۔ اب میں تم پر تین چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے جو چاہو اپنالو۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا پہلی بات یہ ہے کہ ہم اس آدمی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں قسم بخدا! تم پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ نبی مرسل ہے۔ بے شک یہ وہی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ پس اس کے سبب تمہاری جائیں، عورتیں اور مال ہر شے محفوظ ہو جائے گی قسم بخدا! تم یقیناً جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) نبی ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کو تسلیم کرنے سے صرف یہ مانع ہے کہ ہم ان کے عربی ہونے کے سبب اس سے حسد رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے۔ لیکن اب تو اسے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ اور میں بذات خود وعدہ طمانی اور معاہدہ توڑنے کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن یہ مصیبت اور نحوست اس جینے والے یعنی جی بن اخطب کے سبب پڑی ہے۔ (جی بن اخطب اس وقت ان کے پاس قلعہ میں موجود تھا۔ جب قریش اور غطفان کے جتھے واپس چلے گئے تو وہ کعب بن اسد کے ساتھ کیے گئے وعدے کے مطابق قلعہ میں واپس لوٹ آیا تھا)۔ کیا تمہیں یاد ہے جو ابن جو اس نے تمہیں کہا تھا جبکہ تمہاری شراب، گدھے اور امارت

ختم کر دی گئی اور تمہیں شفاء (دوا) سمجھو اور جو کے قریب کر دیا گیا؟ انہوں نے کہا وہ کیا تھا جو اس نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس ہستی میں ایک نبی کا ظہور ہوگا اگر اس کے ظہور کے وقت میں زندہ ہوا تو میں اس کی اتباع بھی کروں گا اور مدد بھی کروں گا۔ اور اگر اس کا ظہور میرے بعد ہو تو تم اس کے بارے کسی کے دھوکہ میں نہ آنا، بلکہ اس کی اتباع و پیروی کرنا اور اس کے مددگار اور دوست بن جانا تو اس طرح تمہارا ایمان دونوں کتابوں یعنی پہلی اور آخری پر ہو جائے گا۔ انہیں میری طرف سے سلام عرض کرنا اور یہ اطلاع کرنا کہ میں ان کی تصدیق کرتا ہوں۔ پھر کعب نے کہا آؤ ہم اس نبی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کا جواب قوم نے اس طرح دیا کہ ہم تو کبھی بھی تو رات کے حکم سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم اسے کسی اور دین کے ساتھ تبدیل کریں گے۔ پھر کعب نے کہا اگر تم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں اور پھر تمہاری سونت کر محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کی طرف خروج کریں اور ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین فیصلہ کر دے۔ پس اس طرح اگر ہم ہلاک بھی ہو گئے تو ہم اپنے پیچھے کوئی ایسی چیز ترک نہیں کریں گے جس کے بارے میں کوئی خوف و اندیشہ ہو۔ اور اگر ہم غالب آ گئے تو مجھے اپنی عمر کی قسم ہم یقیناً عورتیں اور بچے پالیں گے۔ تو قوم نے اس کا جواب یہ دیا۔ ہم تو اس مساکین کو قتل نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بعد زندگی میں کوئی بھلائی اور لطف باقی نہیں رہے گا۔ پھر کعب نے کہا کہ اگر تم یہ بات بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر آج کی رات ہفتے کی رات ہے اس رات میں محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی باطل پر اسن ہوں گے لہذا تم نیچے اترو اور محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کو غفلت میں پا کر ان پر حملہ کر دو۔ (شاید ہم کامیاب ہو جائیں) تو قوم نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ کیا ہم اپنے پوسلہ اسوت کے تقدس کو پامال کر دیں۔ اور ہم انہیں ایسا مل کر دیں جو ہم سے پہلے لوگوں نے نہیں کیا۔ کیا تو جانتا نہیں کہ جس نے بھی اس دن کا خیال نہیں رکھا اس کی گرفت کی گئی اور نکل مسخ کر دی گئی۔ یہ سن کر کعب نے کہا جب سے تم میں سے کسی کو اپنی ماں نے منعم دیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک اس پر ایک رات بھی ایسی نہیں گزری کہ وہ بات پر یقین کرنے والا اور دانا ہو۔ سید کے دونوں بیٹوں ثعلبہ اور اسید اور ان کے چچا کے بیٹے اسد بن عبید نے کہا (یہ لوگ بنی قریظہ اور بنی نضیر سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بنی ہذیل کے ساتھ تھا اور کہیں اوپر سے ان کی نسبت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ ملتی تھی) اے گروہ بنو قریظہ! تم بخدا! تم با یقین جانتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ہیں آپ کے اخلاق و کمالات اور حلیہ مبارک کا تذکرہ ہمارے سامنے ہمارے علماء بھی بیان کرتے رہے ہیں اور بنی نضیر کے علماء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اور بنی نضیر کا یہ اول آدمی بنی بنی بنی قریظہ اور بنی نضیر سے نہیں واقف ہے کہ وہ ہمارے نزدیک تمام لوگوں کی نسبت زیادہ سچ بولنے والا تھا۔ اس نے بھی اپنی موت کے وقت آپ (رسول اللہ ﷺ) کے اوصاف کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے یہی جواب دیا ہم قطعاً تو رات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ پس جب انہوں نے انہیں انکار کرتے دیکھا تو اس رات کی صبح کو بچے انکار کر اسلام قبول کر لیا اور اپنی جانوں، اہل و عیال اور مال و متاع کو محفوظ و مامون کر لیا۔ عمرو بن سعد نے کہا اے گروہ یہود اتم جانتے ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی مخالفت کی ہے اور تمہارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا اسے تم نے توڑ دیا ہے اور میں نے معاہدہ کرنے میں شامل تھا اور نہ ہی اسے توڑنے میں شریک تھا۔ پس اگر تم نے انکار کر ہی دیا ہے تو اب یہودیت پر ثابت قدم ہو جاؤ اور جزیہ ادا کرو۔ قسم بخدا! میں یہ نہیں جانتا کہ وہ اسے قبول کریں گے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم عربوں کو جزیہ دینے کا اقرار نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے لیتے رہیں بلکہ اس سے تو قتل ہو جانا بہتر ہے۔ پس اس نے انہیں کہا میں تو

کے پاس سے گزر ہوا تو انہیں ستون سے کھول دیا۔ حماد بن سلمہ علی بن زید بن جدعان سے اور وہ علی بن حسینؑ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ انہرا مرضی اللہ عنہ حضرت ابولبابہؓ کو کھولنے کے لیے تشریف لے آئیں تو انہوں نے کہا میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی نہیں کھولے گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہؑ تو میری ایک جھڑ (نکلا) ہے۔ اس کی سند میں علی بن جدعان ضعیف ہے اور علی بن حسین کی روایت مرسل ہے۔ حضرت ابولبابہؓ کہتے ہیں مجھے وہ خواب یاد تھا جو میں نے حالت نیند میں دیکھا تھا جب کہ ہم بنی قریظہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ خواب یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو سیاہ بدبودار مٹی کے کچھڑ میں اپنے آپ کو بھیسے دیکھا اور میں (کوشش بسیار کے باوجود) اس سے نکل نہیں سکا حتیٰ کہ میں اس کی بدبو سے مرنے کے قریب ہو گیا۔ بعد ازاں میں نے ایک جاری نہر دیکھی اور مجھے یہ دکھایا گیا کہ میں نے اس میں غسل کیا ہے یہاں تک کہ میں نے (غلاظت اور گندگی) کو دور کر دیا ہے اور انتہائی عمدہ اور اچھی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں نے اس خواب کی تعبیر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تو بالیقین ایسے کام کا ارتکاب کرے گا جو تجھے غم اور پریشانی میں مبتلا کر دے گا پھر وہ حزن و ملال تجھ سے دور ہو جائے گا۔ جب میں ستون سے بندھا ہوا تھا تو مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول یاد تھا اور میں یہ امید کر رہا تھا کہ رب کریم میری توبہ کی قبولیت کے بارے میں ضرور نازل فرمائے گا۔ وہ فرماتے ہیں پس میں اسی حالت پر پڑا رہا حتیٰ کہ تکلیف اور شدت کی وجہ سے مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور رسول اللہ ﷺ یہ سب ملاحظہ فرما رہے تھے (1)۔ ابن ہشام نے کہا ہے کہ وہ چھ دن اور ایک ہفتہ تک بندھے رہے ہر نماز کے وقت ان کی زوجہ محترمہ آتیں اور انہیں کھول دیتیں یہاں تک کہ وہ وضو کر کے نماز ادا کرتے اور پھر وہ انہیں باندھ دیتیں (2)۔ ابن عقبہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تین رات تک بندھے رہے بدایہ میں ہے کہ یہ زیادہ مناسب قول ہے (3)۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ پچیس راتوں تک بندھے رہے۔ جب نماز کا وقت ہوا یا قضائے حاجت کے لیے جانے کا ارادہ کرتے تو ان کی بیٹی آکر کھول دیتی اور جب وہ فارغ ہو جاتے تو وہ انہیں دوبارہ باندھ دیتی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کھولنے کے لیے ان کی زوجہ محترمہ آتی تھیں اور کبھی ان کی بیٹی (4)۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہؓ کی توبہ قبول فرماتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی **وَإِخْرُجُوا يُؤْمِنُونَ** اُغتسلوا یؤمِنون **عَمَلًا صَادِقًا وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا سُبُلًا** اُنَّ اللّٰهُ یُثَبِّتُ عَلَیْہِمْ اَیَّ اَیَّامَ یَشَآءُ لَہُمْ سَلَامٌ **وَاللّٰهُ عَلَیْہِمْ شَهِیدٌ** علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دنوں تک جاری رکھا یہاں تک کہ انہیں محاصرے کے سبب انتہائی مشقت میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا (5)۔ پس جب وہ محاصرے کے سبب تنگ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حکم کے مطابق نیچے اتر آئے۔ اور آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان کی مشکیں باندھ دی جائیں۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ ان کی مشکیں باندھ کر انہیں ایک طرف لے گئے۔ پھر قلعوں سے ان کی عورتوں اور بچوں کو باہر نکالا اور یہ ذمہ داری عبداللہ بن سلام کے سپرد کی گئی۔ اور پھر ان کا ساز و سامان اکٹھا کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس سامان میں پندرہ سو کلو اریں، تین زرہیں، دو ہزار نیزے، پندرہ سو چمڑے کی چھوٹی بڑی ڈھالیں، بہت سا دیگر سامان، کثیر تعداد میں برتن، شراب اور نشہ آور مشروب پایا۔ وہ سارے کا سا راہبہاد یا گیا اور اس کا شکر نہیں نکالا۔ پانی لانے والے بہت لموعث پائے اور علاوہ ازیں کثیر جانور بھی ہاتھ آئے۔ جب یہ سب کچھ اکٹھا کر دیا گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ تھوڑی دور جا کر ایک

2۔ سیرت ابن ہشام، جلد 4 صفحہ 89-90 (المطبع)

4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (المطبع)

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 8 (المطبع)

3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (المطبع)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 453 (المطبع)

طرف تشریف فرما ہو گئے۔ اور قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے قریب حاضر ہوئے اور عرض کناں ہوئے یا رسول اللہ! ﷺ یہ ہمارے حلیف ہیں نہ کہ خرزج کے۔ آپ نے ابن ابی کے حلیف قبیلہ قبیصہ کا معاف فرمایا اس سے آپ خوب واقف ہیں۔ آپ نے ان کے تین سو غیر مسلح اور چار سو زورہ افراد کو معاف فرمایا۔ آج ہمارے حلیف بھی اپنی وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی پر بہت ناہم اور شرمندہ ہیں۔ لہذا آپ انہیں بھی ہماری وجہ سے معاف فرمادیجیے۔ اس کلمہ گفتگو کے دوران رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اور کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ یہاں تک کہ جب ان کی طرف سے بات بڑھ گئی اور اصرار زور پکڑ گیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ ان کا فیصلہ تم میں سے ہی ایک آدمی کے حوالے کر دیا جائے؟ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں (یا رسول اللہ ﷺ ہم ضرور اس پر راضی اور خوش ہوں گے) تو آپ ﷺ نے فرمایا پس یہ فیصلہ سعد بن معاذ کے ذمہ ہے (۱)۔ اور ابن عقبہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کرام میں سے جسے چاہو جن لوگوں نے حضرت سعد بن معاذ کو منتخب کیا۔ اور حضرت سعد بن معاذ کو حضور نبی کریم ﷺ نے رفیعہ نامی ایک مسلمان عورت کے پاس مسجد میں خیمہ لگا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ عورت رخیوں کا علاج کرتی تھی اور جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوا تھا۔ ثواب کے ارادے سے اس کی خدمت بذات خود کرتی تھی۔ جب غزوہ خندق میں تیر لگنے کے سبب حضرت سعد زخمی ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فرمایا انہیں رفیدہ کے خیمے میں پہنچا دو تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کرتا رہوں۔ پس جب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فیصلہ حضرت سعد کے سپرد کیا تو قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے پاس سے نکل کر ان کے پاس پہنچے اور آپ کو ایک عربی گدھے پر سوار کر کے لے گئے۔ گدھے کے اوپر ریشوں سے بنا ہوا ایک چار جامہ تھا اور اس کے اوپر ایک کبیل رکھا گیا تھا۔ اور گدھے کی لگام بھی ریشوں سے بنی ہوئی تھی۔ حضرت سعد عظیم الجثہ آدمی تھے۔ راستے میں آپ کے ارد گرد چلتے ہوئے قبیلہ اوس کے افراد انہیں یہ کہنے لگے اے ابو عمر! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے حلیفوں کے بارے فیصلہ کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے تاکہ تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرو۔ لہذا تم بھی ان پر احسان کرنا اور ان کے بارے فیصلہ کرنا۔ تم نے ابن ابی کو دیکھا ہے اس نے اپنے حلیفوں کے بارے کیسا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کلام کرتے رہے لیکن آپ خاموش رہے اور ابھی تک کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ جب وہ گفتگو کے ذریعے آپ پر زیادہ ہی دباؤ ڈالنے لگے تو اس وقت آپ نے کہا اب سعد کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرے۔ پس یہ سن کر خضاک بن خلیفہ بن ثعلبہ انصاری نے کہا ہاں افسوس میری قوم تہا ہو گئی۔ اسی طرح کی دوسروں نے بھی کہا۔ پھر خضاک اوس کی طرف لوٹ کر گیا اور حضرت سعدؓ کے پیچھے سے پہلے ہی انہیں بنی قریظہ کے مردوں کی ہلاکت کی خبر دے دی۔ اور اس نے یہ خبر صرف آپ کے کلام کو سن کر پہنچا دی۔ صحیحین میں ہے کہ جب حضرت سعدؓ اس مسجد کے قریب پہنچے جو بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے تیار کر رکھی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا قُومُوا اِلٰی سَبِّحْكُمْ (اپنے سردار کے استقبال) کے لیے اٹھ کھڑے ہو) اور یہ الفاظ بھی ہیں قُومُوا اِلٰی خُبْرْكُمْ (اپنے میں سے بہترین آدمی کے لیے اٹھ کھڑے ہو)۔ پس اس سے مہاجرین قریش یہ کہنے لگے کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد میں فقط انصار کا ارادہ کیا ہے اور انصار نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے عام مسلمان مراد لیے ہیں۔ اور امام احمد کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے سردار کے لیے اٹھو اور انہیں نیچے اتار دو۔ اور بنی عبد الاشمل کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کے

(استقبال) کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور درود یا صف بٹائی۔

ابن عائد کے نزدیک حدیث جاہل میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سعد! ان کے بارے فیصلہ کرو۔ تو انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کرم فیصلہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ تو اس پر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے بارے تمہیں فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اوس کے وہ افراد جو ان کے پاس باقی تھے۔ انہوں نے کہا اے ابو عمر! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے دوستوں کے بارے فیصلہ کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے۔ لہذا تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرنا اور ان پر احسان کرنا۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم بنی قریظہ کے بارے میرے فیصلہ پر راضی ہو گے؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں ہم تو تمہارے فیصلے پر اس وقت بھی راضی تھے جبکہ تم یہاں موجود نہ تھے اور ہم نے تمہیں فیصلے کے لیے چنا تھا اور یہ امید تھی کہ تم ہم پر احسان کرو گے جیسا کہ دوسروں (ابن ابی وغیرہ) نے اپنے حلیفوں بنی قریظہ سے کیا۔ ہم نے تمہیں ترجیح دی ہے اور آج کے دن تمہاری طرف سے جزاء اور بدلے کا ہم سے زیادہ محتاج اور کوئی نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے تمہیں اپنے قول سے کوئی ضرورت نہیں پہنچایا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہیں اللہ تعالیٰ کے عہدہ یشاق کی قسم کیا جو فیصلہ بھی میں نے ان کے بارے کیا تم اسے ان پر لازم کر دو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ جس جانب رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور حضرت سعد آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اس جانب سے پھرے ہوئے تھے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا میرا فیصلہ انہیں بھی قبول ہوگا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میرا ان کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے، ساز و سامان کو تقسیم کر دیا جائے اور ان کے گھر مہاجرین و انصار کو روکش کے لیے دے دیے جائیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق تم نے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق ہے جو اس نے ان کے بارے میں سات آسمانوں سے اوپر فرمایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اسی طرح کا فیصلہ فرشتے نے سحری کے وقت مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ جس رات کی صبح بنو قریظہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نیچے اترے تھے اسی رات حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی تھی۔ اے اللہ! اگر تو نے قریش کے ساتھ جنگ ابھی تک باقی رکھی ہوئی ہے تو پھر مجھے اس کے لیے باقی رکھنا کیونکہ میرے نزدیک ان سے بڑھ کر کوئی قوم نہیں جس سے جنگ کرنا میں پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے تیرے رسول کو جھٹلایا، اسے اذیت پہنچائی اور شہر سے باہر نکال دیا۔ اور اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر اسی درخ کو میرے لیے باعث شہادت بنادے۔ اور مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک کہ بنی قریظہ کے سبب میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کے (قتال کے) سبب ان کی آنکھیں ٹھنڈی فرما دیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ذوالحجہ کی نویں یا پانچ تاریخ کو بروز جمعرات وہاں سے واپس تشریف لے گئے اور ان کے بارے میں آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ بنی نضار میں سے رملہ بنت حارث کے گھر انہیں بند کر دیا جائے۔ جس پس منج ہوئی تو رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کے اسی بازار میں کھایاں کھود دی گئیں۔ صحابہ کرام وہاں اور کھایاں کھودنے کا حکم ارشاد فرمایا پس ابو جہم عدوی کے گھر سے لے کر احزاباثریت تک بازار میں کھایاں کھود دی گئیں۔ صحابہ کرام وہاں حاضر رہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے صحابہ کرام کی معیت میں وہیں تشریف فرما رہے۔ اور پھر بنی قریظہ کے مردوں کو بلایا پس انہیں لایا جاتا اور ان کھائیوں میں ان کی گردنیں مار دی جاتیں۔ چونکہ کعب بن اسد انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جا رہا تھا تو انہوں نے

کعب سے کہا اے کعب! تمہارا کیا خیال ہے محمد (ﷺ) ہم سے کیا سلوک کریں گے؟ اس نے جواب دیا تمہاری پلاکت ہو وہ تم سے اچھا برتاؤ نہیں کریں گے اور کسی حال میں تم سے دیت وصول نہیں کریں گے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ بلائے والا اب رکنے والا نہیں ہے اور تم میں سے جو جائے گا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ قسم بخدا! اب تو کمزور ہی ہے۔ میں نے تمہیں اس سے قبل اور بات کی طرف دعوت دی تھی لیکن تم نے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے کہا اب یہ وقت عتاب اور ججز کئے کا نہیں ہے۔ اگر ہم تمہاری رائے کو قبول کرنا پسند نہ کرتے تو اس معاہدے کو توڑنے میں شامل نہ ہوتے جو ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان تھا۔ جی بن اخطب نے کہا اب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنا چھوڑو۔ کیونکہ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اب صبر سے کمزور کا سامنا کرو۔ انہیں قتل کرنے کا فریضہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے سرانجام دیا۔ پھر اس کے بعد جی بن اخطب کو اس حال میں لایا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے قتل کے لیے فتاویٰ حلقہ (جہ) پہنا۔ لیکن پھر اسے پھاڑ کر انگلی کے پوروں کی مثل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تاکہ کوئی اور اسے چھین کر بہن نہ لے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اے دشمن خدا! کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے چھ پر قدرت دے نہیں دی؟ اس نے کہا کیوں نہیں۔ قسم بخدا! میں نے تمہارے ساتھ عداوت رکھنے کے سبب اپنے آپ کو ملامت نہیں کی۔ اور میں اپنے گمان میں تم پر غالب آنے کا متنبی تھا۔ لیکن اللہ نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بلکہ آپ کو مجھ پر قدرت دے دی۔ میں نے مکمل کوشش کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے اسے رسوا کر دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوئی حرج نہیں ہے اسراہیل کے بارے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لکھ دیا گیا ہے اور مقدر بنا دیا گیا ہے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور اس کی گردن رادی گئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے قیدیوں سے اچھا سلوک کیجئے، انہیں تھوڑا سا آرام پانچپائے اور انہیں پانی پلائیے تاکہ یہ کچھ خشک محسوس کریں۔ پھر جو جاتی ہیں انہیں قتل کر دیجئے۔ ان پر سورج اور تلواریں گری جمع نہ کیجئے۔ وہ دن بھی بہت گرم تھا۔ چنانچہ انہیں تھوڑا سا آرام کرنے دیا گیا اور پانی پلایا گیا۔ پس جب وہ ٹھنڈے ہو چکے تو پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ماقبی کو قتل کر دیا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کعب بن اسد کو پیش کیا گیا تو آپ نے اسے فرمایا تجھے ابن حواس کی نصیحتوں نے کوئی نفع نہیں دیا حالانکہ وہ تو میری تصدیق کرتا تھا۔ کیا اس نے تمہیں میری اتباع پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا (اور یہ نہیں کہا تھا) کہ اگر تم مجھے پالو تو اس کی جانب سے مجھے سلام پیش کرتا اس نے جواب دیا۔ کیوں نہیں۔ تو رات کی قسم اے ابو القاسم! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہودی مجھے تلوار سے ڈر جانے کی عار دلائیں گے تو میں ضرور آپ کی پیروی اختیار کر لیتا۔ لیکن اب تو میں دین یہودی پر ہی ثابت قدم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے آگے لاؤ اور اس کی گردن مار دو۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ہر اس آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا جس کے مونے ڈھارے ہوئے ہوں۔

امام احمد اور اصحاب سنن نے عطیہ قرطی سے نقل کیا ہے کہ میں بچہ تھا۔ پس انہوں نے مجھے اس حال میں پایا کہ میرے بال نہیں اگے تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ طبرانی نے اسلم انصاری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بنی قریظہ کے قیدیوں پر مقرر کیا۔ پس میں بچے کی شرمگاہ دیکھتا تھا اگر میں اس کے مونے ڈھارے دیکھتا تو میں اس کی گردن مار دیتا۔ اور اگر اسے اس حال میں نہ دیکھتا تو اسے مسلمانوں کے مال غنیمت میں شامل کر دیتا۔ رفاعہ بن شول قرطی بالغ مرد تھا لیکن اس نے سلیط بن قیس کی بہن ام المہدیٰ سلمیٰ بنت قیس کے پاس پناہ لے لی۔ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی خالواؤں میں سے ایک تھیں، یعنی یہ آپ کے دادا عبدالمطلب کی خالہ تھیں۔ کیونکہ

ان کی والدہ بنی نجار میں سے تھی۔ اور سلمیٰ کو دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل تھی۔ پس انہوں نے کہا یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ رفادہ مجھے عطا فرما دیجئے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ غریب نماز بھی پڑھے گا اور اونٹ کا گوشت بھی کھائے گا۔ پس آپ ﷺ نے وہ انہیں سپرد کر دیا۔ پس اس طرح انہوں نے رفادہ کو زندگی بخش دی۔ پھر بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ غروب شفق تک تمام کو قتل کر دیا گیا۔ پھر خندق میں بنی ان تمام پر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ سب کچھ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ اس دن بنی نصیر کی ایک عورت کے سوا ان کی کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا اس عورت کا نام بانہ تھا۔ یہ بنی قریظہ کے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی۔ اس کو حکم کیا جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ پس جب ان پر محاصرہ شدت پکڑ گیا۔ تو وہ مرد کے پاس آ کر رونے لگی اور کہنے لگی تو اب مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ تو اس نے کہا تو رات کی قسم! تیرے لیے کوئی حرج نہیں اور تو ایک عورت ہے۔ پس یہ جنگی ان پر لڑو کا دے کیونکہ وہ بھی تو ابھی تک ان میں سے کسی کو قتل نہیں کر پائے۔ اور تو عورت ہے اگر محمد ﷺ ہم پر غالب آ گئے (تو وہ تجھے قتل نہیں کریں گے) کیونکہ وہ عورتوں کو قتل نہیں کرتے۔ اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ تجھے قیدی بنایا جائے۔ لہذا میں یہ چاہتا ہوں کہ تجھے بھی قتل کر دیا جائے۔ وہ اس وقت زبیر بن باطلہ کے قلعہ میں تھی۔ پس اس نے قلعہ کے اوپر سے چکی اڑھا دی۔ مسلمان قلعہ کی دیواروں کے ساتھ سایہ میں بیٹھا کر رہے تھے۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو وہاں سے اٹھ گئے لیکن وہ جنگی خداد بن سوید کے سر میں آ گئی۔ جس کے سبب ان کا سر پھٹ گیا اور ان پر موت واقع ہو گئی۔ عروہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا بنانہ میرے پاس نیچی باتیں کر رہی تھی اور خوب ہنس کر اپنی سیدی ہوری تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ تلواروں کے ساتھ ان کے مردوں کے سر قلم کر رہے تھے۔ اور ایک روایت میں آپ فرماتی ہیں کہ بنی قریظہ کے سردار قتل کیے جا رہے تھے کہ اچانک ایک بلانے والے نے اس کا نام لے کر بلند آواز سے پکارا کہ فلاں عورت کہاں ہے۔ تو اس نے جواب دیا قسم بخدا! میں یہاں ہوں۔ میں نے اسے کہا تو ہلاک ہو جائے! تجھے کیا ہے؟ تو اس نے کہا مجھے بھی قتل کیا جائے گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اس نے کہا میں نے بھی ایک واقعہ کیا ہوا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ پھر وہ چلی گئی اور خداد بن سوید کے بدلے اسے بھی قتل کر دیا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میں بنانہ کی خوش طبعی کو کبھی نہیں بھولوں گی کہ وہ اپنے قتل ہونے کا علم رکھنے کے باوجود خوب ہنس کھیل رہی تھی۔ (1)

مسئلہ: یہ حدیث ان کی دلیل ہے جو یہ حکم لاتے ہیں کہ بھاری شے کے سبب بھی کسی کو قتل کرنے کے ساتھ قصاص لازم ہوتا ہے۔ جبور کا یہی نظریہ ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا موقف یہ ہے کہ بھاری شے کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص لازم نہیں آتا اگر کسی پر کوہ اوقیس پھینک دیا جائے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل اور زخم کا قصاص نہیں لیا جائے مگر جبکہ آلہ کاٹنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلی بحث سورۃ البقرہ کی آیت کَتَبَ عَلَيْنَا الْقَصَاص کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ محمد بن اسحاق نے زہری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زبیر بن باطرقلی جس کی کنیت ابو عبد الرحمن تھی دور جاہلیت کی جنگ بعاث کے دنوں میں ثابت بن قیس بن شماس کے پاس آیا اور اسے پکڑ کر لے گیا۔ پھر صرف اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اسے چھوڑ دیا (نہ

اسے قتل کیا اور نہ ہی غلام بنا کر رکھا۔ پھر جب بنی قریظہ کے ان ایام میں ثابت بن قیس کی ملاقات زبیر بن باطرقلی کے ساتھ ہوئی تو اس وقت وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ تو اس وقت ثابت نے اسے کہا اے ابوعبدالرحمن! کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ تو اس نے کہا کیا میرے جیسا آدمی تیرے جیسے آدمی سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ تو پھر ثابت نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں تیرے احسان کا بدلہ دوں۔ اس نے کہا بے شک کریم اور جی لوگ بدلہ دیا کرتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر ثابت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ زبیر کا میرے اوپر احسان ہے اور اس کا بدلہ دینا مجھ پر لازم ہے۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکا ہوں۔ اس لیے آپ اس کا خون (جان) مجھے ہبہ کر دیجئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ تجھے عطا کر دیا۔ پھر وہ اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرا خون مجھے ہبہ کر دیا ہے۔ تو اس نے کہا ایسا بوڑھا انسان جس کی نہ بیوی ہو اور نہ بچے۔ وہ زندہ رو کر کیا کرے گا۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اس کے حمل اور اولاد بھی مجھے عطا کر دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی تجھے ہبہ کر دیے۔ پھر اس نے آکر اسے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے بیوی بچے مجھے عطا فرما دیے ہیں۔ پس وہ بھی تیرے پاس رہیں گے۔ تو اس نے کہا حجاز میں رہنے والے ایسے افراد جن کے پاس ساز و سامان نہ ہو تو وہ کس طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اس کے مال کا بھی مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے وہ مال بھی عطا فرما دیا اور پھر اسے آکر بتایا کہ آقائے دو جہاں ﷺ نے تیرا مال بھی مجھے عنایت فرما دیا ہے۔ پس میں وہ تجھے دیتا ہوں۔ پھر زبیر نے کہا اسے ثابت! اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جس کا چہرہ چینی آئینہ کی مثل حسین تھا اور اس سے سارے قبیلہ کی پیشانیاں دکھائی دیتی تھیں اس سے اس کی مراد کعب بن اسد تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر کہا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جو شہر اور دیہات میں رہنے والوں کا سردار تھا، دونوں قبیلوں کا قائد تھا، جنگ کے دنوں میں لوگوں کو ساریاں مہیا کرتا تھا اور خشک سالی کے ایام میں لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اس کی مراد جی بن اخطب تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا کہ جب ہم حملہ کرتے تو وہ آگے آگے ہوا کرتا تھا اور جب ہم حملہ کر کے واپس لوٹتے تو وہ ہماری حفاظت کے لیے ہماری اطراف میں رہا کرتا۔ اس سے اس کا مقصد و غزالہ بن شہل تھا۔ ثابت نے اسے بتایا کہ وہ بھی قتل ہو چکا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ بنی کعب بن قریظہ اور بنی عمرو بن قریظہ دونوں کی مجلسوں کا گیا تھا۔ تو ثابت نے اسے بتایا کہ وہ سب چلے گئے اور قتل کر دیے گئے۔ یہ سن کر زبیر نے کہا اے ثابت! میرا جوا احسان تیرے ذمہ ہے میں اس کے واسطے سے تجھے کہتا ہوں مجھے اپنی قوم کے ساتھ ملا دے۔ قسم بخدا! ان لوگوں کے بعد زندہ رہنے میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں۔ مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میں ان گھروں کی طرف واپس لوٹ کر جاؤں جن میں وہ رہا کرتے تھے اور ان کے بعد میں ان میں باقی رہوں۔ لیکن اے ثابت! میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا اپنے صاحب سے ان کے بارے میں یہ مطالبہ کرنا کہ انہیں آزاد کر دیا جائے اور ان کا مال بھی واپس لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ ثابت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں زبیر کے گھر والوں اور ان کے مال و متاع کے بارے میں عرض کی تو آپ ﷺ نے اس کے اہل و عیال کو بھی واپس کر دیا اور اسلحہ کے علاوہ دیگر ساز و سامان بھی عطا فرما دیا۔ زبیر نے کہا اے ثابت! میں تجھے اپنے احسان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے بالفور اپنی قوم کے ساتھ ملا دو قسم بخدا! میں اتنی دیر بھی صبر نہیں کر سکتا جتنی دیر میں بھرے ہوئے ڈول کو کنوئیں میں اٹھیل کر دو بارہ بھر کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ پس میں اس سے بھی پہلے اپنے دوستوں کے پاس پہنچنا چاہتا

ہوں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ثابت اسے لے گئے اور اسے قتل کر دیا گیا اور محمد بن عمر نے کہا ہے کہ ثابت نے اسے کہا میں تجھے قتل نہیں کر سکتا۔ زبیر نے کہا مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ مجھے قتل کس نے کیا ہے۔ پس پھر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس زبیر کا یہ قول اَلْفَى الْاِحْبَةُ (کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں گا) پہنچا تو آپ نے فرمایا وہ جہنم کی آگ میں ان سے ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا (1)۔ پھر بنی قریظہ کا ساز و سامان اور ان کی عورتیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ یہ وہ پہلا مال فے ہے جس میں بعض کے لیے دو دو حصے رکھے گئے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور چھتیس گھوڑے تھے گھوڑوں اور آدمیوں کے مجموعی حصوں کی تعداد تین ہزار بہتر 3072 تھی۔ ان میں دو حصے گھوڑے کے دیئے گئے اور ایک حصہ اس کے مالک کا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس تین گھوڑے تھے لیکن حصہ صرف ایک گھوڑے کا رکھا گیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس موقف کی دلیل یہی واقعہ ہے کہ مال غنیمت میں سے صرف ایک گھوڑے کا حصہ دیا جائے گا۔ جبکہ امام ابو یوسف امام احمد اور امام حاکم کا موقف یہ ہے کہ دو گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا۔ لیکن بالاتفاق دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ نہیں نکالا جائے گا۔ سورۃ الانفال میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اس مال میں سے حضور نبی کریم ﷺ نے غلام بنی سویہ کا حصہ بھی علیحدہ کیا جنہیں قلعہ کے قریب اوپر سے چکی پھینک کر شہید کر دیا گیا تھا اور عثمان بن محسن کا حصہ بھی نکالا جو کہ بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران وصال فرما گئے اور وصال سے قبل مسلمانوں کی معیت میں جنگ کرتے رہے۔ یہ امر حاکم نے اس موقف کی دلیل ہے کہ اسے مال غنیمت سے حصہ دیا جائے گا جو جنگ کے وقت حاضر ہوا۔ پھر اگرچہ کفار کے شکست خوردہ ہو کر بھاگے اور مال غنیمت دارالاسلام میں محفوظ کرنے سے قبل ہی فوت ہو گیا۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے روایت نقل کی ہے کہ جو بھی میدان جنگ میں حاضر ہوا اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا (2)۔ یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور طبرانی نے اسے مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا ہے اور موقوف روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور امام شافعی نے اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کیا ہے اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ مال غنیمت میں حق اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ مال دارالاسلام میں محفوظ نہ کر لیا جائے۔ لہذا جو کوئی مال محفوظ کیے جانے سے قبل فوت ہو گیا یا قتل کر دیا گیا اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا اور اس کے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور جب ختم ہونے کے بعد اگر ملک دارالحرب میں پہنچ جائے اس سے قبل کہ مال دارالاسلام میں محفوظ کیا جائے تو پھر ان کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ: یہ واقعہ امام اعظم ابوحنیفہ کے خلاف جمہور کے اس موقف کی دلیل ہے کہ مال غنیمت میں سے گھوڑوں کے لیے تین حصے ہیں ایک حصہ شہسوار کا دو حصے گھوڑے کے، جبکہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ ایک حصہ شہسوار کو دیا جائے گا اور ایک گھوڑے کو۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ قیدیوں میں سے پانچواں حصہ لیتے تھے ان میں سے جسے چاہتے آزا فرما دیتے اور جسے چاہتے کسی کو بہہ کر دیتے اسی طرح آپ نے اپنا پانچواں حصہ سمجھوروں میں سے بھی علیحدہ کیا۔ کل مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے تھے ان میں سے آپ ﷺ کا ایک حصہ حمزہ بن جزاہر بیدی کے حوالے کر دیا گیا اور پھر بقیہ چار حصے لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ رسول اللہ

ﷺ نے ان عورتوں کو بھی مال عطا فرمائے جو جنگ میں حاضر ہوئیں۔ لیکن ان کے لیے باقاعدہ کوئی حصہ مقرر نہیں کیا۔ اس جنگ میں شریک ہونے والی عورتیں صفیہ بنت عبدالمطلب، ام عمارہ نسیمہ، ام سلمہ، ام علاء، الانصار، یسیریہ بنت قیس، ام سعد بن معاذ اور کعبہ بنت رافع تھیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کا ایک گروہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تاکہ ان کے بدلے ہتھیار اور گھوڑے خریدے جاسکیں۔ محمد بن عمر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے سعد بن زید انصاری اشجلی کو بنی قریظہ کے قیدیوں کے ساتھ بھیجا اور انہوں نے انہیں بیچ کر گھوڑے اور اسلحہ خریدا۔ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما نے قیدیوں میں سے ایک گروہ خریدا اور پھر اسے آپس میں تقسیم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم کرتے وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف نے جوان عورتوں کو علیحدہ کیا اور بوڑھی عورتوں کو علیحدہ کر دیا اور پھر حضرت عبدالرحمن نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا کہ جو چاہیں لے لیں۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بوڑھی عورتوں کو لے لیا۔ پس ان کے سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مال کثیر کا منافع ہوا۔ کیونکہ بوڑھی عورتوں کے پاس سے بہت سامان پایا گیا تھا جو کہ جوان عورتوں کے پاس موجود نہیں تھا۔ ابن سیرہ نے کہا ہے جو مال بوڑھی عورتوں سے لیا گیا تھا وہ مال غنیمت میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ مال ایک یا دو ماہ کے بعد ان سے برآمد ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خریدے ہوئے قیدیوں میں سے ہر ایک کے لیے سامان دینے کا وقت مقرر کر دیا۔ پس جس نے بھی اس مقررہ وقت میں سامان دے دیا آپ نے اسے آزاد کر دیا اور اس سے کوئی تعرض نہ کیا (1)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے تقسیم اور بیچ کرنے کے وقت عورتوں اور ان کے بچوں کے درمیان تفریق اور علیحدگی کرنے سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق نہ کی جائے یہاں تک کہ بچے بالغ ہو جائیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ بلوغت کی علامت کیا ہے؟ فرمایا پکی حائضہ ہو جائے اور بچے کو احتلام ہونے لگے (2)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح کہا ہے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق نہ کرو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کب تک؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہاں تک کہ بچہ بالغ ہو جائے اور لڑکی کو حیض آنے لگے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عبد اللہ بن عمر بن حسان ضعیف الحدیث ہے۔ علی بن مدینی نے اسے مقیم بالکذب قرار دیا ہے۔

امام ترمذی نے ابوالایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کسی نے ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے محبوبوں کے درمیان جدائی ڈال دے گا (3)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے اور حاکم نے اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی جی بن عبد اللہ ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی لیے ترمذی نے اسے صحیح نہیں قرار دیا۔ حاکم نے مستدرک میں عمران بن حصین سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ملعون ہے جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی (4)۔ حاکم نے کہا ہے اس کی سند صحیح ہے۔ اس میں ایک راوی طلحہ بن محمد ہے۔ حاکم بھی یہ روایت طلحہ بن محمد کے واسطے سے عمران بن حصین سے نقل کرتے

ہیں۔ کبھی اسی واسطہ سے ابو بردہ سے روایت کرتے ہیں اور کبھی طلحہ کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت نقل کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ طلحہ بن محمد نے اس حدیث کو عمران بن حصین اور ابو بردہ دونوں سے سنا ہو اور پھر وہ کبھی ایک سے روایت کرتا ہے، کبھی دوسرے سے اور کبھی مرسل روایت کرتا ہو۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ طلحہ معروف الحال نہیں ہے۔ ابن حمام نے کہا ہے کہ ابن قطان نے اپنے قول میں خاص سلسلہ سند مراد لیا ہے۔ ورنہ یہ حدیث تو کثیر طرق سے مروی ہے اور مشہور ہے اور اس کے الفاظ معنی مشترک کے صحیح ہونے کو ثابت کرتے ہیں اور معنی مشترک سے مراد ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق کرنے سے منع کرتا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سند سے میمون بن ابی شیبہ کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیگی اور اس کی ماں کے درمیان تفریق کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع کر دیا۔ چنانچہ آپ نے بیع تو زدی (1)۔ اسے ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اسے میمون بن ابی شیبہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع پانے جانے کے سبب رد کر دیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حدیث کے لیے مرسل ہونا نقصان دہ نہیں اور اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے ترجیح دی ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسی سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیع، ہبہ یا ان کی مثل کسی طریقہ کے سبب دو چھوٹے غلاموں (تابعی)، ایک چھوٹے اور ایک بڑے غلام اور دو بڑے (بالغ) غلاموں کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے محرم رشتہ دار ہوں۔ یہی موقف امام احمد کا بھی ہے اور امام مالک نے کہا ہے کہ صرف ماں اور اس کے بچوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی۔ اور امام شافعی نے کہا ہے کہ چھوٹے بچے اور اس کے والدین کے درمیان تفریق نہ کی جائے اگرچہ وہ نسبتاً کتنے اوپر والے درجہ میں کیوں نہ ہوں۔ (اس سے مراد والدین کی جانب سے تمام اصول یعنی دادا پردادا اور نانی وغیرہ ہیں)۔ حضرت امام مالک نے قول کی علت یہ ہے کہ حدیث طیبہ میں صرف ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کرنے کی گنجی مذکور ہے۔ اور امام شافعی نے اپنے قول میں ماں کے ساتھ مطلقاً تمام اصول کو ملا دیا ہے (یعنی جو حکم ماں کا ہے وہی تمام اصول کا ہے) اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک دو غلاموں کے درمیان تفریق کرنے سے روکنے کی علت ان کے درمیان پایا جانے والا رشتہ محرمیت ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں اصول و فروغ کے علاوہ بھی تفریق کرنے سے روکنے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو آپس میں دونوں بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو کوچ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ پر حاتم سے غلام کو کیا ہوا ہے؟ میں نے اس کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کیا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اسے ضرور واپس لوٹا لو (2)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابو داؤد نے ان کی گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث میمون بن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے حالانکہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے۔ اور حاکم اور دارقطنی نے ایک دوسری سند سے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے تو آپ ﷺ نے مجھے دو بھائیوں کو بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس میں نے انہیں فروخت کیا اور انہیں

علحدہ علیحدہ بیچ ڈالا۔ پھر میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان دونوں کو تلاش کرو اور واپس لوٹاؤ، ان دونوں کو انکھانچھا اور ان کے درمیان تفریق نہ کرو (1)۔ حاکم نے اس روایت کو شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے اس میں کوئی عیب نہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ اس باب میں یہی سب سے زیادہ قابل اعتماد روایت ہے۔ ایک دوسری سند سے اسے امام احمد اور ہزار نے بھی نقل کیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے لیکن یہ ہمارے معروف اصول کے لیے ضرور سنا نہیں۔ دارقطنی نے طلیح بن عمران سے انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے ابویوسف سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعنت کی ہے جس نے والدہ اور اس کے بیٹے کے درمیان یا دو بھائیوں کے درمیان تفریق کر دی (2)۔ جب دو بھائیوں کے مابین بھی تفریق کرنے کی ممانعت ثابت ہوگی تو اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ممانعت کی علت ایسی رشتہ داری ہے جس میں محرمیت پائی جائے۔ لیکن وہ محرمیت جو رضاعت کے سبب ثابت ہو وہ تفریق کے مانع نہیں۔ اسی طرح ایسی رشتہ داری جس میں محرمیت نہ ہو وہ بھی تفریق کے مانع نہیں مثلاً چچا کا بیٹا وغیرہ۔

مسئلہ: جو کوئی والدہ اور اس کے بیٹے کے درمیان جدائی کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیچ منعقد ہو جائے گی اور نافذ نہیں ہو جائے گی۔ جب کہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی منعقد نہیں ہوتی بلکہ بیچ باطل ہوتی ہے۔ اسی طرح امام احمد کے نزدیک اگر دونوں کے مابین ولادت کا تعلق نہ بھی ہو تو پھر بھی بیچ منعقد نہیں ہوتی۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیچ صرف اس صورت میں فاسد ہوتی ہے جبکہ دونوں کے درمیان رشتہ ولادت موجود ہو۔ اور آپ ہی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایسی بیچ مطلق فاسد ہوگی، چاہے دونوں کے درمیان ولادت کا رشتہ موجود ہو یا کوئی اور تعلق محرمیت پایا جائے۔ ائمہ کے مذکورہ اختلاف کا دار و مدار ایک اصولی اختلاف پر ہے۔ کیونکہ اگر امور شرعیہ سے نبی بغیر کسی قرینہ کے ہو تو وہ ائمہ خلاصہ کے نزدیک موجب بطلان ہوتی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین کے نزدیک موجب فساد ہوتی ہے۔ لیکن پھر امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد نے کہا ہے کہ جس طرح اذان جمعہ کے وقت بیچ ممنوع ہے اور اس کا سبب امر خارجی ہے (یعنی ایسا امر ہے جو نفس بیچ میں داخل نہیں اور وہ ہے جمعہ کی تیاری میں تاخیر اور غفلت) اسی طرح ایسی بیچ جس سے ماں اور بیٹے کے درمیان تفریق لازم آتی ہو وہ بھی ممنوع ہے اور اس کا سبب بھی امر خارجی ہے۔ لہذا امر خارجی نفس بیچ میں فساد ثابت نہیں کرتا۔ ہاں اگر ممنوع ہونے کا سبب کوئی وصف لازم ہو تو اس سے نفس بیچ فاسد ہو جاتی ہے۔ جبکہ امام یوسف کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیچ توڑنے اور غلاموں کو واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ بیچ بنیادی طور پر فاسد ہو۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے غلاموں کے واپس لوٹانے کو طلب اقالہ پر محمول کیا ہے (یعنی پہلی بیچ فسخ کرنے پر محمول کیا ہے اور اس سے پہلی بیچ کا فاسد ہونا لازم نہیں آتا)۔

مسئلہ: اگر دونوں غلام بالغ ہوں تو ان کے درمیان تفریق کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے کہ مذکورہ روایات کے مطلق ہونے کی وجہ سے دو باغلوں کے درمیان تفریق کرنا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ ابن جوزی نے حضرت عبادہ کی روایت کو رد کر دیا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے موقف کی دلیل حضرت سلمہ بن اکوع

رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے اور ہم نے بنی فزارہ کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ میں انہیں پکڑ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں لے آیا۔ ان میں ایک عورت تھی اور اس کے ساتھ عرب کی حسین ترین اس کی بیٹی بھی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ لڑکی مجھے عطا فرمادی۔ اور میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اے سلمہ! یہ عورت مجھے حبہ کر دے تو میں نے عرض کی حضور! یہ آپ ہی کی ملک ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے عوض تین (مسلمان) قیدیوں کو رہائی دلائی۔ یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن سیرین کے درمیان بھی تفریق کر دی تھی۔ یہ دونوں بکنیں شہبشاہ سکندر یہ مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کو تحفہ پیش کیں۔ تو آپ ﷺ نے سیرین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی۔ اور اسی کے بطن سے حضرت عبدالرحمن بن حسان پیدا ہوئے (اور حضرت ماریہ کو اپنے پاس رکھا)۔ ابن عبدالبر نے یہ روایت الاستیعاب میں ذکر کی ہے۔ اور بزار نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ابن خریزمی میں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کے والدین ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی انفراداً بیچنا جائز نہیں۔ اور اگر صغیر بچے کے ساتھ ماں اور بھائی ہو یا ماں اور چھوٹی بھیلی ہو یا ماں اور خالہ ہو تو چھوٹی بھیلی اور خالہ کو علیحدہ بیچنا جائز ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ دادی نہ ہو بلکہ صرف چھوٹی بھیلی اور خالہ ہو تو ان میں سے تین بڑے ہوں اور تین چھوٹے۔ اور اس نے ہر چھوٹے کے ساتھ ایک بڑا ملا کر فروخت کر دیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر صغیر کے ساتھ دادی، چھوٹی بھیلی اور خالہ ہو تو چھوٹی بھیلی اور خالہ کو علیحدہ بیچنا جائز ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ دادی نہ ہو بلکہ صرف چھوٹی بھیلی اور خالہ ہو تو ان میں سے کسی کو علیحدہ نہیں بیچا جا سکتا (بلکہ صغیر کو بھی ان کے ساتھ فروخت کیا جائے گا)۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر صغیر کے ساتھ متعدد قریبی افراد موجود ہوں۔ ان میں سے بعض دور کے رشتہ دار ہوں اور بعض قریب تر ہوں تو ان میں سے دور کے رشتہ داروں کو علیحدہ فروخت کرنا جائز ہے (جبکہ اقرب کو علیحدہ بیچنا جائز نہیں) اور اگر تمام افراد ایک ہی درجے کے رشتہ دار ہوں اور ان کی جنس مختلف ہو مثلاً باپ اور ماں، خالہ اور چھوٹی بھیلی تو پھر ان میں تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ یا تمام کو اکٹھا فروخت کر دیا جائے گا یا تمام کو روک لیا جائے گا۔ اور اگر وہ تمام ایک ہی جنس میں سے ہوں مثلاً دو بھائی ہوں یا دو چچا ہوں تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ ایک کو صغیر کے ساتھ روک لیا جائے اور اس کے سوا جتنے ہوں تمام کو فروخت کر دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: سمیل الرشاد میں مذکور ہے کہ بنی قریظہ کے قیدیوں میں سے چھوٹے بچوں اور ان کی ماؤں کو عرب کے مشرکوں اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کی ماں نہ ہوتی تو اسے صرف مسلمانوں کے ہاتھ ہی فروخت کیا جاتا۔ کیونکہ جب چھوٹے بچے کو اس کے والدین میں سے کسی ایک کی معیت میں قیدی بنایا جائے تو اسے کافر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے کافر کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، چاہے وہ کافر مشرک ہو یا یہودی ہو کیونکہ تمام کافر ملت واحدہ ہیں۔ اور اگر صرف بچے کو قیدی بنایا جائے اور اس کے والدین میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہ ہو تو پھر دارالاسلام میں آ جانے کی وجہ سے مسلمان شمار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

غزوہ بنی قریظہ میں صرف غلام بن سوید اور منذر بن محمد رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ نے بنی نضیر کی ریحانہ بنت زید بن عمرو بن حذافہ کو اپنے لیے چنا۔ اس کی شادی بنی عمرو بن قریظہ میں ہو چکی تھی اور وہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام لانے کی دعوت دی تو اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے اسے علیحدہ کر دیا لیکن اپنے دل میں اس کا تصور رکھا۔ لہذا ابن مسعود کو بلا بھیجا اور اس کا ذکر اس کے سامنے کیا۔ ابن مسعود نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قریبان ہوں وہ اسلام قبول کر لے گی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس آئے اور اسے کہنے لگے تو اب اپنی قوم کی خواہش نہ کر۔ تو نے وہ مصیبت اور تکلیف دیکھی ہے جو جی بنی نضیر نے ان پر ڈالی ہے۔ پس تو اسلام قبول کر لے۔ رسول اللہ ﷺ تجھے اپنے لیے منتخب فرمائیں گے۔ چنانچہ وہ دعوت کو قبول کرتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئی۔ اس اثناء میں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے جو توں کی آہستہ سی تو آپ ﷺ نے فرمایا ابن مسعود کے جو توں کی آہستہ ہے۔ وہ مجھے ریحانہ کے اسلام لانے کی خوشخبری سنانے آ رہا ہے۔ پس وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ ﷺ یہ سن کر انتہائی خوش ہوئے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی رہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ اس وقت تک وہ آپ ﷺ کی ملکیت میں ہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تو اس سے شادی کرنے اور اسے پردہ میں رکھنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ مجھے ویسے ہی اپنی ملکیت میں رہنے دیجئے۔ یہ میرے لیے بھی باعث راحت ہوگا اور آپ کے لیے بھی آسانی کا سبب ہوگا۔ پس آپ ﷺ نے اسے ویسے ہی ملکیت میں رہنے دیا یہ واللہ اعلم۔

فائدہ: جب بنی قریظہ کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا رخم بھی کھل گیا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت سعد رضی اللہ عنہ (کا حال معلوم کرنے کے لیے) ان کے پاس تشریف لے گئے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے میں نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز علیحدہ علیحدہ پہچان لی اور اس وقت میں اپنے حجرہ میں تھی۔ وہ بالیقین ایسے ہی تھے جیسے رب العالمین نے ارشاد فرمایا: **حَمَاءُ بَيْنَهُمْ**۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا جنازہ اٹھایا گیا تو منافقین نے کہا کہ ان کا جنازہ کتنا ہلکا ہے اور اس کا سبب بنی قریظہ کے بارے میں ان کا فیصلہ ہے۔ جب یہ خبر حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے تو ملائکہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اسے تردی نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کے سبب عرشِ رخن بھی لرز گیا۔ (منقح علیہ۔ (2)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک ریشمی حلیہ بطور ہدیہ پیش کیا گیا۔ پس صحابہ کرام اسے چھو کر اس کے نرم و ملائم ہونے پر اظہارِ توجہ کرنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کی نرمی پر تعجب کر رہے ہو،

جنت میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے رومال اس سے بہتر اور زیادہ نرم ہوں گے۔ متفق علیہ (۱)۔

علامہ بغوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ سے دنیوی ساز و سامان مانگا اور فقہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا ان کے اس رویے سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تو آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک مہینہ تک ان کے قریب نہ آنے کی قسم کھائی۔ اور اپنے صحابہ کرام کی طرف بھی باہر تشریف نہ لے گئے۔ تو صحابہ کرام کو کنگر دامن گیر ہوئی اور وہ کہنے لگے آپ ﷺ کا حال کیا ہے؟ (آپ باہر تشریف نہیں لائے)۔ ان میں سے کچھ یہ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا میں تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کروں گا۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے؟ ﷺ نے فرمایا نہیں! میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں مسجد میں داخل ہوا تو مسلمان کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق دے دی ہے۔ کیا میں انہیں مطلع کروں کہ آپ نے ازواج کو طلاق نہیں دی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! اگر تو چاہے۔ پس میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور بلند آواز کے ساتھ ندا دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَ إِذْ جَاءَهُمْ آمُرُ قَرْنٍ اَلْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَدَاْعُوهُمْ ۖ وَ لَوْ سَاذُوْهُ اِلَى الرُّسُلِ وَاِنِّىْ اَوَّلُ الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّكَ الْاَنۡبَىٰ تَتَشَوَّكُم مِّنۡ دُونِىۡ ۚ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ جَعَلْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۚ فَتَوَكَّلْ عَلٰى تَحْقِیْقِ ۚ اِنَّ كُلَّ شَيْءٍ عِنۡدَ عَلٰمِیۡنَ ۚ (سج) معلوم ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس معاملہ کی حقیقت معلوم کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (۲)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُمْ تُرِيدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَمَعَالِكُنْ
اُمِّعْكُنَّ وَ اَسْرَحْكُنَّ سَرَاحًا جَبِيْلًا ۝۱۶

”اے نبی کریم! آپ فرما دیجئے اپنی بیویوں کو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش (و آسائش) کی خواہاں ہو لے تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں اور پھر تمہیں رخصت کر دوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ۔“

لے آیت طیبہ میں زینتھا سے مراد دنیوی زندگی کی خوشحالی، راحت اور آرائش و آسائش ہے۔ اور فعال اصل میں بلند جگہ پر موجود آدمی کا چنچل جگہ والے آدمی کو اپنی طرف بلانا ہے کہ اوپر آ جاؤ۔ پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ لفظ تمام بیبیوں کے لیے یکساں استعمال ہونے لگا۔ اس کا معنی ہے میری طرف آ جاؤ۔ یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ مطالبہ طلاق کے لیے آ جاؤ۔ تاکہ میں تمہیں مال و متاع دے کر طلاق دے دوں۔ اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ کوئی ضرر پہنچائے بغیر تمہیں رخصت کر دوں۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ تُرِيدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدّٰرَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِمُحْسِنٰتٍ
مِّنْكُمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۷

”اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جہنم

میں سے نیکو کار بیبیوں کا عظیم اجر۔“

۱۔ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مراتب قرب اور اس کی رضا اور اس کے رسول کا قرب چاہتی ہو اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا ارادہ رکھتی ہو، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی رضا مندی اور در آخرت کی راحتوں اور نعمتوں کا ارادہ کیا تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکو کاروں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہی مسند ہیں اور احسان کا معنی ہے اَنْ تُعْطِيَ وَبِكَ بِالْخُصُودِ كَمَا نَكَ فَرَاہ (تیرا اپنے رب کی ایسے حضور قلب کے ساتھ عبادت کرنا گویا تو اسے دیکھ رہا ہے احسان کہلاتا ہے)۔ علامہ بنوئی نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کی نوازدواج مطہرات تھیں پانچ قریش میں سے تھیں۔ ان کے اسماء یہ ہیں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام سلمہ بنت امیہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت سودہ بنت زید رضی اللہ عنہا۔ اور چار دوسرے قبائل سے تھیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث البہلیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت صفیہ بنت جبر بنی اخطلب النخعیہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث امہ مطلقہ رضی اللہ عنہا۔ جب یہ آیت تحریر نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس اختیار کا آغاز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کیا کیونکہ یہی آپ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ محترمہ تھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں قرآن حکم پڑھ کر سنایا اور پھر طلاق چاہنے یا نہ چاہنے کا اختیار انہیں سونپ دیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ اور دار آخرت کو اختیار فرمایا اور آپ ﷺ کے چہرہ مقدس پر فرحت و مسرت کے آثار ملاحظہ کیے تو پھر دیگر ازواج نے بھی آپ ﷺ ہی کی اتباع و پیروی کی۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ان ازواج مطہرات نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی قدر دانی فرمائی اور آپ ﷺ کو انہی پر اکتفا کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا لَا يَحِلُّ لَكَ الْبَسَاءُ وَهِيَ بَعْدُ (ان کے بعد مزید عورتوں سے نکاح آپ کے لیے جائز نہیں) (1)۔ مسلم، احمد اور نسائی نے ابو الزہیر کی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کی مگر آپ کو اجازت نہ دی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہی مگر انہیں بھی اجازت نہ دی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد دونوں کو اذن دیا گیا۔ جب دونوں اندر حاضر خدمت ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ کو غمزدہ حالت میں خاموش بیٹھے ہوئے پایا کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بھی آپ کے ارد گرد بیٹھی ہوئی ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال کیا کہ ضرور کوئی ایسی بات کہوں جو حضور نبی کریم ﷺ کو بھادے۔ چنانچہ اسی خیال سے آپ نے کہا اگر آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دو بکیں کہ اس نے مجھ سے اپنے نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا ہے تو میں اٹھ کر اس کی گردن توڑ دوں۔ پس یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، میرے گرد تو بیٹھ کر یہ اپنے اپنے نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ پس یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان کی گردن پر شدید ضرب لگائیں اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن پر ضرب لگانے کے لیے اٹھے اور دونوں یہ کہنے لگے کہ کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسی شے کا مطالبہ نہ کرنا جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو۔ پھر

آپ ﷺ نے ان سے ایک مہینہ یعنی انتیس دن تک علیحدگی اختیار فرمائی اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ راوی کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ابتدا کی اور فرمایا اسے عائشہ! میں چاہتا ہوں کہ ایک بات تیرے سامنے رکھوں اور اس کے بارے میری پسند یہ ہے کہ تو اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر اس کے جواب میں جلدی نہ کرے۔ تو انہوں نے عرض کی وہ کیا ہے یا رسول اللہ! ﷺ تو پھر آپ ﷺ نے ان کے سامنے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔ تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے بارے اپنے والدین سے مشورہ کروں گی (ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول معظم اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ ساتھ ہی میری آپ سے یہ بھی عرض ہے کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو بھی اس سے مطلع نہ کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھ سے جو عورت بھی پوچھے گی میں اسے یہ بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فتنہ پرداز بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اس نے تو مجھے مبشر اور معلم بنا کر بھیجا ہے (1)۔ اور صحیح میں زہری کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قسم کھائی کہ آپ ایک مہینہ تک اپنی ازواج کے پاس نہیں جائیں گے۔ زہری کہتے ہیں کہ عروہ نے مجھے ابو اسامینہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے آغاز کیا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک آپ نے قسم کھائی ہے کہ آپ ایک مہینہ تک ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ آپ کو انتیس دن ہو چکے ہیں میں انہیں شکر کرتی رہی ہوں آپ ﷺ نے فرمایا مہینہ انتیس دن کا ہی ہے (2)۔

فائدہ: علامہ ابنوٹی نے کہا ہے کہ علماء کے مابین اس حیار کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا کہ صرف ازواج کے اپنے آپ کو اختیار کرنے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی (اور مزید طلاق دینے کی ضرورت نہ ہوتی) یا ایسا نہیں تھا (بلکہ اس سے فقہاء عورتوں کی پسند کا اظہار مقصود تھا اور طلاق کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی تھا) تو اس بارے میں حسن، قتادہ اور اکثر اہل علم کا موقف یہ ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں صرف طلاق کے مطالبہ کا اختیار سونپا۔ پس اگر وہ دنیا کو اختیار کر لیتیں تو آپ انہیں جدا کر دیتے۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **فَتَعَالَىٰ اَصْحَابُكَ وَاسْتَوْحِلْ**۔ اور ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا لہذا اگر وہ اپنے آپ کو اختیار کر لیتیں تو طلاق ہو جاتی۔ (3)

مسئلہ: جب کوئی مرد اپنی عورت سے یہ کہے اختاری (تجھے اپنے بارے میں اختیار ہے تو اپنے آپ وہ اختیار کر لے) اور اس سے نیت یہ کرتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو طلاق دے لے تو جب تک وہ عورت اسی مجلس میں ہے اس کے لیے اپنے آپ کو طلاق دینا جائز ہے۔ اور جب وہ اس مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی یا کسی دوسرے کام میں شروع ہو جائے گی تو طلاق دینے کا اختیار اس کے پاس باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس طرح خاوند عورت کو فحل مٹھی عید کا مالک بنا دیتا ہے اور تمام تعلیمات مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہیں۔ جیسا کہ کتب کی صورت میں جب ایجاب ہو جائے تو مجلس میں ہی قبول کا اختیار باقی ہوتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ عورت کے لیے مجلس کا خیار اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ وہ آدمی جو اپنی زوجہ کو اختیار دیتا ہے اس کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ عورت کا اختیار اس مجلس تک اس کے پاس رہتا ہے۔ پس اگر وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے پاس اختیار باقی نہیں رہے گا۔ ہم نے یہ قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ لیکن ان کی اسانید میں کچھ کلام ہے۔ علاوہ ازیں جابر بن عبد اللہ، عطاء، مجاہد،

معنی بخوبی، مالک، سفیان الثوری، اور ائاعی، شافعی، ابو ثور اور اصحاب راوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی یہی کیا ہے اور دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ عورت کا اختیار مجلس میں اور اس کے بعد بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ یہ قول زہری قتادہ، ابو سعیدہ اور ابن نصر رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے اور ہمارا نظریہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تو (جواب دینے میں) جلدی نہ کرنا یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ لے لے (1)۔ اور صاحب مغنی نے صحابہ کرام میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن حاتم نے ابن منذر کے قول کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مضبوط اور پختہ نہیں ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ سے وہ قول بھی مروی ہے جو صحابہ کرام کی جماعت کے قول سے موافق ہے۔ جیسا کہ امام محمدؒ نے بلاغات میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے پاس حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے اس آدمی کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے جو اپنی بیوی کو اختیار دیتا ہے کہ جب تک وہ عورت اسی مجلس خیار میں رہے گی تو اس کے پاس وہ اختیار رہے گا۔ اور جب وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی تو پھر اس کے لیے اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی اس کے خلاف قول مروی نہیں۔ پس اس مسئلہ پر یہ اجماع سکون ہو۔ اور ان کا یہ قول کہ ان کی اسناد میں کلام ہے اس کے لیے قطعاً نقصان دہ نہیں کیونکہ ساری امت نے اسے قبول کر لیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عبد الرزاق نے حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس سند جدید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد ”لا تمعلجی“ ((جواب میں) جلدی نہ کرنا) سے استدلال کرنا ضعیف ہے۔ کیونکہ آیت میں طلاق کا اختیار دینے اور طلاق تفویض کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ فَتَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُقَابِلٌ لِّمَا أُخْرِجُوا مِنْهَا حَا جِينَ۔

مسئلہ: مرد کے قول اختاری (تو اپنے کو اختیار کر لے) میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مرد نے عورت کو اپنے نفس کے بارے میں اختیار کیا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کام کے کرنے کا اختیار دیا ہو (اس لیے اختیار دیتے وقت تفویض طلاق کی نیت کرنا ضروری ہے)۔

مسئلہ: جب خاوند نے کہا ”اختاری“ اور عورت نے جواب میں کہا ”اِخْتَارْتُ نَفْسِي“ (میں نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا ہے) تو اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ یہ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہی موقف امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ کیونکہ خاوند کا قول اختاری اس کے قول طَلَّقْتُ نَفْسِي (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) کے قائم مقام ہے۔ اور عورت کا قول اِخْتَارْتُ نَفْسِي اس کے قول ”طَلَّقْتُ نَفْسِي“ (میں نے اپنے آپ کو طلاق دے لی) کے قائم مقام ہے۔ اور اس سے بالا جماع طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ اور کتاب اللہ کی آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ طلاق کے بعد رجوع ہو سکتا ہے مگر جب طلاقیں تین ہو جائیں تو پھر رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ مذکورہ صورت میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور مدخول بہا عورت کے بارے میں امام مالکؒ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اور غیر مدخول بہا عورت کا ایک طلاق واقع ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو وہ قابل قبول ہوگا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کا سبب یہ ہے کہ عورت کا اختیار یہ تقاضا کرتا

ہے کہ وہ اس کے لیے اس طرح ثابت ہو کہ اب مرد کو اس پر اس کی رضا مندی کے بغیر کوئی اختیار نہ ہو ورنہ اسے اختیار سونپے جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تو مرد اس کی طرف ہر حال میں رجوع کر سکتا ہے چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اختصاص تب ہی ثابت ہو سکتا ہے جبکہ واقع ہونے والی طلاق بائن ہو۔ اور کتاب اللہ سے یہ ثابت کہ تین طلاقیں کے سوا ہر طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ اس لیے اس سے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور امام اعظم الاصفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہی ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عورت کے ساتھ اختیار کا اختصاص فقط طلاق بائن کی صورت میں ثابت ہوتا ہے اور بیونہ بالا جماع ایک طلاق سے واقع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ طلاق بالمال اور طلاق تمل اللہ بخوں ہے۔ لہذا مقصود حاصل ہو جانے کی وجہ سے مسئلہ کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ ایک طلاق سے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اسے تین پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اس سے طلاق بائن واقع ہوگی (1) جیسا کہ ان دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی۔ پس ان دونوں سے روایت مختلف ہوگئی (اس لیے دونوں روایات قابل استدلال نہ رہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ بیونہ کی دو قسمیں ہیں بیونہ غلیظہ اور بیونہ خفیفہ۔ پس اگر مرد نے اختیار تفویض کر کے وقت بیونہ غلیظہ کی نیت کی تو اس سے بالضرورت تین طلاقیں واقع ہوگی۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مرد کا قول "اختاری" بیونہ پر دلالت بھی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ قول تو خلاصہ طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کیے جانے کا فائدہ دیتا ہے۔ اور بیونہ تو اس سے اقتضاء ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ قول بیونہ عامہ کو شامل نہیں بلکہ بقدر ضرورت بیونہ کو شامل ہے بخلاف انت بائن وغیرہ اقوال کے۔ لہذا خاوند کے قول اختاری کے ساتھ تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی اگرچہ اس نے تین کی نیت بھی کر لی۔ کیونکہ نیت پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب لفظ بھی اس کا احتمال رکھتا ہو۔ اور خاوند کے قول انت بائن کے ساتھ تین واقع ہو جائیں گی اگر اس نے تین کی نیت کی۔ ہاں اگر وہ الفاظ یہ استعمال کرتا ہے اختاری اختاری اختاری تو چونکہ اس صورت میں الفاظ کا متعدد ہونا مقصود کے متعدد ہونے پر دلالت کرتا ہے (اس لیے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی)۔

مسئلہ: اگر خاوند نے اپنی زوجہ سے کہا "اختاری" تو عورت نے جواب میں کہا "اخضرث ذؤجی" (میں نے اپنے خاوند کو اختیار کیا) تو جہور کے نزدیک اس سے کوئی شے بھی واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ خاوند نے اسے طلاق نہیں دی بلکہ صرف طلاق کا اختیار اس کے سپرد کیا ہے اور اس نے طلاق اختیار نہیں کی بلکہ اس نے نکاح کے باقی رکھنے کو اختیار کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہو جائے گی گویا کہ آپ نے لفظ اختیار کو ہی اطلاق قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حام نے کہا ہے کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول (جہور کے موقف کی تائید کرتا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اختیار دیا تو ہم نے آپ ﷺ کو ہی اختیار کر لیا اور آپ ﷺ نے ہمارے اختیار کو کچھ بھی شمار نہیں کیا۔ اسے صحاح ستہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور صحیحین کے الفاظ "فلما بعدہ" کوئی شے واقع نہ ہونے کا فائدہ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواج کو اختیار دینا طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ یہ صرف طلاق کے مطالبے کا اختیار تھا۔ اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول جہور کے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ: خاوند یا عورت کے کلام میں لفظ نفس مذکور ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے کہا، اختوت تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ لفظ الفاظ طلاق میں سے نہیں ہے۔ اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سے کوئی شئی بھی واقع نہ ہو۔ کیونکہ تسلیک (مالک بن ابی ہریرہ) (مالک بن انس) کی ملکیت کی فرع ہے (یعنی دوسرے کو مالک بنانے سے قبل خود اس شے کا مالک ہونا ضروری ہے) اور خاوند بذات خود اس لفظ اختیار کے ساتھ عورت پر طلاق واقع کرنے کا مالک نہیں (تو پھر وہ عورت کو اس لفظ کے ساتھ طلاق دینے کا کیسے مالک بنا سکتا ہے)۔ لیکن ہم نے قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ اگر عورت نے اختیار تفویض کیے جانے کے بعد اپنے آپ کو اختیار کر لیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اجماع اسی صورت میں ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس صراحۃً موجود ہو۔ کیونکہ مرد کا قول اختاری بہم ہے اور یہ اپنے نفس کو اختیار کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کام میں تصرف کرنے کے اختیار کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اور بہم کی تفسیر بہم کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ اور ابہام کی صورت میں کسی شے کی تعیین ممکن نہیں ہوتی۔ اور جب مرد کے قول اختاری کے ساتھ طلاق کا واقع ہونا خلاف قیاس ہے تو پھر اس حکم کا انحصار صرف اسی حالت پر ہوگا جس پر اجماع منعقد ہوا ہے۔ صرف نیت پر اکتفا نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اس کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی موجود ہو جب تک کہ کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس موجود نہ ہو۔ کیونکہ اس حالت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہے کہ اگر خاوند نے اختاری کہہ کر وقوع طلاق کی نیت کی اور نیت کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی پایا جائے تو اس صورت میں نیت پر ہی اکتفا کر لیا جائے گا جبکہ دونوں اس مسئلہ پر متفق ہوں (تو پھر اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) اور امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ ایسی نیت جس کا لفظ احتمال نہ رکھتا ہو لغو ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا ورنہ تو صرف نیت کے ساتھ ایسے لفظ کے ساتھ بھی طلاق واقع ہو جائے گی جو قطعاً اس کا احتمال نہ رکھتا ہو مثلاً مرد عورت کو کہے اسفسی (مجھے پانی پلاؤ) (اس سے اگر وہ طلاق کی نیت کر لے تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں) (لفظ اختیار کے ساتھ بھی ہیئت طلاق واقع نہیں ہو سکتی) مگر ہم نے اس سے طلاق واقع ہونے پر اجماع ہونے کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کا یہ قول کہ لفظ کے احتمال کے بغیر نیت لغو ہوتی ہے۔ یہ قول اپنے محل میں ذکر نہیں ہوا کیونکہ الفاظ اختاری اور اختوت لفظ نفس ذکر کیے بغیر بھی عورت طلاق کا اختیار سوچنے جانے کا احتمال رکھتے ہیں اور عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اپنے نفس کو اختیار کر لے اور چاہے تو کسی اور کام کو۔ اگرچہ اس میں کوئی صراحۃً مذکور نہیں اسی لیے اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے جواباً کہا اختوت نفسی تو اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بشرطیکہ خاوند نے طلاق کی نیت کی کیونکہ اس صورت میں عورت کا کلام مرد کے کلام کی تفسیر ہے اور مرد نے جو نیت کی ہے اس کا کلام اس کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد نے کہا اختاری اختیار اور عورت نے جواباً کہا اختوت۔ تو اس صورت میں بھی طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ لفظ اختیار کے آخر میں تاخیر اور منفرد ہونے کی خبر دیتی ہے اور عورت کا اپنے نفس کو اختیار کرنا بھی حتمی ہوتا ہے۔ اور کبھی متعدد ہوتا ہے پس اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہو گیا (یعنی اگر عورت اپنے نفس کو ایک طلاق کے ساتھ اختیار کرے تو اس میں اتحاد پایا جاتا ہے اور اگر وہ تین طلاقیں کے ساتھ اپنے آپ کو اختیار کرے تو اس میں تعدد پایا جاتا ہے تو اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہے۔ گویا اس نے یہ کہا ہے کہ تو اپنے نفس کو اختیار کر۔ اس لیے طلاق واقع ہو جائے گی) اور اگر خاوند نے کہا اختاری اور عورت نے کہا انا اختار نفسی (یعنی ماضی کی بجائے اس نے مضارع کا صیغہ استعمال

کیا) تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ قیاس تو یہ تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی (میں اپنے نفس کو اختیار کر لوں گی) کیونکہ یہ تو صرف مستقبل میں اختیار کرنے کا وعدہ ہے یا پھر یہ کام اس وعدہ کا احتمال رکھتا ہے تو پس یہ ایسے ہی ہے جبکہ مرد کہے طَلَّقَیْ نَفْسِکَ (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) اور وہ جواب میں کہہ دے اَنَا اُطْلِقُ نَفْسِیْ (میں اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی)۔ صاحب ہدایہ نے دلیل استحسان کے طور پر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے لَا بَلَّ اُخْتَارَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ (نہیں بلکہ میں تو اللہ اور اس کے رسول کرم کو اختیار کرتی ہوں)۔ تو آپ نے اس کلام میں مینہ مضارِع ہی استعمال کیا ہے (اور رسول اللہ ﷺ نے آپ کے جواب کو صحیح تسلیم فرمایا۔ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ تو پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے تو انہیں طلاق دینے کا اختیار نہیں دیا تھا بلکہ صرف طلب طلاق کا اختیار سونپا تھا۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس اختیار کے جواب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول تسلیم کر لیا تھا چاہے اختیار کا تعلق طلاق دینے کے ساتھ تھا یا طلاق کے مطالبہ کے ساتھ۔ اور اس لیے بھی کہ آپ کا قول اَنَا اُخْتَارَ نَفْسِیْ موجودہ حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے اور وہ حالت اپنے نفس کو اختیار کرنے کی حالت ہے جبکہ اس کے برعکس عورت کا قول اُطْلِقُ نَفْسِیْ موجودہ حالت کی حکایت نہیں بن سکتا (اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا) واللہ اعلم

يُنِسَاءَ النَّبِيِّ مِّنْ يَّاتٍ مِّنْكَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ يُضَعِّفُ لَهَا الْعَذَابَ
ضَعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٥٠﴾

”اے نبی کریم کی بیوی! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی ہے تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔ اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔“

۱۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہاں فاحشہ سے مراد فامانی اور بد اخلاقی ہے۔ (۱)

۲۔ ابن کثیر اور ابن عمر نے ضَعَّفَ صیغہ جمع متکلم باب تفعیل سے پڑھا ہے اور الْعَذَابُ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ صیغہ واحد مذکر غائب مجہول حالت میں پڑھا ہے اور الْعَذَابُ کو نائب الفاعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ ابو جعفر اور ابو عمرو نے عین لکھ کر مشدود بغیر الف کے باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقیوں نے عین لکھ کر مخفف اور باب افعال سے پڑھا ہے۔ لفظ ضعف ان اضافی الفاظ میں سے ہے جن کا سمجھنا دوسری شے کے کھینچنے پر موقوف ہوتا ہے۔ جیسا کہ نصف (اور کل میں تضایف ہے) اور لفظ زوج بھی انہی الفاظ میں سے ہے (کہ مرد کا جوڑا عورت اور عورت کا جوڑا مرد ہے)۔ ضعف سے مراد وہ شے جو دو مساوی مقداروں سے مرکب ہو۔ اَضْعَفْتُ الشَّيْءَ کا معنی ہے میں نے فلاں شے کے ساتھ اس کی مثل شے ملا دی۔ یہی معنی ضَعَفْتُهُ اور ضَاعَفْتُهُ کا بھی ہے۔ اور ضَعْفَيْنِ سے مراد ایسی دو ہم مثل چیزیں ہیں جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ملا دیا جائے جیسے زوجین کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے سے ملا ہوتا ہے اور اسے جوڑا بناتا ہے۔ اور کبھی دو ہم مثل مقداروں کے مجموعہ پر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کفار کے شعبین کے قول کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّكَ اَتَيْتَهُمْ عَمَّا اَبَا ضَعْفًا مِّنَ الظَّالِمِ۔ یعنی جس عذاب میں

ہم ہیں اس سے دو گنا عذاب انہیں دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

جب ضعف کو کسی عدد کی طرف مضاف کیا جائے تو اس سے مراد اسی عدد کا دو چند ہوتا ہے پس ضعف عشرۃ سے مراد بیس ضعف مائتۃ سے مراد دو سو اور ضعف الواحد سے مراد دو ہے۔ اور جب ضعفین کو واحد کی طرف مضاف کیا جائے تو وہ اسے تین بنا دیتا ہے (یعنی ایک دوہم مثل عددوں سے مل کر تین ہو جاتا ہے)۔ قاموس میں ہے کہ ضعف الشیء سے مراد اس کی مثل دوسرا ہے اور ضعف الشیء سے مراد اس کی مثل دو اور ہیں یا ضعف سے مراد اس شے کی وہ مثل ہے جو اس پر زائد ہو اور جہاں تک زائد ہو سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے لک ضعفۃ تو اس سے عرب لوگ مراد یہ لیتے ہیں کہ تیرے لیے اس کا دو گنا، تین گنا وغیرہ ہے کیونکہ اس میں زیادتی غیر محصور ہے۔ علام جزیری نے انھما میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوالدحداد کی حدیث میں بوضف مذکور ہے اس سے مراد دو گنا (دو مثل) ہے۔ اور بطور استنباط یہ کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے اِنْ اَعْطِیْتَنِیْ دِرْهَمًا فَلْکَ ضَعْفٌ (اگر تو مجھے ایک درہم دے گا تو میں تجھے دو درہم دوں گا) اور کبھی کہتے ہیں فَلْکَ ضَعْفًا اور کہا گیا ہے ضعف الشیء سے مراد اس کی ایک مثل ہے اور ضعفہ سے مراد اس کی دو مثلیں ہیں۔ اور علامہ زہری نے کہا ہے کہ کلام عرب میں لفظ یا ضعف سے مراد کسی شے کی مثل ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ جتنی بھی زائد ہو جائے وہ دو مثل تک محدود نہیں رہتی۔ لہذا کم سے کم ضعف ایک مثل ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے۔ "يُضَعَّفُ صَلَوةُ الْجَمَاعَةِ عَلَى صَلَوةِ الْفَذِّ خُمْسًا وَعَشْرِينَ ذَرَجَةً" (جاماعت ادا کی جانے والی نماز کا ثواب منفرد کی نماز سے پچیس درجہ زیادہ دیا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَضْعِفُ لَكَ اَصْعَاقًا كَثِيرَةً۔ یعنی اس کے لیے بہت زیادہ گناؤں کا دیا جائے گا۔ یہ کہا جاتا ہے ضَعْفُ الشَّيْءِ وَاضْعَفْتُهُ وَضَاعَفْتُهُ۔ جب تو کسی چیز میں اضافہ کر دے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ ضَعَفٌ اور ضَاعَفٌ دو لغتیں ہیں، یعنی باب تفعیل اور باب مفاعلہ جیسے بَعَدَ اور بَاعَدَ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو وادور ابو عبید نے کہا ہے کہ جب تو کسی شے کو دو مثل کر دے تو اس کے لیے کہے گا ضَعَفْتُهُ (یعنی اس کے لیے باب تفعیل استعمال ہوگا) اور جب تو کسی شے کو کئی گنا کر دے تو پھر اسے ضَاعَفْتُهُ سے تعبیر کیا جائے گا (۱) (یعنی اس کے لیے باب مفاعلہ استعمال ہوگا)۔ چونکہ یہاں آیت کریمہ میں لفظ ضعفین مذکور ہے اس لیے ابو عمرو نے قرأت یضاعف کی بجائے یضعف (باب تفعیل سے) کی ہے۔ اور ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ ضعفین مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ تفعیل اور مضاعفۃ دونوں تعبیر کے معنی کو متضمن ہیں یا مفعول مطلق (معنی مصدریہ) کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ ان مثالوں کی مثل ہے ضربتہ خمسین یا ضربتہ سوطین۔ یا پھر العذاب سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور امہات المؤمنین کے لیے عذاب دو چند کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وافر مقدار میں نعمتیں ہونے کے سبب ان سے گناہ کا صادر ہونا زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ اسی حکمت کی بناء پر آزاد آدمی کے لیے سزا کی غلامی کی حد سے دو گنا مقرر کی گئی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ امہات المؤمنین سے گناہ کے صادر ہونے کے سبب حضور نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کی حرمت و انداز ہوتی ہے۔ اور یہ عمل انتہائی ناپسندیدہ اور بہت قبیح ہے۔

۱۔ اور عذاب کو دو چند کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مقررہ ہے۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْ لَدُنِّهِ وَرَسُوْلِهِ وَتَعَسَّلَ صَالِحًا تَوْتِيَهَا اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۚ

أَعْتَدْنَا لَهُمْ رِزْقًا كَرِيمًا ۝

”اور جو تم میں سے فرمانبردار بنی رہی اللہ اور اس کے رسول کی اور نیک عمل کرتی رہی ۱ تو ہم اس کو اس کا اجر بھی دو چاندیں گے ۲ اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے ۳“

۱۔ یَقْنُثُ قوت سے مانگو ہے جس کا معنی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ یعقوب نے مَنْ قَاتَبَ اور یَقْنُثُ قرأت کی ہے اور انہوں نے ان دونوں میں معنی کا اعتبار کیا ہے۔ اور باقیوں نے انہیں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لفظ مَنْ کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی جو اطاعت و فرمانبرداری پر قائم رہی۔ جزہ اور کسائی نے لفظ مَنْ پر محمول کرتے ہوئے یَعْمَلُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے یَعْمَلُ پڑھا ہے۔ اور ضلیحاً مصدریت (مفعول مطلق) یا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۲۔ جو ہم اس کو (دوسری ازواج کی نسبت) اس کا اجر بھی دو چند دیں گے۔ ایک اجر اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے کا اور ایک اجر اس کا کہ انہوں نے قناعت اور حسن معاشرت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رضا کو طلب کیا۔ مقابلے نہ کہا ہے کہ ہر ایک نیکی کی جگہ دس نیکیاں عطا ہوں گی۔ جزہ اور کسائی نے اسے یَوْفُئُہَا یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی طرف راجع ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ قرأت کی ہے۔

۳۔ اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے۔ رزق کریم سے مراد طیل القدر اور عایشان رزق ہے۔ اور اس سے مراد وہ جنت ہے جو اہل اجر پر زائد ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی متابعت میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جو کچھ آپ ﷺ کو عطا فرمایا جائے گا۔

يُنْسَاءُ النَّبِيُّ لِسَبْتٍ كَأَخٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنْ تَقَبَّلْتُمْ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

”اے نبی کی ازواج (مطہرات) تم نہیں ہو دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند ۱ اگر تم پر بیزارگاری اختیار کرو ۲ پس ایسی نرمی سے بات نہ کرو کہ طمع کرنے لگے وہ (بے حیا) جس کے دل میں روگ ہے ۳ اور گفتگو کرو تو باوقار انداز سے کرو ۴“

۱۔ یعنی تم میں سے کوئی ایک دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند نہیں ہے۔ یا معنی ہے عورتوں کی جماعت میں سے کوئی ایک جماعت بھی نہیں پائی جاتی جو فضیلت میں تمہاری مثل ہو۔ جملہ لَسْتُنَّ مذکورہ مضمون کی تعلیل ہے۔ اخذ اصل میں وَخَذَ ہے اور یہ واحد کے معنی میں ہے۔ پھر اسے نفی عام کے لیے وضع کیا گیا ہے جس میں مذکور مونث اور واحد و کثیر سب برابر ہیں (یعنی یہ ان تمام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے میرے نزدیک تمہاری قدر و منزلت دوسری نیک اور صالح عورتوں کی قدر و منزلت کی مثل نہیں ہے بلکہ تم تو میرے نزدیک ان کی نسبت انتہائی زیادہ محترم و محترم ہو اور میری بارگاہ میں تمہارا اجر و ثواب انتہائی عظیم ہے۔ (۱)

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ازواج مطہرات تمام عورتوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد گرامی اس کے

معارض آتا ہے جو حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے بارے ہے۔ اور وہ یہ ہے إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰی ذَاكُلَکَ عَلٰی نِسَاۃِ الْعٰلَمِیْنَ (اے مریم) بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک فرما دیا ہے اور تجھے عالین کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمادی ہے) تو اگر اس کے بارے یہ کہا جائے کہ اس ارشاد میں نِسَاۃِ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد ان کے اپنے زمانے کی عورتیں ہیں (لہذا معارضت ثابت نہیں ہوتی) تو اس کا انکار اس روایت سے لازم آتا ہے جو امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لیے عالین کی عورتوں میں سے یہ کافی ہیں، یعنی مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور فروعن کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہن (1)۔ (اس کا مقہوم یہ ہے کہ ان عورتوں کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے)۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قول باری تعالیٰ تَشْتَقِیْ کَاحَۃً مِّنَ النِّسَاۃِ میں یہ کہا جائے کہ چونکہ تم حضور سید البشر ﷺ کی ازواج مطہرات ہو اس لیے کوئی غیر عورت اس فضیلت و شرف میں تمہارے ساتھ شریک نہیں۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ عالین کی عورتوں میں سب سے افضل حضرت فاطمہ الزہراء بنت رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے سب سے افضل حضرت خدیجہ الکبریٰ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ پھر حضرت مریم بنت عمران، حضرت آسیہ زوجہ فروعن اور حبیہ رسول اللہ ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہا عیضاً افضل ہیں۔

یہ تین نے صحیحین میں، احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں میں سے کثیر افراد کامل اور عورتوں میں سے حضرت آسیہ زوجہ فروعن اور حضرت مریم بنت عمران کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ صدیقہ کو دوسری عورتوں پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو دوسرے کھانے پر ہے (2)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد تھیں (3)۔ اور کریب کی روایت میں ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے وقت کعب نے آسمان اور زمین کی طرف اشارہ بھی کیا تھا (یعنی یہ دونوں زمین و آسمان کی عورتوں میں سے بہتر عورتیں تھیں)۔ صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ! کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو تمام جنتی عورتوں کی سردار ہو جائے یا فرمایا کہ تو تمام ام المان کی عورتوں کی سردار ہو جائے (4)۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فرشتہ ہے جو اس رات سے قبل کبھی بھی زمین پر نہیں اترا۔ اس نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے آکر سلام عرض کرے اور مجھے آکر یہ خوشخبری سنائے کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔ اور حسن و حسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں (5)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

اگر تم اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول کریم ﷺ کی رضامندی کی مخالفت کرنے سے پرہیز اختیار کرو۔ یہ شرط 7 ا سے مستثنیٰ ہے کیونکہ کلام سابق اس کی جزاء پر دلالت کرتی ہے (لہذا دوبارہ ذکر کی ضرورت نہیں)۔

یہ فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب تقویٰ اور پرہیزگاری کی شرط کے ساتھ تمہاری فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہو چکی ہے تو پھر ضروری ہے کہ

2۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 5 (وزارت تعلیم)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 930 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 488 (وزارت تعلیم)

5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 219 (وزارت تعلیم)

تم سے کوئی ایسی شے ظاہر نہ ہو جو تلوئی کے منافی ہو مثلاً مردوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا وغیرہ۔ یعنی اگر کوئی عورت اجنبی مرد سے نرم لہجہ میں منکلم ہوگی تو یہ اسے حریص اور لالچی بنادے گی۔ علامہ جزری نے انتہای میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی مرد کسی اجنبی اور غیر عورت کے ساتھ ایسے دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کرے کہ وہ عورت کو اپنا حریص بنادے (اور اس کا میلان اس کی طرف ہونے لگے) اور خضوع کا معنی اطاعت و فرمانبرداری ہے (1)۔ اور انتہای میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک آدمی کا گزرا ایک مرد اور عورت کے پاس سے ہوا، اس حال میں کہ وہ دونوں آپس میں دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ پس اس آدمی نے اسے اتنی شدید ضرب لگائی کہ وہ آدمی زخمی ہو گیا۔ لیکن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے جرح قرار دیا (2)۔ (یعنی اسے کوئی سزا وغیرہ نہ دی) کیونکہ وہ ایسے نرم اور دھیمے انداز میں گفتگو میں مصروف تھے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا میلان دوسرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورتیں اپنے خاندانوں کی اجازت کے بغیر (غیر مردوں سے) باتیں کریں۔ دارقطنی نے الافراد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی نماز کے دوران یا اپنی زوجہ اور باندیوں کے سوا دوسری عورتوں کے سامنے انگڑائی لے۔

یٰ فَيُطْمَعُ نَحْمٰی کے جواب میں فَا کے بعد انی مقدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَّرَضٌ سے مراد ایسا آدمی ہے جس میں نفاق کا شائبہ ہے۔ کیونکہ مومن کامل تو وہ ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے رب کی بران دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ ایسی چیزوں میں میلان و رغبت نہیں رکھتا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ آدمی جس کا ایمان ضعیف اور کمزور ہو اور اس میں نفاق کا شائبہ پایا جائے تو وہ ان چیزوں کی اشتہاء اور چاہت رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام قرار دی ہیں۔ غیر متواتر قرأت میں فَيُطْمَعُ مجروم پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف محل تھی پر ہے اور وہ عورتوں کو نرم لہجہ میں گفتگو کرنے سے روکنے کے بعد ایسے آدمی کو ان کی طرف میلان سے روکتا ہے جن کے دل میں روگ ہے۔

مسئلہ: عورت کے لیے یہ مستحب ہے کہ جب وہ اجنبی مردوں سے گفتگو کرنے لگے تو لہجہ درشت اور سخت رکھے تاکہ کسی قسم کی رغبت اور میلان کا اظہار نہ ہو۔

یہ اور ایسی گفتگو کرو جو اچھی اور باوقار ہو اور ہر قسم کے شک و شبہ سے اجتنابی دور ہو۔

وَقَدْزَنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ وَلَا تَنْبَهِمُ الْجَاهِلِيَّةَ الْاُولٰٓئِیْ وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اَتَيْنَ
الرَّكُوْعَةَ وَ اطْعَنَ اللّٰهَ وَ سَمُوْهُ ۚ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ
اَهْلَ الْبَيْتِ وَ یُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ۝۱۱

”اور ظہری رہو گھر میں۔ اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو۔ جیسے سابق دور جاہلیت میں رواج تھا جسے نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی۔ اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا کہ تم سے دور کر دے پلیدی کو اے نبی کے گھر والو! اور تم کو پوری طرح پاک و صاف کر دے۔“

۱۔ نافع اور عاصم نے قُرْآن کو قاف مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قُرْ یَقْرُ سے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں بین مکہ مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے۔ اس کی اصل أَفْزَرْنَ ہے۔ پہلی راہ کو حذف کر دیا گیا اور اس کی حرکت قاف کی طرف نقل کر دی گئی اور پھر مزہ وصل کی ضرورت نہ ہونے کے سبب اسے گرا دیا اور باقیوں نے قاف کو مکسور پڑھا ہے، یعنی یہ قُرْ یَقْرُ قُرْا اُسے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں بین مکہ مفتوح اور مضارع میں مکسور ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اسی طرح دونوں کی تعلیل بھی ایک ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور مصیبت کے قصد سے باہر نہ نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ وَلَا تَبْتَغُوا دُولًا وَلَا مَنَازِلَ کرتا ہے۔

۲۔ اور اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو۔ یہاں عطف تقریری ہے اور معنوی طور پر تاکید کے لیے ہے۔ اس آیت طیبہ میں مطلقاً گھر سے نکلنے سے نہیں روکا گیا کہ اگرچہ وہ نماز، حج یا کسی انسانی حاجت کے لیے ہی ہو۔ جیسا کہ ردوافض نے عثمان کر دیا جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کے سبب حبیبہ الرسول ﷺ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہا پر طعن و اعتراض کیا۔ کہ آپ اپنے گھر سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئیں اور وہاں سے بصرہ چلی گئیں جہاں جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ آپ اپنے گھر سے حج کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئیں اور آپ کے مدینہ طیبہ سے خروج کے بعد وہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اور اہل مصر نے مدینہ طیبہ میں ایسا فتنہ برپا کر دیا۔ جس کے سبب حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی وہاں سے نکل پڑے اور مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جا ملے۔ وہاں ان دونوں نے آپ کو لوگوں کے مابین صلح کرانے اور فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کرنے کے لیے خروج کا مشورہ دیا جب آپ نے اس خروج سے انکار فرمایا تو انہوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا لَا تَبْتَغُوا دُولًا وَلَا مَنَازِلَ إِلَّا مَنَازِلَ مَعْرُوفَةً أَوْ مَنَازِلَ مَعْرُوفَةً أَوْ مَنَازِلَ مَعْرُوفَةً۔ چنانچہ آپ بصرہ کی طرف تشریف لے گئیں اور وہاں آپ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے مابین صلح بھی طے پاگئی مگر پھر عبد اللہ بن سبا یہودی جو منافق تھا اور اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں شمار کرتا تھا۔ اس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی یہاں تک کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہم نے یہ واقعہ اپنی کتاب السیف المسلول میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ تیسرے خروج سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔ اور یہاں مراد مردوں کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرنا اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا ہے۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ تیسرے خروج کا معنی ہے ملک و ملک کر تکبر سے چلنا (۱)۔ علامہ بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی معنی بیان کیا ہے کہ تم فخر و مباہات سے ملک و ملک کر نہ چلو۔ (۲)

۳۔ سابق دور جاہلیت میں رواج عام تھا۔ ترکیب کلام میں تبرج مصدريت (مفعول مطلق) کی بنا پر منصوب ہے۔ الجاہلیۃ الاولیٰ سے مراد اسلام سے قبل کفر کی جہالت ہے اور جاہلیۃ اخیرہ سے مراد اسلام کے بعد فتن کی جہالت ہے۔ علامہ شمش نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ زمانہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کے درمیان تھا۔ ابوالباقیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ کہ اس دور میں عورتیں ایسی قمیصیں پہنتیں تھیں جو اطراف سے سلی ہوتی تھیں ہوتی تھیں جس کے سبب اطراف سے ان کا بدن دیکھا جاتا تھا۔ کبھی کا قول ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد ظالم و جابر حکمران مردود

کا زمانہ ہے کہ عورتیں موتیوں سے قمیصیں بنا کر پہنتی تھیں اور ان کے علاوہ ان کے بدن پر کوئی شے نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے کے درمیان میں چلتی تھیں اور اپنے آپ کو مردوں کے لیے پیش کرتی تھیں (1)۔ حضرت نکرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد حضرت نوح اور حضرت ادریس علیہما السلام کا درمیان کا زمانہ ہے اور یہ ہزار سال پر مشتمل تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے تھے۔ ایک قبیلہ میدانی علاقہ میں سکونت پذیر تھا اور دوسرا پہاڑی علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔ پہاڑ میں رہنے والے مرد خوبصورت تھے۔ ان کے چہرے حسین تھے لیکن عورتیں کمزور اور بد صورت تھیں اور میدانی علاقے میں رہنے والی عورتیں حسن و جمال کا پیکر تھیں اور مرد نحیف اور بد صورت تھے۔ ایک دن میدان میں سکونت پذیر لوگوں میں سے ایک کے پاس اٹلیس آیا اور اجرت پر اس کی خدمت شروع کر دی۔ اسی دوران اس نے چہرہ کی بانسری کی مثل ایک چیز تیار کی اور اس سے ایسی آواز نکالنے لگا جس کی مثل لوگوں نے اس سے قبل نہیں سنی تھیں۔ چنانچہ اس نے وہ آواز گرد و فواح کے تمام لوگوں میں پہنچائی۔ پس وہاں کے لوگ آواز سننے کے لیے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ لہذا انہوں نے ایک معین دن بنالیا جس میں اس کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پس اس میلے میں عورتیں مردوں کے لیے بناؤ سنگھار کرتیں اور مردان کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرتے۔ پس ایک دفعہ پہاڑ میں رہنے والے لوگوں میں سے ایک آدمی ان کے اس میلے کے اجتماع میں شامل ہوا اور اس نے ان مردوں اور عورتوں کے بناؤ سنگھار اور حسن و جمال کو دیکھا۔ اور پھر واپس آ کر اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر دی۔ تو وہ بھی انہی کی طرف چلے گئے اور وہیں میدانی علاقہ میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ پس اس طرح ان میں فحاشی اور بدکاری پھیل گئی اور عام ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا وَلَآ تَبْهَخُنَّ فِیْ رُجِّ الْحَاجِلِیَّةِ الْاَوْفٰی۔ اور کبھی کبھی اولیٰ کا ذکر اس طرح بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے لیے آخری نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اَفْلَکَ غَاذٍ الْاَوْفٰی۔ حالانکہ عاداتی کوئی نہیں (2)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جاہلیت سے مراد وہ زمانہ ہے جو تمہارے زمانے سے پہلے تھا۔

یہ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہر اس کام میں جس کا تمہیں حکم دیا جائے اور جس سے تمہیں روکا جائے۔ کیونکہ یہی وہ تقویٰ ہے جو عالمین کی تمام عورتوں پر تمہاری افضلیت کی شرط ہے۔

یہ یہ جملہ مستانہ ہے۔ اس کا حکم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد میں سے دیگر افراد کو بھی شامل ہے۔ اسی تقیم کے ارادہ کے لیے عِیْ غَنَکُمْ میں ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے لیے ذکر فرمائی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور مردوں کی پابندی کرنے کا حکم اس لیے ارشاد فرمایا ہے تاکہ وہ تم سے چلیے یعنی شیطانی عمل کو دور فرمادے مثلاً گناہ اور ایسی باتیں اور برائیاں جو شرعاً یا طبعاً ایسی ہوں جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی نہ ہو انہیں تم سے اور تمہارے علاوہ دیگر اہل بیت سے دور کر دے۔

یہ ترکیب کلام میں اَهْلُ الْبَیْتِ محلِ نداء یا مدح میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کے افراد خانہ ہیں۔

نکرہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں کیونکہ وہی آپ ﷺ کے گھر میں تھیں۔ یہی روایت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ اور آپ نے یہ آیت کریمہ بھی تلاوت فرمائی

وَأَذْكُرُنَّ مَا يَنْتَلِي فِي بُيُوتِكُنَّ مِنَ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ۔ اسے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے مکرّمہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور انہوں نے آیت کے سیاق و سباق سے استدلال کیا ہے۔ لیکن محکم ضمیر مذکر صرف ازواج مطہرات کے ساتھ حکم کی تخصیص کے مانع ہے (لہذا یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور ان کی تغلیب کا اظہار کر کے کے لیے ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت جس میں مجاہد، قتادہ اور دیگر تابعین شامل ہیں، نے کہا ہے کہ اہل بیت حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں (1) کیونکہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بابر تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ ﷺ سیاہ بالوں سے بنا ہوا کبیلہ اوڑھے ہوئے تھے جس پر کپڑے کی تصویریں تھیں۔ اسے میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی چادر کے نیچے لے لیا۔ پھر حسین بن علی رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ پھر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حاضر خدمت ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنی چادر میں لے لیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی چادر میں داخل کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يَذْكُرُ اللَّهُ ذِكْرُكُمُ الْوَحْشِ اَهْلُ الْبَيْتِ وَبَعَثَكُمْ لِيُذَكِّرَكُمْ وَبَعَثَكُمْ لِيُذَكِّرَكُمْ وَبَعَثَكُمْ لِيُذَكِّرَكُمْ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تَنَّمِ اَبْنَاءُ نَارًا وَبَنَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا اور رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اسے اللہ ایہ میرے اہل بیت ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت داؤد بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يَذْكُرُ اللَّهُ ذِكْرُكُمُ الْوَحْشِ اَهْلُ الْبَيْتِ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے بارے فرمایا اللہ ایہ میرے اہل بیت ہیں اور میرے خاص افراد ہیں۔ پس تو ان سے پلیدی کو دو دفعہ مادے اور ان کو پوری طرح پاک صاف کر دے (4)۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن جریر وغیرہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرات حسین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلایا۔ جبکہ یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يَذْكُرُ اللَّهُ ذِكْرُكُمُ الْوَحْشِ اَهْلُ الْبَيْتِ پھر انہیں اپنی چادر مبارک کے نیچے لے کر رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اسے اللہ ایہ میرے اہل بیت ہیں ان سے پلیدی کو دو دفعہ مادے اور انہیں مکمل طور پر پاک صاف کر دے (5)۔

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر احادیث اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ آیت کریمہ کا یہ حکم صرف ان چار نفوس رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے۔ اور آیت کریمہ کا ماقبل اور مابعد بھی اس تخصیص کے مانع ہے۔ اور عرف و لغت بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اہل بیت کا اطلاق عورتوں پر ہے اور بچوں اور دیگر افراد خانہ پر اس کا اطلاق صحیح ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر اور اغلب بیویوں کے لیے گھر علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مانگے کہ اس قول کو بطور حکایت بیان فرمایا ہے جو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو پکارتے ہوئے کہا تھا اَتَعْجَبِينَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ وَرَكِبَتْهُ عَائِشَةُ اَهْلُ الْبَيْتِ (کیا تجھے اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب ہو رہا ہے تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت ہوا ہے گھر والو!)۔

1- تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 464 (القرآن) 2- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 288 (تذری) 3- صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 278 (تذری)

4- مسند احمد، جلد 4 صفحہ 107 (صاوار) 5- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)

صحیح مفہوم دینی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کہ آیت کریمہ کا حکم تمام اہل بیت کو شامل ہے، اگرچہ کلام ازواج مطہرات کے لیے ذکر کی گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آیت طہیرہ اِقْبَالُیْہِذَا اللہُ لَیْسَ لَہٗ حَیْثُ عَلَیْہِ اَکْثَرُ النَّبِیَّتِ میرے گھر میں نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات حسین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا اور فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں۔ تو پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے اہل بیت میں سے نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں ان شاء اللہ۔ اسے علامہ بغوی وغیرہ نے روایت کیا ہے (1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل بیت کا لفظ تمام گھر والوں کو شامل ہے۔ اور ان شاء اللہ کا کلمہ محض تحرک کے لیے ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور وہ آل علی، آل عقیل، آل جعفر، آل عباس اور آل حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم ہیں۔

یہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو چوری طرح گناہوں کی نجاست سے پاک صاف کر دے، دنیا میں ان سے محفوظ رکھتے ہوئے اور آخرت میں مغفرت فرماتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو بعض چیزوں سے منع فرمایا اور بعض کے کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی تاکہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے گناہوں سے آلودہ نہ ہوں اور وہ تقویٰ و پرہیز گاری سے متصف و حزمین رہیں۔ استعارہ گناہوں کو رجس کہا گیا اور طہارت کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ گناہوں کا رجس پاک صاف ہوتا ہے۔ گناہوں اور رجس کے جاتا ہے جسے نجاست سے اس کا بدن لوث ہوتا ہے۔ اور متقی پاک و صاف کپڑے کی مثل پاک صاف ہوتا ہے۔ گناہوں اور رجس کے درمیان کامل مناسبت کی وجہ سے ہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے چاہے، وہ قربت کے لیے استعمال کیا جائے یا حدیث کو دور کرنے کے لیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے وضو کیا اور خوب اچھی طرح وضو کیا تو اس کے جسم سے خطائیں نکل جاتی ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہیں۔ اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مسلمان ہند وضو کرتا ہے۔ یا فرمایا جب مومن وضو کرتا ہے تو جب وہ اپنے چہرہ کو دھو تا ہے تو اس کے چہرہ سے وہ تمام خطائیں نکل جاتی ہیں جن کی طرف اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا (یعنی آنکھ کے وہ تمام گناہ پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں) اللہ عیضہ (3)۔

اسی آیت سے روافض نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم تمام معصوم ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء بھی ہیں ان کے سوا کوئی نہیں۔ اور اسی آیت سے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ ان چاروں نفوس اور ان کے سوا ان کی اولاد میں سے دیگر ائمہ کا اجماع بھی حجت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پاک کرنے کا ارادہ فرمایا ہے تو پھر وہ معصوم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد (یعنی وہ جسے شمس کا وہ ارادہ فرمائے) اس کے ارادہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کرنے والا کو طہا (پاک) نہیں ہوتا اور امانت کے لیے معصوم ہونا شرط ہے جبکہ حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بالا جماع غیر معصوم ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ائمہ کو صرف اہل بیت ہی ہیں ان کے سوا کوئی نہیں۔ روافض کا ذکر وہ استدلال باطل اور غلط ہے اور اس کی متعدد وجوہ ہیں۔

(1) آیت کریمہ اسے حکم کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے

ساتھ مختص نہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بلکہ یہ آیت تو امہات المؤمنین کے بارے نازل ہوئی ہے لیکن یہ چاروں مقتدر اور معزز نفوس ان کے حکم میں داخل ہیں۔

(2) یہ آیت ان کے معصوم ہونے پر دلالت ہی نہیں کرتی کیونکہ اس کی مثل الفاظ آیت وضو میں تمام امت کے لیے مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **عَالِمِينَ اللَّهُ يَجْعَلُ لَكُمْ خُزُنًا وَدَلِيلًا يَوْمَ يُنْفَخُ الْأَشْجَارُ وَيُنْزَلُ السَّمَاءُ سَازِجًا**۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آیت وضو کے متقاضی ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے وضو کرنے سے تمہارے بدنوں کو نجاستوں اور حدوٹوں سے پاک فرما دے اور اس آیت کا متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گناہوں سے پاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دونوں آیتوں کے متقاضی میں یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں کا انداز ایک طرح کا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس طرح مومنین کے بدنوں کو پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے جبکہ وہ وضو کریں اور اعضائے وضو کے لیے پانی استعمال کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اگر وہ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے طہارت ظاہرہ کے حصول کے لیے پانی کے استعمال کا طریقہ بیان فرمایا اور اہل بیت کے لیے طہارت باطنہ کے حصول کے لیے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں **فَلَا تَخْضَعْنَ** ارشاد فرمایا۔ لہذا جس طرح ظاہر بدن کی طہارت بندے کے اس اختیار پر موقوف ہے کہ وہ پانی استعمال کرے اسی طرح گناہوں سے طہارت اس پر موقوف ہے کہ وہ تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرے۔ واللہ اعلم

(3) عصمت (معصوم ہونا) امامت کے لیے شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ جائز ہے کہ معصوم کے موجود ہونے کے باوجود غیر معصوم امام ہو۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے طالت کو امامت اور بادشاہی عطا فرمائی حالانکہ ان میں اللہ تعالیٰ کے معصوم نبی حضرت اشموئیل اور حضرت داؤد علیہما السلام موجود تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلَكًا** اَللّٰہِ قَوْلُهُ تَعَالٰی وَتَقَاتِلْ ذَآؤُكُمْ اَللّٰہِ قَوْلُهُ۔ واللہ اعلم۔

وَاذْكُرْ مَن مَّا يَمْشِي فِي بَيْوتِكَ مِن بَنِي آدَمَ وَآلِهٖمُ السَّلَامَةُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۝

”اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی باتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھر میں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا

لطف فرمانے والا ہر بات سے باخبر ہے۔“

۱۔ اس کا عطف **أَطْعَمَ اللَّهُ وَزَوَّجَهُ** پر ہے۔ اور ان کے درمیان حکم کی علت بیان کرنے کے لیے جملہ مترشحہ بیان کیا گیا ہے۔
 ۲۔ **بَنِي آدَمَ** اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور حکمت سے مراد وحی غیر مکتوب یعنی سنت ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ ایت اللہ اور حکمت سے مراد قرآن کریم کے احکام اور اس کی نصیحتیں ہیں۔ علامہ بیضاوی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ تم اس کتاب کو یاد رکھو جو دونوں امور کی جامع ہے۔ ایک تو اس انعام کی یاد دلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس صورت میں فرمایا کہ انہیں نبی کا اہل بیت بنادیا اور ان کے گھروں کو مہبط وحی قرار دیا اور دوسرا یہ کہ انہوں نے نزول وحی کی اس مشقت آمیز کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے جو ایمان کی تقویت کا موجب ہے اور اوامرو نواہی کی صورت میں انہیں جن امور کا پابند بنایا گیا ہے وہ ان کے جذبات کو ان کی اطاعت و اتباع کرنے پر براہیختہ کرتی ہے۔ (1)
 ۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بڑا لطف فرمانے والا ہے کہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں ایسے امور کی تعلیم دیتا ہے جو دین میں اصلاح کا

سب بنتے ہیں۔ اور وہ ہر شے سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی اس کا نبی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کوئی نہیں کا اہل بیت ہونے اور اس کی صحبت میں رہنے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَالْقَبِيلَةُ لَإِذَا عَلِمُوا مَلِكًا مِّنْهُمْ أَنِ اتَّبَعْتُم مَّا كَانَتْ يَأْذِيكُمْ أَنَّكُمْ لَا تُحْتَسِبُونَ وَلَا تَعْلَمُونَ۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مردوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن عورتوں کا ذکر تو بھلائی کے ساتھ نہیں فرمایا کیا ہم میں کوئی ایسی اچھائی اور بھلائی موجود نہیں جس کے سبب ہمارا بھی تذکرہ کیا جائے۔ ہمیں تو خون ہونے لگا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری طرف سے اطاعت الہی بھی قبول نہ کی جائے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّا الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ الْآیہ نازل فرمائی (1)۔ طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح ابن سعد نے حضرت قتادہؒ سے بھی طبرانی نے سند مقبول کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عورتوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن اہل ایمان عورتوں کا ذکر نہیں فرماتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ اسے ابن جریر نے حضرت قتادہؒ سے مرسل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے ام عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی میں تو ہر شے مردوں کے لیے ہی دیکھ رہی ہوں اور عورتوں کو نہیں دیکھتی کہ کسی اچھی شے کے سبب ان کا بھی تذکرہ کیا جا رہا ہو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (3)

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ متقال نے بیان کیا ہے کہ ام سلمہ بنت ابی امیہ اور آیہ بنت الکعب انصاریہ رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کیا وجہ ہے ہمارا رب اپنی کتاب میں مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن عورتوں کی کسی شے کا ذکر نہیں کرتا ہمیں تو یہ خوف ہونے لگا ہے کہ شاید عورتوں میں کوئی بھلائی ہی نہ ہو۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب حضرت اسماء بنت عمیس اپنے خاندان حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ سے واپس لوٹیں تو ازواج مطہرات کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا کیا ہمارے بارے میں قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ تو پھر وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک عورتیں تو نقصان (نامراد) اور خسارے میں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسے کیوں؟ تو انہوں نے عرض کی عورتوں کا اس طرح بھلائی اور خیر کے ساتھ ذکر نہیں کیا جاتا جیسے مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (4)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْخَالِصِيْنَ وَالْخَالِصَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ قُرُوبَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّكِرِيْنَ وَالذَّكِرَاتِ اَعَدَّ اللهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے

والے مرد اور بچہ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں تیار کر رکھا ہے اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔“

یعنی مردوں اور عورتوں میں سے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں، اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے والے اور اسی پر توکل و بھروسہ کرنے والے ہیں۔ اور اس دین کی تصدیق کرنے والے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے کر آئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مردوں اور عورتوں میں سے محفوظ رہیں گے جب اللہ تعالیٰ کو لوگوں کو ہلاک کرے گا۔ دونوں فریقوں میں سے اطاعت و فرمانبرداری پر مداومت اختیار کرنے والے اور قول و عمل میں بیچ اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں یعنی ایسے اعمال کرنے والے جن پر ان کی تعریف کرنے والے کو سچا مانا جاتا ہو۔ اور مصائب و آلام میں صبر کرنے والے مرد اور عورتیں، اطاعت و فرمانبرداری پر ڈٹ جانے والے اور اتباع شہوات اور گناہوں سے اجتناب کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اور تواضع و انکساری اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں جن میں تکبر اور غرور نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشودی چاہتے ہوئے اس رزق سے صدقہ و خیرات کرنے والے مرد اور عورتیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اور روزے رکھنے والے مرد اور عورتیں چاہے وہ روزے فرض ہوں یا نفل اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی عورتیں جو عمل حلال نہیں۔ اور اپنے دلوں اور اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور عورتیں (۱)۔ علامہ ابن قیم نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے بندہ اس وقت تک کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ کھڑے ہوئے، بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہے (۱)۔ یعنی کسی وقت بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے میں غفلت اور سستی نہیں برتتے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا تصور تب ہی کیا جاسکتا ہے جب دل ذکر الہی میں غماز و متغزل ہو جائے اور دائمی حضور کا مقام حاصل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (۲)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والی اور کوئی شے نہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر ایک صورت ہے کہ عیال و اپنی تلوار کے ساتھ اتار لے کے تلوار ٹوٹ جائے (تو اس صورت میں اس کا مقام

۱۔ تفسیر ابن قیم، جلد ۴ صفحہ ۴۶۶ (القر) ۲۔ صحیح مسلم، جلد ۲ صفحہ ۳۴۱ (تذہبی)

(۱) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے پوچھا کون سا مجاہد بلند درجہ پر فائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر عرض کی کون سا روزہ دار اعظم درجہ پر فائز ہوگا؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر اس نے نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ میں سے ہر ایک کے بارے میں استفسار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار فرماتے رہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا ہے ابو یوسف! ذکر کرنے والے ہر بھلائی لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں (۱) (یہی ہے)۔ از مضر رحمہ اللہ۔

بڑھ جائے گا) اسے امام بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی کون سے لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دوسروں سے افضل اور بلند درجہ پر فائز ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی افضل و اعلیٰ مرتبہ پر ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر (جہاد) اپنی تلوار کے ساتھ اتناڑے یہاں تک کہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون میں لت پت ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا اس سے درجہ افضل اور بلند تر ہوگا۔ (1) اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ یا داہلی سے غافل رہنے والوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے خشک درخت میں سرسبز شاداب نشی، غافلین میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے تاریک مکان میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اسے دکھا دیتے ہیں حالانکہ وہ ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کی تمام بولنے والوں اور گوگوں کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے بولنے والوں سے مراد تمام نسل انسانی ہے اور گوگوں سے مراد چوپائے ہیں۔ رواہ زرین۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ عطاء بن ابی رباحؒ نے کہا جس کسی نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا وہ اس ارشاد میں داخل ہے إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ جس نے یہ اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور دل نے اس کی زبان کی مخالفت نہ کی (یعنی دل نے بھی اس قول کی تصدیق کر دی) تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہے وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جس نے فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اور سنت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہے وَالْقَائِمِينَ وَالْقَائِمَاتِ جس نے اپنے قول کو کذب سے محفوظ رکھا تو وہ اس ارشاد کے زمرے میں داخل ہو گیا وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ جو کوئی اطاعت و فرمانبرداری پر کار بند رہا، مصیبت سے ڈرتا رہا اور تکلیف و مصیبت پر صبر کرتا رہا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالضَّاهِقِينَ وَالضَّاهِقَاتِ جس کسی نے نماز ادا کی اور یہ نہ پہچانا کہ اس کی دائیں طرف کون ہے اور اس کی بائیں جانب کون ہے تو وہ اس قول باری تعالیٰ کے تحت آگیا وَالْمُحْسِنِينَ وَالْمُحْسِنَاتِ جس کسی نے ہر غشتہ میں ایک درہم صدقہ کیا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّقَاتِ جس کسی نے ہر مہینہ میں ایام بیض (چاند کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ) کے روزے رکھے تو وہ اس ارشاد کے زمرہ میں آگیا وَالْحَاشِيِينَ وَالْحَاشِيَاتِ جس کسی نے اپنی شرم گاہ کو حرام عمل سے محفوظ رکھا تو وہ اس قول کے تحت داخل ہو گیا وَالْمُحْصِنِينَ وَالْمُحْصِنَاتِ اور جس کسی نے پانچ نمازیں باندی سے ادا کیں تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا جن کا ذکر قول باری تعالیٰ وَالْمُكْمِلِينَ وَالْمُكْمِلَاتِ میں ہے۔ (2) علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ مومنوں کا عطف مذکور پر دونوں جنسوں کے اشتکاف کی بناء پر ضروری ہے اور زوجین (جوڑے یعنی مذکر و مؤنث دونوں) کا عطف زوجین پر دونوں مقول کے متعارف ہونے کی وجہ سے ضروری نہیں۔ اسی لیے قول باری تعالیٰ مُؤْمِنَاتٍ مُؤْمِنَاتٍ میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ اعدا اور موعود لہم تمام ان صفات کے درمیان جمع ہیں۔ (3)

۱۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 466 (المکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی، جلد 4 صفحہ 375 (المکر)

ذرا مہر داری پر اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ
الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۚ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ وَصَّلَ صَلَاتًا مُمِيزًا ۝

”نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرما دے اللہ تعالیٰ اور رسول کسی معاملہ کا تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اس معاملہ میں نہ اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا ہے۔“

۱۔ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کے ساتھ نکاح کے ارادہ سے زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہیں یہ گمان ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنے لیے یہ پیغام بھیجا ہے۔ لیکن جب انہیں علم ہوا کہ آپ ﷺ تو ان کا نکاح زیدؓ سے کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (۱) (کہ نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو۔ تو پھر وہ راضی ہو گئیں اور (فیصلہ) کو تسلیم کر لیا۔) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو زمانہ جاہلیت میں عکاظ کی منڈی سے خریدا تھا اور پھر آزاد کر کے انہیں متعین بنالیا تھا۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ نے (حضرت زینب بنت جحشؓ) کو پیغام نکاح بھیجا تو انہوں نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ آپ ﷺ نے یہ پیغام اپنے لیے دیا ہے اسے تسلیم کر لیا پھر جب انہیں یہ علم ہوا کہ آپ ﷺ نے انہیں حضرت زیدؓ کے لیے پیغام نکاح بھیجا ہے تو انہوں نے انکار کر دیا اور اسے ناپسند کیا۔ اسی طرح ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے بھی ناپسند ہی کا اظہار کیا۔ (حضرت زینب اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ کی ماں امیہ بنت عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کی چھوٹی تھی (۲)۔ ان جریہ نے حضرت عمرؓ اور عوفیؓ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحشؓ کو حضرت زید بن حارثہؓ کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہوں نے انہیں حقیر سمجھا اور انہیں پسند نہ کرتے ہوئے کہا میں حسب نسب میں ان سے بہتر ہوں۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (۳) تو اس میں مومن سے مراد حضرت عبداللہ بن جحشؓ ہیں اور مومنہ سے مراد حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔

۲۔ اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ متنی طور پر کسی معاملہ کا فیصلہ فرمادیں۔ تو پھر وہ اپنے معاملات میں سے جو چاہیں اختیار کریں بلکہ ان پر وہی امر واجب ہے جس کا حکم انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اختیار کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے اختیار کے تابع بنالیں۔ لہٰذا ہمیں ضمیر جمع ذکر کیے جانے کی علت یہ ہے کہ لفظ مومن اور مومنہ دونوں گہر ہیں اور یہ عمل نقلی میں واقع ہونے کے سبب عموم پر دلالت کر رہے ہیں۔ اور دوسری ضمیر جمع تعظیم کے لیے ہے۔ قراء کو فدا اور ہشام نے فضل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے کیوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ کنون پڑھا ہے۔ خیرہ اور خیار دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مطلق امر واجب کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ عالم اور جسے دینی فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ علوی اور دیگر شرفاء کا کفو

ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ عورتوں میں سے سب سے پہلے انہوں نے ہی ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اپنا آپ حضور نبی کریم ﷺ کو پہنچ کر دیا۔ پس آپ ﷺ نے زید بن حارثہ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ اس پر ان کے بھائی تاراض ہو گئے اور دونوں نے کہا کہ ہماری مراد تو حضور نبی کریم ﷺ کی اپنی ذات تھی (کہ اپنے ساتھ نکاح فرمائیں گے) لیکن آپ نے ہماری شادی دوسروں سے کر دی۔ (1)

سید اور جو ائمہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ ضللاً مینما سے مراد صحیح اور درست نظریہ سے واضح طور پر منحرف ہو جانا ہے۔ اگر یہ انحراف اور نافرمانی حکم کو مکمل طور پر رد کرنے اور اس کے انکار کی صورت میں ہو تو یہ کفر ہے۔ اور اگر انحراف اور نافرمانی صرف عملاً ہو جبکہ حکم کو قبول کرتے ہوئے اس کا وجوب کا اعتقاد ہو تو ایسا انحراف فسق ہے۔ جملہ فقد حصل مزدف شرط کی جزاء کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ملک فقد حصل۔ علامہ ربوئی نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی رضی اللہ عنہما نے سنی تو دونوں اس پر راضی ہو گئے اور اسے تسلیم بھی کر لیا۔ نتیجہ حضرت زینب نے اپنے بارے میں اختیار رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا اسی طرح ان کے بھائی نے بھی کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ سے فرما دیا اور وہ ان کے ساتھ رہنے لگے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں دس دینار، ساٹھ درہم، اور دھنی، قمیص، تہبند، ایک چادر، پچاس سیر غلہ اور تیس صاع مھو دیں عطا فرمائیں۔ اور وہ ایک مدت تک آپ ﷺ کے پاس ٹھہری رہیں۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی کام کی غرض سے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت زینب کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اور دھنی اور قمیص پہنے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت سفید تھی اور قریش کی عورتوں میں سے انتہائی حسین و جمیل تھیں۔ وہ آپ کے دل میں اثر گئیں اور آپ ﷺ نے ان کے حسن و جمال پر ازراہ تعجب فرمایا سبحان اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے۔ پس اس کے بعد آپ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ جب حضرت زیدؓ نے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ پس زیدؓ سمجھ گئے۔ پس اسی وقت انہوں نے اپنے دل میں حضرت زینب کے بارے کراہت اور ناپسندیدگی ڈال لی۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی میں اپنی بیوی کو اپنے سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تجھے کیا ہوا ہے کیا تم نے اس میں کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں قسم بخدا یا رسول اللہ! میں نے ہمیشہ اس سے خیر اور بھلائی ہی پائی ہے۔ لیکن وہ مجھ پر اپنی خاندانی عظمت و شرف کا اظہار کرتی رہتی ہیں اور اس طرح مجھے اپنی زبان سے اذیت پہنچاتی رہتی ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی رو کر رکھو اور ان کے بارے اللہ تعالیٰ سے ڈرو (2)۔ اسی طرح ابن جریر نے ابو زید سے روایت نقل کی ہے۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلنَّبِيِّ أُنْعِمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ
وَاتَّقِ اللَّهَ وَخُفِيَ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ
تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا لِيَكُنْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
حَرَجٌ فِي أَرْوَاحِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝

”اور یاد کیجیے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا! اپنی بی بی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈرے اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا۔ اور آپ کو اندر بیٹھا لوگوں (کے طعن و تشنیع) کا حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔ پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش، تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا ہے تاکہ (اس کی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔“

۱۔ حاکم نے حضرت انس کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حضرت زینب بنت جحش کی شکایت لے کر حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی رہ کر رکھو۔ تو اس وقت آیت **وَإِذْ تَقُولُ لِلْأَيِّه نَازِلٌ هَؤُلَاءِ (۱)**۔ اے محمد ﷺ یاد کیجیے جب آپ نے اسے فرمایا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی طرف ہدایت عطا فرمائی اسے آپ کی مصاحبت اور سنگت عطا فرمائی اور اس کی محبت اور اس پر رحمت کرنے کے جذبات آپ کے دل میں ڈال دیے اور آپ نے اس پر خرچ کرنے اور اسے آزاد کرنے کا احسان فرمایا یعنی حضرت زید بن حارثہ۔

۲۔ کہ وہ اپنے پاس اپنی بیوی کو روکے رکھے یعنی حضرت زینب بنت جحش کو اور وہ اپنی زوجہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اسے طلاق نہ دے کیونکہ طلاق تمام مباح اعمال میں سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض عمل ہے۔

۳۔ قول باری تعالیٰ **أَمْسِكْ تَقُولُ** کا مقلد ہے اور تشبیہی کا جملہ **تَقُولُ** پر معطوف ہے۔ یعنی آپ اپنے جی میں وہ بات مخفی رکھے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا تھا۔ امام بخاری نے حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (۲)۔ حسن نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کی بات کو پسند کیا لیکن حیا اور کرامت کی وجہ سے اسے اپنے جی میں چھپائے رکھا۔ یہ قول بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دل میں یہ بات مخفی رکھی کہ اگر زید نے زینب کو علیحدہ کر دیا تو آپ اس سے شادی کر لیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت چھپائے رکھی۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند فرمایا کہ زید انہیں طلاق دے دیں (۳)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے علی بن زید بن جدعان سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام زین العابدین علی بن حسینؑ نے پوچھا کہ اس قول باری تعالیٰ **فِي نَفْسِكَ عَلَيْنَا اللَّهُ مَبْنِيٍّ مَبْنِيٍّ وَتَقُولُ أَنَّ نَفْسَكَ** کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت زیدؑ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا نبی اللہ! میں زینب کو اپنے سے جدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے ان کی اس بات کو پسند کیا لیکن یہ فرمایا **أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ** وَاللَّهِ تَقُولُ اس پر امام زین العابدین علی بن حسینؑ نے فرمایا اس طرح نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرمادیا تھا کہ وہ آپ کی ازواج میں سے ہوں گی اور زید عترت انہیں طلاق دے دیں گے۔ پھر جب زید آئے اور اگر عرض کی میں تو انہیں طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ نے فرمایا **أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ** تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور عتاب یہ فرمایا۔ اور فرمایا آپ نے **أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ** کیوں کہا ہے جبکہ ہم نے آپ کو مطلع فرمادیا ہے کہ وہ عترت آپ کی ازواج میں سے ہو جائیں گی۔ یہی مفہوم زیادہ اولیٰ

ہے اور انبیاء علیہم السلام کی شان کے زیادہ لائق ہے اور الفاظ تلاوت کے مطابق بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کرنے کے بارے آگاہ فرمادیا ہے جسے آپ فحشی رکھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ حضرت زینب کی شادی کے سوا اور کچھ بھی ظاہر نہیں فرمایا اور فرمایا *وَلَا يَزُودُ جُنَاظَهَا* (ہم نے آپ کا نکاح ان سے کر دیا)۔ پس اگر وہ بات جسے رسول اللہ ﷺ چھپائے ہوئے تھے وہ ان کی محبت اور ارادہ طلاق ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کا اظہار فرمادیتے۔ اور نکاح کی بات آپ ﷺ نے اس کے لیے بھی رکھی کہ آپ ﷺ کو حیا محسوس ہونے لگی کہ آپ زید کو یہ کہیں کہ وہ زینب جو تیری بیوی اور تیرے نکاح میں ہے وہ غریب میری بیوی ہو جائے گی (1)۔ علامہ بغوثی نے کہا ہے کہ امام زین العابدین کا بیان کردہ یہ قول انتہائی پسندیدہ اور خوبصورت ہے۔ اور دوسرا یہ قول کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت کو فحشی رکھا یا زید کے طلاق دینے کی صورت میں ان سے نکاح کرنے کی خواہش کو چھپائے رکھا تو اس سے بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں کوئی عیب یا نقص نہیں نکالا جاسکتا۔ کیونکہ بندے کے دل میں جو بات پیدا ہوتی ہے تو صرف اس کے سبب اس پر ملامت نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان کی شہ وہ اشیاء جن کا قصد نہ کیا جائے صرف ان کے دل میں وارد ہونے سے ان پر کوئی گناہ نہیں (2)۔ کیونکہ محبت تو فقط نفس کا میلان ہے اور طبع بشری میں سے ہے۔ اور آپ کا قول *أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ* یہ امر بالمعروف ہے اور یہ اچھائی اور نیکی ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔ میں کہتا ہوں بلکہ اس پر تو اجر عظیم ہے کیونکہ یہ تو ایسا امر بالمعروف ہے جو اپنی طبیعت کے خلاف ہے۔ رب کریم نے ایسے ہی امر کے بارے فرمایا *وَيُؤَيِّدُ عَلَى الْفُلُوفِ وَأَلْفُوفٍ مِّنْهُمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوَفِّقِ اللَّهُ فَعَلًا فَلَيْسَ فِي دَعْوَاهُ لُغْوٌ وَلَا عِلْوٌ* (وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں بھی سخت حاجت ہو اور جو شخص حرص نفس سے محفوظ رہے ہیں وہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں)۔ اور حسن کے قول کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس وقت فرمایا جب زینب کو دیکھا *مُبْتَخَانَ اللَّهِ مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ*۔ کیونکہ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کا دل حضرت زینب کے ساتھ شادی کرنے کی طرف پھیر دیا جبکہ پہلے آپ ﷺ کے دل میں یہ تھا کہ آپ ان کا نکاح زید سے کرادیں گے۔

وَيُخْشَى النَّاسَ كَاغْفِطُ نَفْسِي پر ہے۔ یعنی آپ لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈرتے تھے کہ وہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ وَاللَّهِ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَهُ كَاغْفِطُ نَفْسِي کے قائل سے حال ہے (حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں) حضرت عمر، ابن مسعود اور عائشہ صدیقہؓ نے کہا ہے کہ اس آیت سے بڑھ کر کوئی شدید اور سخت آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ اور مسروق سے روایت ہے کہ امام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی میں سے کوئی چیز مخفی رکھتے تو یہ آیت ضرور چھپالیتے *وَتَخْفَى فِي تَخْفِيكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَهُ* (3)۔ علامہ بغوثی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نازل فرما کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصد نہیں فرمایا کہ حضور نبی کریم ﷺ اس سے ڈرتے ہی نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے *إِنِّي أَخْشَاكُمْ وَأَتَّقَاكُمْ* (بے شک تم سے زیادہ شیت و تقویٰ رکھتا ہے) (4)۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے ارشاد فرمایا *يَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ* (وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے)۔ لیکن جب لوگوں سے ڈرنے کا ذکر فرمایا تو فرمایا کہ اللہ

2- تفسیر بغوثی، جلد 4 صفحہ 469 (الفر)

4- تفسیر بغوثی، جلد 4 صفحہ 469 (الفر)

1- تفسیر بغوثی، جلد 4 صفحہ 468 (الفر)

3- جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)

تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ تمام حالات میں اور جمیع اشیاء میں اسی سے ڈرا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کا معنی یہ ہے کہ آپ لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈرتے ہیں بلکہ آپ لوگوں سے ڈرنے کی نسبت کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ آپ اس سے خوفزدہ ہیں۔ پس آپ نے لوگوں سے ڈرتے ہوئے اور ان سے حیا کرتے ہوئے ہی ایک پوشیدہ بات کو مخفی رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کے سبب آپ نے (حضرت زیدؓ) کو خیر اور نیکی کا حکم دیا اور آپ نے کوئی بھی ایسی شے نہیں چھوڑی جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہو۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی منافقہ نہیں۔ اور قول باری تعالیٰ لَا يَخْشَوْنَ أَخَذًا إِلَّا اللَّهُ کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی اس طرح خوفزدہ نہیں ہوتے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور قیل چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ رہا لوگوں سے ڈرنے کا مفہوم تو اس کا معنی ہے دیگر امور میں لوگوں سے حیا کرنا اور یہ اچھی شے ہے کیونکہ حیا و ایمان کا حصہ ہے۔ متفق علیہ (۱)۔ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیا مکمل طور پر خیر اور بھلائی ہے (۲) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حیا اور ایمان دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پس جب ان میں سے ایک کو اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرے کو بھی اٹھالیا جاتا ہے (۳)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب ان میں سے ایک کو سلب کر لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اس کے تابع ہوتا ہے (۴)۔ (یعنی اسے بھی ساتھ ہی سلب کر لیا جاتا ہے) اسے بتاتی ہے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ نے اسے زید بن طیب سے مرسل روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ اور ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے شک ہر دین کا کوئی خلق ہوتا ہے اور دین اسلام کا خلق حیا ہے (۵) واللہ اعلم۔ مسلم، احمد، نسائی، ابویعلیٰ، ابن ابی حاتم، بطرانی اور ابن مردویہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور اسے علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور بغویؒ کے یہ الفاظ حضرت انسؓ سے مروی ہیں کہ جب حضرت زینبؓ کی عدت کے ایام گزر گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو فرمایا جاؤ اور اسے میرے بارے میں یاد دلادو۔ چنانچہ حضرت زیدؓ چلے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنا آنکھیر کر رہی تھیں۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ جب میری نظر ان پر پڑی تو وہ مجھے اپنے سینے سے اتنی محبت اور ذی مرتبہ محسوس ہوئیں کہ میں نے ان کی طرف دیکھنے کی طاقت بھی نہیں رکھی۔ کیونکہ اس وقت میں یہ جانتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے (نکاح کے ارادہ سے) ان کا ذکر کیا تھا۔ پس میں نے فوراً اپنی پیٹھ پھیر لی اور میں نے اگلے پاؤں مڑتے ہوئے کہا اے زینب! مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے آپ تجھے یا دفارہ ہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میں کچھ کرنے والی نہیں یہاں تک کہ میں اپنے رب سے مشورہ کر لوں۔ پس آپ اٹھ کر (اپنے گھر کی) مسجد (نماز کی مخصوص جگہ) کی طرف چلی گئیں اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ فَلَمَّا أَتَتْهُمُ ذُنُوبُهُمْ لَمَّا وَفَّيْهُنَّ مَا أَلَّيْهُنَّ (۶)

یہ رسول اللہ ﷺ شریف لائے اور حضرت زینبؓ کے پاس بلا اجازت چلے گئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں ہمیں یاد ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (ان کے ولیمہ کے وقت) ہمیں گوشت روٹی کھائی۔ یہاں تک کہ نصف کے قریب دن گزر گیا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے اور دو آدمی گھر میں کھانے کے بعد باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ پس رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پس آپ ﷺ باری باری تمام ازواج مطہرات کے حجر میں تشریف لے گئے

۱- صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۴۷ (تذقی) ۲- صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۴۸ (تذقی) ۳- شعب الایمان: ۷۷۲۷ (اعلیٰ)

۴- شعب الایمان: ۷۷۱۶ (اعلیٰ) ۵- شعب الایمان: ۷۷۱۶ (اعلیٰ) ۶- تفسیر بغوی جلد ۴ صفحہ ۴۶۹ (آخر)

۱- صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۴۷ (تذقی)

۴- شعب الایمان: ۷۷۲۸ (اعلیٰ)

آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے اور وہ آپ کو سلام پیش کرتیں اور عرض کرتیں یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ کو کیسے پایا ہے؟ حضرت انسؓ فرماتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ پھر میں نے خبر دی کہ وہ لوگ جا چکے ہیں یا کہ انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ پس اطلاع پایا کہ آپ ﷺ تشریف لے گئے اور حجرہ شریفہ میں داخل ہو گئے حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں داخل ہونے لگا کہ میرے اور آپ ﷺ کے درمیان پردہ ڈال دیا گیا۔ اور اس وقت پردے کے احکام نازل ہوئے (1)۔ قول باری تعالیٰ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْنًا مِّنْهَا مِثْلًا میں ہا سے مراد حضرت زینہؓ کی اہلیہ حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔ اور وَطُوا سے مراد حاجت اور ضرورت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت زینہؓ ان سے آگے گئے اور آپ کو ان کی کوئی حاجت اور ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں طلاق دے دی اور پھر ان کی عدت گزر گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہش و حاجت پوری کرنا طلاق سے کناہیہ ہے (یعنی اس سے مراد طلاق ہے)۔ تو ہم نے انہیں آپ کی زوجہ بنا دیا۔ امام بخاری، احمد، ترمذی، حاکم، ابن مردودہ، عبد بن حمید اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت زینبؓ دیگر ازواج مطہرات سے اظہار فخر کرتیں اور کہتیں کہ تمہارے نکاح تمہارے گھروالوں نے کیے ہیں اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (2) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ میرے نکاح کا ولی ہے اور تمہارے نکاح تمہارے اولیاء نے کیے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام شعبیؒ نے کہا ہے حضرت زینبؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرتی تھیں کہ میں آپ کو ایسی عین چیزیں پیش کرتی ہوں جو آپ کی ازواج میں سے کسی اور زوجہ محترمہ کو حاصل نہیں۔ پھر آپ ان پر اپنی ترجیح کا اظہار اس طرح کرتیں کہ میرا اور آپ کا دادا ایک ہے، آپ کے ساتھ میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان میں فرمایا ہے اور میرے نکاح کے سفیر حضرت جبریل علیہ السلام ہیں (3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کی طرح کسی اور زوجہ کا ولیہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے ایک بکری ذبح فرمائی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ شب زفاف بسر کر لی تو آپ ﷺ نے ان کا ولیہ کیا اور مسلمانوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلایا۔

۱۔ تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو، یعنی حرمت کی تنگی باقی نہ رہے۔ اذ جنبا دعیٰ کی جمع ہے اس سے مراد ہے متنعی (منہ بولا جینا) یعنی ہم نے آپ کا نکاح اس زید کی بیوی زینب سے کر دیا جسے آپ نے متنعی بنایا ہوا تھا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ متنعی کی بیوی حلال ہے۔ اگرچہ منہ بولا جینا اپنی بیوی سے قربت اختیار کر چکا ہو۔ جبکہ اس کے برعکس نبیؐ کی بیوی باپ کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اس میں اس امر پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب تک نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی حکم کے خالص ہونے پر دلیل قائم نہ ہو جائے تو وہ حکم نبی اور امت کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم (فیصلہ) تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے جیسا کہ حضرت زینبؓ کی شادی کے بارے میں ہوا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴿١٦﴾

”نبیؐ کے لیے کوئی مضائقہ نہ ہے اسے کام کرنے میں جنہیں حلال کر دیا ہے اللہ نے ۱۶ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہی

گانِ مُحَمَّدٌ اَنَا اَحَبُّ مِنْ رَجُلٍ اِلَى مُحَمَّدٍ علیہ السلام زید بن حارثہ کے باپ نہیں ہیں کہ آپ علیہ السلام پر ان کی زوجہ سے نکاح حرام ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت قاسم، طیب، طاہر اور ابراہیم حضور نبی کریم علیہ السلام کے صاحبزادے تھے اسی طرح حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بھی آپ کے صاحبزادوں میں ہی شمار کیا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام احمد کے بارے ارشاد فرمایا ہے شک میرا یہ بیٹا تو سردار ہے (تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں؟) تو اس کے بارے ہمارا جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے چھوٹی عمر میں ہی وصال فرما گئے وہ مردوں کی عمر تک پہنچے ہی نہیں (یعنی ان میں سے کوئی بھی من بلوغ کو نہیں پہنچا) (اس لیے ان پر لفظ رَجُل کا اطلاق نہیں ہو سکتا)۔ اور حسین کریمین پر بیٹا ہونے کا اطلاق مجازاً سے (کیونکہ حضرت علیہ السلام کے نواسے تھے نہ کہ بیٹے)۔

مسئلہ دوم: کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ہر رسول اپنی امت کے لیے باپ ہوتا ہے لیکن نسی حیثیت سے نہیں کہ اس پر وہ رشتے حرام ہوں جو نسب کے سبب حرام ہوتے ہیں بلکہ وہ توفیق و نصیحت کے اعتبار سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ اور آپ خاتم الانبیاء ہیں عاصم نے لفظ خاتم کو اتمام ہونے کی بناء پر تاہم مروجہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی آخر ہے۔ اور باقیوں نے فاعل کے وزن پر تاہم کو کسور پڑھا ہے (اس کا معنی ہے ختم کرنے والا)۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ آپ ﷺ پر نبوت کو ختم نہ فرماتا تو وہ آپ ﷺ کے بعد یقیناً آپ کے صاحبزادے کو نبوت عطا فرماتا (1)۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فیصلہ فرمایا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا بچہ عطا فرمایا (جو) بلوغت کو پہنچ کر مرد ہوتا)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال کے وقت فرمایا اگر یہ زندہ رہتا تو یہ نبی ہوتا (2)۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے سبب آپ ﷺ کی ختم نبوت پر کوئی جرح نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ جب نزول فرمائیں گے تو آپ ﷺ کی شریعت پر ہوں گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے نبی بنائے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت عطا فرما کر نبوت کو ختم فرمادیا اور کسی سابق نبی کی باقی ہونا ختم نبوت کے منافی نہیں ہوتا۔

سب جس اللہ تعالیٰ جانتا ہے کون اس لائق ہے کہ اس پر نبوت ختم کر دی جائے اور اس کی شان کیسے ہونی چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی مثال اس حل کی ہے جسے انتہائی حسین و جمیل انداز میں تعمیر کیا گیا ہو اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو۔ اور اس کا نظارہ کرنے والے اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے اس اینٹ کی جگہ کے سوا محل کے حسن تعمیر کو بہت پسند کرتے ہوں، اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے۔ پس میں وہ ہوں جس نے اس اینٹ کی خالی جگہ کو بھر دیا اور درست کر دیا ہے۔ میرے ساتھ اس کی تعمیر مکمل ہو گئی اور میرے ساتھ ہی رسل علیہم السلام کا اختتام ہو گیا (3) اور ایک روایت میں ہے کہ پس میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ متفق علیہ۔ حضرت جبر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میرے بہت سے اسلام ہیں میں محمد (ﷺ) ہوں، میں حامی ہوں کہ میرے سبب اللہ تعالیٰ کفر مٹا دے گا،

میں حاضر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں وہ عاقب (پیچھے آنے والا) ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت ابوسمٰیٰ اشعرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے اپنے مختلف اسماء ذکر فرماتے تھے پس آپ ﷺ فرماتے میں محمد (ﷺ) ہوں میں احمد ہوں، میں متقی، حاضر، نبی التوبہ اور نبی الرحمتہ ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (2)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ ائِمُّوا ذِكْرَ اللَّهِ ذِكْرًا كَثِيرًا ۖ وَسَبِّحُوا بِحَمْدِ اللَّهِ وَاصْبِرُوا ۝

”اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے لے اور اس کی پاکی بیان کیا کرو صبح و شام“

۱۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی فریضہ اپنے بندوں پر لازم نہیں فرمایا اگر اس کی ایک معیت حد مقرر فرمادی اور پھر حالت عذر میں اسے ادا کرنے والوں کے عذر کو قبول بھی فرمایا مگر ذکر (اللہ) کے لیے کوئی ایسی حد مقرر نہیں فرمائی جہاں اس کی انتہاء ہوتی ہو اور اسے پھوڑنے کے لیے مجنوں کے سوا کسی کو بھی معذور قرار نہیں دیا بلکہ تمام حالات میں اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور فرمایا قُلْ ذِكْرُ اللَّهِ عَظِيمٌ ۚ وَتُؤْتُونَ حُكْمًا ۚ وَتُحْكُمُونَ فِي شَيْءٍ مِّنْهُ ۚ وَاللَّهُ عَظِيمٌ ۚ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کھڑے ہونے کی حالت میں) بیٹھے ہونے اور پہلو کے تل لیے ہونے کی حالت میں) اور مزید ارشاد فرمایا ذِكْرُ اللَّهِ ذِكْرًا كَثِيرًا (کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو)۔ یعنی رات کے وقت، دن کے وقت، خشکی میں، سمندر میں حالت صحت میں اور بیماری کی حالت میں، مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ مجاہد کا قول ہے کہ ذکر کثیر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کو کبھی بھی نہ بھلائے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت کا تصور توفیقاً قلب اور دائمی حضور حاصل ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

۲۔ اور اس کی پاک بیانی کرو، یعنی اس کے لیے نماز پڑھو۔ منکوفہ سے مراد صبح کی نماز ہے۔ کبھی نے کہا ہے کہ اُصْبَحَ سے مراد صبح، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں (یعنی تمام نمازیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی پڑھو)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم کہو۔ پس آیت کریمہ سے تسبیح کے انوات یعنی تحمید، تہلیل اور تکبیر وغیرہ کو لفظ تسبیح سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ذکر کثیر سے مراد وہی کلمات ہیں جنہیں آدمی با وضو، بلا وضو اور وضی حالت میں کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے پہلے عمومی ذکر کا حکم فرمایا کہ اس کی یاد کو کبھی بھی نہ بھولو پھر اس ذکر کو اوقات مخصوصہ کے ساتھ خاص کر دیا۔ پس پہلے سے مراد ذکر فنی اور حضور دائم ہے۔ اور دوسرے سے مراد ذکر جلی اور مقرر کردہ عبادات ہیں، یعنی فرائض و سنن وغیرہ۔ اور کہا گیا ہے کہ دن کے پہلے اور آخری حصے کو ذکر کے لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ دن اور رات کے ملائکہ ان اوقات میں جمع ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات اور دن کے فرشتے اپنے اپنے اوقات میں ایک دوسرے کے پیچھے تمہارے پاس آتے رہتے ہیں اور وہ صبح اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ملائکہ جنہوں نے رات تم میں بسر کی وہ اوپر چڑھ جاتے ہیں اور ان سے رب کریم پوچھتا ہے (حالانکہ وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے) تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ متفق علیہ (4)۔ کہا گیا ہے کہ تازع الفضلین کے طریقہ پر منکوفہ ذِکْرُ اللَّهِ فعلوں کے معمول ہیں۔ اور وہ دونوں فعل ان دونوں کی طرف متوجہ ہیں۔ یعنی اذکر وہ بکرة و اصبلا اور سبحوہ بکرة

2۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 86 حدیث: 2355 (اعلیٰ)

4۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 113 حدیث: 210 (اعلیٰ)

1۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 86 حدیث: 2354 (اعلیٰ)

3۔ تفسیر بنو، جلد 5، صفحہ 218 (النجاریہ)

و احیاءاً۔ معنی یہ ہے کہ تم نمازیں اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہوئے ادا کرو اور انھیں ایک تمہارے دل حاضر ہوں غافل نہ ہوں۔ حضرت ابو ذرؓ نے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو رب کریم اس وقت تک مسلسل اس کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ کہیں اور متوجہ نہ ہو اور جب بندے کی توجہ ادھر اور (دوسرے دیگر خیالات میں) ہو جاتی ہے تو رب کریم بھی اس سے نظر تو جھیکر لیتا ہے (۱)۔ اسے احمد ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ ۚ وَكَانَ
بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيْمًا ﴿٣٣﴾

”اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں) اے تاکہ وہ نکال

لے جائے تمہیں (طرح طرح کے) اندھیروں سے نور کی طرف ۱۱ اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱۲“

۱۔ علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ جب آیت طیبہ **إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ** نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرض کی (یا رسول اللہ ﷺ) اللہ تعالیٰ نے جو شرف و عزت بھی آپ کے لیے خاص فرمایا ہے ہمیں بھی اس میں ضرور شریک فرمایا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ** (2)۔ عبد بن حمید نے عبادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ لفظ صلوة کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس سے مراد رحمت ہوئی ہے۔ اور ملائکہ کی طرف ہو تو اس سے مراد استغفار (مغفرت طلب کرنا) ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر صلوة فرمانے کا مطلب بندوں میں اس کے ذکر جمیل کو عام کرنا ہوتا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کی ثناء اور تعریف ہونا (3)۔ قاسم بن میں ہے کہ صلوة کا معنی دعا، رحمت اور استغفار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول کی اچھی طرح تعریف ہونا (4)۔ اور اس کا معنی ایسی عبادت ہے جس میں رکوع و سجود بھی ہو۔ یہ عبارت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ پس جنہوں نے ایک سے زیادہ معانی کے لیے لفظ مشترک کا استعمال جائز قرار دیا ہے انہوں نے یہ معنی جائز قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے تمہارے لیے استغفار کرتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک مشترک میں عمومیت جائز نہیں ہوتی (یعنی لفظ مشترک کا اطلاق ایک سے زیادہ معانی پر نہیں ہو سکتا)۔ لہذا یہاں یہ کہا جائے گا کہ لفظ صلوة ؓ ایسے مجازی معنی میں استعمال ہے جو دو حقیقی معنوں میں مشترک ہے اور وہ ہے تمہارے امور کی اصلاح اور تمہارے غرذ و شرف کے ظہور کی طرف متوجہ ہونا۔ اے عمر مجاز کہا جاتا ہے۔ کثیر اہل لغت نے کہا ہے کہ صلوة کا معنی دعا ہے کہا جاتا ہے صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت قبول کر لے اور اگر وہ روزے دار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت دینے والے کے لیے دعا کر دے الفاظ یہ ہیں **وَانِ كَانْ ضَائِمًا فِیْصِلْ** (5) ای لیدع لاهل۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ** آپ ان کے لیے دعا فرمادیں یہ شک آپ کی دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے۔ اور ارکان مخصوصہ صلوة ؓ کی لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ دعا پر مشتمل ہیں۔ اور وہ دعا ہے **اٰھٰیثَا الْبَرِّطَرَا الْمُسْتَقِیْمَ**۔ تو اس میں کل کو

1- سنن ابی داؤد، جلد 4 صفحہ 133 (الترشد) 2- تفسیر بقوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 3- تفسیر بقوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)

4- القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1709 (اتراث امرلی)
5- جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 429 (الفکر)

جزء کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (اگر صلوٰۃ کا معنی دعا ہے تو پھر صلوٰۃ اللہ کا معنی کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ بھی دعا کرتا ہے؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی ذات سے اپنے بندوں کے لیے رحمت و مغفرت طلب فرماتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات سے طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے اپنی ذات پر رحمت فرمانے کو لازم کر لیا ہے۔ یہی معنی اس قول باری تعالیٰ سے مستفاد ہوتا ہے **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الذِّكْرُ حَتَّىٰ يَكُونَ الْاِيحَابُ** اور طلب دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ ایسی طلب جتنی بھی ہو وہ ایجاب ہی ہوتی ہے۔ اور یہاں ایجاب سے مراد تفضل اور مہربانی فرماتے ہوئے کسی شے کو اپنے ذمہ لینا ہے۔ اور جب یہاں صلوٰۃ سے مراد دعا لی جائے گی تو اس سے عموم مشترک لازم نہیں آئے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نبی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا ہمارا رب بھی صلوٰۃ کرتا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات گراں گزری تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ ان سے کہہ دو بے شک میں صلوٰۃ کرتا ہوں اور میری صلوٰۃ میری رحمت ہے جو ہر شے سے وسیع ہے۔ (۱)

۲۔ بے شک وہ اپنی رحمت اور مہربانی کے واسطے ہمیں ہمیشہ کفر اور گناہوں کی تاریکیوں سے ایمان اور اطاعت کے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے تا کہ وہ ہمیشہ تمہیں وقتاً فوقتاً بعد اور دوری کی تاریکیوں سے نور قرب کی طرف نکالتا ہے۔ اور وہ آدمی جس کے دودن ایک جیسے (مساوی) گزر جائیں تو وہ خسارے میں ہے۔

۳۔ اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے ان کے امور کی اصلاح اور ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ اور ان کے لیے دعائیں ملائکہ مقررین کو شامل کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف صلہ جملہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے **اللّٰہُ یُضِلُّیْ عَلَیْکُمْ وَاللّٰہُ یَهْدِیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمٌ**۔

نَحِیْمٌ لَّہُمْ یَوْمَ یُنْفِقُوْنَ سَلَامٌ وَّاَعَدَّ لَہُمْ اَجْرًا کَرِیْمًا ۝

”انہیں یہ دعادی جائے گی جس روز وہ اپنے رب کریم سے ملیں گے ہمیشہ سلامت رہو اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے

لیے عزت والا اجر۔“

۱۔ اس دن ”نَحِیْمٌ لَّہُمْ“ کے ساتھ مومنین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعادی جائے گی جس دن ان کی ملاقات اپنے رب کریم سے ہوگی، یعنی موت کے وقت یا قبر سے باہر آتے وقت یا جنت میں داخل ہونے کے وقت یا پھر رب کریم کے دیدار کے وقت۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر بطور تحیہ سلام فرمائے گا اور تمام تکالیف وہ امور سے اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ و مامون رکھے گا۔ اس جملہ میں صدر کلام مفعول کی طرف مضاف ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم بن عازبؓ سے روایت ہے کہ **نَحِیْمٌ لَّہُمْ یَوْمَ یُنْفِقُوْنَ** سے مراد وہ دن ہے جس دن ان کی ملاقات ملک الموت سے ہوگی اور سَلَامٌ کا معنی ہے کہ وہ کسی مسلمان پر سلام کے بغیر اس کی روح قبض نہیں کرتا۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب مومن کی روح قبض کرنے کے لیے ملک الموت آتا ہے تو وہ کہتا ہے تیرا رب تجھے سلام فرما رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت انہیں قبروں سے باہر نکالا جائے گا تو ان پر ملائکہ سلام کریں گے اور انہیں خوشخبری سنائیں گے (۲) اور اس نے ان کے لیے عزت والا اجر تیار کر رکھا ہے، یعنی جنت، دیدار الہی اور اللہ تعالیٰ کی رضا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٥١﴾ وَدَاعِيَا إِلَى اللَّهِ
بِأَذْنِهِمْ وَرَاجًا مُنِيبًا ﴿٥٢﴾

”اے نبی (مکرم!) ہم نے تجھے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے ملے اور آفتاب روشن کر دینے والا ہے۔“

اے نبی (مکرم!) ہم نے آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ ابن مبارک نے حضرت سعید بن المسیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہر دن صبح وشام حضور نبی کریم ﷺ پر آپ کی امت پیش کی جاتی ہے پس آپ ﷺ ان کی پیشانیوں سے انہیں پچھاتے ہیں (1)۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ ان کے بارے شہادت دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ کی امت سابقہ امتوں کے بارے یہ شہادت دے گی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام نے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا تو آپ ﷺ اپنی امت کی تصدیق فرمائیں گے۔ اسے امام بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے جی ہاں! پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا انہوں نے تم تک پیغام پہنچایا تھا؟ ﷺ تو وہ کہیں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، ہمارے پاس تو کوئی بھی نہیں آیا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کون تمہاری شہادت دے سکتا ہے؟ تو وہ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ کی امت۔ الحدیث۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں (2)۔ ترکیب کام میں شاہد احوال مقدمہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے مردٹ ہر جمل معہ صفو صائدا بہ غدا۔ اور انہیں خوشخبری سنانے والا جو رسولوں پر ایمان لائے اور انہیں جہنم سے ڈرانے والا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

جے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی طرف بلانے والا یا جنت یا بے کیف و دیدار الہی کی طرف بلانے والا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کے آسان بنانے سے (یعنی اس کی توفیق سے)۔ دعوت کو اذن کی قید سے اس لیے مقید کیا ہے کیونکہ یہ انتہائی مشکل امر ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور معاونت کے بغیر یہ کام نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طرف دعوت دینے کا عمل، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک بندے کا پہنچنا ایک ایسا امر ہے جو اس کے فضل کے بغیر ممکن ہی نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا إِنَّكَ لَا تَهْدِي عَنِ أَهْضَ وَلَئِنْ أَتَيْتَهُ بِقِدْيٍ مِنْ قِدْيَاءِ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ آپ اگر کسی کو ہدایت یاب کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو سیدھے راستہ پر چلانا چاہتا ہے اس کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ حضرت ربیعہ جریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس (حالت خواب میں) کوئی آیا اور آپ ﷺ کو کہا گیا چاہیے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں، چاہیے کہ آپ کے کان سنیں اور چاہیے کہ آپ کا دل سمجھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری آنکھیں سو گئیں، میرے کانوں نے سنا اور قلب نے سمجھا پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ایک سردار نے گھر بنوایا، اس نے اس میں دسترخوان بچھایا اور پھر دعوت دینے کے لیے کسی کو بھیجا۔ پس جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا وہ گھر میں داخل ہوا، اس نے دسترخوان سے کھانا کھایا اور سردار اس سے راضی ہو گیا۔ اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ گھر میں داخل نہ ہوا اور نہ اس نے دسترخوان سے کچھ کھانا کھایا۔ تیجہ سردار اس پر ناراض ہو گیا۔

فرمایا (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ سرور اللہ تعالیٰ ہے۔ دعوت دینے والے محمد ﷺ ہیں، دار یعنی وہ گھر جو سرور دار نے بنوایا وہ اسلام ہے اور دسترخوان سے مراد جنت ہے۔ اسے داری نے روایت کیا ہے۔ (1)

آج اور روشن کر دینے والا آفتاب (بنا کر بھیجا ہے) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سراج (چراغ) فرمایا ہے کیونکہ آپ ﷺ سے ایسے ہی نور اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے جیسے تاریک رات میں چراغ سے روشنی بھی حاصل کی جاتی ہے اور راستے کی راہنمائی بھی۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ اپنی زبان اقدس سے تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے تھے اور اپنے دل اور جسم کے اعتبار سے چراغ کی مثل تھے۔ تمام مومنین آپ ﷺ کے رنگوں سے ہی رنگ حاصل کرتے اور آپ ﷺ کے انوار سے ہی اپنے کو منور کرتے جیسا کہ عالم سورج کے نور سے روشنی حاصل کرتا ہے اور گھر کے چراغ سے نور۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ و دیگر تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ علوم جو امت نے آپ ﷺ کی زبان اقدس سے حاصل کیے ہیں ان میں تو صحابہ کرامؓ اور دیگر لوگوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کے پاس علم پہنچایا جائے وہ بلا واسطہ سننے والے کی نسبت زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔ لیکن وہ نور جو صحابہ کرامؓ کو بلا واسطہ آپ ﷺ کے انوار سے حاصل ہوا وہ اگرچہ اور لوگوں کو صحابہ کرامؓ پھر تابعین پھر تبع تابعین وغیرہ کے واسطہ سے قیامت تک حاصل ہوتا رہا ہے گا لیکن اس میں نائب شاہد کی مثل نہیں ہو سکتا (یعنی وہ لوگ جنہیں یہ فیضان نبوت بالواسطہ پہنچا وہ ان کی مثل اور مساوی نہیں ہو سکتے جنہوں نے یہ فیضان بلا واسطہ حاصل کیا) بلکہ ان کی مثال اس کمرے کی ہے جو محض کے نور سے بالواسطہ روشن ہوتا ہے جبکہ صحن سورج کے مقابل ہونے کی وجہ سے بلا واسطہ اس کی شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ تو صحن اور کمرے کی روشنی میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عطاء بن یسارؓ فرماتے ہیں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ملا۔ تو میں نے ان سے کہا رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف جو تو رات میں میں بیان فرمائیے۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا جی ہاں قسم بخدا آپ ﷺ کے وہ اوصاف جو تو رات میں میں ان میں سے کچھ قرآن کریم میں بھی ہیں مثلاً فرمایا ہے نبی (مکرم!) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور امیوں کے لیے پناہ بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ بد خو اور تند مزاج نہیں ہوں گے، باز اوروں میں چیخ چیخ کر آواز بلند نہیں کریں گے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے (2) بلکہ غمخوار و غمگین نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی روح ہر گز تپش نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ لا الہ الا اللہ کہنے کے سبب صراط مستقیم سے ہٹکی ہوئی ملت پھر صراط مستقیم پر گامزن نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب اندھی آنکھوں، بہرے کا نوں اور بند اور غافل دلوں کو کھول دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح داری نے عطاء بن سلام سے بھی نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔ امام بیہقی نے دلائل النبوة میں حضرت ربیع بن انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب آیت مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَكْلَمْ تَنْزِلَ ہوئی۔ پھر اس کے بعد لَيْفَعْفُورُكَ اللّٰهُ مَا تَلَقَّاهُمْ مِنْ دُحُوكٍ وَمَا تَلَقَّوْهُ تَنْزِيلَ ہوئی تو اہل ایمان میں سے بعض نے آپ ﷺ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا یا رسول اللہ! ﷺ تحقیق ہم نے یہ تو جان لیا جو کچھ آپ کے ساتھ کیا جائے گا (لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں) کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝

”اور آپ مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے۔“

۱۔ (اور آپ مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے۔) اسی طرح ابن جریر نے مکرّم اور حسن سے نقل کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے فرمایا فضل کبیر سے مراد جنت ہے (1) اور یہ جملہ اِنَّا اَوْسَلْنٰکَ پر معطوف ہے۔

وَلَا تُطِيعُوا الْكُفْرَیْنَ وَالسُّفْهَیْنَ وَذَعَاۤءَ لَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِیْلًا ۝

”اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا۔ اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسائی کی۔ اور بھروسہ رکھو اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز۔“

۱۔ اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا ان امور میں جن میں وہ آپ کی شریعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس میں گویا آپ ﷺ کو ان کی مخالفت میں اپنے موقف پر ڈٹے رہنے پر برا بھینٹ کیا جا رہا ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؓ نے فرمایا اسی کا معنی ہے وہ آپ کو جو اذیت پہنچاتے ہیں اس پر صبر اختیار کیجیے (2)۔ اس میں مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ آپ کو جو اذیت دیتے ہیں اسے ایک طرف رکھ دیجیے، اس کی پرواہ نہ کیجیے اور نہ اس کا خوف کیجیے۔ زجاج نے کہا ہے کہ معنی اس طرح ہے کہ آپ ان سے جھگڑا نہ کیجیے اور انہیں اذیت پہنچانے کا قطعاً ارادہ بھی نہ کیجیے۔ اس صورت میں مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

۳۔ اور بھروسہ رکھو اللہ پر کیونکہ وہی آپ کے لیے کافی ہے۔ یعنی جب آپ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں گے تو وہ آپ کے لیے کافی ہوگا۔ وہ کسی غیر کی طرف جانے کے لیے آپ کی کوئی حاجت نہیں رہنے دے گا۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے پانچ اوصاف بیان فرمائے ہیں (یعنی شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ اور سزا جاعیز) اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بالمقابل ایسا خطاب فرمایا جو اس وصف سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن شاہد کے بالمقابل امر کو حذف کر دیا اور وہ ہے تاکنے اور نگاہ رکھنے کا امر۔ اور حذف کا سبب یہ ہے کہ مابعد کلام اسی امر کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ مبشر کے بالمقابل مومنین کی بشارت کا امر ہے، نذیر کے بالمقابل کفار کی بات نہ ماننے اور ان کی اذیت کی پرواہ نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی طرف دعوت دینے والے وصف کے بالمقابل اس پر توکل کرنے کا امر ہے اور سراج منیر کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی بطور کارساز کافی ہے۔ کیونکہ وہ رب کریم جس نے ساری مخلوق سے بڑھ کر آپ کو دلائل سے منور فرمایا ہے حقیقتاً وہی اس لائق ہے کہ کسی غیر کی بجائے صرف اسی پر انکشاف کیا جائے۔ (3)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ
فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَةٍ تَعْتَدُونَهَا فَيَعْبُوهُنَّ وَسَوَّ حُكْمُهُنَّ سَوَّ أَحَابِيثٍ ۝

”اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مومن عورتوں سے۔ پھر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم انہیں باجماع لگاؤ۔ پس تمہارے لیے ان پر عادت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو۔ لہذا انہیں کچھ مال دے دو اور انہیں رخصت کر دو۔“

فولصورتی سے ہے۔“

۱۔ آیت طہ میں صرف مومنات کا ہی ذکر کیا گیا ہے حالانکہ مومن مردوں کا نکاح کتابیہ عورتوں سے بھی جائز ہے اور قبل از دخول طلاق ہونے کی صورت میں ان کا حکم بھی مومنہ عورتوں کی مثل ہی ہے۔ تو اس تخصیص سے فقط اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مومن مردوں کے لائق اور شایان شان یہی ہے کہ وہ مومنہ عورتوں سے نکاح کرے نہ کہ کتابیہ سے۔

۲۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ نکاح سے قبل طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کو نکاح پر مرتب کیا ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کو یہ کہا جب میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے یا یہ کہا برو عورت جس سے میں نکاح کرو تو اسے طلاق ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے اسی اجنبیہ سے نکاح کر لیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یہ قول حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، معاذؓ، جابر اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن المسیبؓ، سعید ابن جبیرؓ، عمروہؓ، قاسمؓ، طاؤسؓ، حسنؓ، مکرّمہؓ، عطاءؓ، سلیمان بن یسارؓ، عکبہؓ، عقیقہؓ، قتادہؓ اور اکثر اہل علم نے کہا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کا موقف بھی یہی ہے (۱)۔ ایسی آزادی جو ملکیت کے ساتھ متعلق ہو اس کے بارے میں ان تمام کا موقف یہی ہے کہ وہ آزادی واقع نہیں ہوگی (مثلاً اگر کوئی کسی غیر کے غلام یا لونڈی کو یہ کہہ دے جب میں تیرا مالک بنوں گا تو تو آزاد ہے۔ بعد میں اس کا مالک ہو گیا تو وہ آزاد نہیں ہوگا)۔ مسئلہ کی مذکورہ صورت میں حضرت ابن مسعودؓ سے یہ مروی ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی یہی موقف ابراہیم نخعیؒ، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور آپ کے صحابہ کا ہے۔ حضرت ربیعہؒ، امام اوزاعیؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے مذکورہ الفاظ کسی معینہ عورت سے کہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر تعین کے بغیر عام عورتوں کے لیے مذکورہ الفاظ کہہ دیے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت مکرّمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے حضرت ابن مسعودؒ کی طرف مذکورہ مسئلہ میں جھوٹی نسبت کی ہے۔ اور اگر تحقیق انہوں نے ایسا کیا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ کسی ایسے مخصوص آدمی کے بارے میں کہا ہو جس نے یہ کہا کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اذْكُرْ أَنكُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَلَكُمْ مِمَّا كَفْتُمْوهَا۔ یہ نہیں فرمایا اذْكُرْ اذْكُرْ مِمَّا كَفْتُمْوهَا (یعنی نکاح کا ذکر پہلے ہے پھر طلاق کا)۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے طلاق کا ذکر ہو پھر نکاح کا)۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے (۳)۔ میں کہتا ہوں کہ حاکم نے مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ مجھے شیخینؒ پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو کیسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ یہ ان دونوں کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کی طلاق کو نکاح کی شرط سے متعلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر آزادی کو ملکیت کی شرط سے متعلق کیا تو اس بارے میں آپ سے دو روایتیں ہیں۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے شہر یا قبیلہ یا صنف یا کسی عورت کو خاص کر دیا اور پھر اس کی طلاق کو نکاح کے ساتھ متعلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اس نے مطلقاً بلا تخصیص عام قول کیا تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے امام احمدؒ کا قول ثابت کرنے کے لیے چھ احادیث سے استدلال کیا ہے۔

(۱) عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کی

طرف سے ایسی عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی جس پر اسے ملکیت نکاح حاصل نہ ہو، اس پر آزادی واقع نہیں ہوتی جس پر ملک رقبہ حاصل نہ ہو اور ایسی شے کی بیع صحیح نہیں ہوتی جس کا وہ مالک نہ ہو (1)۔ اسے ابن جوزی نے امام احمدی سند سے روایت کیا ہے۔ اصحاب سنن نے بھی اسے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا اس باب میں مذکورہ احادیث میں سے یہ احسن ہے۔ بزار نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ نکاح سے پہلے نکاح نہیں اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں۔ امام بیہقی نے خلافت میں کہا ہے کہ امام بخاری نے اس باب کی تمام احادیث میں سے اسے زیادہ صحیح کہا ہے۔

(2) حضرت عمرو بن شعیب نے طاء وک کے واسطے سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس پر ملکیت حاصل نہ ہو اسے طلاق دینا، آزاد کرنا، فروخت کرنا اور اس کی نذر پوری کرنا جائز نہیں اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (2)۔ اور دارقطنی نے ایک دوسری سند سے ابراہیم ابی اسحاق الضریر سے انہوں نے یزید بن عیاض سے انہوں نے زہری سے انہوں نے سعید بن المسیب سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد اگرچہ عید عورت کا نام ذکر کر دیا جائے (3)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہ روایت منقطع ہے اور اس میں راوی یزید بن عیاض متروک ہے۔ علامہ ذہبی نے استیعاب اسماء الرجال میں ذکر کیا ہے کہ امام مالک نے کہا ہے یزید بن عیاض کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے یہ ضعیف ہے اور کسی کام کا نہیں۔ احمد بن صالح نے کہا ہے یہ لوگوں کے لیے حدیثیں وضع کرتا تھا (یعنی اپنی جانب سے بنالیتا تھا)۔ امام بخاری اور امام مسلم نے کہا ہے یہ منکر الحدیث ہے۔ ابوداؤد نے کہا اس کی حدیث چھوڑ دی جائے اور امام نسائی نے کہا ہے یہ متروک ہے اور ایک دوسرے مقام پر کہا ہے یہ کذاب ہے۔

(3) یہ حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ بقیہ بن ولید نے ثوبان بن یزید سے انہوں نے خالد بن معدان سے اور انہوں نے حضرت ابوالعباس خشعی سے ہمیں حدیث بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے چچا نے کہا میرے ساتھ مل کر کام کرو یہاں تک کہ میں تمہارا نکاح اپنی بیٹی کر دوں گا۔ تو میں نے اسے یہ کہہ دیا اگر میں اس سے شادی کروں تو اسے تین طلاقیں پھر کچھ عرصہ بعد مجھے اس سے شادی کرنے کا خیال آیا۔ تو میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اس سے شادی کر لو کیونکہ طلاق نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد پس میں نے اس سے شادی کر لی اور اس سے میرے دو بیٹے اسعد اور سعید پیدا ہوئے (4)۔ امام ذہبی نے میزان میں ذکر کیا ہے کہ امام نسائی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ جب بقیہ بن ولید حدیث اور اخبار کے الفاظ کہے تو وہ ثقہ اور قابل اعتماد ہے۔ لیکن کئی ایک نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مدلس تھا۔ لہذا جب وہ عن فلاں کے الفاظ سے کوئی روایت نقل کرے تو وہ قابل حجت نہیں۔ اور ثور بن یزید ثقہ اور صحیح الحدیث راوی ہے اور اس کا فرقہ قدرے میں شامل ہوتا مشہور ہے۔ چونکہ بقیہ بن ولید نے یہ روایت لفظ عن کے ساتھ بیان کی ہے (اس لیے یہ قابل حجت نہیں)۔ علامہ ابن ہمام نے بھی اس پر ظن کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی علی بن قریں ہے جسے امام احمدؒ نے جھوٹا کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن جوزی نے جس طرح اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ دارقطنی کی سند میں سے نہیں اور نہ اس میں کوئی راوی علی بن قریں ہے۔ واللہ اعلم

(4) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے یہ کہا کہ جس دن

میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ (آیا نکاح کے بعد اسے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟) تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس نے ایسی طلاق دی ہے جس کا وہ مالک ہی نہیں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (۱)۔ اس کی سند میں ایک راوی ابو خالد الواسطی یعنی عمرو بن خالد ہے اس کے بارے میں امام ذہبی نے کہا ہے کہ اسے ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام احمد اور ابن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ ابن عدی نے نافع کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلاق واقع نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد۔ علامہ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ثقہ راوی ہیں۔

(5) طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر (پوری کرنا لازم نہیں ہوتی مگر اس صورت میں جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہو قطع تعلقی کی قسم (صحیح) نہیں ہوتی اور جس کا مالک نہ ہو اسے طلاق دینا یا آزاد کرنا (نافذ العمل) نہیں ہوتا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (2)۔ اور حاکم نے اسے ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس میں بعض راوی غیر معروف ہیں۔ علامہ ابن حجر نے اسی طرح کہا ہے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قبل از نکاح وقوع طلاق کا قول، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا اور اگر کہا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ (یہ قول ایسے آدمی کے بارے میں ہے جو یہ کہے کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَوَلَّيْتُمْ فَلِلَّهِ وَاللَّهِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ** اس طرح نہیں فرمایا **إِذَا تَوَلَّيْتُمْ فَلِلَّهِ وَاللَّهِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ**۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا طلاق قبل نکاح کی روایت کا مرفوعاً حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہوتا صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں صحیح ترین روایت منکر رکی ہے جو انہوں نے طاؤس کے واسطے سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل نقل کی ہے۔

(6) حضرت امام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو سفیان بن حرب کو یمن کے علاقے نجران کا حکم بنا کر بھیجا۔ تو وہ ذمہ دار یاں جو آپ کو تفویض کی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کوئی آدمی ایسی عورت کو طلاق نہ دے جس سے اس نے شادی نہیں کی اور ایسے قلام وغیرہ کو آزاد نہ کرے جس کا وہ مالک نہیں (3)۔ علامہ ابن حجر نے کہا ہے کہ ابن ابی حاتم نے علل الحدیث میں ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ حاکم نے اسے حجاج بن منہال کی سند سے ہشام الدستواہی سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ اسی طرح یہ حدیث حضرت علی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ لیکن یہ اسناد واجب الاجتناب ہیں (ان میں سے کوئی بھی قابل اعتماد نہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے (4) اس کی سند میں ایک راوی جو بیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ حدیث جابر کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اسی بارے میں ایک حدیث حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں ہے (5)۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے موقف کی دلیل یہ ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط کے ساتھ معلق ہو وہ طلاق نہیں ہوتی۔ کیونکہ تعلیق باشرط اس کے مانع ہے کہ وہ

1- سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 16 (الحسان) 2- سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 16 (الحسان)

3- سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 15 (الحسان) 4- سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (ذرات تعلیم) 5- سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (ذرات تعلیم)

طلاق کا سبب بنے، حکم کے مانع نہیں ہے۔ مثلاً کسی کا یہ قول ان دخلت الدار فانت طالق (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق) اور ان نکحتک فانت طالق (اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق)۔ یہ قسم ہے جو گھر میں داخل ہونے اور نکاح کرنے کے مانع ہے۔ اور یہی دونوں طلاق کے وجود کے لیے شرط ہیں۔ پس یہ تعلیق طلاق سے مانع ہے۔ اور یہ ایسا سبب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی جو موجب طلاق ہو۔ کیونکہ یہ دونوں وصف یعنی مانع طلاق ہونا اور موجب طلاق ہونا باہم متضاد ہیں۔ لیکن جب شرط پائی جائے گی تو پھر طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ اس صورت میں یہ طلاق کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور جب تعلیق طلاق نہیں ہے تو پھر آیت طہ سے استدلال صحیح نہیں اور وہ احادیث جو نکاح سے قبل طلاق ہونے کی نفی پر دلالت کرتی ہیں تو ان میں سے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہم حدیثوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور ان کے صحیح نہ ہونے کے اسباب ہم نے پہلے ذکر کر دیئے ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب معلق بالشرط طلاق ہی نہیں تو پھر ان دونوں کے مابین کیا فرق ہے کہ اگر کوئی اجنبیہ عورت سے کہے ان دخلت الدار فانت طالق اور ان نکحتک فانت طالق۔ تو ان دونوں جملوں کی نوعیت ایک ہونے کے باوجود پہلی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی جبکہ دوسری صورت میں شرط پائے جانے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی ہے (تو ان دونوں کے حکموں میں یہ فرق کیوں ہے؟)

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں جملے اسی اعتبار سے مختلف ہیں کہ قسم و اعتبار سے کسی فعل کے کرنے سے مانع ہوتی ہے یا توہر کرنے سے گناہ کا خوف ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کام کی قسم کھانا وغیرہ یا پھر اس کے کرنے سے ایسا خوف لاحق ہو جسے قسم اٹھانے والا پسند نہیں کرتا مثلاً طلاق اور عتاق وغیرہ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر طلاق اور آزادی کو کسی شرط پر معلق کر دیا جائے تو یہ تب ہی اسے کرنے سے مانع ہو سکتے ہیں جب قسم اٹھانے والے کو ان کی ملکیت اور اختیار حاصل ہو (کیونکہ خوف کے سبب وہ اسے کرنے سے رکا رہے گا۔ لہذا اگر اجنبیہ عورت کی طلاق کو اس نے نکاح کی شرط پر معلق کیا تو چونکہ نکاح کے سبب اسے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے یہ قسم ہوگی اور تعلیق صحیح ہوگی۔ نتیجہ نکاح کرنے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) جبکہ اس کے برعکس اگر کوئی اجنبیہ عورت کی طلاق اور اجنبی غلام کی آزادی کو دخول دار کی شرط پر معلق کرتا ہے تو یہ اسے گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی نتیجہ اس صورت میں طلاق بھی واقع نہیں ہوگی اور کلام لغو ہوگا) کیونکہ کسی اجنبیہ کے کسی گھر میں داخل ہونے سے تعلیق کرنے والے کو اس پر ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔ جب ملکیت حاصل نہیں ہوتی تو یہ طلاق وجود شرط کے لیے سبب خوف بھی نہیں بن سکتی، تو جب خوف کا سبب نہیں بن سکتی تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ نتیجہ کلام ہی لغو ہو جائے گا۔

علامہ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ ہمارا مذہب حضرت عمر، ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سالم، قاسم بن محمد، عمر بن عبدالعزیز، شعبی، بخاری، اسود، ابو بکر بن عبد الرحمن اور کھول شامی سے ایسے آدمی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جس نے یہ کہا کہ اگر میں نے فلاں عورت سے شادی کی تو اسے طلاق ہے۔ یا یہ کہا اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے یا ہر دو عورت جس سے میں شادی کروں تو اسے طلاق ہے تو ان تمام مسوئلوں میں مذکورہ بالا جملہ القدر افراد نے یہ کہا ہے کہ ایسے ہی ہوگا جیسے اس نے کہا ہے (یعنی نکاح ہونے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی)۔ علاوہ ازیں ہمارا مسلک حضرت سعید بن المسیب، عطاء، حماد بن ابی سلیمان اور شریح رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی منقول ہے۔

امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط سے معلق ہو تو وہ طلاق ہے اور تعلیق سبب کے لیے سبب بننے سے مانع نہیں بلکہ یہ حکم سے مانع ہے۔ جیسا کہ ایسی بیعت جس میں اختیار شرط ہو (تو وہ بیعت ہی ہوتی ہے مشتری یا بائع کا خیال اس کے لیے بیعت ہونے سے مانع نہیں۔ البتہ عدت خیار کے اختتام تک حکم یعنی تعلیق کی ملکیت کے حصول کے مانع ہیں) اور حضرت ابو بعلہہ خشعی کی حدیث اس بارے میں ایک واضح نص ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسے ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر کوئی طعن وغیرہ نہیں کیا حالانکہ وہ اظہار حق میں غیر متعمد اور بے باک ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد اگر لامی اطلاق قبل النکاح اور اس کے ہم معنی الفاظ کے ذریعے طلاق کو نکاح پر معلق کرنے سے منع کیا گیا ہے (اگر نبی کے معنی لیے جائیں)۔ یا پھر اس کی نفی کی گئی ہے اور نکاح سے قبل بالفور طلاق ہونے کی تو کسی عقلمند سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے لہذا حضور نبی کریم ﷺ کے کلام کو اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کلام ایسے آدمی کے قول کی مثل ہو جاتا ہے جو یہ کہے جو یہ انہیں ہوا اس پر نماز فرض نہیں ہے (یعنی پیدا ہونے سے پہلے اس پر نماز فرض نہیں ہے)۔ آیت میں اس کرنے سے مراد جماعت کرنا ہے۔

عدت سے مراد وہ ایام ہیں جن میں عورت انتظار کرتی رہتی ہے اور ان ایام میں اس کے لیے نکاح ممنوع ہوتا ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے اور قول باری تعالیٰ فَمَّا لَكُمْ میں اس پر دلیل ہے کہ عدت مردوں کا حق ہے کیونکہ اس کا مقصود پانی کی حفاظت اور نسب میں جنگ داخل ہونے سے محفوظ رکھنا ہے اور نسب کی نسبت مردوں کی طرف ہی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ جب کسی ذمی مرد نے ذمیہ عورت کو طلاق دی اور وہ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ اس کی عدت نہیں ہے تو ایسی عورت پر عدت نہیں ہوگی۔ اور اگر اس کے معتقدین عدت واجب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوں تو اس عورت پر عدت واجب ہوگی اور جب کوئی حربیہ (دارالحرب میں رہنے والی) مسلمان ہو کر ہماری طرف آئے گی تو اس پر عدت نہیں ہوگی اور اگر اس نے بالفور شادی کر لی تو اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ حربی عورت جمادات کی مثل ہے یہاں تک کہ دیگر سامان کی طرح اس کا بھی مالک بنا جاسکتا ہے۔ لہذا اس کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ مگر جب عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک انتظار ضروری ہے کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ ثابت الاسب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ اس سے نکاح تو جائز ہے لیکن اس سے قربت جائز نہیں جیسا کہ حاملہ من الولد کا حکم ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہمتعواھن کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ عورت کے لیے مہر مقرر کیا جائے تو اس صورت میں عورت کے لیے متعہ ہوگا۔ اور اگر عورت کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو تو مذکورہ صورت میں اس کے لیے نصف مہر ہوگا اور اس کے لیے متعہ نہیں ہوگا (1) (متعہ سے مراد تین کپڑے ہیں قیص، تہبند اور اوڑھنی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ آیت عام مخصوص عند البعض ہے۔ اور قادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس قول سے منسوخ ہے فَيُضْفَ مَا قَرَضْتُمْ (2)۔ دونوں قولوں کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ایسی عورت جس کے لیے مہر مقرر کیا جائے اور پھر جس کرنے سے قبل اسے طلاق ہو جائے تو اسے متعہ دینا واجب ہے اور نہ متعہ (بلکہ اسے نصف مہر دیا جائے گا)۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے لہذا نصف مہر کے ساتھ عورت کو متعہ دینا مستحب ہے۔ اور حضرت حسن اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس آیت کے مطابق عورت کے لیے متعہ واجب ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت فَيُضْفَ مَا قَرَضْتُمْ کے مطابق نصف مہر لازم ہے۔ ہم نے متعہ کے وجوب، استحباب اور اس کی

مقدار کے بارے میں تفصیلی اختلاف سورۃ البقرہ میں ذکر کر دیا ہے یہاں اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہیں اپنے گھروں سے رخصت کر دو اور ان کے راستے خالی کر دو کیونکہ تمہارے لیے ان پر کوئی عادت وغیرہ نہیں۔ بغیر کوئی تکلیف اور ضرر پہنچانے بڑی خوبصورتی کے ساتھ (انہیں رخصت کر دو)۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ
يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَ بَنَاتِ عَمَّتِكَ وَ بَنَاتِ خَالِكَ وَ بَنَاتِ
خُلَّتِكَ الَّتِي هَاجَزْنَ مَعَكَ وَ أَمْرًا كَأَمْرُؤَمَةٍ إِن وَ هَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ
أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا
مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ
حَرَجٌ وَ كَانَ اللَّهُ عَفُورًا رَحِيمًا ۝

”اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لیے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں۔ اور آپ کی کنیزیں جو اللہ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں۔ اور آپ کی چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالائوں کی بیٹیاں جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ۔ اور مومن عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کر دے۔ اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں۔ تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے، ہمیشہ مہر فرمانے والا ہے۔“

۱۔ اُجُورُ نرہن سے مراد ان کے مہر ہیں۔ کیونکہ مہر ملک وضع کا اجر ہوتا ہے۔ یہاں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ازواج کے حلال کرنے کو مہر کی ادائیگی سے متعین کرنا امر واقعہ کے مطابق ہے اور آپ ﷺ کی عین عادت شریف کے بیان کے لیے ہے کیونکہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے مہر انہیں بالغورا وافر مادیات تھے۔ یا اس قید کا مقصد بالغور مہر کی ادائیگی کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے۔ اور بالا جماع یہاں مفہوم مخالف مراد نہیں (یعنی یہ متقی ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ اگر کسی بیوی کا مہر فقہانہ کیا گیا ہو تو وہ آپ کے لیے حلال تھی)۔

۲۔ اور آپ کی کنیزیں جو اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف سے آپ کو مال غنیمت کے طور پر عطا فرمائی ہیں اس طرح کہ انہیں قیدی بنایا گیا اور آپ ان کے مالک بن گئے مثلاً حضرت صفیہ اور جویریہ (وہ بھی آپ کے لیے حلال کر دی گئی ہیں)۔ اَمَّا عَلَیْكَ اللَّهُ عَلَیْكَ کی قیدی بھی اجزائی نہیں اور مفہوم مخالف کے قائلین کے نزدیک بھی اس میں مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قیدی بنا کر نہیں لائی گئی تھیں بلکہ مقتول شاہ مصر نے وہ آپ ﷺ کی ہارہ میں بطور مدبہ اور تحفہ پیش کی تھیں۔

۳۔ وَ بَنَاتِ عَمَّتِكَ وَ بَنَاتِ خَالِكَ وَ بَنَاتِ خُلَّتِكَ سے مراد نبی زہرہ کی بیٹیاں ہیں اور النبی هَاجَزْنَ مَعَكَ سے مراد وہ ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ اس میں لفظ مع نفس فعل میں موافقت کے اثبات کے لیے ہے زمانے اور وقت میں موافقت کے لیے نہیں (یعنی وہ جو فعل ہجرت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ مراد انہیں کرنا ہوں نے ہجرت

آپ کی رفاقت اور معیت میں کی ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں لفظ مع موافقت فعلی کے لیے ہے اَمْسَكَتُمْ مَعَهُ سَلْبَتَيْنِ۔ گویا آیت میں مطلقاً ہجرت کرنے والی عورتیں مراد ہیں (چاہے انہوں نے ہجرت آپ ﷺ سے پہلے کیا یا بعد میں)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے مذکورہ خاندانوں میں سے جن عورتوں نے ہجرت نہیں کی ان کے ساتھ آپ ﷺ کا نکاح جائز نہیں تھا (1)۔ امام ترمذیؒ نے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے سدی کی سند سے حدیث نقل کی ہے اور اسے صحیح کیا ہے۔ کہ وہ ابو صالحؒ سے اور حضرت ابن عباسؓ کے واسطے سے ام ہانی بنت ابی طالبؓ سے روایت کیا ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے پیغام نکاح بھیجا تو میں نے معذرت پیش کر دی۔ پس آپ ﷺ نے میرا عذر قبول فرمایا پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں آپ ﷺ کے لیے حلال ہی نہ رہی۔ کیونکہ ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے نہیں تھی اور میں طلاق میں سے تھی (2)۔ (یعنی میں ان میں سے تھی جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن آزادی عطا فرمادی تھی)۔ ابن ابی حاتم نے اسماعیل بن ابی خالد کی سند سے ابو صالحؒ سے اور انہوں نے ام حانیؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے وَ هَبْتَ عَمَّكَ وَ هَبْتَ عَمَّتِكَ وَ هَبْتَ خَالَكَ وَ هَبْتَ خَالَتَكَ وَ هَبْتَ خَالَتَكَ وَ هَبْتَ خَالَتَكَ وَ هَبْتَ خَالَتَكَ وَ هَبْتَ خَالَتَكَ۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ پھر حلت کے لیے ہجرت کی شرط منسوخ کر دی گئی (3)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے یعنی جو آپ ﷺ کے ساتھ اسلام لائیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مہاجر وہ ہے جس نے اس عمل کو چھوڑ دیا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ان کی اس تاویل کے مطابق آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے غیر مسلمہ سے نکاح حلال نہیں تھا چاہے وہ یہودیہ ہو یا نصرانیہ۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ غیر مومنہ عورت جب اپنی جان نبی کی نذر کر دے تو وہ آپ ﷺ کے لیے حلال نہیں (اور مومنہ کی قید سے یہی ثابت ہوتا ہے)۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا مہر کے عوض آپ ﷺ کے لیے یہودیہ اور نصرانیہ سے نکاح کرنا حلال تھا؟ تو اس بارے میں ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے ان سے نکاح کرنا حلال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ امْرَاةٌ مُؤْمِنَةٌ۔ اور ہم نے بعض کی جانب سے قول باری تعالیٰ الَّذِي هَاجَرْنَا مَعَكَ کی تاویل بھی ذکر کر دی ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے (4)۔ (جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلمہ سے آپ کا نکاح جائز نہیں تھا)۔ ما قبل کلام کی وجہ سے یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے۔ اور امْرَاةٌ اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر ما قبل فعل کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَ نَحْلُ لَكَ امْرَاةً مُؤْمِنَةً۔ یا یہ سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ اور اس کے لیے ”انی“ جو کہ استقبال کا معنی دیتا ہے سے متقدم کرنا باعث حرج نہیں۔ کیونکہ یہاں احلال کا معنی ہے حلال ہونے کی خبر دینا۔ یعنی ہم نے آپ کو اس مومنہ عورت کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے کی اطلاع دے دی ہے جو اپنی جان آپ ﷺ کی نذر کر دے اور مہر کا مطالبہ نہ کرے (یعنی آپ اس سے نکاح کر سکتے ہیں) اگر کہیں ایسا اتفاق ہو۔ اسی وجہ سے اسے نکرہ ذکر کیا ہے۔

یہ اِنْ اَمْرًاۤ اِلٰہِیُّ اَنْ یَسْتَدِیْجَہَا بِہِیْ شَرْطٍ کے لیے معنی شرط ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے جس نے اپنی جان بہیک ہے تو ہم نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے اگر وہ اپنی جان نذر کر دے۔ کیونکہ اپنی جان بہید کر دینا نکاح کا ایک رکن ہے جو کہ اس کی جانب سے اسباب کے قائم مقام ہے۔ اور آپ ﷺ کے لیے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوگا جب تک کہ نبی کریم ﷺ اس سے نکاح کا ارادہ نہ فرمائیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارادہ اس کے لیے قبول کے قائم مقام ہے جس کے ساتھ نکاح مکمل ہوتا ہے۔ پس حلت دوشرطوں پر موقوف ہے اور وہ دونوں علت یعنی نکاح کے لیے رکن ہیں۔ لفظ نبی کو مکرر لانے کے سبب خطاب سے غیب کی طرف عدول کیا گیا تھا۔ پھر اسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرمایا خَالِصَةً لِّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِیْنَ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ ان پر جماع یا موت کے سبب بہر دینا واجب ہوتا ہے اگرچہ عقد نکاح کے وقت اس کا ذکر بالکل نہ کیا جائے لیکن آپ ﷺ کے شرف نبوت کے اظہار اور استحقاق کرامت کی مضبوطی کے لیے آپ کو یہ خصوصی اجازت عطا فرمائی گئی (کہ آپ بلا مہر نکاح کر سکتے ہیں)۔ خَالِصَةً عَاقِبَہ کے وزن پر مصدر ہے جو تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے یعنی خلص احلال ما احللنا لک علی المقہود المذکورہ خلوصاً لک۔ (مذکورہ قیود کے مطابق ہم نے جو عورتیں آپ کے لیے حلال کی ہیں وہ تو خلیل صرف آپ ہی کے لیے ہے)۔ یہ مفہوم تب ہی متصور ہو سکتا ہے جب مذکورہ قیود احترازی ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خالصۃ وہبت کی ضمیر سے حال ہے اور سخی یہ ہوگا کہ اگر وہ اپنے آپ کو بغیر مہر کے بہر کر لے اس حال میں کہ وہ صرف آپ ہی کے لیے ہو۔ یا پھر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی حبۃ خالصۃ۔ قول باری تعالیٰ وَاصْرَافًا مُّوَسَّعًا اَلَا یَہْدٰی سَعْدُ نے حضرت نیکر مہر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ام شریک دوسرے کے بارے نازل ہوئی (۱)۔ ابن سعد نے منیر بن عبد اللہ دوسی سے نقل کیا ہے کہ ام شریک عزیمت بنت جابر بن حکیم دوسی نے اپنے آپ کو حضور نبی کریم ﷺ پر پیش کیا۔ یہ بہت خوبصورت تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں قبول فرمایا پھر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا وہ عورت جو اپنی جان مرد کے لیے بہر کر دیتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ ام شریک نے کہا پس میں ہی وہ ہوں پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مومن کا نام دیا اور فرمایا وَاصْرَافًا مُّوَسَّعًا اِنْ وَهَبْتَ نَفْسَہَا لِلنَّبِیِّ۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ کی خواہش جلد پوری فرمادیتا ہے (2)۔ ابن سعد نے ابوزین سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں میں سے کسی کو طلاق دینے کا قصد فرمایا۔ پس جب انہوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے نفوس کے حقوق کے بارے آپ کو آواز دیا۔ آپ عورتوں میں سے جسے چاہیں ترجیح دے سکتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اِنَّا اَخْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ سے شروع فرمایا تَشَاءُ وَمِنْہِ اِنْ یَہْدٰی تَبَکَ آیات نازل فرمائیں۔ (3) اور قول باری تعالیٰ خَالِصَةً لِّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِیْنَ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ بغیر مہر کے آپ کے لیے نکاح کرنا جائز ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ وَهَبْتَ نَفْسَہَا لِلنَّبِیِّ سے بھی مراد ہے۔ یعنی اگر کسی نے بغیر مہر کے اپنی شادی کر لی جیسا کہ چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ لفظ بہر سے نکاح کا منعقد ہونا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ کسی غیر کے لیے یہ جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہی قول حضرت سعید بن المسیب، زہری، مجاہد اور عطاء کا قول بھی ہے اور ربیع، امام مالک رحمۃ

اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے (1)۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کا نکاح لفظ نکاح اور تزویج کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ امام احمد نے بھی یہی کہا ہے۔ اور آیت کے ترجمہ میں ائمہ کے اختلاف میں امام احمد کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ بہہ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ مزید ذکر کیا جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ لفظ بہہ کے ساتھ نکاح کا منعقد ہونا حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک کا نکاح لفظ بہہ، بیع، صدقہ اور تملیک کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر اس لفظ کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے جو ہمیشہ کے لیے معین چیز کی تملیک کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اور لفظ اجارہ اور اعارہ سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔

امام کرغنی نے کہا ہے کہ لفظ اجارہ اور اعارہ سے بھی نکاح جائز ہوتا ہے کیونکہ ان سے بھی منفعت حاصل کرنے کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اور نکاح میں بھی منفعت کے حصول کی تملیک ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد اَرْوُاجَكَ الْبَيْتِ اُجُوْرُهُنَّ میں مہر پر لفظ اجرت کا اطلاق کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں چونکہ لفظ اجارہ اور اعارہ ملک متعہ کے حصول کا سبب نہیں بن سکتے اس لیے انہیں بطور استعارہ نکاح کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح لفظ وصیت سے بھی نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وصیت موت کے بعد ملکیت کا سبب بن سکتی ہے (پہلے نہیں)۔ امام مجاہدؒ نے ذکر کیا ہے کہ لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے ملک رقبہ تو ثابت ہو جاتی ہے۔ اور امام کرغنی نے لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہونے کے لیے اسے ایسے لفظ کی قید تفسیر کیا ہے جو زمانہ حال پر دلالت کر رہا ہو مثلاً کسی نے یہ کہا او وصیت لک بنی ہذہ الان (میں نے تیرے لیے اپنی اس بیٹی کی اب وصیت کر دی، یعنی اسے تیرے نکاح میں دے دیا) تو اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا کیونکہ اس صورت میں لفظ وصیت مجازاً تملیک کے معنی میں ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ لفظ وصیت کے مفہوم میں اضافت کا معنی لیا جاتا ہے (یعنی لفظ وصیت کے مفہوم سے ہی تملیک بعد الموت کا معنی ماخوذ ہوتا ہے) جبکہ لفظ نکاح کے مفہوم میں اضافت کا معنی نہیں پایا جاتا (یعنی لفظ نکاح سے تملیک دائمی کا معنی ماخوذ ہوتا ہے)۔ اس طرح یہ دونوں لفظ باہم متضاد ہیں (لہذا یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال نہیں ہو سکتے) اور ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح عام افراد امت کا نکاح لفظ نکاح یا تزویج کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ان دونوں لفظوں کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَنْكِحَ فَاِنْ يَشَاءُ فَاِنْ يَشَاءُ فَاِنْ يَشَاءُ اور آیت طیبہ میں نکاح پر لفظ بہہ کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے۔ علامہ بیضاوی نے اس آیت سے امام شافعی کے مسلک پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے اور اس پر تو اجماع ہے کہ معنی طور پر یہ حکم (بغیر مہر کے نکاح کا جائز ہونا) حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ متحقق ہے (2)۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ بہہ سے نکاح کا انعقاد بھی آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا)۔ علامہ بیضاوی کا یہ قول درست نہیں ہے۔ کیونکہ مجازی طور پر لفظ بہہ سے نکاح مراد لیتا جائز ہے۔ اور لفظ نکاح کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی سبب نہیں۔ اور نکاح لفظ بہہ کا مجازی معنی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں یہ قطعاً تخصیص نہیں کہ اس کا مجازی معنی صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں حقیقی معنی بالحقین مراد نہیں۔ کیونکہ لفظ بہہ کا حقیقی معنی تملیک المعین (معینہ شے کا مالک بنانا) ہے۔ اور یہ معنی یہاں مراد نہیں بلکہ یہاں اس سے مراد بغیر عوض کے بیع کا مالک بنانا ہے۔ تو جب لفظ بہہ کا مجازی معنی آپ ﷺ کے ساتھ متحقق

ہے۔ اور لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بغیر کسی کے لیے لفظ بہہ کے ساتھ مجازی طور پر نکاح کرنا جائز نہیں۔ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ لفظ بہہ کا مجازی معنی صرف بلا عرض تملیک بضع میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ لفظ بہہ بولا جائے اور اس سے مراد مطلقاً تملیک بضع ہو چاہے وہ عوض کے ساتھ حاصل ہو یا بغیر عوض کے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ کلام طریق مجاز کے متحقق ہونے کے بارے میں ہے اور امام شافعیؒ نے اس کی نفی کر دی ہے کیونکہ وہ دلیل جس کے سبب مجازی معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے وہی موجود نہیں۔ آپ نے اس پر اجماعی دلیل قائم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی لفظ سے مجازی معنی مراد لینا صحیح ہو تو پھر دونوں الفاظ میں سے ہر ایک سے دوسرے کا معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے۔ لہذا انکسرتک هذا الثوب بول کر اس سے وہبتک یا ملکسرتک مراد لینا جائز ہے (لیکن اس طرح کہنا لغت کے خلاف ہے) اور اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر مجازی معنی مراد لینا صحیح نہیں ہوتا۔ تفصیلی دلیل یہ ہے کہ وضع کے اعتبار سے لفظ تزویج کا معنی تلفیق (دو چیزوں کو باہم جوڑ دینا اور ملا دینا) ہے۔ اور لفظ نکاح کا معنی بھی ملا دینا اور جمع کر دینا ہے۔ لیکن مالک اور مملوک کے درمیان تو ازدواج اور ضم کا معنی قطعاً موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک جب دوسرے کا مالک بنتا ہے تو ان کا نکاح فاسد ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ملکیت نکاح کے منافی نہ ہوتی تو نکاح اس کے سبب مزید پختہ ہو جاتا (لہذا لفظ بہہ سے نکاح مراد لینا صحیح نہیں ہے)۔ امام شافعیؒ کے خلاف ہماری اجماعی دلیل تو یہ ہے کہ اگر بہہ اور نکاح کے درمیان مجازی معنی کے صحیح ہونے کے لیے کوئی علاقے موجود نہیں تو پھر لفظ بہہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا نکاح بھی صحیح نہیں ہونا چاہیے حالانکہ وہ تو جائز ہے۔ اور جب مجاز صحیح ہونے کے لیے لفظ بہہ اور بلا عرض نکاح کے درمیان علاقہ ثابت ہے تو وہ مطلق نکاح اور بہہ کے درمیان بھی بالیقین ثابت ہوگا کیونکہ شخص کے ضمن میں اہم بھی پایا جاتا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ بہہ کا حقیقی معنی تملیک العین (نفس شے کا مالک بنادینا) ہے۔ اور تملیک العین ملک رقبہ کے واسطے سے ملک متعہ کے لیے اس کے محل میں سبب ہے۔ اور ملک متعہ اپنے محل میں نکاح سے ثابت ہوتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ بہہ اور نکاح کے مابین علاقہ سببیت موجود ہے) اور سببیت بطریق مجاز ہے (اس لیے لفظ بہہ بول کر نکاح مراد لینا صحیح ہے)۔ رہا مسئلہ یہ کہ پھر لفظ نکاح کو بطریق مجاز تملیک عین کے لیے بولنا کیوں جائز نہیں۔ تو یہ مسئلہ کتب اصول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمارے نزدیک مجازی طور پر سبب کے لیے مسبب کا استعمال جائز نہیں۔ مگر جبکہ سبب سے مقصود اس کی مشروعیت ہو۔ جیسا کہ لفظ بیع ملک رقبہ کے حصول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور وہ ملک متعہ جو موجب نکاح ہے وہ تملیک کا مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصود ملک رقبہ ہے۔ اور امام شافعیؒ کا یہ قول کہ مالک اور مملوک کے درمیان نہ ازدواج ہے نہ ضم۔ تو یہ قول ممنوع ہے قابل تسلیم نہیں۔ واللہ اعلم۔ علامہ لغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضور نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت تھی جس نے اپنی جان آپ ﷺ کو بہہ کر دی تھی؟ اور اس کے بارے حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس سے آپ نے عقد نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپ کی ملکیت میں (لغوی) نہ ہو۔ اور قول باری تعالیٰ اِنَّ زَوْجَہٗنَّ لَفِیْ شَرِّ طَرِیْقٍ پر ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایسی عورتیں تھیں۔ امام ضعیف نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک عورت زینب بنت خزیمہ انصاریہ تھی جسے ام المومنینؓ کہا جاتا تھا قتادہ نے کہا ہے کہ ان میں سے میمونہ بنت حارث تھی۔ حضرت علی بن حسینؓ، ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ بنی اسد میں سے ام شریک

بنت جابر تھی (1)۔ ابن سعد نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ام شریک بنت جابر تھی۔ اور عروہ بن زبیر نے کہا ہے کہ وہ بنی سلیم میں سے خولہ بنت حکیم تھی (2)۔

یہ ہمیں غیب علم ہے جو ہم نے واجب کیا ہے مومنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں۔ مثلاً نکاح کی شرائط، باری کی تقسیم، ولی کے سبب مہر کا لازم ہونا جبکہ پہلے مہر مقرر نہ کیا جائے اور یہ کہ وہ چار سے زیادہ عورتوں سے شادی نہ کریں۔ اور کنیزوں کے بارے میں چاہے انہیں خریدا گیا ہو یا کسی اور طریقے سے ملکیت میں آئی ہوں۔ اور کنیز ایسی ہو جو اپنے مالک کے لیے حلال ہو مثلاً کتابیہ بخلاف مجوسیہ (آتش پرست) اور وحشیہ (بت پرست) کے (کیونکہ یہ مالک کے لیے حلال نہیں ہوتی) اور ولی سے قبل استبراء رحم کرنا۔ ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے وسعت دیتے ہوئے ان کی تعداد مقرر نہیں فرمائی اور ان کے درمیان باری کی تقسیم بھی واجب نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مترغہ ہے۔

یہ تاکہ آپ پر کسی قسم کی غلطی نہ ہو۔ یہ قول باری تعالیٰ خالصۃً کے متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو بہت بخشے والا ہے جن سے بچنا اور پرہیز کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ جہاں حرج اور غٹگی کا گمان ہو وہاں وسعت اور گنجائش پیدا فرما کر وہ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ کیا عورت کو حیا نہیں آتی کہ وہ اپنا نفس بہہ کرتی ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نافذ فرمائی۔

تُرْجَىٰ مِنْ تَسَاءَلٍ مِّنْهُنَّ ۖ وَتُؤْمَىٰ إِلَيْكَ مِنْ تَسَاءَلٍ ۖ وَهَمَّ ابْتِغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَٰلِكَ أَذْنٰی أَنْ تَقْرَأَ عَنِّيْهِنَّ وَلَا يَحْزَنَ ۚ وَيَرْضَيْنَ بِمَا
أَتَيْتَهُنَّ كَلِمَةً ۖ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوْبِكُمْ ۖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝۱۰ لَا يَحِلُّ
لَكَ الْبَسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ
إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝۱۱

” (آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے لے اور اپنے پاس رکھیں جس کو آپ چاہیں لے اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضاقتہ نہیں۔ اس (رضعت) سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں بخشنے ہوں گی اور وہ آزرہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے سب اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا ہر بار ہے ہے حال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس کے بعد لے اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کر لیں ان ازواج سے دوسری بیویاں لے اگرچہ آپ کو پسند آئے ان کا سن بے بجز کنیزوں کے ۱۱ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔“

۱۰ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں دیکھ رہی ہوں آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلد پوری فرما دیتا ہے۔ اور ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں ان عورتوں کو عار دلاتی تھی جو اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لیے بہہ کرتی

تھیں اور میں کہتی تھی کیا ایک عورت بھی اپنے آپ کو بہہ کر سکتی ہے پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو جن میں سے ایک آدمی نے لایہ تو میں نے کہا میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرما دیتا ہے (1)۔ نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے غزوہ جحہ کو یاہ ساکن کے ساتھ بغیر حمزہ کے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے حمزہ مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے جسے چاہیں آپ دور کر دیں۔

یہ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ یہ آیت ازدواج کے درمیان باری تقسیم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ پر ازواج مطہرات کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات واجب تھی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ سے یہ وجوب ساقط ہو گیا۔ اور آپ ﷺ کو ان کے بارے میں اختیار حاصل ہو گیا۔ ابو زید اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ بعض امہات المؤمنین نے حضور نبی کریم ﷺ پر رشک کیا اور بعض نے نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کر دیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک ان سے علیحدگی اختیار فرمائی۔ یہاں تک کہ آیت تکمیل نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں دینا اور آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اختیار دے دیں۔ پس ان میں سے جو دنیا کو اختیار کر لے اسے آزاد چھوڑ دو اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کو اختیار کرے اسے اپنے پاس روک لو۔ اس کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ امہات المؤمنین ہیں۔ اس لیے وہ کبھی بھی کسی اور سے نکاح نہیں کریں گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ کو یہ اختیار ہے آپ ان میں سے جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں گے اور جسے چاہیں اپنے سے دور کر دیں گے۔ پس وہ تمام آپ ﷺ کے ساتھ راضی ہو گئیں، چاہے آپ ان کے لیے باری مقرر فرمائیں یا مقرر نہ کریں یا ایک کے لیے زیادہ وقت مقرر کریں اور دوسری کے لیے کم۔ یا آپ ان میں سے بعض کو نفقہ اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت دیں۔ یہ تمام اختیارات آپ ﷺ کے پاس ہوں گے آپ جیسے پسند کریں گے وہی کریں گے۔ یہ اختیار بھی حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ پس وہ ان شرائط پر آپ ﷺ سے راضی ہو گئیں اور انہوں نے آپ کو اختیار کر لیا (2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے بلکہ امت کے لیے بھی حکم اسی طرح ہے۔ پس وہ آدمی جس کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں۔ اور وہ اس سے اپنے حقوق نکاح نفقہ اور باری تقسیم میں مساوات کا مطالبہ کر دیں اور وہ آدمی ان سے یہ کہے فَعَالَتَيْنِ اُفْتَعِلْنِ وَالْمَرْحُومَتَيْنِ سَمَّا حَا جَبِيْلًا (کہ آؤ میں تمہیں سامان دوں اور تمہیں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں)۔ اور جو تم میں سے نفقہ کے مطالبہ کے بغیر میرے ساتھ نکاح باقی رکھنے پر راضی ہو، اس شرط پر کہ تم میں سے جسے چاہوں گا اپنے پاس رکھوں گا اور جسے چاہوں گا اپنے سے دور کر دوں گا، چاہے میں تمہارے لیے باری مقرر کروں یا نہ کروں یا بعض کے لیے زیادہ اور بعض کے لیے کم مقرر کروں یا تم میں سے بعض کو نفقہ، لباس اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت اور ترجیح دوں۔ پس اس کے جواب میں ان عورتوں نے اسے کہہ دیا کہ ہم تجھے اختیار کرتی ہیں اور ہم نے نفقہ اور باری میں سے اپنا حق چھوڑ دیا ہے۔ تو اس صورت میں تمام اختیارات مرد کو حاصل ہو جائیں گے وہ جیسے چاہے وہی کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں علماء کی مختلف روایات ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعض ازواج مطہرات میں سے کسی کو باری سے خارج کیا تھا یا نہیں۔؟ تو اس کے بارے میں بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی کو باری سے خارج نہیں

فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ تمام اختیارات ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات اختیار فرمائی۔ مگر حضرت سودہؓ بذات خود اپنا حق چھوڑنے پر راضی ہو گئیں اور آپ ﷺ نے ان کی باری کا دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ابن جریر نے منصور کے واسطے سے اور زین سے یہ نقل کیا ہے کہ جب آیت تحفیر نازل ہوئی تو ازواج مطہرات کو خطرہ لاحق ہوا کہ آپ ﷺ انہیں طلاق دے دیں گے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اپنے مال اور نفس میں سے جو چاہیں ہمیں عطا فرمائیں لیکن ہمیں ہمارے حال پر ہی رہنے دیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں اپنے سے دو فرما دیں تو پھر آپ ﷺ نے بعض کو دو فرما دیا۔ اور بعض کو اپنے پاس رکھا جنہیں اپنے پاس رکھا ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن تھیں آپ ﷺ ان کے درمیان باری کی تقسیم مساوی کرتے تھے۔ اور جنہیں آپ نے دو فرما دیا وہ پانچ تھیں یعنی حضرت ام حبیبہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہن۔ جب آپ ان کے لیے جاتے تھے باری بنا لیتے تھے (۱)۔ امام بخاری نے حضرت معاذہ کے واسطے سے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آیت طیبہؓ کی شجرہٗ من شجرۃ اللہ نازل ہونے کے بعد کسی زوجہ کی باری کے دن ہم سے اجازت طلب فرماتے تھے۔ تو حضرت معاذہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے عرض کی، پھر آپ کیا کہتی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا میں آپ ﷺ سے یہ عرض کرتی تھی یا رسول اللہ! ﷺ اگر اس کا اختیار میرے پاس ہے تو میں نہیں چاہتی کہ اپنے معاملہ میں کسی اور کو اپنے آپ پر ترجیح دوں۔ (۲) مجاہد نے کہا ہے کہ شجرہٗ من شجرۃ اللہ کا معنی یہ ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہتے ہیں بے غرضی طلاق کے طیبہ کر دیں اور پھر جب چاہیں تجدید نکاح کے بغیر انہیں واپس لے آئیں (۳)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں طلاق دے دیں اور جنہیں چاہیں اپنے پاس روک لیں۔ حسن نے کہا ہے اس کا معنی ہے اپنی امت کی عورتوں میں سے جس سے چاہیں نکاح نہ کریں اور جس سے چاہیں نکاح کر لیں اور کہا کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کسی عورت کو پیغام نکاح بھیجتے تھے تو پھر کسی اور کے لیے اسے پیغام نکاح دینا جائز نہیں تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ اس سے دستبردار ہو جاتیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جن مومنہ عورتوں نے آپ کے لیے اپنی جانیں بہک دی ہیں آپ ان میں سے جنہیں چاہیں انہیں قبول کر لیں اور انہیں اپنے پاس روک لیں اور جنہیں چاہیں انہیں چھوڑ دیں اور قبول نہ کریں (۴)۔ علامہ بخاری نے ہشام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خولہ بنت حکیم ان عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے اپنی جانیں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے بہک دی تھیں۔ تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا کیا کسی عورت کو اپنا نفس مرد کے لیے بہک کرنے سے حیا نہیں آتی۔ پھر جب یہ آیت شجرہٗ من شجرۃ اللہ نازل ہوئی تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرما دیتا ہے۔ (۵)

جس اور اگر آپ دوبارہ ان عورتوں میں سے کسی کو اپنے پاس رکھنے کی طلب اور ارادہ کریں جنہیں آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ (گناہ) نہیں۔ اور یہ اختیار جو آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔ یہ ان کی آنکھوں کو کھنڈا کرنے، ان کے غمزہ نہ ہونے اور ان تمام کی رضا اور خوشی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ اس میں ان تمام کے لیے حکم برابر ہے۔ پھر آپ ان میں سے جسے اپنے پاس روک

1- تفسیر بخاری، جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ (التجاریہ) 2- صحیح بخاری، جلد ۲ صفحہ ۷۰۶ (دراستہ تعلیم)

3- تفسیر بخاری، جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ (التجاریہ) 4- تفسیر بخاری، جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ (التجاریہ) 5- تفسیر بخاری، جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ (التجاریہ)

لیس گئے وہ اسے فضل اور مہربانی تصور کرے گی اور جسے آپ علیحدہ فرما دیں گے وہ یہ یقین کرے گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا ہے اور وہ اسے بھی آپ کی طرف سے مہربانی اور احسان تصور کرے گی کہ آپ نے بغیر حاجت کے اسے اپنے نکاح میں لیا رکھا ہوا ہے۔

جہ اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ پس تم اس کے احسان کے لیے کوشاں رہو۔ اور اس میں اس بیوی کے لیے وعید ہے جو ان میں سے رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے ساتھ راضی نہ ہو۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورتوں کے بارے میں اور ان میں سے بعض کی طرف میلان اور جھکاؤ کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے جانتا ہے۔ اور ہم نے آپ کی آسانی کے لیے عورتوں کے بارے میں اختیار آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سینوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو بھی جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ پس حق یہی ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ ابن سعد نے کرم سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یہ ابو عمر اور یعقوب نے لایا۔ کوئٹہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ کیونکہ اس کا قائل جمع مونث غیر حقیقی ہے۔ یعنی حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس دن کے بعد جنسی کہ اگر ان میں سے ایک فوت بھی ہو جائے تو آپ کے لیے کسی دوسری سے نکاح کرنا حلال نہیں۔

میں اُدواج میں من زائدہ ہے اور فنی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ ان میں سے کسی ایک کو حلاق دیں اور اس کی جگہ کسی دوسری سے نکاح کر لیں۔

علامہ ابونعیم نے ذکر کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کو اختیار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قدر افزائی فرمائی اور ان کے سوا دیگر عورتیں آپ ﷺ پر حرام قرار دیں اور آپ ﷺ کو انہیں طلاق دینے اور ان کے بدلے نئی عورت سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ یہی قول حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور علماء کے مابین اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس حکم ممانعت کے بعد پھر آپ ﷺ کے لیے اباحت نکاح کا حکم نافذ کیا گیا انہیں؟ (۱) تو اس بارے میں عبدالمزاق، سعید بن مسعود، ابن سعد، احمد، عبد بن حمید، راہو داؤد نے اپنی تاریخ میں، ترمذی اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے، نسائی، ابن جریر، ابن منذر، حاکم اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ابن مردودہ اور امام بیہقی نے عطاء بنی سندی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قول تُوْجِیْ مِنْ شَآءٍ وَهَلْهُنَّ وَهَلُوْیْ اِنَّکَ صَرَفْتَ شَآءً عَلٰی سَبَبِ اَبٍ ﷺ کے لیے یہ طلال کر دیا کہ آپ عورات کے سوا جن عورتوں سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ آیت اگرچہ قرأت کے اعتبار سے مقدم اور پہلے ہے لیکن نزول کے اعتبار سے (آیت ممانعت سے) مؤخر ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ابن سعد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل نقل کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابھی تحریم باقی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا (2)۔ اور علامہ بغویؒ نے عکرمہ اور ضحاک کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے آپ کے لیے ان عورتوں کے بعد کسی سے نکاح

حلال نہیں ہے جو ہم نے آپ کے لیے ان صفات کے سبب حلال قرار دی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اگر حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا وصال ہو جاتا تو کیا آپ ﷺ کے لیے نئی شادی کرنا جائز تھی؟ تو آپ نے فرمایا کوئی شے آپ ﷺ کے لیے مانع تھی؟ تو عرض کی گئی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد لا یَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِهَا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے ایک خاص قسم کی عورتیں حلال فرمائیں اور ارشاد فرمایا یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَ الْيَتَامَىٰ۔ اور پھر ارشاد فرمایا لا یَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ (یعنی اس خاص قسم کے سوا دیگر عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں)۔ ابو صالح نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کسی اعرابی یا عام عربی عورت سے شادی نہ کریں۔ اور آپ اپنی قوم (قبیلہ) کی عورتوں مثلاً چچی کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں ہوں سے شادی کر سکتے ہیں اگرچہ وہ تین سو ہوں۔

مجاہد کا قول ہے کہ آپ کے لیے مسلمان عورتوں کے بعد یہودی اور نصرانی عورتوں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ مسلمان عورتوں کو چھو کر ان کے بدلے غیر مسلموں سے شادی کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین نہ کوئی یہودی عورت ہو سکتی ہے اور نہ عیسیٰ مگر اہل کتاب میں سے جو آپ کی کنیز ہیں آپ ان سے شب باشی کر سکتے ہیں۔

ضحاک سے روایت ہے کہ اُنْ فَبَلَغَ بَعْضُ النَّاسِ مَا مَعْنَىٰ ہُوَ کہ وہ ازواج مطہرات جو آپ کے حوالہ عقد میں ہیں انہیں حلاق دے کر ان کے بدلے دوسری عورتوں سے نکاح کرنا آپ کے لیے حلال نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ آپ ﷺ پر حرام قرار دیا کہ آپ اپنی موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں امہات المؤمنین بنادیا ہے اور جب انہوں نے آپ ﷺ کو اختیار کر لیا ہے تو آپ کے سوا کسی غیر پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور عورت سے نکاح کرنے سے آپ ﷺ موعظ نہیں فرمایا گیا۔

ابن زید نے قول باری تعالیٰ وَلَا اَنْ يَتَزَوَّجَ مِنْ اَزْوَاجِہِمْ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی ازواج کا تبادلہ کر لیتے تھے، ایک آدمی دوسرے سے کہتا تو میرے ساتھ اپنی بیوی کا تبادلہ کر لے، میں اپنی بیوی کا تبادلہ تجھ سے کرتا ہوں، یعنی تو اپنی بیوی سے میرے لیے دستبردار ہو جا اور میں تیرے لیے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا اَنْ يَتَزَوَّجَ مِنْ اَزْوَاجِہِمْ یعنی اپنی ازواج کا کسی غیر سے تبادلہ نہ کیجئے اس طرح کہ آپ اپنی زوجہ اس کے حوالے کر دیں اور اس کی بیوی خود لے لیں۔ مگر کنیزیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی اپنی جس کنیز کے بارے میں آپ چاہیں تبادلہ کر لیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے تو ان کا تبادلہ ہرگز حلال نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عیینہ بن حصین بغیر اجازت کے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس داخل ہوا اور اس وقت حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے پاس موجود تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اجازت طلب کیوں نہیں کی؟ تو اس نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ جب سے میں بن شعور و ادراک کو پہنچا ہوں میں نے شہر کے کسی آدمی سے داخل ہونے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ پھر اس نے کہا آپ کے پہلو میں یہ حسین و جمیل عورت کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ عائشہ ام المؤمنین ہے۔ تو عیینہ نے کہا کیا میں تمہیں (اس کے بدلے) حسین ترین عورت نہ دے دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا تبادلہ حرام قرار دیا ہے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون تھا؟ آپ ﷺ نے

فرمایا یہ احمق اور بیوقوف ہے جس کی بیرونی کی جاتی ہے یہ باوجود اس حالت کے جس پر تم نے اسے دیکھا ہے یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔ (1)
یہ ترکیب کلام میں وَلَوْ اَعْجَبَكَ الْآیۃ تَبَدَّلَ کے فاعل سے حال ہے نہ کہ مفعول سے۔ کیونکہ مفعول من الزواج ہے جو متوکل فی
الغنکر ہو نے کی وجہ سے (ذوالحال نہیں بن سکتا)۔ تقدیر عبارت ہے مَقْرُوءًا اَعْجَبَا بَكَ بَہُنَّ۔

علامہ بغوی نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں اور اس کے بدلے
دوسری سے نکاح کریں، اگرچہ اس کا حسن و جمال آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت جعفر بن
ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی بنت عمیس خنعمیہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو رسول اللہ
ﷺ نے انہیں پیغام نکاح بھیجے گا ارادہ فرمایا۔ تو آپ ﷺ کو اس سے روک دیا گیا۔ (2)

۱۔ یہاں لفظ غافل ریح میں ہے اور یہ النساء سے مشتق ہے۔ کیونکہ النساء کا لفظ ازواج کو بھی شامل ہے اور کنیزوں کو بھی۔ بعض نے
کہا ہے کہ یہ متشقی منقطع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ماریہ کے مالک بنے تھے (3) جو
کہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ تھیں۔

۲۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مگر ان ہے۔ پس تم اپنے معاملات کی حفاظت کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو حد مقرر فرمائی ہے اس سے
تجاوز نہ کرو۔

مسئلہ: علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ آدمی جس عورت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو اس کی طرف دیکھنا
جائز ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو
اگر وہ ان اعضاء کی طرف دیکھنے کی طاقت رکھتا ہو جو اس کے ساتھ نکاح کرنے کی دعوت دیتے ہوں تو اسے ایسا کر لینا چاہئے (4) (یعنی
اسے دیکھ لینا چاہئے) اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد
فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اسے دیکھ لے کیونکہ تم دونوں کے مابین اتفاق و اتحاد
قائم رکھنے کے لیے یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہے (5)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ
رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے انصار میں سے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے
فرمایا اس کی طرف دیکھ لے کیونکہ انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔ حمیدی نے کہا ہے
کیونکہ ان کی آنکھوں میں زردی (پٹلا پن) ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

شیخین نے یحییٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت
جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو آپ ﷺ نے قوم کی دعوت کی۔ پس جب وہ کھانا کھا چکے تو وہ بیٹہ کر باتیں کرنے لگے۔ پھر آپ
ﷺ نے ایسا انداز اپنایا گویا کہ آپ انھیں کی تیاری فرما رہے ہیں لیکن وہ لوگ نہ اٹھے۔ پس جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو آپ

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (انتحاریہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (انتحاریہ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (انتحاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (انتحاریہ)

6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 456 (قدیمی)

5۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 72 (وزارت تعلیم)

اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو نبی آپ ﷺ اٹھے تو لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے تین آدمی بیٹھے ہی رہے۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ اندر داخل ہونے کے لیے واپس تشریف لائے لیکن وہ لوگ ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے (تو آپ انہیں دیکھ کر پھر واپس چلے گئے) پھر کچھ دیر کے بعد وہ لوگ اٹھے تو میں چلا اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اطلاع دی کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ آپ ﷺ تشریف لائے یہاں تک کہ آپ اندر داخل ہو گئے۔ پس میں بھی اندر داخل ہونے کے لیے ساتھ گیا مگر آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرٍ
نُظِرَ لَكُمْ عَنْهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْسِنُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ
لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذَى النَّبِيَّ فَيَسْتَعْجِلُ مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَعْجِلُ مِنَ
الْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ
لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِرُوا
أَرْوَاحَهُ مِنْ بَعْدِ آبَدًا ۚ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۖ ۝ إِن يُبَدِّلْ شَيْئًا أَوْ
يُخْفِئْهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۖ ۝ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي آبَائِهِنَّ وَلَا
أَبْنَائِهِنَّ وَلَا إِخْوَانِهِنَّ وَلَا آبَائِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَاءِهِنَّ وَلَا
مَمَالِكُهُنَّ أَبَدًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا بِكُلِّ شَيْءٍ عَظِيمًا ۖ ۝

”اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو نبی کریم کے گھروں میں۔ بجز اس (صورت) کے کہ تم کو کھانے کے لیے آنے کی اجازت دی جائے (اور) نہ کھانا پکے کا انتظار کیا کرو۔ لیکن جب تمہیں بلا یا جائے تو اندر چلے آؤ پس جب کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ۔ اور نہ وہاں جا کر دل بہلانے کے لیے باتیں شروع کر دیا کرو۔ تمہاری یہ حرکتیں (میرے) نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں (اور چپ رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کسی کو ٹہم نہیں کرتا حق بیان کرنے میں۔ اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر۔ یہ طریقہ پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لیے نیز ان کے دلوں کے لیے۔ اور تمہیں یہ ریب نہیں دینا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو اور اس کی بھی اجازت نہیں کہ نکاح کرو ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی۔ بے شک ایسا کرنا اللہ کے نزدیک گناہ عظیم ہے بکے چاہے تم کسی بات کو ظاہر کر دیا اسے چھپاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ کوئی جرم نہیں ان پر اگر ان کے ہاں آئیں ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بیٹھنے اور ان کے بھانجے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں اور لونڈیوں کی آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں (اے عورتو!) ذرا کرو اللہ (کی نافرمانی) سے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔“

۱۔ علامہ یحییٰ نے ذکر کیا ہے کہ ابن شہاب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف

فرمایا ہوئے تو اس وقت میری عمر دس برس تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے پر میری ماں میرے ساتھ تعاون فرماتی تھی۔ لہذا میں نے دس سال تک آپ ﷺ کی خدمت کی اور جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت میری عمر تیس برس تھی۔ اور میں آیت حجاب کے شان نزول کے بارے میں تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں۔ حضور نبی کریم ﷺ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی خواب گاہ میں تھے کہ پہلی بار آیت حجاب کا نزول ہوا۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ان کے ساتھ شادی کی تو صبح کے وقت آپ ﷺ نے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور وہ کھانا کھانے کے لیے حاضر ہوئے، اللہ عزوجل (1)۔ یہ روایت بھی بخاری کی روایت کی مثل ہی ہے۔ بخاری شریف کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں آیت حجاب کو تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا گیا۔ دو آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں ہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے پر بلا یا پس لوگ (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد) وہاں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ جب کچھ دیر کے بعد واپس لوٹ کر آئے تو ابھی تک وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ آپ ﷺ نے پردہ ڈال دیا اور لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت اس طرح ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے خلوت اختیار فرمائی تو پھر آپ ﷺ نے ویسے کا اہتمام کیا اور گوشت روٹی تیار کروایا۔ پھر مجھے کھانے کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ پس لوگ آنے لگے کھاتے اور نکلے جاتے۔ پھر اور لوگ آئے کھاتے اور نکلے جاتے۔ پس میں لوگوں کو بلاتا رہا یہاں تک کہ میں نے کوئی ایسا آدمی نہ پایا جسے میں دعوت دوں۔ پھر میں نے عرض کر دی یا نبی اللہ! میں کوئی ایسا آدمی نہیں پا رہا جسے میں دعوت دوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کھانا اٹھا لو۔ پس میں آدمی گھر میں باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ حضور نبی کریم ﷺ باہر تشریف لے گئے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف چلے گئے اور انہیں فرمایا السلام علیکم اهل البيت و رحمة اللہ۔ تو انہوں نے بھی آگے سے کہا و علیکم السلام و رحمة اللہ۔ آپ نے اپنی اہلیہ کو کیسے پایا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے۔ پھر آپ ﷺ اپنی تمام ازواج کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور انہیں وہی کچھ فرمایا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا اور انہوں نے بھی آپ کو وہی کچھ کہا جو حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا تھا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ واپس لوٹے لیکن ابھی تک وہ لوگ گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ حضور ﷺ تو شرم و حیا کا پیکر تھے اس لیے پھر واپس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کو خبر دی یا کسی اور کی جانب سے خبر دی گی کہ وہ لوگ نکل گئے ہیں تو آپ واپس لوٹ آئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک پاؤں دروازے کی دہلیز سے اندر رکھا اور دوسرا ابھی باہر ہی تھا تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔ اور آیت حجاب نازل ہوئی۔ (3)

بخاری کی ایک روایت اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت اختیار فرمائی تو آپ نے ویسے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھائی، پھر آپ ﷺ

امہات المؤمنین کے حجروں کی طرف تشریف لے گئے جیسا کہ آپ ﷺ کا ایسے مواقع پر معمول تھا۔ پس آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے رہے اور عادیہ دیتے گئے اور وہ بھی جواباً سلام عرض کرتی رہیں اور آپ کو عادیہ دیتی رہیں۔ پھر جب آپ ﷺ وہاں اپنے گھر کی طرف لوٹے تو وہاں آدمیوں کو دیکھا وہ جیسے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ پس جو نبی آپ نے انہیں دیکھا تو اپنے گھر سے پھر واپس لوٹ گئے۔ پس جب ان دونوں آدمیوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو اٹھ کر چلے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ لوٹ کر آئے یہاں تک کہ گھر میں داخل ہو گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت امام ترمذی نے نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ اس عورت کے دروازے کے پاس آئے جس سے شادی کی تھی تو وہاں دیکھا کہ ان کے پاس کچھ لوگ موجود ہیں تو آپ ﷺ وہاں سے چلے گئے۔ پھر جب وہ لوگ باہر نکل گئے تو آپ واپس لوٹ آئے اور اندر تشریف لے گئے اور اسی دوران میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا۔ میں نے اس کا تذکرہ ابو طلحہ سے کیا تو انہوں نے کہا اگر ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو یقیناً اس کے بارے میں کچھ نازل ہوگا تو پھر آیت حجاب نازل ہوئی۔ طہرانی نے صحیح سند کے ساتھ امام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ میں ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر ایک پیالے میں کھانا کھا رہی تھی کہ اسنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی کھانے پر بلایا اور وہ بھی ساتھ کھانے لگے۔ اسی شام میں اچانک ان کی انگلی میری انگلی سے آگئی۔ تو فوراً ان کی زبان سے یہ نکلا: او! اگر تم عورتوں کے بارے میں میری رائے تسلیم کر لی جاتی تو کوئی آنکھ دیکھ نہ سکتی۔ پس پھر آیت حجاب نازل ہوئی (۱)۔ امام بخاری نے الادب المفرد میں اور امام نسائی نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

ابن مردودہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ حضور نبی کریم ﷺ تین مرتبہ باہر تشریف لے گئے تاکہ وہ بھی چلا جائے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ پس اسنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے چہرہ مقدس پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تو آپ نے اسے آدمی سے کہا شاید تو نے حضور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تین بار اٹھا تاکہ وہ بھی میرے پیچھے اٹھ کھڑا ہو لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ اگر آپ پر وہ ہمارے لیے (تو یہ بہتر تھا) کیونکہ آپ کی ازواج دیگر عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کے دلوں کو بھی زیادہ پاک کرنے والا ہے (۲)۔ پس اس کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ سورہ بقرہ میں وہ روایت گزر چکی ہے جو امام بخاری وغیرہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے (۱) نے تین چیزوں میں اپنے رب کے حکم کے ساتھ موافقت کی ہے۔ پس میں نے کہا کاش آپ

1۔ الادب المفرد لبخاری، جلد 2، صفحہ 523 (المدنی قاہرہ) 2۔ مجمع بیہر، جلد 11، صفحہ 439 (العلوم والحدیث)

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو چار چیزوں کے سبب دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی۔ ایک یہ تھی کہ آپ نے غزوہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے کی رائے دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: ﴿لَا يَحْضَبُ مِنْ اللَّهِ سَبْقُ الْآيَةِ﴾۔ دوسری چیز یہ تھی کہ آپ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج کے لیے پردہ کرنے کا مشورہ دیا تو حضرت زینب نے آپ سے کہا: اے ابن خطاب! آپ ہم پر بھی غیرت کھانے لگے ہیں حالانکہ وہی ہمارے گھروں میں نازل ہوئی ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالیتے تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی **وَإِنِ اخَذُوا مِنْ مَّقَامٍ إِبْرَاهِيمَ مَفْضَلٍ**۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی ازواج کے پاس نیک اور فاجر لوگ آتے رہتے ہیں۔ پس اگر آپ انہیں پردہ کرنے کا حکم ارشاد فرمائیں (تو یہ بہتر ہو)۔ پس اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کی ازواج مطہرات غیرت اور رقابت کے سبب جمع تھیں کہ میں نے ان سے کہا **عَسَىٰ وَهْنُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبَدِّلَ أَوْنًا خَيْرًا مِّنْكُمْ**۔ تو آیت بھی اسی طرح نازل ہوگئی (1)۔ نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے اور علامہ بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب کے سبب نزول میں صحیح واقعہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے اونچے ٹیلوں کی طرف نکلتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کرتے تھے کہ آپ اپنی ازواج کو پردے کا حکم دیتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک رات عشاء کے وقت حضرت سودہ بنت زمعد رضی اللہ عنہا باہر تشریف لے گئیں۔ آپ ایک طویل القامت عورت تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پردے کا حکم نازل ہونے کی شدید خواہش کرتے ہوئے آپ کو آواز دی ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمادی (2)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا تمام روایات کو جمع کرنا ممکن ہے اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قصہ سے کچھ پہلے پیش آیا ہو۔ لہذا اس واقعہ کے نزول آیت سے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ہی سبب نزول قرار دیا گیا ہو اور ایک آیت کے اسباب نزول متعدد ہونے سے کوئی شے مانع نہیں ہے۔

ج۔ یہ استثناء مفرغ ہے ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا مصدر ہونے کی بناء پر (مفعول مطلق کی بناء پر) یا پھر حال ہونے پر وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی **لَا تَدْخُلُوا فِيْ وَقْتِ الْاَوْقَاتِ اَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ اَلَا تَدْخُلُوْا دُخُوْلًا اِلَّا دُخُوْلًا مَّأْذُوْنًا لَّكُمْ اَلَا تَدْخُلُوْا فِيْ خَالِ الْاِخْوَالِ اَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ**۔ ”اَلِیْ طَعَامٍ“ مؤذون کے متعلق ہے کیونکہ وہ یہی کے معنی کو مستحسن ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ بغیر دعوت کے کھانے پر جانا اچھا نہیں ہوتا اگرچہ داخلے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد میں بھی اشارہ ہے۔ **غَيْرَ لَطْمٍ وَّلَا اِثْمٍ وَلَا كِتَابٍ** کے وقت کا انتظار کیے بغیر۔ ترکیب کلام میں یہ **لَا تَدْخُلُوْا** کے فاعل سے حال ہے یا لکم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور یہ استثناء میں داخل ہے۔ یعنی تم داخل نہ ہو مگر اجازت کے ساتھ اور کھانا کھانے کا انتظار کیے بغیر۔ یہ استثناء صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جو کھانے کے لیے داخل ہوتے ہیں مطلقاً لوگوں کے لیے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے انہ میں امالہ کیا ہے۔ یہ اس صورت میں مصدر ہے۔ جب کھانا کپکپ جائے تو کہا جاتا ہے اَلِیْ الطَّعَامِ اسی طرح کہا جاتا ہے اَلِیْ الْحَمِيمِ جب پانی شدید گرم ہو جائے۔ اسی طرح جب کوئی کام کرنے کا وقت ہو جائے تو کہا جاتا ہے اَلِیْ اَنْ یَّفْعَلَ كَذَا۔ علامہ بخاری نے کہا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 558 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بخاری، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ)

(گزشتہ سے پیوست)

وَإِذَا سَأَلَكَ عَنْ فَعْلٍ مِّنْ أَعْمَالٍ قُلْ مَا أَعْلَمُ بِهَا۔ تیسری چیز یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کے لیے یہ دعا کی تھی **اَللّٰهُمَّ اِنِّیْہِ الْاِسْلَامَ بَعْدَیْ** اللہ! اسلام کو میرے سبقت میں عطا فرما، اور چوتھی چیز یہ تھی کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا مشورہ دیا اور سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (مسلم المفسر رحمۃ اللہ تعالیٰ)

ہے کہ یہ انہی ہمزہ تصورہ کسرہ کے ساتھ ہے اور جب اسے فتح دیں گے تو ہمزہ معدومہ ہوگا۔ اور کہیں گے الاناء۔ اس کی دو لغتیں ہیں انہی یانی (1) یہ زمعی یومنی کے وزن پر باب ضروب یضروب ہے۔ اور دوسری لغت ان یانی ہے یہ باغ بیبع کے وزن پر باب ضروب یضروب ہے۔ اور قاموس میں ہے انہی الشیء یانی اینا و اناء و اناء۔ یہ غنی کے وزن پر انہی آتا ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کام کا وقت ہو گیا، چیز پک گئی، تیار ہو گئی۔ انہی الحمیم پانی اپنی گرمی اور تپش کی انتہا کو پہنچ گیا۔ قہو ان انتہا کو پہنچے والا۔ وبلغ هذا اناء، چاہے فتح کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ ہو معنی ہوگا وہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا یا چیز پک گئی یا تیار ہو گئی۔

ج جب تم کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ اور آپ ﷺ کے کا شانہ اقدس سے نکل جاؤ اور کھانے کے بعد وہاں نہ ٹھہرو۔ وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ نَاطِرِينَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ یا یہ محل نصب میں ہے۔ یعنی لَا تَدْخُلُوهَا مُسْتَأْنِسِينَ (دل بہلانے کے لیے ان کے پاس داخل نہ ہو)۔ بعض نے تقدیر عبارت اس طرح ذکر کی ہے وَلَا تَمْكُونُوا مُسْتَأْنِسِينَ (اور تم دل بہلانے کے لیے وہاں نہ رکو)۔ اس صورت میں جملہ کا عطف جملے پر ہے۔ اس جملہ میں انہیں دیر تک بیٹھے رہنے سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دیر تک وہاں بیٹھے بیٹھے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے دل بہلا لیں۔

یہ بے شک تمہارا ٹھہرانہی کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ گھر آپ ﷺ اور آپ کے گھر والوں پر تنگ ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا اعتبار سے کہ آپ ﷺ کو اس طرح لایینی (بے مقصد) کاموں میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔ یہ جملہ کلام سابق کی علت بیان کر رہا ہے۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں اور تمہیں (گھر سے باہر) نہیں نکالتے۔ فَيَسْتَعْجِلُكَ عَظْفُ سَابِقِهِ جملہ اسبہ پر ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَسْتَعْجِلُ مِنَ الْخَلْقِ جملہ معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معرضہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حیا کے سبب تمہیں ادب سکھاتا نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ ادب کی تعلیم دینا حق ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہیں نبی مکرم کے گھر سے نکالنا حق ہے۔ پس چاہئے کہ نبی مکرم ﷺ حیا کو ترک نہ کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ حق کو نہیں چھوڑتا لہذا وہ تمہیں نکلنے کا حکم دے رہا ہے۔ (2)

۱۔ اور جب تم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج سے کوئی چیز مانگو۔ کیونکہ بیوت النبی کے الفاظ انہی پر اذات کرتے ہیں اس لیے کہ گھروں میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ہی تھیں۔ ایسی شے جس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہو۔ چاہے عاریضہ طلب کرو یا بہت مانگو یا پھر عاریضہ لی ہوئی چیز واپس لوٹنا نہ جاؤ۔ وہ شے ان سے مانگو تو پس پردہ ہو کر مانگو یہ جملہ شرطیہ قول باری تعالیٰ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ پر معطوف ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد کسی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں سے کسی کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں تھی چاہے وہ نقاب اوڑھے ہوئے ہو یا نہ ہو (3)۔ پردے کے پیچھے سے مانگنے کا طریقہ شیطانی و سادس سے تمہارے دلوں کو پاک رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی۔ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کر رہا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوگا تو میں آپ کے بعد آپ کی فلاں زوجہ سے شادی کروں گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ۔ یعنی ایسی باتیں کرو جو آپ کے لیے پسندیدہ نہ ہوں۔ اور تمہیں اس کی

بھی اجازت نہیں کہ آپ کے وصال یا جدائی اختیار کرنے کے بعد آپ کی ازواج میں سے کسی سے کبھی بھی نکاح کرو۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے آپ کے بعد شادی کرنے کا قصد کیا تھا (1)۔ سفیان نے کہا ہے کہ یہ قصد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے کیا گیا تھا۔ اور سدی سے مروی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ نے یہ کہا کہ کیا محمد (ﷺ) ہمیں اپنی چچا کی بیٹیوں کے پاس جانے سے پردہ کے باعث روکتے ہیں اور خود ہمارے بعد ہماری بیویوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی واقعہ پیش آ گیا تو ہم بھی آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کریں گے۔ پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن سعد نے ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت طلحہ بن عبید اللہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس نے یہ کہا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ وصال فرمائیں گے تو میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کروں گا۔ جو میرے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کے پاس آیا اور ان سے گفتگو کرنے لگا اور وہ ان کے چچا کا بیٹا تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج کے دن کے بعد اس مقام پر کھڑے نہ ہونا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے چچا کی بیٹی تھی قسم بخدا! میں نے اسے کوئی بری بات نہیں کی اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی ایسی بات کہی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیر متدن نہیں اور نہ مجھ سے بڑھ کر اور کوئی غیر متد ہے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا اور کہنے لگا یہ مجھے میری چچا کی بیٹی سے باتیں کرنے سے روکتے ہیں۔ میں ان کے بعد اس سے ضرور شادی کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنی اس بات سے توبہ کرتے ہوئے ایک غلام آزاد کیا، دس اونٹوں کا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا اور پیدل چل کر حج کیا۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ عمر نے زہری سے روایت نقل کی ہے کہ عالیہ بنت ظلمیان وہ عورت ہے جسے حضور نبی کریم ﷺ نے طلاق دے دی تھی۔ پھر اس نے ایک اور آدمی سے شادی کی اور اس کے ہاں اولاد بھی ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ لوگوں پر ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ حکم تحریم سے وہ عورت مستثنیٰ ہیں جن کے ساتھ آپ ﷺ نے خلوت اختیار نہیں فرمائی (اور انہیں طلاق دے دی)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اصحف بن قیس نے مستعدہ سے شادی کی۔ (مستعدہ کا معنی ہے پناہ طلب کرنے والی)۔ اس کا نام جو یہ نکلیے تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس سے قربت کا ارادہ فرمایا تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ سنتے ہی اسے چھوڑ دیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر آپ کو یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تو اسے مٹس کرنے سے قبل ہی جدا کر دیا تھا۔ تو پھر بغیر کسی انکار اور اعتراض کے آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ (3)

یہ بے شک ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تحریم نکاح کا حکم اس وجہ سے ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کوئی آپ کا وارث بنا اور نہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بیوہ ہوئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی

اور آزاد مسلمان عورتوں اور غلاموں اور لونڈیوں کی آمدورفت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اجازت صرف لونڈیوں کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ ہم سورہ نور میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ جملہ لاجئنا علیہم کے معنوں پر معطوف ہے۔ یعنی اے عورتو! جنسی لوگوں کے سامنے بغیر پردہ کے آنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جن احکام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان میں نافرمانی اور غفلت برتنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جملہ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات مزید تاکید کے لیے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا مشاہدہ فرما رہا ہے اور اس پردہ جزا بھی عطا فرمائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيٍ مَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ اقْتُلُوا يُهَانُوا وَإِذَا أُسْأِلُوا

”بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس نبی مکرم پر! اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود بھیجنا کرو اور (بڑے ادب و محبت سے) سلام عرض کیا کرو۔ بے شک جو لوگ ایذا پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے سزاؤں عذاب جہنم۔ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھالیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا لہجہ ہے۔“

۱۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نبی مکرم ﷺ پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ آپؐ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یُصَلُّونَ کا معنی ہے وہ برکت دیتے ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس کا معنی رحمت کرتا ہوتا ہے اور اگر نسبت ملائکہ کی طرف ہو تو معنی استغفار کرنا ہوتا ہے۔ (۱) ابو العالی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ میں آپ کی ثنا فرماتا ہے اور صلوٰۃ ملائکہ کا معنی (حاکم) ہے (۲) صلوٰۃ کے معنی کی مکمل وضاحت قول باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَى نَبِيِّهِ وَمَوْلَا يَشَاءُ کے ضمن میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

۲۔ اے اہل ایمان! تم بھی آپ ﷺ کے لیے دعا مانگو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجار کرو کہ وہ آپ پر رحمت نازل فرمائے اور بڑے ادب و محبت سے سلام عرض کرو اور کبوالسلام علیک ایہا النبیؐ ورحمة اللہ وبرکاتہ۔ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ ﷺ کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام پیش کرنا واجب ہے، اگرچہ عمر میں ایک باری ہو۔ یہی موقف امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالکؒ کا ہے۔ اور امام محمدؒ نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امر قطعی کا مقتضی یہ ہے کہ عمر بھر میں ایک بار صلوٰۃ و سلام پیش کرنا فرض ہے کیونکہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اور ہمارا موقف یہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہر نماز کے آخری قعدہ کے بعد درود پڑھنا واجب ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ رحمتہ الامتہ فی اختلاف الامتہ میں ہے کہ آخری قعدہ میں تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک

سنت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ کی مشہور ترین روایت یہ ہے کہ درود پاک چھوت جانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درود پاک پڑھنا فرض ہے اور انہی سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ درود پڑھنا سنت ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جب بھی آقاؐ کا ذکر آئے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے۔ علامہ رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ حالت نماز میں درود پاک پڑھنا واجب ہے وہ حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس آدمی کی نماز ہی نہیں ہوتی جس نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود پاک نہ پڑھا (1)۔ اسے ابن جوزی نے دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عبدالمہدیں ابن عباس بن سہل بن سعد ہے جو اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتا ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ عبدالمہدیں قوی راوی نہیں ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث ابن القاط میں بھی ذکر کی ہے کہ اس آدمی کی نماز نہیں جس نے وضو نہیں کیا۔ اس کا وضو نہیں جس نے وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی نہیں لیا، اس کی نماز نہیں جس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا اور اس کی نماز نہیں جس نے انصار سے محبت نہیں کی۔ اس کی سند میں راوی عبدالمہدیں ضعیف ہے وہ قابلِ محبت نہیں، بطرانی نے ابی بن عباس بن سعد سے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔ علامہ نے کہا ہے کہ عبدالمہدیں کی حدیث صحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ محمد شین کی ایک جماعت نے ابی بن عباس کے بارے میں کلام بھی کیا ہے حضرت ابوسعود انصاریؒ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز پڑھی اور مجھ پر اور میرے اہل بیت پر درود پاک نہ پڑھا تو اس کی نماز مقبول نہیں (2)۔ اسے بھی علامہ ابن جوزی نے دارقطنی کی سند سے روایت کیا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں خود اختلاف کیا ہے۔ کہ کبھی اسے ابن مسعود سے موقوف روایت کرتا ہے اور کبھی مرفوعاً نقل کرتا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے یہی روایت ابن مسعود سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں اختلاف کیا ہے کہ کبھی اسے موقوف ذکر کیا ہے اور کبھی مرفوع۔ حاکم اور بیہقی نے یہی ابن سہاق سے انہوں نے بنی حارث کے ایک آدمی کی وساطت سے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی شہید پڑھ چکے تو پھر یہ کہے اَللّٰہُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ مُحَمَّدًا وَاٰلَ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَبَارَكْتَ وَرَحَّمْتَ عَلٰی اِبْرٰہِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰہِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مُّجِیْدٌ (3)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام روایات حارثی کے سوا اللہ ہیں لیکن وہ ایک محلِ نظر ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس حدیث "جس نے مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں" کو تمام محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس کا معنی ہے کہ اس کی نماز کامل نہیں ہوتی جس نے مجھ پر درود پاک پڑھا۔ یا یہ معنی ہے کہ جس نے عمر بھر میں ایک بار بھی مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس سے قوی ترین حدیث فضالہ بن عبیدہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو نماز میں دعا کرتے سنا کہ اس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے جلدی کی ہے۔ پھر آپ ﷺ

نے اسے بلایا اور اسے اور اس کے علاوہ دیگر افراد کو فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرے پھر نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھے پھر جو چاہے دعا مانگے (1)۔ اسے ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی کے الفاظ اس طرح ہیں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے کہ اسی اثنا میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے دعا مانگتے ہوئے کہا اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ کر بیٹھ جائے تو اس طرح اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ایک دوسرے آدمی نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی، حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اے نمازی! دعا مانگ، وہ قبول کی جائے گی (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور نسائی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے کے وجوب پر استدلال اسی طرح بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں آپ ﷺ پر درود پاک پڑھنا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ وَرَبِّكَ فَتَقُوتُ سے مراد حالت نماز میں تکبیر تحریمہ، وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ سے مراد قیام، اِمْرُؤُا الَّذِیْنَ اٰتٰهُ جُؤُوسٌ سے مراد کوع و جود کرنا اور فَاقْرَءْ ذَا الَّذِیْ سَمِعَ مِنَ الْغُرٰنِ سے مراد حالت نماز میں قرأت کرنا ہے۔ اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو امام بخاری نے حضرت کعب بن عجرہ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ ہم یہ تو بیچتے ہیں کہ آپ پر سلام کیسے بھیجا جائے لیکن درود پاک پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح کہو اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ (3)۔ یعنی تشہد میں سلام پڑھنے سے تویم واقف ہیں اور وہ آپ کا یہ ارشاد ہے السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ لیکن اس حالت میں ہم درود پاک کیسے پڑھیں گے؟ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح درود پاک پڑھنے کا طریقہ تعلیم دیا کہ اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ آخرہ یہ ہو۔ اس حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے اور درود پاک کے تشہد کے بعد پڑھنے پر اجماع کیا ہے، اگرچہ اس کے فرض ہونے کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں تشہد کے بعد درود پاک پڑھنا ہے۔ واللہ اعلم۔

وہ لوگ جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جب بھی حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا جائے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں رمضان المبارک کا مہینہ آیا لیکن اس کی مغفرت اور بخشش کا سبب بنے بغیر گزر گیا۔ اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں اس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھے ہو گئے لیکن وہ اسے جنت میں داخل نہ کر سکے (4) (یعنی بیانا کی خدمت نہ کرنے کے سبب جنت کا مستحق نہ بن سکا)۔ اسے ترمذی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہو اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے (5)۔ حضرت ابن عباسؓ کی

2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 186 (دعوات تعلیم)

4- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 193 (غاری)

1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 186 (دعوات تعلیم)

3- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 708 (دعوات تعلیم)

5- تخم کبیر، جلد 19، صفحہ 292 (العلوم والحکم)

مرفوع روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل امین آئے اور کہا جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا لیکن اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہوا اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے مذکورہ دونوں حدیثیں طبرانی نے نقل کی ہیں۔ ابن السنی حضرت جابر سے مرفوع روایت ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ بد بخت (شقی) ہو گیا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل وہ ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام احمدؓ نے حضرت حسین بن علیؓ سے نقل کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت حسین بن علیؓ سے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس سے مجھ پر درود پاک پڑھنا چھوٹ گیا تو اسے جنت کا راستہ چھوٹ گیا (2)۔ امام نسائی نے صحیح حدیث کے ساتھ حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا تو اسے چاہیے کہ وہ مجھ پر درود پاک پڑھے کیونکہ جو مجھ پر (ایک بار) درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ (3)

فصل: حضور نبی کریم ﷺ پر صلوة وسلام پڑھنے کی فضیلت و کیفیت کا بیان

عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن جرحہؓ سے ملے اور کہا۔ کیا میں (ایک حدیث) بطور تحفہ تمہیں پیش نہ کروں جو میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے سنی ہے؟ تو میں نے کہا کیوں نہیں! آپ ضرور وہ تحفہ مجھے عطا فرمائیے تو انہوں نے فرمایا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو سکھا دیا ہے لیکن ہم آپ پر اور آپ کی اہل بیت پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہوا اللہم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم انک حمید مجید، اللہم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم انک حمید مجید۔ متفق علیہ (4)۔ لیکن مسلم نے دونوں مقامات پر علی ابراہیم کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ ابو حنیفہ الساعدی سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس طرح پڑھو اللہم صل علی محمد وازواجه وذریئہ کما صلیت علی ابراہیم وبارک علی محمد وازواجه وذریئہ کما بارکت علی آل ابراہیم انک حمید مجید۔ متفق علیہ (5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔ حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، اس کے دس گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (7) اور اس کے دس درجات بلند کر دیئے جائیں گے۔ اسے امام احمدؓ، بخاری نے الادب میں، نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تمام

- 1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 193 (قاری)
- 2۔ معجم کبیر، جلد 3 صفحہ 128 (اعلم والکم)
- 3۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 91 (وزارت تعلیم)
- 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 940 (وزارت تعلیم)
- 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 64 (قاری)
- 6۔ الادب المفرد، جلد 2 صفحہ 101 (البدنی)
- 7۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 193 (قاری)

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (بابر) تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ایک نخلستان میں داخل ہوئے اور بعد سے میں پڑ گئے اور اتنا طویل سجدہ فرمایا کہ مجھے یہ خوف ہونے لگا شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دے دی۔ چنانچہ میں آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے قریب آیا تو آپ ﷺ نے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا تمہیں کیا ہوا ہے؟ تو میں نے اپنے خوف کا تذکرہ کر دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور اکر کہا۔ کیا میں آپ کو بشارت ندے دوں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے جو کوئی آپ پر درود پاک پڑھے گا میں اس پر رحمت نازل فرماؤں گا اور جو آپ پر سلام پیش کرے گا میں اس پر سلام فرماؤں گا (1)۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا دعا زمین آسمان کے مابین ہی موقوف رہتی ہے اور دعا کو کوئی حصہ بھی اوپر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تو نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔ عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا جو کوئی مجھ پر جتنا درود پاک پڑھے گا اتنی ہی فرشتے اس پر جتنیں نازل کریں گے اب چاہے تو آدمی قبلِ مقدار میں درود پاک پڑھے یا زیادہ مقدار میں (3)۔ اسے بغوی نے روایت کیا ہے حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اس کے لیے ایک قیراط (اجر) لکھ دیا جاتا ہے اور ایک قیراط قبلِ احد کے برابر ہے۔ اسے عبد الرزاق نے الباقی میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی دس مرتبہ صبح شام مجھ پر درود پاک پیش کرے گا قیامت کے دن اسے میری شفاعت نصیب ہوگی (4)۔ (1) اسے طبرانی نے الکبیر میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مسئلہ: کیا غیر انبیاء پر صلوٰۃ السلام جائز ہے؟ تو اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ انبیاء علیہ السلام کی اتباع میں تو غیر کے لیے الصلوٰۃ والسلام جائز ہے (یعنی پہلے نبی علیہ السلام کا ذکر ہو اور ان کے بعد کسی اور کا تو اس طرح نبی کے واسطے سے دوسرے کے لیے بھی جائز ہے)۔ لیکن مستقل طور پر غیر انبیاء کے لیے الصلوٰۃ والسلام مکروہ ہے مجہوز و مصل۔ حالانکہ آپ ﷺ معزز بھی ہیں اور جلیل القدر بھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ عز و جل کے الفاظ خاص ہیں اسی طرح عرفا صلوٰۃ السلام انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص ہیں ہم نے یہ مسئلہ مکمل تفصیل کے ساتھ سورہ توبہ کی آیت وَصَّيْ عَلَيْنَا اِنْ صَلَوٰتُكَ سَكُنَ لِقَامِکَ

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 191 (المکتب الاسلامی)

2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 64 (فاروقی)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (اتحادیہ)

4۔ کنز العمال، جلد 1 صفحہ 491 (الانوار الاسلامی)

(1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ کی بارگاہ میں ایک آدمی حاضر ہوا اور اس سے سلام عرض کیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سلام کو جواب دیا اور بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ روی کے ساتھ اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ پس جب وہ آدمی اپنا کام کر چکا تو اٹھ کر چلا گیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسے ابوبکر ہر روز ساری زمین کے باسیوں کے اعمال کی مثل اس آدمی کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کی ایسے کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا یہ ہر صبح تمام مخلوق کے درود کی مثل مجھ پر دس مرتبہ درود پاک پیش کرتا ہے (یعنی اس کا درود اجر و ثواب میں ساری مخلوق کے درود کے برابر ہے)۔ میں نے عرض کی وہ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس طرح پڑھتا ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ عَدَدَ مَنْ خَلَقَ وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ کَمَا یَنْبَغِیْ لَنَا اِنْ نَصَلِّیْ عَلَیْهِ وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ کَمَا عَمَرْنَا فَانَا نَصَلِّیْ عَلَیْهِ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھتا پائی کے آگ کو بجھانے کی نسبت زیادہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنا غلام آزاد کرنے سے زیادہ افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے افضل ہے یا فرمایا اللہ کی راہ میں شمشیر زنی سے زیادہ افضل ہے۔ انظر رحمہ اللہ تعالیٰ۔

تفسیر میں ذکر کر دیا ہے۔

ع علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے ان سے مراد یہود و نصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ کیونکہ یہودیوں نے یہ کہا تھا **عَزَّوَجَلَّ اَبْنُ اَبْنِی اللہ** (عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) **یٰۤاِنَّ اللہَ مَغْلُوْلٌ** (اللہ تعالیٰ کا دست قدرت بندھا ہوا ہے) اور مزید یہ کہا **اِنَّ اللہَ لَفَرِیْدٌ وَ ذُو شَعْنٍ اَغْنِیَا** (بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں) اور عیسائیوں کا نظریہ یہ تھا **اَللہُ یَسِیْرُ** (مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) مزید یہ کہا **اَللہُ کَلْبٌ** (کلب یعنی علیہ السلام) تین میں سے تیسرے ہیں) اور مشرکین نے یہ کہا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بت اس کے شریک ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (یعنی یہ حدیث قدسی ہے) **اِنَّ اَدَمَ** نے میری کلمذیب کی ہے حالانکہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اس نے مجھے گالی دی ہے حالانکہ اُسے ایسا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے میری کلمذیب تو اس طرح کی ہے کہ اس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ اس طرح نہیں بنا سکے گا جیسے اس نے پہلی مرتبہ مجھے پیدا فرمایا حالانکہ میرے لئے دوبارہ زندہ کرنے کی نسبت پہلی بار پیدا کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔ اور اس نے مجھے گالی اس طرح دی ہے کہ اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بتائی ہے حالانکہ میں اعداد و اربابے نیاز ہوں کہ نہ کسی کا باپ ہوں اور نہ بیٹا اور میرا کوئی ہمسر نہیں (2)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اس کا مجھے گالی دینا اس طرح ہے کہ یہ کہتا ہے میری اولاد ہے حالانکہ میری ذات اس سے پاک ہے کہ میں کسی کو بیوی بناؤں یا بیٹا۔ اسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے **اِنَّ اَدَمَ** مجھے ایداء پہنچاتا ہے اس طرح کہ وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں اس کے تمام معاملات میرے قبضے میں ہیں۔ میں ہی رات اور دن کو تہلیل کرتا ہوں۔ متفق علیہ (3)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ **یُوْذِیْنِیْ** (وہ مجھے ایداء پہنچاتا ہے) کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں بکجروی اختیار کرتے ہیں۔ اور حکمران نے کہا ہے کہ **اَلنَّیْنِیْ** یُوْذِیْنِیْ **اللہ** سے مراد تصویریں بنانے والے لوگ ہیں۔ ابوذرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ سنا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو میری تخلیق کی طرح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے پس انہیں چاہیے کہ وہ ایک چوٹی تو پیدا کریں اور ایک دانہ یا جو تو بنا کر دکھائیں۔ متفق علیہ (4)۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس کسی نے تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دیتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے لیکن وہ کبھی بھی اس میں روح نہیں پھونک سکے گا (5) (لہذا وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا)۔ بعض نے کہا ہے کہ اذی کا معنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت اور ناکاہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ لیکن یہاں الفاظ ایسے ذکر کئے گئے ہیں جو لوگوں کے درمیان متعارف ہیں (کیونکہ لوگ آپس میں حکم کی خلاف ورزی کو ایداء دینے سے ہی تعبیر کرتے ہیں) اور نہ ہیضۃ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے مبرا اور منزہ ہے کہ اسے کوئی اذیت پہنچا سکے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کو ایداء دینے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی کیا گیا، دندان مبارک شہید کئے گئے آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور مجنوں کہا گیا (6)۔ ہماری تفسیر ان کے قول کے مطابق صحیح ہے جن کے نزدیک ایک لفظ کا اطلاق دو معنوں پر کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک وہ لوگ جو ایسے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کو ناپسند ہے۔ اور یہ بھی

- 1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (اتحادیہ) 2۔ تفسیر غازی، جلد 5 صفحہ 227 (اتحادیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 237 (نندی) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (اتحادیہ)

جائز ہے کہ آیت کا معنی اس طرح ہو بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر لفظ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لیے ہو، یعنی جو رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچائے گا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی ہے۔ ابن ابی حاتم نے العوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اس وقت حضور نبی کریم ﷺ پر طعن و تشنیع کی جب کہ آپ ﷺ نے صفیہ بنت جحش کو اپنی (ازواج) میں شامل کیا۔ جو میر نے ضحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ پر تہمت عائد کی تھی۔ اور پھر حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا اس آدمی کی جانب سے کون میرے سامنے ہند پریش کر سکتا ہے جو خود مجھے اذیت دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں جمع رکھتا ہے جو مجھے ایذا پہنچاتے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو کوئی میرے ولی (دوست) کی اہانت کرتا ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے گویا وہ مجھے جنگ کے لیے دعوت مہارزت دیتا ہے (1)۔ اور مجھے کوئی کام کرتے ہوئے اتار دو نہیں ہوتا جتنا اپنے مومن بندے کی جان قتل کرتے ہوئے ہوتا ہے وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی تارنگی کو ناپسند کرتا ہوں حالانکہ اس کے لیے موت لازم اور ضروری ہے عبد مومن کو کسی عمل سے میرا اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا دنیا میں زہد اختیار کرنے سے ہوتا ہے اور اس کی میرے لیے کوئی عبادت میرے اس پر فرض کردہ احکام کی بجا آوری کی مثل نہیں ہوتی۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو تو رب العالمین ہے میں تیری عبادت کیسے کرتا تو رب کریم ارشاد فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو اسے اس کی بیماری پر ہی نہیں کی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عبادت کرتا تو تو بائیس تھیں مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ اللہ ریٹ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اولیاء اللہ کی عداوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عداوت اور جنگ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی بیماری کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ان تمام حوادث سے بالا اور بلند تر ہے تو اس کا سبب ایسا وصل ہے جو غیر متکلیف ہے (یعنی اسے کسی کیفیت میں بیان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ کیفیات سے پاک ہے)۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بد رجحان کی تصحیح ہے۔ ہماری ذکر کردہ احادیث کی بناء پر ہی بعض نے آیت کا معنی اس طرح کیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو اولیاء اللہ کو ایذا پہنچاتے ہیں یعنی لفظ اللہ سے پہلے اولیاء کا لفظ محذوف نکالا ہے۔ جیسا کہ دشنی انقریۃ میں اہل محذوف ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر اولیاء اللہ کے ذکر کی تقدیم لازم آتی ہے۔ (اور یہ صحیح نہیں) اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تخصیص بعدا تمم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اولیاء اللہ میں داخل ہیں (یعنی پہلے عام اولیاء اللہ کا ذکر ہے جو انبیاء اور غیر انبیاء تمام کوشاں ہے۔ پھر رسول ذکر فرما کر آپ ﷺ کو عام اولیاء اللہ میں سے خاص کر دیا ہے) تو اس کے بارے میں یہ کہیں گے کہ اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر قول باری تعالیٰ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ کے ذریعہ تکرار لازم

آتا ہے۔ (کیونکہ مومنین بھی اولیاء ہی ہیں)

یہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اس نے ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ **إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ جَعَلَ اللَّهُ لَهُمْ سَبِيلًا** ہے۔ گویا کہ یہ ان کے جواب میں ہے جنہوں نے یہ سوال کیا کہ ہمیں تو حضور نبی کریم ﷺ پر صلوات و سلام بھیجے کا حکم دیا گیا ہے لیکن جو آپ کو ایذا پہنچانے والے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **لَعَنَهُمُ اللَّهُ** الآیہ (کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے)۔

مسئلہ: جس کسی نے رسول اللہ ﷺ کی ذات، دین، نسب یا آپ ﷺ کی صفات میں سے کسی صفت پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے یا وجہ عجب میں سے کسی کے سبب اعتراض کرتے ہوئے آپ کو اذیت پہنچائی، چاہے اس کا یہ قول صراحتہ ہو یا کنایہ، تعریف یا بوجہ اشارہ یا کفر ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ایسے آدمی پر لعنت کی ہے اور اس کے لیے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو کیا ایسے آدمی کی توبہ قبول کی جائے گی؟ یہ تو اس کے بارے علامہ ابن ہمام نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اپنے دل میں رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھتا ہے وہ مرتد ہے۔ لہذا آپ کے بارے گالی گلوچ کرنے والا بدرجہ اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک (ایسے آدمی کی سزا یہ ہے) کہ اسے حد قتل کر دیا جائے گا اور قتل کی سزا ساقط کرنے کے بارے میں اس کی توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہ مذہب اہل کوفہ (امام اعظم حنفیہ، صاحبین اور ان کے متبعین وغیرہ) اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق سے بھی اسی طرح منقول ہے (ایسے شخص کو سزا ضروری نہ رہتی تھی) چاہے تو وہ خود جرم کا اقرار کرے یا (وہ خود جرم کا اقرار نہ کرے) بلکہ اس کے خلاف شہادتیں موجود ہوں (اور جرم ثابت ہو جائے) بخلاف دیگر اسباب کفر کے۔ کیونکہ ان میں انکار توبہ منظور ہوتا ہے اور انکار کے ساتھ شہادت قابل عمل نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ علماء نے یہاں تک کہا کہ اگر کسی نے نشے کی حالت میں بھی آپ ﷺ کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کیے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور معاف نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ اس کا نشہ ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اس شے کا استعمال بلا اکراہ اپنے اختیار سے کیا ہو۔ بصورت دیگر وہ جنون کی شل ہوگا (اور اس کے لیے سزا نہیں ہوگی)۔ علامہ خطابی نے کہا ہے کہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسے شخص کے واجب القتل ہونے کے بارے اختلاف کیا ہو۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے کسی کے سبب قتل کرنا واجب ہو جائے پھر وہ توبہ کر لے تو اس سے قتل کی سزا ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر نشے کی حالت میں کسی کی زبان سے حضور نبی مکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات کے سوا کوئی اور کلمہ کفر نکل جائے تو اسے مرتد قرار نہیں دیا جائے گا اگرچہ اس کا نشہ کسی ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اسے بلا اکراہ اپنے اختیار سے استعمال کیا ہو۔

یہ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ان کے ایسا عمل کیے بغیر جو انہیں ایذا پہنچانے کا موجب ہو یا جو لوگ انہیں بغیر جرم کے اذیت دیتے ہیں اور انہیں ایسے جرائم سے مجسم کرتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے۔ تو انہوں نے بہتان باندھنے اور کلمہ گستاخانہ کا بوجھ (اپنے سر پر) اٹھالیا۔ اس میں بہتان اور اٹھام کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان کی عقیم اور بڑائی کا اظہار ہو۔ ماقابل کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب کے بارے نازل ہوئی ہے (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت ابو امامتین حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کے الفاظ عام ہیں اور یہ ہر اس آدمی کو شامل ہیں جو کسی بھی مومن مرد یا عورت کو کسی

بھی وجہ سے اذیت پہنچاتا ہے۔ اگرچہ اس کا سبب نزول خاص ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کی جان اور مال محفوظ و مامون ہو (1)۔ اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنا عرفاً عقلاً اور فقلاً حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا ہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم نے جوہر کو قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ضحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ایسے آدمی کی جانب سے میرے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے جو مجھے ایذا پہنچاتا ہے اور اپنے گھر میں ایسے آدمیوں کو جمع رکھتا ہے جو مجھے دکھ دیتے ہیں۔ اس سے مراد عبد اللہ بن ابی ہے جبکہ اس نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ پر جہت عائد کی تھی۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے نازل ہوئی ہے ان کے نزدیک یہ آیت اِنَّ اِيَّاهِ يُؤْذُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ سے لے کر اِنْفِصَالِ مُبْتَلٰکِ آپؐ کی شان میں نازل ہوئی نہ کہ صرف آخری جملہ آپؐ کے بارے میں نازل ہوا۔ اسی طرح جس نے حضرت علیؓ کو گالیاں دیں تو اس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (۱ علی!) تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں (2)۔ اسے شیخین نے براء بن عازب سے صحیحین میں نقل کیا ہیں۔ بلکہ عام صحابہ کرام کو برا کہنا بھی حضور نبی کریم ﷺ کو ایذا پہنچانے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ نے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے صحابہ کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے بعد انہیں (اپنے وطن و تہذیب) کا نشانہ نہ بنانا۔ پس جو ان سے محبت رکھے گا تو وہ میری محبت کے سبب ان سے محبت کرے گا اور جو کوئی ان کا بغض رکھے گا تو وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کے سبب ان سے بغض رکھے گا۔ اور جس نے انہیں ایذا پہنچائی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائے گا تو قریب ہی اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لے گا (3)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلثی نے کہا ہے کہ یہ آیت ان بدکاری کرنے والے لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ کے گلی کوچے میں چلتے پھرتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ جب رات کے وقت عورتیں قضاے حاجت کے لیے گھروں سے باہر نکلتیں۔ تو یہ ان کا پیچھا کرتے اور عورتوں کو آنکھوں سے اشارے کرتے اور دست دراز کی کوئی کوشش کرتے۔ پس اگر کوئی عورت خاموش رہ جاتی تو وہ اس کے پیچھے ہو جاتے اور اگر انہیں جھمک دیتی تو پھر وہ اس سے رک جاتے۔ وہ اگرچہ اس طرح لوٹن پھرنے کو تلاش کرتے تھے۔ لیکن وہ آزاد عورتوں کو لوٹن پھرنے سے علیحدہ پہچان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تمام عورتوں کا لباس ایک ہی جیسا تھا آزاد اور لونڈیاں تمام عورتیں ہی قمیص پہنے اور دوپٹہ اوڑھے باہر نکلتی تھیں۔ لہذا آزاد عورتوں نے اس معاملہ کی شکایت اپنے خاندانوں سے کی اور انہوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اس کے بعد آنے والی آیت میں آزاد عورتوں کو لونڈیوں جیسا لباس پہننے سے روک دیا گیا۔ واللہ اعلم۔ (4)

ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابوما لکؓ سے روایت نقل کی ہے۔ اور اسی کی مثل حسن اور محمد بن کعب قرظی سے بھی مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضاے حاجت کے لیے باہر نکلتی تھیں اور منافقین میں سے کچھ افراد ان سے

تعرض کرتے اور انہیں اس طرح ایذا پہنچاتے۔ انہوں نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی۔ جب اس کے بارے میں منافقین سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہہ دیا ہم تو یہ چھیڑ چھاڑ کا عمل لوٹھ یوں سے کرتے ہیں (یعنی ہم تو لوٹھ یاں سمجھ کر ایسا کرتے ہیں ہمیں ازدواج مطہرات کی کوئی پہچان نہیں ہے) تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيقِهِنَّ ۖ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ السُّفْقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالسُّرْمَةُ فِي السِّبْطِ لَتُغْرِيبَنَّهُمْ لَمَّا دَخَلُوا فِيهَا وَلَا قَلِيلًا ۝

”اے نبی کریم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادرؤں کے پلے اس طرح وہ باسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمائے والا ہے۔ اگر (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے۔ تو ہم آپ کو مسطہ کر دیں گے ان پر پھر وہ نہ ٹھہر سکیں گے آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں مگر چند روز ہی۔“

یٰٰدُنَّیْنِ صیغہ امر ہے اور اس سے پہلے لام امر مقرر ہے۔ اصل میں یٰٰدُنَّیْنِ ہے۔ اور جلابیق جلباب کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چادر ہے جس کے ساتھ عورت قمیص اور اڑھنی کے اوپر سے اپنے آپ کو لپیٹ سکتی تھی۔ امام بخاری نے حضرت ام المؤمنین عاتشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت سودہؓ پر دے کا حکم نازل ہونے کے بعد کسی کام سے باہر نکلیں۔ کیونکہ آپ عظیم الجثہ عورت تھیں اور جو کوئی آپ کو پہچانتا تھا آپ اس سے قطعاً نہیں چھپ سکتی تھیں۔ پس حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں دیکھ لیا اور پکار کر کہا اے سودہ! قسم بخدا تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ پس دیکھو تم کیسے باہر نکل رہی ہو۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ فوراً وہاں لوٹ آئیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے اور شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اور آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایک ہڈی بھی تھی۔ اتنے میں حضرت سودہؓ اندر داخل ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں اپنے کسی کام کے لیے باہر نکلی تو عمرؓ نے مجھے اس طرح کہا ہے۔ حضرت عاتشہؓ فرماتی ہیں حضور نبی کریمؐ ہڈی پکڑے ہوئے تھے، ابھی آپ نے اسے رکھا بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرمادی اور جو نبی وہ قسم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اپنے کام کی غرض سے باہر نکلیے کی اجازت عطا فرمادی ہے (1)۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بڑی چادریں اوڈھ کر باہر نکلیے کی اجازت فرمادی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابو عبیدہؓ نے فرمایا ہے کہ اہل ایمان کی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سروں اور چہروں کو بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ کر باہر نکلیں مگر ایک آنکھ نکلی رہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں (2)۔ وہ جلابیق میں منہ چھپیے ہے کیونکہ عورت اپنی چادر کا بعض حصہ ہی چہرہ پر لٹکا سکتی ہے۔

ع۔ اس میں اُنی یَعْرِفُنَّ سے پہلے اِلیٰ مضمر ہے جو کہ ادنیٰ کے متعلق ہے۔ مفہوم عبارت یہ ہے اقرب الی اُنی یَعْرِفُنَّ (اس طرح ان کی پہچان زیادہ آسان اور قریب ہوگی) یا پھر اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ادنیٰ اسباب معرفتھن۔ یہ ان کی پہچان کے اسباب میں سے زیادہ آسان اور قریب ہے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں اور ”فَلَا یُؤْخِذُنَّ“ کا عطف یَعْرِفُنَّ پر ہے، یعنی پھر منافقین اور فاسق ان سے کوئی تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔ اور جو کچھ گزر چکا اللہ تعالیٰ اسے بہت بخشنے والا ہے (اور) اپنے بندوں پر ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ وہ اپنے بندوں کی مصالحہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جزئیات کی رعایت بھی کرتا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک لونڈی پردہ کیے ہوئے حضرت عمرؓ و فاروقؓ اعظمؓ کے پاس سے گزری۔ آپ نے درے کے ساتھ اس کا نقاب اٹھایا اور فرمایا اے کبھی! کیا تو آزاد عورتوں کی مثل بن رہی ہے؟ پھر آپ نے اس کا پردہ پھینک دیا۔

ع۔ اگر منافقین اپنی منافقانہ حرکات اور عورتوں کے ساتھ تعرض کرنے سے باز نہ آئے اور جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ یعنی جن کے ایمان کمزور ہیں اور ایمان پر شائبہ و استتال اور کمزوری یا ان میں دین کے بارے میں متزلزل ہونے یا گناہوں میں منہمک ہونے کے سبب فسق و فجور زیادہ ہے۔

ع۔ اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے لوگ۔ یعنی وہ لوگ جو شہر میں زلزلہ اور شدید اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے جنگی دستے باہر بھیجا کرتے تھے تو منافقین میں سے بعض لوگوں میں جھوٹی خبریں پھیلا دیا کرتے تھے۔ اور کہنے لگتے وہ قتل کر دیئے گئے ہیں اور حکومت خورہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہتے عترتِ دشمن تم پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ کبھی نے کہا ہے وہ یہ پسند کرتے تھے کہ اہل ایمان میں بری اور تکلیف دہ باتیں پھیلیں۔ چنانچہ وہ جھوٹی خبریں اڑاتے رہتے تھے۔ (1)

ع۔ لَنْ یُؤْخِذَکُمْ بِہُمْ مَحْذُوفِ قَسَمٍ کا جواب ہے۔ اور معنی قسم اور شرط دونوں کے لیے ہے۔ یعنی ہم آپ کو انہیں قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کا حکم دیں گے۔ یا ہم تمہیں ایسی شئی کا حکم دیں گے جو انہیں جلا وطنی کے مطالبہ پر مجبور کر دے گی یا ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور لَمْ یَجِئَا بِہُمْ بِذُنُوبٍ فِیْہَا۔ لَنْ یُؤْخِذَکُمْ بِمَعْطُوفِ ہے۔ کیونکہ اسے بھی جواب قسم بنانا جائز ہے۔ معنی یہ ہوگا۔ کہ اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو وہ آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ چونکہ جلا وطنی انتہائی شدید سزا ہے بلکہ اعظم المصائب ہے اس لیے معطوف اور معطوف علیہ کے حال کے درمیان بعد اور دوری کے اظہار کے لیے حرف عطف ثم ذکر کیا گیا ہے۔ مگر انتہائی قلیل وقت حتیٰ کہ انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قلیل یا تو زمانہ کی صفت ہے یا جوارِ اُکی (پہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری صورت میں مفعول مطلق)

مَلْعُونِیْنَ ۙ اَیْمَانُکُمْ فَوَ اٰخِذُوْا بِہُمْ وَ اَقْبِلُوْا تَقْتِیْلَہُمْ ۚ سُنَّۃُ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ۚ یَسْئَلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَۃِ ۗ قُلْ اِنَّمَا عَلَّمَہَا عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَ مَا یَذِیْرُکَ لَعَلَّ السَّاعَۃُ تَکُوْنُ قَرِیْبًا ۝۱۱

”وہ بھی اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور جان سے مار ڈالے جائیں گے۔ اے اللہ کی سنت ان (بد قماشوں) کے متعلق بھی یہی تھی جو پہلے گزر چکے۔ اور آپ سنتِ الہی میں ہرگز کوئی تغیر

وتبدل نہ پائیں گے۔ جو لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں سب فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔“

۱۔ مَلْعُونِینَ کے منصوب ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ یا تو اس سے پہلے قتل ذمہ مقدر ہے یا یہ حال ہے اور استثناء اسے بھی شامل ہے یعنی لَا يُخَاوِرُوكَ إِلَّا مَلْعُونِینَ (وہ چند روز آپ کے پاس ٹھہریں گے اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی)۔ مَلْعُونِینَ کو مابعد کلام کی وجہ سے نصب دینا جائز نہیں کیونکہ کلمہ شرط کا مابعد اس کے ماقبل میں عامل نہیں بن سکتا۔ فَمَلْعُوا بَاب تَفْعِيل ہے اور یہ فعل قتل کی کثرت پر دلالت کر رہا ہے۔

۲۔ سُنَّة مصدر تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ام ماضیہ کے لیے بھی یہی ضابطہ قائم کر رکھا تھا کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام سے منافقانہ برتاؤ کیا اور جموں افواہوں کے ذریعے ان کے مقصد کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کر دیا جہاں بھی وہ پائے گئے۔ یا صِنَةُ اللہ منصوب بزعم الکافض ہے (یعنی اس سے پہلے حرف جار محذوف ہے)۔ تقدیر عبارت یہ ہے کُتِبَتْهُ اللہ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنی سنت کو تبدیل نہیں کرتا لہذا کوئی اور بھی اسے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

۳۔ لوگ آپ سے قیامت قائم ہونے کے بارے میں پوچھتے ہیں ان کا یہ سوال یا تو استہزاء ہے یا بطور عداوت یا بطور استحسان۔ پس مشرکین آپ ﷺ سے استہزاء کرتے تھے اور اسی استہزاء اور انکار کے سبب وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے تھے۔ جبکہ یہودی آپ ﷺ سے عداوت رکھتے ہوئے اور آپ ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اس کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور دیگر تمام کتب میں قیامت کے عین وقت کا ذکر نہیں فرمایا۔

۴۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس نے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں کیا۔ اور (اے سائل!) کوئی شے تھے اس کے قائم ہونے کا وقت بتا سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع کیا ہی نہیں۔ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔ تقدیر عبارت ہے شَيْئًا قَرِيبًا يَأْتِيكَ السَّاعَةُ عَنْ قَرِيبٍ۔ یا پھر طرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور چونکہ السَّاعَةُ الْيَوْمِ کے معنی میں ہے اس لیے قریباً کو مذکر ذکر کرنا جائز ہے۔ اور قیامت کے قریب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ جس کا آئینی ہوتا ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے (اگرچہ بظاہر کتنی دور ہی کیوں نہ ہو) اور مل (اگرچہ تہرجی اور آرزو کے لیے آتا ہے لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو پھر یہ یقین کے معنی دیتا ہے) لہذا یہاں اس معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ قیامت کا قائم ہونا واجب اور یقینی امر ہے (اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہے) اور اس میں استہزاء و جلدی قیامت قائم ہونے کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے تہدید اور جھرک ہے اور وہ منکرین جو عداوت انکار کرتے تھے انہیں اس کے سبب خاموش کر دیا گیا۔

إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكُفْرِينَ وَآعَدَ لَهُمْ سَعِيرًا ۖ خُلِدَ فِيهَا أَبَدًا لَا يَجِدُونَ
وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۖ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَا أَطَعْنَا
اللَّهَ وَآَطَعْنَا الرَّسُولَ ۖ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا
السَّبِيلَ ۖ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَهُمُ اللَّهُ كَعَنِيَ ۖ ﴿٢١﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے محروم کر دیا کفار کو اور تیار کر رکھی ہے اس نے ان کے لیے بھڑکنی آگ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں تا بد نہ پائیں گے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار۔ جس روز وہ منہ کے بل آگ میں پھینکے جائیں گے۔ تو (عبدالہیاس) کہیں گے اے کاش! ہم نے اطاعت کی ہوتی اللہ تعالیٰ کی اور ہم نے اطاعت کی ہوتی رسول اکرم کی یہ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے بیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی ہے، پس ان (خالموں نے) ہمیں بھکا دیا سیدی راہ سے۔ اے ہمارے رب! ان کو دو گنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت ہے۔“

یہ وہ ہمیشہ تا بد اس میں رہیں گے۔ خَالِدِیْنِ فُھْم کی ضمیر سے حال ہے، یعنی آگ میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بنادیا گیا ہے وہ کوئی دوست نہیں پائیں گے جو ان کی حفاظت کرے گا۔ اور نہ کوئی مددگار (پائیں گے) جو ان سے عذاب کو دور کرے گا۔

یَوْمَ تَقْلُبُ ترکیب کلام میں یا تَوَلَّوْا یَجْذُوْنَ کی طرف ہے یا اَذْکُرْ فضلِ محمد صوف ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جس دن ان کے چہرہ کو آگ میں ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرا جائے گا جیسا کہ گوشت کو جھوننے وقت کیا جاتا ہے یا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرا جائے گا۔ بالخصوص چہرہ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے سب سے محترم اور ذی مرتبہ عضو چہرہ ہے۔ یا پھر چہرہ ذکر کر کے مراد پورا بدن لیا گیا ہے۔

یَوْمَ تَقْلُبُوْنَ ترکیب کلام میں وُجُوْھُھُمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ چونکہ مضاف مضاف الیہ کا جز ہے اور وہ مندر الیہ ہے اس لیے اس کا اس سے حال واقع ہوتا صحیح ہے (تو عبدالہیاس) کہیں گے اے کاش! اس میں یا حرف نداء ہے اور منادی کی محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح یا فومنا لیستا (اے ہماری قوم کاش!) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مطلق تنبیہ کے لیے ہے ہم نے (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے (دنیا میں) رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کی ہوتی تو ہم آخرت میں اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ فواصل کی رعایت (آخری حرف کو ہم وزن کرنے) کے لیے اَلْمُؤْمِنُوْنَ اور السَّابِقُونَ کے آخر میں الف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ انتظام کلام پر بھی دلالت کرتی ہے اور اس کا ابعد جملہ مستاتفہ ہے۔

یہ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے بیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی۔ ان سے مراد اپنے وہ قائدین ہیں جنہوں نے ان کے لیے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ ابن عامر اور یعقوب نے ساداتہ تا قبل مسمور یا قبل الف کے ساتھ جمع الجمع کی صورت میں اسے پڑھا ہے۔ تاکہ کثرت پر دلالت کرے۔ اور باقیوں نے الف کے بغیر اور تا مفتوح کے ساتھ اس کی قرأت کی ہے۔

یہ پس ان (خالموں نے) ہمیں سیدی راہ سے بھکا دیا اس کفر کے سبب جسے انہوں نے ہمارے لیے مزین کر کے پیش کیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دو گنا عذاب دے اس کی نسبت جو عذاب تو نے ہمیں دیا کیونکہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ اور ان پر لعنت بھیج بہت بڑی لعنت۔ حاصم نے باء کے ساتھ کبیرا پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہو گا شدید ترین لعنت اور بہت بڑی پھینکار۔ اور باقیوں نے اسے تاہ کے ساتھ کبیرا پڑھا ہے۔ یعنی بہت زیادہ اور کثرت کے ساتھ لعنت ان پر برسا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّ اَدُّ اللّٰهِ وَمَا قَالُوْۤا وَّكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْہًا ۝۶۱

”اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بد بختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ پس بری کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس

سے جو انہوں نے کہا: اور آپ اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے۔“

۱۔ اسے ایمان والوں نے جاننا (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیب کی باتیں کر کے نہیں ستایا۔ کہا گیا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی شرم و حیا والے، شریف النفس اور ستر پوش آدمی تھے حتیٰ کہ ان کے شرم و حیا کے باعث ان کے جسم کا کوئی اندرونی حصہ بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کے کچھ افراد سیب سے انہیں ستاتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ یہ اپنے جسم کو پاتھیں کسی عیب کی وجہ سے بھی چھپائے رکھتے ہیں یا تو انہیں کوئی جلدی بیماری ہے یا برص ہے یا خصیتیں میں پانی ہے یا پھر کوئی اور بیماری ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی اس نوع کے عیب سے برأت ظاہر فرمادے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن آپ نے تنہائی میں غسل کے ارادہ سے کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیے پھر غسل فرمایا جب آپ فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لیے پتھر کی جانب تشریف لائے تو وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ پڑا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی عصا مبارک اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے پتھر کے پیچھے پیچھے بھاگ پڑے۔ اے پتھر! میرے کپڑے، میرے کپڑے (میرے حوالے کر دے) بالآخر پتھر وہاں جا کر رکا جہاں بنی اسرائیل کی مجلس تھی۔ پس انہوں نے آپ کو شکے بدن کو لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی حسین پیدا فرمایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے آپ کی برأت ظاہر فرمادی جو وہ آپ کے بارے میں کہتے تھے۔ وہاں پتھر ٹھہر گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے پہن لیے اور پھر اپنے عصا کے ساتھ پتھر کو مارنا شروع کر دیا تا کہ آپ کے مارنے کے سبب پتھر پر تین، چار یا پانچ ضربوں کے نشان باقی رہے۔ پس اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتْلُوا كِتَابَ اللَّهِ جَمِيعًا طَرَفًا مِمَّا نَسِيَ مِنْهُمْ لَهْفَاتُهَا أَوْ كَانُوا كَالْمُهْلِ يَغْوِيهِ الْهَمُّ نَفْسًا يَنْفَرُ** (۱)۔ اسے بخاری، ترمذی، احمد، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، عبد الرزاق اور عبد بن حمید نے روایت کیا ہے۔ ابو العالیہ نے یہ کہا ہے کہ قارون نے ایک عورت کو اس مقصد کے لیے اجرت پر لیا کہ وہ ہر مجلس موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا آپ کی برأت ظاہر فرمادی اور قارون کو ہلاک کر دیا (۲)۔ مذکورہ آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ القصص میں گزر چکی ہے۔

ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا کوافیت دینے کا مقہوم یہ ہے کہ جب حضرت ہارون علیہ السلام کا وادی القتیہ میں وصال ہوا تو لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے ہارون علیہ السلام کا قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا اور وہ ان کا جنازہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپ کی میت کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ آپ کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے دعویٰ سے بری فرمادیا۔ اسے ابن مہذب، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کچھ مال تقسیم فرمایا تو ایک آدمی نے کہا یہ تقسیم ایسی نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہو۔ پس میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو اس بات

سے مطلع کر دیا۔ آپ ﷺ یہ سن کر اسے غضبناک ہوئے کہ میں نے غصے کے آثار چہرہ مقدس پر دیکھ لیے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں اس سے کہیں زیادہ ستایا گیا لیکن انہوں نے صبر کیا۔ (1)
 ۱۔ اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے۔ جب کوئی آدمی عظمت و شان کا مالک ہو تو اسے کہا جاتا ہے وجہ المرجل بوجہ وجہ وجہ وجہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ علیہ السلام کا مقام یہ تھا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے تھے وہ آپ کو عطا فرمادیتا تھا۔ حسن نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی مقرب اور مقبول تھے۔ (2)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَاقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ
 وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ٥١

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ سچی بات کیا کرو۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا۔ اور جو شخص حکم مانتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا تو وہی شخص حاصل کرتا ہے بہت بڑی کامیابی سے۔“

۱۔ اے ایمان والو! ایسے اعمال کا ارتکاب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو جو اسے ناپسند ہیں، چہ جائیکہ ایسے اعمال کا ارتکاب کرو جو اس کے رسول اکرم کے لیے باعث اذیت ہوں۔ اور ہمیشہ سچی بات کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قَوْلًا سَدِيدًا سے مراد ہے درست اور سچی بات۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے انصاف کی بات، حسن نے کہا ہے سچی بات۔ بعض نے کہا ہے سیدھی بات (3)۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسی بات ہے جس کے ذریعے حق تک پہنچنے کا ارادہ ہو۔ ان تمام اقوال میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن تمام کا مقصد اور نتیجہ ایک ہے کہ قَوْلًا سَدِيدًا سے مراد ایسی سچی بات ہے جس میں نہ تو جھوٹ کی آمیزش ہو اور نہ ہی وہ محض ظن و تخمین سے کہی گئی ہو۔ کیونکہ جھوٹ مٹ جاتا ہے اور صدق باقی رہتا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد لوگوں کو ایسی باتوں سے روکنا ہے جو انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے وقت عدل و انصاف کی راہ اختیار کیے بغیر کہی تھیں اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت عائد کرنے کے واقعہ میں بے اعتدال کی راہ پر چلنے ہوئے کہی تھیں۔ حضرت عمر ممد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ قول صدید سے مراد لا الہ الا اللہ کا قول ہے۔ (4)
 ۲۔ یُصْلِحْ یہ مضارع امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے اور اسی وجہ سے اس پر معطوف ہونے والا مابعد فعل بھی مجزوم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہاری نیکیاں قبول فرمائے گا۔ متناہی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو پاک فرمادے گا (5) یعنی آپس اس قابل بنائے گا کہ انہیں قبول کر لیا جائے اور ان پر اجر و ثواب عطا فرمایا جائے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا۔ یعنی قول و عمل

2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (اتحارہ)

4۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (اتحارہ)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 901 (وزارت تعلیم)

3۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (اتحارہ)

5۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (اتحارہ)

پر تمہاری استقامت کو گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔

جس اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کا حکم مانتا ہے تو وہی شخص بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں وہ قابل تعریف زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں اسے سعادت مندی اور خوش بختی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿١﴾ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٢﴾

”ہم نے جیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھالیا اس کو انسان نے۔ بے شک یہ ظلم بھی ہے (اور) جہول بھی ہے۔ تاکہ عذاب دے اللہ تعالیٰ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو اور نفاق و کفر فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ ہم نے یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے جیش کی (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور اس کو انسان نے اٹھالیا۔ اس آیت طیبہ کی وضاحت میں چند امور بحث طلب ہیں۔ (1) امانت سے مراد کیا ہے؟ (2) کیا آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد حقیقتاً آسمان، زمین اور پہاڑ ہی ہیں یا ان سے مراد ان کے پاسی (رہنے والے) ہیں؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَنَسَلِ الْقُرْآنِ میں مراد اہل القریہ ہیں؟ (3) ان پر جیش کرنے سے مراد خطاب لفظی ہے یا خطاب حالی (یعنی کیا لفظاً انہیں امانت اٹھانے کے بارے کہا گیا یا ایسا نہیں؟) (4) امانت اٹھانے اور اس سے انکار کرنے کا معنی مفہوم کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ امانت سے مراد اطاعت اور وہ فراموش نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وہی فراموش واقعہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر خطاب لفظی کے ساتھ پیش فرمائے کہ اگر تم انہیں ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائے گا اور اگر انہیں ضائع کرو گے تو عذاب دے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امانت سے مراد ہے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا، بیت اللہ شریف کا حج کرنا، بات کرتے وقت سچ بولنا، ناپ تول میں انصاف کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امانتوں کی حفاظت کرنا۔ مجاہد کا قول ہے امانت سے مراد فراموش کی ادا دہی اور دین کی حفاظت کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا ہے کہ امانت سے مراد ادا امر و نواہی ہیں (یعنی ہر وہ شے جس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جس پر عمل کرنے سے منع کیا گیا ہے)۔ زید بن اسلم نے کہا ہے کہ امانت سے مراد روزہ، غسل جنابت اور شریعت کے مخفی امور ہیں اور ان سے مراد ایسے امور ہیں جن میں ریاکاری کا کوئی دخل نہ ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عمر بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء میں سب سے پہلے شرمگاہ بنائی اور فرمایا یہ امانت ہے، میں اسے بطور دیوبت تیرے حوالے کر رہا ہوں۔ پس شرمگاہ امانت

ہے، کان امانت ہیں، آنکھ امانت ہے، اور پاؤں بھی امانت ہے اور جو امانت کی (حفاظت) نہیں کرتا اس میں ایمان نہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد لوگوں کی امانتیں ہیں اور وعدہ کو پورا کرنا ہے۔ لہذا ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مومن اور ایسے آدمی سے دھوکہ نہ کرے جس سے اس نے کوئی معاہدہ کر رکھا ہو، چاہے وہ قلیل شے کے بارے میں ہو یا کثیر کے بارے میں یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحاح کی روایت ہے۔

مذکورہ تمام اقوال کا مرجع اور نتیجہ یہ ہے کہ امانت سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جن کا انسان کو پابند بنایا گیا ہے، چاہے وہ امر ہوں یا نواہی۔ اور آسمانوں اور زمین سے مراد واقعہ آسمان اور زمین بھی ہیں۔ علامہ بغویؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ موقف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ایک جماعت اور اکثر علماء سلف کا ہے۔ اور عرض (پیش کرنے) سے مراد خطاب لفظی ہے۔ علامہ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے ارشاد فرمایا کیا تم اس امانت کو اس کے جمیع لوازمات سمیت اٹھا سکتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے نیکی کرو گے تو تمہیں اس پر اجر و جزا عطا کی جائے گی اور اگر نافرمانی کرو گے تو پھر سزا دی جائے گی۔ تو انہوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم تو فقط تیرے حکم کے تابع ہیں نہ ہم انہر دو آپ کے خواہشمند ہیں اور نہ سزا برداشت کر سکتے ہیں۔ آسمان و زمین نے یہ قول اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور مخالفت میں ہرگز نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے یہ قول خوف اور خشیت خداوندی کی بناء پر کہا تھا اور دین الہی کی تعظیم کی خاطر ایسا کہا کہ وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر امانت چش فرمائی اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا انہیں اختیار دیا، ان پر اس کی قبولیت کو لازم نہیں فرمایا (گویا یہ امر اختیار ہی تھا انہیں نہیں تھا)۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پر اسے قبول کرنا لازم قرار دیتا تو وہ ہرگز اسے اٹھانے سے انکار نہ کرتے (۶)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عرض سے مراد خطاب لفظی ہے اور آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد ان کے پاسی ہیں ایمان نہیں جیسا کہ قول باری تعالیٰ وَشَکَّلَ الْفَرِیْقَیْنِ اٰمِلِی الْقَرِیْبِ (ہستی والے) مراد ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد واقعہ آسمان اور زمین اور پہاڑ ہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد بعینہ آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں اور عرض سے مراد وہ ہے جس کی نسبت ان کی ذاتی استعداد کی طرف کرنا معتبر ہے۔ اباء (انکار) سے مراد طبعی انکار ہے یعنی طبعی طور پر قابلیت اور استعداد کا نہ ہونا ہے۔ اور انسان کے امانت کو اٹھالینے کا معنی یہ ہے کہ اس میں اسے برداشت کرنے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے۔ اور اس کے ظلوماً جھوٹا ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پر قوت غضبہ اور قوت شہو یہ غالب ہیں۔ اس وضاحت کے مطابق یہ دونوں اچھی صفات ہیں جو اس بار امانت کو اٹھانے پر پُر ہینچتے کرتی ہیں۔

علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ شاید امانت سے مراد عقل یا تکلیف (احکام شرعیہ کی پابندی) ہے۔ عقل کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ دونوں قوتوں (قوت غضبہ اور قوت شہو یہ) کی نگرانی کرتی ہے اور تعدی اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے سے ان دونوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اور احکام شرعیہ کی پابندی کا مقصود اعظم ہی مذکورہ دونوں قوتوں کو معتدل رکھنا، اور ان کی شدت و عظمت کو کم کرنا ہے (۲) اور علامہ بیضاویؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ سابقہ آیت میں اطاعت کی تعظیم اور عظمت شان کا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت اس کی تقدیر و تائید کے لیے ہے اور اس میں اسی اطاعت کو امانت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ امانت کی طرح اطاعت بھی واجب الاداء ہے۔ اور آیت کا

معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ یہ امانت اپنی عظمت شان کے سبب اتنی نقل اور بھاری ہے کہ اگر اسے ان عظیم الجثہ (بڑے بڑے جسوں والی چیزیں مراد آسمان، زمین اور پہاڑ وغیرہ) چیزوں پر پیش کیا جاتا اور ان میں ادراک و شعور بھی ہوتا تو یہ اسے اٹھانے سے انکار کر دیتیں اور اس سے خوفزدہ ہو جاتیں لیکن انسان نے اپنے تحیف و کمزور جسم اور اپنی قوت و طاقت انتہائی کم ہونے کے باوجود اسے اٹھالیا۔ لہذا جو اس امانت کی پاسداری کرے گا اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے گا تو بالیقین دونوں جہاں کی کامیابیاں اور بھلائیاں اس کا مقدر ہوں گی (۱)۔

میں کہتا ہوں اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے ﴿لَوْ اَنَّ لَنَا هٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَاٰ بَصَافًا مِّنْهُ تَصْنَعُ عَاقِبِينَ خَشِيعَةً لِلّٰهِ وَتِلْكَ اِلٰهٌ مُّثَالُ نَصْرِ بَهْلَالِ الْاَيَّامِ لَعَلَّكُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (انگزم نہ) اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا (اور) پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ پس اس تاویل کے مطابق زیر بحث آیت ہدیکہ ایک مثال کا بیان ہے۔ ان دونوں قوتوں یعنی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مجازاً ان کے رہنے والے مراد لینے اور عرض اور خطاب کو مجازی معنی پر محمول کرنے کا درود مدار جمادات سے خطاب بعید از عقل خیال کرنے پر ہے۔ لہذا بعض نے اس استبعاد (بعید از عقل سمجھنا) کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان اجرام کو پیدا فرمایا تو ان میں فہم و ادراک کی قوت بھی تخلیق فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا میں نے کچھ فرشتے لازم کیے ہیں میں نے ان پر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے لیے جنت پیدا کی ہے اور نافرمانی کرنے والے کے لیے جہنم۔ تو انہوں نے جواباً یہ کہا جن اوصاف پر ہمیں پیدا فرمایا گیا ہے ہم ان ہی کے پابند اور تابع ہیں ہم مزید کوئی فریضہ برداشت نہیں کر سکتے اور نہ لاجرو و ثواب کے خواہش مند ہیں۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان پر اسی کی مثل امانت کو پیش فرمایا تو انہوں نے اسے اٹھالیا۔ لہذا اسی بوجھ کو اٹھانے کے سبب جو ان کے لیے انتہائی نقل اور گراں تھا، وہ اپنے نفس کے لیے ظلم (ظلم کرنے والے) تھے اور اس کے انجام سے واقف ہونے کے سبب جھول تھے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح کی وضاحت نقل کی ہے۔ اور اس میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اس بار امانت کو اٹھانے اور جنت سے نکالے جانے کے درمیان اتنا ہی وقت تھا جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے۔

اور بعض نے اس استبعاد کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ تمام کی تمام جمادات اپنی طرف نسبت کے اعتبار سے غیر ذوی العقول ہیں (یعنی وہ ہماری بات نہیں سمجھتے اس کا جواب نہیں دے سکتے) لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے اعتبار سے وہ ذوی العقول بھی ہیں۔ مطیع و فرمانبردار بھی ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ کرنے والے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو فرمایا ﴿فَسَبِّحْهُمَا كَلِمَاتٍ مِّنْ دُونِ مَا يَدْعُونَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَإِنْ مِنْ الْحِجَابِ لَمَّا يَسْجُدُونَ﴾ ﴿وَإِنْ مِنْهَا لَمَّا يَرْفَعُونَ خُلُوعًا﴾ ﴿وَإِنْ مِنْهَا لَمَّا يَرْفَعُونَ خُلُوعًا﴾ اور بے شک کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گرتے ہیں۔ مزید فرمایا ﴿لَمْ تَكُنْ أَنْتَ تَسْجُدُ لَكَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّجَرُ وَالتَّحِيُّوتُ وَالْجِبَالُ وَالْشَّجَرُ وَالْأَنْدَادُ﴾ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور سارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے)۔

بعض نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَخَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نَارِ اِنْسَانٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم

علیہ السلام کو فرمایا میں نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھی (اور نہ اسے قبول کیا) کیا تو اسے اس کے تمام لوازمات سمیت لینے کے لیے تیار ہے؟ آدم علیہ السلام نے عرض کی اسے رب! اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تو کسی اور احسان کرے گا تو تجھے اس پر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا اور اگر برائی اور نافرمانی کرے گا تو تجھے سزا دی جائے گی۔ پس آدم علیہ السلام نے اسے اٹھا لیا۔ اور عرض کی میں اسے اپنے کانوں اور کندھوں کے درمیان اٹھاتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جب تو نے اسے قبول کر لیا ہے تو پھر میں بھی تیرا معاون و مددگار ہوں گا۔ میں تیری آنکھوں کے لیے حجاب بنا دوں گا۔ پس جب تجھے ایسی شے کی طرف دیکھنے کا خطرہ لاحق ہو تو اس پر اپنا حجاب ڈال لینا، میں تیری زبان کے لیے دو جڑے بنا دوں گا اور ان میں بند ہونے کی طاقت رکھ دوں گا۔ پس جب بھی تجھے خطرہ لاحق ہو تو اسے بند کر لینا۔ اور میں تیری شر مٹا دے گا اور اسے قطعاً اس کے سامنے نہ کھولنا جس پر کھولنا اسے میں نے حرام قرار دیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آپ کے امانت اٹھانے اور جنت سے نکلنے کے درمیان اتنا ہی وقت ہے جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید امانت اٹھا لینے کے بعد آپ کو جنت سے نکالے جانے میں حکمت یہ ہے کہ جنت اوائے امانت کا محل نہیں بلکہ وہ تو اوائے امانت پر اجر و ثواب کا محل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوائے امانت کے لیے اس دنیا کی طرف بھیج دیا جو کہ آخرت کی سمجھتی ہے۔

علامہ بغوی نے نقل کیا ہے کہ نقاش نے اپنی استاد کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ (آیت طہ میں) امانت کو انتہائی وزنی اور بھاری چٹان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جو کسی بھی جگہ پڑی ہوئی ہو۔ پھر آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو اسے اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اسے اٹھانے کے لیے قریب نہ ہوا اور ان تمام نے کہہ دیا ہم تو اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام دعوت کے بغیر اُدھر آئے اور چٹان کو حرکت دیتے ہوئے کہا اگر مجھے اسے اٹھانے کا حکم دیا جائے تو میں اسے اٹھا لوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھانے کا حکم فرمایا تو آپ علیہ السلام نے اسے گھنٹوں تک اٹھا لیا اور پھر اسے رکھ دیا اور کہا قسم بخدا! اگر میں اسے مزید اٹھانا چاہوں تو اسے اٹھا سکتا ہوں۔ تو اس پر آسمانوں اور زمین وغیرہ نے آپ سے کہا اسے اٹھا لو۔ تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ پھر آپ نے اسے پیچھے رکھنے کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اسے اپنی جگہ پر رہنے دو پس یہ امانت یوم قیامت تک آپ کی اور آپ کی اولاد کی گردن پر رہے گی۔ (2)

زجاج اور دیگر علماء معانی نے یہ ذکر کیا ہے کہ امانت سے مراد ایسی اطاعت ہے جو اطاعت طبعیہ ہے اور اختیار یہ دونوں کو شامل ہو۔ اور عرض امانت سے مراد اس اطاعت کا مطالبہ کرنا ہے جو کہ طلب فعل کو شامل ہو چاہے وہ اختیاری ہو یا نیکوئی اور امانت اٹھانے سے مراد امانت میں خیانت کرنا اور اسے ادا نہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے حامل الامانة اور محتمل الامانة (امانت اٹھانے والا) اس آدمی کے لیے بولا جاتا ہے جو امانت ادا نہ کرے اور اس کی ادا نیکی سے بری الذمہ نہ ہو۔ پس اس طرح امانت اٹھانے سے انکار کرنے کا مفہوم اپنی استطاعت کے مطابق بقدر ممکن ادا کرنا ہوگا۔ اور امانت کی ادا نیکی میں خیانت اور کوتاہی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے انسان کو ظُلْمًا جَهَنَّمًا کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَيَذَرْنَاهُمْ فِيهَا يَذُنُّونَ (اور وہ اپنے بوجھ اٹھا نہیں گئے)۔ حسن

سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ آیت طہر کی اس تاویل و تشریح کے مطابق وَخَمَلَهَا الْإِنْسَانُ میں انسان سے مراد کافر اور منافق ہیں جنہوں نے (رب کریم کی) اس امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ علمائے سلف کا قول پہلا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیاق آیت یہ تقاضا کرتا ہے کہ امانت اٹھانا فقط انسان کے ساتھ مختص ہے کوئی دوسری مخلوق اس میں شریک نہیں۔ لہذا اس شخص کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کی پابندی ہے، یہ مناسب نہیں کیونکہ ان احکام میں جو تواتر اور ملائکہ بھی شریک ہیں۔ بلکہ اس سے ملائکہ کی انسان پر فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ وہ معصوم ہونے کے سبب کامل طور پر امانت کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ ان کے بارے میں ارشاد باری ہے يُسَبِّحُونَ أَكْثَرَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَا يَفْثُونَ (وہ (ملائکہ) رات دن (اللہ تعالیٰ کی) تسبیح بیان کرتے ہیں اور (کبھی) سست نہیں پڑتے۔) جبکہ اس کے برعکس انسان کے بارے میں فرمایا قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِّنَ ظُلُمٍ إِنَّ فِى ظُلُمٍ إِكْرَامٌ (کیونکہ انسانوں میں سے بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میان روی اختیار کرنے والے ہیں اور بعض بھلائیوں میں بہت لے جانے والے ہیں)۔ اس وجہ سے عالی مرتبہ مصوفیاء نے کہا ہے کہ امانت سے مراد عقل کا نور اور عشق کی آگ ہے۔ پس نور عقل کے ساتھ استدلال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور عشق کی آگ سے تمام حجابات ہل جانے کے سبب معرفت الہی نصیب ہوتی ہے۔ اور ملائکہ اگرچہ مقربین بارگاہ الہی ہیں لیکن وہ اپنی مخلوق ہیں جن کے لیے مقام قرب و عرفان معلوم اور معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے بارے میں ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِى يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُصَوِّغُ لَكُمْ ذِكْرَهُ وَالَّذِى لَهُ مُلْكُ يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَشْجَارُ يُ显露ُ فَا تَرَوْنَ سُجُودَ (ہمارے نزدیک ہر ایک کے لیے مقام معین ہے)۔ پس مراتب غیر متناہیہ کی طرف ترقی تا مشق کے سبب ہوتی ہے اور وہ انسان کے خصائص میں سے ہے۔ اور جو کچھ میں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام سے استفادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ دائرہ کبوتول کرنے کی وہ استعداد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ماہیت میں دو عینت فرما رکھی ہے۔ کیونکہ جن اگرچہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے کے سبب ملائکہ سے مل سکتے ہیں اور ان میں تجلیات صفاتیہ کبوتول کرنے کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے لیکن تجلیات ذاتیہ صرف وہی برداشت کر سکتا ہے جس کا مزاج خاکی ہو۔ اور یہی تجلی ذات کبوتول کرنے کی استعداد ہی (انسان کے لیے) خلافت کو ثابت کرنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں جو یہ ارشاد فرمایا اِنِّىْ جَاعِلُكَ فَى الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً اَوْکَلَّیْتُكَ الْمُلْکَ وَکَلَّیْتُکَ النَّاسَ میں علم سے مراد یہی استعداد ہے۔ یعنی تم جان لو کہ تجلی ذاتی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا جس کا مزاج خاکی نہ ہو۔ اور اسی طرف اپنے اس ارشاد میں بھی اشارہ فرمایا۔

وَ اِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُلًا (انسان میں ایسی قوائے سبعیہ و دعیۃ فرمادی گئی ہیں جو اسے حقوق اور بلندی کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اس کے لیے بلند سے بلند تر مراتب معرفت کی طرف ترقی کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ جہول سے مراد وہ قوائے سبعیہ ہیں جو انسان میں یہ طاقت پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ عبادت و ریاضت کی مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔ اور وصال محبوب کی طلب میں عاشق کے لیے ریاضات شاقہ برداشت کرنا ضروری ہیں۔ پس اس طرح ظلم و جہول انسان کے لیے مستحق خلافت ہونے کی علت ہیں اور یہ اس کے لیے اچھی اور قابل تعریف صفات ہیں۔ اور یہ دونوں قوتیں (قوتہ سببی اور قوتہ بکبی) زمین سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ مادہ زمین اپنی کمال کثافت کے سبب تجلی ذاتی کو برداشت کر لیتا ہے جیسا کہ اجرام ارضیہ اپنی کثافت کے سبب سورج کے نور سے منور ہوتے ہیں بخلاف اجرام لطیفہ کے (کہ وہ اس نور سے منور نہیں ہوتے۔ یعنی وہ اسے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے) اور ملائکہ

مقرین اپنے مقامات اور ولایتوں میں محصور ہیں، اگر چہ ان کی ولایت انبیاء علیہم السلام کی ولایت سے اوپر ہے کیونکہ ان کی ولایت صفات من حیث البطون سے مستفاد ہے، یعنی اس حیثیت سے کہ صفات کا قیام اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی ولایت صفات من حیث الظہور سے مستفاد ہے، یعنی فقط اس حیثیت سے کہ وہ صفات ہیں اس حیثیت سے نہیں کہ ان کا قیام ذات کے ساتھ ہے۔ اور اسی اعتبار سے یہ صفات تعینات عالم کی مہادی کے لیے مہادی ہیں۔ لیکن ملائکہ کا جس ذات میں کوئی حصہ نہیں جو کہ کمالات نبوت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے نبوت انسانوں کے ساتھ منحصر ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص ملائکہ کے خواص سے افضل والہی ہیں۔ اور جنت انسانوں کے لیے ہے اور ملائکہ ہر دروازے سے ان کے احترام کے لیے داخل ہوں گے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ ہیں اور اسے اٹھانے سے مراد انہیں اختیار کے ساتھ قبول کرتا ہے تو ان کے نزدیک اس جملے یعنی انہ کان ظلوم غفلو کا معنی یہ ہوگا کہ انسان ایسے ہو جہ کو اٹھا کر جو اس کے لیے انتہائی شاق اور بھاری ہے اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے اور امانت کو ادا نہ کرنے کے سبب اسے جو عذاب ہوگا اس انجام سے ناواقف ہونے کے سبب وہ جہول ہے۔ تو اس اعتبار سے بھی (ان صفات کے بیان میں) انسان کے لیے مذمت نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور امر واقعی کا بیان ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ آیت سابقہ وعدے کی تائید و تقریر کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ امانت اتنی عظیم الشان اور اعلیٰ ہے کہ اگر ان بڑے بڑے عظیم اجسام کو بھی باشعور اور ذی عقل فرض کر لیا جائے تو یہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھتے بلکہ انسان نے اپنے نجف و کمزور جسم کے باوجود اسے اٹھالیا ہے۔ پس جو اس امانت کے حقوق ادا کرے گا تو وہ دونوں جہاں کی بھلائی اور منافع حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس وضاحت کے مطابق آپ کے نزدیک انہ کان ظلوم غفلو کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے امانت ادا کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا اور اس کے حقوق کو ادا نہیں کیا (اس اعتبار سے یہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے) اور جہول اس اعتبار سے ہے کہ یہ امانت ادا نہ کرنے کے انجام کی حقیقت و گمراہی سے ناواقف ہے۔ لہذا یہ دونوں جنس انسان کے وصف ہیں لیکن اس میں اعتبار اعم اور اکثر افراد کا ہے (تمام افراد کا نہیں کیونکہ بعض افراد مثلاً انبیاء، اولیاء اور متقی مومنین نے تو امانت کا وعدہ وفا کیا ہے)۔

صاحب بحر المعراج نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انسان ظلوم اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس امانت کے ادا کرنے پر قادر گمان کیا ہے جس امانت نے آسمانوں اور ان جیسے دیگر اجرام کو خوفزدہ کر دیا۔ اور پھر اسے ادا نہیں کیا اور انسان جہول اس اعتبار سے ہے کہ وہ امانت کو ادا کرنے سے اپنے عاجز ہونے سے ناواقف تھا۔ یہ تاویل میرے نزدیک پسندیدہ نہیں کیونکہ امانت کو اٹھانے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور انسان سے مراد آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ تو نبی تھے اور مصمم تھے آپ نے جو بوجھ اٹھایا اسے پورا پورا ادا کیا۔ اور انہ کہ ضمیر کا مربع وہی ذات ہے جس نے بار امانت کو اٹھایا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ صوفیہ نے کہا ہے کہ انسان اپنے اکثر افراد کے اعتبار سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے کیونکہ انسان کے اکثر افراد اسے معرفت الہی اور تجلیات ربانی کو قبول کرنے کی استعداد ضائع کر دی ہے جو اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے اور اسی فطرت پر اس نے تمام لوگوں کو پیدافرمایا ہے۔ اور اکثر افراد جہول اس اعتبار سے ہیں کہ ان سے جو نعمت ضائع ہو گئی وہ اس کی خوبی اور عظمت و شان سے ناواقف ہیں اور جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اس کے نتیجے انجام کو وہ نہیں جانتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والد یا اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ الحدیث متفق علیہ (1)۔ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

ڈالے اور اس بوجھ کو اٹھانے کی علت ہیں۔

سَلِّعْ ذَنْبَ پر لام عاقبت کے لیے ہے جیسا کہ اس قول میں ہے لَذُو اللَّيْمُوتِ وَانْتَوُا لِلْعَذَابِ (موت کے لیے جنم دو اور خرابی کے لیے بناؤ) یعنی ولادت کا انجام موت ہے اور تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ عذاب دے نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو۔ کیونکہ یہی امانت کو ضائع کرنے والے ہیں اور ظلم و لُذات میں منہمک ہیں۔ اور نگاہ لطف و کرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت، مغفرت، مراتب قرب کے انتخاب اور عطا کے لیے اہل ایمان کی طرف توجہ فرمائے کیونکہ اہل ایمان ہی امانتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور تجلیات الہیہ میں مستغرق ہیں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے امانت پیش کی یعنی احکام شرعیہ یا وہ استعداد جو انسان میں ودیعت کی گئی ہے تاکہ منافق کا نفاق اور شرک کا شرک ظاہر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے۔ اور مومن کا ایمان ظاہر ہو جائے (۱)۔ (میں کہتا ہوں عارف کا نور عرفان ظاہر ہو جائے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت و مغفرت کی توجہ فرمائے اگر ان میں سے کسی اطاعت کی ادائیگی میں سستی اور غفلت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی دائمی ذاتی تجلیات نازل فرمائے اور انہیں بغیر حجاب کے اپنا بلا کیف وصال عطا فرمائے۔ اور وعدہ کے مقام پر توجہ کا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ انسان اپنی فطرت و جبلت کے اعتبار سے ظلم و جہول ہے اس لیے وہ کچھ نہ کچھ غفلت اور کمزوری سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ مومنین کو بہت بخشنے والا ہے، ان کی غفلتوں اور خطاؤں کو معاف فرماتا ہے، ہر دم ان پر رحم فرمانے والا ہے، اپنے خاص فضل و احسان سے اہل ایمان کی اطاعتوں پر ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر اپنی تجلیات و برکات کی بارش نازل فرماتا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين۔ ربنا عليك توكلنا و اليك انبنا و اليك المصير

اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و احسان سے سورۃ احزاب کا ترجمہ آج مورخہ 3 اپریل 2000ء بروز پیر شام آٹھ بجے اپنے

اختتام کو پہنچا۔